[illegible]

مطالعۂ سلیمانی

مقالات

سیمینار

مرتبہ

مسعود الرحمن خان ندوی
محمد حسان خان

انه من سليمان وانه بسم الله الرحمن الرحيم

مطالعۂ سلیمانی

مقالات

بزمِ سلیمان

زیرِ اہتمام
دار العلوم تاج المساجد بھوپال
۴؍ تا ۶؍ ستمبر ۱۹۸۵ء

مرتبہ

مسعود الرحمٰن خاں ندوی
محمد حسان خاں

ناشر :- دار العلوم تاج المساجد بھوپال

سلسلۂ مطبوعات بزم سلیمان شمار (۲)

(جملہ حقوق نشر و اشاعت بحق ناشر محفوظ)

مقالہ نگار حضرات اپنے اپنے خیالات کے ذمہ دار ہیں

طبع اوّل ـــــ جون ۱۹۸۶ء
تعداد ـــــ ایک ہزار
سرورق ـــــ وکیل بستوی
کتابت ـــ منّے خاں سہسوانی، حافظ عتیق احمد، وکیل بستوی
طباعت ـــــ جمال پرنٹنگ پریس دہلی
ناشر ـــــ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال
صفحات ـــــ ۲۴ + ۵۷۶ = ۶۰۰
قیمت ایک سو روپے

منظوم نذرانۂ عقیدت
(بیادِ علامہ سید سلیمان ندویؒ)
"بزم سلیمان" منعقدہ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کی ایک خصوصی شعری نشست میں پیش کردہ
خراجِ تحسین ـ دیدہ زیب آفسیٹ طباعت ـ صفحات ۳۲ ـ قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ: دارالعلوم تاج المساجد بھوپال ـ ۴۶۲۰۰۱

ھدیہ

عمِ محترم مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری مدظلہ العالی

کی خدمت میں
جن کے
خلوص، اولوالعزمی، عالی ہمتی، بلند حوصلگی اور لگن
کی جس طرح

بزمِ سلیمانی

رہینِ منت تھی

اسی طرح یہ کتاب

مطالعۂ سلیمانی

بھی ہے

!

فہرست

مطالعۂ سلیمانی

مجموعہ مقالات بزم سلیمانی

حرفِ آغاز — مسعود الرحمٰن خان ندوی — ح
رودادِ بزم — اقبال احمد انصاری — ن

رہنما خطبات و مقالات

خطبۂ استقبالیہ — محمد عمران خان ندوی ازہری — ۱
خطابِ مہمانِ خصوصی — عمرو موسیٰ — ۹
خطبۂ صدارت — سید ابوالحسن علی حسنی ندوی — ۱۲
کلیدی مقالہ — سید صباح الدین عبدالرحمٰن — ۲۶
رہنما مقالہ — خلیق احمد نظامی — ۴۸

علوم و فنون سلیمانی پر نظر

قرآنیات:

قرآنی خدمات — محمد اقبال انصاری — ۶۳
قرآنی مباحث — ضیاء الدین اصلاحی — ۸۱
قرآنی تحقیقات — عبیداللہ فہد — ۱۰۴

فقہیات:

فقہ سلیمان — عبیداللہ کوٹی ندوی — ۱۱۴
احکام شرعی کا تدریجی نزول — ظفر الاسلام — ۱۴۰

تاریخ نگاری:

ممتاز تاریخ نگار	عبدالباری	۱۵۵

تحقیق و تنقید:

نقد و نظر	حبیب ریحان ندوی ازہری	۱۶۴
تنقیدی بصیرت	محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱۷۷
محقق و تنقید نگار	سید ابراہیم ندوی	۱۹۶

لسانیات:

سلیمانی نظریۂ لسانیات	سید احتشام احمد ندوی	۲۰۴
تحقیقاتِ الفاظ	سید حامد حسین	۲۱۶
لغوی تحقیق	محمد عمیر الصدیق ندوی	۲۲۲

تہذیب و تمدن:

عربی ثقافت کے فروغ میں علمی کردار	شفیق احمد ندوی	۲۳۸

ادب و شاعری:

شعری آہنگ	اختر سعید خاں	۲۴۳
شعر و سخن	منصور نعمانی ندوی	۲۵۰
تفہیم اقبال	اقبال احمد انصاری	۲۵۹
ادبِ اسلامی میں حصہ	سید عارف عزیز	۲۶۷

صحافت:

علمی ادبی صحافت کا پیشرو	سید محمد ہاشم	۲۷۰

طب:

سید سلیمان اور طب یونانی	سید ظل الرحمٰن	۲۸۵

تصنیفات سلیمانی: تعارف تبصرہ

سیرۃ النبیؐ اور چند جدید عربی کتب سیرت	محمد راشد ندوی	۲۹۴
سیرت عائشہؓ مکاتیب شبلی کی روشنی میں	ابو علی اثری	۳۰۲
سیرت عائشہؓ: ایک تنقیدی جائزہ	ریاض الرحمٰن خاں شیروانی	۳۱۱

خطبات مدراس	سید احمد عروج قادری	۳۲۰
خیام پر ایک نظر	کبیر احمد جائسی	۳۲۹
نقوش سلیمانی تحقیق کی روشنی میں	خورشید نعمانی ردولوی	۳۳۵

دیگر نگارشات

اردو:

مقدمات سلیمانی	مشیر الحق	۳۴۲
خطوط سلیمانی	عبد اللطیف اعظمی	۳۵۰
مکاتیب سلیمانی: علمی ادبی نکات	محمد فضل الرحمٰن ندوی	۳۵۸

عربی:

عربی زبان میں خدمات	محمد رابع ندوی	۳۷۶
اولیں عربی تحریریں	مسعود الرحمٰن خان ندوی	۳۸۸

ملی سیاسیات و تحریکات

ملی سیاست	حمید اللہ ندوی	۴۱۰
تحریک خلافت	سید یوسف کمال بخاری	۴۱۵
تصور خلافت	محمد صلاح الدین عمری	۴۲۷
تصور امارت شرعیہ	محسن عثمانی ندوی	۴۳۴
سید سلیمان ندوی ـ ایک تحریک	نثار احمد فاروقی	۴۳۹

سیرت و شخصیت

سلوک و معرفت:

دور سلوک	سید حسین	۴۴۴
علوِ سلیمانی	غلام محمد	۴۴۷

دار الاقبال بھوپال میں

علامہ سید سلیمان ندوی اور ریاست بھوپال	عبد القوی دسنوی	۴۵۷
آخری قاضی القضاۃ ریاست بھوپال	سید عابد علی وجدی الحسینی	۴۸۱

بارگاہِ سلیمانی میں:

سید صاحب کے ساتھ میرے پانچ سال — محمد یوسف کوکن عمری — ۴۸۷
خدمت سلیمانی میں چند سال — مجیب اللہ ندوی — ۴۹۳
دید و شنید — ابو العرفان ندوی — ۵۰۲
ذاتی تجربات کی روشنی میں — سید حشمت علی — ۵۰۶

● معاصرین سے روابط:

مولانا محمد علی جوہر — ابو البقاء ندوی — ۵۱۰
ڈاکٹر محمد اقبال — سید شرافت علی ندوی — ۵۲۲

● مباحثاتِ بزم ● ۵۳۳

مرتبہ: مسعود الرحمٰن خان ندوی

● اختتامی تقریب ●

کارگذاری بزم — مسعود الرحمٰن خان ندوی — ۵۵۱
اختتامی تاثرات صدر بزم — سید ابو الحسن علی حسنی ندوی — ۵۵۳
شکریہ داعئ بزم — محمد عمران خان ندوی ازہری — ۵۶۰
تجاویز بزم — مجلس تجاویز — ۵۶۲

● اشاریہ ● ۵۶۴

مقالات تقریبات صدسالہ یوم پیدائش

علامہ سید سلیمان ندوی

مرتبہ: مسعود الرحمٰن خان ندوی

○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

حرفِ آغاز

استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی کی ذاتِ گرامی مشرقی تاریخ علم و ادب اور دین و سیاست کی ان چند مستثنیٰ ہستیوں میں ہے جن کی علمی ادبی و دینی ملّی خدمات کے اعتراف میں نہ معاصرت کا حجاب حائل ہوا، اور نہ ان کے بعد ان کی قدردانی میں کمی آئی، بلکہ زمانہ گذرنے کے ساتھ عقیدت و محبت اور تشکر و ممنونیت کے احساسات و جذبات کی تپش دوچند ہوگئی، جس کے مخلصانہ پرجوش اظہار کی صدائے بازگشت ان کی ولادت باسعادت کی پہلی صد سالہ برسی کے موقع پر برصغیر کی سرسبز و شاداب وادیوں سے نکل کر یوروپ کے برفانی مرغزاروں میں سنائی دی۔

ان کی بابرکت پیدائش کی صد سالہ تقریبات متعینہ ہجری تاریخ ولادت (۲۳؍ صفر ۱۳۰۲ھ) سے نہیں بلکہ مختلف فیہ عیسوی تاریخ (۲۲؍ نومبر ۱۸۸۴ء) کے لحاظ سے ترتیب دی گئیں۔ پاکستان میں تو چند سال قبل ہی سے ان تقریبات کی ابتدا ہوگئی، سب سے پہلے سید صاحب کی یاد میں ۲۲؍ نومبر ۱۹۸۱ء کو بیدل لائبریری شرف آباد میں ایک جلسہ جناب منظر احمد ضیاء کی صدارت میں منعقد ہوا، جس سے مولانا جعفر شاہ پھلواری (مرحوم) مولانا عبد القدوس ہاشمی، مولانا محمد مثنیٰ ندوی، ڈاکٹر غلام محمد اور دیگر حضرات نے خطاب کیا۔ اس کے بعد کراچی میں لیاقت علی خاں ڈگری کالج اور مجلس علوم اسلامیہ کے زیر اہتمام متعدد تقریبات ہوئیں، پہلا باوقار اجتماع ۲۲؍ نومبر ۱۹۸۳ء کو جبیس ہوٹل میں زیر صدارت ایڈمرل ایم۔ آئی ارشد منعقد ہوا جس میں ناظم دار المصنفین سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب مہمانِ خصوصی، ڈاکٹر محمد حنیف فوق (کراچی یونیورسٹی)، غلام محمد صاحب (مؤلف تذکرۂ سلیمان) مقالہ نگار اور داعیِ تقریب پروفیسر سید فخر الحسن (پرنسپل لیاقت کالج و صدر مجلس علوم اسلامیہ)، ان کے رفقائے کالج اور بہار کے مشہور شاعر کلیم عاجز مقررین میں تھے۔ اس تقریب میں یہ بھی اعلان ہوا کہ آئندہ سال دسمبر ۱۹۸۴ء تک سید صاحب پر ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوگی، لیکن ستمبر ۱۹۸۵ء میں مجلس علوم اسلامیہ کی طرف سے شائع کردہ "اورنگ سلیمان" مرتبہ آفاق صدیقی سے اندازہ ہوا کہ سال بھر سے زیادہ مختصر پیمانے پر ان تقریبات کا سلسلہ جاری رہا، جن کا حاصل یہ اٹھارہ مقالات اور چند منظومات کا مجموعہ ہے، پھر مذکورہ کالج اور مجلس کے زیر اہتمام ہی "یوم سلیمان" کی مزید مقامی تقریبات ۱۲؍ دسمبر ۱۹۸۵ء کو منعقد ہونے کی خبر ملی۔

۲۶؍ نومبر ۱۹۸۳ء کو کراچی ہی کے اسلامیہ کالج (جس کے احاطہ میں سید صاحب کی آخری آرام گاہ واقع ہے) کے زیر اہتمام جناب عبد العزیز اشرفی (سکریٹری محکمہ اطلاعات حکومت سندھ) کی صدارت میں ایک پروقار تقریب منعقد ہوئی،

ناظم دار المصنفین اس میں بھی مہمان خصوصی تھے، اجتماع کو خطاب غلام محمد صاحب، جناب انیس الرحمٰن (ایڈوکیٹ)، مولانا عبد القدوس بہاری اور جناب سلیم یزدانی نے کیا۔ لیاقت کالج میں ایک اور خصوصی جلسہ ہوا جس میں ناظم دار المصنفین نے سید صاحبؒ کی تحریروں کی روشنی میں تقریر کی، پھر پرنسپل کالج کے گھر پر بھی ایک خصوصی نشست رہی جس میں جناب عبد الغنی شمسؔ نے علامہ مرحوم کو شعری نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا۔

دیسنہ ایسوسی ایشن کراچی بھی اس برسی کے موقع پر سالانہ جلسوں کا اہتمام کرتی رہی، پہلی تقریب ۲۷ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو زیر صدارت مولانا عبد القدوس ہاشمی منعقد ہوئی، مہمان خصوصی جناب بوستان علی ہوتی (وزیر صحت و سماجی بہبود حکومت سندھ) تھے، مقررین میں صدر جلسہ کے علاوہ علامہ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر سید سلمان ندوی، جناب محمد صلاح الدین (مدیر ہفت روزہ تکبیر) ڈاکٹر غلام محمد اور سید فخر عالم (صدر دیسنہ ایسوسی ایشن) تھے، خواجہ ریاض الدین عطش اور احسان عظیم آبادی نے منظوم ہدیۂ عقیدت پیش کیا۔ آخری تقریب ۱۳ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو منعقد ہونے کی خبر تھی، نیز اس نے ۱۹۸۴ء میں علامہ مرحوم کی یاد میں "مجلۂ صد سالہ یوم پیدائش علامہ سید سلیمان ندوی" مرتبہ صبیح محسن بھی شائع کیا، جس میں سید صاحب کی سیرت و شخصیت کے دلکش جلووں اور کمالات کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا۔

اس مبارک موقع پر پاکستانی صحافت نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ۱۹۸۳ء کی تقریبات کے وقت انگریزی اخبار "ڈان" میں مصباح الہدیٰ (اسلام آباد) کا مقالہ "ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا سید سلیمان ندوی" شائع ہوا، مشہور صحافی جناب محمود شامی نے سید صاحب پر ناظم دار المصنفین کا انٹرویو روزنامہ "نوائے وقت" میں نمایاں طور پر چھاپا، سید صاحب کا مضمون "رسول وحدت" کئی اخباروں میں نقل ہوا، ۱۹۸۵ء کی تقریبات کے موقع پر بھی مختلف اخبارات و رسائل میں ان پر مضامین شائع ہوئے۔

۵ر نومبر ۱۹۸۴ء کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحریک پر فرانس کے سرکاری ٹیلویژن سے علامہ مرحوم کے علمی ادبی کارناموں پر ایک خوبصورت پروگرام پیش ہوا، جس میں جناب عبد الغفور فرہادی (سابق سفیر و وزیر افغانستان) نے سید صاحب کا تعارف کراتے ہوئے، ان کی، ان کے مزار اور ان کی اہم کتابوں کے سرورق کی تصاویر دکھائیں اور جناب سید سالار الدین محمد نے ایک مختصر مضمون فرانسیسی زبان میں پیش کیا۔ اسی دن پیرس کے محلہ اشالن گراڈ کی مسجد میں رابطة الطلبة الاسلاميين کے زیر اہتمام علامہ مرحوم کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی فرانسیسی میں تقریر ہوئی، اس کا ترجمہ عربی میں ہوا، جس پر حاضرین نے سوالات بھی کئے اور مقرر سے وضاحتیں چاہیں۔ آغاز دسمبر ۱۹۸۴ء میں عالمگیر اسلامی مشن کی تحریک پر پیرس کی ترکی مسجد میں ہند و پاک کے باشندوں کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہوا جس میں قرآن خوانی کے بعد اردو میں تقریر ہوئی۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو جناب محمد عبد الماجد نے اپنی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک تقریب کا انتظام کیا جس میں خود انھوں نے اور ڈاکٹر حمید اللہ نے فرانسیسی میں

علامہ مرحوم کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بریلویوں کی تبلیغی انجمن کی پیرس میں شاخ نے بھی جلسہ کیا۔ بین الاقوامی امور کے تحقیقی ادارہ کے پروگرام میں بھی ایک لیکچر فروری ۱۹۸۵ء میں ترتیب دیئے جانے کی اطلاع تھی۔

ہندوستان میں ان تقریبات کی ابتدا کا سہرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سر بندھا جس نے ۲۴ تا ۲۵ نومبر ۱۹۸۴ء کو ایک دو روزہ مجلس مذاکرہ ترتیب دی، اس کا حاصل دس مقالات کا مجموعہ بعنوان "سید سلیمان ندوی" مرتبہ پروفیسر عتیق احمد صدیقی ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔

اس کے فوراً بعد بہار اردو اکیڈمی کی طرف سے ایک سہ روزہ سیمینار ۱ تا ۳ دسمبر ۱۹۸۴ء کو پٹنہ میں زیر صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی منعقد ہوا جس میں سترہ مقالات پیش کئے گئے۔ اطلاع ہے کہ اس سیمینار کی کارروائی بھی جلد زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آنے والی ہے، اس موقع پر منتظمین نے پروفیسر عبدالقوی دسنوی سے "یادگار سلیمان" تیار کرا کے شائع کی جس میں مولانا مرحوم کی حیات سے متعلق اہم تاریخوں اور واقعات کی نشاندہی کے ساتھ ان کی تصنیفات و مقالات کے جامع اشاریے اور ان پر اب تک کتابی یا مقالات کی شکل میں جو کچھ مواد شائع ہوا ہے اس کی مفصل فہرست شامل ہے جو "سلیمانیات" سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یقیناً بہت مفید ثابت ہوگی۔

اس مبارک سلسلہ کی تیسری دو روزہ تقریب کل ہند انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام اردو گھر دہلی میں ۹ تا ۱۰ مارچ ۱۹۸۵ء کو منعقد ہوئی جس کا افتتاح جناب سید مظفر حسین صاحب برنی (گورنر صوبہ ہریانہ) نے کیا، اس سیمینار میں کل اٹھارہ مقالات پیش ہوئے جن کی چھاپے جانے کی بھی خبر ہے۔

صد سالہ برسی پر ان کل ہند تقریبات کا حسنِ اختتام دار العلوم تاج المساجد بھوپال کے زیر اہتمام سہ روزہ "بزم سلیمان" ۴ تا ۶ ستمبر ۱۹۸۵ء کا علمی ادبی جشن تھا جو علامہ مرحوم کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد عمران خان ندوی ازہری (امیر دار العلوم تاج المساجد بھوپال) کی دعوت پر ان کے دوسرے شاگرد سعید حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سعادت مآب عمرو موسیٰ (سفیر عرب جمہوریہ مصر متعینہ ہند) خصوصی مہمان تھے۔ عالی جناب سید ہاشم علی (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے بزم کا افتتاح کیا۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن (ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ) نے کلیدی مقالہ پیش کیا، پروفیسر خلیق احمد نظامی (سابق صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا رہنما مقالہ تھا۔

یہ تقریب دراصل طبقۂ علماء کی طرف سے علامہ مرحوم کی ناقابلِ فراموش علمی، ادبی، دینی، ملی، خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی، لیکن دیگر طبقات اہل علم و مکاتب فکر کی بھرپور نمائندگی اس کا نمایاں وصف تھا، اس یادگار بزم کے لئے پچاس اہل علم نے بیش قیمت مقالات لکھے جو زیادہ تر علوم و فنونِ سلیمانی

کو اجاگر کرنے کے لئے وقف تھے، غیر مقالہ نگار بیرونی شرکار کی تعداد مقالہ نگاروں سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی جو ملک کے گوشہ گوشہ سے ان روح پرور لمحات سے مستفید ہونے کے لئے تشریف لائے تھے۔ بھوپال کے علم دوست شہریوں کی بڑی تعداد بھی از افتتاح تا اختتام اس بزم کی رونق میں اضافہ کرتی رہی۔

اس مبارک موقع پر ایک شاندار نمائش کا انتظام بھی کیا گیا تھا جس کا افتتاح بھوپال کی مشہور خانقاہ مجددیہ کے فاضل سرپرست مولانا محمد سعید مجددی نے فرمایا۔ اس میں علامہ مرحوم کی تصنیفات و تالیفات، خطوط و فتوی، عدالتی فیصلوں اور ان پر دوسرے اہل علم کی لکھی ہوئی مؤلفات کو جمع کیا گیا تھا۔ ان کے بارے میں مشاہیر اہلِ علم و ادب و سیاست کی آراء خوبصورت زرّیں کتبات کی شکل میں آویزاں کئے گئے تھے (ان کتبات کے فوٹو اس کتاب کے سادہ صفحات پر طبع کئے جا رہے ہیں) خود ان کی آرا و افکار کے نمائندہ اقتباسات کثیر تعداد میں جاذب نظر تھے، اور بعض یادگار تصاویر سے بھی نمائش کی سجاوٹ میں اضافہ کیا گیا تھا۔

ایک خصوصی شعری نشست بھی ترتیب دی گئی تھی جس میں بھوپال کے شعراء نے زیر صدارت قاضی شہر مولانا سیّد عابد علی وجدی الحسینی، علامہ مرحوم کی خدمت میں پرخلوص خراج عقیدت جس والہانہ انداز سے پیش کیا اس کی یاد بھی مدتوں باقی رہے گی۔ اس نشست کی کارروائی ”منظوم نذرانۂ عقیدت بیادِ علامہ سید سلیمان ندوی“ دار العلوم تاج المساجد بھوپال کی طرف سے نومبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔

ان صدسالہ تقریبات پیدائش کے موقع پر قابل ذکر بات یہ رہی کہ ”سلیمانیات“ سے دلچسپی رکھنے والے مقالہ نگار حضرات کی نظر زیادہ تر علوم و فنون سلیمانی کے متنوع گوشوں پر مرکوز رہی۔ اس رجحان کو عام کرنا، ترقی دینا اور دیگر اہم شخصیات پر آزمانے کی ضرورت ہے کہ ہر قابل ذکر شخصیت کا اس کے میدان اختصاص میں حصہ ابھر کر سامنے آئے جس سے ملک و ملت کی علمی فکری ادبی تاریخ کے ارتقاء کو سمجھنے اور مرتب کرنے میں سہولت ہو۔

زیر نظر کتاب اسی ”بزم سلیمانی“ کے لئے پچاس مقالات میں سے سینتالیس مقالات کا مجموعہ ہے۔ تین مقالات نظر ثانی کے بعد واپس نہ مل سکے جن کی عدم اشاعت کا افسوس ہے۔ اکثر مقالات علوم و فنون سلیمان کے متنوع گوشوں کو اجاگر کرنے اور مؤلفات سلیمانی کے تعارف پر مشتمل تھے، اس لئے اس کتاب کا نام ”مطالعۂ سلیمانی“ تجویز ہوا، اور رہنما خطبات و مقالات کے بعد علوم و فنون سلیمانی اس کا بنیادی باب قرار پایا جس کو ذیلی عنوانات ”قرآنیات“، فقہیات، تاریخ نگاری، تحقیق و تنقید، لسانیات، تہذیب و تمدن، ادب و شاعری، صحافت اور طب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تیسرا باب مؤلفات سلیمانی: تعارف و تبصرہ میں اردو و عربی نگارشات پر مقالات کو الگ الگ پیش کیا گیا ہے، چوتھا باب ملی سیاسیات سے متعلق ہے، پانچواں باب وسیع موضوع سیرت و شخصیت کے تحت

سلوک و معرفت، دارالاقبال بھوپال میں (سید الملت کا قیام) بارگاہ سلیمانی میں (متوسلین کے تاثرات) اور معاصرین سے روابط کے ذیلی عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے، قارئین کی دلچسپی کے لئے مقالات کے بعد مباحثات بزم کو بھی شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے، ریکارڈ کے لئے اختتامی تقریب میں پیش کردہ رپورٹ ناظم بزم اختتامی تاثرات صدر بزم، اور شکریہ داعیٔ بزم شامل کر لیا گیا ہے، آخر میں ہند و پاک میں منعقدہ تقریباتِ صد سالہ یوم پیدائش علامہ سید سلیمان ندوی کے موقع پر پیش کردہ مقالات کا جامع اشاریہ سلیمانیات پر کام کرنے والوں کے فائدہ کے پیش نظر دیا جا رہا ہے۔

اختصار کی خاطر مقالات کے عناوین میں معمولی رد و بدل سے کام لیا گیا ہے اور اصلی عناوین مباحثاتِ بزم اور کارگذاریٔ بزم میں ریکارڈ کے لئے برقرار رکھے گئے ہیں۔ مبسوط مقالات میں طوالت کے بہانے بے جا چھیڑ چھاڑ سے کام نہیں لیا گیا ہے لیکن اختیار کردہ موضوع کے دائرے سے خروج پر مرتب کے حقوق کا فیاضی سے استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیشگی معذرت خواہ ہے۔ مباحثاتِ بزم کو قید تحریر میں لاتے وقت اندازہ ہوا کہ بعض مقالہ نگاروں کا تعارف نشست کے صدر یا معتمد نے بہت مفصل، بعض کا بہت مختصر اور اکثر کا بالکل نہیں کرایا، اس لئے تعارف کے حصّہ کو بالکل خارج کرنا پڑا اور اب یہ کام ہر ایک مقالہ نگار کی تحریر خود انجام دے گی۔ ویسے ہر مقالہ نگار کی اس کے ادارے کی طرف نسبت اور پتہ مقالہ کے ابتدائی صفحہ کی آخری سطر میں موجود ہے۔ مباحثات میں تکرار کو حذف کرنا، طویل جملہائے معترضہ کو حدود میں رکھنا، نامکمل جملوں کی تکمیل اور علی العموم زبانی بات کو تحریری شکل میں پیش کرنے کی نازک ذمّہ داری مرتب کے ضعیف شانوں پر ہے، گرچہ اس نے کوشش کی ہے کہ متکلم کے الفاظ و تعبیرات کو تا حد امکان باقی رکھا جائے، تاہم مباحثہ میں شریک کسی شخص کو تعبیر کی غلطی یا ترجمانی میں کوتاہی کی شکایت ہو تو اس کی تلافی کی ممکن صورت یہ ہے کہ نومبر ۱۹۸۶ء تک مطلع فرما دیا جائے تا کہ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے ترجمان پندرہ روزہ "نشان منزل" بھوپال کے سالانہ خصوصی شمارہ جنوری ۱۹۸۷ء میں اس کی تصحیح شائع کی جا سکے۔

کم وقت میں جتنی عجلت کے ساتھ "بزم سلیمان" کا انعقاد بھوپال میں عمل میں آیا تھا اسی مستعدی کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت بھی پیش نظر تھی، لیکن اُردو مطبوعات کی نشر و اشاعت کاتبوں کے اخلاص اور مستعدی پر موقوف ہے جس کی زندہ مثال یہ کتاب ہے جو بھوپال، رامپور، علی گڑھ کے کئی کاتبوں کے ہاتھ بدلتے ہوئے آخر جناب منّے خان سہسوانی کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچی جنھوں نے اس کے ۳۲۰ صفحات لکھے، جناب وکیل احمد بستوی نے اگرچہ چند صفحات کی کتابت کی لیکن ان کی یادگار اس کتاب کا سرورق ہے، اس لئے ان دونوں کا شکریہ واجب ہے۔

عم محترم مولانا محمد عمران خان صاحب مدظلہ العالی کی ذاتی توجہ اگر شامل حال نہ ہوتی تو شاید یہ مجموعۂ مقالات بھی اشاعت سے محروم رہ جاتا، لیکن ان کے پیہم اصرار اور رہبری و رہنمائی کے طفیل یہ کتاب آج آپکے ہاتھوں میں ہے۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، جناب اقبال احمد انصاری، ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی، ڈاکٹر سید محمد ہاشم اس کتاب کی اشاعت میں از اول تا آخر مدد کرتے رہے، میری بیگم صالحہ سلطان تصحیح میں معاونت کرتی رہیں، آخری تصحیح کے موقع پر میزبان بزم جناب سید منظور حسین سروش (نائب امیر دار العلوم تاج المساجد بھوپال) اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا بھی مخلصانہ تعاون حاصل رہا۔ میرے شعبہ کے ساتھی جناب محمد توصیف (کارٹوگرافر نے بیشتر انگریزی ٹائیٹل لکھے، ان سب کی خدمت میں رسمی شکریہ کے بجائے نیک تمنائیں اور مخلصانہ دعائیں پیش ہیں۔

آخر میں بارگاہِ خداوندی میں التجا ہے کہ یہ کتاب جس جذبہ احسان مندی اور ممنونیت کے ساتھ منتظمین دار العلوم تاج المساجد بھوپال نے شائع کرنے کی نیت کی ہے اس کو نافع بنائے اور قبولِ عام بخشے۔ ○

مسعود الحسن

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ / یکم جون ۱۹۸۶ء

عرفان منزل، کامدار لین
مسجد شکور خاں روڈ۔ بھوپال

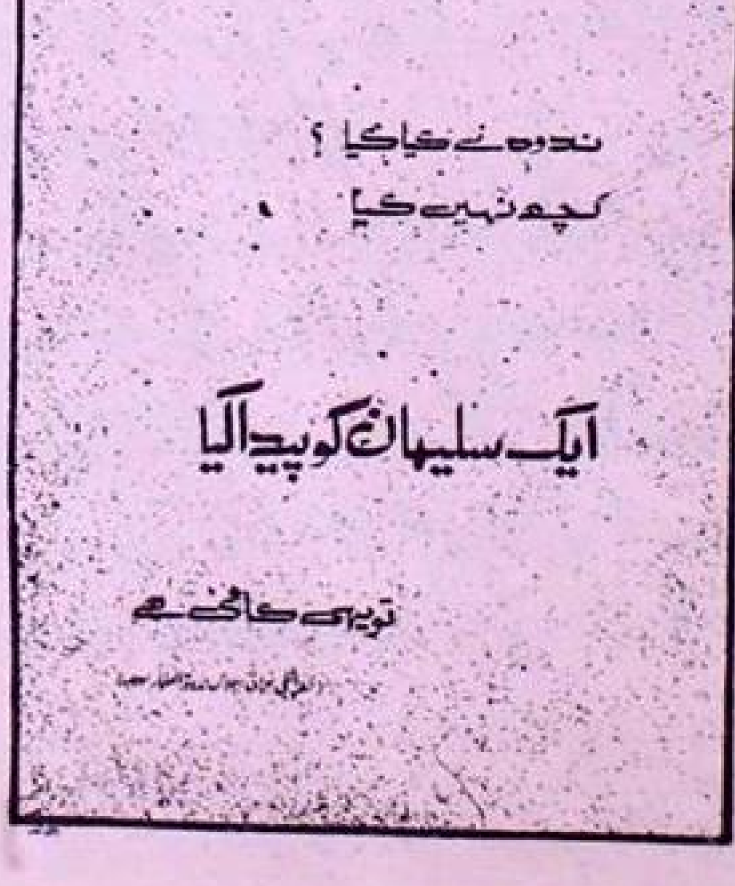

ندوہ نے کیا کیا؟
کچھ نہیں کیا
ایک سلیمانؒ کو پیدا کیا
تو یہی کافی ہے

اقبال احمد انصاری★

رُوداد بزم

دار العلوم تاج المساجد بھوپال کے زیر اہتمام منعقدہ "بزم سلیمان" بتاریخ ۴ تا ۶ ستمبر ۱۹۸۵ء کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے ایک منفرد علمی اجتماع تھا جس نے ملک کے دینی مدارس، عصری دانشگاہوں اور تحقیقی و تصنیفی اداروں کے ممتاز علمار و فضلاء اور اہل فکر ونظر کو ایک جگہ جمع ہونے کا ایسا موقع عطا کیا جو شاذونادر ہی میسر آتا ہے۔ دار المصنفین اعظم گڑھ، دار العلوم ندوۃ العلمار لکھنؤ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی اور دیگر تعلیم گاہوں سے ممتاز مندوبین شریک بزم ہوئے۔ عالم اسلام کے ممتاز عالم دین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حکومت مصر کے سفیر متعینہ ہند سعادت مآب عمرو موسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر عالی جناب سید ہاشم علی کی شرکت سے یہ موقر بزم متنوع اور مختلف الجہات بن گئی۔ سید صاحب کے قائم کردہ ادارہ کے موجودہ ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن اپنے کلیدی مقالہ اور مختلف نشستوں میں اپنی آرار و تعلیقات سے سید صاحب کے علمی فیض کے جاری رہنے کا احساس دلاتے رہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے جن کو سید صاحب اور ان کے ادارہ سے خاص نسبت حاصل رہی ہے، اپنی شرکت اور مقالہ سے بزم کا علمی مرتبہ بلند کیا، داعئ بزم مولانا محمد عمران خان ندوی ازہری نے جو اپنی پیرانہ سالی اور خرابی صحت کے باوجود عزم و حوصلہ اور بلند ہمتی و پرسوزی کا مجسمہ نظر آتے تھے ایک جامع خطبۂ استقبالیہ سے ملکی مندوبین کا اردو میں اور سعادت مآب سفیر مصر کا عربی میں خیر مقدم کیا۔

افتتاحی جلسہ تاج المساجد بھوپال کے بلند و بالا مناروں کے زیر سایہ سلیقہ سے مزین ایک بڑے شامیانہ میں منعقد ہوا، مہمان خصوصی سعادت مآب سفیر مصر کی رعایت سے افتتاحی جلسہ کی کارروائی عربی اور اردو دونوں زبانوں میں مولانا حبیب ریحان خان ندوی اور ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خان ندوی نے بہت خوبی بلکہ اہل زبان جیسی قادر الکلامی اور لب و لہجہ میں انجام دی، موضوع بزم کی مناسبت سے جلسہ کا آغاز دار العلوم کے ایک کمسن طالب علم محمد خالد نے قرآنی آیات کریمہ **ولقد اٰتینا داؤد و سلیمان علما** الخ (النمل ۱۵-۱۶)

★ معتمد مجلس روداد، دیگر اراکین: ضیاء الدین اصلاحی، عبداللطیف اعظمی، نثار احمد فاروقی، روداد نگار: سید شرافت علی ندوی، محمد فضل الرحمٰن ندوی، حمید اللہ ندوی، محسن عثمانی ندوی، عبدالنور ندوی، شفیق احمد ندوی، محمد عمیر الصدیق ندوی۔

کی خوش الحان تلاوت سے کیا، ایک اور طالب علم محمد ارشد نے ان آیات کا اردو ترجمہ پیش کیا، اسکے بعد جناب عبدالرزاق متعلم شعبہ عربی نے سید صاحب کی مشہور نعت ترنم سے پڑھی جس کا مطلع یہ ہے ؏

آدم کے لیے فخر یہ عالی نسبی ہے
مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے

داعیٔ بزم جناب مولانا محمد عمران خان صاحب امیر دار العلوم تاج المساجد بھوپال نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں سید صاحب سے اپنے ذاتی تعلق و نسبت اور بھوپال سے ان کے ربط و وابستگی کے علاوہ یہ بھی ذکر کیا کہ جس دار العلوم کو آج اس بزم کے انتظام کا شرف حاصل ہوا ہے سنہ ۱۹۴۹ء میں اس کا افتتاح علامہ مرحوم ہی کے مبارک ہاتھوں سے ہوا تھا، مولانا کے خطبہ کے آخری حصہ کے مخاطب مہمان خصوصی سفیر مصر تھے، اس لیے ان کو عربی میں مخاطب کرتے ہوئے دار العلوم اور جامعۃ الازہر کے درمیان علمی روابط و تعاون کا ذکر کیا اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مصر کے قدیم تاریخی کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اہل مصر کو ان کے اصلی منصب دعوت کی طرف مخلصانہ توجہ دلائی۔ انھوں نے فرمایا کہ "اسلامی عہد کی علمی فکری و دینی ادبی ترقی اس درجہ عظیم ہے کہ قدیم مصری تہذیب کی عظمت اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔ یقیناً عمرو بن العاص ملک مینا سے افضل تھے، اور دار الکتب المصریہ معبد کرنک سے زیادہ اہم و مفید ہے، اور بلاشبہ جامعۂ ازہر، اہرام مصر سے زیادہ بلند و پائیدار ہے۔"

بزم کا افتتاح کرتے ہوئے عالی جناب سید ہاشم علی صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے سامعین کو مسلم یونیورسٹی اور مسلمانانِ ہند کو درپیش مسائل کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ مولانا سید سلیمان ندوی متبحر عالم کے علمی کارناموں کا جائزہ لینے کے ساتھ ہم کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر وہ آج ہمارے درمیان ہوتے تو ہماری کیا رہنمائی فرماتے؟

سعادت مآب سفیر مصر نے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں یہاں صرف حکومت مصری کا نہیں بلکہ جامعۃ الازہر کا بھی نمائندہ ہوں، ہندوستانی اور بھوپالی ازہریوں سے یہاں مل کر ازہر کے پیغام اور اس کی تعلیم کی افادیت پر میرا یقین مزید مستحکم ہوا ہے، خطبۂ استقبالیہ کی دلنشیں خوبصورت ادبی تعبیرات و تلمیحات جیسے ارض کنانہ سے متعلق مولانا کے الفاظ" کہ وہ دنیا میں تہذیب انسانی کا پہلا گہوارہ ہے جہاں عصائے کلیمی نے ہمیشہ باطل کو سرنگوں کیا اور حق کا پرچم لہرایا، جہاں "ید بیضا" نے ہمیشہ تیرگیوں کا پردہ چاک کیا اور اپنی ضیاپاشیوں سے معمورۂ ہستی کو سراپا نور بنا دیا، جہاں جلوۂ حسن یوسفی کی تب و تاب عفت و طہارت کی برق پاشیوں کے ساتھ نمودار ہوئی، جہاں نور الٰہی کا پرتو پیغام محمدی کی شکل میں توحید کا پرچم لہرانے، شرک کی ظلمتوں کو مٹانے، ظلم و کفر و فسق کی بادشاہتوں کو اجاڑنے اور مظلوم و محروم عوام کی دادرسی کیلئے نمودار ہوا"

کو دہراتے ہوئے انھوں نے مولانا کے شاندار عربی اسلوب، شستہ وشائستہ دھلی نکھری ہوئی زبان اور فصیح و بلیغ انداز بیان کی پر جوش داد دیتے ہوئے کہا کہ "یہ تمام گرانقدر پر مغز خیالات میرے دل میں اترتے چلے گئے، کیونکہ ان میں دلنشیں اور خوبصورت زبان وبیان کے ساتھ معانی کی گہرائی، گیرائی اور بلندی بھی تھی، جو کہنے والے کے علم ومعرفت سے معمور سینہ کے ساتھ اس کی زبان دانی ہی نہیں بلکہ ہمزبانی کی بھی دلیل ہے"۔ مولانا کے خطبہ پر ایک اہل زبان کے یہ بے لاگ تاثرات حقیقتاً ہم سب ہندیوں کے لئے باعثِ افتخار ہیں۔ البتہ انھوں نے خطبۂ استقبالیہ میں مذکور قبل اسلام اور بعد اسلام مصر کی تاریخ میں ترجیحی موازنہ سے اختلاف کرتے ہوئے اس کے تخیلی رُخ پر زور دیا اور کہا کہ "اگر ملک مینا نے مصر کو متحد نہ کیا ہوتا تو عمرو بن العاصؓ کے ہاتھوں منقسم مصر کا کوئی ایک حصہ ہی فتح ہوتا۔ اسی طرح ایک کتب خانہ اور عبادتگاہ یا ایک تعلیم گاہ اور مقبرہ کے درمیان موازنہ کیسے ممکن ہے؟ اہرام مصر تو عظمتِ رفتہ کی شاندار تاریخی یادگار ہیں، جبکہ ازہر ایک ایسا منارۂ انوار ہے جس کے ذرہ ذرہ میں مصر کے تابناک مستقبل کی چمک ودمک پوشیدہ ہے"۔ عصر حاضر کے تقاضوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے جدید علوم سے استفادہ پر بھی زور دیا اور اسلامی تہذیب وثقافت کی نشر واشاعت میں سید صاحب کے علمی وفکری کارناموں کو ایک اہم ملی سرمایہ قرار دیا۔ آخر میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ دار العلوم بھوپال جیسے مرکزی ادارہ میں علماء اور فضلاء کے ایسے نادر اجتماع کے موقع پر ان کا اتنے کم وقت کے لئے آنا ہوا۔ سفیر صاحب کو اسی دن سہ پہر دہلی واپس جانا تھا۔

ناظم دار المصنفین جناب سید صباح الدین صاحب نے اس بزم کے انعقاد پر مولانا محمد عمران خان صاحب کو مبارکباد دی اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "اس سرزمین میں آکر خاکسار پر شکرگذاری کے جذبہ کی کیفیت اس لئے طاری ہے کہ یہاں کے سابق حکمراں خاندان کی فیاضی اور کرم گستری دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کی تاسیس اور فروغ میں معاون ہوئی، جس کے بانی ناظم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ تھے۔

پھر یہیں ان کے بڑے بھائی کو مجددیہ سلسلہ کے فیوض وبرکات حاصل ہوئے، اور یہیں خود ان کی زندگی کے کچھ آخری ایام گذرے، اور اب یہیں ان کے محبوب شاگرد اور اسی تعلق سے میرے برادر عزیز مولانا محمد عمران خان ندوی ازہری اس شاندار اجتماع میں ان کی یادوں کی قندیل فروزاں کر رہے ہیں"۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے انھوں نے اپنا مطبوعہ کلیدی مقالہ آئندہ نشست میں پیش کرنے کا وعدہ فرمایا۔

صدر بزم جناب مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب نے اپنے فکر انگیز خطبۂ صدارت میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت اور علمی کارناموں کے مرکزی نقطہ کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح نمایاں کیا کہ ان کے تاریخ وسیرت نگاری کے مقام ومرتبہ کا تعین معرکۂ مذہب وسائنس، مغربی ذہنی وفکری استیلاء اور جدید علم کلام کے

تناظر میں صحیح نہج پر ہو سکے۔ انھوں نے فرمایا کہ "سید صاحب اپنے عہد کے ہی ممتاز ترین سیرت نگار نبویؐ نہ تھے، وہ تاریخ اسلام کے ان ممتاز ترین سیرت نگاروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں جن کے بغیر پچھلے زمانہ میں سیرت کے موضوع پر تصنیف و تالیف کا فرض انجام نہیں دیا جا سکتا تھا، وہ اس امتیاز میں بھی منفرد ہیں کہ انھوں نے سیرت کا دائرہ صاحب سیرت کی سوانح حالات و واقعات اور اخلاق و عادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدی، تعلیمات نبویؐ اور شریعت اسلام کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا، انھوں نے بعثت محمدیؐ اور سیرت نبویؐ کی ہر عہد میں انسانی سعادت کے لئے بے خطا رہبری و رہنمائی کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے پیشوایان مذاہب کی سیرت و تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا ایسا اہتمام کیا کہ ان کی سیرت النبیؐ ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لئے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ اور ذات نبویؐ سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی اور اب وہ سیرت کا ایک ایسا انسائیکلوپیڈیا ہے جس کی نظیر دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔" مولانا نے مزید فرمایا کہ "انھوں نے سیرت و تاریخ سے ایک ایسے علم کلام کا کام لیا جو تاریخی حقایق و واقعات پر مبنی ہونے، عملی زندگی سے تعلق رکھنے، فطرت انسانی کو اپیل کرنے اور عقل کے ساتھ قلب کو بھی متاثر کرنے کی بنا پر قدیم علم کلام سے زیادہ مؤثر، عام فہم اور مفید بن گیا، اور جس کی افادیت و تازگی میں خاتم النبیینؐ کی زندگی اور تعلیمات سے مربوط ہونے کی وجہ سے پیشنگوئی کی جا سکتی ہے کہ کوئی بڑا فرق نہیں آئے گا۔" خطبات مدراس کو سیرت کے کتب خانہ کا عطر قرار دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ "تاریخی حقائق تقابلی مطالعہ، نفسیاتی تجزیہ، علم الاخلاق، علم الاجتماع اور پھر ادبیت و خطیبانہ انشاء پردازی کی آمیزش سے اس کی افادیت اور علمی قدر و قیمت میں ایسا اضافہ ہوا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں اور سلیم الطبع حق کے جویا غیر مسلموں کو دینے کے لئے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں۔" مولانا نے سید صاحب کی مہارت کا اصل موضوع علوم قرآنیہ کو قرار دیتے ہوئے علم کلام و عقائد پر ان کی گہری نظر کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ "ان کو عصر حاضر کے ذہن و روح کے مطابق سلف کے اصول اور کتاب و سنت کی روشنی میں علم کلام کو پیش کرنے کا خاص ملکہ تھا" جو سیرۃ النبیؐ جلد چہارم و پنجم میں تفصیل کے ساتھ اور رسالہ اہل سنت والجماعت میں اجمال کے ساتھ صاف نظر آتا ہے، ان کی تصنیفات "خیام"، "عرب و ہند کے تعلقات"، "عربوں کی جہاز رانی" کو علمی تحقیق، وسعت مطالعہ، دقت نظر، قوت محاکمہ تقابلی مطالعہ اور علمی تلاش میں صبر و تحمل کا اعلیٰ نمونہ قرار دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ یہ تصنیفات بڑے سے بڑے مصنف و محقق کی ساری عمر کی کمائی اور سرمایۂ افتخار بن سکتی ہیں۔" "ارض القرآن" جو ان کی ابتدائی عہد کی تصنیف ہے کو "ابھی تک اردو میں آخری چیز اور اپنے موضوع پر سب سے بڑا ماخذ" قرار دیتے ہوئے کہا کہ "مشرق میں ایک آدمی اکثر وہ کام کرتا ہے جو مغرب میں اکیڈمی کرتی ہے۔" ان کی جامعیت اور ملکی زبان و ادب میں انکے استادانہ ملکہ و قائدانہ

کردار کو نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی "زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو طبقۂ علماء میں ان کی جامعیت اور علوم و فنون کا تنوع ہے"، ان کی ذات اور ان کی زندگی میں قدیم و جدید واقفیت، علمی تبحر، ادبی ذوق، نقاد و مورخ کی حقیقت پسندی و سنجیدگی، ادباء و انشاء پردازوں کی شگفتگی و حلاوت، فکر و نظر کا لوچ و مطالعہ کی وسعت اس طرح جمع ہو گئی تھی جو بیک وقت شاذ و نادر جمع ہوتی ہے"۔ ان کے "ضمیر میں عقل و عشق، قدیم و جدید، مشرق و مغرب اور دین و فلسفہ کے معرکہ" کو امام غزالی کی کہانی اور واردات قلبی کے مشابہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ "ان کو بھی علم و شہرت کے بام عروج پر پہنچنے کے بعد اپنی علمی زندگی اور ذہنی کد و کاوش سراب نظر آنے لگی، وہ بھی علم و یقین کے چشمۂ حیوان کی تلاش میں نکلے اور سیراب و کامیاب واپس آئے"۔ اور "جس طرح ان کو علم و ادب کی وادی کو کامیابی و فتحمندی کے ساتھ طے کرنے کے لئے علامہ شبلیؒ جیسا خضر طریق ملا تھا، احسان و تزکیہ کی وادی کو سر کرنے کے لئے خضر راہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شکل میں مل گیا، چونکہ عراقی کی طرح ان کا باطن اس حرارت و حلاوت کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار تھا، اس لئے انہوں نے برسوں کی راہ مہینوں میں اور مہینوں کی راہ ہفتوں اور دنوں میں طے کی، اور شیخ وقت کے اعتماد و استناد سے بہت جلد سرفراز ہو کر ان کے خلیفہ مجاز ہوئے"۔ یورپ میں علم و مذہب کی خونریز کشمکش جس نے وہاں قرون مظلمہ کو جنم دیا کا ذکر کرتے ہوئے صدر بزم نے فرمایا کہ "ملت اسلامیہ کی تاریخ میں علماء راسخین اور کتاب و سنت کے حاملین و شارحین اور نئے زمانہ اور نئی نسل کے درمیان بیگانگی کا وقفہ کبھی اتنا طویل نہ ہونے پایا کہ علم و مذہب کے درمیان خوں ریز کشمکش اور تحقیقی عدالتوں کے قیام کی نوبت آگئے"۔ بلکہ نئے تقاضوں کے مطابق ہر زمانہ میں اشعری، غزالی، باقلانی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ جیسے علماء نے "قرآن و سیرت، عقائد اسلامیہ اور تعلیمات نبوی نئی زبان، نئے زور قلم، جدید استدلال، عصری فلسفوں، تاریخ و ادب سے واقفیت اور تقابلی مطالعہ" کی روشنی میں اس ضرورت کو پورا کیا۔ مولانا نے سید صاحب کی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ انھوں نے بھی اپنے زمانہ میں اس حقیقت و ضرورت کو محسوس کیا اور اپنی تحریروں میں اس کا لحاظ رکھتے ہوئے اس فرض اور علماء کے ذمہ قرض سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے، یہی وہ خصوصیت ہے جو ان کو اس عہد کے متکلمین اسلام اور نئی نسل کے معلمین و محسنین میں شامل کرتی ہے، اور اس کے بغیر ان کی بلندی کا اندازہ اور اس یادگاری جلسہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا"۔ آخر میں مولانا نے اس جلسہ کے بھوپال میں انعقاد کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس ریاست سے جو کبھی شیراز زمین کی ہمسری کر چکی تھی، شبلیؒ و سلیمانؒ کے تعلقات کا ذکر کیا اور اس اجلاس کے انعقاد کو بھوپال میں موجود فضلاء ندوہ کی ایک وفا شعار بڑی جماعت کے جذبۂ تشکر و احساس شناسی کا نتیجہ و مظہر قرار دیا۔

میزبان بزم جناب سید منظور حسین صاحب سروش نائب امیر دار العلوم تاج المساجد بھوپال نے معزز حاضرین و مندوبین کا مخلصانہ شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ "اپنے محدود وسائل کے ذریعہ ہم نے طبقۂ علماء پر سید صاحبؒ کے قرض کو فرض کفایہ کے طور پر ادا کرنے کی کوشش کی ہے، امید ہے کہ مندوبین و شرکاء اجلاس کے عملی تعاون سے آئندہ تین دنوں میں یہ فرض کما حقہ ادا ہو سکے گا" اور بزم کامیاب ہوگی۔"

کیونکہ سفیر مصر اسی دن عصر سے پہلے ہی واپس جانا چاہتے تھے اس لئے انجمن طلباء دار العلوم کی طرف سے ان کو عربی میں خیر مقدمی سپاسنامہ اسی تقریب میں عبد الرزاق صاحب ناظم انجمن نے پیش کیا، جس میں ایک نئے مصری استاد کی ضرورت کا مطالبہ بھی شامل تھا جس کو سفیر صاحب نے فراخیٔ دل کے ساتھ قبول کیا۔ اس طرح یہ باوقار تقریب ترانۂ دار العلوم پر ختم ہوئی جو متعدد طلباء نے مل کر پیش کیا تھا۔

اس مبارک موقع پر ایک شاندار نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جس میں سید صاحبؒ کی تصانیف، مقالات، مکاتیب، اور چند تصاویر کو جمع کیا گیا تھا، اسی طرح سید صاحب پر اب تک جو کام دیگر لوگوں نے کیا ہے وہ بھی ترتیب سے ایک گوشہ میں موجود تھا، خاص دلچسپی کی چیز سید صاحب کے اقوال زریں اور ان کے بارے میں مشاہیر وقت کی آراء تھیں، جن کو خوبصورت جاذب نظر کتبات کی شکل میں جابجا آویزاں کر کے نمائش کی سجاوٹ کے کام میں لایا گیا تھا، نوادرات میں خاص توجہ کی چیز دار الافتاء اور دار القضاء بھوپال کے وہ فتاوی اور عدالتی فیصلے تھے جن کا تعلق سید صاحب کے قیام بھوپال کے زمانہ سے تھا۔ افتتاحی تقریب کے فوراً بعد اس نمائش کا افتتاح بھوپال کی مشہور خانقاہ مجددیہ کے موجودہ عالم و فاضل سرپرست مولانا محمد سعید صاحب مجددی کے مبارک ہاتھوں سے ہوا، قیام بھوپال کے زمانہ میں سید صاحبؒ کے روابط ان کے والد بزرگوار شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ سے رہ چکے تھے، اور اس سے پہلے سید صاحب کے بڑے بھائی کا بیعت و ارشاد کا تعلق شاہ ابو احمد صاحب مجددیؒ سے تھا۔ یہ خوبصورت نمائش پروفیسر عبد القوی دسنوی کی رہنمائی میں مولانا محمد لقمان خان ندوی ازہری اور جناب سید شرافت علی ندوی کے تعاون سے ترتیب دی گئی تھی۔

پہلے ہی دن بعد نماز عصر مندوبین اجلاس کے اعزاز میں طلباء، دار العلوم کی انجمن نے ایک شاندار استقبالیہ کا اہتمام کیا تھا، جس کی صدارت مولانا ابو بکر حسنی صاحب (سابق استاد جواہر لال نہرو یونیورسٹی) نے فرمائی، وہ اس وقت وہاں موجود ندویوں میں سب سے بزرگ تھے، انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں ظریفانہ چٹکلوں سے مجلس کو زعفران زار بنا دیا۔ ناظم انجمن عبد الرزاق صاحب نے اردو زبان میں ایک خوبصورت مطبوعہ سپاسنامہ پیش کر کے مندوبین کا خیر مقدم کیا جس میں تقسیم ملک کے بعد سے مسلمانوں کے مسائل، موقع پرست قیادت سے بے اطمینانی اور مخلص علماء و اہل فکر و نظر سے نئی نسل کی توقعات کی طرف اشارے کیے گئے تھے۔

اسی شب مابین مغرب و عشار سید صاحبؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک خصوصی شعری نشست بھی ترتیب دی گئی تھی، جس میں بھوپال کے قدیم و جدید شعرا نے قاضی شہر جناب سید عابد علی وجدی الحسینی کی صدارت اور جناب اختر سعید خاں کی نظامت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا، یہ نشست بھی رسمی انداز کی نہ تھی، بلکہ معیارِ کلام اور سامعین کے ذوق و شوق دونوں اعتبار سے بہت بلند رہی، اور اس میں غزل، رباعی، قطعات، قصیدہ، مثنوی، نظم جیسی متنوع اصناف سخن میں سید صاحب کو شایان شان خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ سید صاحبؒ خود شعر و ادب کا بہت بلند اور صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے، ان کے ایک شعر ؏

زربار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

کو اقبال سے داد مل چکی تھی، ان کی سخن فہمی اور شعری تنقیدی صلاحیت کا اندازہ کلام اقبال پر ان کی تقاریظ و تبصروں سے لگایا جا سکتا ہے، اس مناسبت سے اس شعری نشست کا اہتمام بھی سہ روزہ بزم کا ضروری حصہ بن گیا جس کے انتظام میں منصور نعمانی ندوی نے پروفیسر عبد القوی دسنوی کی رہنمائی میں نمایاں حصہ لیا۔

مقالات کی نشستوں کا آغاز ۴؍ ستمبر ۱۹۸۵ء بعد ظہر ہوا، اور ۵، ۶؍ ستمبر کو صبح و بعد ظہر دو دو نشستیں ہوئیں اس طرح پانچ نشستوں میں کل تیس مقالات پیش ہوئے، ابتدا میں کافی وقت مباحثات کی نذر ہوا، باقی بیس مقالات پڑھے نہیں جا سکے لیکن بزم کی کارروائی میں داخل کر لئے گئے۔

مقالات کے موضوعات کا تنوع اور ان کے علمی و تحقیقی معیار کا اندازہ خود قارئین زیر نظر کتاب کے مقالات سے لگا سکتے ہیں، جو بات یہ صفحات ان تک نہ پہنچا سکیں گے وہ یہ ہے کہ تینوں دن ہر نشست میں تمام مندوبین اور مقامی اہلِ فکر و نظر جس مستعدی اور پابندی سے شریک ہوتے رہے اور جس شوق و انہماک سے مقالات سنے اور مباحثات میں حصہ لیا وہ کاروباری یا رسمی قسم کے سیمناروں میں کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ تیسرے دن صبح کی نشست کے فرائض انجام دیتے ہوئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی صاحب کے الفاظ بجا طور پر تمام شرکا کے احساس کی ترجمانی کرتے ہیں:

> "اس بزم علم و ادب کی جو خوبی میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ آج تیسرا دن ہے، ہر روز کثیر تعداد میں علمی مقالے پیش ہو رہے ہیں، مندوبین کی دلچسپی برقرار ہے، سامعین ہمہ تن گوش ہیں، مباحثات تہذیب و شائستگی کا نمونہ ہیں۔"

مقالات ان تمام موضوعات کا احاطہ کرتے تھے جن کا تعلق سید صاحب کے علمی و دینی کارناموں، قومی و ملّی سیاست، شعر و ادب و شخصیت سے ہو سکتا ہے، اگرچہ غالب رجحان ان کے علمی کارناموں کو نمایاں کرنے کی طرف تھا۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا خطبۂ صدارت، جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا کلیدی مقالہ، پروفیسر خلیق احمد نظامی

کا فاضلانہ رہنما مقالہ کسی ایک پہلو کے بجائے ان کے پورے علمی کارناموں کا بصیرت افروز جائزہ پیش کرتے تھے۔ صباح الدین صاحب نے ان کی حیات و کارناموں کا ایک موثر اور جامع تعارف پیش کیا ہے، نظامی صاحب نے ان کے علمی کاموں کے محرکات، ماحول و مؤثرات کے علاوہ طریقۂ تحقیق و نقد، مآخذ سے استفادہ وغیرہ کے ساتھ ان کی شخصیت و مزاج کے خمیر و سانچہ کا ذکر بہت خوبی سے کیا، اور بعض نئی سمتوں کی طرف اشارے کیے، جو پوری توجہ کے مستحق ہیں، مثلاً "عرب و ہند کے تعلقات" میں اسلامی فتوحات سے قبل مسلمانوں کی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں موجودگی، ہندوؤں کے مشابہ اہل کتاب ہونے کے بارے میں عرب فاتحین کا خیال اور بعض سلیمانی تصنیفات میں ارضی سیاست سے متعلق دلچسپ اشارات کو موجودہ زمانہ کے فن سیاست ارضی کے مطالعہ کے پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت وغیرہ۔

بزم میں پڑھے گئے باقی مقالات میں سے تین قرآنیات، دو فقہیات، ایک تاریخ نگاری، تین تحقیق و تنقید، دو لسانیات، ایک تہذیب و تمدن اور تین ادب و شاعری سے متعلق تھے، نگارشات سلیمانی کے تعارف و تبصرہ سے متعلق پانچ مضامین تھے، ان کے علاوہ ملی سیاسیات پر چار، اور سید صاحب ایک تحریک، قیام بھوپال معاصرین سے ربط اور ذاتی تاثرات پر ایک ایک مقالہ پیش ہوا۔

بزم کے بعض مقالات و مباحثات میں سید صاحب کے اصول نقد و جرح، مآخذ سے استفادہ، افکار و آرا اور عقاید و مسلک زیر بحث آئے، ان کا اپنے استاد علامہ شبلی سے بعض مسائل میں اختلاف اور خود اپنی بعض آرا، ابدیت نار، زیوروں پر عدم زکوٰۃ اور تصویر کے جواز سے رجوع وغیرہ پر بھی گفتگو ہوئی، ان کا اقبال سے تعلق کئی نہج سے بار بار زیر بحث آیا، خاص کر اقبال کی آرا و افکار پر سید صاحب کے گہرے اثرات، تصوف کے بارے میں دونوں کے خیالات طویل گفتگو کا موضوع بنے۔ ایک نکتہ یہ بھی اٹھایا گیا کہ سید صاحب نے اقبال کی حیات میں ان کی عظمت کا اعتراف علانیہ "معارف" کے شذرات اور دیگر تحریروں میں کیا، جبکہ اقبال نے سید صاحبؒ کے علم و فضل کا اعتراف صرف نجی خطوط میں کیا، جواب دیا گیا کہ اقبال کسی رسالہ کے مدیر نہ تھے کہ ان کو اس کا موقع ملتا، نیز سید صاحب کی حیات میں ان پر مرثیہ وغیرہ لکھنے کا بھی جواز نہ تھا۔ "خطبات احمدیہ" میں سرسید کے نتائج تحقیق سے سید صاحب کے استفادہ کی بات آئی، جواب دیا گیا کہ "تاریخ ارض القرآن" میں محدود پیمانہ پر کچھ اثرات تلاش کیے جا سکتے ہیں زیادہ نہیں، ایک دلچسپ سوال یہ اٹھا کہ سید صاحب کے خیال میں حکومت کا قیام فرائض نبوت میں ہے کہ نہیں، جواب نفی میں دیا گیا کیونکہ فرائض نبوت میں عقائد و ایمان کی درستگی کو اولیں اہمیت حاصل ہے جس کے نتیجہ میں سماجی انقلاب اور نظام حکومت خود قائم ہوتا ہے، اس سلسلہ میں سید صاحبؒ اور مولانا مودودیؒ کے نقطۂ نظر کے اختلاف کا ذکر بھی آیا۔ امارت شرعیہ کے قیام کی ضرورت جس کو سید صاحبؒ نے

شدت سے محسوس کیا تھا تمام حاضرین کی توجہ کا خصوصی مرکز بنی، اور اس بارے میں ایک قرارداد بھی منظور کی گئی۔ سید صاحب کے خطوط اور ان کے نام دیگر مشاہیر کے مکاتیب کی اشاعت کا مسئلہ شدت سے موضوع بحث بنا، جس کے دارالمصنفین کے ذمہ داران مخالف ہیں۔ نجی خطوط کی علمی افادیت اور ان کی اشاعت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، لیکن جیسے علمی ادبی خطوط اقبالؔ کو لکھے گئے ہیں، ان کی اشاعت بہرحال ایک اہم خدمت ہے۔

ایک امر کی وضاحت ناظم دارالمصنفین بار بار کرتے رہے کہ شبلیؔ و سلیمانؔ تاریخ اور شعر و ادب کو اپنے علمی دسترخوان کی چٹنی تصور کرتے تھے جو ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی کبھی کھائی جاتی ہے، راقم کے خیال میں اس بات کا ان الفاظ میں اتنی شد و مد سے اصول کے طور پر بار بار اعادہ غیر موزوں ہے، جس سے شبلی و سلیمان شناسی میں نہ کوئی مدد ملتی ہے اور نہ ان کا علمی وقار بلند ہوتا ہے، بلکہ بعض نگاہوں میں ان کے علمی کارناموں کا وزن ہلکا ہو سکتا ہے، ویسے چٹنی کا لفظ بھی ذوق پر گراں گزرتا ہے۔

آخری دن ۷ر نومبر کو ۴ بجے سہ پہر اختتامی تقریب مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی کی صدارت میں منعقد ہوئی، سب سے پہلے جب ڈاکٹر مسعود الرحمن خان ندوی ناظم بزم اپنی رپورٹ پڑھنے کھڑے ہوئے تو تمام سرکار و حاضرین کو احساس تھا کہ داعیٔ بزم کے عزم و حوصلہ کے بعد بزم کی کامیابی میں ان کی مساعی و سلیقہ کا بڑا دخل ہے، یہ ضرور ہے کہ ان کو ہر شعبہ میں اچھے معاون کارکن ملے جن کے تعاون سے سب کام خوش اسلوبی سے انجام پاتے رہے، تنگ وقت میں پچاس مقالات کا تیار ہو جانا خود ایک غیر معمولی بات تھی، ناظم بزم نے بجا طور پر اپنے رفقاء کا نام بنام شکریہ ادا کیا، نیز تمام مندوبین کی شرکت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے "ندوہ"، "دارالمصنفین" اور "مسلم یونیورسٹی" کے سربراہوں کا خصوصی شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے نہ صرف بذات خود شرکت فرمائی بلکہ اپنے اپنے اداروں کے بڑے وفود بھیج کر بزم کی رونق اور معنوی افادیت میں اضافہ فرمایا۔

اس کے بعد سید صاحب کے صاحبزادہ ڈاکٹر سید سلمان ندوی (مقیم ڈربن۔ جنوبی افریقہ) کا مکتوب بنام داعیٔ بزم پڑھ کر سنایا گیا جس میں انھوں نے وقت کی تنگی کے باعث سفر کے انتظامات مکمل نہ ہونے کی وجہ سے بزم میں عدم شرکت پر افسوس و معذرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کے والد بزرگوار کی "صد سالہ تقریبات ولادت کے سلسلہ میں ہندوستان کے علمی مذاکرے پاکستان سے سبقت لے گئے، اور اب تاج المساجد کے زیر اہتمام اس مذاکرے نے ان تقریبات کا وقار اور بھی بڑھا دیا"۔

پھر مجلس روداد کی طرف سے پیش کردہ متفقہ تجاویز برائے منظوری کھلے اجلاس میں پڑھ کر سنائی گئیں جو کچھ بحث مباحثہ کے بعد منظور ہوئیں، جن میں سے دو تجاویز کا تعلق براہ راست دارالعلوم بھوپال سے تھا، اطمینان کی بات ہے کہ اس نے تجویز ۱۲ کے مطابق "کتب خانہ سلیمانیہ" کا قیام اور تجویز ۲ کے مطابق

"مقالات بزم سلیمان" کی اشاعت کا کام انجام دیدیا ہے، تجویز ۱۳ کے مطابق اتر پردیش سے ضلعی امارات شرعیہ کے قیام کا کچھ کام شروع ہو چکا ہے۔ تجویز ۲ کے مطابق ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ کی حیثیت سے سید صاحب کے فتاوی اور عدالتی فیصلوں کی تدوین و تحقیق کا کام دار العلوم بھوپال، ندوہ اور دار المصنفین کے تعاون سے ہونا باقی ہے۔ دیگر قابل توجہ اہم تجاویز کا تعلق دیگر اداروں سے ہے جیسے مسلم یونیورسٹی سے التماس کہ وہ ندوہ اور دار المصنفین کے تعاون سے بی۔ اے تک مختلف تعلیمی مراحل کے لئے سیرت نبوی پر اردو، ہندی اور انگریزی میں ایک درسی سلسلہ تیار کرائے (تجویز ۵) یا مسلم اداروں اور دیگر یونیورسٹیوں سے درخواست کہ وہ سیرت نبوی توسیعی خطبات اور تحریری و تقریری مقابلوں کا انتظام کریں (تجویز ۶ و ۱۰)، یا دار المصنفین سے گذارش کہ افادۂ عام کی خاطر "سیرۃ النبی" کا ایک ملخص ایڈیشن ملکی و علاقائی زبانوں میں شائع کرے (تجویز ۹) اور سید صاحب کی تصانیف کے انگریزی و عربی میں ترجمے کرانے کا انتظام کرے (تجویز ۱۱) یا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور بھوپال یونیورسٹی میں "سید سلیمان ندوی چیئر برائے مطالعۂ اسلامیات" کے قائم کرنے کا مطالبہ (تجویز ۳ و ۸)۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ متعلقہ ادارے ان تجاویز کو سنجیدگی سے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں یا یہ صرف ہمارے قومی و ملی سنہرے ریکارڈ کی زینت کا کام دیں گی۔

صدر بزم مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی نے اختتامی تقریر میں کہا کہ میں اس وقت رسمی خانہ پری کے طور پر نہیں بلکہ قلبی تقاضہ کے تحت یہ تاثرات عرض کر رہا ہوں کہ اس سہ روزہ بزم کی غیر معمولی کامیابی داعیٔ بزم، منتظمین اور شرکا کے اخلاص کے علاوہ موضوع بزم علامہ سید سلیمان ندوی کی اقبال مندی بلکہ قبولیت عند اللہ کی دلیل ہے، مجھے خود یہ توقع نہ تھی کہ اتنے اچھے مقالات اتنی بڑی تعداد میں اس پایہ و معیار کے حاصل ہو جائیں گے جن میں موضوع کی وحدت اور معیار کی ایسی یکسانیت ہو گی جو عام طور پر دیکھنے میں کم آتی ہے۔ اس بزم کے بھوپال میں انعقاد کی موزونیت کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے بھوپالی ندویوں کی بڑی جماعت اور داعیٔ بزم اور ان کے خاندان کی وفاشعاری و احسان شناسی کا ذکر کیا اور کہا کہ جو بات میں نے پہلے اپنے سابق علم کی بنیاد پر خطبۂ افتتاحیہ میں اشارتاً کہی تھی اب اس میں موجودہ تجربہ کی بنا پر مزید وثوق و استحکام پیدا ہو گیا ہے، داعیٔ بزم اور منتظمین کو رسمی شکریہ سے بالاتر سمجھتے ہوئے مولانا نے خود اپنے کو اور تمام شرکاء کو مبارکباد دی کہ ہم نے ایسے پرسکون ماحول اور علم پرور فضا میں اپنا یہ وقت گذارا جس میں کسی وقت یہ احساس نہ ہوا کہ ہم اس وقت میں اس سے زیادہ مفید کوئی اور کام کر سکتے تھے۔

داعیٔ بزم مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی ازہری نے باوجود خرابی صحت و نقاہت کے شکریہ کے کلمات بہت دلسوزی اور دردمندی سے ادا کیے، اور مولانا علی میاں صاحب کا وہ خط پڑھ کر سنایا

جس میں انھوں نے ندوہ کی طرف سے اس سعادت میں شریک ہونے کے جذبے سے دس ہزار روپے کا نذرانہ پیش کرنے کی اطلاع دی تھی۔ بزم سلیمان کی کامیابی پر پیش کی گئی مبارکبادوں کو مولانا مدظلہٗ نے اپنے کارگذار عملہ کی طرف منتقل کرتے ہوئے اس دعا پر اپنی بات ختم کی الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

آخر میں مندوبین کی نمائندگی کرتے ہوئے جناب سید صباح الدین صاحب، مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور راقم سطور نے داعی اور منتظمین بزم کا شکریہ اپنے اپنے رنگ میں ادا کیا۔ سب ہی مولانا محمد عمران خان صاحب کی صحت و درازیٔ عمر کے لئے دعا کرتے ہوئے، منتظمین کے سلیقہ کی داد دیتے ہوئے تین دن کے دوران مجلس و بیرونِ مجلس یادوں کو سمیٹتے ہوئے یہ کہہ کر رخصت ہوئے ع

برلوح قلب نام تو صد جا نوشتہ ایم

○

انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمن الرحیم

DARULULOOM
BHOPAL

خطبہ استقبالیہ

بزمِ سلیمانی

بتاریخ ۴-۶ ستمبر ۱۹۸۵ء

زیر اہتمام : دار العلوم تاج المساجد بھوپال

از

محمد عمران خان الندوی

امیر دار العلوم تاج المساجد بھوپال

وکیل بستوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

امابعد

جناب صدر محترم ، مہمانانِ عظام ، وحاضرین کرام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دار العلوم تاج المساجد کے ارکان اور اہلِ بھوپال آپ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے ہماری دعوت قبول کی اور "بزمِ سلیمان" میں شریک ہوکر اس محفل کو رونق بخشی اور "علم وفضل وکمال" کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کیلئے جمع ہوئے۔

راقم الحروف پر حضرۃ الاستاذ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی محبت، شفقت، رہنمائی اور سایۂ عاطفت کی داستان طویل ہے اور زمانۂ طالب علمی سے لیکر سفرِ مصر، دار العلوم ندوۃ العلماء کی مہتمی اور بھوپال کے قیام تک محیط ہے لیکن ان ذاتی تعلقات کی تفصیل بیان کر کے میں آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا کیونکہ آپ کے سامنے ہندوستان کی مختلف علمی شخصیتیں موجود ہیں جو سید صاحبؒ کی شخصیت کے مختلف علمی وتحقیقی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کریں گی۔ ذاتی تعلقات کی تفصیل انشاء اللہ سید صاحب کے مکاتیب کے ساتھ شائع ہوگی۔ مختصراً اتنا عرض کروں گا کہ ابتدائی طالب علمی کے زمانے سے دار العلوم ندوۃ العلماء کی مہتمی تک ترقی کے ہر مرحلے میں سید صاحبؒ کے تعلق، محبت اور عنایت کا اثر کارفرما رہا ہے۔ یہاں صرف ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے خاکسار پر سید صاحبؒ کی خصوصی نظرِ کرم کا اظہار ہوتا ہے، مصر سے واپسی پر قبلہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس فرزند سعید کی خوش قسمتی اور سعادت پر آپ کو دلی تہنیت پیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ وہ واپس آکر آپ کی توقعات کو بیش از بیش پورا کریں گے، میری دلی تمنا ہے کہ آپ اس عزیز سعید کو دین اور ملت اور علم وفن کی خدمت کے لئے نثار کریں، گو اس راہ میں دنیا اور روپیہ کی

تھلی نہیں، مگر وہ ہے جس پر سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔" (مکتوب سلیمانی بتاریخ ۱۳؍اگست ۱۹۳۹ء بنام جناب حافظ محمد الیاس خاںؒ مہتمم مساجد و وظائف و اوقاف ریاست بھوپال)

مہمانانِ محترم المقام!

سید صاحبؒ کے فضائل و کمالات، اخلاق و عادات، تحقیق و ریسرچ، ملی سیاسی اور علمی خدمات اتنی متنوع ہیں کہ ان کی تفصیل کے لئے ہزاروں صفحات ناکافی ہیں اور ان کی کچھ جھلکیاں اور جمالیاتی تجلیاں آپ کے سامنے اس بزمِ سلیمان میں شریک ہونے والے علماء اور محققین پیش کریں گے۔

مختصراً اتنا ضرور عرض کروں گا کہ حضرت استاذ الاساتذہ اور عہدِ جدید کے معلمِ اول علامہ شبلی نعمانیؒ کی فکری، علمی امنگوں اور تمناؤں کو اگر "مجسم" کیا جائے تو ان کا نام "سید سلیمان ندوی" ہوگا، مولانا شبلی کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کیلئے اگر علماء و فضلاء کی پوری ایک جماعت ہوتی تو وہ کام نہ کرسکتی تھی جو ایک فردِ واحد "سلیمان ندوی" نے کیا، دار المصنفین کے ابتدائی ڈھانچہ کو علمی اعتبار سے انھوں نے اور انتظامی و مالی حیثیت سے مرحوم مولانا مسعود علی ندویؒ نے بامِ عروج پر پہنچادیا، اور ایک اکیڈمی بنادیا، سیرت النبی کے ناتمام اوراق کو ماہِ تمام بناکر اسلامی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف بنادیا، دار العلوم ندوۃ العلماء کے تعلیمی و تدریسی ڈھانچے میں جو نئی روح مولانا شبلی نے پھونکی تھی سید صاحبؒ نے اس کو بامِ عروج تک پہنچادیا اور اسی بنا پر شبلی کے جانشینوں نے بجا طور پر ان کو "سید الطائفہ" کا لقب دیا اور شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ نے ان کو شبلی کے بعد "استاذ الکل" تسلیم کیا۔

سید صاحب علم و فضل و تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر متمکن ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقِ انسانی میں بھی درجۂ کمال پر فائز تھے، آپ حلم و عفو، صبر و تحمل، متانت و شرافت، مروت و محبت، انکساری و تواضع، کشادہ دستی، وسعتِ قلبی، عدمِ تعصب، رواداری، استغناء و بے نیازی جیسی تمام صفاتِ حسنہ کا مجموعہ تھے۔

حاضرینِ کرام!

سید صاحب کا تعلق بھوپال سے قدیم زمانہ سے رہا ہے اور آپ متعدد بار بھوپال تشریف لائے ہیں، مولانا شبلی کی وفات کے بعد ۲۹؍نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین فراہیؒ کے ساتھ

سرکار عالیہ سلطان جہاں بیگم کی خدمت میں حاضر ہوئے" اور اس بشارت کے ساتھ واپس ہوئے کہ سیرت کی ماہوار رقم بقیہ زمانہ مقررہ تک جاری رہے گی۔" (حیات سلیمان ص۹۰)

اس موقع پر اختصار کی غرض سے مولانا شبلی اور سیرت سے متعلق بھوپال اور نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمات جلیلہ کا تذکرہ نہیں کیا جارہا لیکن یہ کہنا ضروری ہے کہ سید سلیمان صاحب ندوی کی ایک اہم کتاب "سیرت عائشہؓ" کی تکمیل بھی دراصل سلطان جہاں بیگم والیۂ ریاست بھوپال کے اصرار اور تقاضے پر ہوئی ہے۔

۳۰ر جون ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلیؒ نے "سیرت عائشہؓ" کے سلسلہ میں سید سلیمان ندوی کو تحریر فرمایا ہے "آج بھوپال سے خط آیا ہے، حضرت عائشہؓ کی سوانح کا بڑا تقاضہ ہے، یعنی جلد تیار کردو۔" (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص۱۱)

اسی طرح جب سیرت النبی کا پہلا حصہ شائع ہوا تو سید صاحب نے ۱۶ر اگست ۱۹۱۸ء کو خود بھوپال جاکر دو مطبوعہ جلدیں نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمت میں پیش کیں۔

(حیات سلیمان ص۱۶۹)

اسی سفر میں بیگم صاحبہ بھوپال نے دارالمصنفین کے پریس کی خریداری کے لئے تین ہزار روپیہ مرحمت فرمائے۔ (حیات سلیمان ص۱۰۱)

جولائی ۱۹۳۵ء میں اسلامی فقہ کی روشنی میں قتل وقصاص کی ترتیب وتدوین کی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے سید صاحبؒ حیدرآباد تشریف لے جاتے ہوئے بھوپال ٹھہرے اور نواب حمیداللہ خاں سے ملاقات کی" اور مختلف اصلاحی مسائل پر گفتگو کی .... ریاست نے دارالمصنفین کی امداد دو سو روپیہ سے گھٹا کر نوے روپیہ کردی تھی، اس کی اطلاع دی، نواب صاحب مرحوم نے امداد کی رقم بڑھاکر پہلے کی طرح دو سو روپیہ ماہوار کردی" (حیات سلیمان ص۴۳۰ - ۴۳۱)

اہل بھوپال کی خوش قسمتی اور اوج بختی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ سید صاحب نے جون ۱۹۴۶ء میں قاضی القضاۃ ریاست بھوپال اور امیر جامعہ (ڈائرکٹر تعلیمات علوم مشرقی) کا عہدہ اس شرط کے ساتھ قبول فرمایا کہ" دارالمصنفین اور ندوہ سے ان کا تعلق بدستور قائم رہے گا اور وہ ان کی دیکھ بھال کے لئے وقتاً فوقتاً آتے رہیں گے۔" (حیات سلیمان ص۵۱۵) ۱۶ر جولائی ۱۹۴۶ء کو آپ نے اپنے عہدہ کا چارج لیا۔ (حیات سلیمان ص۵۱۹)

بھوپال میں سید صاحبؒ نے تقریباً چار سال قیام فرمایا، محکمہ قضا کے کاموں کے علاوہ مدارسِ عربیہ کی ازسرِ نو اصلاح و تنظیم کا کام بھی کیا، جمعہ کے دن موتی مسجد میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع فرمایا جس سے بھوپال کے تعلیم یافتہ طبقہ کو بڑا اخلاقی و روحانی فیض پہنچا۔ بھوپال کے قیام کے دوران ہی آپ نے جوشؔ ملیح آبادی کی گستاخانہ نظم کا الہامی جواب دیا۔

(روزنامہ ندیم ۲ر فروری ۱۹۴۹ء)

اہلِ بھوپال نے سید صاحبؒ کی جتنی قدر دانی کی اس کا اعتراف خود سید صاحب کو تھا۔ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں" اور حق یہ ہے کہ بھوپال میں اعلیٰ سے ادنیٰ تک نے میرے استحقاق سے زیادہ میری قدر دانی کی۔" (مکتوب بنام شاہ معین الدین احمد ندویؒ حیات سلیمان ص ۵۳۰)

اس مختصر خطبہ میں سید صاحبؒ اور بھوپال کے تعلق پر سیر حاصل بحث کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ یہ عرض کرنا مطلوب ہے کہ ان تعلقات کی بنا پر اہلِ بھوپال کو سید صاحب کا یوم ولادت منانے اور کل ہند پیمانہ پر ایک " بزمِ سلیمان" منعقد کرنے کا حق تھا جس میں علماء و فضلاء ہندوستان " علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے اس فرہاد" پر اپنے تاثرات و تحقیقات پیش کریں۔

محترم سامعین کرام۔

جس دار العلوم اور اس کی عظیم الشان مسجد میں (جو بجا طور پر اسم با مسمّٰی "تاج المساجد" ہے)، یہ اجلاس منعقد ہو رہا ہے اس کا انتہائی مختصر تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے، تاج المساجد کی تعمیر نواب شاہجہاں بیگم نے شروع کی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء ہی سے شاہجہانِ وقت کے دل میں اس مسجد کو جامعۃ العلوم یعنی اسلامی و انسانی علوم کی عظیم الشان و بے نظیر جامعہ بنانے کا ارمان پوشیدہ تھا، اس لئے انھوں نے اس کے گردو پیش عالیشان عمارتوں اور موقوفہ زمینوں کی جائداد بھی چھوڑی تھی لیکن یہ مسجد شاہجہاں بیگم کے انتقال کے بعد بعض سیاسی و اقتصادی حالات کی بنا پر ستر سال تک تشنۂ تکمیل رہی۔ وقت کو کچھ مردان کار کا انتظار تھا جو ۱۹۴۸ء میں پورا ہوا جب دینی علوم کی اشاعت و بقا اور تدریس کے لئے ۱۹۴۸ء میں ایک دار العلوم کا قیام پرانے شہر کی مسجد شکور خاں میں ہوا، پھر کچھ مدت کے بعد جب یہ مدرسہ تاج المساجد میں منتقل ہوا تو اس کا نام دار العلوم تاج المساجد رکھا گیا۔

استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندویؒ اس وقت بھوپال میں موجود تھے، راقم نے انھیں

کے علم و دانش اور حکمت و بینش سے لبریز ہاتھوں سے اس سرچشمۂ علم و دین کا افتتاح کرایا۔

اس کے بعد تاج المساجد کی تعمیر کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور مہجور و تشنہ مسجد خدا کی مدد، حوصلہ مند مسلمانوں کے تعاون اور مخلصینِ دار العلوم کی جد و جہد سے اب تکمیل کے آخری مرحلوں میں ہے اور آپ کے سامنے ہے۔

دار العلوم تاج المساجد میں یہ اجلاس سلیمانی اس لئے بھی منعقد ہو رہا ہے کہ یہ دار العلوم علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کے فکری و تحریکی مقاصد یعنی ندوہ تحریک کے اصولوں پر قائم ہے اور یہاں کا نصابِ تعلیم بھی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ہی کا نصاب ہے۔

جناب صدر، علماء محققین اور معزز حاضرین کرام :

ان مختصر الفاظ کے ساتھ میں تمام مندوبین و حاضرین کا خیر مقدم کرتا ہوں جن کے مثبت تعاون سے "بزمِ سلیمان" کامیاب ہوگی، اور جن کی آمد اور سہ روزہ قیام کی برق پاشیوں سے بھوپال روشن و منور ہوگا، اور جن کی علمی و فکری حیات بخش تقریروں اور تحریروں سے سرزمین دار العلوم سیراب ہوگی۔

آخر میں میرے ہم کار اس ادارہ کے اساتذہ و طلباء، منتظمین، ملازمین اور اس شہر کے مخلص معاونین کا ذکر از بس ضروری ہے، یہاں آپ کو جو بھی راحت، آرام اور آسائش ملے گی وہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے، آپ ان کا نام نہ جانیں گے لیکن وہ محض اپنے رب کی خوشنودی، علم دوستی اور اور آپ کی محبت میں اس مخلصانہ محنت پر خوش اور مسرور ہیں، ان سب کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔

اس سہ روزہ قیام میں آپ کو اگر کسی قسم کی زحمت اٹھانی پڑے تو میں پہلے سے معذرت خواہ ہوں۔

جناب صدر محترم، معزز علماء و محققین ہند و حاضرین کرام :

مجھے اس بات کی اجازت دیجئے کہ میں، ہم سب کے خصوصی مہمان (ضیف الشرف) سعادت مآب جناب عمرو موسیٰ صاحب سفیر مصر کا خاص طور پر شکریہ کروں۔

اس بزم کے خصوصی مہمان، ذی شان، سعادت مآب جناب عمرو موسیٰ سفیر جمہوریہ مصر کا ہم پُر جوش خیر مقدم کرتے ہیں، ان میں سفارتی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے خداداد سیاسی صلاحیتیں موجود ہیں، ساتھ ہی ساتھ وہ علم و فن کے گرویدہ بھی ہیں، اور زبان و ادب کی دولت کا بھی انھیں وافر حصہ نصیب ہوا ہے، دل کی آسودگی اور فکر و نظر کی پختگی بھی ان میں پائی جاتی ہے وہ اس سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں جس نے قدیم فکری اور معماری تہذیب کو جنم دیا ہے، جہاں "عصائے موسوی" نے ہمیشہ حق و باطل کی جنگ میں باطل کو سرنگوں کیا، اور حق کا پرچم لہرایا ہے، جہاں "ید بیضا" نے ہمیشہ تیرگیوں کا پردہ چاک کیا ہے، اور معمورۂ ہستی کو اجالوں اور روشنیوں سے معمور کیا ہے، جہاں جلوۂ حسن یوسفی نے عفت و طہارت کی برق پاشیاں کی ہیں، جہاں نورِ الٰہی کا پرتو پیغام محمدیؐ کی شکل میں توحید کا پرچم لہرانے، شرک کی ظلمتوں کو مٹانے، ظلم و کفر و فسق کی بادشاہتوں کو اجاڑنے اور مظلوم و محروم عوام کی دادرسی کرنے کے لئے نمودار ہوا۔ اور حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں مشہور اسلامی کمانڈر حضرت عمرو بن العاص کی قیادت میں مصر اسلامی شریعت کا گہوارہ بن گیا، کچھ ہی عرصہ میں یہاں کی زبان، ادب، تہذیب و تمدن علم و فن سب الٰہی رنگ میں رنگ گئے۔ "صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ"۔

اسلامی عہد کی علمی و فکری و دینی ترقی اس درجہ عظیم ہے کہ قدیم مصری تہذیب کی عظمت اس کے سامنے ماند پڑ گئی، یقیناً عمرو بن العاص ملک مینا سے افضل تھے۔ اور یقیناً دار الکتب المصریہ معبد کرنک سے زیادہ اہم اور مفید ہے، اور بلاشبہ جامعہ ازہر اہرام مصر سے زیادہ بلند اور پائیدار ہے

جامعہ ازہر نے ایک ہزار سال سے علم دین و ادب کی جو خدمت کی ہے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی بقا و اشاعت میں اس کا جو حصہ ہے اس کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہیں۔

جامعہ ازہر مصر کے اندر اور عالم اسلامی میں جس طرح علم و دین کی ترویج کیلئے علماء و مدرسین تیار کرتی ہے اور ساری دنیا میں ان کو بھیجتی ہے وہ ہمیشہ سے اس کی بے مثال علم دوستی اور حمایتِ دین کا ثبوت رہی ہے۔

جامعۂ ازہر سے انتساب کا فخر راقم الحروف کو بھی ہے، اور اسی شہر میں متعدد ایسے علماء ہیں جو جامعۃ الازہر سے فارغ التحصیل ہیں، اور اس جلسہ میں موجود ہیں۔ راقم الحروف نے ۱۹۵۸ء میں دار العلوم کے تعارف کے لئے عالم عربی کا دورہ کیا تھا، جس میں مصر کی زیارت سے مشرف ہوا،

اور مصری حکومت کا مہمان تھا، فضیلۃ الامام الاکبر سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اور میری درخواست پر جامعہ ازہر کے ایک مدرس دار العلوم میں تدریسی فرائض انجام دینے کیلئے ارسال کئے گئے تھے۔ ماضی قریب میں بھی ایک مصری مدرس یہاں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے، مجھے امید ہے کہ ہمارے معزز مہمان کی توجہ سے کوئی نئے استاذ دار العلوم کی خدمت کے لئے ضرور معین کئے جائیں گے۔

معزز مہمان: ہماری طرف سے تحیات وسلام اور نیک خواہشات کا تحفہ اپنی حکومت اور عوام تک پہنچادیں۔ جناب عمرو موسی، موسیٰؑ و عمروؓ کی اس مقدس سرزمین پر مکمل اسلامی نظام کے قیام، اور شریعت اسلامیہ کے نفاذ کی تمنا اور مطالبہ پر مصری پارلیمنٹ کی تاریخی منظوری پر ہم مصری عوام اور حکومت کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مہمانِ محترم: اس "بزمِ سلیمان" کا تعلق مصر سے اسطرح وابستہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی اور ان کے استاذ اجل علامہ شبلی نعمانی کے روابط عالم عربی و اسلامی سے عموماً اور مصر سے خصوصاً بہت زیادہ تھے، علامہ شبلی نے اپنے تاریخی سفر میں مصر میں قیام فرمایا، شیخ محمد عبدہ اور دوسرے علماء مصر سے ملاقاتیں کیں، واپسی پر "سفرنامہ مصر و روم و شام" نامی کتاب لکھی۔ جب مصر میں جرجی زیدان کی کتاب "التمدن الاسلامی" شائع ہوئی تو علامہ شبلی نے اس پر تنقید کی، اور عالمِ اسلامی کی طرف سے یہ فرضِ کفایہ ادا کیا، کتاب کا نام "الانتقاد علی التمدن الاسلامی لجرجی زیدان" تھا، علامہ رشید رضا (صاحب المنار) نے تعریفی نوٹ کے ساتھ اسے شائع فرمایا۔ ۱۹۱۲ء کے ندوہ کے اجلاس کی صدارت مولانا شبلی کے صدیق حمیم مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا مصری نے کی۔ علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ کے تعلقات بھی عالم عربی و اسلامی اور مصر سے وابستہ تھے، عربی اخبارات اور رسالے ان کے مطالعہ میں رہتے تھے، سب سے پہلے وہ پورٹ سعید میں ایک دن اس وقت ٹھہرے جب وہ وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے ۱۹۲۰ء میں لندن تشریف لے جارہے تھے۔ (حیات سلیمان ص۱۸۱) ۱۹۲۴ء میں سید صاحبؒ وفد خلافت کے صدر کی حیثیت سے حجاز تشریف لے گئے اور شریف حسین و سلطان عبد العزیز اور علمائے کرام سے ملاقاتیں کیں، اسی دوران آپ اہلِ مصر سے حجاز کے معاملات پر گفتگو کرنے کیلئے مصر تشریف لے گئے جہاں شیخ الازہر اور مصر کے دوسرے ارکان و عمائدین سے ملے۔ (حیات سلیمان ص۲۳۳ سید صاحب کے تعلقات ازہر کے شیوخ کے علاوہ علامہ رشید رضا، شیخ محب الدین الخطیب، ڈاکٹر عبد الرحمن عزام پاشا اور متعدد علمی و سیاسی و ادبی شخصیات سے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں سید صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں مصر کی مجمع العلمی الادبی کے آپ رکن منتخب کئے گئے (حیات سلیمان ص۵۰۹) یہ دراصل مصر کی سرزمین علم و ادب کی طرف سے برصغیر ہند و پاک کے لئے سب سے بڑا علمی اعزاز تھا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

Falcon Offset, Bhopal.

عمرو موسیٰ* ترجمہ برائے اشاعت: سید ضیاء الحسن ندوی**

خطاب مہمان خصوصی

اسے میں اپنی انتہائی خوش نصیبی تصور کرتا ہوں کہ بھوپال حاضر ہو کر آپ حضرات کے ساتھ اس سیمینار میں شرکت کروں جو علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ولادت باسعادت کی صد سالہ یادگار کے مبارک موقع پر منعقد کیا گیا ہے، اس بہانے دار العلوم تاج المساجد کی حاضری و زیارت میرے احساس مسرت و سعادت کو دوبالا کر رہی ہے، یہاں کی اس برادرانہ اسلامی، علمی، دینی و تربیتی فضا میں یہ چند لمحے میرے لئے بڑے جاں بخش و روح پرور ہیں، اس مبارک موقع پر یاد فرمائی کے لئے میں تہِ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں، آپ کا احسان ہے کہ اس طرح ایک بار پھر مجھے اس یگانۂ روزگار اور جلیل القدر شخصیت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جسے دنیا سید ابو الحسن علی ندوی کے نام نامی سے یاد کرتی ہے، جن کی ذات بیک وقت ایک بے مثال ادیب، ایک محبوب دوست اور ایک عظیم انسان سے عبارت ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی صد سالہ یاد منانا اور ان کے شاندار علمی، ادبی، دینی و سماجی کارناموں سے باخبر ہونا جن کا تذکرہ علامہ مرحوم کے قابلِ رشک شاگرد حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری نے بجا طور پر فرمایا ہے بجائے خود فکر اسلامی کے لئے ایک مہمیز اور قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ کی تعمیل ہے کہ "یاد دلاتے رہو، اس لئے کہ یاد ایمان والوں کے لئے فائدہ مند ہوتی ہے۔"

سچ تو یہ ہے کہ میں جب مصر سے پہلے پہل ہندوستان پہنچا اور علوم اسلامیہ کے میدان میں یہاں ہونے والی ترقی و پیش رفت سے آشنا ہوا، ایک سے زائد بار دار العلوم ندوۃ العلماء جانا ہوا وہاں کے طلبہ و اساتذہ کرام سے ملنے کا موقع ملا، پھر اسی طرح اس میدان میں آپکی خدمات و کارناموں سے واقفیت کی خاطر اس ملک کے چپہ چپہ کی سیر کی، اور آج میرا دل فخر و مسرت سے لبریز ہے کہ اسلامیانِ ہند کے مراکز علم میں سے ایک اور عظیم الشان قابل صد فخر و احترام مرکز دار العلوم بھوپال کی زیارت سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر رہا ہوں اور اپنے تئیں ایمان و آگہی کے اس سرچشمہ کے قریب محسوس کر رہا ہوں جس کی شہرت جغرافیائی حدود سے باہر

---

* سعادت مآب سفیر عرب جمہوریہ مصر متعینہ ہند، نئی دہلی

** شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

پہنچ چکی ہے، اور جس سے فیضیاب ہونے والوں کی نوائے شیریں سے مصر و حجاز کے بام و در بھی گونج رہے ہیں اور دوسرے عرب ملک بھی اس صدائے معرفت کے لئے گوش بر آواز ہیں۔

میں اس ملک میں مصر کی نمائندگی کرتے ہوئے دراصل جامع ازہر شریف اور علم و ادب اور زبان و مذہب کے میدان میں اس کے تمام برکات و عطایا کا نقیب ہوں، ایک یونیورسٹی کی حیثیت سے اور اسلام کے ایک منارۂ نور کی حیثیت سے جامعہ ازہر صرف اپنی آپ بیتی نہیں سناتا بلکہ وہ ساری مصری قوم کے احساسات و واردات سے دنیا کو باخبر کرتا ہے، وہ قوم جو اسلام کے بلند و بالا اصول و ضوابط پر غیر متزلزل ایمان رکھتی ہے اور جس نے سرزمینِ مصر کو عربی زبان و ادب اور اس سے متعلق علوم و فنون کا گہوارہ بنا دیا ہے۔ آج ازہری بھوپالیوں اور ازہری ہندوستانیوں کے درمیان خود کو پاکر گویا میں اپنی آنکھوں سے ان فوائد کو دیکھ رہا ہوں جو جامع ازہر کے طرزِ تدریس و مطالعہ اور اس بلند تر پیغام کی دین ہے جس کا جامع ازہر امین ہے۔ میں بڑے شوق و اہتمام سے وہ خطبات و تقاریر سن رہا ہوں جو میرے پیشرو مجھ سے پہلے کر چکے ہیں، خصوصاً اس تقریر کا حوالہ دیئے بغیر نہ رہ سکوں گا جو اس دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی ازہری نے ارشاد فرمائی، میرے لئے ان کی زبان حق ترجمان سے نکلا ہوا ہر جملہ از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق تھا۔

ہاں دنیا میں سرزمینِ کنانہ ہی وہ جگہ ہے جہاں انسانی تہذیب نے پہلے پہل آنکھ کھولی، ایک مصری کی حیثیت سے مجھے اس پر فخر ہے کہ یہ مختلف مذاہب کا گہوارہ بنی، اس کی خاک کے ذرے انبیاء کرام کے پیروں تلے آفتاب و ماہتاب بن گئے، مختلف ادیان و مذاہب کی کرنیں یا تو اسی زمین سے پھوٹیں یا اس کے گرد و پیش سے ابھریں، یہ شرف صرف اسی زمین کو حاصل ہے کہ قرآن میں متعدد بار اس کا ذکر کیا گیا ہے اور ایک ملک و حکومت کی حیثیت سے صرف اسی کا تذکرہ ملتا ہے، اسی بنا پر ایک مصری کی حیثیت سے ہمارا یقین ہے کہ ہم ہمیشہ قرآن کی حفاظت میں رہیں گے، اور ہم پر خواہ کیسی ہی آزمائشیں آئیں، آخرکار ہم رحمت الٰہی کے سزاوار ہوں گے، وہ ہمارے وطن و اہل وطن کا حامی و نگہبان رہیگا۔

جی چاہتا ہے کہ اس بھری محفل میں یہ اعتراف بھی کرتا چلوں کہ حضرت مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری نے اپنے گرانقدر خطبہ استقبالیہ میں جو شاندار عربی اسلوب اختیار فرمایا ہے اور جو شستہ و شائستہ دھلی اور نکھری ہوئی عربی زبان استعمال کی ہے، اس نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے، ان کا طرزِ بیان، ان کے الفاظ و تعبیرات اس زبان پر ان کی بے مثال قدرت کا کھلا ہوا ثبوت ہیں، خاص کر ارضِ کنانہ کے متعلق ان کا ارشاد کہ وہ دنیا میں تہذیب انسانی کا پہلا گہوارہ ہے جہاں "عصائے کلیمی" نے ہمیشہ باطل کو

سرنگوں کیا اور حق کا پرچم لہرایا، جہاں "یدبیضا" نے ہمیشہ تیرگیوں کا پردہ چاک کیا اور اپنی ضیا پاشیوں سے معمورۂ ہستی کو سراپا نور بنا دیا۔ جہاں "جلوہ حسن یوسفی" کی تب وتاب عفت وطہارت کی برق پاشیوں کے ساتھ نمودار ہوئی، یہ تمام گراں قدر پرمغز خیالات میرے دل میں اترتے چلے گئے، کیونکہ ان میں دلنشیں خوبصورت زبان وبیان کے ساتھ ساتھ معانی کی گہرائی، گیرائی اور بلندی بھی تھی۔ اور ان دونوں خوبیوں کی یکجائی کہنے والے کی زبان دانی ہی کی نہیں بلکہ ہمہ زبانی کی دلیل ہے۔

البتہ اجازت دیجئے کہ اس استقبالیہ تقریر کے ایک فقرہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرسکوں، جس میں مصر کے عہد فراعنہ اور عہد اسلامی کا نئے انداز سے مقارنہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی میری ناچیز رائے میں گنجائش نہیں ہے، ہم مصریوں کے نزدیک تو بیتی ہوئی صدیوں کی ہزار یا ہزار سالہ تاریخ ایک تہذیبی تکملہ اور لیل ونہار کی گردش ایک زمانی تسلسل کا پتہ دیتی ہے، چنانچہ جہاں ایک طرف فراعنہ کا دور تاریخ مصر کا ایک ترقی یافتہ دور تھا، وہیں دوسری طرف عہد اسلامی نے سرزمین مصر کو ایک دوسرے عظیم الشان دور سے روشناس کرایا ہے، البتہ قرآن سے بہتر کوئی کتاب زندگی چشم فلک نے نہ کبھی دیکھی ہے اور نہ کبھی دیکھے گی۔ لیکن موجودہ مقارنہ میں تعبیر کے لحاظ سے یقیناً میں نے ایک اچھوتا پن محسوس کیا ہے، میرے نزدیک فاتح مصر عمرو ابن العاص کا ملک مینا کے ساتھ مقابلہ جس نے مصر کو وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا تکمیلی موازنہ کے طور پر ہو سکتا ہے نہ کہ ترجیحی موازنہ کے طور پر، ظاہر ہے کہ اگر ملک مینا نے مصر کو متحد نہ کیا ہوتا تو عمرو ابن العاص کے ہاتھوں بٹے ہوئے مصر کا کوئی ایک حصہ ہی فتح ہو پاتا۔ اسی طرح ایک کتب خانہ (دار الکتب المصریہ) اور ایک عبادت گاہ (کرنک کا مندر) یا ایک یونیورسٹی (جامعہ ازہر) اور ایک مقبرہ (اہرام مصر) کے درمیان موازنہ کیسے ممکن ہے؟ یہ سب چیزیں تو مصری عوام کی قوت فکر وعمل کی غماز ہیں۔ اہرام اگر ایک شاندار تاریخی یادگار ہے، تو جامعہ ازہر ایک عظیم الشان منارۂ انوار، جس کا آثار قدیمہ سے کوئی تعلق نہیں، وہ تو مصر کے مستقبل کی شاہراہ ہے۔ اہرام مصر کی عظمت رفتہ کا آئینہ دار ہے، اور ازہر کے ذرے ذرے میں مصر کے تابناک مستقبل کی چمک دمک پوشیدہ ہے۔

آخر میں جی چاہتا ہے کہ ایک اور اہم مسئلہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلاؤں، اور وہ یہ کہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے ہم کو اپنے گرد وپیش سے سیکھنے سکھانے، جدید تمدن کی برکتوں کو عام کرنے اور مستفید ہونے نیز تہذیب حاضر کی نوک پلک سنوارنے کا فریضہ انجام دینا چاہیئے، بجائے اس کے کہ ہم ازکار رفتہ قدیم کتابوں میں پڑھے ہوئے سبق دہراتے رہیں، جن سے آج کچھ حاصل نہیں اور جن کی حیثیت ایسے آثار قدیمہ کی رہ گئی ہے جن کا ذکر ہمارے فاضل صدر استقبالیہ نے دوسرے سیاق میں فرمایا تھا، کیونکہ

جس عہد میں آج ہم سانس لے رہے ہیں وہ سائنس وٹکنالوجی کا دور ہے اور وہ ہم سے انتھک محنت اور پیہم عمل کا طلبگار ہے تاکہ ہم بھی اس کی رفتار کا ساتھ دے سکیں، لہٰذا ناگزیر ہے کہ ہم اسلام کے بنیادی اصولوں کو مضبوطی سے تھامے رکھیں اور ذیلی فرعیات میں اپنے قیمتی وقت کو ضائع نہ کریں جیسے کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے متقدمین میں سے بہت سوں نے نواقض وضو جیسے فرعی موضوع کی بحث و تحقیق واختلافات میں پوری پوری عمریں گذار دیں۔

ہمارے سامنے بہت طویل سفر ہے، دنیا بڑی تیز رفتاری سے ہمارے آپ کے اور اس تیسری دنیا کے گرد وپیش رواں دواں ہے، ہم کو بالفعل اس تیز گام قافلہ کو پکڑنا اور اس کے علوم وفنون اور آداب میں دستگاہ پیدا کرنا ہے، اسی لئے ہمارے لئے اصولی اور فروعی مسائل کو جاننا اور انکو ان کا صحیح مقام دینا بھی اہم ہے، اس طرح سے کہ اسلام کے بنیادی اصول ہاتھ سے جانے نہ پائیں، تاکہ ہماری زندگی کے قیمتی اوقات فرعی ذیلی مسائل میں الجھ کر ضائع نہ ہونے پائیں۔

حضرات! آپ نے آج کی اس دل خوش کن ملاقات میں جن بیش قیمت خیالات کے سننے کا مجھے شرف حاصل ہوا، انہوں نے حقیقتاً میری فکری جولانگاہ میں ایک ہلچل مچادی، لیکن وقت اتنا تنگ ہے کہ اصولی وفروعی مسائل اور تاریخ اسلام اور اس کے مستقبل کے بارے میں مزید بحث کی گنجائش نہیں، لہٰذا اسی بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ مسلمانوں کو لیلیٰ علم وآگہی کے گیسو سنوارنے اور اصول دین کی بنیادوں کو استوار کرنے کی مہم پر ڈٹ جانا چاہیئے۔

آخر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس دارالعلوم میں عربی زبان وادب کی تعلیم وتدریس کے لئے ایک نئے مصری استاد کی ضرورت کا مجھے علم ہوا، اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ انشاءاللہ اس ضرورت کی تکمیل اور اس حکم کی تعمیل مستقبل قریب میں انشاءاللہ ہوجائے گی۔

اس سے پہلے کہ میں آپ سے اجازت لوں پھر ایک بار اس یاد فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس کی وجہ سے مجھے اس مبارک محفل میں حاضری اور اپنے وقت کی نادرۂ روزگار شخصیت، جلیل القدر عالم اور مثالی محقق علامہ سید سلیمان ندوی کی یاد میں شرکت، اور آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ بہت بہت شکریہ

* * *

سید ابوالحسن علی حسنی ندوی★

خطبۂ صدارت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

حضرات! ۱۴۰۰ھ ۱۹۸۰ء میں جب سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ساتویں جلد جو معاملات پر مشتمل ہے اور چند متفرق مضامین ومباحث کا مجموعہ ہے، اور جس کی بازیافت اور دریافت ایک بیش بہا خزانے کی دریافت سے کم نہیں سمجھی گئی تھی، مطبع معارف اعظم گڑھ، کو طباعت کے لیے حوالے کی گئی تو محترمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم۔ اے۔ ناظم دارالمصنفین نے مجھ سے اس پر پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی، میں نے اُن کے احترام میں اس فرمائش کی تعمیل کی۔ لیکن پیش لفظ کے آخر میں میرے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلے:

> "آثارِ قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگارِ نبویؐ، متکلم اسلام اور نابغۂ عصر استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی کی شہرۂ آفاق کتاب سیرۃ النبیؐ کی جلد ہفتم پر یہ ہیچمداں پیش لفظ لکھے، لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے اس لیے اس پر ایک "ناقص" کچھ لکھنا محلِ تعجب نہیں کہ ع
>
> دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"

اب ایک ایسے موقر جلسہ کی صدارت کے لیے معذرت کے الفاظ کہاں سے لاؤں جو اس نابغۂ عصر کے علمی، تصنیفی، تحقیقی کمالات اور اس کی دینی وعلمی خدمات کی یاد تازہ کرنے اور اس عہد کے سب سے بڑے سیرت نگارِ نبویؐ، متکلم اسلام اور محقق مصنف کی خدمت میں خراجِ عقیدت ومحبت پیش کرنے کے لیے منعقد کیا جا رہا ہے، اور جس میں مُلک کے چیدہ اور برگزیدہ اصحاب، نامور فضلاء اور اہلِ فکر واہلِ قلم شرکت فرما رہے ہیں، لیکن اس خدمت یا شرف کے لیے یا "جنودِ سلیمان" کے استقبال کے لیے ایک "مورِ ناتواں" کا انتخاب ہوا ہے، جس پر بے اختیار قرآن کی آیت یٰۤاَیُّھَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُہٗ وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ یاد آجاتی ہے جو ایک تاریخی و

★ ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

نفسیاتی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

لیکن یہ انتخاب ایک ایسی شخصیت کی طرف سے ہوا ہے جس کا حکم ٹالنا آسان نہیں، اور جس کی قدیم اور مخلصانہ رفاقت، پھر موجودہ صحت کی کیفیت و حالت کے پیشِ نظر یہ پرانا مصرعہ یاد آتا ہے ع انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو! اس لیے احساسِ ندامت اور اعترافِ عجز و قصور کے ساتھ اس کو قبول کرنا پڑا کہ ع

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن   کہ جاہا سپر باید انداختن

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اس عہد (چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی) کے ہی ممتاز ترین سیرت نگار نبویؐ نہ تھے، وہ تاریخِ اسلام کے ممتاز ترین سیرت نگاروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں، ان سیرت نگاروں میں بھی جو ہمارے ہر طرح کے اعتراف و تشکر کے مستحق ہیں، اور جن کے بغیر پچھلے زمانہ میں سیرت کے موضوع پر تصنیف و تالیف کا فرض انجام نہیں دیا جا سکتا تھا، وہ اِس امتیاز میں منفرد ہیں کہ انھوں نے سیرت کا دائرہ صاحب سیرت (علیہ الف الف صلاۃ وسلام) کی سیرت طیبہ، حالات و واقعات اور شمائل و عادات سے آگے بڑھا کر پیغامِ محمدیؐ، تعلیماتِ نبویؐ اور شریعتِ اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے، بعثتِ محمدیؐ اور سیرتِ نبویؐ کی وسعت و جامعیت، اس کی بے خطا رہبری و رہنمائی اور ہر عہد میں حیات انسانی اور نسلِ آدم کے لئے ہدایت و سعادت کے اس سامان کو انھوں نے اس طرح علمی انداز میں پیش کیا، اور دوسرے پیشوایانِ مذاہب اور ان کی تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا ایسا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لئے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ، اور ذاتِ نبوی (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی، اب وہ سیرت کا ایک ایسا دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) ہے جس کی نظیر دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔

ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سیرت سے (اور ایک قدم آگے بڑھ کر کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ سے) علم کلام کا کام لیا، اور ایک ایسے علم کلام کی بنیاد ڈالی جو تاریخی واقعات و حقائق پر مبنی ہونے، عملی زندگی سے تعلق رکھنے، فطرت انسانی کو اپیل کرنے اور عقل کے ساتھ قلب کو بھی متاثر کرنے کی بنا، پر اس علم کلام سے زیادہ مؤثر، عام فہم اور مفید بن گیا ہے، جس کے قابلِ قدر نمونے اپنے اپنے وقت میں پیش کئے گئے ہیں، اور بلاشبہ انھوں نے اپنے اپنے زمانے میں اسلام کی عظیم الشان خدمت انجام دی، اور وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے (جزاھم اللہ عن الاسلام خیرا) اسی کا نتیجہ ہے کہ ان حملوں اور اعتراضات و شبہات کا زور ختم ہو جانے یا ان کا رخ بدل جانے کی وجہ سے

جن کا جواب دینے یا ان کے اثر سے ذہین و تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بچانے کے لئے وہ وجود میں آئے تھے، ان کی افادیت اور زندگی و تازگی میں بھی فرق آگیا، لیکن اس علم کلام کا تعلق (جس کی ابتداء "سیرۃ النبی" کی پانچ جلدوں اور "خطبات مدراس" سے کی گئی ہے) خاتم النبیینؐ اور اقبال کے الفاظ میں ؎

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

کی زندگی اور تعلیمات کے متعلق ہونے کی وجہ سے پیش گوئی کی جا سکتی ہے (اور دلائل قرائن اس کی تائید کرتے ہیں) کہ اس کی افادیت و تازگی میں انقلاب زمانہ سے کوئی بڑا فرق نہیں آئے گا، صرف زبان کی تبدیلی، اختصار و اطناب اور تلخیص و انتخاب سے کام چل جائے گا۔

"خطباتِ مدراس" کا نام آگیا ہے تو اتنا کہتا چلوں کہ میرے محدود علم میں کسی اسلامی زبان میں سیرت پر اتنی طاقتور، دل آویز، دل پذیر اور ایمان آفریں کتاب دیکھنے میں نہیں آئی، اس میں سیرت کے کتب خانے کا عطر آگیا ہے، اور تاریخی حقائق، تقابلی مطالعہ، نفسیاتی تجربہ، علم الاخلاق، علم الاجتماع اور پھر اپنی ادبیت اور خطیبانہ انشاپردازی کی آمیزش سے اس کی افادیت اور اس کی علمی قدر و قیمت میں ایسا اضافہ ہوا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں اور سلیم الطبع اور جویائے حق غیر مسلموں کو دینے کے لیے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں۔

عام طور پر لوگ سید صاحبؒ کو مؤرخ کی حیثیت سے جانتے ہیں خصوصاً علماء کے قدیم حلقے میں ان کا تعارف عام طور پر اسی نسبت سے ہوتا ہے، لیکن سید صاحبؒ کی علمی مجلسوں میں بیٹھ کر مجھے شدت سے اس کا احساس ہوا کہ ان کا امتیازی مضمون قرآن مجید اور علم کلام ہے۔ میں نے "پرانے چراغ" حصہ اول میں سید صاحب کے تذکرہ میں لکھا ہے اور آج بھی اسی مقام پر ہوں کہ

> "میں نے معاصر علماء میں کسی شخص کا مطالعہ قرآن اور علوم قرآنیہ کا اتنا وسیع اور گہرا نہیں پایا، علم کلام اور عقائد پر سید صاحبؒ کی نظر بہت وسیع و عمیق تھی، اور ان کو علم کلام کو سلف کے اصول اور کتاب و سنت کی روشنی میں اور عصر حاضر کے ذہن اور روح کے مطابق پیش کرنے کا خاص ملکہ تھا اور یہ غالباً مولانا حمید الدین فراہیؒ کی طویل صحبت، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابوں کے مطالعہ اور "سیرۃ النبی" کی تالیف کے سلسلے میں طویل غور و فکر کا نتیجہ تھا۔"[۳]

علی گڑھ کے عزیز فضلاء، محبوب دوستوں اور وائس چانسلروں سے معذرت کے ساتھ ایک تاریخی حقیقت کے طور پر اس میں اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ اس میں اس کو بھی دخل تھا کہ سید صاحب نے سرسید مرحوم اور ان کے عہد کا (جو بہت قریب تھا) پیدا کیا ہوا وہ مذہبی اور کلامی لٹریچر بغور پڑھا تھا، جس میں جدید فلسفۂ نوخیز اور

کہ سائنس اور مغرب کی حاکم و فاتح تہذیب کے ملے جلے ردعمل نے ایک ایسا جوابی انداز پیدا کر دیا تھا، جس کی بنیاد معذرت اور تاویل پر تھی، سید صاحب کی سلیم طبع، خاندانی ماحول، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کامل الفن اساتذہ اور راسخ العلم علماء سے تلمذ، سائنس کے صبح و شام بدلتے ہوئے نظریات، مغربی تہذیب کی عبرتناک ناکامی اور اس کے زوال کے کھلے ہوئے نشانات، پہلی جنگِ عظیم کی ہلاکت خیزی اور جہاں سوزی، یورپ کے سفر میں مغربی تہذیب و معاشرت کے براہِ راست مشاہدہ اور تجربہ نے اس طلسم کو پاش پاش کر دیا تھا جس کے اسیر و نخچیر انیسویں صدی کے اخیر کے اچھے اچھے دماغ رہے ہیں، پھر توفیقِ الٰہی اور کتاب و سنت کے براہِ راست مطالعہ اور سیرت کے اشتغال نے ذاتِ نبویؐ کی عظمت اور اسلامی عقائد و حقائق کی صداقت و حقانیت اور علمیت و معقولیت پر نیا ایمان اور نیا اعتماد بخشا جو سیرۃ النبیؐ کے چوتھے اور پانچویں حصے میں تفصیل کے ساتھ اور رسالہ "اہل سنت والجماعت" (جو "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کا مصداق ہے) اجمال کے ساتھ صاف نظر آتا ہے۔

جہاں تک سید صاحبؒ کے ایک عظیم مورخ ہونے کا تعلق ہے وہ بلاشبہ اپنے عہد کے عظیم ترین مورخوں اور محققوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں، ان کی کتاب "خیام" اور اس کے بعد "عرب و ہند کے تعلقات" "عربوں کی جہاز رانی"، علمی تحقیق، وسعتِ مطالعہ، دقتِ نظر، قوتِ محاکمہ، تقابلی مطالعہ اور علمی تلاش میں صبر و تحمل کا اعلیٰ نمونہ ہیں، جہاں تک "خیام" کا تعلق ہے کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی محققانہ کتاب نہیں ہے، علامہ اقبالؒ نے اس کتاب کو پڑھ کر سید صاحب کو لکھا تھا:

> "عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا"[۵]

ان کی یہ تاریخی تصنیفات بڑے سے بڑے مصنف و محقق کی ساری عمر کی کمائی اور سرمایۂ افتخار بن سکتی ہیں، ان کے اس امتیاز و تفرد کے اظہار کے لئے علامہ اقبال کے الفاظ سے بہتر الفاظ نہیں لائے جا سکتے ہیں کہ "ہندوستان میں علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد، سید سلیمان ندوی کے سوا کون ہے؟"۔

"ارض القرآن" ان کے ابتدائی عہد کی تصنیفات میں سے ہے لیکن وہ ابھی تک اردو میں آخری چیز اور اس موضوع پر سب سے بڑا ماخذ ہے، ان کے کاموں کو دیکھ کر کسی نکتہ رس کا یہ جملہ یاد آتا ہے کہ مشرق میں "ایک آدمی" اکثر وہ کام کرتا ہے جو مغرب میں "اکیڈمی" کرتی ہے۔

یہاں پر پھر میں مجبوراً "پرانے چراغ" کا ایک پیراگراف نقل کروں گا، جس میں سید صاحب کی جامعیت اور ملک کے زبان و ادب میں ان کے اس استادانہ ملکہ، قائدانہ کردار ادا کرنے کو نمایاں

کیا گیا ہے جس نے طبقہ علماء و عوام میں بیگانگی اور قدیم و جدید میں وہ خلیج نہیں پیدا ہونے دی، جو بعض دوسرے اسلامی ملکوں میں (علماء کے اپنے دینی اور مخصوص ثقافتی حصار میں محدود ہو جانے کی وجہ سے) پیدا ہو گئی اور جس سے دین کا رشتہ زندگی سے اگر ٹوٹا نہیں تو کمزور ضرور ہو گیا۔

"سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو طبقہ علماء میں ان کی جامعیت اور ان کے علوم و مضامین کا تنوع ہے، ان کی ذات اور ان کی علمی زندگی میں قدیم و جدید واقفیت، علمی تبحّر اور ادبی ذوق، نقّاد و مؤرخ کی حقیقت پسندی اور سنجیدگی، ادباء اور انشاپردازوں کی شگفتگی اور حلاوت، فکر و نظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت اس طرح جمع ہو گئی تھی جو شاذ و نادر جمع ہوتی ہے، سیّد صاحب جس زمانے کے طالب علم ہیں اس زمانے میں جدید و قدیم کے درمیان شدید رقابت تھی، ایک شخص بیک وقت دونوں قلمروؤں سے راہ و رسم نہیں رکھ سکتا تھا، قدیم و جدید نمائندوں کا ایک جگہ جمع ہونا بھی مشکل تھا (اور شاید ندوۃ العلماء کے جلسوں میں وہ پہلی مرتبہ جمع ہوئے تھے) دینی علوم اور ملک کے زبان و ادب کے درمیان بھی سرحدیں قائم ہو گئی تھیں، اور ان کو پار کرنا بڑی جرأت کا کام تھا۔ وہ دور جس نے نذیر احمد، حالی، شبلی جیسے عالم اور صاحب طرز انشاء پرداز پیدا کئے، ختم ہو رہا تھا اب یک فنی علماء کا دور تھا جو ادب و شاعری کو ثقاہت کے خلاف سمجھتے تھے، ایسے بھی بہت سے لوگ تھے جو جیتی جاگتی زبان اور سلیس و شیریں اُردو میں تصنیف کرنا اپنی عالمانہ شان کے خلاف سمجھتے تھے، جغرافیہ و تاریخ سے ناواقفیت علماء کا شعار سمجھا جانے لگا تھا، علوم قدیمہ میں بالعموم مغایرت تھی، جو فقیہ و محدث ہوتے تھے، وہ ادیب نہیں ہوتے تھے، جو ادیب ہوتے تھے، ان کو علوم دینیہ سے سروکار نہ ہوتا تھا، زندگی پر اثر انداز ہونے اور قوم کی رہنمائی کے لئے ضروری تھا کہ ملک کے علمی و ادبی رجحانات سے واقفیت اور علمی زندگی میں شرکت ہو، سیّد صاحبؒ نے نصف صدی سے زیادہ علماء کی اس قدیم جامعیت کو زندہ اور نمایاں رکھا، اور دینی و علمی و ادبی حلقوں میں بیک وقت نہ صرف باریاب بلکہ اکثر صدر نشیں رہے۔"

سیّد صاحبؒ نے انجمن ترقی اُردو کے جلسوں کی صدارت کی، ہندوستانی اکیڈمی میں فاضلانہ و محققانہ مقالات پڑھے، جن کا مجموعہ "نقوشِ سلیمانی"؎ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کے مطالعے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مصنف نِرا عالمِ دین نہیں، لسانیات، فلسفۂ زبان اور تاریخ السنہ کا ماہر خصوصی ہے، خصوصیت کے ساتھ وہ خطبہ جو تمہید کے عنوان سے ہے، اور جس میں انھوں نے کثیر التعداد اُردو کے روزمرّہ کے الفاظ کا عربی نسب نامہ بیان کیا ہے، اور ان کے اس طویل اور دل چسپ سفر کی کہانی سُنائی ہے جس کے طے کرنے کے بعد انھوں نے یہ حُلیہ اور لباس اختیار کیا، ان

کی دیدہ وری اور نکتہ سنجی اور عربی اُردو سے گہری واقفیت کا بیّن ثبوت ہے۔

جب سنہ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کے قائدین کو انگلستان جانے والے اس موقر وفد میں جس کی قیادت رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؔ کر رہے تھے، شرکت کے لیے ایک باخبر وسیع النظر عالم اور ایک باحمیت و ہوش مند ترجمان شریعت کی ضرورت پیش آئی تو اہلِ نظر کی نظر اسی نوجوان عالم سید سلیمان ندویؒ پر پڑی، جب سلطان ابن سعود کی دعوت پر مکۂ مکرمہ میں مؤتمر اسلامی کا عالمی اجلاس ہونا طے پایا اور مجلس خلافت نے مسلمانان ہند کے خیالات کی ترجمانی کے لئے ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا، تو اس کی قیادت کے لئے بھی (جس میں بلند پایہ علماء اور آزمودہ کار سیاسی رہنما تھے) اُن سے زیادہ موزوں شخص نظر نہیں آیا، جب نادر خاں شاہِ افغانستان نے اپنے ملک کے لئے تعلیم کا نیا خاکہ و نظام مرتب کرنے کا ارادہ کیا، جو بیک وقت قومی و دینی تقاضوں کو پورا کر سکے، اور دین کے اصول اور عصر حاضر کی ضروریات پر حاوی ہو تو اس نازک و دشوار کام کے لئے اُن کی نظر ہندوستان کی تین ہی ہستیوں پر پڑی۔ ایک ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ، دوسرے سر راس مسعودؒ، تیسرے مولانا سید سلیمان ندویؒ، ہم ان کو کانگریس کے مخصوص جلسوں میں شرکت کرتے ہوئے بھی دیکھتے ہیں، اور خلافت کے سالانہ جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے بھی، ہر جگہ ان کی رائے کا وزن، اُن کی شخصیت کا وقار اور ان کی واقفیت کا اعتراف پاتے ہیں، اسی کے ساتھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جامعۂ ملیّہ اسلامیہ بھاول پور کے صادق ایجرٹن کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی علمی کمیٹیاں اور کورٹ ان کی شرکت پر مفتخر اور ان کے مشوروں سے مستفید ہوتی ہیں، پھر زندگی کے آخری دور میں ہم اسی ادیب و مؤرخ کو بھوپال کے مسند قضا پر شرعی مقدمات کا فیصلہ کرتے ہوئے اور فقہی رائے دیتے ہوئے پھر دُنیا کے ایک بڑے اسلامی جمہوریہ کی مملکت کے دستور میں دینی رہنمائی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، یہ گوناگوں مشاغل و خدمات سید صاحب کی ہمہ گیر طبیعت اور ان کے علم و ثقافت (CULTURE) اور وسعت کا بہترین ثبوت ہیں۔

اب ہم سید صاحبؒ کے ایک اور امتیاز کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی بیداریٔ قلب، طلب صادق، اور ہمت عالی کے ثبوت کے لیے "پرانے چراغ" کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

"سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء کا زمانہ تھا کہ سید صاحب علم و تحقیق کے چشموں سے سیراب ہو کر اور علوم دینیہ اور تاریخ و ادبیات کے سمندر میں بار بار غوطہ لگانے کے بعد اپنی روح کی پیاس اور "قلب کی کسی اور چیز کی تلاش" محسوس کرنے لگے تھے، اور اپنے محبوب دوست اور نامور معاصر علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں خلوتوں میں (زبان حال سے) زیر لب اس طرح گویا ہوتے تھے کہ ؏

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب — مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رُطب
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا — عشق تمام مصطفیٰؐ، عقل تمام بولہب

شاید علمائے معاصرین کم سے کم ہندوستان کے فضلائے مدارس میں کسی کے ضمیر میں عقل و عشق، قدیم و جدید، مشرقِ و مغرب اور دین و ادب یا دین و فلسفہ کا یہ معرکہ اس طرح برپا اور تازہ نہ ہوا ہوگا جس طرح ندوہ کے اس فاضل، "سیرۃ النبیؐ" کے اس مصنف، میدانِ سیاست اور بزمِ ادب کے اس محرمِ راز، اور یورپ کے اس سیاح کے ضمیر میں ہوا تھا، انھوں نے اس نخیل علم کی آبیاری بھی کی تھی، اس کی گھنی چھاؤں میں برسوں آرام بھی کیا تھا، اس کی تاریخ بھی لکھی تھی، اس کی زندگی اور موت کا فلسفہ بھی بیان کیا تھا، لیکن ان کے قلبِ سلیم اور روحِ بے تاب کی شہادت تھی (اگرچہ ان کے بہت سے معتقدین تلامذہ اس کے ماننے کے لیے تیار نہ تھے، کہ سید صاحبؒ میں کوئی کمی اور تشنگی ہے) کہ وہ اس کے تازہ اور شاداب رُطب سے فیض یاب نہیں ہوئے تھے، ان کی کتابوں نے بالخصوص "خطبات مدراس" "سیرت النبیؐ" کے مضامین اور "سیرت عائشہؓ" کے صفحات نے ہزاروں کو حلاوتِ ایمان سے لذّت آشنا کیا تھا، لیکن ان کی ہمت عالی اور ان کا طائرِ بلند پرواز خود اس دولتِ بیدار کا طالب تھا، جس کو حدیث میں "احسان" اور قرآن مجید میں "تزکیہ" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے، اور جس طرح ان کو علم و ادب کی وادی کو کامیابی و فتح مندی کے ساتھ طے کرنے کے لئے علامہ شبلیؒ جیسا خضرِ طریق مِلا تھا، "احسان" اور "تزکیہ" کی وادی کے لئے بھی ایک خضرِ راہ اور ایک مردِ حق آگاہ کی تلاش تھی، اس سلسلے میں ان کی کہانی اور اُن کے وارداتِ قلبی حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی کہانی اور وارداتِ قلبی سے بہت مشابہ نظر آتے ہیں کہ ان کو بھی علم و شہرت کے بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد اپنی علمی زندگی اور ذہنی کد و کاوش سراب نظر آنے لگی، وہ علم و یقین کے چشمۂ حیوان کی تلاش میں نکلے اور سیراب و کامیاب واپس آئے۔

یہ "خضرِ راہ" ان کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شکل میں مل گیا، اور چونکہ عراقی[9] کی طرح ان کا باطن اِس حرارت و حلاوت کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار تھا، اس لئے انھوں نے برسوں کی راہ مہینوں میں اور مہینوں کی راہ ہفتوں میں اور دنوں میں طے کی، اور شیخ وقت کے اعتماد و استناد سے بہت جلد سرفراز ہو کر ان کے خلیفۂ مجاز ہو گئے"۔[10]

جن حضرات کی اُمّت اسلامیہ کی علمی، فکری اور کلامی تاریخ پر وسیع و عمیق نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کے دریا اپنے رُخ پر آزادانہ سالہا سال بہتے رہتے ہیں۔ ان کو دورِ صحیح طور

پیران دریاؤں کے غواصوں اور جہاز رانوں کو زمانے کے انقلابات اور بعض اوقات وقت کی ضروریات اور مطالبات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، وہ اپنا کام یکسوئی اور کسی قدر بے نیازی اور بے پرواہی کے ساتھ اپنے کتب خانوں اور مطالعہ و تصنیف کے گوشوں میں انجام دیتے رہتے ہیں، ماہرینِ تفسیر، محققین حدیث و فقہ، مصنفین علم کلام، شارحین متون اپنے علم و مطالعے کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں، اور آنے والی نسلوں کے لئے ان علمی جواہرات کو ایک جگہ جمع کرتے رہتے ہیں، بعض اوقات نئی نسل نئے مسائل سے دوچار اور ذہنی انتشار اور اعتقادی اضطراب کا شکار ہوتی ہے، اس کو سمجھانے اور مطمئن کرنے کے لئے ایک نئی زبان، نیا پیرایۂ بیان، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی تبدیلیوں کے اثرات سے واقفیت اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نفسیات سے نہ صرف شناسائی بلکہ ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے، جب کبھی ان علوم کے دریاؤں کی غواصی اور شناوری، عقیدہ کی پختگی اور صلابت، دین کی حمیت، قلم کی طاقت اور زبان کی طلاقت اپنے ان بلند نشینوں سے اتر کر (جہاں ان کو ہر طرح کی لذت و عزت حاصل ہے) زندگی کے ان میدانوں میں آتی ہے، زمانے کی تبدیلیوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتی ہے، اور سیدنا علی مرتضیٰ رضؓ کی حکیمانہ نصیحت: کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (لوگوں سے اُن کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ اس حکمت کی عدم رعایت کی وجہ سے لوگ خدا اور رسول کی باتوں کا انکار کرنے لگیں؟) پر یہ گروہ علماء و متکلمین عمل کرنے لگتا ہے، تو پھر اکھڑے ہوئے قدم جم جاتے ہیں، انحراف و ضلال کی شکار تعلیم یافتہ نسل دین کی نہ صرف قائل بلکہ داعی بننے لگتی ہے، اس وقت دین کے غلبے کا ایک نیا دور، مسلمانوں میں شریعتِ اسلامی پر اعتماد بلکہ افتخار کا جذبہ، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جدید فلسفوں کے علمی حملوں سے آنکھیں ملانے اور اُن کے حملے کو پسپا کر دینے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، اقوام و ملل اور مذاہب کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ قدیم و جدید کا یہ اتصال اور دین کے صحیح نمائندوں اور رمز شناسوں اور جدید نسل کے متجسس و بے چین اور تشکیکی ذہن کی مواجہت یا تقاطع (CROSS) بہت سے مذاہب و ممالک میں بڑے بڑے، طویل طویل وقفوں کے بعد پیش آیا ہے، اور اسی کی کمی یا تاخیر نے یورپ میں علم و مذہب میں وہ خون ریز کشمکش پیدا کر دی جس کی تاریخ ڈریپر (DRAPPER) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE (معرکۂ مذہب و سائنس) میں سنائی ہے، اور ان تاریک صدیوں کو جنم دیا جن کو یورپ کی تاریخ میں "قرونِ مظلمہ" (DARK AGES) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے،

(اور میرے اس ٹکڑے میں عالی مرتبت سفیر صاحب نے جو بات اٹھائی ہے اس کا بھی جواب ہے) کہ ملت اسلامیہ کی تاریخ میں علمائے راسخین اور کتاب و سنت کے حاملین و شارحین اور نئے زمانہ اور نئی نسل کے درمیان بیگانگی کا وقفہ کبھی اتنا طویل نہیں ہونے پایا کہ علم و مذہب کے درمیان کسی خون ریز کشمکش کے پیش آنے اور ان تحقیقی عدالتوں COURTS OF INQUISITION کے قیام کی نوبت آئے، جن کی یورپ میں مقتولین کی تعداد بارہ ملین یعنی پہلی جنگِ عظیم کے مقتولین کی تعداد سے دو چند ہے" (یہ ہے اس یورپ کی ترقی کا حال جہاں قرون وسطیٰ میں عیسائیوں کے عقائد کی تحقیق کے لیے تفتیش کے محکمے قائم ہوئے اور انھوں نے سینٹ پال کی عیسائیت سے انحراف پر لوگوں کو سزائیں دیں) لیکن تاریخ اسلام میں قرون مظلمہ کا وجود اور اس کی اصلاح کا کوئی جواز نہیں ہے۔

یہ دینِ اسلام کے ان شارحین داعیوں اور اسلام کے محققوں اور متکلمین کے گروہ کا وہ کارنامہ ہے، جس نے اپنے زمانے میں امام ابوالحسن اشعری، حجۃ الاسلام غزالی، ابوبکر باقلانی شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی کو پیدا کیا، اس گروہ کی ہر زمانہ میں ضرورت ہے اور یہ ضرورت تبدیلیوں کے احساس اور قرآن و سیرت، عقائدِ اسلامیہ اور تعلیماتِ اسلامی کو نئی زبان، نئے زورِ قلم، جدید استدلال، اور عصرِ حاضر کے فلسفوں، تاریخ و ادب سے واقفیت اور تقابلی مطالعے کے بغیر پوری نہیں کی جا سکتی۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس حقیقت و ضرورت کو محسوس کیا اور اپنی تحریروں بالخصوص "سیرۃ النبیؐ" میں، نیز اپنی شاہکار تاریخی تصانیف "ارض القرآن"، "عرب و ہند کے تعلقات" اور "خیام" وغیرہ میں اس کا پورا لحاظ رکھا، آپ پہلے اس حقیقت و ضرورت کی واقفیت و اہمیت ان کی زبان سے سنئے، پھر ان کی جلیل القدر تصانیف کا مطالعہ کر کے فیصلہ کیجئے کہ اس فرض اور علماء کے ذمہ قرض سے وہ کس خوبی سے عہدہ برا ہوئے، یہی خصوصیت ہے جو ان کو اس عہد کے متکلمین اسلام اور نئی اسلامی نسل کے معلمین اور محسنین کی صف میں شامل کرتی ہے، اور اس کے بغیر ان کی بلندی کا اندازہ اور اس یادگاری جلسہ کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا، "خیام" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "یورپ کے اس نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفہ سے بہت کچھ ہٹ کر تاریخ کی طرف منتقل ہو گیا تھا، اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی، یہاں تک کہ اس کو اسکولوں

اور کالجوں کے نصاب کا جزء اور علمی تحقیقات کا بڑا شعبہ بنایا گیا، اور خصوصیت کے ساتھ محکوم ملکوں کی درسگاہوں میں ان ملکوں کی تاریخ کو دھندلا کرکے دکھانا ضروری قرار دیا گیا، اور اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ وہ اپنی نسلی و قومی برتری کا اعلان کریں، اور اپنے مقابلے میں اپنی محکوم قوموں کی تاریخ و تمدن کے روشن چہرہ پر نئے نئے طرز سے ایسی سیاہی پھیریں کہ ان کو خود اپنے اسلاف سے آپ نفرت آئے، اور اہلِ یورپ کے کارناموں کے سامنے ان کو اپنے مذہبی و تمدنی، سیاسی و قومی کارنامے پھیکے نظر آئیں، اور اس طرح ان کا مذہب جو ان کی تمام تحریکات کی روح ہے، ہمیشہ کے لئے مردہ ہو جائے۔

اس کام کے لئے سب سے پہلے انھوں نے خود سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ پاک کو چنا اور اس کو اپنے ہر قسم کے اعتراضوں اور شبہوں کا مورد ٹھہرایا۔ اس کے بعد خلفائے راشدینؓ صحابۂ کرامؓ اور سلاطین اسلام کو اپنے اعتراضوں کا نشانہ بنایا، اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کی سلطنتوں کو طرح طرح سے ظالمانہ ثابت کرنے کے لئے سچ جھوٹ کسی سے دریغ نہیں کیا، اسلام کے اجتماعی، سیاسی اور تمدنی کارناموں کو اتنا بگاڑ کر دکھانے لگے کہ خود مسلمان نئے تعلیم یافتوں کو اپنی تاریخ سے آپ گھن آنے لگی۔"[۱۲]

ارض القرآن کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

"عہدِ قدیم میں مخالفین کے اعتراضات کا نشانہ اعتقادیات تھا، لیکن اس عصرِ جدید میں ہمارے مخالفین عقائدِ اسلام کی مضبوطی کا امتحان کر چکے ہیں، اُنھوں نے یہاں سے ہٹ کر تاریخ و تمدن کے میدان میں مورچے قائم کئے ہیں، ضرورت ہے کہ جس طرح ایرانی و یہودی مورخین کے مقابلے میں ابو حنیفہ دینوری (م ۲۸۱ھ) ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ) اور ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) نے قرآن کی تحقیق و تطبیق میں کوشش کی، اس زمانے میں جدید یورپین تاریخ کی تاریخ اسلام و قرآن سے تطبیق دی جائے اور یورپین تاریخی تحقیقات و اکتشافات کی غلطی کا پردہ چاک کیا جائے۔ اور خود انھیں کے کارخانوں کے بنے ہوئے ہتھیاروں سے ان کے حملوں کا جواب دیا جائے۔"[۱۳]

سیرۃ النبیؐ حصہ ہفتم کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

"اوّل تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاقِ حال تسکین پا سکے، اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں اُن کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات و اقتصادیات

کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلق اصولی نظریات سے قدماء کی کتابیں نصاً اکثر خالی ہیں، اور اُن کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے"۔[۱۴]

دارالمصنّفین کے رسالہ "معارف" کے پہلے اداریہ میں ان کے قلم سے حسبِ ذیل سطور نکلی ہیں جو ان کے صحیح ذوق اور ذہن کی ترجمان ہیں:

"ملک میں اس وقت علم و مذہب کے متعلق جو خیالات بھی پھیلے ہوئے ہیں وہ بالکل غیر معتدل ہیں، کچھ ایسے اشخاص ہیں جو عقل پرستی کے غرور میں مذہب اور مذہبی علوم کے ساتھ تمسخر سے نہیں شرماتے، دوسری طرف حامیانِ مذہب و علوم مذہبی کا جمود عام ہے جو عقل و علم، مصالح و حکم، فلسفہ و اسرار کی ضرورت سے منکر ہے، ملک میں دونوں قسم کے مضامین اور تصنیفات ہر روز شائع ہوتے ہیں، ہماری جماعت صلحِ عام کی منادی ہے، وہ دونوں فریق کو دعوت دیتی ہے، وہ جدید علوم، تازہ خیالات، نئی تحقیقات کی بجان و دل خریدار ہے، لیکن اس کے معاوضہ میں بزرگوں کا اندوختہ نہیں کھونا چاہتی ہے، ان نادانوں پر ہنسی آتی ہے جو تمام سرمایۂ عمر دے کر بازارِ فرنگ کی ہر چمکتی ہوئی چیز کے خریدار بن جاتے ہیں، ہر چیز کو خریدنے سے پہلے یہ جان لینا چاہیئے کہ کیا ہمارے بزرگوں کے تاریک تہہ خانوں میں، ویران خرابوں میں اور مدفون خزانوں میں یہ موجود تو نہیں؟ اگر ہیں تو وہ کون احمق ہوگا جو گھر میں ایک چیز چھوڑ کر اسی کی تلاش میں گلیوں اور بازاروں کی آوارہ گردی قبول کرے گا۔

دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے، لوگ اپنی وضع تبدیل کر رہے ہیں، مذاق، طرزِ معاشرت، طریق تجارت، اسلوبِ گفتگو ہر چیز میں نمایاں انقلاب ہے، اب اگر دلی کی پرانی وضع میں ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر ایک چھوٹی سی دکان پر بیٹھ کر ولی دکنی اور مظہر جان جاناں کی زبان میں ہم اکسیر بھی بیچیں تو کون خریدنے آئے گا؟ ہمارے گزشتہ علوم و فنون کا بھی بعینہٖ یہی حال ہے، ہم کو اسی سامان و متاع کو لے کر اب نئے ساز و سامان سے موجودہ طرز کی ایک بڑی شاپ میں بیٹھ کر شیشہ دار الماریوں میں اپنی دکان سجانی چاہیئے"۔[۱۵]

ہم اس خطبے کو مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی مرحوم (سابق ناظم دارالمصنفین) کے ایک شذرہ پر ختم کرتے ہیں، جس میں اُنھوں نے "دبستانِ سلیمانی" کا اچھا تعارف کرایا ہے، "مقالاتِ سلیمان" کے حصہ اول کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"ان مضامین میں اگرچہ بڑا تنوع ہے، لیکن ان کا مرکزی نقطہ اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تاریخ و تہذیب کی مرقع کشی اور اس کی تحقیق و تنقید ہے، اس لئے ان میں کثرت کے باوجود ایک طرح کی وحدت ہے، اُردو میں اس کے معلم اول مولانا شبلی تھے، سید صاحب نے اس کو کمال تک پہنچا دیا، اور ان

دونوں کی تصانیف اور طریقۂ تحقیق نے ایک مستقل مکتبِ فکر قائم کر دیا اور اس موضوع پر لکھنے والوں نے انھیں کے نقشِ قدم کی تقلید کی، اگر تنہا انھیں کی تصانیف اور مضامین پڑھ لئے جائیں تو مذہبِ اسلام، اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تاریخ و تہذیب کے تمام اہم پہلو سامنے آجائیں گے"۔[۱۶]

حضرت سید صاحب کی یاد اور ان کے کمالات و خدمات کے تشکر و اعتراف کے سلسلے میں یہ تاریخی اجلاس ایک ایسے شہر میں منعقد کیا جا رہا ہے، جس سے خود ان کے اور ان کے مربی محبوب استاذ علامہ شبلیؒ اور ان دونوں کے عزیز ادارہ دارالمصنفین کے گہرے اور گوناگوں تعلقات رہے ہیں، اور خود بقول علامہ شبلیؒ کہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف اور اس کے عالمِ وجود میں آنے میں اس کا گراں قدر حصہ ہے، مولانا فرماتے ہیں ع

معارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت کہ ابرِ فیضِ سلطانِ جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل کہ جس میں اک فقیرِ بے نوا ہے اک سلطاں ہے

آپ سب جانتے ہیں کہ سلطان سے مراد والیۂ بھوپال سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ ہیں، جو ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۲ء میں اورنگ نشینِ ریاست ہوئیں اور ۱۳۴۸ھ / ۱۹۳۰ء میں انھوں نے وفات پائی، پھر خود سید صاحبؒ نے سلطان جہاں بیگم صاحبہ کے فرزند ارجمند جناب نواب حمید اللہ خاں والیِ بھوپال کی خواہش و درخواست پر قاضی القضاۃ ریاست، جامعہ احمدیہ کے امیر اور دینی تعلیم اور مذہبی امور کے صدر کا عہدہ قبول فرمایا جو اس ریاست کے لئے بڑے امتیاز و اعزاز کا باعث تھا، سید صاحبؒ جولائی ۱۹۴۶ء میں بھوپال تشریف لائے اور اکتوبر ۱۹۴۹ء تک تقریباً چار سال رہ کر اس مسلم ریاست کے (جو کبھی شیراز و یمن کی ہمسری کرتی تھی اور ہندوستان ہی نہیں عالمِ اسلام کے متعدد چیدہ و برگزیدہ مشائخ و علماء و فقہاء و محدثین کا مرکز رہ چکی تھی) علمی اور دینی حلقوں کو اپنے نادرۂ روزگار علمی تجربات، دینی رہنمائی اور قیمتی صحبتوں اور مجالس سے فیض پہنچایا۔

اس سب کے ماسوا یہاں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فرزندوں اور فضلاء کی ایک وفا شعار جماعت کے اتنے افراد موجود ہیں جو بیک وقت کم کسی شہر میں موجود ہوں گے، (یہ ناظم ندوہ عرض کر رہا ہے، اس لیے اس کی شہادت کسی قدر وقعت رکھتی ہے) یہ اجلاس جو اپنی بہت سی خصوصیات میں ممتاز ہے اسی جذبۂ تشکر اور احسان شناسی کا نتیجہ و مظہر ہے، اور کیا عجب ہے کہ سید صاحبؒ کی روح سروشِ غیب کی زبان سے یہ پیام دے رہی ہو کہ ؎

حوالے و تعلیقات:

(۱) سیرۃ النبی ج ۲ ص ۷   (۲) رفیق محترم حافظ محمد عمران خاں ندوی صاحب، امیر دار العلوم تاج المساجد بھوپال

(۳) پرانے چراغ ج ۱ ص ۵۸   (۴) کاش مجھے اتنی فرصت ہوتی اور میں اس کو عالی مرتبت سفیر مصر کی تلقین "کہ ہم زمانہ کا ساتھ دیں اور اس کے قدم بقدم چلیں" کے جواب میں پیش کرتا۔

مغربی تہذیب تو خود ایک ایسے پکے ہوئے پھل کی مانند ہے کہ جس کی طرف کوئی دستِ بے باک بڑھے اور اس کو توڑ لے، اس کو انتظار ہے کسی اہلِ طاقتور اور صاحبِ پیغام ملت کا جو اس نئے عہد کے لیے نیا پیغام رکھتی ہو، اس کے اندر حیات بخشی کی طاقت ہو اور وہ مغربی تہذیب کو جو اس وقت جاں کنی کے عالم میں ہے زوال سے بچالے۔   (۵) حیات سلیمان از شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۴۰۵

(۶) اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ (۷) پرانے چراغ ج ۱ ص ۵۳-۵۴ باختصار و انتخاب۔

(۸) سید صاحب کے ان مضامین اور تقریروں کے مجموعہ کا نام ہے جو زبان و ادب اور اردو اور ہندوستانی سے متعلق ہیں (۹) مشہور صوفی و عارف شاعر ابراہیم بن شہریار فخر الدین ہمدانی متخلص بہ عراقی، مرید شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی متوفی ۶۸۸ھ، حالات کے لیے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر"، ج ۲ ص ۲۰۱

(۱۰) پرانے چراغ ج ۱، ص ۳۶-۳۷   (11) DAVENPORT, JOHN. APOLOGY FOR MOHAMMED AND THE KORAN.   (۱۲) دیباچہ حیات شبلی ص ۲۳   (۱۳) ارض القرآن ص ۵

(۱۴) مقدمہ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۵   (۵) معارف کا پہلا اداریہ منقول از حیات سلیمان ص ۱۰۶

(۱۶) دیباچہ مقالات سلیمان ج ۲ ص ۱-۲

سید صباح الدین عبد الرحمٰن ★

کلیدی مقالہ

صدر محترم و معزز حاضرین!

اس وقت آپ کے سامنے یہ خاکسار ملی جلی کیفیات کے ساتھ کھڑا ہے، اس سرزمین مین آکر اس پر شکر گزاری کے جذبے کی کیفیت اس لیے طاری ہے کہ یہاں کے سابق حکمراں خاندان کی فیاضی اور کرم گستری دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کی تاسیس اور فروغ میں معاون ہوئی جس کے بانی ناظم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی تھے، پھر یہیں ان کے بڑے بھائی کو مجددیہ سلسلے کے فیوض و برکات حاصل ہوئے اور یہیں خود ان کی زندگی کے کچھ آخری ایام گذرے، اور اب یہیں ان کے محبوب شاگرد اور اسی تعلق سے میرے برادر عزیز مولانا محمد عمران خاں ندوی الازہری اس شاندار اجتماع میں ان کی یادوں کی قندیل کو فروزاں کر رہے ہیں، خاکسار کے دل میں مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی الازہری کی گوناگوں خوبیوں کے احساس کے ساتھ ان کا بے پناہ احترام اس لیے بھی ہے کہ انھوں نے سطوت دین مبین کی خاطر "تاج المساجد" کی از سر نو تعمیر کر کے آئندہ نسلوں کو یہ سبق سکھایا ہے کہ وہ تاج محل کی طرح کوئی دوسری عمارت تو نہیں تعمیر کر سکتے، لیکن محنت، ریاضت اور جوش و ولولے سے اُن کی طرح اپنی علمی زندگی کا تاج محل بنا سکتے ہیں، مگر اس وقت ان سے یہ خاکسار گلہ مند بھی ہے کہ ایک مور ناتواں کو بارگاہِ سلیمان میں پیش کر کے اس کے اوپر اس کی قوت تحمل سے زیادہ بار ڈال دیا ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس بارگاہ کے جلوہ ہائے صد رنگ کو یہاں کیسے دیکھے اور دکھائے اس کے لیے الفاظ کے جن اور پری کو قابو میں لانے کی ضرورت ہے، جو اس کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے تحریر بھی بلقیس صفت ہونی چاہیے، جو اس کے لیے ممکن نہیں، اسی لیے وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہے

ع نگاہِ شوق میسّر نہیں اگر تجھ کو   ترا وجود ہے قلب و نظر کی رُسوائی

مگر آپ کے سامنے کچھ کہنا ہے، اس لیے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس بارگاہ کے تاجدار کیا تھے،

★ ناظم دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

ہم کو کیا دے گئے، اور ہم ان سے کیا درس لے سکتے ہیں؟

ان کی ولادت پٹنہ ضلع (اب نالندہ ضلع - بہار) کے ایک گاؤں دیسنہ میں ۱۸۸۴ء میں ہوئی، ان کی تاریخ ولادت سنہ ہجری سے اس مصرع سے نکالی گئی ع شدہ مہرِ تاباں ز برجِ کمال ۱۳۰۲ھ، برجِ کمال کا یہ مہرِ تاباں کراچی میں ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء میں غروب ہوا، ان کی وفات کو بتیس سال گزر چکے ہیں، لیکن ان کو دیکھنے والے ابھی بہت سے لوگ موجود ہیں، اس مجلس میں بھی ہیں، ان کو ان کا سرو قد، بیلے کے پھول کے رنگ جیسا ان کا سفید چہرہ، اس پر چودھویں رات کے چاند کی چاندنی جیسی ان کی داڑھی، عقیق کی کٹوریوں کی طرح اُن کی آنکھیں، گوری چنبیلی جیسی اُن کی جبیں، جسم پر ڈھلی ہوئی ان کی شروانی اور اس کے اوپر وزن و وقار کے خوبصورت تاج جیسا اُن کا عمامہ یاد ہوگا، اُن کو دیکھنے والوں کی آنکھیں اب بھی دیکھتی ہوں گی کہ وہ چلتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ سنجیدگی ان کے یسار اور متانت اُن کے یمین میں ہے، بزرگی ان کے اوپر چتر ڈالے ہوئے ہے، اور عظمت ان کے سامنے کوکبہ لیے ہوئے ہے، ان کے دیکھنے والوں کو یہ بھی یاد ہوگا کہ وہ بولتے تو علم ان کے منہ کو چومتا، ہنستے تو ان کے قلب کی پاکیزگی ان کی ہنسی کی آواز میں سنائی دیتی، کسی سے ملتے تو ملنے والا اپنے کو لطف و کرم کے حصار میں محصور پاتا، جن عزیزوں کو ان کی گھریلو زندگی کی مجلسوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا تو وہ دیکھتے کہ جب وہ اپنے بچوّں کے درمیان میں ہوتے تو یہ بچے اپنے سامنے دلبری کی کوثر اور شفقت کی تسنیم بہتے دیکھتے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں اپنے کسی بچے یا بچی کو خشمگیں آنکھیں نہیں دکھائیں، اپنے ملازم کو بھی کبھی نہیں ڈانٹا، انھوں نے داغِ جگر لالہ کی طرح زندگی بسر کرنے کو زیادہ ترجیح دی، دوسروں کی باتیں سن کر بیمار پڑ سکتے تھے مگر اُن سے اُلجھ کر اپنے کو شرمسار کرنا پسند نہ کرتے تھے، وہ کہتے کہ میں کسی کو بُرا نہیں سمجھتا، جب تک کہ وہ خود اپنے کو بُرا ثابت نہ کر دے۔

وطن میں ہوتے تو اپنی بے تکلفی سے اپنے ہم وطنوں پر اثر ڈالتے کہ وہ ان ہی کے لیے ہیں، ان کے والد بزرگوار میں بڑا زہد و اتقا تھا، آداب و تہذیب کے لیے بھی مشہور تھے، اس کا اثر ان کی زندگی پر بھی پڑا، اُن کے بڑے بھائی ان کی کمسنی کے زمانے میں عورتوں کی مجلس میں حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان پڑھوایا کرتے تھے، جس کا اثر ان کے ذہن پر ایسا پڑا کہ ان کا بیان ہے کہ علمِ کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی، رازی اور ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گذرے، مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین بہرحال اپنی جگہ پر رہی۔[1]

ان کے خاندان میں صرف مذہبی تعلیم رہی، لیکن ان کے گاؤں کے لوگ زیادہ تر انگریزی زبان کے ذریعے سے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا رہے تھے، ان کا وقت گاؤں میں ایسے ہی

ہم وطنوں کے ساتھ گذرتا، اس لیے غیر شعوری طور سے ان پر قدیم و جدید دونوں رنگ چڑھے۔

وہ اپنے گاؤں سے نکل کر پھلواری شریف پٹنہ کی خانقاہ مجیبیہ میں مزید تعلیم کے لیے آئے، یہاں اس کے سجادہ نشین حضرت شاہ محی الدین کے زیر سایہ رہے، خانقاہ میں مجلس سماع بھی ہوتی تھی، جس سے ان کو شعر و سخن کا چسکہ پڑا، یہیں انھوں نے مولانا عبدالحلیم شررؔ کا ناول "منصور موہنا" پڑھ کر ختم کیا تو پھوٹ پھوٹ کر روئے، یہی آنسو آگے چل کر ان کے لیے علم کا منصور، اور فضل کی موہنا بن گئے، پھلواری شریف کے بعد دربھنگہ کے مدرسہ امدادیہ میں رہ کر کچھ دنوں تعلیم پائی، یہاں انھوں نے طلبہ کی انجمن میں تعلیم نسواں پر ایک مضمون پڑھا جو پٹنہ کے ہفتہ وار اخبار "الپنچ" میں چھپا، یہ مضمون ان کے لیے سم سم کا جادو بن گیا، جس کے بعد ان کے لئے مضمون نگاری کے دروازے برابر کھلتے رہے، اسی زمانے میں اپنے گاؤں کی انجمن "الاصلاح" میں ایک نظم پڑھی، جس کے دو شعر یہ تھے

ع اب کہاں قرطبہ و اندلس و بیت الحمرا سوتے ہیں چین سے اسلاف درونِ تربت
زیورِ علم سے آراستہ فرمائیے روح قوم کے ہاتھوں میں دے دیجیے شمعِ عزت

ایسی نیک ساعت میں یہ دعا مانگی تھی کہ ان کی زندگی کا مقصد یہی رہا کہ قوم کے ہاتھوں میں شمعِ عزت دے دیں، مگر اس کے لیے اپنی نثر نگاری ہی کو ذریعہ بنایا، شاعر بن سکتے تھے، مگر اس کی طرف بہت کم توجہ کی۔

جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء آئے، تو کچھ دنوں کے بعد ان کی صلاحیت سے متاثر ہو کر مولانا شاہ سلیمان پھلواروی‌ؒ نے وہاں کے ایک جلسے میں یہ پیشین گوئی کی کہ ان شاء اللہ ایک سلیمان بہار کی سرزمین میں علم اور دین کی خدمت کے لیے موجود رہے گا، جب مولانا شبلی نعمانیؒ اس ادارہ سے وابستہ ہوئے تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ ع زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے۔ اور وہاں کی یہ فضا کہہ رہی تھی کہ جس طرح علامہ ابن تیمیہؒ کو حافظ ابن قیمؒ مل گئے تھے، اسی طرح مولانا شبلی نعمانیؒ کو ایک جاں نثار شاگرد مل گیا، اسی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے پورے سوزِ جگر اور سوزِ دماغ سے شاہ عبدالعزیز محدثؒ دہلوی کا رسالہ عجالۂ نافعہ حافظ ذہبیؒ کی تذکرۃ الحفاظ، حافظ ابن حجرؒ کی فتح الباری، امام مالکؒ کی موطا ابن ندیم کی الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون ابن خلکان کی وفیات، شہرستانی کی الملل والنحل، ابن حزم کی فصل الملل والنحل، ابن رشد کی کشف الأدلہ، اور شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کر کے بہت کچھ حاصل کیا، مگر لکھتے ہیں کہ بالآخر علامہ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کی تصنیفات نے ہر نقش کو مٹا ڈالا، اور ہر رنگ کو بے رنگ کر دیا[۲]، اور جب ان کی دستار بندی کے موقع پر ان کی ایک برجستہ تقریر سے

متاثر ہو کر مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنا عمامہ آتار کر ان کے سر پر رکھ دیا تو اس علم کی کلاہ کو مہر عالمتاب بنانے کی ذمہ داری سے برابر دبے رہے۔

مولانا شبلی نعمانیؒ نے ان کو جب دار العلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان رسالہ "الندوہ" کے علمی کاموں میں شریک کیا تو ان کے علمی ذہن کے دریچے کھلتے گئے، انھوں نے اس میں مضمون نگاری کر کے نہ صرف اپنے کو دریافت کیا، بلکہ ان پر یہ بھی ظاہر ہوا کہ ع علم دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، عزت بھی ہے۔ اس رسالہ میں انھوں نے قرآنیات میں "قضا و قدر اور قرآن مجید"، "الفرقان والفلسفۃ الجدیدۃ" اور "مسئلۂ ارتقا" حدیث میں "علم الحدیث"، "امام بخاری"، "موطا امام مالکؒ" اور "طبقات ابن سعد" تاریخ میں "فرماں روایان اسلام کا دربار"، "خواتین اسلام کی بہادری"، عربی زبان و ادب میں عربی کی مشہور کتاب "نہایۃ الارب فی فنون الادب" کی بیس۲۰ جلدوں پر تبصرہ، ہیئت و نجوم میں "علم ہیئت اور مسلمان"، "اسلامی رصدخانے" متفرقات میں "برنابا کی انجیل" اور "مستشرقین کی خدمات" اور طرح طرح کے عنوانات پر مضامین لکھے، جن سے ان کے ذوق کی رنگا رنگی اور ان کی آیندہ کی علمی زندگی کی درخشانی کی شہادت ملی۔ اس رسالے کے ان کے تمام مضامین کو جمع کر کے شایع کیا جائے تو کئی جلدیں ہو جائیں، لیکن علم کے شاہین نے ان کے مجموعے شایع کرنے کی کبھی فکر نہیں کی، اس لیے کہ وہ ان کو اپنے علمی لہو کو گرم رکھنے کا محض بہانہ سمجھتے رہے، ان کی نظرِ علم کے نیلگوں "آسمان بے کرانہ" کی طرف اُٹھتی رہی، دار المصنفین کی طرف سے "حیاتِ امام مالکؒ" کے نام سے جو بعد میں کتاب شایع ہوئی، اس میں الندوہ ہی کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے ۱۹۰۶ء میں کئی قسطوں میں لکھے تھے۔ ان کے لکھنے کے وقت ان کی عمر تیئیس۲۳ سال کی تھی، مگر اس کا مطالعہ کرتے وقت یہ معلوم ہوگا کہ کسی سن رسیدہ اور تجربہ کار مصنّف کی محنت و کاوش کا یہ نتیجہ ہے، اس کے لکھنے کا مقصد فقیہ مدینۃ الرسولؐ امام دار الہجرۃ اور بانیٔ اول فن حدیث کو صرف خراج عقیدت پیش کرنا تھا، دار المصنفین ہی کی طرف سے ان کے مضمون "خواتین اسلام کی بہادری" کو بھی ایک رسالے کی صورت میں شایع کیا گیا تو اس کو بہت سے ایڈیشن نکلے، اس کے انگریزی ترجمہ کے تو بارہ۱۲ ایڈیشن نکل چکے ہیں، وہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں کچھ دنوں مدرس بھی رہے، اس زمانے میں عربی کی دو ریڈریں "دروس الادب" کے نام سے لکھیں، چاہ زمزم کی طرح اس کا فیض اب تک جاری ہے، اسی زمانے میں عربی کی "لغاتِ جدیدہ" لکھ کر لغت نویسی سے بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

اس زمانے کی ملی سیاست سے متاثر ہو کر مولانا ابو الکلام آزاد کے مشہور ہفتہ وار جریدہ "الہلال" کی ادارت میں بھی شریک ہوئے، اس میں ان کے کچھ مضامین میں ابو الکلامیت پائی

جاتی ہے، مگر اسی میں ان کے جو علمی مضامین شائع ہوئے تو یہ اندازہ ہوا کہ صحافت نگاری میں علمی رنگ کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے، الہلال کی ادارت سے تھوڑے دنوں تک وابستہ رہنے کے بعد پونا کالج میں مشرقی زبان کے معلم ہو گئے، اپنے شفیق استاد مولانا شبلی نعمانیؒ کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق اعظم گڑھ آگئے، تو اپنے استاد کے تخیل دار المصنفین کو ان کی محبت کے سرور اور اپنے شوق کے ناز و نیاز بلکہ خونِ جگر سے علم کا قرطبہ، فن کا الحمراء، اور فضل کا بیت الحکمۃ بنا دیا، یہاں انھوں نے بتیس^{۳۲} سال رہ کر اس طرح زندگی گذاری کہ دیکھنے والے کہتے رہے کہ ان کی امیدیں قلیل لیکن مقاصد جلیل ہیں، دار المصنفین کے در و دیوار سے اب بھی ان ہی کے تب و تاب جاودانہ کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے، یہاں کی محنت شاقہ سے ان کا جسم کبوتر کا تن نازک بن گیا تھا لیکن ان کا علمی جگر شاہین کا جگر بنتا چلا گیا۔

یہاں سے سنہ ۱۹۱۶ء میں رسالہ "معارف" نکالنا شروع کیا، اس میں اپنے شذرات کے ذریعہ سے کبھی ساقیٔ لالہ فام بن کر زندگی کا جام مے پلایا، کبھی یم زندگی اور رم زندگی دونوں کو قابو میں لانے کا سبق پڑھایا، کبھی اپنی نظر و فکر سے خوب و ناخوب کی تمیز دلائی، کبھی مسلمانوں میں ملی حمیت، سیاسی غیرت اور ایمانی حرارت پیدا کرنے میں ان کے قلم کی صدیقیت، فاروقیت اور مرتضویت رونما ہوتی رہی، یہ شذرات ان کے طرح طرح کے خیالات کے گل و نرگس و سوسن و نسترن بھی ہیں۔

معارف میں مختلف عنوانات سے ان کے جو مضامین شائع ہوئے وہ انیس سو^{۱۹۰۰} صفحات پر مشتمل ہیں، یہ مذہبی بھی ہیں، کلامی بھی، تحقیقی بھی، تاریخی بھی، ادبی بھی، سیاسی بھی، تنقیدی بھی اور تعزیتی بھی، معارف میں لکھنے کے ساتھ ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں میں بھی بکثرت مضامین لکھتے رہے، جن سے ان کی محنت بلکہ سخت کوشی کا اظہار ہوتا ہے، لیکن اسی نے ان کی علمی زندگی کو انگبیں بنائے رکھا تھا۔

ان مضامین کے مجموعے شائع کرنے کی کوئی فکر نہیں کی، بہت اخیر میں اردو زبان و ادب پر جو مضامین لکھے تھے، ان کو "نقوشِ سلیمانی" کے نام سے شائع کرایا، اپنے معاصر مشاہیر کی وفات پر جو نوحے لکھے تھے ان کو بھی "یادِ رفتگان" کے نام سے مرتب کرایا، بعض حلقوں میں ان کی "نقوش سلیمانی" ہی کی بدولت ان کو صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز تسلیم کیا گیا ہے، لیکن ان کی اور تصانیف غور سے پڑھی جائیں تو ان میں وہ اور بھی بہتر قسم کے انشاء پرداز نظر آئیں گے، شعر و ادب پر تحریر تو خود ہی لچکتی، سرکتی، سنبھلتی اور بل کھا کر نکلتی چلی جاتی ہے، مگر قلم کو پھول کی پتی بنا کر گہرے علوم و فنون کے ہیرے کو کاٹنا بڑا مشکل کام ہے، حضرت سید صاحبؒ نے اپنی تمام تصانیف میں علمی ہیرے کے جگر کو اپنے

قلم کے پھول کی پتی سے جس طرح کاٹا ہے اسی میں ان کی انشاء پردازی کا اصلی کمال نظر آتا ہے۔

ان کے تعزیتی مضامین کا مجموعہ "یادِ رفتگاں" کے نام سے شائع ہوا تو یہ ان کے معاصر مشاہیر کے تذکرے کی حیثیت سے ابھی تک پڑھا جاتا ہے، اسی کے ساتھ ان کا سینۂ پُر داغ ان کی تحریروں میں لالہ کا خیابان بھی بن گیا ہے۔

دارالمصنفین میں ان کی پرشور، پرسوز لیکن پُربہار تصنیفی زندگی کی ابتداء ان کی تاریخ ارض القرآن[1] کی دو جلدوں کی اشاعت سے ہوئی ہے، وہ جب کسی تصنیف کا آغاز کرتے تو ان کے ذہن کے سامنے تین[2] ارباب کمال ہوتے: ابن خلکانؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ اور نظام حیدرآباد کے وزیر اعظم نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، تاریخ ابن خلکان کا مطالعہ اپنی طالب علمی سے لے کر آخر وقت تک کرتے رہے، وہ اس کی اس بات سے متاثر تھے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے بڑی محنت سے لکھتا ہے، روایت پر اعتبار کر کے درایت سے کام لیتا ہے، جو باتیں خلافِ عقل ہوتی ہیں ان کو بالکل نہیں چھوتا، پھر اس کی عبارت میں لطافت اور بیان میں حسن ہوتا ہے۔[3] ان کے استاد مولانا شبلی نعمانیؒ کی بھی یہ تعلیم رہی کہ معلومات کو ہر کونے سے اس محنت سے ڈھونڈو کہ پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے، اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے کچھ لکھا ہو تو اس سے مضمون بالکل الگ رہے، یا اس سے بڑھ جائے، جملے کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی، اور تشبیہ و استعارات کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے۔[4] انھوں نے اپنے استاد کی وفات پر جو نوحہ لکھا تھا، اس کی جہاں اور حلقوں میں تعریف ہوئی، وہاں حیدرآباد سے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے ان کو لکھا کہ عرض ہنر اس وقت تک نہیں کرنا چاہیے جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ اب اس ہنر میں میرا کوئی حریف نہیں ہو سکے گا۔[5] یہ لکھ کر حضرت سید صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ یہ نکتہ میرے لیے رہنما ثابت ہوا۔

وہ جو کچھ لکھتے بڑی محنت سے لکھتے، سہل انگاری ان کی تصنیفی شریعت میں معصیت تھی، انداز بیان اور تحریر کے وزن، وقار اور حسن کا لحاظ رکھتے، اس وقت تک چھپنے کے لیے کوئی چیز نہ دیتے جب تک کہ ان کو اپنے عرض ہنر پر پورا اطمینان نہ ہو جاتا۔

"تاریخ ارض القرآن" گو ان کی ابتدائی تصنیف ہے، لیکن یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس کے عرض ہنر میں ان کا اب تک کوئی حریف نہیں ہو سکا، ان کو قرآن مجید سے عشق رہا، اسی لیے انھوں نے اس کی سرزمین کی قوموں کو اپنا محبوب موضوع بنایا، عام طور سے قرآن مجید کو لوگ پند و موعظت اور عبرت و بصیرت کا محض صحیفہ سمجھتے ہیں، لیکن حضرت سید صاحبؒ نے "تاریخ ارض القرآن" لکھتے وقت اس کو تاریخ و سیر کا ایک بہت ہی اہم ماخذ بھی بنا دیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے لکھنے میں زبور، توریت، انجیل، پھر

یونانی، یوروپی اور عرب مورخوں کی تصانیف، جغرافیہ کی کتابوں، آثار قدیمہ کے انکشافات اور کتبات کو جس طرح استعمال کیا ہے، اور اُن سے جو تاریخی نتائج استنباط کیے ہیں، وہ تلاش تجسس، تفحص، نظر اور فکر کے ایسے نمونے ہیں جن سے آجکل کے مستشرقین بھی استفادہ کر سکتے ہیں، یہ دونوں جلدیں ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئیں، اس وقت ان کی عمر چونتیس ۳۴ سال کی تھی۔

ان دونوں جلدوں کی اشاعت کے ساتھ اپنے استاد مرحوم کی سیرۃ النبی کی ترتیب و تہذیب بھی پوری جانکاہی سے کی، ان کے احترام میں ان کے مسودے پر انگلی رکھتے ہوئے ڈرتے تھے، اگر کہیں ایسی گستاخی کرنی پڑی تو بقول ان کے خواب میں چونک جاتے تھے۔ پھر بھی کچھ مقامات پر اضافہ کی ضرورت پڑی لیکن اس کی کامل احتیاط کی کہ شاگرد کا کوئی لفظ استاد کی عبارت میں ملنے نہ پائے، اس لیے ان جزوی اضافوں کو قوسین کے اندر جگہ دی، اس کی پہلی اور دوسری جلد کی اشاعت سے خوش تھے کہ استاد مرحوم کے ہاتھ میں حسن عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چن کر آئے تھے، ان کو وہ قوم کی نذر کر رہے ہیں، اور آستانۂ نبوت پر بھی چڑھا رہے ہیں، اس کی پہلی جلد ۱۹۱۸ء اور دوسری جلد ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۲۰ء میں ان کی "سیرت عائشہؓ" شائع ہوئی، جس میں نسوانیت کی عفت، محبت، طہارت، اطاعت، خشیت الہٰی اور دوسرے فضل و کمال کا حجلۂ عروسی سجایا گیا ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ نسوانیت کو کیسے معراج حاصل ہو سکتی ہے اور دنیا کیسے اس کے سامنے جھک سکتی ہے، یہ کتاب ہر مسلمان عورت کی سیرت کے روئے تاباں کے غازہ کا کام دیتی رہے گی، مدینہ منورہ کے ایک استاد نے راقم سے کہا کہ اس پایہ کی کتاب اب تک عربی میں نہیں لکھی گئی، اس کے لکھنے میں کسی تاریخ کا سہارا نہیں لیا گیا ہے، احادیث نبوی ہی کو تاریخ بنا دیا گیا ہے، ان ہی کے سہارے یہ سوانح عمری ایسی مرتب ہو گئی ہے جو بے شمار تاریخی کتابوں کے ذریعے سے نہیں لکھی جا سکتی تھی، اس میں طبقات ابن سعدؒ، تذکرۃ الحفاظ ذہبی، تہذیب ابن حجرؒ، فتح الباری، قسطلانی، نووی، صحیح مسلم، ابو داؤد، اور مسند امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے، لیکن زیادہ تر زور صحیح بخاری پر دیا گیا ہے، لکھتے ہیں کہ اس میں حضرت عائشہؓ کے حالات بہت متفرق اور منتشر تھے، لیکن ان کو ڈھونڈ کر اس طرح یکجا کیا جس طرح چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے کوئی چنے، انھوں نے روایت و درایت کے اصولوں کی پابندی میں بڑی احتیاط کی ہے، درایت کے سلسلے میں حضرت عائشہؓ کے اس اصول کو بڑی اہمیت دی ہے کہ روایت کلام الہٰی کی مخالف نہ ہو، اسی کو سامنے رکھ کر اس کتاب میں بکثرت ایسی روایتوں کو رد کیا ہے، جو ان

کے اصول درایت پر پوری نہیں اترتی تھیں جن حدیثوں کو رد کیا ہے، اس سے گزشتہ پینسٹھ ۶۵ سال میں علمائے امین کو کوئی اختلاف نہیں ہوا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب پوری تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے، البتہ حضرت عائشہ رض کی شادی کے وقت ان کی جو عمر بتائی ہے، اس سے کچھ اختلاف ضرور پیدا ہو گیا ہے، لیکن حضرت سید صاحب کو آخر وقت تک اس پر اصرار رہا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہی معتبر احادیث کی رو سے صحیح ہے، پھر سوانح نگاری کے فن کے جس معیار سے یہ کتاب جانچی جائے گی، اس پر یہ پوری اترے گی، حضرت سید صاحبؒ نے طبریؒ، اور ابوالفداؒ کی بعض روایتوں کی جو تکذیب عبدالبرؒ کی استیعاب، ابن اثیرؒ کی اسد الغابہ، اور سیوطیؒ کی تاریخ کی روشنی میں کی ہے، اس سے ان کی وقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے، پھر واقعۂ افک اور جنگ جمل کے واقعات کا جس موثر انداز میں تجزیہ کیا ہے، اس کی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر ناظرین نہیں رہ سکتے۔

اس کتاب کے اندازِ بیان کی خوبی یہ ہے کہ حضرت عائشہ رض کی زندگی کے جو بھی واقعات قلمبند کیے گئے ہیں، وہ آنکھوں دیکھا حال جیسا بیان معلوم ہوتا ہے، تمام معلومات میں ایسا تسلسل رہا ہے کہ سارے واقعات موتیوں کی لڑیاں دکھائی دیتی ہیں، کتاب ختم کرنے کے بعد ناظرین محسوس کریں گے کہ انھوں نے دنیا کی ایک بہت ہی جلیل القدر خاتون نامرۂ اسلام کی مریم، کاشانۂ نبوت کی ملکہ اور فضل و کمال کے ایک بے مثال پیکر کے نہ صرف حالات پڑھے، بلکہ قرآن مجید، حدیث اور علم کلام کے بہت سے اسرار سے بھی واقف ہو کر اپنے ایمان کی سلامتی اور ذہن کی جلا کا بھی سامان کر لیا ہے، پھر مؤدب، متین، باوزن اور باعظمت اسلوب سے بھی محظوظ ہوتے رہے۔

"سیرۃ عائشہ رض" کے بعد "سیرۃ النبیؐ" کی تیسری جلد ۱۹۲۴ء میں شایع ہوئی، جو خالص حضرت سید صاحبؒ ہی کی تصنیف ہے، اس میں معجزات پر مباحث ۸۶۸ صفحے میں ہیں، ان میں ۸۳ صفحے مولانا عبدالباری ندویؒ کے لکھے ہوئے ہیں، اس میں تاثراتِ فلکیہ، علل خفیہ، قوت کمالیہ، قوت نفیہ، تاثرات نفسانیہ، مکالمۂ الٰہی، وحی، نزول ملائکہ، عالم رویا، مشاہدات، مسموعات، معراج، معراج کے اسرار، اعلانات، انعامات، شق القمر، اور شق صدر پر جو کلامی اور فلسفیانہ رنگ کے مباحث ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی علمی معرفت، دینی بصیرت، تحقیقی دیدہ وری کس طرح اوج کمال کی طرف بڑھ رہی تھی، معجزہ کی غامض بحث میں ہم کو یہ یقین دلایا ہے کہ نبوت کا اصلی معجزہ یہ ہے کہ نبی زنگ آلودہ نفوس اور سیہ کار قلوب کو جلا دیتا ہے، لوگوں کو کتاب و حکمت اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اچھی باتوں کو پھیلاتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے، طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرتا ہے، قوموں کے بوجھ کو اتارتا ہے، نیکوکاروں کو بشارت سناتا ہے، بدکاروں کو عذابِ الٰہی سے ڈراتا ہے، اور ظلمت کدۂ عالم میں وہ چراغ بن کر چمکتا ہے، خوارق عادات معجزۂ نبوت کے ظاہری آثار ہیں، جو صرف وہ لوگ طلب کرتے ہیں جن کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں، اور جو تعصب و عناد اور جہل کے باعث حق کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ حضرت

موسیٰؑ کو معجزہ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں نہیں بلکہ فرعون کے مقابلے میں دیا گیا، حضرت عیسیٰؑ سے ان کے حواریوں نے نہیں بلکہ یہودیوں نے معجزہ طلب کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے نہیں، بلکہ ابولہب اور ابوجہل نے معجزہ مانگا، اسی لیے قرآن مجید نے طلب معجزہ کو کفار کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن سید صاحبؒ نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ انبیاءؑ ظاہری آیات اور مادی نشانات سے خالی ہیں، انبیاءؑ کو باطنی آیتوں کے ساتھ ظاہری حصہ بھی ملتا ہے، قرآن مجید نے اکثر انبیاءؑ کے سوانح و واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و فضائل کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے، لیکن یہ مادی اور ظاہری نشانات نبوت کی اصلی حقیقت سے خارج ہیں، سید صاحبؒ نے ان نکتوں کو قرآن مجید کی آیتوں کے ذریعے سے اچھی طرح سمجھایا ہے، پھر سحر و معجزہ کا فرق اور ساحر و پیغمبر میں امتیاز بتا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا ذکر کیا ہے، ان میں پہلے تو ان معجزانہ واقعات کی تفصیل لکھی ہے جو بنص صریح اشارۃً قرآن مجید میں مذکور ہیں، پھر ان معجزات کا ذکر ہے جو صحیح اور مستند روایات سے ثابت ہیں، اور پھر ان معجزات پر بھی بحث ہے جن کو بعض محدثین اور ارباب سیر نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، مگر محدثانہ اصول کی بنا پر وہ تمام تر کمزور اور غیر مستند ہیں، حضرت سید صاحبؒ نے اس پر زور دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش گاہ الٰہی سے جو معجزات عطا ہوئے ان میں سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے، اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات وقتی اور عارضی تھے، ہوئے اور ہو کر مٹ گئے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزۂ اعظم یعنی قرآن مجید قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے گا، اور قیامت تک نئے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا رہے گا، اس معجزہ کے متعلق خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ اعلان کیا ہے کہ تمام جن و انس مل کر بھی چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنائیں تو نہیں لا سکتے، دنیا ہمیشہ اس کی مثالیں پیش کرنے سے عاجز اور درماندہ رہے گی"۔

اس جلد کے لکھنے میں ان کا اصلی ماخذ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ ہیں، قرآن مجید کی آیتوں کے تدبر میں اپنے ہی فہم و ادراک پر زیادہ بھروسہ کیا ہے، تفسیروں کا سہارا نہیں لیا، احادیث میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، ابوداؤد، سنن ابن ماجہ، نسائی، موطا امام مالک، مسند احمد بن حنبل، مستدرک حاکم، شرح مواہب اور جوامع الکلم کے حوالے جا بجا دیے گئے ہیں، توراۃ اور متی کی انجیل بھی ان کے زیر نظر رہیں، ابن اسحاق اور ابن ہشام بھی ان کے سامنے رہے، ابن حزم کی الملل والنحل کا بھی ذکر ہے، واقدی کا بھی حوالہ آیا ہے، ابن تیمیہ امام غزالی، ابن رشد، یعقوبی، کندی، فارابی اور بوعلی سینا کے بعض مباحث پر بھی نقد و تبصرہ ہے، مولانا رومی کے اشعار تو بکثرت نقل کیے گئے ہیں، وجود ہستی، وجود عقلی اور وجود خیالی کی بحث میں امام غزالیؒ کا ایک طویل اقتباس نقل کیا گیا ہے، امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کے بھی اقتباسات دیے گئے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ سے عالم مثال کے پورے باب کا ترجمہ دیا گیا ہے، ان کی الفوز الکبیر کا بھی حوالہ آیا ہے، طبری، سیوطی،

بیہقی کی تاریخوں کے علاوہ ایڈورڈ گبن کی تاریخ زوال روم، ہیکل کی ونڈرس آف لائف کا بھی ذکر ہے، ان ماخذوں کے ذکر کرنے کا منشا یہ ہے کہ حضرت سید صاحبؒ نے اپنے استاد محترم کی اس نصیحت پر پورا عمل کر دکھایا کہ معلومات کو ہر کونہ اور ہر گوشہ سے اس محنت سے ڈھونڈ کر پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے، اور پھر اس کتاب کے مباحث کی بعض باتوں سے چاہے کتنا ہی اختلاف کیا جائے، لیکن اس کے عرض ہنر میں بھی ان کا اب تک حریف نہیں پیدا ہو سکا ہے۔

ان کی مشہور تصنیف "خطباتِ مدراس" ۱۹۲۵ء میں شایع ہوئی، یہ ان کے آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر مدراس میں دیئے تھے، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے، عالمگیر اور دائمی نمونہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، کسی زندگی کا کامل نمونہ اور ہر نقص سے بری ہونا، اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس کی زندگی کے تمام اجزاء سامنے نہ ہوں، پیغمبرؐ اسلام کی زندگی کا ہر لمحہ پیدائش سے وفات تک ان کے زمانے کے لوگوں کے سامنے رہا، آپؐ کی زندگی کامل کہی جا سکتی ہے، اس لیے کہ آپؐ میں تمام انبیاء کی خصوصیات جمع کر دی گئی تھیں، ان کو عمل کر کے دکھایا، بحیثیت ایک عملی پیغمبر کے آپ کی سیرت درحقیقت قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے، اور انبیاءؑ کے پیغامات کسی خاص زمانہ اور قوم کے لیے تھے، وقتی تھے، دائمی نہ تھے، لیکن آپؐ کا پیغام آخری تھا، اور تمام دنیا کے لیے تھا، اس لیے رب العالمین نے آپؐ کو رحمۃ للعلمین کہا، آخری باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام میں نجات کا مدار دو چیزوں پر رکھا گیا ہے، ایمان اور عمل صالح پر، ان تمام باتوں کے لکھنے میں ان ہی ماخذوں کا سہارا لیا گیا ہے جن سے سیرۃ النبیؐ لکھی جا رہی تھی، اور جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ ناقابل رد منطقیانہ دلائل سے قلمبند ہوئی ہیں، لیکن اس کی اصلی خوبی انشاء پردازانہ انداز بیان ہے، جس کا مطالعہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی مرقع آرائی کرنے میں حضرت سید صاحبؒ کا قلم مانی کا موئے قلم بن گیا ہے اور آپؐ کی سیرت کی نقش آرائی میں بہزاد کی مصوری کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، اس کو پڑھتے وقت کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے حضرت سید صاحبؒ کی شیفتگی کے گنبد مینائی پر ان کے سوز پنہاں کا چراغاں ہو رہا ہے،

پوری کتاب پڑھنے کے بعد قارئین کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہوگا کہ ع شاہد مضمون تصدق ہے ترے انداز پر

دنیا کے ادب و انشاء کے شاہکار کی کوئی فہرست تیار ہوگی تو اس میں یہ کتاب ضرور شامل کی جائے گی۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں ان کی دوسری مشہور کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" شایع ہوئی، اس کو پڑھ کر یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ اگر ابن خلکان یا ابن خلدون یا یورپین مورخوں میں ایڈورڈ گبن، یا موسیو لیبان یا ایچ۔ جی۔ ویلس اس موضوع پر لکھتے تو شاید اس سے بہتر نہیں لکھ سکتے تھے، اس میں یہ دکھایا گیا ہے، کہ پہلے عرب اور ہندوستان کے درمیان تجارتی، علمی اور مذہبی تعلقات کے دودھ اور شہد کے دریا کس طرح بہتے تھے، حضرت سید صاحبؒ

نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں جہاں اور بہت سی تحریریں لکھیں وہاں اسی مقصد کی خاطر یہ کتاب بھی لکھی، ان کو برابر دکھ رہا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی تاریخ کی کتابوں میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی باتیں جمع کی جاتی ہیں جن سے ہندو مسلمان کے جذبات میں مزید اشتعال پیدا ہو، اور دونوں کا اتفاق آئندہ مشکل سے بڑھ کر محال ہوجائے، حالانکہ اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جن کے پڑھنے سے دونوں کے درمیان اختلاف کے بجائے محبت پیدا ہوتی، مگر بازاری قدردانی کے تابع مصنف اور کتب فروش اپنی ذاتی عارضی کامیابی کے ساتھ ملکی اور قومی بھلائی کی قیمت کی پرواہ نہیں کرتے۔[۹]

یہ کتاب ہندوستان کے ان مورخوں کے لیے ایک نمونہ ہے جو واقعی دل سے اس ملک میں جذباتی ہم آہنگی کے قائل ہیں، اس کے لکھنے میں حضرت سید صاحبؒ نے اپنی عمر کے چوبیس ۲۴ برس صرف کیے، اس سے ان کی تصنیفی زندگی کے سوز دماغ اور سوز جگر کا بھی اندازہ ہوگا اور یہ بھی کہ علمی نگاہ میں شباب و مستی و ذوق و سرور و رعنائی ہو تب ہی علمی کمال کا حاصل ہونا ممکن ہے، اس کے لکھنے میں عرب سیاحوں، جغرافیہ نویسوں، تاجروں، جہاز رانوں، مورخوں، ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں سے جس طرح استفادہ کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ کونہ کونہ سے معلومات ڈھونڈنے میں کیا ریاضت کرنی پڑتی ہے۔

۱۹۳۱ء میں ان کی "عربوں کی جہاز رانی" شایع ہوئی، اس میں وہ چار ۴ خطبے ہیں جو حکومتِ بمبئی کے شعبۂ تعلیم کی دعوت پر دیے گئے تھے، یہ بڑا ہی خشک موضوع تھا، قرآن پاک میں جہاز رانی کے متعلق جس قدر الفاظ اور دریا کے تلاطم وغیرہ کے جتنے مناظر و کیفیات ہیں، ان سے اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اہلِ عرب اس فن سے پورے طور سے واقف تھے، حضرت سید صاحبؒ ماہر قرآنیات ہونے کی وجہ سے قرآن پاک کو طرح طرح سے بڑی لذت کے ساتھ اپنی کتابوں اور تحریروں میں ماخذ بناتے رہے، اور اگر ان تمام سورتوں اور آیتوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا جائے جو ان کی مختلف تحریروں میں زیر بحث ہی ہیں تو اس سے ظاہر ہوگا کہ کلام پاک کا زیادہ تر حصہ ان میں منتقل ہو گیا ہے، عربوں کی جہاز رانی کے سلسلے میں اپنی تحقیقی دیدہ وری سے یہ بھی دکھایا ہے کہ انھوں نے سمندروں کی پیمائش کس طرح کی، ان کے نقشے کس طرح مرتب کئے، جہاز رانی کے کیا کیا قوانین مدون کئے، لائٹ ہاؤس کہاں کہاں بنائے، قطب نما کس طرح ایجاد کیا، جہاز رانی کے کارخانے کہاں کہاں قائم کئے، ڈوبے ہوئے جہازوں کو نکالنے کے لئے کون کون سے آلات بنائے، بحریات پر کون کون سی کتابیں لکھیں، ان سب کی تفصیلات پڑھنے سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ حضرت سید صاحبؒ کا ذہن مسلمانوں کے کمالات دکھانے میں کس کس سمت میں پرواز کرتا رہا۔

۱۹۳۳ء میں ان کی "سیرۃ النبیؐ" کی جلد چہارم شایع ہوئی، جو ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس وقت ان کی عمر ۵۰ سال کی ہو چکی تھی، لیکن ان کا قلم روز بروز رعنا اور جوان ہوتا جا رہا تھا، اس جلد کا موضوع منصب نبوت

ہے، نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی تشریح امام غزالیؒ نے معارج القدس اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے، حضرت سید صاحبؒ نے ان کو سامنے رکھ کر منصب نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کو جس انداز میں ظاہر کیا ہے، اس کو پڑھنے میں اردو داں اہل ذوق کو وہی لطف ملے گا، جو عربی دانوں کو امام غزالیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مذکورہ کتابوں میں ملتا ہے، نبوت کی حقیقت، نبی کی ضرورت، نبی کی عصمت، نبی کی محبوبیت، مصلحین کے اقسام، بعثت کے لیے کسی قوم کا انتخاب، نبوت کے لوازم اور خصوصیات، وہبی استعداد، غیبی علم، غیر مادی علم، غیب کی حقیقت، وحی، ملکۂ نبوت، وحی متلو اور وحی غیر متلو، الہام، اجتہاد، آیات اور ملکوت کی رؤیت وغیرہ جیسے غامض موضوعات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے بیسویں صدی کا ذہن جس زبان، اسلوب اور طرز ادا کا طلب گار ہے، حضرت سید صاحبؒ نے وہی پیرایہ اختیار کرکے اس کو مطمئن کیا ہے، ان تمام باتوں کو متکلمانہ انداز سے سمجھانے کے ساتھ ہی ساتھ ان مباحث میں جب وہ مجوسیت کی مزدکیت، یہودیوں کی یہودیت، عیسائیوں کی عیسائیت، ہندوؤں کی ہندویت اور بودھوں کی بدھ مت کا ذکر کرکے نوشیرواں، قباد، خسرو، قسطنطین، جسٹنین اور یزدگرد وغیرہ کی حکمرانی کی کچھ تفصیل لکھتے ہیں تو متکلم کے بجائے مؤرخ نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ ظہور اسلام کے پہلے عرب میں جو شرک، جنات کی الوہیت، اور تین سو ساٹھ ۳۶۰ بتوں کی پرستش، شیاطین، بھوت پریت اور کہانت کے جو تخیلات تھے ان کو قرآن کی آیتوں اور احادیث صحیحہ کے ذریعے سے پیش کرنے کے بعد یہ دکھایا ہے کہ اس ظلمت شب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خورشید نبوت طلوع ہوا تو ظلمت شب کافور ہو گئی، پھر تبلیغ نبویؐ کے اصول اور کامیابی کے سلسلے میں اس کی وسعت، تنظیم، قدرتی ترتیب، دعوت بالقرآن، موانع کے ازالے کے عنوانات سے جو بحث کی ہے اس کو پڑھ کر قارئین کو معلوم ہوگا کہ اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کس طرح انسان کی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہوتی گئیں۔

پھر اس جلد میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کیسا ہو، توحید اور اس کے ایجابی اصول و ارکان کیا ہونے چاہئیں، ان پر جو مباحث ہیں، ان کا طرز استدلال ایسا ہے کہ اس سے متقشف علماء، ذہین متکلمین، جدت پسند معتزلین اور خمار توحید سے مخمور صوفیائے کرام کو بھی اختلاف نہیں ہوا، عام قارئین کو تو اپنے ذہن کی تاریکی میں چاندنی پھیلتی ہوئی دکھائی دے گی اس میں توحید پر جو باب ہے اس کو پڑھ کر مستشرقین کو بھی سوچنا پڑے گا کہ عیسائی پادریوں نے تثلیث کو جس طرح معمہ بنا دیا ہے اس کا حل دراصل توحید کی اس تعلیم میں ہے جو اسلام میں دی گئی ہے۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں ان کی علمی تحقیقات کا اعلیٰ ترین معیار ان کی کتاب "خیامؔ" کی اشاعت سے ظاہر ہوا، اس کا فاضلانہ حصہ وہ ہے جس میں خیام کے ماخذوں پر نقد و تبصرہ ہے، خیام پر فرانسیسی، روسی، انگریز مستشرقین نے جو کچھ لکھا ہے اس پر اپنی رائے کے مقابلے میں ان کی رائے کو رد کرکے ان ماخذوں کے نام لکھے ہیں جو صحیح ترتیب زمانی کے لحاظ سے قابل اعتبار ہیں، خیام کے حالات زندگی کے سنین بہت ہی ناصاف اور گنجلک تھے، ان کو صاف اور منقح کیا، پھر اس کی ذات سے جو من گھڑت قصے منسوب ہو گئے ہیں اس کی تردید پورے وثوق کے ساتھ کی ہے، اس کے

نام، مولد، ولادت اور وفات کے سنین بھی متعین کیے ہیں، ان کے اساتذہ اور تلامذہ کی بھی تفصیل لکھی ہے، جو رباعیات اس کی طرف منسوب ہو گئی ہیں، ان کو غلط ثابت کر کے اس کی اصلی رباعیات کی طرف توجہ دلائی ہے، یورپ میں وہ عام طور سے ایک رند مشرب، عورتوں کے پیچھے دیوانہ رہنے والا، مذہب کا تمسخر کرنے والا، ابلیس کا سفیر اعظم، عظیم کافر اور ایرانی بدمعاش قسم کا شاعر سمجھا جاتا ہے، لیکن حضرت سید صاحبؒ نے اپنی غیر معمولی تحقیقات سے اس کتاب میں یہ ثابت کیا ہے کہ فلسفہ و حکمت میں بوعلی سینا کے بعد اسی کا درجہ تھا، گو اس کو خود علم نجوم سے عقیدت نہ تھی، لیکن وہ اپنے منجملہ کمالات کی وجہ سے مشہور تھا، وہ سلجوقی حکمراں ملک شاہ کا طبیب بھی تھا، علوم عقلیہ کا بھی ماہر رہا، فن قرأت میں یدطولیٰ رکھتا تھا، اس کو ہندی ریاضیات سے بھی واقفیت تھی، اس نے جبر و مقابلہ، اقلیدس، طبیعیات، فلسفہ اور تصور وجود پر جو رسالے لکھے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا علم ایک بحر ذخار تھا، جس کی علمی موجیں اور لہریں مختلف سمتوں میں امنڈتی رہیں، اس نے حج بھی کیا، نماز بھی پڑھتا تھا، خدا اور رسولؐ کا قائل تھا، مگر حکیم تھا، متکلم حکیم نہ تھا، فلسفی حکیم بھی نہ تھا، اسماعیلی حکیم بھی نہ تھا، مگر تھا تو صوفی حکیم، اس کتاب کی اشاعت سے اس کے متعلق تمام اصحاب نظر کے سوچنے کا ڈھنگ ہی بدل گیا۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں ان کی "سیرۃ النبیؐ" جلد پنجم شایع ہوئی، جس میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادات کی حقیقت کیا ہے، اس کے اقسام کتنے ہیں؟ ان میں کیا مصلحت و حکمت رکھی گئی ہے، عمل صالح کیا ہے، اس میں نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، جہاد کی مختلف قسموں، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر، شکر پر قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں اختلافی رنگ پیدا نہیں ہونے پایا ہے، فقہی مسائل کو بھی کلامی انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ فقہاء اور متکلمین دونوں مطمئن نظر آتے ہیں، ان مباحث میں باتیں وہی ہیں جو چودہ سو سال سے لکھی جا رہی ہیں لیکن ان کے لکھنے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو چیزیں اب تک نہیں معلوم تھیں وہ اب معلوم ہو رہی ہیں، یہ محض پیش کرنے کا اعجاز ہے۔

ان کی "سیرۃ النبیؐ" جلد ششم سنہ ۱۹۳۹ء میں شایع ہوئی، جس کے ۸۷۲ صفحات ہیں، اس میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے، اور بہت ہی حسین پیرایہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام کے ارکان پنجگانہ یعنی ایمان، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں، مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو وہ احکام کی محض لفظی تعمیل ہے، مگر عبادات کے جوہر و معنی سے یکسر خالی ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں، پھر اسلام کے فلسفۂ اخلاق سے متعلق جہاں اور باتیں لکھی ہیں وہاں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ اسلام کے اخلاق کا فلسفہ یہ بھی ہے کہ جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے اور اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے تو یہ عدل ہے، اور اس کو چھوڑ دینا، معاف

کردینا اور درگذر کرنا یہ احسان ہے، اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں، قانون عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں دیا گیا ہے، یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے، مگر احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے، یہ محض شخصی معاملہ ہے، پھر قانون اور اخلاق کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دُنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ہیں، قانون اور اخلاق، گو ان دونوں کا منشاء ایک ہی ہے مگر ان کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے راستے مختلف ہیں، ان دونوں میں کچھ نہ کچھ کمی ہے، جس کی تلافی ایک دوسرے سے ہوتی ہے قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے، مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کی کوئی روحانی کیفیت نہیں پیدا کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں عدل، احسان، قانون اور اخلاق کی جامعیت ہے، توراۃ محض قانون ہے، انجیل محض اخلاق ہے، مگر اسلام نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کرکے ہر ایک کی حد مقرر کردی ہے، اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا، موسوی، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے، وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے“۔ سید صاحبؒ نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا، لیکن اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی جیسی کوئی چیز نہ رہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سزا اور انتقام تو حکومت کے ہاتھ میں رہے، اس کے اجراء میں رحم نہ کیا جائے اور امیر و غریب، بڑے چھوٹے میں تفریق نہ ہو، تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے، مگر اسلام میں عفو کی بھی اہمیت ہے، تاکہ اس سے شخصیت کے مدارجِ کمال کا ذریعہ پیدا ہو اور اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاق کی بلندی برابر ترقی کرتی رہے۔

پوری کتاب میں علیحدہ علیحدہ عنوانات سے فضائل اخلاق، رذائل اور آداب اخلاق کی تفصیلات ہیں، فضائل اخلاق کو ربوبیت، ملکوتیت اور نبوت کے محاسن قرار دیئے ہیں، رذائل اخلاق کو شیطان کے خصائص بتائے ہیں، اس میں جو باتیں بتائی گئی ہیں ان کی تائید کے لیے فوراً قرآن کی آیتیں اور حدیثیں پیش کر دی گئی ہیں، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے واقعات بھی قلمبند کرتے جاتے ہیں، تاکہ معلوم ہو کہ آپؐ نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر دکھایا، مثلاً اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے، دوسروں کو کھلایا، اگر آپؐ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا، آپؐ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانداں، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک واعظ، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک مرشد، ایک زاہد اور آخر میں ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، ہر حیثیت سے آپؐ اپنے قول اور عمل میں مکمل نظر آتے ہیں، دوسرے

مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کی تعلیمات اور احوال سناتے ہیں، اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو نہ صرف آپؐ کے اقوال و نصائح بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی نمونوں اور کارناموں کو پیش کرتے ہیں، آپؐ خود کامل ہوئے تو دوسرے ناقصوں کو کامل بنایا، خود پاک ہوئے تو دوسرے ناپاکوں کو بھی دھوکر پاک کیا، یہ جلد تو اس لائق ہے کہ روزانہ اس کے کسی نہ کسی حصہ کا مطالعہ کیا جائے، غیر مسلم اپنے تعصب کی عینک اتار کر اس کو پڑھیں تو ان کو بھی معلوم ہوگا کہ اس سے بہتر اخلاقی تعلیمات نہیں دی جاسکتی ہیں۔

۱۹۳۹ء میں بچوں اور عورتوں کے لیے بہت ہی سلیس اور آسان زبان میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت "رحمتِ عالمؐ" کے نام سے لکھی، جو ایسی مقبول ہوئی کہ معلوم نہیں اس کے اب تک کتنے ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

ان کو اپنی گوناگوں مشغولیتوں اور دلچسپیوں میں اپنی آخرت کا بھی خیال برابر رہا، اور وہ دعاگو رہے۔

؏ غمِ امروز بھلا دے غمِ فردا دے دے

اسی کیفیت میں اپنے کو مٹا کر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے آستانے پر جھک گئے، جس کے بعد ان کی طبیعت کا رنگ بدل گیا، جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؏

عالم کے تماشے نہیں اب جاذبِ دل میں　　ہر لذتِ ہستی کا مزہ بھول گیا ہوں

اس زمانے میں ان پر جو کیفیات طاری رہیں ان کا اظہار اپنی کچھ نظموں اور غزلوں میں بھی کیا ہے، اس سے پہلے بھی مختلف عنوانات سے کچھ اشعار کہے تھے اور داد بھی حاصل کی، لیکن انھوں نے اپنے استاد محترم مولانا شبلی نعمانیؒ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی اردو شاعری خودرو پودا ہے، نہ انھوں نے اس میں کسی سے اصلاح لی اور نہ جم کر شاعری کی، اور نہ کبھی اردو شاعری کو عزت اور شہرت کا ذریعہ سمجھا" یہی بات ان کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے، وہ فنِ عروض میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اس کے سہارے جب کبھی طبیعت موزوں ہوتی یا کسی واقعہ سے متاثر ہوتے، یا خاص سبب سے ان کی جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا، تو نظمیں اور غزلیں کہہ لیتے، ڈاکٹر اقبالؔ نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مولانا شبلیؒ کی طرح نظمیں لکھا کریں، مگر اپنی تصنیف و تالیف کے غیر معمولی انہماک میں اس کی طرف توجہ نہ کرسکے، یوں تو وہ اپنی پوری زندگی میں بارگاہِ الٰہی میں زبانِ حال سے کہتے رہے ؏ مری دنیا میں تیری بادشاہی

مگر روحانی انقلاب کے بعد ذکرِ جلی و خفی اور رشد و ہدایت میں ان کو لذتِ ہستی ملنے لگی، اور ان کی جو روحانیت ان کی مانند حرم پاک طبیعت کے اندر دبی ہوئی تھی وہ اچھی طرح ظاہر ہونے لگی اور لوگ اُن کی طرف ایک مُرشدِ کامل کی حیثیت سے رجوع کرنے لگے تھے، مگر حضرت تھانویؒ کے آستانے پر جھک جانے کے باوجود اپنے استاد محترم مولانا شبلی نعمانیؒ کی یاد برابر تازہ رکھی، ان کی یہ وصیت تھی کہ جب وہ تمام کاموں سے فارغ ہوجائیں تو

ان کی سوانح عمری لکھ دیں، اسی کی تعمیل میں ۱۹۴۳ء میں ان کی ضخیم تصنیف "حیات شبلیؒ" تیار ہوئی جس میں انھوں نے اپنے جلیل القدر استاد کی خدمت میں اپنی شیفتگی کا نذرانہ پیش کیا ہے، اس میں نہ صرف ان کی زندگی کے کمالات واجتہادات کا احاطہ کیا گیا ہے، بلکہ ان کے دور کی پوری علمی تاریخ بھی سمٹ آئی ہے۔

"سیرۃ النبیؐ" جلد ہفتم ان کی وفات کے بعد شایع ہوئی، وہ معاملات اور سیاسیات پر اسلام کی تعلیمات ایک علیحدہ جلد میں پیش کرنا چاہتے تھے، مگر اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے مکمل نہ کر سکے، اس کے کچھ ابواب لکھے تھے ان ہی کو ترتیب دے کر شایع کر دیا گیا ہے، اس کے عنوانات یہ ہیں: معاملات، اسلام میں حکومت کی حقیقت واہمیت عہد نبویؐ میں نظام حکومت، حکومت، سلطنت اور دین کا تعلق، سلطنت اور ملکیت کی حقیقت، امت مسلمہ کی بعثت قوت عاملہ یا قوت آمرہ، حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، یہ جلد نامکمل ہی، پھر بھی ان ملکوں کے لیے جہاں کے حکمراں اپنے کو اسلامی فرماں روا کہتے ہیں، اس کی بہت سی باتیں مشعل ہدایت بن سکتی ہیں۔

حضرت سید صاحبؒ کی "سیرۃ النبیؐ" کی پانچوں جلدوں کا جائزہ جلد ہفتم کو چھوڑ کر جس حیثیت سے بھی لیا جائے گا ان کے عرض ہنر میں کسی قسم کی کمی نہ پائی جائے گی، مولانا شبلی نعمانیؒ نے سیرۃ النبیؐ لکھنی شروع کی تھی تو ان پر یہ خیال غالب رہا کہ یہ ایسی ہو کہ اس کی بلندی کو کوئی اور کتاب نہ پہنچ سکے، حضرت سید صاحبؒ نے اپنے استاد کی اس خواہش کو پورا کر دکھایا، ان جلدوں کی گوناگوں خوبیوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بقول خود حضرت سید صاحب ان کے لکھنے میں ان کی اپنی کوشش یہی رہی کہ قدم اس راستے سے نہ ہٹے جو صراط مستقیم ہے، اور وہ سررشتہ نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقیٰ ہے،[۱۲] اور یہ جلدیں ان کے لیے زاد راہ سفر آخرت ہیں، انھوں نے خود بڑے فخر کے ساتھ لکھا ہے کہ سیرۃ النبیؐ کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے، اور حدیث نبویؐ اس کے نقش ونگار ہیں، اور یہی دونوں میرا سرمایہ اور یہی میرے زاد راہ ہیں، ایک اصل ہے، دوسرا نقل، ایک وحی جلی ہے، دوسرا خفی، ایک دلیل ہے، دوسرا نتیجہ، جس کو یہ ایک دو نظر آئے وہ احول ہے، لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔[۱۳] ان چند جملوں میں ان کی سیرۃ النبیؐ کی پوری نوعیت سامنے آجاتی ہے، وہ کلام پاک اور احادیث مقدسہ کے سہارے جو کچھ لکھنے اس کو اپنے کلامی رنگ کی تحریروں سے موثر بنا دیتے، وہ جب توحید، ذات باری تعالیٰ، صفات باری تعالیٰ، نبوت حقیقت، وحی، ملائکہ، معجزہ، روح، معاد، جبر اور قدر جیسے مسائل پر بحث کرتے ہیں تو اعلیٰ قسم کے متکلم نظر آتے ہیں، جب یہ کہا جائے کہ ان کے متکلمانہ مباحث سے ہر زمانے میں فکر ونظر کی جلا ہوتی رہے گی، تو اس پر یقین کر کے اپنے ذہن کی عفت مآبی کا ثبوت ضرور دیا جائے، ان جلدوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ابن اسحاق، ابن ہشام اور طبری کی کتابیں زیادہ تر مغازی، اخلاق نبویؐ اور شمائل نبویؐ پر مشتمل ہیں، لیکن یہ پانچوں جلدیں ان نامور مصنفین سے بہت آگے بڑھ کر اسلامی تعلیمات کی دائرۃ المعارف بن گئی ہیں، ان کو لکھتے وقت حضرت سید صاحبؒ کو خیال رہا کہ مباحث وعقائد میں سلف

صالحین کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو، اسی کے ساتھ انھوں نے فقہاء میں کسی ایک مجتہد کی تقلید نہ کی بلکہ دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے، لیکن کبھی کوئی ایسی رائے اختیار نہیں کی جس کی تائید ائمۂ فن میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو، خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا، ایسا بھی ہوا کہ دو چار دفعہ ایک تحقیق کے بعد ہی نئی تحقیق سامنے آئی اور ان کو اپنی غلطی ظاہر ہوئی تو بعد کے ایڈیشن میں اس کے مطابق تبدیلی کر دی[۱۴]۔ یہ ان کی انتہائی تصنیفی دیانت داری کا ثبوت ہے، حدیث کی صحیح روایتوں کو قلمبند کرنے میں اصول و فروع قائم کر کے ان کے تجزیہ کرنے میں روایت و درایت کی پوری احتیاط کی۔

جہاں تک ماخذوں کا تعلق ہے تیسری اور چوتھی جلدوں کے مباحث میں مشاہیر کی بعض کتابوں کے تھوڑے بہت حوالے ضرور ہیں، ورنہ تمام تر قرآن پاک اور صحاح ستہ ہی کو ماخذ بنا کر سارے مباحث قلمبند کئے گئے ہیں، اگر دوسرے مذاہب سے کہیں موازنہ اور مقابلے کی ضرورت پڑی ہے تو مناظرانہ رنگ اختیار کرنے کے بجائے یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام کی تعلیم تمام عالم کی اصلاح کے لیے کس قدر ضروری اور کافی ہے۔

ان جلدوں کا بہت بڑا فیض یہ بھی ہے کہ اس سلسلے کی اشاعت سے پہلے اس موضوع پر اردو میں کوئی قابل قدر کتاب نہ تھی، اس کے بعد چھوٹی بڑی کتابیں نئے نئے دعووں کے ساتھ ان ہی جلدوں کو سامنے رکھ کر لکھی جا رہی ہیں، اور سیرت کا عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں پیدا ہوتا جا رہا ہے، ان جلدوں نے یہ بھی تصنیفی درس دیا ہے کہ عنکبوتی رنگ اختیار کر کے مواد اور تحریر کے صرف جالے نہ تنے جائیں، یا نملی رنگ اختیار کر کے مواد کا صرف ڈھیر نہ لگایا جائے بلکہ نحلی رنگ اختیار کر کے علوم و فنون خصوصاً اسلامی علوم و فنون کے پھولوں سے رس نچوڑ کر نظر و فکر کے شہد کا ایک انبار لگا دیا جائے۔

ان کی سیرۃ النبیؐ میں بہت سے مباحث ہیں، ان میں معجزہ کی لازمی شرط نبوت، دوزخ کی ابدیت و غیر ابدیت، برزخ اور انبیاءؑ کی معصومیت پر کچھ جزوی اختلافات ہوئے، ورنہ پوری کتاب اب تک مذہبی افکار اور جدید علم کلام کی چمنستان اور سنبلستان بنی ہوئی ہے، یہ پوری جلدیں مسلمانوں کا دستور حیات ہیں، ان کی زندگی کی کیمیائے سعادت میں مستشرقین کے زہر کا تریاق بھی ہے۔

پھر ان جلدوں میں اسلوب اور طرز ادا کا جو طاقتور انداز اختیار کیا گیا ہے وہ بھی ان کی بڑی خوبی ہے، یہ قرآن پاک کی آیتوں کا گلزار بنی ہوئی ہیں، احادیث مقدسہ کا لالہ زار بھی ہیں، فقہی رموز و نکات کا مرغزار بھی ہیں اور کلامی مباحث کا سمن زار بھی ہیں لیکن ان کا مطالعہ کرتے وقت محراب و منبر کے مواعظ کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ ان میں وہی طرز استدلال ہے، وہی فصاحت و بلاغت کی شیوا بیانی ہے، جملوں کے دروبست اور الفاظ و

تراکیب کے انتخاب کا وہی حسن ذوق، زبان کی وہی زور آوری اور انشا پردازی کی وہی لالہ کاری ہے، جس کا طالب بیسویں صدی کا ذہن ہے، ان میں اردو زبان کا وہی پیرایۂ بیان نظر آتا ہے جس سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانیں اپنے غوامض اور دقائق کو شگفتہ اور رفتہ انداز میں پیش کیا کرتی ہیں۔

ان کی انشاء پردازی کا جوہر ان کی اور تصانیف میں بھی چمکتا نظر آئے گا، تاریخ ارض القرآن کے خشک موضوع کو اردو کے جس پیرایۂ بیان کا متحمل بنایا ہے یا سیرت عائشہؓ میں وزن اور وقار جس طرح ان کے قلم کو چومتے دکھائی دیتے ہیں، یا خطبات مدراس میں ادب و انشاء کا جو سنبلتان دیدہ زیب بن گیا ہے، یا عرب و ہند کے تعلقات میں عمیق تحقیق کے ساتھ زبان و بیان جو ہمرکاب ہے، یا خیام میں نقد و تبصرہ کے ساتھ جو با تحمل اور پُر شکوہ انداز تحریر ہے، یا رحمت عالم میں بچوں کے لیے جو سلیس اور آسان زبان اختیار کی گئی ہے، یا حیاتِ شبلیؒ میں فن سوانح نگاری کے ماتحت جو اسلوب ہے، یا ان کے متفرق مضامین اور "معارف" کے شذرات میں قلم کی جو بوقلمونی ہے، ان تمام تحریروں کارناموں کا تجزیہ ادب و انشاء کے فن کے لحاظ سے کیا جائے تو ان کے قلم کی سکندری اور صاحب قرانی کا صحیح اندازہ ہوگا، ان کے ادب و انشاء کو محض ان کی نقوش سلیمانی یا یاد رفتگان میں محبوس اور مقید نہ کر دیا جائے۔

دار المصنفین کی علمی زندگی کے ساتھ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے لیے بھی لزوم مالا یلزم بنے رہے، یہیں انھوں نے عروس علم کی مشاطگی سیکھی تھی، یہیں انھوں نے اس کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار بنانے کا خواب زریں دیکھا تھا جس کی تعبیر ان کی پوری زندگی رہی، اس لیے دار المصنفین اگر ان کے علم کا خمکدہ تھا تو ندوہ ان کے ذہن کا عشرت کدہ بنا رہا، دار المصنفین کے علمی مشاغل سے تھک جاتے تو ندوہ پہونچ کر تازہ دم ہو جاتے، وہ اس کے معتمد تعلیم بھی آخر وقت تک رہے، ان کی یادوں کی قندیل نہ صرف ندوہ کے سلیمانیہ ہوسٹل میں فروزاں ہے، بلکہ اس کے در و دیوار میں ان کا وہ سوز دروں پنہاں ہے جو وہ اس کے لیے رکھتے تھے، بھوپال چھوڑنے کے بعد ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی آخری زندگی ندوہ کے عشرت کدہ میں گزاریں، مگر مصلحت خداوندی سے یہ ممکن نہ ہو سکا، اور وہ کراچی گئے تو وہیں سپرد خاک ہوئے۔

دار المصنفین اور ندوہ کی دلچسپیوں کے ساتھ وہ ملک کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے بھی برابر وابستہ رہے، انجمن ترقی اردو، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ہندوستانی اکیڈمی، اور کل ہند تاریخی کانگریس کی علمی و ادبی مجلسوں کی صدارت بھی کی، اور ان میں جو خطبات دیئے وہ نظر و فکر کے لیے شمع ہدایت ہیں، پھر اسلام کے ضمیر اور سفیر بن کر اسلام کا پیام پہنچانے کی خاطر ملک کے ہر گوشے میں پہنچے، اور اپنی تقریروں سے مسلمانوں میں وہ درد پیدا کرنے کی کوشش کی جس کی کسک ان کی تمنا کے مطابق لازوال ہو، مسلسل سفر سے وہ اکثر سخت بیمار بھی پڑ جاتے تھے، مگر اپنے ساقی سے آب نشاط انگیز مانگ کر اپنی زندگی کے لیے پھر آب حیات کا سامان پیدا

کر لیتے، بھوپال کے نواب حمید اللہ خاں کی دعوت پر وہاں اس لیے قیام کیا کہ اس ریاست کے دارالقضاءُ اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ میں کر دیں۔

وہ اپنے زمانے کی سیاسی تحریکوں میں بھی کبھی کبھی حصّہ لیتے رہے، خلافت تحریک میں ان کی دلچسپیاں زیادہ رہیں، وہ مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ ایک وفد میں لندن بھی گئے، اور وہاں سے انھوں نے جو خطوط لکھے وہ "بریدِ فرنگ" کے نام سے شایع ہو گئے ہیں، اس سے خلافت تحریک کے علاوہ سیاست اور بین الاقوامی سیاست میں ان کی گہری نظر کا اندازہ ہو گا، وہ خلافت کانفرنسوں کے مختلف اجلاسوں کی صدارت بھی کرتے رہے، کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی ہوئے، جمعیۃ العلماء کے اجلاسوں کی بھی صدارت کی، فلسطین کانفرنس کے بھی صدر رہے، سیاست میں ان کے مسلک کا اندازہ اس لطیفے سے ہو گا کہ ایک بار پٹنہ میں ڈاکٹر سید محمود نے ہندوستانی کمیٹی کا جلسہ کیا، تو اس میں سید صاحبؒ اور مولانا ابو الکلام آزادؒ بھی مدعو کئے گئے، جاڑے کا زمانہ تھا، سید صاحبؒ گرم شروانی پہنے ہوئے تھے، اور اسی کی کشتی نما ٹوپی بھی سر پر تھی، جو اس زمانے میں گاندھی ٹوپی کہلاتی تھی، اس کے اوپر عمامہ باندھے ہوئے تھے، مغرب کی نماز کے لیے جلسہ ملتوی کیا گیا تو سید صاحبؒ وضو کرنے لگے، عمامہ اتارا، ان کی ٹوپی دیکھ کر مولانا ابو الکلام آزادؒ نے ان کو مخاطب کر کے تفریحاً کہا کہ اچھا مولانا آپ نے مذہب اور قومیت دونوں کو ساتھ جمع کر رکھا ہے، سید صاحبؒ نے برجستہ جواب دیا، مگر مذہب اوپر ہے، اور قومیت نیچے ہے، ان کی سیاست بھی اس نہج کی تھی، جس سیاست سے مذہبی بیگانگی پیدا ہونے کا خطرہ رہا، اس سے وہ دور رہے، سیرۃ النبیؐ کے مصنف کی حیثیت سے کبھی اس کے قائل نہیں ہو سکتے تھے کہ خدا اور قیصر الگ الگ ہیں، اس لیے دونوں کے حقوق الگ الگ ادا کئے جائیں، اس برصغیر میں پاکستان کی تحریک کا زمانہ بڑا ہنگامہ خیز اور خوں ریز رہا، حضرت سید صاحبؒ نے اس میں عملی حصّہ تو نہیں لیا، لیکن ان کا دل دھڑکتا رہا کہ اس انقلاب کے بعد معلوم نہیں اس برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کا نہج کیا ہو، ان کی خواہش تھی کہ پاکستان بننے سے پہلے اسلامی سیاسیات اور اسلامی اقتصادیات کا خالص اسلامی حل مسلمانوں کے سامنے رکھا جائے، اور اس کے قبول و عمل کی دعوت دی جائے جس سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہو، اور مسلمان مسلمان بن کر دنیا میں ظاہر ہوں، وہ اپنی دوررس نگاہوں کی بدولت اس رائے پر اس وقت بھی پہنچ گئے تھے کہ اس قسم کا اسلامی حل سامنے رکھے بغیر کسی گوشہ میں مسلمانوں کی ایک سلطنت کا اضافہ ہو گیا تو ضروری نہیں کہ اس سے اسلام کا پیام زندہ ہو جائے اور مسلمان پھر مسلمان بن جائیں، زیادہ سے زیادہ جو خوش کن خواب نظر آسکتا ہے، وہ یہ کہ ہم کو ایک اور طویل و عریض عراق، شام یا مصر مل جائے گا، مگر اس سے اسلام کی بےکسی اور غربت میں کچھ کمی نہیں آسکتی ہے، اسی کے ساتھ تقسیم ہند کے بعد ان کو ان صوبوں کے مسلمانوں کی بھی فکر رہی جہاں

وہ اقلیت میں ہیں، ان کو یہ خطرہ دکھائی دیا کہ کہیں وہ حکومت سے اپنی محکومانہ وفاداری کا اظہار کر کے اپنے علوم، فنون، زبان، طور طریق، پرسنل لا، تمدن اور تہذیب سے بیگانہ نہ ہو جائیں، اپنی زندگی میں جن خطرات کا اظہار کیا تھا اس کا تجزیہ آج بھی پاکستان اور ہندوستان میں اچھی طرح کیا جا سکتا ہے، وہ پاکستان گئے، کیسے گئے، کیوں گئے؟ اور وہاں جا کر کیا کیا؟ اس کی علیحدہ المناک داستان ہے، وہ گئے، لیکن وہاں جا کر ان کی دنیا ہی بدل گئی، بقول ان کے ہندوستان بھلائے نہیں بھولا۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ بظاہر ان کی زندگی خالصتہً علمی معلوم ہوتی ہے، اور واقعی وہ بحر العلوم اور قلم کے قلمرو کے تاجدار تھے، مگر ایک عزیز معاصر نے اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ

> "مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک بہت بڑے محقق، نامور مصنف، بلند پایہ عالم اور صاحب طرز انشاء پرداز تھے، ایک عام اور معمولی پیرایۂ بیان ہے، جس سے مولانا کا اصل مقام اور رتبہ متعین نہیں ہوتا، اور نہ ان کا صحیح حق ادا ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن و فکر اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ طرز قدیم کا ہو یا طرز جدید کا، نصف صدی کے اندر مذاق تصنیف و تالیف طریق فکر و استدلال اور تہذیبی امیال واعمال کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے۔"[15]

یہ صحیح ہے، ان کے معاصروں میں تین[16] بڑی قد آور شخصیتیں تھیں، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ محمد اقبال، اپنے زمانہ کے یہ تینوں عبقری حضرات سید صاحبؒ کی عبقریت اور قد آوری سے متاثر رہے، مولانا ابو الکلام آزاد نے "الہلال" اور "البلاغ" میں رعد کی طرح کڑکتی ہوئی اپنی تحریروں کے ذریعے سے مسلمانوں کو اخوت دینی، مودت ملی اور اتحاد اسلامی کا پیام دیا، وہ حضرت سید صاحبؒ کے کچھ ایسے گرویدہ ہو گئے کہ ان کو صدیقی العزیز سے مخاطب کرتے رہے، آخر میں "الہلال" اور "البلاغ" دونوں کی ادارت ان کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے، مولانا محمد علی جوہر نے سیاست میں اپنے دل شکستہ کے ساتھ ملت کی غمخواری کر کے یہ بتایا کہ گفتار میں کردار میں اللہ کا برہان کیسے بنا جا سکتا ہے، وہ بھی اپنی سیاست میں حضرت سید صاحبؒ کے عملی اور علمی تعاون کے جویاں رہے، علامہ محمد اقبال اپنی شاعری میں عشق کلام اللہ اور عشق رسول اللہ کا پیام دے کر مفکر اسلام ہوئے، اور نوجوانوں کو یہ سکھایا کہ اسلام کی ضیا باری کے مقابلے میں ان کے سامنے جدید تہذیب و تمدن کی نئی روشنی نور نخشب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، وہ ایک مسلمان کو مرد مسلمان اور مرد مومن بن کر اپنی زندگی کے کارواں کو جادہ پیما دیکھنا چاہتے تھے، وہ بھی اپنے تمام افکار کے ساتھ حضرت سید صاحبؒ کے بڑے شیفتہ رہے، وہ جب اپنے خطوط میں ان کو "استاذ الکل" لکھتے ہیں[17] یا جب ان کو "جوئے شیر اسلامیہ کا فرہاد" کہتے ہیں[18] یا جب

32737

ان کو "سید العلماءؒ" اور علم و فضل کا ایک ایسا دریا قرار دیتے ہیں جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں" یا جب وہ ان سے بڑے احترام اور محبت سے مسلسل طویل خط و کتابت کرتے ہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کے اس علم، فضل، دانش، حکمت اور بصیرت کے قدر دان اور قائل تھے، جن سے ہندوستان کا اسلامی ذہن و فکر متاثر ہو رہا تھا، ان کی تحریروں کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخوت دینی، وحدت ملی اور اتحاد اسلامی کا پیام بھی ہے، مولانا محمد علی جوہرؔ کی سیاست کی ایمانی حرارت بھی ہے، اسد اللّٰہی بھی ہے، حق گوئی اور بے باکی بھی ہے، علامہ محمد اقبالؔ کا عشق کلام اللّٰہ اور عشق رسول اللّٰہ بھی ہے، اور پھر ان کے مرد مسلمان اور مردِ مومن کا تخیل تو ان کے یہاں اپنے سدرۃ المنتہیٰ پر ہے، وہ عملی سیاست کے میدان کارزار میں اتر کر تو مسلمانوں کے رہنما نہیں بنے، لیکن مولانا شبلی نعمانیؒ نے اسلام کی حشمت، شوکت اور سطوت کا ایک محاذ بنایا تھا، اس پر جب وہ تلوار سے زیادہ طاقت ور قلم لیے اللّٰہ کو پیارے ہوئے تو ان کے شاگرد رشید حضرت سید صاحبؒ فوراً اس محاذ پر پہنچ گئے، اور اپنے مضامین کے لشکر اور طاقتور اسلحے سے زیادہ قوی تصانیف سے اس محاذ کو اپنی آخر زندگی تک سنبھالے رکھا، مولانا شبلی نعمانیؒ کی حدی خوانی اور رجز خوانی کو بلند تر اور تیز تر کیا، انھوں نے جو کتابیں لکھیں یا دار المصنفین میں اپنی نگرانی میں اسلامی تاریخ، شعر و ادب، فلسفہ، تذکرہ اور تراجم پر جو کتابیں لکھوائیں ان میں یہی حدی خوانی اور رجز خوانی ملے گی، پھر یہ اسلامی علوم و فنون کا ایک ایسا سرچشمہ بھی ہے جس سے اس برصغیر کے اسلامی ذہن کی روشن ضمیری، خود اعتمادی، اور خود شناسی کی پوری آبیاری ہو رہی ہے، اور جب انگریزوں کے چکا چوند کر دینے والے تمدن سے مسلمان مرعوب اور مسحور ہو کر مذہب سے بے گانہ ہو رہے تھے، تو ان کی بیگانگی جہاں اور ذرائع ابلاغ سے دور ہوئی وہاں حضرت سید صاحبؒ کی تحریروں اور کتابوں سے بھی ان کی تشکیک اور بے راہ روی کا رُخ مڑ گیا اور جب ان کا تاریک ذہن منور ہوتا گیا تو وہ حضرت سید صاحبؒ کے اس درس سے متاثر ہوئے کہ قرآن مجید کے بحر ناپیدا کنار میں غواصی کر کے اس کے آبدار موتیوں سے زندگی کو کیسے جگمگایا جا سکتا ہے، احادیثِ مقدسہ کو سمجھ کر وہ کیسے آیاتِ الٰہی کے نگہبان ہو سکتے ہیں، فقہی مسائل کو کیسے متنازع فیہ ہونے سے بچایا جا سکتا ہے اور کلامی مباحث کا صحیح ادراک کر کے پیکر کہنہ کو قائم رکھتے ہوئے اس میں نئی روح کیسے پیدا کی جا سکتی ہے، اس سلسلے میں انھوں نے جو جوئے شیر اسلامیہ بہائی، اس میں اب تک ان کا کوئی حریف نہیں ہو سکا۔ اسی لیے علامہ محمد اقبالؔ نے ان کو اپنے ایک مکتوب میں یہ بھی لکھا تھا کہ آپ قلندر ہیں، اور وہ قلندر ہیں جن کی نسبت اقبالؔ نے یہ کہا ہے ع

قلندراں کہ بہ راہِ تو سخت می کوشند   زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بہ جلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند   بہ خلوت اند و زمان و مکان در آغوشند

دریں جہاں کہ جمال تو جلوہا دارد زفرق تابہ قدم دیدہ و دل و گوشند
بروز بزم سراپا چو پرنیاں و حریر بروز رزم خود آگاہ و تن فراموشند

آپ اس جماعت کے پیش خیمہ ہیں، اس جماعت کا دنیا میں عنقریب پیدا ہونا قطعی اور یقینی ہے۔[19]

ہم کو اور آپ کو اس کا جائزہ بھی لینا ہے کہ ایسی جماعت پیدا ہوئی کہ نہیں، اور اس کے پیش خیمہ حضرت سید صاحبؒ کس حد تک تھے؟

حوالے:

۱و۲- مشاہیر علم کی محسن کتابیں مرتبہ محمد عمران خاں ندوی، ص ۷۹ (۳) الندوہ، اکتوبر و نومبر ۱۹۰۸ء
۴- معارف، اپریل ۱۹۵۰ء ۵- یاد رفتگان ص ۸
۶- دیباچہ سیرۃ النبی ج ۱، ص ۱ ۷- دیباچہ سیرت عائشہ ص ۲
۸- سیرۃ النبی ج ۳، ص ۵۱۲ ۹- خطبۂ صدارت آل انڈیا ہسٹری کانگریس شعبۂ ازمنۂ وسطیٰ مدراس
۱۰- سیرۃ النبی ج ۶، ص ۹۴ ۱۱- دیباچہ کلیات شبلی اردو ص ۴ ۱۲- دیباچہ سیرۃ النبی ج ۵
۱۳- مشاہیر علم کی محسن کتابیں ص ۱۲ ۱۴- معارف، جنوری ۱۹۴۳ء
۱۵- معارف سلیمان نمبر ص ۱۵۷ ۱۶و۱۷- اقبال نامہ ص ۱۷ و ۱۹۶ - ۱۸- معارف سلیمان نمبر ص ۲۸۵
۱۹- اقبال نامہ ص ۱۴

خلیق احمد نظامی★

رہنما مقالہ

کہتے ہیں معاصرت ایک حجاب ہے، جہاں نظارہ بھی نقاب کا کام کرتا ہے، اور شخصیت کتنی ہی دلکش اور عظیم کیوں نہ ہو، اس کے حقیقی خدوخال اور اس کی فکر کے دوررس اثرات معاصرین کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہتے ہیں، لیکن بعض اوقات کسی شاعر کی حساس روح اس "روبند عصر" کو چاک کر دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے، اور معاصر شخصیت کو اس کی پوری عظمت و شان میں دیکھ لیتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی عظمت کا احساس سب سے پہلے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کو ہوا، آنے والی نسلوں نے جو کچھ دیکھا، مرزا صاحبؒ کے حساس دل نے پہلے ہی اس کی جھلک دیکھ لی تھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علمی تبحر اور ان کے کارناموں کے عظیم الشان اثرات کا مشاہدہ سب سے پہلے علامہ محمد اقبال کی چشم جہاں بیں نے کیا، اور وہ بے اختیار پکار اٹھے:

"علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندویؒ کے اور کون ہے"۔

سید صاحبؒ کے علمی کارناموں کی قدر اور ان کی شخصیت کا احترام تو معاصرین کے دل میں پہلے سے تھا، لیکن کسی نے نہ ان کی "صدائے تیشہ" سنی تھی، نہ ان کے جوئے شیر کو کسی نے دیکھا تھا۔ علامہ محمد اقبال کی آواز نے ایک دم سے چونکا دیا، اور معاصرت کے حجاب گرنے شروع ہو گئے، اور ایسا محسوس ہوا کہ ع

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں   ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

سید صاحبؒ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے، ۱۹۵۳ء میں انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اس مدت میں ہندوستان کے سیاسی حالات نے کیا کیا رنگ بدلے، اور وقت کا قافلہ کن کن نازک منزلوں سے گذرا، لیکن "تیشۂ فرہاد" کبھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا، اور اپنی زندگی کا جو مقصد پہلے دن قرار دیا تھا، اس پر آخر تک جمے رہے، بلکہ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ تپش اور تابناکی پیدا ہوتی رہی اور ستر سال بعد جب جان جانِ آفریں کے سپرد کرنے کا وقت آیا تو ان کی تصانیف کے ہزاروں صفحات ان کے عزم کوہ کن کو خراج تحسین ادا کر رہے تھے، اور ان کی روح زبان حال سے خسرو کا یہ شعر پڑھ رہی تھی ع

★ سابق صدر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ساختہ ام ایں ہمہ لعل و گہر   زخوئے پیشانی و خونِ جگر

کتنے ہی بنجر اور غیر ذی زرع میدان تھے جو ان کی جہد و سعی سے "غزالانِ فکر کا مرغزار" بن چکے تھے، اور کتنی ہی گذرگاہیں تھیں جہاں ان کی دوربینی نے روشنی کے مینارے کھڑے کر دیئے تھے، جو اعلان کر رہے تھے ع

علم را بردل زنی یارے بود   علم را برتن زنی مارے بود

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ذات مجسم علم تھی، ایسا علم جو پائی عقل و خرد کا امین اور عفت قلب و نگاہ کا پاسبان ہوتا ہے، انھوں نے اپنے شاگردوں اور رفقاء کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی، جس نے خدمت علم کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی زندگیاں اس کام میں صرف کر دیں، اور ان کے دامن کمال میں بعض بہترین دماغوں نے پرورش پائی، ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ میں ان کے شاگردوں کا کام کوئی دیانت دار مورخ بھلا نہ سکے گا، کسی عالم اور استاد کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز باعثِ فخر و مسرت نہیں ہو سکتی کہ اس کے شاگرد اس کی جلائی ہوئی شمع سے تاریک گزرگاہوں کو اس طرح روشن کر دیں کہ اس کا نام زمان اور مکان کی قیود سے بے نیاز ہو جائے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنا علمی سفر اس منزل سے شروع کیا جہاں مولانا شبلیؒ نے اپنا رخت سفر کھولا تھا، وہ "چندے مقیم آستانِ غیر" رہ کر آستانۂ نبوت پر پہنچے تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے کام کا آغاز ہی وہاں سے کیا۔ شفیق استاد نے اپنی علمی زندگی کا حاصل ان کے سپرد کیا، اور اس کام کی تکمیل کی ہدایت کی، جس کے متعلق خود کبھی کہا تھا ع

فرشتوں میں یہ چرچا تھا کہ حالِ سرورِ عالمؐ   دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہ عالمِ قدوس سے آئی   کہ یہ ہے اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

کس قدر مشکل تھا یہ کام اور کتنی بڑی تھی یہ ذمہ داری جو ان پر ڈالی گئی تھی، لیکن ان کے بے پناہ خلوص، غیر معمولی جذبۂ مشقت اور مقصد کی شالی لگن نے اس بار امانت کو اس طرح اٹھایا کہ دیکھنے والے حیرت میں رہ گئے، استاد کی تمنا پوری ہوئی، اور انھوں نے سیرت کو قرآن کی روشنی میں اس طرح پیش کیا کہ عالم قدوس کی بانگِ قلم اس میں سنائی دینے لگی، علامہ محمد اقبال نے سچ کہا ہے ع

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا   روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی علمی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہمیشہ ذاتِ نبی کریمؐ رہی، اپنے شیخ کو ایک بار انھوں نے لکھا تھا کہ سیرۃ نبویؐ میں مصروفیت نے ذات نبوی سے ایک جذبۂ محبت پیدا کر دیا ہے۔ یہ جذبۂ محبت ان کی تصانیف میں خون زندگی کی طرح دوڑتا نظر آتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تصانیف نے اسی سے آب و رنگ حاصل کیا ہے، ارض القرآن، سیرۃ النبیؐ کا مقدمہ، سیرۃ عائشہؓ اس کا تتمہ، عربوں کی جہازرانی

صاحب سیرت کی تعلیم کے اثر و نفوذ کو سمجھنے کی کوشش، عرب و ہند کے تعلقات، دیار رسول سے اپنا رشتہ جوڑنے کا جذبہ سیرت امام مالکؒ، روح حجازی سے قریب پہنچنے کی بے چینی، ہر کام میں عشق رسولؐ پکارتا سنائی دیتا ہے کہ ع

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

بیسویں صدی کے نصف اول میں علما و فضلا کی کمی نہ تھی، شاید ہی کوئی فن ہو جس کے مشاہیر موجود نہ ہوں، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، ہر فن کے مشہور اساتذہ یہاں موجود تھے، لیکن سیرۃ النبیؐ کو اپنی زندگی کا مقصد بنانے کی سعادت مولانا سید سلیمان ندویؒ ہی کے لیے مقدر تھی؛ انھوں نے جو بھی علوم حاصل کیے تھے، انھیں اس کام میں صرف کر دیا، وہ بجا طور پر کہہ سکتے تھے ع

ملال عالمیاں دم بہ دم دگر گون ست　　منم کہ مدت عمرم بیک ملال گذشت

سید صاحبؒ کا سب سے پہلا مقالہ جو دیسنہ کی انجمن "الاصلاح" میں پڑھا گیا تھا، "علم اور اسلام" پر تھا، (بعد کو یہ مضمون علی گڑھ منتھلی میں شایع ہوا) ان کا سب سے پہلا مضمون "وقت" پر تھا، جو لاہور کے رسالہ "مخزن" میں چھپا تھا، یہ سب اتفاقات سے زیادہ فطرت کے خاموش اشارے تھے کہ ان کی جہد و سعی کا محور "اسلام"، "علم"، اور وقت کے تقاضوں کی تشخیص ہوگا، انھوں نے اپنی ساری زندگی ان ہی تین کی خدمت میں بسر کی، وقت کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی علم اور اسلام کی خدمت کے مترادف تھا اور شاہ ولی اللہؒ کا یہ قول کبھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہوا: "نصیحت و نیک خواہی مسلماناں در ہر زماں و در ہر مکاں رنگے دیگر دارد، و اقتضائے دیگری نماید، و لہذا علمائے دین و کبرائے اہل یقین در تفسیر و حدیث و عقائد و سلوک تصانیف متنوعہ ساختہ اند، و توالیف گوناگوں پرداختہ"۔

"مخزن" اور "علی گڑھ منتھلی" میں ان کے سب سے پہلے مضامین کا چھپنا بھی معنی خیز تھا، آنے والے وقت میں ان کے علمی تجربے جدید اور قدیم دونوں علوم کے ماہرین کو مستفید ہونا تھا، سر عبدالقادر نے بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "مخزن" میں جدید و قدیم ادب نوازوں کو ایک میز پر جمع کر دیا تھا جو آواز وہاں سے اٹھتی تھی وہ قدیم اور جدید دونوں ایوانوں میں سنائی دیتی تھی، سید صاحب طبقۂ علما میں شاید پہلے شخص تھے جن کی علمی کاوشوں کو جدید و قدیم دونوں مکتب خیال کے لوگوں نے یکساں عزت کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی تحقیق کی ندرت، فکر کی جودت اور دلائل کے استحکام کا لوہا مانا، ان کے الندوہ کے بعض مضامین اشتراکیت اور اسلام، مسئلہ ارتقاء، قیامت وغیرہ سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عصر حاضر کے بعض مسائل پر غور و فکر ابتدائی زمانے سے شروع کر دیا تھا۔

یوں تو مولانا سید سلیمان ندویؒ کی پچاس سال سے زیادہ پر پھیلی ہوئی علمی زندگی میں صدہا کتابیں اور مصنف ایسے ہوں گے جن سے ان کے نظریات اور رجحانات نے اثر قبول کیا ہوگا، لیکن ان کی فکر کی بنیاد دو کتابوں پر تھی، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان جس سے گہرا قلبی اور ذہنی تعلق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا، اور دوسرے امام مالکؒ کی موطا جس سے شاہ ولی اللہؒ کی طرح انھوں نے روح حجازی کو سمجھنے کا کام لیا تھا، حیات امام مالکؒ

Delhi-62

اس لیے نہیں لکھی گئی تھی کہ مولانا شبلیؒ "النعمان" لکھ چکے تھے، بلکہ اس کے پیچھے اجتہاد کی اس روح کو بیدار کرنے کا جذبہ کام کر رہا تھا، جس کی نشان دہی شاہ ولی اللہؒ نے اس طرح کی تھی:

"بہ یقین معلوم شد کہ طریقۂ اجتہاد امروز مسدود است، الّا از یک وجہ کہ موطا را پیش گیرند۔"[۲]

راہِ اجتہاد میں موطا ہی ایک چشمۂ نور تھا، جس کی روشنی میں فکر کا قافلہ آگے بڑھ سکتا تھا، سید صاحبؒ نے اس کے ذریعہ اس ماحول سے اپنا ذہنی ربط قائم کیا جس میں اسلامی فکر اور اداروں کی نشو و نما ہوئی تھی، حضرت مرشد تھانویؒ کو ایک خط میں اعتزال سے سلفیت تک اپنے ذہنی سفر کا حال بتا کر امام مالکؒ کے اصولوں پر ہمیشہ کاربند رہنے کا اعتراف کیا ہے، انھوں نے حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے خرمن کمال سے خوشہ چینی ضرور کی لیکن اپنی منزل اور محل کا نشان ہمیشہ امام مالکؒ ہی سے پوچھا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ذہن کی تربیت مولانا شبلیؒ نے کی اور دل کی پیر تھانویؒ نے، یہ دو جلیل القدر ہستیاں ہیں جنھوں نے علیحدہ علیحدہ اپنے حلقۂ فکر میں وقت کی رفتار پر اپنا نقش چھوڑا ہے، سید صاحبؒ کی علمی بصیرت کی یہ کرامت ہے کہ استاد اور پیر کے درمیان فکری خلیج کو اس طرح پاٹ دیا کہ بُعد کا گمان ہی ختم ہو گیا، مولانا شبلیؒ کی مسندِ علم اور پیر تھانویؒ کے سجادۂ مشیخت دونوں کو ان سے رونق حاصل ہوئی، ایک نے اپنا عمامہ ان کے سر پر رکھا، دوسرے نے اپنا عصا ان کے ہاتھ میں دیا، فغانیؔ کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے ؎

مسیحا یار و خضرش رہنما و ہم عناں یوسفؑ　　فغانیؔ آفتاب من بدیں اعزاز می آید

علم و عرفان کا یہ نادر الوجود سنگم، ہماری ذہنی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصانیف کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کے تحقیقی اصولوں اور علمی طریقۂ کار پر ایک نظر ڈالی جائے۔

(۱) سید صاحبؒ کا احاطۂ علم اور دائرۂ معلومات بہت وسیع تھا، وہ ایک زندہ دائرۃ المعارف تھے، جس سے علم و عرفان کی شعاعیں پھوٹتی تھیں، جس موضوع پر گفتگو کرتے ٹھہر ٹھہر کر سمجھا سمجھا کر سننے والے پر "فتاد سامعہ در موجۂ کوثر و تسنیم" کا عالم طاری ہو جاتا، ان کی گفتگو میں اس سمندر کی خاموش روانی تھی جس کی تہ میں موتیوں کے خزانے بھرے ہوں، قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، چاروں کا گہرا مطالعہ علیحدہ علیحدہ کیا تھا، پھر ان سب کو مربوط کر کے حکمت دین کی اکائی میں ڈھال دیا تھا، ان علوم کا ایک جگہ اس طرح جمع ہو جانا کہ وہ علمی شخصیت کا جزو بن جائیں، ان کا امتیازی وصف تھا، وسیع مطالعے، مستحضر علم اور قوی حافظے نے ان کی علمی شخصیت کا وقار بہت اونچا کر دیا تھا۔

(۲) سید صاحبؒ نے جمع مواد کو تحقیقی کام کی اساس اور بنیاد قرار دیا تھا، ان کا خیال تھا کہ اس کے بغیر تمام نظریات خام اور نقش ناتمام رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف معلومات کا خزانہ ہیں، کسی موضوع

پر قلم اٹھانے سے پہلے وہ سارے متعلقہ لٹریچر کو کھنگال ڈالتے تھے، ایک اہم بات ان کی تصانیف کے سلسلے میں یہ ہے کہ ان کی کوئی تصنیف ایک وقت میں مرتب نہیں ہوئی، وہ برسہا برس مواد جمع کرتے رہتے تھے، پھر اس موضوع پر اپنے خیالات کو ضبط تحریر میں لاتے تھے، عرب و ہند کے تعلقات جیسے موضوع کو بیس بیس پچیس پچیس سال تک اپنے ذہن میں رکھا، اور جہاں سے بھی جو معلومات حاصل ہوئیں ان کو نوٹ کر لیا، اصطرلاب پر ان کے مضامین، تاج محل کے معماروں سے متعلق ان کی تحقیق، خلافت اور ہندوستان کے تعلقات پر ان کی تفصیلات مدت کے غور و فکر اور جہد وسعی کا پتہ دیتے ہیں، وہ انگریزی کتابوں کے معلومات کو بھی ذہن میں رکھتے تھے، اور مستشرقین کے افکار و نظریات پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے تھے، سید صاحبؒ کے دو اصول تھے جو آج بھی اہل قلم کے لیے مشعل ہدایت بن سکتے ہیں: (۱) وہ اپنی تصنیف کا مواد بڑی محنت سے اور مدتوں جمع کرتے رہتے تھے، (۲) جب مسودہ تیار ہو جاتا تھا تو اس کو کچھ دنوں کے لیے دراز میں رکھ کر بھول جاتے تھے، یہ بات خود انھوں نے راقم الحروف کو بتائی تھی، اس طرح کچھ عرصے بعد جب مسودہ نکالتے تو خود اپنے ناقد بن جاتے تھے، اور عرفی کی اس ہدایت پر عمل کرنے لگتے تھے ؎

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا	یک دم منافقانہ نشیں در کمین خویش

اس طرح عبارت اور دلائل کا توازن جو وقتی انہماک میں کبھی کبھی برہم ہو جاتا ہے، اس کو بڑی نفاست اور خوش اسلوبی سے صحیح کر دیتے تھے، ان کی تصانیف میں خیالات کے توازن کا بڑا سبب یہی اصول تھا۔

(۳) مولانا سید سلیمان ندویؒ مآخذ کی تلاش میں بڑی صعوبتیں برداشت کرتے تھے، انھوں نے صدہا ذاتی ذخیرے اور درجنوں پبلک لائبریریاں ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں دیکھی تھیں، جب لندن میں تھے تو وہاں بھی کافی وقت کتابوں کے مطالعہ اور تلاش میں صرف کیا، لکھتے ہیں "اس عمارت میں جہاں سینکڑوں حقیقی اور مجازی زیارت گاہیں ہیں، ایک زیارت گاہ کا نام انڈیا آفس لائبریری ہے، یہ لائبریری ہندوستان کی علمی تاریخ کا مجموعہ ہے"، پھر جب اردو کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست دیکھی تو اس طرح اپنے تعجب کا اظہار کیا: "اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی، دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی زبان بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل علم کا برابر کا ساجھا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں میں منقسم نہیں کیا تھا، بلکہ جب صرف ایک سالم اور متحد ہندوستان دنیا میں موجود تھا۔" یہ الفاظ ۱۹۲۰ء کے ہیں۔

ان کا دستور تھا کہ کتب خانوں کی سیر خود کرتے، اور جب واپس آتے تو ناظرین "معارف" کو اس کی فلم دکھاتے، اس سلسلے میں گو مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی مساعی اپنے عہد کے مشرقی و مغربی علوم کے سب

ماہرین سے بڑھ گئی تھیں، لیکن سید صاحبؒ بھی مآخذ کی تلاش میں بڑی جدوجہد کرتے تھے، نزہۃ الخواطر اور عرب و ہند کے تعلقات فراہمی مواد کا ایسا شاہکار ہیں جن سے ہندوستانی علماء کا سر اونچا ہو گیا ہے۔

(۴) مولانا سید سلیمان ندویؒ کو تصنیف و تالیف کے کام میں کسی طرح کی سہولت پسندی گوارا نہیں تھی، دوسروں کی نکالی ہوئی راہ پر چلنے سے بچتے تھے، اور اپنا راستہ خود نکالتے تھے، خواہ اس میں ان کو کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں، ان کا مسلک یہ تھا ؏

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش　　براہِ دیگراں رفتن عذاب است

ایک بار سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے فوجی نظام پر تحقیقی کام میں دشواری کا ذکر کیا تو فرمایا کہ دشوار گزار راہیں طے کرنے کے بعد ہی تحقیق کے رموز سے واقفیت ہو سکتی ہے، لیکن مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ کمال ہے کہ تصنیف و تالیف میں اس قدر محنت اور مشقت کے باوجود کہیں آبلہ پائی کی شکایت یا تھکن کا اثر ان کی تحریروں میں محسوس نہیں ہوتا، پڑھنے والوں کو ان کی محنت کے ثمر تو نظر آتے تھے، لیکن جس طرح وہ خونِ جگر سے اس کشت ویراں کی آبیاری کرتے تھے، بہت کم لوگ اس کو دیکھ سکتے تھے۔

(۵) مولانا سید سلیمان ندویؒ مسائل فقہ پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے، وہ عصری رجحانات پر غور و فکر کرتے تھے، اور مسائل پر رائے قائم کرنے میں بڑی احتیاط اور تدبر سے کام لیتے تھے، علامہ محمد اقبالؒ نے جب بھی فقہی مسائل پر ان کی رائے معلوم کی، ان کے جوابات کو نہ صرف شافی پایا، بلکہ ان میں فکر کی نئی روشنی محسوس کی، اجماع، قیاس، نص، ناسخ و منسوخ وغیرہ پر اقبالؒ نے ان کے خیالات سے استفادہ کیا، اور شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ کے بعض اجزاء کا مفہوم بھی ان سے سمجھا، علامہ اقبال نے (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) میں جس انداز سے بعض مباحث کو اٹھایا ہے، اس پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے افکار کا اثر محسوس ہوتا ہے، بعض جگہ علامہ محمد اقبالؒ کی فکر اجتہادی منزلوں کو قطع کرتے کرتے ایک دم سے رک گئی ہے، ممکن ہے کہ سید صاحبؒ ہی نے بعض مسائل میں ایک حد سے آگے بڑھنے سے روکا ہو، علامہ محمد اقبالؒ کی نظر میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے افکار کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی عادت کے خلاف سید صاحب کے مکتوبات کو بڑی حفاظت سے رکھتے تھے، بھوپال ان کی مجتہدانہ فکر کے سفر میں ایک منزل تھی، افکار کو عملی جامہ پہنانے کی، اپنی راہ سے ہٹنا مقصود نہیں تھا، مولانا مسعود عالم ندویؒ کو ۲۶ دسمبر ۱۹۴۷ء کے ایک خط میں بھوپال سے لکھتے ہیں، "یہاں بھی بفضلِ الٰہی کچھ دینی کام انجام پا رہے ہیں"[۹]۔

(۶) عالم اسلام کی تحریکوں اور فکری رجحانات سے باخبر رہنے کے لیے مولانا سید سلیمان ندویؒ بڑی جستجو کرتے تھے، علامہ محمد اقبالؒ سے اس سلسلے میں تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہتا تھا، مفتی عالم جان کی تحریک کی نوعیت

پر علامہ محمد اقبالؒ نے سید صاحبؒ کی رائے دریافت کی تھی، افغانستان میں قدیم و جدید نظریات کے تصادم کو خود انھوں نے دیکھا تھا، ترکی کے اصلاحی رجحانات پر کڑی نظر رکھتے تھے اور گو تحریک خلافت کے پس منظر نے اس کو مشکل بنا دیا تھا، وہ کھلے دماغ سے ان کا مطالعہ کرتے تھے، قیام لندن کے زمانے میں شامی، مصری، تیونسی علماءؒ سے طویل گفتگوئیں رہی تھیں، مفتی اعظم فلسطین اور وہ خود موتمر عالم اسلامی کے نائب صدر منتخب کئے گئے تھے، وہ اس ذہنی اور فکری ہیجان سے پوری طرح واقف تھے، جو اسلامی دنیا میں برپا تھا، ویسے عالم اسلام کی تحریکیں دینی رجحانات، عوامل و نظریات کا جو براہ راست مطالعہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ نے کیا ہے وہ کسی دوسرے ہندوستانی عالم کو میسر نہیں آیا، اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نگاہ نے بھی ان اثرات کا اندازہ لگا لیا تھا، جو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے عرب ممالک میں اس وقت پیدا کر دئے تھے، ایک خط میں ۲۴ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کو مولانا سید سلیمان ندویؒ ان کو حجاز کے تجربات کے سلسلے میں لکھتے ہیں "بے شبہ جو چیز آپ کے لیے آثار سعادت میں سے ہے وہ یہ ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ دو سال گزرنے کے بعد آپ کے نام اور کام کو میں نے زندہ پایا، بلکہ آپ کی نسبت سے مجھے بزرگی ملتی رہی۔"

(۷) سید صاحبؒ کی علمی خصوصیات کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ انھوں نے علمی رجحانات اور سائنس کے انکشافات سے اپنے آپ کو بے خبر نہیں رکھا تھا، سائنسی ایجادات پر وہ کھلے دماغ سے غور کرتے تھے اور ان کے اثرات کا جائزہ لیتے تھے، ان کے رسالہ معارف کے صفحات اخبار علمیہ کے عنوان سے نئے اور اہم معلومات سے بھرے ہوئے ہیں، مثال کے طور پر جون سنہ ۱۹۲۰ء کا معارف لے لیجیے، اس میں سر جے۔ سی۔ بوس اور رامانجم کی تحقیقات علمی کا ذکر ہے، رامانجم کی جواں سال موت پر ع خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود کہہ کر رنج کا اظہار کرتے ہیں، مانچسٹر یونیورسٹی میں چندہ جمع کرنے کی تدابیر کا ذکر تعجب سے کرتے ہیں، یورپ میں ریڈیو نگاری کے اصول پر بحث کرتے ہیں، نائٹروجن کے متعلق جدید تحقیقات کا ذکر کرتے ہیں، ڈاکٹر آگسٹس والر، ڈاکٹر رابرٹ بل، پروفیسر میکسول لی فرائے کی تحقیقات سے روشناس کراتے ہیں، RADIOGRAPHIC CANCER MACHINE کی ایجاد کی خبر دیتے ہیں، نیویارک میڈیکل سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر فنیک کے لیکچرس کا تذکرہ کرتے ہیں، کرۂ ارض اور کرۂ مریخ سے متعلق سائنس کی تحقیقات بیان کرتے ہیں، ڈاکٹر ملیز کے رصد خانے کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہیں، یہ ایک مہینے کے معارف کے معلومات کا حال ہے، بعض اوقات عالمی علمی رفتار میں اس دلچسپی کو دیکھ کر ذہن ان عوامل و اسباب کے تجزیے کی تلاش کرنے لگتا ہے، جن کے باعث یہ رجحانات کسی مثبت نتیجہ پر نہ پہونچ سکے اور مغربی اور مشرقی علوم کے درمیان کوئی پل نہ بنایا جا سکا، مولانا سید سلیمان ندویؒ مغربی علوم کے نظریات سے واقفیت کو بقول اقبالؒ "یوہب را حیدر کرار کن" کا کام لیتے تھے۔

(۸) سید صاحبؒ اسلامیات کے سلسلے میں ہندوستانی یونیورسٹیوں اور طلبہ کے اس طریقۂ کار کو کہ مستشرقین کی کتابوں کو بنیاد بناکر تحقیق کی جاتی ہے، بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس سلسلے میں انھوں نے خاص طور پر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، میکڈونالڈ (MAC DONALD) کی DEVELOPMENT OF MUSLIM THEOLOGY JURISPRUDENCE AND CONSTITUTIONAL THEORY، ہیوجز (HUGHES) کی DICTIONARY OF ISLAM، اور اگنیدس (AGHNIDES) کی MOHAMMADAN THEORIES OF FINANCE کا ذکر کیا ہے، ان کا کہنا تھا کہ اس طرح نہ صرف مستشرقین کی غلطیاں دہرائی جاتی ہیں، بلکہ تحقیقی زاویے محدود ہوکر رہ جاتے ہیں، اور اسلامی فکر اور اداروں کو صحیح پس منظر میں دیکھنے کی صلاحیت مردہ ہوکر رہ جاتی ہے۔

(۹) مولانا سید سلیمان ندویؒ خود کو سراپا "مشرقی درسگاہوں کا پروردہ اور نمائندہ" کہتے تھے اور یہ صحیح بھی تھا، لیکن ان کا انداز بیان طرز استدلال اور ترتیب معانی و مطالب بالکل جدید طرز پر ہوتی تھی، موضوع بحث سے گریز یا غلط مبحث کا ان کی تحریروں میں دور دور نشان نہیں ملتا، وہ معاصر مآخذ کے سہارے تغیر و تعبیر کا قدم آگے بڑھاتے تھے، فرانسیسی ادیبوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی تحریریں انداز بیان و مطالب صاف شفاف دریا کی روانی کے مانند ہوتی ہیں، اردو لٹریچر میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ بڑی جاندار زبان ایسے ستھرے اور پرتاثیر انداز میں لکھتے تھے، کہ اس کی کوئی دوسری مثال پیش کرنا مشکل ہے، تحریر کی یہ خوبی نفس مضمون پر کامل عبور کا نتیجہ ہوتی ہے۔

(۱۰) مولانا سید سلیمان ندویؒ کو قدرت نے اخذ و استنباط کی غیر معمولی صلاحیت ودیعت کی تھی، دوران مطالعہ جب کوئی ایسا واقعہ نظر سے گذرتا جو ان کے موضوعات تحقیق سے متعلق ہوتا تو ان کا مرتب ذہن فوراً اس کو مناسب جگہ منتقل کر دیتا تھا، اور یہ کیفیت اس طرح ان کی عادت ثانیہ بن گئی تھی کہ تقریر بھی کرتے تو مرتب، مربوط اور مدلل، اگر ضبط تحریر میں آجائے تو منظم مقالہ کا گمان ہو، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ترتیب ان کی کوشش کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان کے منظم مطالعے اور گہرے فکر سے ایک مربوط شکل اختیار کر لیتی تھی، پھر یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ان کی بعض بہترین تصانیف عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، عمر خیام، ابتداء میں لیکچرس کی صورت میں پیش کیے گئے تھے۔

(۱۱) مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی علمی تحقیقات میں "دل" کو پاسبان عقل بنا کر رکھا تھا، نہایت مدلل گفتگو کرتے، حوالوں سے دلیل کو محکم بناتے لیکن دل کی پاسبانی ہر جگہ رہتی، بہت دنوں کی بات ہے، راقم نے اس وقت شاید ایک دو مضمون لکھے ہوں گے، سید صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیے، ملاحظہ فرماکر لکھا آپ کے طرز تحقیق اور جمع معلومات

سے خوشی ہوئی، دماغ سے پہلے دل کی ضرورت ہے، وہ مورخ جو دماغ رکھتے ہیں اور دل نہیں رکھتے، ان کے آثار قلم کی موجیں سراب ہیں، تاریخ تمامتر کچا مواد ہے، اس سے جیسا سامان دل چاہے تیار کر لیجئے۔"

ان جملوں میں تنبیہ بھی تھی اور نصیحت بھی، خود ان کا مسلک بھی اس میں جھلکتا تھا، اس وقت یہ حقیقت آپ سے چھپانا نہیں چاہتا کہ اس وقت یہ بات قدامت پسندی اور مذہبیت کے غلو کا اثر محسوس ہوئی تھی، لیکن جوں جوں وقت آگے بڑھتا گیا، اس نصیحت کی صداقت واضح ہوتی گئی، میرٹھ میں ایک بار انھوں نے پورا دن میری قلمی کتابوں کا ذخیرہ دیکھنے میں گذارا، اپنی چھوٹی سی نوٹ بک میں نوٹس لکھتے جاتے تھے، اور بتاتے جاتے تھے کہ ایک ہی مواد کس طرح متضاد مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، اور جب تک انسان کا دل تاریخ کے بکھرے ہوئے مواد میں ربط نہ پیدا کر لے اس میں جان نہیں پڑ سکتی، محض مواد کے سہارے نہ فکر انسانی کی تہ تک پہنچا جا سکتا ہے، نہ انسانی اعمال کا جائزہ ممکن ہے، اس وقت میرٹھ کا ذکر آیا تو ایک واقعہ اور بیان کر دوں، میں نے سید صاحبؒ کو ایک عربی مخطوطہ دکھایا جس کی خصوصیات سے میں خود ناواقف تھا، اس کی سطریں مختلف روشنائی سے کئی کئی ٹکڑوں میں لکھی ہوئی تھیں، اور پھر ہر نیچے کی سطر اسی ترتیب سے تھی، تقریباً ایک گھنٹہ اس مخطوطہ کو دیکھتے رہے، پھر مسکرا کر فرمایا یہ علم کی جادوگری تو دیکھئے، ایک کتاب میں مختلف فنون جمع کر دیے ہیں، مسلسل پڑھیے تو ایک فن ہے، اوپر سے نیچے پڑھیے تو دوسرا فن، آخری حصوں کو ملا کر پڑھیے تو تیسرا، پھر چند سطریں پڑھ کر سمجھائیں، اس وقت اندازہ ہوا کہ مختلف علوم پر ان کی نظر کتنی گہری اور مطالعہ کتنا وسیع تھا، تحقیق کے میدان میں ان کی ہمت افزائی اور ذرہ نوازی کے احساس کو الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں۔

(۱) مولانا سید سلیمان ندویؒ کو شدید احساس تھا کہ ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ انگریز مورخوں کے ہاتھوں مسخ ہو گئی ہے، اس کو از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے، مدراس میں انڈین ہسٹری کانگریس کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "اب ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے، اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے اور کیوں مستقبل کے لیے یہ کوشش جاری رہے کہ وہ کبھی خوش آیند نہ ہو سکے۔"

یہ بوڑھے مورخ کی آواز تھی، جو ۱۹۴۴ء میں بلند ہوئی تھی، لیکن صدا بصحرا ثابت ہوئی، اور تاریخ کو مسخ کرنے کا کام پہلے سے تیز تر ہو گیا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصانیف موضوع کے اعتبار سے سیرت، تاریخ، ادب اور جغرافیہ میں تقسیم کی جا سکتی ہیں، گو ان کی فکری وحدت کی طرف ہم نے شروع ہی میں اشارہ کر دیا ہے، "سیرۃ النبی" کا خواب مولانا شبلیؒ نے دیکھا تھا دم واپسیں ان کے لب پر "سیرۃ، سیرۃ" تھا، انھوں نے اپنے شاگرد کو وصیت کی کہ اس کام کو سب سے پہلے مکمل کیا جائے مولانا شبلیؒ نے سیرت کا کام تحقیق کی بہت اونچی محراب پر سجایا تھا اور جلد اول کی طباعت سے پہلے اس سلسلے کے جو

مضامین "الہلال" میں شایع کیے تھے، ان میں اعلان کیا تھا: "تیرہ سو برس کی وسیع مدت میں ایک کتاب بھی اس فن (سیرت) میں ایسی تصنیف نہیں کی گئی جس میں صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا..... محدثین نے تنقید و تحقیق کی ضرورت کو احادیث احکام کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔"

یہ بہت بڑا اعلان تھا، اور بہت بڑی ذمہ داری، اس کی روشنی میں سیرت نبویؐ کا سارا سرمایہ تحقیق و تنقید کی نئی کسوٹیوں پر پرکھنا ضروری ہو گیا تھا۔ مولانا شبلیؒ نے حافظ ابن تیمیہ کی کتاب التوسل کی روشنی میں ایسی بہت سی احادیث کو نظر انداز کر دیا جو اصول اسناد پر پوری نہیں اترتی تھیں، مولانا سید سلیمان ندویؒ استاد کی بتائی ہوئی شاہراہ پر گامزن ہوئے اور تحقیقی پیمانوں کو انھوں نے اور زیادہ مضبوط بنا دیا، جلد اول کے طبع چہارم میں لکھتے ہیں: "اس دفعہ جب نئے نسخے کے چھاپنے کی ضرورت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کتاب کے اصل مسودے کو اصل ماخذوں سے ملا کر دیکھا جائے، اور مقابلہ اور مطابقت کی جائے، یہ بڑا مشکل کام تھا، بیسوں کتابوں کو پھر سے دیکھنا اور ہزاروں صفحات کو الٹنا، مختلف روایتوں کو پرکھنا اور ضرورت کے مقام پر حاشیے لکھنا خود ایک مستقل تصنیف کے برابر محنت تھی۔"

جس مقام پر مصنف کے نظریہ سے اختلاف تھا، وہاں حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کیا کہ علمی دیانت کا تقاضا تھا، فروتر ماخذ کی جگہ بالاتر کے حوالے دیئے کہ جدید تحقیقی اصولوں کا مطالبہ تھا، جو کتابیں مصنف کی زندگی میں طبع نہ ہوئی تھیں (مثلاً ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ) ان کو پوری طرح استعمال کیا، مبادا ماخذ کی تشنگی کتاب کے علمی مرتبے کو متاثر کر دے، پھر جب اور جلدوں کی تکمیل کا وقت آیا تو گو مولانا شبلیؒ کا دیا ہوا چراغ ان کے ہاتھ میں تھا، لیکن وہ اپنی تحقیق سے بھی نئے عنوانات پیدا کرتے رہے، سیرت کی آخری تین جلدیں جن میں منصب نبوت اور تعلیمات اخلاقی پر گفتگو کی ہے، دینی فکر، تحقیقی نظر اور تنقیدی صلاحیتوں کا شاہکار ہیں، علم کی جس وحدت کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں اس کا بہترین نمونہ یہ جلدیں ہیں، ان کی تکمیل میں قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ سب نے اپنے خزانۂ معلومات ان کے حوالے کر دیئے ہیں، اور اسلامی اخلاق کا پورا فلسفہ مرتب کرنے کے لیے حضور سرور کائناتؐ کو معلم اخلاق کی حیثیت سے اس طرح پیش کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے اس قول کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے کہ قرآن اور سیرت رسولؐ دونوں ایک ہیں، سیرت کے یہ حصے بے شمار کتابوں کا ماخذ بنے ہیں، نبی کریمؐ کی ذات اقدس، اسلام کی تعلیمات اور اس کے اثرات کو اس طرح عصر حاضر کے مزاج اور ضروریات کے مطابق کسی اور مصنف نے پیش نہیں کیا تھا، ان سے مستشرقین کی صدہا افترا پردازیوں کا سد باب ہوا ہے، اور ہزارہا غلط روایات کی جو خود مسلمانوں میں رائج تھیں، اصلاح ہوئی ہے، مولانا ابو الکلام آزاد نے ایک مرتبہ سیرت نبویؐ سے متعلق بعض روایتوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا: "ایران میں بعض لوگوں نے وعظ گوئی کو ایک مستقل فن بنا دیا، اور چونکہ قابل اور اہل قلم بھی تھے، اس لیے اپنی مجالس کو کتب سیر و قصص کی صورت میں مدون بھی کر دیا مثلاً ملا حسین واعظ الکاشفی اور ملا معین الدین ہروی علی الخصوص آخر الذکر شخص جو فی الحقیقت انشا پردازی، حکایت طرازی و اقتباس

روایات ضعیفہ و موضوعہ و تاویلات رکیکہ قرآن و سنت، و عبور و رسوخ اسرائیلیات و روایات یہود میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، شاید بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ آج اردو زبان میں جس قدر مولود لکھے گئے ہیں اور رائج ہیں وہ سب کے سب بے واسطہ یا بالواسطہ اسی ملا معین ہروی کی کتابوں معارج النبوۃ تفسیر سورۂ یوسف موسوم بہ نقرہ کار، قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موسوم بہ اعجاز موسوی وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔"[۹]

سیرۃ النبیؐ کا یہ عظیم الشان کارنامہ تاریخ بھلا نہیں سکتی کہ اس کے ذریعہ اسلامی ذہن، اسرائیلیات کے گورکھ دھندوں سے نکل کر صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آگیا، اور نبی کریمؐ کی ذات اقدس تاریخ کے آئینہ میں اس طرح جگمگا اٹھی کہ مذاہب عالم کو اس کو عظمت و شان کے آگے سر خم کرنے پڑ گئے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس حقیقت کو پوری طرح اور موثر طریقہ پر واضح کیا کہ ذات نبویؐ ہر انسان کے لیے خواہ وہ کسی زمان و مکان، مرتبہ و حیثیت سے تعلق رکھتا ہو یکساں طور پر سرچشمۂ ہدایت ہے، شاید ہی کسی دوسری زبان میں سیرۃ النبیؐ کے پایہ کی کتاب لکھی گئی ہو، اس میں روایات کی صحت، بیان کی دلکشی، مباحث کا تنوع، تحقیق کی جستجو، اور صحیح اسلامی فکر کی کارفرمائی حیرت انگیز ہے، خطبات مدراس میں حقیقتہً ان جلدوں کا عطر کشید ہو کر آگیا ہے، مذہبی عنوانات پر ایسا طرز تخاطب۔ کہ معتقد اور مخالف سب کے دل سچائی کی آواز سن لیں، سید سلیمان ندویؒ کا اعجاز ہے۔ آخری زمانہ میں ایک بار ان خطبات کے متعلق انھوں نے یہ مصرع پڑھ کر اس کی تالیف کا پورا پس منظر واضح کر دیا تھا ع

من قماش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

سید صاحبؒ نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کر دیا کہ واقدی جس پر مارگولیتھ نے اپنی تحقیق کی ساری عمارتیں تعمیر کی ہیں، ایک داستان گو سے زیادہ نہیں، "سیرۃ النبیؐ" نے سید سلیمان ندویؒ کو عالم اسلام کی فکری تاریخ میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

سیرت عائشہؓ کو حقیقت میں سیرۃ النبیؐ کا تتمہ سمجھنا چاہیے، یہ کام طالب علمی میں شروع کیا تھا، پونہ کے قیام کے زمانے میں مولانا شبلیؒ اس کی تکمیل کا تقاضا کرتے رہے، مولانا اسلم جے راج پوری نے اسی زمانے میں سیرت عائشہؓ لکھی تو مولانا شبلیؒ نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کو ہدایت کی" اس کو دیکھ لو، اس سے بہت الگ رہے، یا بہت آگے نکل جائے"۔

ان دو جملوں میں استاد کی پوری ذہنی کیفیت اور شاگرد سے توقعات کی پوری تصویر ابھر آئی ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جس تحقیقی انداز میں یہ سیرت لکھی تھی، اس کا اعتراف اقبالؔ نے بھی کیا، زیوروں میں زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کے مسئلہ پر جو رائے سیرت عائشہؓ میں ظاہر کی گئی تھی اس سے پھر تھانویؒ کے ارشاد پر رجوع کر لیا گیا، لیکن اور تفصیلات میں وہ کتاب اپنے موضوع پر ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے۔ ان کا مختصر رسالہ "رسولِ وحدت" اپنے موضوع پر بے مثال ہے اس میں وحدت الٰہی، وحدت کتاب، وحدت انسانیت اور آخر میں وحدت دین و دنیا پر جس طرح گفتگو کی گئی ہے، اس سے اس کی عالمگیر حیثیت واضح ہو گئی ہے، اس رسالہ کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔

"سیرت امام مالکؒ" کی تدوین میں جو جذبہ کارفرما تھا وہ ایسے شخص کے حالات زندگی سے باخبر کرنا تھا جس کی تالیف میں حجازی فکر جلوہ گر تھی، موطا تاریخی، فقہی، محدثانہ تینوں حیثیتوں سے فکر اسلامی میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کی تو یہ رائے تھی کہ "صحیح بخاری و صحیح مسلم ہر چند در بسط و کثرت احادیث دہ چند موطا باشند، لیکن طریق روایت احادیث و تمیز رجال و راہِ اعتبار و استنباط از موطا آموختہ اند۔"[10]

مولانا سید سلیمان ندویؒ شاہ ولی اللہؒ ہی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، اور موطا کو دینی فکر کی اساس بنا کر مسائل پر رائے دیتے تھے، حقیقۃً انھوں نے امام مالکؒ پر الندوہ میں ایک طویل مضمون لکھا تھا، بعد کو اس میں اضافہ کیا، اور کتاب کی صورت میں شائع کر دیا۔

"عرب و ہند کے تعلقات" وہ گراں بہا علمی یادگار ہے جو سید صاحبؒ کے نام کو بحیثیت مورخ، ہمیشہ زندہ رکھے گی، انھوں نے چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے چن کر مٹھائی تیار کی ہے، اس کی تیاری میں ان کی محنت اور اس کی ترتیب میں ان کی مورخانہ بصیرت حیرت انگیز ہے، عرب و ہند کے تجارتی، علمی اور مذہبی تعلقات پر انھوں نے سنہ ۱۹۲۹ء میں جو لکھا تھا، اس کے بہت سے بیانات کی تائید حال میں "GENIZA RECORDS" کی دریافت سے ہوئی ہے، اس کتاب میں بعض ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جن پر مستقل کام کیا جا سکتا ہے مثلاً عربی ماخذ سے ایلیٹ کے ادھورے کام کی تکمیل تاکہ "یونانی اور فارسی تاریخوں کے درمیان جو چند صدیوں کا غار رہ جاتا ہے وہ پٹ جائے"[11] برامکہ کے متعلق یہ تحقیق کہ وہ بدھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے[12] یا F. ROSEN کے اس خیال کو تردید کہ لفظ "ہندسہ" ہند سے مشتق ہے[13] یا عرب، ترک اور مغل فاتحوں کا فرق[14] جس سے فتوحات کی نوعیت فاتحین کے مقاصد جنگ پر روشنی پڑتی ہے، اور تاریخ ہند کو سمجھنے اور قرون وسطیٰ میں ہندوؤں سے تعلقات کی حقیقی نوعیت واضح ہو جاتی ہے، عرب فاتحوں کا یہ فیصلہ کہ ہندو مشابہ اہل کتاب تھے[15]، بڑا اہم تھا، اس کے امکانات پر تفصیلی گفتگو آج تک نہ ہو سکی، پھر ایک پورا باب "ہندوستان میں مسلمان فتوحات سے پہلے" انتہائی بصیرت افروز ہے، اس باب میں ان کا دائرۂ تحقیق زیادہ تر سراندیپ، ساحلی علاقوں اور گجرات تک محدود ہے، لیکن محض یہ رائے کہ مسلمانوں کی آبادی فتوحات سے قبل اس ملک میں موجود تھی، فی نفسہ اہم ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اس نظریے سے متاثر ہو کر راقم الحروف نے شمالی ہندوستان میں نو مسلم آبادیات کا پتہ لگانے کی کوشش کی، اور بالآخر تاریخی شواہد سے یہ ثابت ہو گیا کہ اجمیر، ناگور، قنوج، بدایوں وغیرہ میں فتوحات سے قبل مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم ہو گئی تھیں، ان مباحث کے علاوہ جن پر مستقل تحقیق کی ضرورت ہے، بعض ایسے اشارے بھی اس کتاب میں ہیں جن کی روشنی میں بعض تاریخی واقعات اور ہی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً سندھ میں قبائل کی نوعیت اور وہاں کے حالات پر ایران کا اثر، سندھ میں عرب حکومت کا قیام، قرامطہ کے اثرات، اسماعیلی فرقوں کا نشو و نما وغیرہ وغیرہ، اگر سنہ ۱۹۲۹ء کے بعد کی بعض اہم انگریزی تاریخی تصانیف کا جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہیں جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سید صاحبؒ کے خاموش اشاروں نے کس کس کو راہ دکھائی ہے،

۱۹۱۸ء میں انھوں نے "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی ترقی" پر مفصل مضمون لکھ کر تحقیق کا نیا عنوان فراہم کر دیا تھا جس سے متاثر ہو کر بعض کتابیں انگریزی میں ضرور لکھی گئیں، لیکن کام پوری طرح آگے نہ بڑھ سکا۔

تاریخ جغرافیہ کے پس منظر کے بغیر بے روح رہتی ہے، یورپ کی جدید تحقیقات نے ایک نئے علم GEOPOLITICS (سیاست ارضی) کی بنیاد ڈالی ہے، اس کی روشنی میں یورپ، امریکہ اور جاپان میں مؤرخین کی جماعتیں بڑی مفید تحقیقات میں مصروف ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے زمانے میں یہ علم وجود میں نہیں آیا تھا، لیکن تعجب ہوتا ہے کہ ان کا ذہن جغرافیہ کی اہمیت کو ان ہی خطوط پر محسوس کر رہا تھا، جو بالآخر اس فن کو ایک واضح اور متعین شکل دینے میں موثر ثابت ہوئے، تاریخ ارض القرآن حقیقۃً سیرۃ النبیؐ کا مقدمہ تھا جو حجم بڑھ جانے کے باعث علیحدہ شایع کیا گیا، تاریخ ارض القرآن اور عربوں کی جہاز رانی میں تاریخ، جغرافیہ، اور ارضی سیاست کے باہمی تعلق پر بعض دلچسپ اشارے ہیں، عیسائی مصنفین نے BIBLICAL LANDS پر متعدد کتابیں لکھی ہیں لیکن ارض القرآن پر مسلمانوں نے کوئی تحقیقی کام، اس سے پہلے غالباً نہیں کیا تھا، لیکن BIBLICAL LANDS پر تحقیق کا کام اب تک جاری ہے، تاریخ ارض القرآن میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر مزید تحقیق نہیں کی گئی، گو مغرب کی جدید تحقیقات کی روشنی میں اس کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، ارض القرآن نے کلام پاک کے بیانات کی تاریخی اور جغرافیائی مطابقت اس طرح کر دی ہے کہ بہت سے نئے پہلو سامنے آ گئے ہیں، تحقیق جستجو کا یہ کمال ہے کہ جب عربوں کی جہاز رانی پر گفتگو کی تو سب سے پہلے عربی بحری لغات کی ایک فہرست تیار کر دی جس میں فارسی، ہندی، چینی، یونانی اور لاطینی الفاظ کا مخرج اور ماحول پیش کر دیا، پھر قدیم عرب شعراء کے کلام سے جہاز رانی کی تفصیلات حاصل کرنے کے بعد قرآن پاک میں جہاں جہاں کشتی، سمندر، بادبان وغیرہ کا ذکر ہے اس طرح جمع کر کے پیش کیا کہ بحری دنیا اور اس کے مسائل کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی، سورۂ بنی اسرائیل (۷) اور سورۂ لقمان (۴) میں جس طرح بحری خطرات کا ذکر ہے اس سے دلچسپ نتائج مرتب کیے، پھر بتایا کہ نہر سوئز کا تخیل سب سے پہلے عمرو بن العاصؓ کے ذہن میں آیا تھا، پھر بندرگاہوں کے بیان سے پوری تحقیق میں ایک جان ڈال دی، ابن خلدون نے سمندروں کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے تفصیلی اقتباسات سے مسلمانوں کے جغرافیائی ذہن کی ایک تصویر بنانے کی کوشش کی، شاید وہ وقت آئے جب ارضی سیاست کا کوئی طالب علم اس کتاب کو ایک نئے پیکر میں ڈھال کر تصورات کی ایک نئی دنیا پیش کرے۔

تصوف پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، بعض مضامین میں

اشارے ضرور ملتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ تصوف پر لکھنے کا جب وقت آیا تو تصنیف و تالیف سے ان کی طبیعت بھر چکی تھی، علاوہ ازیں جو کیفیت ان پر طاری ہو گئی تھی اس کا زبان قلم پر لانا بھی آسان نہ تھا اس لیے خاموشی کو ہمراز بنا کر انھوں نے تصوف پر اظہار خیال سے گریز کیا، میں نے ایک بار تصوف میں اپنی دلچسپی اور اس پر کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو فرمایا: "کیا آم کو چکھے بغیر اس کا ذائقہ بیان کیا جا سکتا ہے"۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تصوف پر ان کے خیالات مختلف منزلوں سے گذرے تھے، ۱۹۱۷ء میں تصوف سے متعلق ان کے خیالات ناقدانہ تھے، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اقبال کی اسرار خودی اور رموز بے خودی پر انھوں نے اقبال کی ہمنوائی کی، ۱۳ر نومبر ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں اقبال لکھتے ہیں: "میں مدت کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد ان ہی نتائج پر پہنچا ہوں جو آپ کے والا نامہ میں درج ہیں، جو کام آپ کر رہے ہیں وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ آپ کو اس کا اجر عطاء فرمائیں گے، اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے، جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی[١٦]"۔

لیکن ایک وقت آیا جب دونوں اپنے اس موقف سے ہٹے، اور تصوف کے دامن میں پناہ لی، اقبال نے حقیقی تصوف میں تعمیر خودی کا راز پایا، اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کو دین کی روح اور ایمان کا کمال قرار دیا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ادبی ذوق اور شعر و سخن میں دلچسپی کے متعلق کچھ کہنا لاحاصل ہے، انھوں نے "ہندوستان میں ہندوستانی" اور "الفاظ کی تہذیب" پر جو پر مغز مضامین لکھے ہیں وہ تحقیق کی نئی راہ دکھاتے ہیں، "نقوش سلیمانی" میں اُردو زبان اور ادب سے متعلق ان کے خطبات و مقالات معلومات کا گنجینہ ہیں۔

ایرانی شاعری بہت سے ادبی رجحانات اور مذہبی افکار کا منبع و مخرج تھی، اور اس کا مطالعہ ہماری تہذیب کا جزو تھا، خود مولانا شبلیؒ نے "شعر العجم" لکھ کر فارسی شاعری میں نیا ذوق پیدا کر دیا تھا، بقول مولانا ابو الکلام آزاد وہ فارسی کے آخری شاعر تھے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا مزاج محققانہ تھا، شاعرانہ نہ تھا، مولانا شبلیؒ کی طرح انھوں نے فارسی میں سوز و گداز سے تڑپتے ہوئے اشعار نہیں کہے، لیکن ناقدانہ بصیرت اور عرفان شعر کا ان کو خاصا حصہ ملا تھا، خیام پر ان کا کام ادبی ذوق اور شاعرانہ بصیرت اور محققانہ کمال کا آئینہ دار ہے، خود فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے تو یہ کتاب محض اس اظہار کے لیے پیش کی ہے کہ اہل مغرب کو معلوم ہو جائے کہ ان کو جس ریسرچ پر ناز ہے، مشرقی علماء اس میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں"، انھوں نے خیام کے فلسفے کو نئے رنگ میں پیش کیا ہے، اور مروجہ نظریات میں جو مستشرقین کی دین تھے، ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اقبال کا یہ کہنا کہ

اس موضوع پر کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہیں کر سکتا، سب سے بڑا خراج تحسین ہے جو ان کو ادا کیا جا سکتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی علمی خدمات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے نظر ان کی تصانیف تک محدود نہیں رہنی چاہیئے، معارف میں ان کے مقالات، شذرات، اخبار علمیہ ان کے انداز فکر اور وسیع معلومات کے آئینہ دار ہیں، خود معارف نے جو مقام پیدا کیا، وہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مساعی کا رہین منت ہے، مولانا ابو الکلام آزاد نے ایک بار کہا تھا کہ "بحمد اللہ مولانا شبلیؒ کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرت، تاریخ، ادب، ہر میدان میں اپنی تحقیق اور معلومات کے نہ مٹنے والے نقش چھوڑے ہیں، اس صدی کے نصف اول میں ان کی شخصیت علوم اسلامی کی جوئے شیر بن کر کوہ و صحرا کو سیراب کرتی نظر آتی ہے، اقبال نے سچ کہا ہے ع

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

حوالے:

(۱) دیباچہ فتح الرحمٰن ج ۱

(۲) المصطفیٰ

(۳و۴) معارف جون سنہ ۱۹۲۰ء و ص ۴۰۳ و ص ۴۱

(۵) اقبال نامہ ج ۱، ص ۱۴۶

(۶) فاران اپریل سنہ ۱۹۵۴ء ص ۲۸

(۷) معارف ص ۳۸

(۸) سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۲

(۹) الہلال ۲۲/فروری سنہ ۱۹۱۳ء ص ۸۷

(۱۰) المصطفیٰ

(۱۱ تا ۱۵) عرب و ہند کے تعلقات ص ۳۴، ۱۱۴، ۱۴۴، ۱۸۷، ۱۹۴

(۱۶) اقبال نامہ ج ۱، ص ۷۷-۸۰،

محمد اقبال انصاری*

قرآنی خدمات

اگرچہ استاذ الکل علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۳۰۲-۱۳۷۳ھ/۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) نے اپنے استاد گرامی علامہ شبلی نعمانیؒ (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی گراں قدر ولاثانی تصنیف "سیرت النبیؐ" کی تکمیل کر کے بحیثیت سیرت نگار شہرت دوام حاصل کی اور خود بھی اس کام کی اہمیت کا اعتراف و اظہار ع شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم لکھ کر کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت الاستاذ نے علوم اسلامیہ کے ہر باب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے، انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے، بالخصوص قرآن و حدیث، فقہ و کلام اور تصوف، اور سب سے زیادہ تاریخ اسلام، نیز انھوں نے اپنی ہر تحریر میں ہمیشہ نئی راہیں پیدا کی ہیں، اور اچھوتے خیالات، نئے معلومات اور نقاط نظر سے دنیا کو روشناس کرا کے حلقۂ اہل علم سے خراج عقیدت حاصل کیا ہے۔ البتہ اس ناچیز کی رائے میں سید صاحبؒ کا اصل موضوع قرآنیات ہے اور خود "سیرۃ النبیؐ" بھی دراصل قرآن مجید کی روشنی ہی میں ترتیب دی ہے۔ اِس لئے کہ جس کثرت سے قرآنی آیات سے استشہاد اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اب تک سیرت کی کسی اور کتاب میں، خواہ وہ عربی ہی کی کیوں نہ ہو، نظر نہیں آتا اور درحقیقت یہ کتاب 'کان خلقہ القرآن' کی صحیح تفسیر ہے۔ ہر باب میں اس سے متعلق قرآنی آیات کا اس طرح استقصا کیا گیا ہے اور ان کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ سید صاحبؒ کے مخالفین کو بھی ان کی قرآن فہمی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

اِس بنا پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ "سید صاحبؒ" کو اسلامی علوم میں حقیقی شغف قرآن مجید سے تھا۔ آیات قرآنی سے کلامی، فقہی اور سیاست اسلامی کے مسائل کا استنباط، اس کے ادبی لطائف کی تشریح و توضیح اور تاریخی مباحث کی تحقیق اُن کی زندگی کا دلچسپ موضوع تھا۔ "ارض القرآن" اور "سیرۃ النبیؐ" (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضخیم جلدیں اُن کے اس مذاق کی شاہد

---

* سابق صدر شعبۂ اسلامیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عادل ہیں۔"[1] اس لئے اُنھوں نے اگر ایک طرف سیرۃ نبوی کی تکمیل کو "کارے کردم" سے تعبیر کیا تو دوسری طرف درسِ قرآن کو "ماحصلِ زندگی" قرار دیا۔[2]

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب سیّد صاحب نے اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا تو ان کی خوش قسمتی سے انھیں ایک ایسا کیمیاگر مل گیا جس نے ان کی علمی صلاحیتوں کی مسِ خام کو کندن بنا دیا۔ میری مُراد علاّمہ شبلی نعمانیؒ سے ہے جو ۱۹۰۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمد تعلیمات ہو کر آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ندوہ کو علاّمہ شبلی نعمانیؒ نہ مل جاتے تو نہ صرف یہ کہ سید سلیمان، علامہ ڈاکٹر سیّد سلیمان ندویؒ[3] نہ ہوتے، بلکہ دیگر ندوی فضلا بھی وہ گراں بہا علمی خدمات انجام نہ دے سکتے جو اُنھوں نے علاّمہ شبلیؒ کے دامنِ تربیت کے زیرِ سایہ رہ کر انجام دیں اور علمی دنیا میں اپنے محترم استاد اور اپنی مادرِ درسگاہ کا نام روشن کیا۔

علاّمہ شبلیؒ کی نگہِ جوہر شناس نے سیّد صاحب کی علمی صلاحیتوں کا اندازہ ان کی زمانۂ طالب علمی ہی میں لگا لیا اور جب ندوۃ العلماء لکھنؤ کی جانب سے ماہنامہ "الندوہ" نکالنا شروع کیا تو اس کی دیکھ بھال کا کام سید صاحب کے سپرد کیا جسے اُنھوں نے اِس خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا کہ جب ۱۹۰۶ء میں وہ ندوہ سے فارغ ہوئے تو علامہ شبلی نعمانیؒ نے انھیں "الندوہ" کا سب ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ اگرچہ سیّد صاحب نے سب سے پہلا مضمون اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں "وقت" کے عنوان سے ۱۹۰۳ء میں لاہور کے مشہور علمی و ادبی رسالہ "مخزن" میں لکھا جو اس وقت اردو کے مشہور ادیب و اہلِ قلم شیخ عبدالقادر کی ادارت میں نکلا تھا اور اس میں کسی کے مضمون کا شائع ہو جانا باعثِ فخر و اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ البتہ الندوہ کے لیے بھی سیّد صاحب نے اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں پہلا مضمون "علمِ حدیث" پر لکھا جو مئی ۱۹۰۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا اور جس کی داد خواجہ الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ - ۱۹۱۵ء) نے علامہ شبلی نعمانیؒ کو دی۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۰۶ء میں "قضا و قدر اور قرآن" کے عنوان سے ایک پر مغز علمی و تحقیقی مضمون لکھا جو قرآنیات پر سیّد صاحب کا پہلا مضمون ہے اور اُس کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا، اور الندوہ کے مضامین سے سیّد صاحب کی علمی شہرت دن دگنی اور رات چوگنی بڑھتی رہی، اور خود علامہ شبلیؒ نے اُن کے بعض مضامین پر انھیں داد دی اور ان کی علمی صلاحیت و تصنیفی سلیقہ پر اظہارِ مسرت کیا۔

۱۹۰۸ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں علمِ کلام اور جدید عربی کے ایک استاد کی ضرورت پیش آئی تو مولانا شبلیؒ کی نظرِ انتخاب اپنے لائق و ہونہار اور جوان العمر مگر پختہ علم شاگرد

ہی پر پڑی۔ سیّد صاحبؒ نے اس فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دیا اور اس زمانے میں "دروس الادب" کے نام سے عربی کی دو ابتدائی ریڈریں ترتیب دیں جو متعدد عربی مدارس میں داخلِ نصاب ہو کر مقبولِ اہلِ علم ہوئیں۔ سیّد صاحب نے اُن کی ترتیب میں قرآنی آیات کا بڑا اچھّا انتخاب کیا اور انھیں مناسب جگہ دی۔ یہ سیّد صاحب کی پہلی تالیف ہے اور قرآنیات سے اُن کے شغف کی آئینہ دار۔ اِس عرصے میں مضمون مذکورہ بالا کے علاوہ سیّد صاحب نے الندوہ میں قرآنیات پر جو مضامین قلمبند فرمائے اُن میں:

۱۔ القرآن والفلسفۃ الجدیدہ	الندوہ، ستمبر ۱۹۰۶ء
۲۔ مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید	الندوہ، دسمبر ۱۹۰۷ء
۳۔ ایمان بالغیب (یعنی آیت یؤمنون بالغیب کی تفسیر)	الندوہ، دسمبر ۱۹۰۸ء
۴۔ مکررات القرآن (یعنی قرآن مجید میں مکرر آیتیں کیوں ہیں؟)	الندوہ، جنوری ۱۹۰۹ء
۵۔ سود اور صحف انبیاء	الندوہ، جولائی ۱۹۰۹ء
۶۔ اسماء القرآن	الندوہ، اگست ۱۹۱۱ء

خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں جو سیّد صاحب کے ابتدائی مضامین ہونے کے باوجود اُن کے تبحرِ علمی کی بیّن دلیل ہیں۔

اگرچہ سیّد صاحب مسندِ علمی چھوڑنا پسند نہ کرتے تھے مگر کچھ حالات ایسے ہوئے کہ انھیں مولانا ابوالکلام آزاد کے پیہم اصرار نیز علامہ شبلی کی ایما پر ہفتہ وار 'الہلال' کلکتہ کی مجلس ادارت میں شامل ہونا پڑا جسے مولانا آزاد نکال رہے تھے اور جو سید صاحب کے وہاں پہنچنے پر نام کا تو ہلال ہی رہا مگر اہلِ علم و بصیرت کے نزدیک وہ بدرِ کامل بن گیا جس کی نور افشانی کلکتہ کے مطلع سے شروع ہو کر مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سب کو مطلعِ انوار بنانے لگی۔ عربی کے قدیم و جدید ماخذوں کی مدد سے مسلمانوں کے لئے دینی، تمدّنی، سیاسی اور تاریخی ہر عنوان سے متعلق بہترین معلومات پیش کرنا تو سیّد صاحب کا کام تھا ہی، باقی خود ہندوستان کی سیاستِ حاضرہ پر تبصرہ لکھنے میں بھی وہ اپنے چیف ایڈیٹر (مولانا آزاد) سے پیچھے نہ رہے۔ البتہ چونکہ 'الہلال' میں مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے اس لیے 'مضامین الہلال' کے مجموعے شائع کرنے والوں نے بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا آزاد کی طرف منسوب کر دیا جب کہ ان میں سے بعض سید صاحب کے بھی ہیں۔

اگرچہ سیّد صاحب کا الہلال سے تعلق بہت ہی مختصر رہا پھر بھی اس مختصر مدت میں قرآنیات

پر اُن کے جو مضامین شائع ہوئے اُن میں:

۱۔ تذکار نزول القرآن	الہلال ۶ر اگست ۱۹۱۳ء
۲۔ قصص بنی اسرائیل	الہلال ۲۴ر ستمبر، ۱۵ر اکتوبر، اور ۱۲، ۱۹ر نومبر ۱۹۱۳ء
۳۔ علوم القرآن	الہلال ۱۱ر فروری، ۲۵ر مارچ اور ۸ر جولائی ۱۹۱۴ء
۴۔ اساطیر الاولین	الہلال ۱۵ر و ۲۲ر اپریل ۱۹۱۴ء

خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

سید صاحب مولانا آزاد کے اصرار پر 'الہلال' کی مجلس ادارت میں شامل ہو تو گئے تھے، مگر وہ خود اس صحافتی زندگی سے مطمئن نہ تھے، نیز علامہ شبلیؒ بھی اُن کے لئے کسی مناسب و موزوں جگہ کی تلاش میں تھے، جس میں انھیں اپنے ایک مخلص دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر (م ۱۹۵۲ء) کی کوششوں سے کامیابی ہوگئی اور سید صاحب کو بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت پُونہ کے مشہور دکن کالج میں السنۂ مشرقیہ کی اسسٹنٹ پروفیسری مل گئی۔ اگرچہ اُن کا خود اس منصب کے قبول کرنے کا ارادہ نہ تھا، مگر چونکہ مولانا شبلی کی خوشی اسی میں تھی اس لئے اُن کے اصرار پر امتثالاً للامر قبول کرنا پڑا، اور یہاں فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ایک یہودی عالم سے عبرانی زبان بھی سیکھ لی، تاکہ عربی الفاظ کے عبرانی ماخذ پر بھی عبور حاصل ہو جائے، اور ساتھ ہی انگریزی زبان پر بھی زور دیا، اور یہیں "سیرت عائشہؓ" اور "تاریخ ارض القرآن" کا آغاز کیا جو قرآنیات پر اپنی نوعیت کی پہلی بلکہ ابھی تک آخری تصنیف ہے۔

علامہ شبلیؒ نے سب سے پہلے دار المصنفین کا ابتدائی تخیل دار العلوم ندوۃ العلماء کی اس رپورٹ میں پیش کیا تھا جو انھوں نے ندوۃ العلماء کے تیرھویں اجلاس منعقدہ دہلی مارچ ۱۹۱۰ء میں پیش کی اور اس میں ایک کتب خانۂ اعظم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا کہ

> "یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف ہو جس طرح یورپ میں اکاڈیمیاں ہوتی ہیں، یہ بھی اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب کہ ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کرایا جائے۔"[5]

اور اس کی تائید میں سید صاحب سے "ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت" پر تقریر کرائی تھی اور انھیں ہدایت کی تھی کہ وہ اس میں دار المصنفین کے قیام کی تجویز پیش کریں۔ چنانچہ سید صاحب نے ایسا ہی کیا، مگر قبل اس کے کہ یہ تجویز عملی جامہ اختیار

کرتی ندوہ میں اختلافات شروع ہو گئے، جن سے دل برداشتہ ہو کر اور جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیمات کے عہدہ سے استعفا دے کر علامہ شبلیؒ اپنے وطن اعظم گڑھ چلے آئے، اور وہاں قیام دار المصنفین کے منصوبے بنانے میں مصروف ہو گئے، مگر اُن کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی، اور وسط نومبر ۱۹۱۴ء میں جب زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی تو سید صاحب کو تار دے کر بلایا۔ وہ تار تو نہیں پہنچا البتہ استاد کی قلبی کشش نے انھیں خود ہی اعظم گڑھ پہنچا دیا، مگر وہ بمشکل تکمیل سیرت کی وصیت کر سکے، اور ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کی صبح اُن کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ سید صاحب اپنے استاد کی وصیت پوری کرنے اور اُن کے تیار کردہ دار المصنفین کے خاکہ کو علمی جامہ پہنانے کی نیت سے دکن کالج، پونہ کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ آ گئے۔ یہاں تمام وابستگانِ شبلیؒ نے بالاتفاق سید صاحب کے سر پر اُن کے استاد مرحوم کی جانشینی کا تاج رکھا، اور 'سید الطائفہ' کا خطاب عطا کر کے اُن کے تبحرِ علمی کا اعتراف کیا اور مئی ۱۹۱۵ء میں سید صاحب نے اپنے استاد مرحوم کی رکھی ہوئی بنیاد پر دار المصنفین کی تعمیر کا باقاعدہ آغاز کیا۔

دار المصنفین کی مطبوعات کا آغاز سید صاحب کی "تاریخ ارض القرآن" جلد اول سے ہوا۔ البتہ چونکہ اس وقت تک دار المصنفین کا اپنا پریس نہ تھا، اس لئے یہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کے مطبع شاہی میں طبع ہوئی، اور اسی سال رمضان المبارک میں سید صاحب کی زیر ادارت دار المصنفین کے ترجمان (ORGAN) ماہنامہ معارف کا اجرا عمل میں آیا۔ اور ماہ اجرا کی مناسبت سے انھوں نے 'روزہ' پر معارف، جولائی ۱۹۱۶ء میں اپنا مضمون بغیر نام کے شائع فرمایا، در حقیقت "کتب علیکم الصیام" (قرآن ۲:۱۸۳) کی تفسیر ہے جس میں روزہ کی تاریخ، اس کی حقیقت اور لیلۃ القدر پر بہت ہی سلجھے انداز میں بحث کر کے متعلقہ آیات کی تشریح کی گئی ہے، اور اُن اعتراضات کے جوابات بھی دلائل کے ساتھ دیئے گئے ہیں جو روزہ پر کئے جاتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے مبارک مہینے میں 'معارف' کا اجرا بھی سید صاحب کی قرآن کے ساتھ بے پناہ شیفتگی کی ایک دلیل ہے۔ چنانچہ خود سید صاحب نے معارف کے سب سے پہلے شذرات کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:

> "رسالے کا پہلا نمبر ہم رمضان المبارک کے مقدس مہینے سے شروع کرتے ہیں کہ ہمارے علوم و معارف کی سب سے پہلی کتاب اسی ماہِ مقدس میں نازل ہوئی تھی، شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ"

معارف میں قرآنیات پر مضامین کے جس سلسلے کا آغاز اس مبارک مقالے سے ہوا تھا وہ بعد میں بھی جاری رہا، اور دیگر مقالہ نگاروں کے علاوہ خود سید صاحب نے مضمون بالا کے علاوہ

وقتاً فوقتاً حسب ذیل گیارہ اہم مقالات قلمبند فرمائے جن کا قرآنیات سے براہِ راست تعلق ہے:

۱- قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات	معارف، اگست و ستمبر سنہ ۱۹۱۶ء
۲- آیت استخلاف	معاف، اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء
۳- ارضِ حرم اور اس کے معالح و احکام قرآن مجید کی نظر میں	معارف، نومبر و دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء
۴- علوم القرآن	معارف، اپریل سنہ ۱۹۲۶ء (الہلال میں شائع شدہ مضمون نظر ثانی کے بعد)
۵- لفظ صلوۃ قرآن شریف میں	معارف، اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء
۶- ایّام صیام پر نظر ثانی	معارف، جنوری سنہ ۱۹۳۲ء
۷- قرآن پاک کا تاریخی اعجاز	معارف، فروری سنہ ۱۹۳۹ء
۸- کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے؟	معارف، اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء
۹- وحی از روئے قرآن اور مدعی کا تضاد بیان	معارف، نومبر سنہ ۱۹۴۰ء
۱۰- وحی کی اقسام	معارف، دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء
۱۱- حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے (یعنی إنِ الحکمُ إلاّ للہ کی تفسیر)	معارف، نومبر سنہ ۱۹۴۶ء

اِن کے علاوہ تین مضامین:- [۱]احکام القرآن، [۲]صبر کا قرآنی مفہوم اور [۳]کیا قرآنِ پاک انسانی ذہن سے ماخوذ ہے؟ کا ذکر شاہ معین الدین احمد ندوی (م ۱۹۷۴ء) نے کیا ہے مگر نہ تو ان کی کوئی نشاندہی کی ہے اور نہ انھیں اپنی مرتبہ مقالاتِ سلیمان کی جلد سوم میں شامل کیا ہے جو سید صاحب کے مذہبی مضامین کا مجموعہ ہے۔

سید صاحبؒ نے صرف مذکورہ بالا مضامین لکھنے پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ان نام نہاد مسلمان متجددین کے خلاف بھی آواز بلند کی، جن کا کام ہی خدا، رسول، وحی، قرآن مجید اور احادیثِ نبوی وغیرہ پر دل آزار مضامین لکھ کر اسلام اور تاریخ اسلام کو مسخ کرنا اور اس طرح جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کو گمراہ کرنا تھا، اس کے سرغنہ نیاز فتحپوری تھے جنھوں نے اپنے ماہنامہ نگار، لکھنؤ کے صفحات اِس کارِ شر کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ نیاز صاحب خود بھی اِس قسم کے مضامین لکھتے اور اپنے ہم مشربوں سے بھی

لکھواتے، جو بڑی حد تک مستشرقین کے خیالات کا چربہ اور اُن کے افکار کے ترجمان ہوتے تھے۔ سید صاحب نے معارف کے شذرات میں ان کے وقتاً فوقتاً جواب دیتے رہنے کے علاوہ اِن پر اگست ۱۹۳۱ء کے معارف میں "گلہ آشنا" کے معنی خیز عنوان سے ایک بہت ہی مدلل مضمون لکھا، جس سے مسلمانوں میں "نیازیت" سے سخت بیزاری پیداری ہوگئی، پورے مسلم پریس نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اور بالآخر نیاز صاحب کو توبہ نامہ شائع کرتے ہی بن پڑی، جس کے ساتھ یہ وعدہ بھی شامل تھا کہ وہ آیندہ سے 'نگار' میں مذہب کے خلاف مضامین شائع نہ کریں گے، لیکن چند ہی برسوں میں وہ اس وعدے سے مکر گئے، اور توبہ توڑ کر پھر سے اپنے ملحدانہ خیالات کی اشاعت شروع کردی اور ایک استفسار کے جواب میں کلام مجید کے الہامی کتاب ہونے سے انکار کردیا، اور یہاں تک لکھ دیا کہ نعوذ باللہ "کلام مجید کو نہ میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں، نہ الہام ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں..."[9]

نیاز صاحب کی ان ہفوات سے مسلمانوں کے دلوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوگیا، اور اُن کے تمام فرقوں نے ان ملحدانہ خیالات سے بیزاری کا اظہار کیا، اور جن متعدد علمائے نے ان کی تردید اور قرآن مجید کے دفاع اور اس کی حقّانیت کے ثبوت میں مضامین لکھے، اُن میں سرفہرست سید صاحب ہی ہیں۔ انھوں نے معارف کی اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۳۰ء کی تین مسلسل اشاعتوں میں علی الترتیب "کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے؟" "وحی ازروئے قرآن اور مدعی کا تضاد بیان" اور "وحی کے اقسام" کے عناوین سے مضامین لکھ کر اُن کا مدلل جواب دیا، اور لکھا کہ:

> "ہماری سعادتوں اور ہدایتوں کے سب سے قیمتی خزانے کا نام قرآن پاک ہے، جس پر بہ اختلافِ فرق تمام مسلمانوں کا اتفاق تام اور اجماع عام تھا اور ہے، کہ یہ انسانی اوہام وخیالی قصص وحکایات سے بلند تر خدا کی طرف سے آئی ہوئی صداقت کا نام ہے، اور اسی لئے وہ ہر خطا سے پاک اور ہر غلطی سے مبرّا ہے۔ اس لئے ہر وہ ہاتھ جو اس کی عصمت کو داغدار بنانے کی کوشش کرے گا اس کا کاٹ ڈالنا ہمارا فرض ہے۔"[10]

اس وقت تو یہ فتنہ دب گیا لیکن چونکہ نیاز فتحپوری صاحب نے الحاد و بے دینی کی تبلیغ و اشاعت کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنا رکھا تھا، اس لیئے چند سال بعد پھر وہ اپنی پُرانی روش پر آگئے، اور ایک گڑے مردے کو اکھاڑ کر ۱۹۴۵ء میں ایک اور شگوفہ چھوڑا۔

ایک انگریز مشنری کلیر ڈبلو ٹسڈل (Dr. CLAIR W. TISDALL) نے ۱۹۰۰ء میں

"ینابیع الاسلام" کے نام سے فارسی میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ (نعوذ باللہ) قرآن مجید اللہ کا کلام نہیں بلکہ رسول اللہ کی طبع زاد تصنیف ہے اور خود مذہب اسلام بھی یہودی، عیسائی اور دیگر مذاہب سے ماخوذ ہے...." اس کتاب کے انگریزی، عربی اور اردو میں ترجمے بھی شائع ہوئے اور خود ٹسڈل نے بھی اس کا نقش ثانی مزید اضافوں اور حاشیہ آرائیوں کے ساتھ (THE ORIGINAL SOURCES OF THE QURAN) کے نام سے لکھا جسے لندن کی (SOCIETY FOR PROMOTING CHRISTIAN KNOWLEDGE) نے ۱۹۰۵ء میں شائع کیا۔ اسی زمانے کے اہل قلم مسلمانوں نے اس کی تردید میں متعدد کتابیں بھی لکھیں جن میں عربی کی "التطبیق بین الدیانۃ الوثنیہ والمسیحیہ" اور اردو میں خواجہ کمال الدین کی "ینابیع المسیحیت" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اگرچہ عام طور پر پروفیسر سید نواب علی کی "قصص الحق" اور "تاریخ صحف سماوی" کو بھی اس کتاب کا الزامی جواب سمجھا جاتا ہے لیکن موخر الذکر (جیسا کہ اس کے پیش لفظ میں وضاحت ہے) ڈاکٹر منگانا کی کتاب کا جواب ہے جو ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

ٹسڈل کی کتاب قصۂ پارینہ بن چکی تھی، مگر کہیں سے اس کا ایک نسخہ نیاز فتحپوری کے ہاتھ لگ گیا جسے اُنھوں نے اپنی حاشیہ آرائی کے ساتھ شائع کر کے اور قرآن مجید و اسلام کے متعلق اپنے مزعومات ظاہر کر کے علماء سے اُن کا جواب مانگا جس پر متعدد علمائے نے مضامین لکھے جن میں شاہ معین الدین احمد ندوی کا مقالہ "فہم قرآن کے اصول و شرائط" خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، اس میں انھوں نے ٹسڈل کی کتاب کی حقیقت بے نقاب کی ہے۔ خود سیّد صاحبؒ نے بھی معارف اگست ۱۹۴۵ء کے شذرات میں اس بارے میں لکھا۔ بالآخر نیاز فتحپوری کے دیگر فتنوں کی طرح یہ فتنہ بھی ختم ہو گیا، اور پھر وہ پاکستان سدھار گئے، جہاں 'نگار' تو جاری رہا مگر انھیں اپنے ملحدانہ خیالات اپنے سینے ہی میں دفن کر لینے پڑے۔

سید صاحب کی علمی وقعت کم کرنے اور انھیں قرآنیات سے بے بہرہ ثابت کرنے کی غرض سے ان کے مخالفین نے جو کوششیں کیں اُن میں جناب امداد صابری کا ایک رسالہ "علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اُن کی تصنیف نہیں ہے بلکہ جیسا کہ بعض علماء کا دستور تھا کہ بسا اوقات وہ اپنی کسی تصنیف کو اپنے کسی شاگرد یا عزیز کے نام سے منسوب کر دیا کرتے تھے یہ بھی کسی اور کی تصنیف ہے۔ بہرحال نومبر ۱۹۳۶ء میں جب سید صاحبؒ فلسطین کانفرنس کی صدارت کی غرض سے دہلی تشریف لائے تو اس رسالہ کا ایک نسخہ اُنھیں دیا گیا جس پر مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۹۴۳ء) اور بعض دوسرے علماء کی تقریظیں بھی تھیں۔ سید صاحبؒ

نے دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء کے معارف میں اس کا مدلل جواب دے کر گیارہ غلطیوں کے اس رائی کے پہاڑ کی دھجیاں اڑا دیں[۱۲] جس پر برافروختہ ہو کر صابری صاحب نے ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا، مگر نواب سائل دہلوی نے درمیان میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا[۱۳] اور یہ حقیقت بے نقاب نہ ہو سکی کہ کیا یہ بھی سید صاحبؒ کے خلاف پسِ پردہ زرنگاری ایک سازش تھی۔

سید صاحب نے قرآن مجید کی جو گراں قدر علمی خدمت انجام دی ہے، اور قرآنیات پر جو بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے ان الباقیات الصالحات کے سوا ان کے سامنے اس سلسلے میں کچھ اور بھی کام تھے جو اُن کی زندگی میں انجام نہ پا سکے، اور اُن میں سے بعض جو مولانا محمد اویس ندوی (م ۱۹۷۶ء) استاد تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علم میں تھے وہ انھوں نے قلمبند کر دیئے تھے[۱۴]۔ اور میں انھیں مختصراً اس امید میں درج کر رہا ہوں کہ شاید خود دارالمصنفین یا کسی اور ادارے کو انھیں مکمل کر کے سید صاحبؒ کی روح کو خوش کرنے کی توفیق ہو ہی جائے۔

۱- عصری مذاق کے مطابق قرآنی آیات کی ترتیب و تدوین، یعنی جن آیات سے فقہی، کلامی، اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا استنباط ہو سکے ان کو احادیث نبویہ، نیز صحابہ و تابعین اور سلفِ صالحین کی تشریحات کے ساتھ الگ الگ مرتب کیا جائے۔

اس سلسلے میں عقائد القرآن اور فقہ القرآن کے دو عنوان قائم کر کے سید صاحبؒ نے کچھ کام بھی شروع کر دیا تھا، اور فقہ القرآن کے لئے مولانا محمد اویس ندوی نے قرآن مجید کی آیات احکام جمع کی تھیں جو اب بھی ان کے کتب خانے میں محفوظ ہیں، اور اُن کے لائق فرزند ڈاکٹر محمد یونس نگرامی اس کام کا تکملہ بحسن و خوبی کر سکتے ہیں۔ اگرچہ اس موضوع پر کچھ کام پاکستان میں ہو چکا ہے، اور فقہ القرآن کے عنوان ہی سے تین ضخیم جلدیں مولانا محمد عمر احمد عثمانی صاحب نے ادارہ فکر اسلامی کراچی سے سنہ ۱۹۸۰ء میں شائع کر دی ہیں، مگر دارالمصنفین کے مذاق و معیار کے مطابق اب بھی اس موضوع پر کام کی گنجائش ہے۔ نیز عقائد القرآن والا کام بھی غالباً باقی ہے، اور اخلاقیات و اقتصادیات وغیرہ دیگر مجوزہ موضوعات کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے۔

۲- دوسرے محققین کی طرح سید صاحب کا بھی خیال تھا کہ آیاتِ قرآنی کی حیثیت کلیات کی ہے، اور احادیث نبوی ان ہی کلیات کی تشریح ہیں، اس لئے اُن کی تجویز تھی کہ قرآن مجید نیز کتب احادیث کا بنظر غائر مطالعہ کر کے احادیث نبویؐ کو ان ہی کلیات کے ماتحت جمع کر دیا جائے۔ اس کے لئے انھوں نے

حسب ذیل دو عنوان قائم کر کے خود ہی ابتدائی کام شروع کر دیا تھا۔

ا۔ الآیات التی استدلّ بہا النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم علی ما قالہ جس کے ذیل میں وہ ۵۸ استدلالات نبوی جمع کر چکے تھے۔

ب۔ الاحادیث التی تفسّر القرآن بغیر ذکر القرآن جس کے ذیل میں ۱۸۲ احادیث جمع فرمائی تھیں۔

ان اہم اور بنیادی کاموں کے سوا قرآنیات کے متعلق کچھ کام سیّد صاحب کی موجودگی ہی میں مکمل ہو چکے تھے جن کی اشاعت کی ضرورت ہے اور جو کچھ ادھورے اور کچھ تجویز کی شکل میں کام اب بھی باقی ہیں اُن پر بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے مثال کے طور پر:

۱۔ قرآن مجید پر ادبی حیثیت سے کام کرنے والوں کی سہولت کی غرض سے سیّد صاحبؒ نے ان تمام آیات کو سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے دو جلدوں میں جمع کرا دیا تھا جن سے معانی و بلاغت نیز دوسرے فنون کی کتابوں میں مسائل کی تشریح کے ضمن میں قرآن مجید کے لطائف ادبیہ کی وضاحت ہوتی ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں جن چیزوں کو بطور آیات الٰہی پیش کیا گیا ہے انھیں متعلقہ آیات اور قدیم و جدید مآخذ سے ایسے معلومات کے ساتھ جمع کر دیا جائے جن سے اُن کے آیت (نشانی) خداوندی ہونے کی حقیقت و حیثیت کی وضاحت ہو جائے۔ اِن آیات کو متعلقہ عنوانات کے ساتھ جمع کیا جا چکا ہے، صرف اُن کی تشریح کا کام باقی ہے۔

۳۔ اعجاز قرآن پر شروع سے سید صاحب کی دارالمصنفین سے روانگی تک جو بھی کام ہوا تھا وہ اُنھوں نے بترتیب سنین ایک جلد میں جمع کرا دیا تھا اس کی بھی اشاعت کی ضرورت ہے تاکہ ہر دور میں مسئلے کی صحیح نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔

۴۔ دارالمصنفین کے کتب خانے میں شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۲ء-۱۷۶۳) کی "الفوز الکبیر" کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں شاہ صاحبؒ کے حواشی قرآن مجید اور اصولِ ترجمۂ قرآن کا رسالہ بھی ہے۔ سیّد صاحبؒ کی دلی خواہش تھی کہ اسے شائع کیا جائے، نیز اصل "الفوز الکبیر" کا تحشیہ کیا جائے۔ شاہ صاحب کے ارشادات کو آیات قرآنی سے مدلل کیا جائے اور دوسرے محققین کی کتابوں سے ان کی توثیق کی جائے۔ اِس سلسلے میں کچھ ابتدائی کام ہو چکا ہے۔

افسوس ہے کہ قرآنیات کے ان اہم کاموں میں بعض کو مکمل، بعض کو ادھورا اور بعض کو زیرِ تجویز چھوڑ کر سید صاحبؒ ۱۱ جون ۱۹۵۰ء کو پاکستان چلے گئے اور وہیں ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء

کو سفرِ آخرت اختیار کیا، مگر اس قلیل مدت میں بھی وہ خدمتِ قرآن سے غافل نہیں رہے، اگرچہ اُن کی یہ دلی آرزو تو پوری نہ ہو سکی کہ "قدیم درس گاہوں کے فارغ التحصیل طلباء اور جدید کالجوں کے ایسے تعلیم یافتہ طلبہ جنھوں نے عربی یا اسلامیات میں ایم۔ اے کیا ہو اور جن کو علوم دین سے شغف بھی ہو، ان دونوں قسموں کے طلباء کو ملا کر ایک باضابطہ درس کا سلسلہ قائم کیا جائے جس میں صرف علوم قرآنی کی اعلیٰ تعلیم ہو اور کلام اللہ سے استفادہ کے طریقوں کی تفہیم کی جائے"[۱۵] تاہم انھوں نے اس کے بدل کے طور پر ایک حلقہ درس قرآن قائم کر رکھا تھا جس کے متعلق ایک خط میں شاہ معین الدین احمد ندوی کو تحریر فرماتے ہیں کہ "بحمداللہ کہ صبح کی نماز کے بعد ایک گھنٹے ایک مسجد میں درسِ قرآن ہوتا ہے[۱۶]، سوا دو سو سامعین ہوتے ہیں جن میں بعض افسران بھی ہوتے ہیں، یہی ماحصل زندگی ہے۔" اس اقتباس کا آخری جملہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہے جو آخری وقت تک سید صاحبؒ کے قرآنی شغف کا بیّن ثبوت ہے۔

وقت کی تنگدامانی کے پیش نظر اب مزید تفصیلات میں جائے بغیر میں سید صاحب کی قرآنیات پر شاہکار کتاب "تاریخ ارض القرآن" کے مختصر تعارف پر اکتفا کروں گا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے وہ نہ صرف یہ کہ سید صاحب کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے بلکہ سلسلۂ مطبوعات دارالمصنفین کی بھی پہلی کتاب ہے، جس کی جلد اول ۱۹۱۵ء اور جلد دوم ۱۹۱۸ء میں اشاعت پذیر ہوئی، اور جو دراصل علامہ شبلی نعمانیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف "سیرۃ النبیؐ" کے مقدمہ کے طور پر لکھی گئی تھی مگر طویل ہو جانے کی باعث ایک مستقل تصنیف بن گئی۔ سبب تالیف کے بارے میں خود سید صاحب نے لکھا ہے کہ "سرزمین قرآن (عرب) کی تاریخ جس قدر بعد القرآن یعنی اسلام کے بعد روشن ہے، اسی قدر قبل القرآن یعنی اسلام سے پہلے تاریک ہے۔ قرآن مجید میں بر سبیل عبرت و اظہار واقعہ ملک عرب کے متعدد اقوام و اشخاص و انبیاء کے حالات مجملاً بیان کئے گئے ہیں، لیکن عرب کی قوم تصنیف و تالیف سے آشنا نہ تھی، اس لئے ان اقوام، اشخاص اور اقطاع ملک کے تاریخی، سیاسی، قومی، مذہبی اور جغرافی حالات کے بیان کی بنیاد مسلمان مصنّفین نے صرف بے احتیاطانہ زبانی روایات پر رکھی، لیکن اہل یورپ اُن کے مقابل یونانی و رومانی سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کے تحریری بیانات، عرب کے آثارِ قدیمہ اور نقوش و کتبات پیش کرتے ہیں، جو تنہا زبانی روایات سے ظاہر ہے کہ کہیں صحیح تر ماخذ ہیں۔ اس بنا پر انھوں نے عرب قبل قرآن کی تاریخ کے متعلق بالکل نیا عالم پیدا کر دیا ہے جو اُن کی نظر میں، قرآن مجید کے بیانات اور عرب کی زبانی روایات نے جو تصویر کھینچی ہے

اس سے مختلف ہے اور اس لئے ان کو اس میدان میں اعتراضات کا بڑا جولانگاہ نظر آتا ہے۔

"اس تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ قدیم و جدید معلومات کی تطبیق کے ساتھ ارض القرآن (عرب) کے حالات مذکورہ کی اس طرح تحقیق کی جائے کہ قرآن مجید کی صداقت اور معترضین کی لغزش علی الاعلان آشکار ہو جائے ...... قرآن مجید میں عرب کی بیسیوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں جن کی ہر قسم کی تاریخ سے نہ صرف عوام بلکہ علماء تک ناواقف ہیں اور نہایت عجیب بات ہے کہ تیرہ سو (۱۳۰۰) برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود مسلمانوں کو ان سے ناواقفیت رہی اور دوسری طرف غیروں کو انھیں افسانہ (LEGEND) کہنے کی جرائت ہوئی ..... مقام عبرت ہے کہ ہماری مذہبی کتاب کی تحقیق و کاوش میں اغیار نہایت کوشش و جانفشانی سے مصروف ہیں، جرمن، فرنچ، اٹالین اور انگلش مستشرقین نے تاریخ عرب قبل اسلام پر محققانہ کتابیں لکھیں؛ یونانی و رومانی تصنیفات سے، جو عرب قبل اسلام کے حالات پر ہیں، انتخاب و خلاصہ کیا، قرآن مجید نے جن اقوام و بلاد کا ذکر کیا ہے اُن کے کھنڈروں کا مشاہدہ کیا، ان کے کتبات کو حل کیا اور اُن سے عجیب و غریب نتائج مستنبط کئے۔

"تاہم وہ مسلمان نہیں یہودی یا عیسائی ہیں، انھوں نے نہایت بیدردی سے قرآن کے فوائد کو پامال کیا اور بعض متعصب مستشرقین نے ان معلومات کو غلط طور سے قرآن کی مخالفت میں استعمال کیا ہے ..... لیکن کیا کہیئے کہ ہماری غفلت سے وہ قرآن کہ صداقت تاریخی کا معیار ہے بعض پادری اس قرآن کی تاریخی اغلاط کو پیش کرتے ہیں ..... عرب کے بعض اثری اکتشافات کی بنا پر یورپ کے بعض سبک مغز مصنفین جرأت کے ساتھ کہتے ہیں کہ قرآن کے پہلے کا عرب قرآن کے بعد کے عرب سے ہزار درجہ بہتر تھا۔

"ضرورت ہے کہ جس طرح ایرانی و یہودی مؤرخین کے مقابلے میں ابن حنیفہ دینوری المتوفی ۲۸۱ھ ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ اور ابن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ھ نے اسلام اور قرآن کی تاریخ کی تحقیق و تطبیق میں کوشش کی، اس زمانے میں جدید یورپین تاریخ کی اسلام و قرآن سے تطبیق دی جائے اور یورپین تاریخی تحقیقات و اکتشافات کی غلطی کا پردہ چاک کیا جائے اور خود ان ہی کے کارخانوں کے بنے ہوئے ہتھیاروں سے اُن کے حملوں کا جواب دیا جائے[۱۷]۔"

اس اہم کام کی تکمیل کا بیڑہ خود سید صاحب نے اٹھایا اور اس وقت جو اہم ماخذ ہو سکتے تھے انھیں جس خوش اسلوبی سے کھنگالا وہ اُن کے علمی و تحقیقی کارناموں کا ایک زرین باب

ہے اور "سرمایہ ارض القرآن" کے عنوان سے اُن مآخذ کی تفصیل دے دی ہے جو چار قسموں پر مشتمل ہے:

۱- ادبیات اِسلامیہ (MUHAMMADAN LITERATURE)

۲- ادبیات اسرائیلیہ (JEWISH LITERATURE)

۳- ادبیات یونانیہ و رومانیہ (GREEK AND ROMAN LITERATURE)

۴- اکتشافات اثریہ (ARCHAELOGICAL DISCOVERIES)

اور ان مآخذ کی اہمیت و نوعیت پر جو سیر حاصل تبصرہ کیا ہے وہ اُردو میں پہلی مثال ہے۔ ادبیات اسلامیہ میں قرآن مجید، روایات تفسیر، اسرائیلیات، کتب تفسیر، تاریخ عرب، جغرافیہ عرب اور انساب عرب سے متعلق تمام ممکن الحصول کتابوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ادبیاتِ اسرائیلیہ کا مجموعہ توراہ (TORAH) کیتبیم (KETHUBIM)، نبیجم (NEBHIIM)، ترگوم (TERGUM)، مدراش (MIDRASH) اور تالمود (TALMUD) سے عبارت ہے عبرانی زبان سے واقفیت کی بنا پر سید صاحب نے اِن سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ادبیات یونانیہ و رومانیہ میں اُنھوں نے ہیروڈوٹس (HERODOTUS)، اراٹستھینس (ERATOSTHENES) ڈیوڈوڈس (DIODODUS)، اسٹرابو (STRABO) پلینی (PLINY) اور بطلیموس (PTOLEMY) وغیرہ کی تصانیف کے تراجم یا اُن کے اقتباسات سے کام لیا ہے۔ اکتشافات اثریہ میں اُنھوں نے یمن، حضرموت، حوران، تدمر، پیطرا، علا، مدائن، صالح، صنعا، حجر، حجاز، عراق اور مصر کے آثار، کتبات و نقوش سے استفادہ کیا ہے۔ اور اِن سب کو پیشِ نظر رکھ کر اُنھوں نے عرب کی قدیم قوموں کے زمانے کے مختلف مقامات اور اُن کے باشندوں کے نام کی تطبیق دی ہے۔ اس کے بعد عرب کے جغرافیہ سے مفصل بحث کی ہے۔ مگر اس کتاب کا سب سے اہم حصّہ وہ ہے جس میں ارض القرآن کی اقوام کی تفصیلات دی گئی ہیں اور سہولت کی خاطر انھیں حسب ذیل تین طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱- طبقہ اولی۔ امم سامیہ (اولی و ثانیہ) جلد اول ص ۲۴ تا ۲۲۰
۲- طبقہ ثانیہ۔ بنو قحطان جلد اول ص ۲۲۱ تا ۳۱۵
۳- طبقہ ثالثہ۔ سلسلہ ابراہیمی و آل ابراہیم جلد دوم

طبقہ اولی میں عاد، بعثت ہود، عاد ثانیہ، ثمود، حضرت صالح، ثمود ثانیہ، جرہم، طسم و جدیس، اہل مدین بنی لحیان اور مجہول قبائل سامیہ پر بحث ہے، جس میں عاد و ثمود پر بالخصوص بہت تفصیل سے لکھا ہے۔

طبقہ ثانیہ میں قوم سبا، حمیر، تبابعہ، اصحاب الاخدود اور اصحاب الفیل و ابرہہ کی تفصیلات کے علاوہ واقعہ فیل کی تحقیق کر کے مخالفین کو مسکت جواب دیا ہے۔

طبقۂ ثالثہ میں بنو ابراہیم و اسماعیل سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان قریش تک کی مفصل تاریخ ہے اور ساتھ ہی قبل اسلام عربوں کے مذاہب و مشاغل اور اُن کی زبانوں وغیرہ کا ذکر ہے، نیز اصحاب الایکہ اور اصحاب الحجر کی تفصیلات خصوصیت کے ساتھ اہم ہیں۔

تاریخ ارض القرآن کے محتویات کے اس سرسری جائزہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سید صاحبؒ نے اُن کی جمع و ترتیب میں کس قدر عرق ریزی و جانفشانی کی ہوگی بالخصوص اس لئے کہ آج سے تقریباً اسی سال قبل جب اُنھوں نے اِس کام کا آغاز کیا تھا تو کتب خانوں، مائیکرو فلموں اور زیروکس وغیرہ کی وہ سہولتیں انھیں حاصل نہ تھیں جو آجکل ہم کو حاصل ہیں، اور نہ اس وقت آجکل کی رسل و رسائل و ذرائع ابلاغ کی سہولتوں کا تصوّر بھی کیا جاسکتا تھا۔

اِس لئے اس کتاب کے شائع ہوتے ہی علماء نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی تفاسیر و دیگر تصانیف میں اس سے استفادہ کیا، اور جو شخص بھی اس کتاب کا بنظر غائر مطالعہ کرے گا وہ اِس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہ رہے گا کہ یہ بلاشبہ سید صاحبؒ کی ایک اہم قرآنی خدمت ہے جس نے قرآن فہمی کے معیار میں ایک خاص پہلو سے فکری انقلاب پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحبؒ کے معاصرین و متاخرین اُن کی اس گراں قدر تصنیف کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانی رقمطراز ہیں کہ

"تاریخ ارض القرآن اول سے آخر تک ایسے معلومات سے بھری ہوئی ہے جو کم از کم علماء کے لئے صرف یہی نہیں کہ نئے ہیں بلکہ ان معلومات کی رہنمائی میں مطالعہ و تحقیق کے ارباب ذوق کو تجربہ بتائے گا کہ کافی مدد مل سکتی ہے، عرب کے جغرافیائی معلومات کے مصادر و مآخذ کی طویل فہرست اس کتاب میں درج ہے، جن میں اسرائیلی ویونانی و رومانی ادبیات و اکتشافات اثریہ کے سوا سید صاحبؒ نے ادبیات اسلامیہ کے ذیل میں جن مطبوعہ اور غیر مطبوعہ عربی زبان کی کتابوں کا ذکر کیا ہے یہ ایک ایسی علمی فہرست ہے کہ ہمارے علماء جو انگریزی یا اسی قسم کی جدید عصری زبانوں سے ناواقف ہیں وہ بھی ادبیات اسلامیہ کی اِن کتابوں سے کافی طور پر مستفید ہوسکتے ہیں، یہ واقعہ ہے کہ سالہا سال کی کد و کاوش اور تحقیق و جستجو کے بعد ہم جن کتابوں تک رسائی حاصل کر سکتے تھے سید صاحب کی درج کردہ فہرست سے بیک وقت و نظر معلومات کا یہ سارا ذخیرہ ہمارے سامنے اس طرح پر آجاتا ہے کہ کتابوں کے مصنف، سن تصنیف، مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ، غیر مطبوعہ کی شکل میں ان کتابوں کے نسخے کہاں کہاں پائے جاتے ہیں عموماً اِن امور کے متعلق بھی کافی و شافی اشارے ملتے چلے جاتے ہیں۔"[۱۸] شاہ معین الدین احمد ندوی، (م ۱۹۷۴ء) تحریر فرماتے ہیں:

”اس (کتاب) کا مقصد کلام مجید کے بعض تاریخی اور جغرافیائی بیانات پر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب اور عرب کے قدیم جغرافیہ و تاریخ کی تحقیق و تنقید ہے ..... مستشرقین نے جب عربوں کی تاریخ پر تحقیقات شروع کی تو انھوں نے قدیم یونانی و رومانی مورخین اور جغرافیہ نویسوں کے بیانات اور جدید اثری اکتشافات اور پرانے کتبات وغیرہ سے ایسے معلومات حاصل کئے جو عربوں کی قدیم روایات کے خلاف تھے۔ کلام مجید میں عبرت و بصیرت کے لئے عرب کی قدیم قوموں، ان کے انبیاء و رسل اور ان کے اماکن و آبادیوں کا ذکر کیا گیا ہے ..... بے احتیاط مفسرین نے اِن بیانات کی تفسیر میں عربوں کی بہت سی زبانی روایات و اسرائیلیات نقل کردیں اِس سے مستشرقین کو اور بھی اعتراض کا موقع مل گیا جس سے اُن کے نزدیک قرآن مجید کی صداقت مُشتبہ ہو جاتی ہے۔ ارض القرآن ان اعتراضات کے جوابات اور عرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق میں لکھی گئی ہے۔ مگر سیرۃ نبوی کی طرح اس کا طرز بھی مناظرانہ کے بجائے تحقیقی و تنقیدی ہے۔ اس میں قدیم و جدید دونوں ماخذوں سے قدیم عرب کی محققانہ تاریخ اور اس کا جغرافیہ پیش کیا گیا ہے۔ کلام مجید کے بیان کردہ واقعات پر مستشرقین کے اعتراضات کی تنقید و تردید کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھا گیا ہے جس سے دونوں میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے یا مستشرقین کی تحقیقات کی غلطی اور کلام مجید کے بیان کی صداقت ظاہر ہو جاتی ہے۔“[19]

مولانا مجیب اللہ ندوی تاریخ ارض القرآن کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”آج سے پچاس برس پہلے خالص جغرافیہ قرآن پر اُردو کیا عربی زبان میں بھی کوئی جامع اور مکمل کتاب موجود نہیں تھی، قدیم عربی تاریخوں میں متفرق طور سے اس پر بحثیں ضرور ملتی ہیں مگر عرب مورخین کو قدیم یونانی و رومی تاریخوں اور اثری اکتشافات سے فائدہ اٹھانے کا موقع کم ملا تھا اس لیے جب یہ کتابیں اُن کے سامنے آئیں اور عرب و شام و عراق وغیرہ میں اثری اکتشافات ہوئے تو ان کی روشنی میں یورپین مورخین نے قرآن مجید میں مذکورہ مقامات اور ان کی قوموں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں مغربی مصنفین کے تمام جدید ذرائع معلومات اور قدیم مآخذ کو سامنے رکھ کر پورے قرآن کا جغرافیہ لکھا، مغربی مصنفین کی تاریخی تحقیقوں اور قیاس آرائیوں کی کمزوری دکھائی اور قرآن پر کئے گئے ایک ایک اعتراض کا پردہ فاش کیا اور اس کا مکمل جواب دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے عرب مورخین کی بھی بعض تاریخی غلطیوں کی وضاحت کی ”غرض اس کتاب کے ذریعے اُنھوں نے قرآن کو ہدف طعن بننے سے بھی بچا لیا۔ اس لئے ان کی یہ خدمت دینی حیثیت سے بھی بہت اہم ہے اور علمی و تحقیقی حیثیت سے بھی۔

حال ہی میں ڈاکٹر سید محمد ہاشم نے "سید سلیمان ندوی: حیات اور ادبی کارنامے" کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، جس میں اُنھوں نے تحقیقی تصانیف کے سلسلے میں سب سے پہلے ارض قرآن کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس میں سید صاحب کی تحقیقی کاوشوں کو خراج عقیدت پیش کیا، اور اس کے طرزِ تحقیق کو حد درجہ سراہا ہے۔ البتہ "بعض جگہ خطیبانہ استفہامیہ" پر اعتراض کیا ہے اس لئے کہ "یہ انداز و اسلوب تحقیق کے لئے موزوں نہیں ہے"[۲۱] اگر ان کی یہ سخن گسترانہ بات، صرف "زیب جیبس" کے لئے ہے تو مجھے اُن کی اس مجبوری پر دلی ہمدردی ہے ورنہ سیدھی سی بات ہے کہ ہر زبان کے اپنے اسالیب بیان ہوتے ہیں، اور ہر صاحب قلم کا اپنا ایک مخصوص انداز بیان اور طرزِ نگارش ہوتا ہے جو اس کا مابہ الامتیاز ہوتا ہے، اور اس پر اس کی گرفت بالخصوص جبکہ وہ ایک مسلمہ استاد ہو "خطائے بزرگاں گرفتن" سے بڑھ کر خطا ہوگی، پھر مزید لطف یہ کہ ہاشم صاحب کو یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ ایک قرآنی اسلوب ہے، اور اعتراض اس شخص پر کر رہے ہیں جس کا قرآن۔ اوڑھنا بچھونا ہے، اور قرآنی اسالیب بیان جس کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔

جس طرح اشاعت "تاریخ ارض القرآن" سے تیرہ سو سال قبل تک اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اسی طرح اُس کے بعد بھی تقریباً پون صدی گزر جانے کے باوجود بھی اب تک میرے علم میں کوئی ایسی تصنیف نہیں ہے جسے اس کا ہمسر کہا جا سکے۔ انگریزی میں تو غالباً ابھی تک اس کا ترجمہ ہی ہے جسے مولانا مظفر الدین ندوی نے کیا تھا، اور جو عرصہ سے نایاب تھا، اسے حال ہی میں دہلی کی تاج کمپنی نے شائع کر دیا ہے۔[۲۲] ہاں اردو میں تین کتابیں کسی قدر ہمنام ضرور شائع ہوئی ہیں: ایک مولانا عبد الماجد دریابادی (۱۸۹۲-۱۹۷۷) کی "ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی"[۲۳] دوسری انتظام اللہ شہابی صاحب کی "جغرافیہ قرآن"[۲۴] اور تیسری مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹) کا "سفرنامہ ارض القرآن"[۲۵] جسے محمد عاصم صاحب نے مرتب کیا ہے اول الذکر بہت ہی مختصر اور صرف ان مقامات کا مختصر جغرافیائی تعارف ہے جن کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے مگر کوئی حوالہ یا تفصیلی تاریخی ذکر نہیں ہے۔ جبکہ شہابی صاحب نے حوالہ جات کا التزام بھی کیا ہے، اور موخر الذکر میں بر سبیل تذکرہ دیگر مقامات کے ساتھ قرآن کے اُن تاریخی مقامات کا ذکر بھی آگیا ہے جن سے مودودی صاحب اپنے اس سفر میں گذرے، متعلقہ آیات دے کر جدید اکتشافات اثریہ و تاریخیہ کی مدد سے کوئی خاص تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ غالباً مولانا ان عینی مشاہدات کی بنیاد پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا قصد رکھتے تھے مگر اُن کی عمر نے وفا نہ کی، پھر بھی یہ تینوں

کتابیں اپنی اپنی جگہ اور اِس موضوع پر اُردو کے ذخیرہ میں بہتر اضافہ ہیں۔

البتہ ضرورت ہے کہ سید صاحبؒ نے اپنے محدود وسائل کے باوجود پون صدی قبل جس تحقیقی کام کی بنیاد ڈالی تھی اس پر موجودہ وسائل کو کام میں لاکر عمارت تیار کی جائے، اور نئے اثری اکتشافات اور نئی تاریخی تحقیقات کی روشنی میں اس پر نظرِ ثانی کی جائے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شاید کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر نثار احمد، ماہنامہ 'نقوش' لاہور کے قرآن نمبر کے لئے یہ کام کر رہے ہیں، مگر ہمیں اس اہم کام کو تنہا اُن پر نہ چھوڑنا چاہیے۔ "تاریخ ارض القرآن" دار المصنفین کی پہلی کتاب ہے، اس لئے یہ اسی کا فرض اولین ہے کہ وہ اسے ایڈٹ کرا کے جدید اضافات، اشاریات اور کتابیات کے ساتھ شائع کر کے بانی دار المصنفین کی روح کو خوش کرے۔

حوالہ جات:۔

۱۔ محمد اویس ندوی، سید صاحب کے پیش نظر بعض اہم علمی کام، معارف، سلیمان نمبر مئی و جون ۱۹۵۵ء ص ۲۴۵

۲۔ شاہ معین الدین احمد، حیات سلیمان۔ (اعظم گڑھ، دار المصنفین، ۳، ۱۹۷۳)، ص ۵۸۵

۳۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۴۳ء میں سید صاحب کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی، مصدر سابق، ص ۹۶

۴۔ عبد الماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی ایڈیٹر کی حیثیت سے، صدق جدید (لکھنؤ، ۲۲/ جنوری ۱۹۵۴ء)

۵۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، (اعظم گڑھ، دار المصنفین) ۱۹۷۰ء ص ۶۸۹

۶۔ ایضاً و شذرات (معارف، اعظم گڑھ) ج ۱، ش ۱، ص ۲

۷۔ شاہ معین الدین احمد ندوی، حضرت الاستاد رحمۃ اللہ کے دینی و علمی خدمات (معارف، اعظم گڑھ) سلیمان نمبر مئی و جون ۱۹۵۵ء، ص ۲۰۸

۸۔ سید سلیمان ندوی، گلۂ آشنا (معارف اعظم گڑھ) اگست ۱۹۳۱ء، ص ۹ - ۸۴

۹۔ نیاز فتحپوری، (نگار، لکھنؤ، جون ۱۹۴۰ء) بحوالہ معارف اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۴۰ء ص ۳۲۱

۱۰۔ سید سلیمان ندوی، شذرات (معارف، اعظم گڑھ،) نومبر ۱۹۴۰ء ص ۳۲۳

۱۱۔ شاہ معین الدین احمد ندوی: فہم قرآن کے اصول و شرائط (معارف، اعظم گڑھ) جولائی ۱۹۴۰ء ص ۱۲ - ۵، اگست ۱۹۴۰ء، ص ۱۰۴ - ۸۵ اور ستمبر ۱۹۴۰ء ص ۱۸۲ - ۱۲۵

۱۲۔ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں: مشتے کہ بعد از جنگ باد آید (معارف، اعظم گڑھ) دسمبر ۱۹۴۵ء ص ۱۰۴/۱ تا ۴۰۴/۳

۱۳۔ مالک رام: علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (معارف، اعظم گڑھ) سلیمان نمبر مئی و جون ۱۹۵۵ء، ص ۰ - ۳۵۶

۱۴۔ محمد اویس ندوی : سید صاحب کے پیشِ نظر بعض اہم علمی کام (معارف ، اعظم گڑھ) سلیمان نمبر مئی و
جون ۱۹۵۵ء ص ۲۴۵-۵۱ ۱۵۔ غلام محمد ، مصدر سابق ، ص ۲۲۴
۱۶۔ شاہ معین الدین احمد ندوی ، حیات سلیمان (اعظم گڑھ ، دار المصنفین ، ۱۹۷۳) ، ص ۵۸۵
۱۷۔ سید سلیمان ندوی ، تاریخ ارض القرآن ، جلد اول (طبع چہارم ، (اعظم گڑھ ، دار المصنفین ، ۱۹۵۵ء) ص ۳ تا ۵
۱۸۔ سید مناظر احسن گیلانی ، تاریخ ارض القرآن کے متعلق میرے ذاتی احساسات (معارف ، اعظم گڑھ)
سلیمان نمبر ص ۲۱۷-۸ ۱۹۔ شاہ معین الدین احمد ندوی ، مصدر بالا ص ۱۹۳
۲۰۔ مجیب اللہ ندوی ، مصدر بالا ، ص ۲۶۴ ۲۱۔ سید محمد ہاشم : سید سلیمان ندوی ،
حیات اور علمی کارنامے ، (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، غیر مطبوعہ مقالہ پی ایچ ڈی) ۱۹۸۲ء ص ۲۴۵
۲۲۔ سید مظفر الدین ندوی ، A GEOGRAPHICAL HISTORY OF THE QURAN (دہلی ،
تاج کمپنی ، ۱۹۸۵ء) ۲۳۔ عبد الماجد دریابادی ، ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی لکھنو ، صدق
جدید کی ایجنسی ۱۹۵۵ء) ۲۴۔ انتظام اللہ شہابی ، جغرافیہ قرآن (کراچی ، انجمن ترقی اردو
پاکستان) ، ص ب ، ت ۲۵۔ محمد عاصم سفرنامہ ارض القرآن (دہلی ، مرکزی مکتبہ اسلامی ، ۱۹۷۸ء

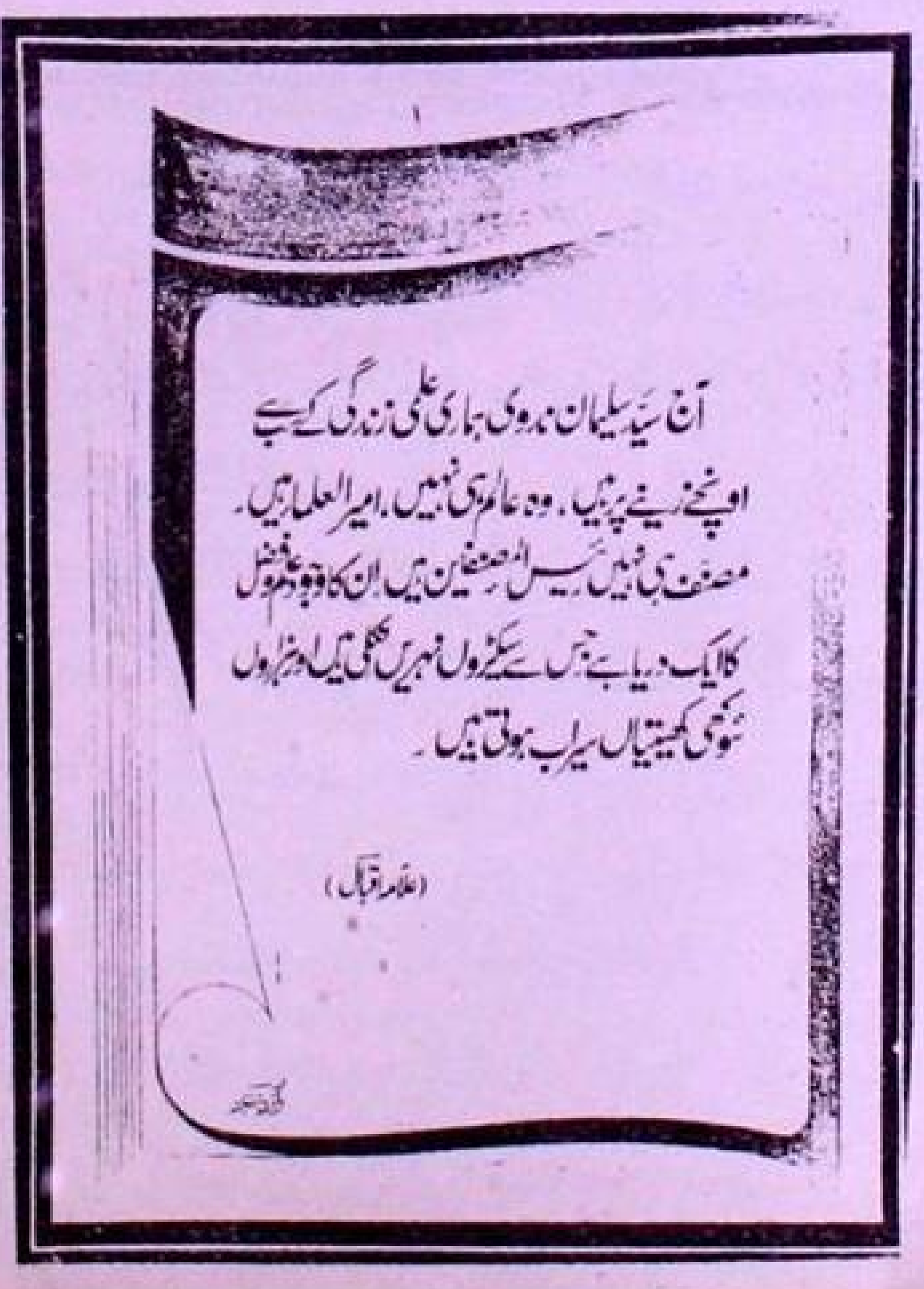

آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب
اونچے زینے پر ہیں ۔ وہ عالم ہی نہیں ، امیر العلما ہیں ۔
مصنف ہی نہیں رئیس المصنفین ہیں ۔ ان کا وجود علم و فضل
کا ایک دریا ہے جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں
سوکھی کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں ۔

(علامہ اقبال)

ضیاء الدین اصلاحی★

قرآنی مباحث

بحوالہ سیرۃ النبی جلد چہارم

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علمی، تحقیقی اور تصنیفی کارناموں میں سیرۃ النبیؐ سب سے ممتاز اور مہتم بالشان ہے، اس شہرۂ آفاق اور مقبول ترین کتاب کا آغاز ان کے استاذ محترم علامہ شبلیؒ نے کیا تھا، مگر سلسلۂ سیرۃ النبی کی تکمیل اور اولین دونوں جلدوں کی طباعت و اشاعت کی سعادت مولانا سید سلیمان ندویؒ ہی کے حصے میں آئی۔

سیرۃ النبی دائرۃ المعارف النبویہ اور اسلامی تعلیمات کی انسائیکلوپیڈیا ہے، یہ نہایت صحت، تحقیق، احتیاط اور مکمل غور و فکر کے بعد لکھی گئی ہے اس کا اصل ماخذ قرآن مجید ہے جو مجسم صحت و صداقت بھی ہے اور صحت و صداقت کی سب سے بلند و بالا کسوٹی بھی ہے، شبلی و سلیمان نے سیرت کی تالیف میں اسی کو معیار حق بنایا ہے اور سب سے زیادہ اسی پر اعتماد کیا ہے، ان کے نزدیک یہ ہر چیز پر مقدم و مرجح ہے، غزوۂ بدر کے اصلی سبب کی تحقیق و جستجو میں گو تمام مؤرخین و ارباب سیر مصنف سیرت کے حریف ہیں مگر وہ کتنے وثوق و اعتماد کے ساتھ فرماتے ہیں:

> ”لیکن کتب سیر، تاریخ اور تمام دیگر شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے (قرآن) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے۔“[1]

اور مولانا سید سلیمان ندویؒ معجزات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ”گذشتہ صفحات میں جو کچھ پھیلایا گیا ہے وہ انسانی افکار و خیالات کی جہاں تک دسترس ہے اس کی تشریح ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک ہدایت و ارشاد کا اصلی سرچشمہ قرآن مجید ہے، اس لیے آیات دلائل کی نسبت اخیر فیصلہ اسی کی عدالت میں ہونا چاہیے۔“[2]

★ رفیق دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تفسیر اور آپ کا وجود مبارک اس کا پرتو، عملی نمونہ اور جیتی جاگتی تصویر ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بجد امکان اسی کو آپ کی سیرت مبارکہ کی تالیف وتدوین کا اصلی وبنیادی ماخذ بنایا جائے، سیرۃ النبیؐ کے اکثر مباحث قرآن مجید کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں، اس لیے اس میں قرآن مجید کی آیتوں کی تفسیر وتاویل، اس کے معارف وحقائق کی تلاش وجستجو، اس کے مطالب و مضامین کی توضیح وتلخیص، اس کے اسرار وحکم کی تعلیل وتوجیہ اس کے مشکلات وغوامض کی عقدہ کشائی اس کی مراد ومنشا کی تعیین، اس کے دلائل اور طریقہ استدلال کی وضاحت، اس کی دعوت اور طریقہ دعوت کی خصوصیات، اس کی تاثیر ودلنشینی، اس کے جہات اور اصولی حقائق کی نشاندہی، اس کے لطائف و نکات کی شرح، اس کے اشارات وابہامات کی تفصیل وتبیین، اس کی تعبیروں اور اصطلاحات کا مفہوم اس کے متعلق شکوک وشبہات کا ازالہ، اس کی ادبی رعنائیاں اور بلاغت کی خوبیاں، نحو وصرف کے مسائل اور اس کے الفاظ ولغات کی بحث وتحقیق وغیرہ سب ہی کچھ ہے۔

ان امور ومباحث کی تحقیق وتدقیق کے لیے قرآن مجید پر وسیع اور گہری نظر اور اس کا امعان نظر سے مطالعہ ضروری ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ دوسرے علوم کی طرح قرآن مجید پر بھی عمیق نظر رکھتے تھے بلکہ ان کا اصلی ذوق اور ان کو سب سے زیادہ مناسبت اسی موضوع اور فن سے تھی، ان کی اکثر کتابوں اور خصوصاً سیرۃ النبیؐ سے قرآن مجید سے ان کے شغف، دلچسپی اور اس میں دقت نظر، مہارت، بصیرت اور دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصنیفات سے اگر ان کی قرآنی تحقیقات کو یکجا کر دیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں لیکن یہ مقالہ صرف سیرۃ النبیؐ جلد چہارم کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے، تنہا اس جلد میں جو قرآنی حقائق ومعارف بیان کئے گئے ہیں وہ سید صاحب کے تدبر فی القرآن اور قرآنی علوم میں ان کی ژرف نگاہی اور تبحر کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

پیش نظر جلد کا موضوع اسلام کے اصول وعقائد ہیں، اس کے مقدمہ میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم وخصوصیات کی تشریح ہے اور دیباچہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی عموماً اور ملک عرب کی خصوصاً مذہبی، اخلاقی اور روحانی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے، اس اعتبار سے اس میں آپ کے پیغمبرانہ کارناموں کو پوری تشریح، استناد اور دلچسپی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور مصنف نے قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے مقدم رکھا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا ہے، مناظرانہ پہلو سے بچ کر ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ

کیاہے تاکہ اسلام کی تکمیلی شان نمایاں ہوجائے۔

عقائد کی عام کتابوں کی طرح یہ کتاب کسی خاص نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی گئی ہے اور بقول مصنف انھوں نے اس میں کسی مخصوص فرقہ کے نہیں بلکہ اسلام کے وہ عقائد لکھے ہیں جن پر ایمان لانے کا قرآن مجید نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو دی تھی انہی کا ذکر آمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی میں بھی ہے یعنی خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، آخری دن اور قضا و قدر پر ایمان، کتاب میں ان شش گانہ عقائد کا جہاں ذکر ہے ان کا عنوان انہی سے متعلق و مناسب آیتوں سے کیا گیا ہے، اس طرح یہ جلد ایمانیات و عقائد کے متعلق قرآنی تعلیم و ہدایت کا مجموعہ ہے اور اس میں جن مسائل پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، ان میں خاص طور پر آیات قرآنی سے استدلال و استنباط کیا گیا ہے، اس مقالہ میں اس کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں ان سے قرآن مجید کے بحر بیکراں میں سید صاحب کی غواصی و غوطہ زنی کے کچھ نمونے سامنے آئیں گے۔ سلف نے قرآن مجید کی تفسیر کے بنیادی اصول یہ بتائے ہیں کہ سب سے پہلے اس کی تفسیر قرآن ہی سے کی جائے کیونکہ القرآن یُفَسِّرُ بعضہ بعضاً جو بات قرآن میں ایک جگہ مبہم اور مجمل بیان کی جاتی ہے وہی بات دوسری جگہ واضح اور مفصل ہوتی ہے اسی طرح ایک لفظ کا معنی و مفہوم ایک موقع پر واضح نہیں ہوتا مگر دوسرے موقع پر اس کا اصل معنی و مفہوم پوری طرح واضح ہوتا ہے اسی لیے سید صاحب نے قرآن مجید کی آیتوں کی تفسیر اور ان کے مفہوم کی وضاحت کے لیے سب سے زیادہ قرآن ہی سے مدد لی ہے اس کے علاوہ احادیث صحیحہ اور صحابہ و تابعین کے اقوال سے بھی قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہیں۔

قرآنی آیات کا استقصا: مسائل کی وضاحت و تفہیم کے لیے ان سے متعلقہ تمام آیتیں نقل کر کے ان پر بحث و گفتگو کی ہے اس کی وجہ سے اس کتاب میں بڑا اعتدال و توازن پیدا ہو گیا ہے اور آیات کا مفہوم و منشا بھی اچھی طرح واضح ہو گیا ہے۔ مثلاً سید صاحب نے رسول کی بشریت مدلل طور پر ثابت کی ہے اور اس مفہوم کی تمام آیتیں نقل کر کے ان پر بحث و گفتگو کی ہے، ان کے نزدیک اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی و غیر نبی میں صرف وحی کا فرق ہے بلکہ اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی حیثیت سے ایک پیغمبر انسان رہ کر بھی غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے، نیز وحی کا فرق مان لینے کے بعد لوازم، خصائص اور اوصاف وغیرہ کا فرق بھی تسلیم کرنا پڑے گا، لیکن اس باب میں علاوہ بشریت کے اس لیے بھی شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرتؐ کو آپ کی چند فروگذاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی نبوت کے تیئس ۲۳ برسوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپ نے اپنے اجتہاد

اور شرح صدر سے فیصلے صادر کیے مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی، ان پانچوں امور کا جن پانچ آیتوں میں ذکر ہے ان سب کو نقل کر کے ان کے شان نزول، اور ان کی نوعیت وحقیقت مکمل طور پر واضح کردی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا تعلق حکم دینی، شریعت ابدی اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات سے ہو بلکہ وہ کل امور ایسے ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین اور شریعت میں آپ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادات اور فیصلے خطا وغلطی سے پاک ہوتے تھے۔

استقصا کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ کے جو نام اور صفتیں بیان ہوئی ہیں ان سب کو ایک ایک کر کے ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں قرآن مجید کی روشنی میں چند اصولی باتیں قلمبند کر کے اپنے ماہر قرآنیات ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

۱- ان کا خیال یہ ہے کہ ہم خدا کو اس کے ناموں، کاموں اور صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں، عرب کا جاہل "اللہ" نام کی ایک اعلیٰ ہستی سے واقف تھا لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا اس لیے اس کے اسماء صفات سے قطعاً بیگانہ تھا، دیوان عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا، قرآن سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کے اسماءُ وصفات سے بھی آگاہ تھے، بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ ساتھ "الرحمٰن" کا لفظ بھی مستعمل تھا اس کی وجہ سے مشرک عربوں کو اس لفظ سے چڑھ ہو گئی تھی، سورۂ فرقان میں اس کی تصریح موجود ہے، صلح حدیبیہ میں جب آنحضرتؐ نے معاہدہ کے کاغذ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا تو قریش کے نمایندہ نے کہا کہ قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم کہ رحمان کیا ہے ؟

۲- اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ اسلام کے ان مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں اور ہندوؤں کی گمراہی کی مثالیں دینے کے بعد لکھتے ہیں محمدؐ نے بتایا کہ اللہ کی صفات کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں، حضرت عائشہؓ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی "خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتی ہوں"۔

۳- تمام اچھے اور کمالی نام اسی کو زیبا ہیں۔

۴- بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذات بے ہمتا کے لیے ہے خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ

کہو لغت اور زبان کا فرق اس میں خلل انداز نہیں، لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے نام سے بھی اس کو یاد نہ کرو۔

۵۔ تعلیم محمدی کا صحیفہ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنہ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسماء و صفات کی جلوہ گری سے معمور ہے، قرآن پاک کا کوئی ایسا رکوع نہ ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف و حمد پر نہ ہو۔

۶۔ قرآن مجید اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں، صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کے ننانوے نام ہیں، ننانوے نام مقرر کئے جانے اور پورے سو نہ مقرر کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کو طاق پسند ہے اور اس سے توحید کا رمز آشکار ہوتا ہے، انھوں نے بعض کبار محدثین کے حوالے سے اس کی تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی کی کوئی حد و پایاں نہیں ہے۔

۷۔ قرآن پاک اور احادیث کے تتبع سے علماء نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے، یہ تمام نام وہ ہیں جو بطور علم اور بطور صفت قرآن پاک میں آئے ہیں یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں اور آنحضرتؐ نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے۔

۸۔ سید صاحبؒ نے ۱۰۹ نام اور صفات کا ذکر کر کے ہر ایک کی مختصر لغوی تشریح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیرؤوں کو سکھایا، وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاک ہے۔

۹۔ عام علمائے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے، لیکن سید صاحبؒ نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیئے ہیں۔

(الف) صفاتِ جمالی: یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے

(ب) صفاتِ جلالی: جن سے خدا کی عظمت، کبریائی، شہنشاہی، جلال، جبروت، حکومت اور استیلا کا اظہار ہوتا ہے۔

(د) صفات کمالی: وہ اسماء و صفات ہیں جن سے خدا کی بڑائی اور ہر وصف میں اس کا کمال، اس کی تنزیہہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ کا ثبوت ملتا ہے۔

صفات کمالی کی سید صاحب نے پانچ قسمیں کردی ہیں:

۱۔ وحدانیت: وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں۔

۲۔ صفات وجودی: یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقا، دوام، ازلیت اور بے زوالی ظاہر

ہوتی ہے۔

۳ - **علم:** یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

۴ - **قدرت:** وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

۵ - **تنزیہ:** وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور ہر عیب و نقص سے اس کی برائت ظاہر کرتی ہیں۔

اسماء و صفات الٰہی کی طرح قرآن میں قیامت کے مذکور مختلف ناموں کا احاطہ بھی کیا ہے، ان ناموں کی اہمیت اس طرح بتائی ہے کہ کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں کرتا ہے مثلاً قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو سب سے پہلی سورہ میں ہے وہ یوم الدین ہے یعنی جزا کا دن جس سے معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا۔ یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت یا صفت کی صورت میں ہیں، ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور بھی بکثرت نام قرآن میں آئے ہیں چنانچہ وہ قیامت کے اوصاف و خصوصیات پر دلالت کرنے والے فقرے اور آیتیں بھی نقل کرتے ہیں

آیات کی تفسیر: سیرۃ النبیؐ تفسیر کی کتاب نہیں ہے، اس میں بحث و استناد کی غرض سے اکثر آیات کا ذکر آگیا ہے۔ اس لیے جس خاص نوعیت اور انداز میں کتب تفسیر میں قرآنی آیتوں کی تشریح کی جاتی ہے اس انداز و نوعیت کی تفسیر اس کتاب میں کم ملتی ہے، تاہم مختلف حیثیتوں اور پہلوؤں سے اس میں اکثر قرآنی آیات کی تفسیر و تشریح کی گئی ہے، اس کی مثالیں بکثرت ہیں لیکن ہم نے ایک مختصر مگر پوری سورہ کو منتخب کیا ہے یعنی سورۂ اخلاص جو قرآن مجید کی نہایت مہتم بالشان سورہ ہے، سید صاحبؒ نے پہلے اس کا سبب نزول بیان کرتے ہوئے حضرت ابی بن کعب کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "آپؐ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو"، گویا ان کا مقصد یہ تھا کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کر سکتا، اس کے جواب میں وحی محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی۔

حضرت ابی بن کعب صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، ان سے یہ تفسیر بھی مروی ہے کہ "صمد وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنا وارث اور جانشین بھی چھوڑ جاتا ہے، اور خدا نہ مرتا ہے، نہ اس کا کوئی جانشین ہے اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے، یعنی نہ کوئی اس کے برابر ہے اور نہ کوئی اس کے مثل۔"

حضرت سید صاحب ابی بن کعب کی اس تفسیر اور حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت کا موازنہ

مشرکین کی اس ذہنیت سے کرتے ہیں جو شان نزول کی روایت میں مذکور ہے اور پھر یہ بتاتے ہیں کہ محمدؐ کی تعلیم سے پہلے خدا کے متعلق اہل عرب کا تخیل کس قدر پست اور ذلیل تھا اور آپ کی تعلیم کے بعد وہ کتنا پاک اور بلند ہو گا۔[۳]

لفظ صمد کی تحقیق میں بڑی نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی سے کام لیا ہے، اور غالباً اس پر مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر سورۂ اخلاص سے زیادہ استفادہ کیا ہے، فرماتے ہیں کہ "اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ "صمد" ہے لیکن قرآن کی بلاغت نے اس میں صفات الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے، صمد کے معنی لغت میں اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسے علاقے میں ہو جہاں جب سیلاب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنی جانیں بچائیں، اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراج کمال پر ہو اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اور اس سردار کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرکز و مرجع کے معنی میں بھی آیا جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو اسی سے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل و اولاد نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو، "صمد" اس اونٹنی کو بھی کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو۔"[۴]

ان معنوں کے علاوہ صحابہ و تابعین میں ابن عباس، حسن بصری، ربیع بن انس، عبد اللہ بن مسعود، بریدہ، عکرمہ و شعبی اور قتادہ نے صمد کی تفسیر میں جو معانی بیان کئے ہیں ان کو تحریر کر کے فرماتے ہیں کہ "یہ سب صرف ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں اور یہ تمام معانی اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے اصلی معنی چٹان کے ہیں جو لڑائی اور مصیبت کے وقت جائے پناہ کا کام دے، اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لیے چٹان کا لفظ آیا ہے، سید صاحبؒ نے استثنا اور سموئل کے پہلے صحیفہ کے حوالے بھی دیئے ہیں۔[۵]

احد اور صمد اللہ کے دو صفاتی نام ہیں جو اس کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں، اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کو کسی کی حاجت نہ اس کو کسی سے غرض، وہ یکہ و تنہا اکیلا، بے ہمتا، بے نیاز، بے پروا، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے لیکن اسی کمال یکتائی کے ساتھ

وہ صمد بھی ہے یعنی سب کے ساتھ، سب کا دستگیر، سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع، سب کا مادی، سب کا ملجا یعنی سب کی چٹان ہے جو مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے۔ فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ، (ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے یہاں پناہ لو)۔

اس کے بعد وہ اس سورہ کی عظمت و اہمیت بیان کرتے ہیں جس کا انداز عام تفسیروں سے مختلف ہے جن میں اس کے خواص، اثرات اور برکتوں کا ذکر زیادہ ہوتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

"یہ سورۂ پاک توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لیے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے، ایک صحابی نماز کی ہر دو رکعت میں قرأت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے، آنحضرتؐ نے اس کی وجہ ان سے دریافت کی تو انھوں نے کہا اس میں میرے رب کی صفتیں بیان ہوئی ہیں جو مجھ کو بہت محبوب ہیں، آپ نے فرمایا بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے، ایک اور انصاری صحابی قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے، وہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے، مقتدیوں کو اس پر اعتراض ہوا اور انھوں نے آنحضورؐ سے شکایت کی، آپؐ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو گذارش کی کہ یا رسول اللہؐ مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے، ارشاد ہوا کہ "یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی، قتادہ بن نعمان رات بھر اسی ایک سورہ کو دہرا کر لطف حاصل کرتے رہتے تھے لوگوں نے آنحضرتؐ سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔"

آیات سے استنباط: قرآنی آیات سے وہ لطیف استنباط بھی کرتے ہیں اور ان کے خلاصے بھی پیش کرتے ہیں جن کی وجہ سے کسی خاص مسئلہ کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر پوری طرح سامنے آجاتا ہے مثلاً ایک جگہ ملائکہ کے اعمال و فرائض نمبروار لکھے ہیں اور ثبوت میں آیتیں بھی پیش کی ہیں جن سے ملائکہ کی خصوصیات، ان کے بارہ میں صحیح اسلامی تصورات اور قرآن کی واضح اور صریح تعلیمات وغیرہ کا علم ہوتا ہے نیز ان باطل اور فاسد خیالات و افکار کی تردید ہوتی ہے جو ان کی نسبت دوسرے مذاہب میں رائج اور عام ہیں۔ اختصار کی وجہ سے ہم نے آیتیں حذف کر دی ہیں اور صرف ان سے سید صاحب کے استنباطات کا خلاصہ تحریر کرتے ہیں۔

۱۔ ملائکہ کے اعمال و فرائض میں پہلی چیز ان کی سفارت و پیام رسانی ہے یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہچانا اور اس کام میں ان کا بے اختیار ہونا، کیونکہ سب اختیارات خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور و انتظامات کا مرجع کل ہے۔ سورہ فاطر کی چند ابتدائی آیتوں سے بھی ان کی سفارت، درمیانگی اور عدم اختیار دکھایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ "رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا

صرف خدا ہے"، اس سے اس غلط عقیدہ کی تردید ہوتی ہے کہ ان کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے یا ان میں ربوبیت یا الوہیت کا کوئی شائبہ ہے یا وہ پرستش کے قابل ہیں یا ان کی دہائی پکارنی چاہیے۔

۲۔ ملائکہ خدا کے احکام دنیا میں جاری کرتے ہیں، وہ احکام لے کر اترتے بھی ہیں اور دربار الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں، موت کے وقت روح قبض کرنا انھی کے سپرد ہے، اس مفہوم کی بعض آیتیں نقل کر کے اور بعض کی جانب اشارہ کر کے لکھا ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق موت و فنا کی تدبیر علل و اسباب کی انھی روحانی قوتوں سے متعلق ہے، دنیا میں کسی شے کے وجود، انقلاب اور فناء کے لیے کسی ایک علت و سبب کا وجود کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق علل و اسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ ہوں اور ایک دوسرے کے معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں، یہ متعلقہ علل و اسباب کا توافق اور موانع کا انسداد ہی تدبیر ہے جو بحکم الٰہی ملائکہ کے سپرد ہے، اس تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے یدبر الامر اور کبھی ملائکہ کی طرف والمدبرات امراً[9]۔

۳۔ یہی ملائکہ خدا اور رسولوں کے درمیان بھی سفیر ہیں[10]۔

۴۔ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس بشارت لے کر آئے اور حضرت زکریاؑ اور حضرت مریمؑ کو بھی انھوں نے بشارت دی اور حضرت لوطؑ کے پاس ان کی قوم کی بربادی کے لیے آئے[11]۔

۵۔ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں اور ان کے ثواب و گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہیں[12]۔

۶۔ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ ہیں۔

۷۔ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا۔

۸۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس کے حاضر باش ہیں اور قیامت کے دن بھی پایہ تخت الٰہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے جو ہر وقت اس کے ہر حکم کو بجا لانے کے لیے تیار رہیں گے[13]۔

۹۔ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے، ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس اور حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے جلال و جبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور اس کے حضور میں اہل زمین کے لیے عموماً اور نیکوکاروں کے لیے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ مگر یہ دھوکہ نہ ہو کہ ان کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے بلکہ بخشش و رحمت کرنے والا صرف خدائے واحد ہے اور یہ بخشش و رحمت اسی کی وسعت اختیار میں ہے[14]۔

ملائکہ کے بارے میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کا اعتقاد دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی ایسی باتیں داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں، اسکندریہ کے نو افلاطونی فلسفہ میں خدا معطل اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا، عراق کے صابی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے، یہود بھی ان کو کسی قدر صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خداؤں کا درجہ دیتے تھے، ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے چھوٹے خداؤں کے مرتبے پر بھی فائز تھے، عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جزو تسلیم کرتے تھے، عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے، وہ ان کی پوجا کرتے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے، لیکن قرآن مجید یعنی تعلیم محمدی نے ان تمام باطل عقائد کو مٹا دیا اور بتایا کہ وہ بھی خدا کی مخلوق ہیں، اس کا کوئی اختیار ان کو حاصل نہیں، وہ اطاعت، عبادت اور احکام الٰہی کی بجا آوری میں معروف ہیں اور جس کے جو کام سپرد ہے وہ اس کو انجام دیتا ہے، وہ بندہ محض ہیں، عبادت کے مستحق نہیں، نہ خدا کی اذن کے بغیر وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں اور نہ خدا کے سامنے کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، نہ مرد ہیں نہ عورت، نہ کھاتے پیتے ہیں اور نہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔

ملائکہ کے یہ اوصاف جن سورتوں میں بیان ہوئے ہیں ان سے اس مفہوم کی سب آیتیں جمع کی ہیں[5]، اسی طرح سورۂ انعام رکوع ۱۰ کی چند آیتیں وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ الخ نقل کر کے ان سے جو کچھ مستنبط کیا ہے اس کا خلاصہ چھ نمبروں میں لکھا ہے۔

اصولی حقائق: سید صاحبؒ نے قرآن مجید کے بعض اصولی مباحث و حقائق کی نشاندہی کر کے اس میں اپنی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے مثلاً ”عام خیال یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے وہ صرف فصاحت و بلاغت کا کرشمہ تھا یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لیے جب وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے، بے شبہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے، لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشاء میں ہے اس سے کہیں زیادہ معانی و مطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجزہ ہوتا جیسا اب ہے لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا، قرآن مجید ایک

طرف تو فصاحت و بلاغت کی بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا، دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا وہ اسلام ہی کے مقاصد و مطالب تھے وہ خدا کی عظمت و جلالت، اصنام کی تحقیر و تذلیل، انسان کا عجز و تعبد، سزا و جزا، بعث و نشر، جور و ظلم کی تقبیح، اخلاق حسنہ کی تحسین، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دلوں میں گھر کر جاتے تھے اور ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لیے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے"۔[۱۶]

آخرت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اصولی باتیں بتائی ہیں:

(الف) یہ اسلام کے سلسلۂ ایمانیات کی آخری کڑی ہے۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کئے گئے ہیں وہاں یوم آخر پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔[۱۷]

(ب) دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بے شمار آیتوں میں مذکور ہے، حضرت عیسٰی کے متعلق ہے وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (آل عمران ۴۵) سلسلۂ دعا میں ہے: رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (بقرہ ۲۰۱) کفار کے بطلان عمل کے ذکر میں ہے: حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (بقرہ ۲۱۷) اِسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ (نحل ۱۰۷) نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (حم سجدہ ۳۱)، اور کبھی دنیا کے بجائے "اولیٰ" (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے فرمایا: فَأَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولٰى (نازعات ۲۵) وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولٰى (لیل ۱۳)۔[۱۸]

ایک جگہ انھوں نے اس اہم حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے اور قرآن مجید کی روشنی میں دکھایا ہے کہ وہ اپنے پیرووں سے صرف اتنا ہی نہیں کہتا کہ مجھ پر ایمان لاؤ بلکہ اس نے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں اور صحیفۂ محمدی کی طرح دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم کریں، اسی ضمن میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہودیوں کی نظر میں صرف دو ہی قومیں ہیں بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانا اور غیر قومیں یا مختون اور غیر مختون اور ان دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے، مسیحیوں، رومیوں اور پارسیوں کے یہاں بھی تقریباً یہی حال ہے، نیز ہندوؤں میں صرف اونچی ذاتیں اور اچھوت قومیں دو ہی صورتیں ہیں، لیکن قرآنی تعلیمات نے قانونی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار طبقوں میں تقسیم فرمایا اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیئے۔

۱۔ مسلمان: جو قرآن اور دوسری کتب سماوی کو کتاب الٰہی یقین کرتے ہیں۔

۲۔ اہل کتاب: ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں

۳۔ **شبہ اہل کتاب:** وہ لوگ جو قرآن اور توراۃ و انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود ان کے علاوہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج، آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں، ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہی پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بدھوں وغیرہ کو بھی اسی صنف میں داخل کیا۔

۴۔ **کفار اور مشرکین:** وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دین الٰہی کی طرف منسوب ہیں۔

سید صاحبؒ نے ان سب قوموں کے ساتھ برتاؤ اور اسلامی حکومت کے ان کے ساتھ معاملہ کی وضاحت بھی کی ہے۔

آیتوں کی اصلی مراد کی تعیین: ایک ماہر قرآنیات کی طرح انھوں نے قرآن مجید کی اصل مراد و منشا کی تعیین بھی کی ہے مثلاً اہل جنت کے متعلق ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِیْهَا بُكْرَةً وَّعَشِیًّا (مریم ۶۲)

اس صبح و شام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوان نعمت ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو صبح و شام کی تخصیص کیا تھی، وہ تو ہر وقت سامنے ہوں گے، سید صاحب کا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے خدا کی تسبیح و تہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے وہ حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر خیال کرتے ہیں جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلے میں فرمایا یُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّعَشِیًّا ان کے نزدیک شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں وَهُدُوْٓا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْٓا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِیْدِ (حج - ۲۴)[19]

سورۂ آل عمران کی آیت وَمَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ الخ میں نبی کا لفظ عام ہے اس لیے گویا ہر نبی سے غلول مال (چھپانے) کی نفی کی گئی ہے مگر سید صاحب کے نزدیک اس میں خصوصیت کے ساتھ آنحضرت کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے کیونکہ بعد کی آیت اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ الخ میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا، اس کے بعد آیت لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ الخ میں بتایا کہ جو دوسروں کو احکام الٰہی سنائے خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں جو دوسروں کو پاک و صاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہگار و ناپاک نہیں ہو سکتا۔"[20]

سورۂ نساء کی آیت: وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ الخ کے متعلق بتاتے ہیں کہ موقع ومحل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے۔[21]

سورۂ انفال کی آیت وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ میں ان کے نزدیک فتنہ سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے اس سلسلے میں انھوں نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ صحابہ کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے ایک شخص نے ان سے کہا کہ کیا خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لیے لڑنے کا حکم نہیں دیا اور اوپر کی آیت پیش کی، انھوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرتؐ کے زمانے میں ادا کر چکے جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کر دیا جاتا تھا اس کو لوگ یا مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہیں رہا۔[22]

انبیاء کی عصمت اور بے گناہی ایک اجماعی مسئلہ ہے، اس پر سید صاحبؒ نے بڑی محققانہ بحث کی ہے، مگر قرآن کے بعض الفاظ سے اس بارہ میں ظاہر بینوں کو دھوکا ہو گیا ہے کہ پیغمبروں کے دامن پر عدم معصومیت کے بھی داغ ہیں۔ اس سلسلے میں دو باتوں کا خاص طور پر ذکر کر کے اس شبہ کا ازالہ کیا ہے، اختصار کی وجہ سے یہاں ایک ہی بات کو پیش کیا جاتا ہے، اس سے قرآن مجید کے لفظ ضلالت کی مکمل تحقیق ہو جاتی ہے اور اس کی صحیح مراد بھی معلوم ہو جاتی ہے، انبیاء کی عصمت کے بارے میں غلطی کا سبب یہ ہے کہ انبیاؑ کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اسے ملحوظ نہیں رکھا جاتا، علم وجہل، ہدایت اور ضلالت اضافی الفاظ میں سے ہیں، علم کی ہر حد کو علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند رتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبے کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں، اس کی وضاحت کے لیے انھوں نے تخم کی مثال دی ہے جس میں برگ وبار پوشیدہ ہوتا ہے اور پھر بتایا ہے کہ قبل از نبوت زندگی تاریکی اور ضلالت اور بعد کی زندگی نور وہدایت معلوم ہوتی ہے جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام وایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام وایمان کے بعد ہدایت ہو جاتی ہے اسی طرح انبیاؑ کی نظر میں ظہور نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے لیکن ہدایت وضلالت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیاء کے حق میں مستعمل ہے، اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ پر اپنے احسانات گناتے ہوئے کہا ہے: اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى (ضحیٰ ۶-۸) یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے اس کے قبل کی زندگی مراد ہے، جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلے میں نسبتاً ضلالت ہی ہے، وہ اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ ضلالت کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی کے نہیں ہیں بلکہ نادانستہ بھولنے، بھٹکنے اور غفلت

کرنے کے بھی ہیں عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے: اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (بقرہ، ۲۸۲) ایک اور آیت علم الٰہی کی تعریف میں ہے لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسٰى (طٰہٰ ۵۲) حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسا مارا تھا جس کے صدمے سے وہ اتفاقیہ مر گیا تھا، نبوت پاکر جب وہ لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم میرے فراری مجرم ہو، حضرت موسیٰ نے جواب دیا: فَعَلْتُهَا اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ (شعراء ۲۰) حضرت موسیٰؑ نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی، نہ بت کو پوجا تھا، نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا، نہ کوئی اور شرک کیا تھا، کسی کے طمانچے مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کا مرجانا مارنے والے کا کوئی بالقصد گناہ نہیں جس کو ضلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے، دوسری جگہ اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے غفلت (بے خبری) سے تعبیر کیا گیا ہے، حضرت یوسفؑ کے قصے میں آپ کو خطاب ہے: وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ اس بے خبری کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (شوریٰ ۵۲)

> "کتاب و ایمان" کے نور ہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا، اس سے مقصود حقیقی گنہگاری، عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے بلکہ طلب حق، تلاش معرفت اور انتظارِ حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے، روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسروں کو رہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے، یہ ہدایت کا دور ہے۔[۲۳]

قرآن مجید کی بعض خصوصیات کی نشاندہی: قرآن مجید کی اہم خصوصیات کا اس میں کہیں کہیں ذکر بھی ہے ایک جگہ قرآن مجید کی ایک اہم خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ اسلام کے دعوی اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے، خود آنحضرتؐ اور صحابہ بھی دعوت و تبلیغ میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی۔ اس کی تبلیغ کے لیے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ قرآن کی تلوار تھی۔ جس کی ضرب کی روک خود اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا تھا: فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان ۵۲)

اس پیغام الٰہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو

ان کا عہد یاد دلائی ق ۳) قرآن رحمت عالم کا پیام عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض و غایت ہے۔ (فرقان، ۱۰) یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمدؐ کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی۔[۲۴]

اسی سلسلۂ بیان میں وہ اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب کے زیر عنوان قرآن مجید کے اصول دعوت اور اس کے طرز خطاب کی یہ خصوصیت بیان کرتے ہیں کہ عرب میں صرف تین قومیں تھیں جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ۔ اس بنا پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار کو پہلے دعوت دی جاتی پھر یہود کو حلقہ بگوش اسلام بنایا جاتا، اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی، چنانچہ آنحضرتؐ نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے۔ تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفار مکہ تھے اسی لیے ان میں بت پرستی کی مذمت، توحید کی ترغیب، عجائب قدرت کا بیان، عذاب الٰہی سے تخویف اور صنادید قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں لیکن جب آپ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پڑا اور اب قرآن مجید کا طرز خطاب بدل گیا چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ، ان کی تحریفات ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصص بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں سب سے آخر میں نصاریٰ کی باری آئی اور فتح مکہ کے بعد قبائل عرب کے وجود کے سلسلے میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا، اسی زمانے میں سورۂ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

مجوس عرب میں بہت کم تھے، بحرین اور یمن میں خال خال وہ پائے جاتے تھے، اس لیے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ میں ان سے خطاب نہیں کیا ہے، البتہ جابجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے اور ان کے عقائد کی تردید کی، اور ان کو ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی۔[۲۵]

قرآن مجید سے استدلال اور اس کے طریقہ دلائل کی وضاحت: مولانا سید سلیمان ندوی کی قرآنی فہم و معرفت اس وقت زیادہ ممتاز اور بہت نمایاں دکھائی دیتی ہے جب وہ کسی مسئلہ میں قرآن مجید سے استدلال و استشہاد کرتے ہیں، یہ پہلے گذر چکا ہے کہ اس کتاب میں قرآن مجید سے استناد کو ہر چیز پر مقدم کیا گیا ہے اس اعتبار سے اس میں جس قدر قرآنی آیتیں درج ہیں وہ گویا بطور استدلال ہی درج ہیں، اس کا اندازہ گزشتہ مثالوں سے بخوبی ہوا ہوگا مگر یہ سیرۃ النبی کی بہت اہم خصوصیت ہے اس لیے اس کی مستقلاً چند مثالیں پیش کرنا ضروری ہے۔

سید صاحبؒ نے اللہ کی ہستی، توحید اور خدا کی عظمت کے دلائل تقریباً ۲۲ صفحے میں جس طرح پیش کئے ہیں اس سے ان کے زور استدلال کے علاوہ قرآن مجید کے طریقۂ استدلال کی خوبی اور دلنشینی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اس میں انھوں نے اہل فلسفہ اور متکلمین کے دلائل پر قرآن کے دلائل کی برتری

بھی دکھائی ہے مگر طوالت کی وجہ سے اس بحث کو قلم انداز کیا جاتا ہے البتہ انھوں نے قیامت پر قرآنی دلائل کی جو وضاحت کی ہے اسے اختصار کی وجہ سے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

قرآن نے قیامت پر عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے اول یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا، اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزا و سزا نہ ہو تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں۔

دوسری بات جو روز جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عادل و منصف ہونا ہے، اگر اچھے اور برے انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں بلکہ اللہ نعوذ باللہ ظالم و غیر منصف قرار پائے۔

چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اس لیے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے ورنہ اس کے ان ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ان کے اس وہم و استبعاد کو مختلف طریقوں پر دور کیا گیا ہے۔

١۔ مر کر جینے کی تاریخی مثالیں پیش کیں، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت عزیرؑ اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور ہیں

٢۔ زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے اور پھر دفعتہً بارش کے چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح زمین قدرت الٰہی کی ایک بارش سے انسانی دفینوں کو اُگلوا دے گی اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دے گی۔

٣۔ جس نے یہ سارا کارخانہ عالم بنایا کیا وہ اس کے فنا ہونے کے بعد دوبارہ اس کی ایجاد پر قادر نہیں

٤۔ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا خدا نے اس کو ہست و موجود بنایا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا تو جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے اس کو پیدا کیا، وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا، جس نے نقش اول بنایا کیا نقش ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں۔

٥۔ دنیا میں باری باری بہت سی قومیں آئیں، انھوں نے جسمانی زور، مالی وسعت، اجتماعی و تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت قائم کی مگر جب انھوں نے غرور و نخوت، ظلم و ستم اور دوسرے قوانینِ الٰہی کی مخالفت کی تو وہ فنا کر دی گئیں اور ان کا نام بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، عاد و ثمود، سبا و تبع، قوم لوط و قوم مدین کا قرآن نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج و فنا کی داستانیں محفوظ ہیں۔ غرض جس طرح افراد جی کر مر جاتے

ہیں، جماعتیں آکر مٹ جاتی ہیں، قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں، اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات بھی ایک دن آئے گا جب قانون الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔

جس طرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں وہ گو افراد کی فنا کا یقین رکھتے ہیں لیکن قوموں کی فنا کے مسئلے کو نہیں سمجھ سکتے اور اس میں شک کرتے ہیں، اسی طرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اس کے فنائے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے، یہ دلائل و شواہد انھوں نے قرآنی آیتوں سے پیش کئے ہیں جو حذف کردی گئی ہیں۔ قیامت اور آخرت کے تعلق سے انھوں نے مختلف عنوانات قائم کرکے ہر ایک کے بارہ میں قرآنی دلائل و شواہد پیش کئے ہیں اس سلسلے کی دو بحثیں نہایت معرکۃ الآراء ہیں ایک فنائے نار اور دوزخ کی انتہا سے متعلق ہے اس مسئلے میں پہلے وہ حافظ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کے ہمنوا تھے اس بنا پر جہنم کی عدم ابدیت کو پہلے ایڈیشن میں نہایت مدلل طور پر ثابت کیا ہے مگر دوسرے اڈیشن میں اس کے ساتھ جمہور کے دلائل کا بھی اضافہ کیا اور بالآخر اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا ان کی سمجھ میں آگیا، جس کا ذکر جنوری ۴۳ء کے شذرات میں "رجوع و اعتراف" کے عنوان سے کیا ہے۔

دوسری بحث برزخ کی ہے، احادیث سے قطع نظر انھوں نے خود قرآن مجید سے اس کے نہایت قطعی دلائل و شواہد بیان کئے ہیں، سیرت کی یہ جلد شائع ہوئی تو ایک ممتاز صاحب علم و قلم نے برزخ کے معاملے میں سید صاحب کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا مگر وہ اس کے باوجود اپنی رائے پر قائم رہے، اس کے نتیجہ میں "معارف" "جامعہ" اور "ترجمان القرآن" میں اس پر عرصہ تک مضامین شائع ہوتے رہے، اس بحث میں ان دونوں حضرات کے علاوہ چند اور ممتاز اصحاب علم نے بھی حصہ لیا تھا۔

تطبیق آیات: قرآن مجید کی بعض آیتوں میں قلت تدبر کی وجہ سے بعض کوتاہ بیں لوگوں کو تضاد نظر آتا ہے، سید صاحب نے اس قسم کی متعدد آیتوں میں جمع و تطبیق دے کر ان کے ظاہری تضاد کو رفع کیا ہے، ایک مثال ملاحظہ ہو:

اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، کلام مجید میں بار بار اس حقیقت کا اعادہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ سورۂ جن اور آل عمران میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "بایں ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے۔" ان دو آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے سید صاحبؒ دونوں قسم کی آیتیں نقل کرکے ان میں اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیۃً اور قطعاً نفی کی گئی ہے ان سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطے اور ذریعے سے اور اس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے بعض آیتوں میں اس

کی صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علوم غیب میں سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے وہ ان کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا ہے، بعض امور کے متعلق صراحتہً کہا گیا ہے کہ ان کا علم کسی کو نہیں۔

بعض آیتوں میں آنحضرتؐ کے عدم علم کی صراحت ہے، ان سب کو نقل کر کے وہ ثابت کرتے ہیں کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیئے جانے کے موقع پر دونوں آیتوں میں رسول ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امور غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضۂ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعت سے ہے۔[۲۶]

بعض اوقات انھوں نے مفسرین اور ائمہ لغت کے مختلف اقوال میں تطبیق دی ہے اس سلسلے میں حکمت پر ان کی تحقیقی بحث ملاحظہ کی جا سکتی ہے جو تقریباً ۱۶ صفحے پر مشتمل ہے۔

نکات: سید صاحبؒ نے قرآن مجید سے متعلق جو نکتے بیان کیے ہیں وہ دراصل ان کے مطالعہ قرآن کا نچوڑ ہیں سورۂ شوریٰ کی ایک آیت کے متعلق صراحتہً وحی کے تین طریقے بیان کئے گئے ہیں اس سے سید صاحبؒ نے یہ دلچسپ نکتہ تحریر کیا ہے۔

آیت میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان تین طریقوں سے، اس کے آخر میں فرمایا کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمے کے شرف کا مستحق نہ سمجھے مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص سے عام بندوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقے سے گفتگو فرمائے۔[۲۷]

خدا کے صفاتِ جلالی کے سلسلے میں یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ ان صفات کا ذکر تو زیادہ تر توراۃ میں ہے لیکن صحیفۂ محمدی میں جہاں کہیں ان کا ذکر آتا ہے ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل، حکیم اور علیم ہونے کا ذکر بھی ہوتا ہے جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان جلالی صفتوں کا یہ منشأ نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گزرتا ہے بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انتقام اور اس کی گرفت عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ کے وصف میں عزیز (غالب) کے ساتھ حکیم (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے۔ اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔ غرض صفات جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے ساتھ آگے یا پیچھے خدا کی صفات جمالی کا بھی ذکر ہو تاکہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔[۲۸]

خدا کی صفات سے متعلق ایک اور نکتہ یہ بھی ہے کہ اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے جیسے الضّار (نقصان پہنچانے والا) المذل (ذلت دینے والا) الخافض (پست کرنے والا) المانع (روکنے والا) وغیرہ کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے اس لیے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا ہے، یعنی خدا کو صرف الضّار کہنا درست نہیں بلکہ اس کے ساتھ النافع کو بھی ملایا جائے۔ اس قسم کی تنہا صفتوں میں کوئی خوبی نہیں بلکہ ایک طرح کی برائی ہے ہاں دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا، اس سے مقصود خدا کی قدرت کی وسعت ہے، اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہ ہو تو وہ نفع پہنچانے پر مجبور ہوگا اور اس کی قدرت کا یہ کمال نہ ہوگا البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا ہے اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔[29]

قرآن مجید کے موثر اور دل آویز طریقۂ بیان کی وضاحت: قرآن مجید نے اپنی تعلیم و دعوت کو نہایت موثر اور دلآویز انداز میں پیش کیا ہے، سید صاحبؒ کے نزدیک یہی معجزہ قرآنی اشاعت اسلام کا اولین اور اصلی سبب تھا، وہ جس قدر موثر اور دل کپکپا دینے والے طریقے سے عقائد و عادات و اخلاق کی تلقین کرتا تھا اس کی وجہ سے تمام موانع و عوائق فنا ہو جاتے تھے چنانچہ وہ قرآن مجید کی متعدد آیتیں نقل کر کے اس کے موثر اور پر کشش انداز بیان کی وضاحت کرتے ہیں مثلاً اس نے خدا کے وجود کے منکرین کے سامنے عالم کی بوقلمونی، مظاہر قدرت کی بوالعجبی، کائنات کی نیرنگی، اجرام فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے جو موثر استدلال کیا ہے پہلے اسے نقل کیا ہے پھر اس نے طرح طرح سے نہایت موثر پیرایوں میں شرک کی لغویت جس طرح بیان کی ہے اسے دکھایا ہے، اسی طرح قیامت کے منکرین کی وہ جس بلیغ اور موثر اسلوب میں تردید کرتا ہے اس کا ذکر بھی آگیا ہے کئی صفحوں تک قرآن مجید ہی سے اس کے موثر انداز بیان کو نمایاں کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں "غرض عقائد، عبادات، اخلاق، اعمال ہر چیز کو قرآن اس موثر اور دلنشین طریقے سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا، حقیقی جحود اور انکار نہ تھا۔"[30]

کسی خاص ذہنیت و عقیدہ کی تردید پر مشتمل آیتوں کی نشاندھی: قرآن مجید میں بعض جگہ کسی خاص ذہنیت اور مخصوص عقیدے کی تردید و اصلاح کی گئی ہے اس لیے جب تک یہ صورت حال سامنے نہ ہو ان آیتوں کا مفہوم بخوبی واضح نہیں ہو سکتا، سید صاحبؒ نے اس طرح کی بعض آیتوں کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے جیسے ایک جگہ ہے یَا أَهْلَ الْكِتَابِ هَلْ تَنْقِمُونَ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَأَنَّ أَكْثَرَكُمْ فَاسِقُونَ (مائدہ ۵۹)

اس کے متعلق انھوں نے بتایا ہے کہ یہودی حضرت عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے، یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے وہ مسیحیت سے زیادہ ہے اس لیے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیح کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہ کیا اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت، معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا اس کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی، آنحضرتؐ کے زمانے میں بہت سے یہود آپ پر ایمان لانے کو تیار تھے مگر حضرت عیسیٰؑ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے آپ نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محروم رہنا گوارا کیا مگر مسیحؑ کی سچائی سے محروم رہنا قبول نہ فرمایا اور صاف کہا یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ الخ اسی طرح اس آیت وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا (مریم ۳۲) کے متعلق لکھا ہے کہ انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰؑ تورات کے احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہ کرتے تھے قرآن مجید نے اس کی تردید کی اور خود حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے یہ کہلایا۔

موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰؑ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ نماز روزے کی پروا نہیں کرتے تھے قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا، وَاَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا (مریم ۳۱)

یہود حضرت مریمؑ پر تہمت رکھتے تھے اور حضرت سلیمانؑ کو گنڈہ، تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے قرآن نے اول الذکر کی سورہ تحریم میں وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْ الخ اور دوسرے الزام کی سورہ بقرہ میں تردید کی ہے وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ الخ

جن آیتوں کا غلط مفہوم لیا جاتا ہے اس کی مفصل و مدلل تردید کرتے ہیں مثلاً ان آیتوں میں جن میں اس کا ذکر ہے کہ رسول کا فرض صرف پہنچا دینا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ رسول کا فرض صرف وحی الٰہی کی تبلیغ ہے اسے تشریح وغیرہ کا کوئی حق نہیں حضرت سید صاحبؒ نے اس کی کئی صفحوں میں تردید کی ہے۔[31]

بعض قرآنی استعارات اور تمثیلیں: قرآن مجید کے استعاروں اور تمثیلات کی جو وضاحت کی ہے اس سے بھی ان کی قرآنی مہارت و بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً ایک جگہ یہ بتاتے ہیں کہ " انسان کے بھلے اور برے دو قسم کے اعمال ہوتے ہیں ان میں ایک قسم کا عمل کم اور دوسرے قسم کا بیش ہوگا یا دونوں برابر ہوں گے، مادی چیزوں کے درمیان تفاضل اور گھٹ بڑھ کا علم تولنے یا گننے سے ہوتا ہے اس لئے وزن اور حساب سے عموماً عدل و انصاف، حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے۔ اعمال انسانی کے بارے میں فرمایا کہ جَزَآءً وِّفَاقًا (نباء ۲۶)

اس برابری اور کمال عدل کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا

کیا اس سلسلے میں دو آیتیں نقل کی ہیں اور بتایا ہے کہ تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود اعمال خیر کی کمی و بیشی ہے۔ آگے بتایا ہے کہ کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن مجید میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے۔[۳۲]

آخرت کے خانۂ عیش و راحت کے لیے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سید صاحبؒ نے اسے بھی استعارہ قرار دیا ہے اور اس کے بارہ میں بعض شبہات کا ازالہ اور بعض نکتوں کی وضاحت کی ہے۔

اسی طرح سامان جنت کے دنیاوی نام بھی دراصل استعارہ ہیں اور ان سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں بلکہ ان اخروی اشیا کو ان دنیاوی ناموں سے اس لیے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے ان کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی، اس خیال کی تائید میں قرآن مجید کی آیتیں بھی پیش کی ہیں۔

وہ جنت کی مسرتوں اور دوزخ کی تکلیفوں کو اعمال انسانی کی تمثیلیں بتاتے ہیں۔[۳۳] قرآن پاک نے بتصریح تمام کہا ہے اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (طور۔۱۶) اس کو بھی متعدد آیتوں سے ثابت کیا ہے۔

الفاظ قرآنی کی تحقیق : قرآن مجید کے بعض لفظوں کی تحقیق و تدقیق کی مثالیں اوپر گذر چکی ہیں، یہاں لفظ "حکم" کے متعلق ان کی تحقیق پیش کی جاتی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن مجید میں انبیا کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے، اس کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کے ہیں جس کا اردو ترجمہ سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ) کر سکتے ہیں، ان انبیا کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں اس علم و حکم کا عطا ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس سے وحی کتاب کے علاوہ کسی اور عطیہ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے، اس طرح کتاب، حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں، یہ شبہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حکم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ خاص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے، وہ اسے اہل عجم کا محاورہ بتاتے ہیں اور قرآنی آیتوں کے استناد سے ثابت کرتے ہیں کہ قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ بعض جگہ اصلی اور مجازی معنی کی وضاحت بھی ہے مثلاً قرآن میں قیامت کے ذکر میں فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ ان کے نزدیک صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں اس کو بیان کر کے لکھتے ہیں اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال و جلوس اور اعلانِ جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا اس لیے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی

خطرہ کا اعلان ہے، چنانچہ توراۃ میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے، قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ آج کس کی بادشاہی ہے پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دیگا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (اس ایک سب پر غالب آنے والے کی) غرض وہ دن آسمان وزمین اور نظم کائنات کے شہنشاہ مطلق کے اظہار جلال اور شدید خطرۂ حساب کا اعلان ہوگا، اس لیے نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس کے لئے استعمال کیا گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ واقعۃً اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں۔[۳۴]

کہیں کہیں ہم معنی الفاظ قرآن کی نشاندہی کی ہے مثلاً تبلیغ کے ہم معنی قرآن میں چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک انذار کا لفظ ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں، دوسرا لفظ دعوۃ ہے جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تذکیر ہے جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں۔[۳۵]

قریب المعنی لفظوں کا دقیق ولطیف فرق بھی بتایا ہے:

عربی زبان میں گناہ کے لیے مختلف الفاظ ہیں مثلاً ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ، ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر بھول چوک سے ہو یا قصداً اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لیے گناہ نہیں لیکن انبیا کے حق میں اتنی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہے۔ انبیاء کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جرم، اثم یا حنث کا نہیں۔ ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیان تک کو شامل ہے اس لیے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفار ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیان وگناہ کے نہیں بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فروگذاشت ہے۔ یہ گو امت کے حق میں قابل مواخذہ نہیں مگر انبیاء علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں۔[۳۶]

قرآنی اصطلاحات: بعض جگہ قرآن کے مخصوص اصطلاحی لفظوں کے معنی بھی تحریر کئے ہیں مثلاً:

وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشاء کو لبوں کو جنبش دیئے بغیر اخفا وآہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کردینا ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشاء سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں، یہ علم واطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔[۳۷]

ایک جگہ فرماتے ہیں "ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور پھر کشف یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعہ علم کا نام مکالمہ الٰہی (خدا سے بات

کرنا) ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں وحی، خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا، فرشتے کے ذریعے سے بات کرنا۔

غیب کی قرآنی اصطلاح پر بڑی تحقیق و جامعیت سے مفصل بحث کی ہے اور قرآن مجید میں اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کا جو اجمالی اور تفصیلی مفہوم سامنے آیا ہے اس کو شرح و بسط کے ساتھ واضح کیا ہے۔ اسی طرح شرح صدر، علم الیقین اور عین الیقین وغیرہ قرآنی اصطلاحوں کی بھی تشریح و وضاحت کی ہے۔

حوالے:

۱۔ سیرۃ النبیؐ، ج ۱، ص ۳۴۵ ۲۔ ج ۳، ص ۲۱۱ ۳۔ ج ۴، ص ۵۹۹ ۴ تا ۷۔ ص ۵۰۰ تا ۵۰۳
۸ تا ۱۲۔ ص ۵۶۱ تا ۵۶۵ ۱۳ و ۱۴۔ ص ۵۶۸ تا ۵۶۹ ۱۵۔ ص ۵۷۵ ۱۶۔ ص ۳۸۸ ۱۷۔ ص ۶۳۳
۱۸۔ ص ۶۳۴ حاشیہ ۱۹۔ ص ۸۵۲ تا ۸۵۳، ۲۰۔ ص ۹۵ ۲۱ ص ۱۰۱ ۲۲۔ ص ۳۶۳ ۲۳۔ ص ۱۰۸ تا ۱۱۲
۲۴ و ۲۵۔ ص ۳۷۳ تا ۳۷۴ ۲۶ و ۲۷۔ ص ۶۶ تا ۶۹ ۲۸۔ ص ۵۱۰ ۲۹۔ ص ۵۱۴ ۳۰۔ ص ۳۸۳
۳۱۔ ص ۱۹۴ تا ۲۰۱ ۳۲۔ ص ۷۳۴ تا ۷۳۵ ۳۳۔ ص ۸۲۳ ۳۴۔ ص ۶۹۲ ۳۵۔ ص ۳۴۶
۳۶۔ ص ۱۰۷ ۳۷۔ ص ۶۳

عبیداللہ فہد فلاحی★

قرآنی تحقیقات

بحوالہ مقالات

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے گرچہ قرآن پاک کے علوم وفنون اور تفسیر وتفہیم پر باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں چھوڑی تاہم آپ نے قرآن پاک کے متعلق جو مقالات وقتاً فوقتاً تحریر فرمائے انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ تحریر کا ایک حصہ وہ ہے جو قرآن کے علوم سے متعلق ہے۔ اس حصے میں مولانا نے سمندر کو کوزہ میں بند کردیا ہے۔ ایک ایک مقالے میں بہت ساری کتابوں کی تلخیص اور منتشر مسائل کی ایسی تدوین کردی ہے کہ قاری معلومات کا اتھاہ ذخیرہ لے کر ہی مطالعے سے فارغ ہوتا ہے۔

علوم قرآن سے متعلق اس جلد میں سید صاحبؒ کے تین مقالے ہیں: ۱۔ علوم القرآن ۲۔ اسماء القرآن ۳۔ مکررات القرآن۔

پہلے مقالے میں جو ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے قرآن کے تقریباً تمام علوم کا جامع اور مختصر تعارف ہے۔ رسوم القرآن، تجوید القرآن، قراءات القرآن، معرفۃ الوقف والابتداء، مفردات، غریب القرآن، مصادر، واحد، تثنیہ اور جمع، معربات، وجوہ ونظائر، اعراب، معانی، اعجاز، مجاز، تشبیہ، امثال، امثلہ، بدائع، ہجاء، النقط والشکل، اجزاء، مقطوع وموصول، عدد آیات اور احکام سبھی علوم آگئے ہیں۔ ہر فن کی مختصر تشریح اور اس پر قدماء نے جو کچھ کام کیا ہے اس کا حوالہ ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ اعجاز القرآن کا ذکر کرتے ہیں تو قرآن کے اس امتیاز کی طرف بطور خاص اشارہ کرتے ہیں کہ یہ کتاب معانی واشارات کے ساتھ اپنے الفاظ، ترکیب کلام ادائے مقصود اور تعبیر مفہوم میں بھی اعجاز رکھتی ہے[1]، حقیقت اعجاز بیان، اسباب اعجاز کی تشریح، انواع اعجاز کی تعیین وتحلیل، محاسن عبارات قرآن کی تفصیل، نکات ووجوہ بلاغت وفصاحت قرآن کی توضیح میں علمائے کرام نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں ان کا تعارف کراتے ہوئے رمانی کی النکت فی الاعجاز سے لے کر زملکانی کی البرہان فی اعجاز القرآن الکبیر اور المجید فی اعجاز القرآن المجید[1] الصغیر تک کی تمام نادر تصنیفات کا حوالہ دیتے نظر آتے ہیں۔

★ طالب علم ایم اے فائنل، شعبۂ سیاسیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید صاحب کے نزدیک اعجاز قرآن پر پہلا کام ابوالحسن رمانی کی النکت فی الاعجاز ہے[۲] لیکن اس کے مقابلے میں زیادہ قرین صحت رائے یہ ہے کہ اعجاز پر پہلی باقاعدہ تصنیف ابن زید واسطی کی ہے[۳] کیونکہ رمانی کی تاریخ وفات ۳۸۴ھ / ۹۹۴ء[۴] ہے جب کہ واسطی نے ۳۰۷ھ / ۹۱۹ء میں وفات پائی[۵]۔ یہ بحث بھی خاصی دلچسپ ہے کہ واسطی کی کتاب سے پہلے معجزہ اور اعجاز کا لفظ اصطلاح کے طور پر کبھی استعمال نہیں کیا گیا اور اگر استعمال کیا گیا ہو تو اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس سے پہلے آیۃ، برہان، سلطان وغیرہ کے الفاظ اس مفہوم کے لیے استعمال ہوتے تھے کیونکہ تیسری صدی ہجری کے اولین دور کے مصنف علی بن ابن طبری نے بھی اپنی کتاب "الاسلوب والبلاغہ" میں لفظ معجزہ کا کہیں استعمال نہیں کیا۔ یہ ابن زید واسطی ہے جس نے سب سے پہلے لفظ معجزہ کا استعمال کیا اس کے بعد دوسرے الفاظ متروک ہو گئے اور نبوت و اعجاز کے مسائل میں یہ لفظ علامت بن گیا۔ بہتر ہوتا کہ سید صاحبؒ اپنے مقالے میں شان نزول اور نظم قرآن کا بھی تذکرہ و تعارف کرا دیتے کیونکہ ان کا تذکرہ کیے بغیر شاید علوم القرآن پر کوئی بحث مکمل نہیں ہو سکتی۔ خاص طور پر اول الذکر پر متعدد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ علی بن احمد النیسابوری الواحدی (م ۴۶۸ھ) علی بن عبداللہ المدینی (م ۲۳۴ھ) اور عبدالرحمٰن بن علی ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) کی اسباب النزول پر کتابیں کافی مشہور ہیں۔

اس سلسلے کا دوسرا مقالہ "اسماء القرآن" ہے جو ۳۹ تا ۶۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ مقالہ اس اعتبار سے کافی قیمتی اور معلوماتی ہے کہ اس میں قرآن کے نام کی ضرورت، تناسب، دیگر صحف انبیاء کے نام اور قرآن کے دوسرے ناموں پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ یہ دراصل کسی آریہ مصنف کی اس "تحقیق" کا جواب ہے کہ قرآن لفظ قُر اور آن سے مرکب ہے قُر قرات کا امر ہے جس کے معنیٰ ہیں پڑھ اور آن کے معنیٰ ہیں اب، اب دونوں لفظوں کی ترکیب سے معنیٰ یہ ہوئے کہ "پڑھ تو اب"۔ سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "آریہ محقق کی اس تحقیق کی داد ہمارے عربی مدارس کے میزان خواں طلبہ دیں گے"[۶]۔ سید صاحبؒ امام شافعی وغیرہ علمائے اسلام کی اس رائے سے متفق نہیں ہیں کہ قرآن مجید کا نام قرآن کی کسی مناسبت سے نہیں اور نہ یہ کسی مناسب لفظ سے مشتق ہے بلکہ قرآن کا نام قرآن اس طرح ہے جس طرح انجیل اور تورات کا خدا نے انجیل اور تورات نام رکھ دیا ہے۔ سید صاحبؒ کے نزدیک دیگر صحف انبیاء کے نام بھی مناسبت سے رکھے گئے ہیں مثال کے طور پر انجیل کے معنی یونانی زبان میں مژدہ اور بشارت کے ہیں اور یہ نام عیسائیوں کے خیال کے مطابق اس وجہ سے رکھا گیا کہ حضرت عیسیٰ خدا کی بادشاہت کا مژدہ سناتے تھے اور مسلمانوں کے نزدیک انجیل مژدہ اس لیے ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کی آمد آمد کی بشارت ہے قرآن باآواز بلند کہہ رہا ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ

يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (صف: ۶)

(اور یاد کرو عیسیٰ بن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ "اے بنی اسرائیل میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا)

ٹھیک اسی طرح سید صاحب کے نزدیک (۱) جس طرح قرآن کے الفاظ و معانی الہامی ہیں اس کے نام بھی الہامی ہیں (۲) جس طرح قرآن کو بلا تحریف و تبدیل بلا زیادۃ و نقص دائمی وجود عطا ہوا ہے اسی طرح اس کے نام بھی دائم الوجود ہیں اور (۳) قرآن اپنے ثبوت میں اپنے پیرووں کا محتاج نہیں ہے۔

آخر میں سید صاحب قرآن کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک قرآن مصدر ہے اور صیغہ مفعول کے معنی میں ہے اس گروہ کی تحقیق میں قرآن کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بار بار پڑھا جاتا ہے اور اس کی تلاوت کی جاتی ہے لیکن جمہور مفسرین اور ماہرین لغت کے نزدیک قرآن جمع کرنے کے معنی میں ہے اور درحقیقت یہی صحیح بھی ہے لیکن اختلاف اس امر میں ہے کہ قرآن کو جامع کیوں کہا جاتا ہے۔ ابو اسحاق نحوی کے نزدیک قرآن اس لیے نام رکھا گیا کہ وہ سورتوں کو باہم جمع کرتا ہے اور ملاتا ہے۔ ابن اثیر کے نزدیک وہ قرآن اس لیے ہے کہ قصص، امر و نہی، وعد و وعید سب کا جامع ہے اور امام راغب کے نزدیک قرآن اس لیے نام ہے کہ وہ تمام گزشتہ منزل من اللہ کتابوں کے نتائج کا جامع ہے۔ اس آخری رائے کی سید صاحبؒ پر زور تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ انہی کے الفاظ میں "تورات قانون ہے، انجیل اخلاق ہے اور زبور حمد و ثنا اور مناجات ہے لیکن قرآن قانون بھی ہے، قرآن اخلاق بھی ہے، قرآن ادعیہ و مناجات بھی ہے، قرآن تمام دنیا کی صحیح مذہبی کتابوں کا خلاصہ ہے، قرآن تمام صحف آسمانی کی روح ہے، قرآن انسان کی ہر قسم کی حاجتوں کا سامان ہے، قرآن ہر قسم کی ضروریات کا کفیل ہے، قرآن دین و دنیا کی ہر راہ کا مشعل ہے ...... غرض ہر قسم اور ہر نوع کی تعلیمات اور اس کے اصول و فروع کا جامع ہے کیا اس جامعیت میں دنیا کی کوئی مذہبی کتاب اس کا مقابلہ کر سکتی ہے اور اگر نہیں کر سکتی تو ایسی حالت میں قرآن کا قرآن سے بڑھ کر جامع نام دوسرا نہیں ہو سکتا۔"

اس سلسلے کا تیسرا مقالہ "مکررات القرآن" ہے یعنی قرآن مجید میں مکرر آیتیں کیوں ہیں؟ اس مضمون میں سید صاحبؒ نے اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کی مکرر آیات قرآن سے خارج ہیں جیسا کہ نواب صدیق حسن خاں کی تفسیر سے ان کا یہ فقرہ نقل بھی کیا ہے۔ وقد نبغت فی ھذا الزمان طائفۃ تفسر القرآن بآرائھا وتحذف منہ الآیات المتالیات تسمیٰ بالنیچریۃ (اس زمانے میں ایک فرقہ پیدا ہوا ہے جو اپنی آرا سے قرآن کی تفسیر کرتا ہے اور مکرر آیتوں کو قرآن سے خارج سمجھتا ہے جس کا نام نیچری ہے)

اسی طرح دی انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے بھی اس قسم کا اعتراض کیا ہے وہ لکھتا ہے:

"قرآن اکثر یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ کسی قدر "الل ٹپ" انداز میں مرتب کیا گیا ہے اور اس احساس کو اس حقیقت سے مزید تقویت ملتی ہے کہ مختلف محبوب اور دلنشیں جملے جیسے وَلٰکِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ اور وَ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ وغیرہ سیاق سباق سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں یا بالکل ہی متعلق نہیں ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں محض صوتی ہم آہنگی کے لیے مربوط کر دیا گیا ہے۔"[9]

اس قسم کے اعتراضات کا سید صاحب نے منہ توڑ جواب دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں کوئی بات مکرر نہیں ہے۔ اور جہاں جہاں بظاہر تکرار ہے وہاں مختلف معنی مراد لیے گئے ہیں اور مضامین و الفاظ کی یہ تکرار پیش و عقب اور لواحق و تضمنات کے ساتھ اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی ہر بات طالب ہدایت کے ذہن نشین ہو جائے اور منکرین حق کے لیے قیل و قال کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

سید صاحب نے لکھا ہے کہ قرآن میں دو قسم کی تکرار ہے:

۱۔ **معنوی تکرار:** اس سے مقصود یہ ہے کہ ایک ہی مفہوم اور ایک ہی معنی کو خاص الفاظ کی پابندی کے بغیر بار بار کہنا۔

۲۔ **لفظی تکرار:** اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی مفہوم کو کسی خاص عبارت اور الفاظ کے ساتھ بار بار ادا کرنا مثلاً سورہ رحمٰن میں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کی تکرار۔

معنوی تکرار عموماً چند موقعوں پر ہے بعض خاص پر اثر قصوں کی تکرار اور بعض خاص خاص عقائد و فرائض کی تکرار۔

لفظی تکرار کے لیے سید صاحبؒ نے عربی اشعار سے اور قدیم آسمانی صحیفوں سے زبردست استدلال کیا ہے۔ یہ حصہ سید صاحبؒ کی عربی شاعری اور آسمانی کتب پر عبور اور تبحر علمی کی واضح دلیل ہے لیکن آخر میں یہ اعتراف کرتے بھی نظر آتے ہیں کہ "علوم قرآن دراصل ایک بحر ناپیدا کنار ہے اس قسم کے نکتے صرف اس دریا کے چند حباب ہیں۔"[10]

البتہ سورہ مراسلات میں وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ کی تکرار پر چند پہلو اور غور طلب ہیں جو مولانا کے یہاں بیان ہونے سے رہ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر اس میں انشا و خبر دونوں ہونے کی صلاحیت ہے اور دونوں کا احتمال موجود ہے۔ خبریہ اسلوب کا مقصد یا تو اس امر کا بیان ہوگا کہ ان منکرین کے لیے ہلاکت اور خرابی ثابت ہے یا ان کے اس قول کا بیان مقصود ہے جو وہ قیامت کے دن کہیں گے۔ اس طرح اس تکرار سے اسباب ویل کی کثرت واضح ہوگی اور دوسری صورت میں قیامت کے دن بہت سے مواقع پیش آئیں گے جب

وہ اپنی بدبختی کا ماتم کریں گے۔

قیامت کے دن والا انکا قول مختلف مقامات پر دوہرایا گیا ہے:

قَالُوا یٰوَیْلَنَا ھٰذَا یَوْمُ الدِّیْنِ (صافات: ۲۰) "وہ کہیں گے ہائے ہماری بدبختی یہ تو قیامت کا دن ہے"۔

دوسری جگہ ہے:

قَالُوا یٰوَیْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰسین: ۵۲) "وہ کہیں گے ہائے ہماری بدبختی، ہم کو ہماری قبروں سے کس نے اٹھایا"۔

قرآنیات سے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا دوسرا حصہ وہ ہے جو مختلف موضوعات پر "معارف" اور "الندوہ" میں چھپے ہیں۔ میرے نزدیک ان میں سب سے دلچسپ بحث "ذبحِ عظیم" کی ہے جس میں سید صاحب نے ایک منفرد اور اچھوتی رائے قائم کی ہے۔ سورہ صافات کی آیت (۱۰۷) وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ کے متعلق مفسرین نے عام طور پر لکھا ہے کہ

۱۔ چونکہ قربانی کا مینڈھا جنت سے لایا گیا تھا اس لیے اس کو ذبحِ عظیم (بڑی قربانی) کا لقب ملا۔

۲۔ یہ وہی مینڈھا تھا جس کو ہابیل نے قربان کیا تھا اور جس کو خدا نے قبول فرمایا تھا تو چونکہ خدا اس کو قبول فرما چکا تھا اس لیے اس کو بڑی قربانی فرمایا۔

۳۔ حسن بصریؒ اور دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ اس بڑی قربانی سے مقصود وہ خاص جانور نہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے سامنے قربانی کے لیے پیش ہوا بلکہ وہ مطلق قربانی ہے جو اس کے بدلے میں پوری ملت کے لیے قیامت تک حضرت ابراہیمؑ کی یادگار سنت قرار پائی۔

لیکن سید صاحب اس وقت اس میں بڑی معنویت پیدا کر دیتے ہیں جب وہ خواب کی تقسیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خواب کی دو قسمیں ہوتی ہیں: حقیقی اور تمثیلی۔ حضرت ابراہیمؑ کو جو خواب دکھایا گیا تھا وہ تمثیلی تھا یعنی یہ کہ بیٹے کی قربانی کا مطلب یہ تھا کہ اس کو ہمیشہ کے لیے خدا کی راہ میں خانۂ کعبہ کی خدمت گزاری اور دینِ حنیف کی تبلیغ کے لیے خدا کی راہ میں قربان کر دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فداکاری کے سچے جوش کے ساتھ اس خواب کو حقیقی سمجھ لیا لیکن بارگاہِ ایزدی سے ندا آئی کہ حضرت اسماعیل کی جسمانی قربانی مقصود نہیں بلکہ روحانی قربانی مطلوب ہے اور یہ جانور کی جسمانی قربانی اس روحانی قربانی کی تمثیل ہے، سید صاحب کے الفاظ میں "روحانی قربانی جسمانی قربانی کے مقابلے میں یقیناً ذبحِ عظیم ہے جسمانی قربانی کی تکلیف تو ایک لمحہ کی بات ہے مگر روحانی قربانی تو کسی امرِ حق کی خاطر ساری زندگی کی جیتے جی کی قربانی ہے جس میں مر کر نہیں بلکہ جی کر حق کی راہ میں ہر تکلیف اور مصیبت کو انگیز کرنا اور ہر وقت موت کیلئے آمادہ رہنا ہے"۔

دیکھئے سید صاحب نے "ذبحِ عظیم" کی اس عظیم تفسیر کے ذریعے معانی میں کتنی وسعت اور گہرائی پیدا کردی ہے اور جہاد و شہادت کا سارا فلسفہ کتنی عمدگی سے اس میں سمو دیا ہے۔ سید صاحب کے الفاظ میں "جہاد و شہادت جن کی فضیلتوں میں اسلام کا سارا دفتر لبریز ہے وہ اسی ذبحِ عظیم کی تفسیریں ہیں، جو مسلمان اس ذبحِ عظیم کا منظر پیش کرتا ہے بارگاہِ قدس سے وہ بقائے دوام، حیاتِ جاوید اور "بل اَحیاءٌ" کے سرخ خلعت سے سرفراز ہوتا ہے۔ جنت کے دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں اور خداوند تعالیٰ اپنے پاس کی روزی سے اس کو سیر فرماتا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما"[13]

اس سلسلے میں دوسرا دلچسپ مقالہ "حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے"۔ سید صاحب کے نزدیک عبادت کے معنی صرف بندگی اور پرستش ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ اطاعت اور تعمیلِ امر پر بھی مشتمل ہے اور یہ کہ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ ایک خدا کو دو خدا کہا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ خدا کی بلا واسطہ اطاعت میں کسی اور کو شریک کیا جائے۔ اہلِ کتاب نے اپنے احبار و رہبان کو رب کا جو درجہ دے رکھا تھا اور حلال و حرام میں ان کے فیصلوں کے پابند تھے اس کا بھی سید صاحبؒ نے تذکرہ کیا ہے اور سورہ توبہ (۳۱) آل عمران (۷) اور ترمذی کی عدی بن حاتمؓ والی حدیث سے استشہاد کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اس بنا پر تھا کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور سے اپنے حکموں سے اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے۔ اسلام نے دوسری سورہ میں ان کو اس شرک سے باز رہنے کی تلقین کی ہے"۔[14]

سید صاحبؒ کے نزدیک طاغوت اللہ کے سوا ہر وہ معبود ہے جس کی عبادت و اطاعت کی جائے۔ اہلِ تفسیر نے شانِ نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں اور جادوگروں کو اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے اس لیے اس کا مشترکہ مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے وہ طاغوت ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکمِ باطل اور معبودِ باطل ہے۔[15]

سید صاحبؒ کے نزدیک حکومتِ الٰہیہ کے قیام یا تمکینِ دین کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی مخصوص روحانی زندگی اور مخصوص مادی تمدن کو دنیا میں قائم اور باقی رکھنا ہے۔ اس لیے کہ مسلمان ایک خاص پیغامِ الٰہی لے کر دنیا میں بھیجے گئے ہیں، ان کے خاص عقائد ہیں، ان کی خاص عبادات ہیں ان کے خاص علوم و فنون ہیں، ان کا ایک خاص تمدن اور ایک خاص اصولِ زندگی ہے اور خلافت کے اصول کا مقصد اسی نظامِ زندگی کا تحفظ ہے۔ چنانچہ آیتِ استخلاف (نور ۵۵) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ الخ کی تشریح میں کہتے ہیں کہ اس خلافتِ الٰہی کا مقصد یہ ہے کہ "مسلمانوں کا وہ دین جس کو خدا نے ان کے لیے پسند کیا ہے یعنی

اسلام اس کو دنیا میں قوت و استحکام بخشا جائے کہ ظالموں اور ستم گروں کی زبردستی کے حملوں سے وہ دین اور اس کے ماننے والے ہمیشہ محفوظ رہیں اور بخت نصر، نیرو اور چنگیز کے ظہور ثانی کا اسلام کو خطرہ نہ رہے۔"[۱۷]

سید صاحبؒ اس امر پر خاص طور سے زور دیتے نظر آتے ہیں کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے وہ بھرپور استدلال کرتے ہیں اور ان دو آیتوں کو اِنِ الحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (انعام: ۵۷، یوسف: ۶۷) أَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَ الْأَمْرُ (اعراف: ۵۴) کو بطور خاص پیش کرتے ہیں اور انھیں تکوینیات اور حوادث عالم سے متعلق مانتے ہیں لیکن یہ امر وضاحت طلب ہے کہ یہ آیت دو نہیں بلکہ تین جگہوں پر قرآن میں وارد ہے اور تیسری جگہ بالکل واضح طور پر حکم تشریعی سے متعلق ہے سورہ یوسف میں یوسف علیہ السلام جہاں قیدیوں کو تبلیغ کرتے ہیں وہاں قرآن پاک ذکر کرتا ہے: ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ (یوسف: ۳۹، ۴۰) (کیا بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے، تم خدا کے علاوہ جن کی بھی عبادت کرتے ہو وہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کی عبادت کی کوئی سند نہیں اتاری حکم صرف اللہ کے لیے ہے اس لیے اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی دین قیّم ہے لیکن اکثر لوگ واقف نہیں ہیں۔)

اس آیت میں اِنِ الحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کے ماقبل و مابعد عبادت کا ذکر ہے۔ اس کی جو تشریح سید صاحب نے کی ہے اس کو سامنے رکھیے تو یہ اس بات کے لیے مزید ثبوت ہوگا کہ حکم سے مراد تشریعی قوانین ہیں۔ پھر بالکل شروع میں رب کا ذکر ہے، اس کی جو تشریح سید صاحب نے کی ہے اس کی رو سے رب کے معنی قانون ساز اور تحلیل و تحریم کے واضع کے بھی ہوتے ہیں گویا حضرت یوسف علیہ السلام یہ فرماتے ہیں کہ متفرق معبود، مالک، آقا، حاکم اور قانون ساز بہتر ہیں یا ایک خدا؟ اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ مصر کو مصریوں کا رب بتایا ہے کیونکہ وہ اسے اپنا بادشاہ، حاکم اور قانون ساز سمجھتے تھے لیکن خود اسے کبھی رب نہیں کہا بلکہ کئی جگہ ان کے مقابلے میں جہاں شاہ مصر کو مصریوں کا رب بتایا ہے وہاں خدا کو اپنا رب بتایا ہے۔

اس سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے کہ اِنِ الحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ سے خدا کی حاکمیت ثابت نہیں ہوتی ورنہ اصل مدعا سے سید صاحبؒ بھی متفق ہیں اور انھوں نے خدا تعالیٰ کی حاکمیت کو دوسری آیات کریمہ اور اجماع امت سے ثابت کیا ہے۔[۱۸]

اس جلد کے مضمون "خلیل اللہ کی بشریت" کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس مضمون میں سید صاحب

نے انبیاء کے اوصاف کمالی سے بحث کی ہے جس میں یہ دکھایا ہے کہ بعض انبیاء کے یہاں بشیریت کا پہلو غالب ہے اور بعض کے یہاں نذیریت کا۔ بعض نبی شاہد تھے اور بعض داعیٔ حق، اور بشیر و نذیر کے یہ جلوے صحابہ کرام کے یہاں بھی موجود ہیں۔ حضورؐ نے بعض صحابہ کو نوحؑ اور موسیٰؑ کی صفت سے اور بعض کو ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کی صفت سے متصف قرار دیا ہے۔ اس مضمون سے بعض ان معترضین کا اعتراض بھی رفع ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سید صاحبؒ انبیاء میں تقسیم و تخصیص کے قائل تھے[19] اس لیے کہ سید صاحبؒ کے نزدیک اس عبارت کا منشاء یہ ہے کہ "کسی نبی میں عام وصف انذار کے ساتھ مبشریت کا کمال ہوتا ہے اور کسی میں مبشریت کے عام وصف کے ساتھ نذیریت کا کمال ہوتا ہے ورنہ خود اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کو بشیر و نذیر ایک ساتھ فرمایا ہے لیکن اس بشیریت و نذیریت کے معنی واضح بھی فرما دیئے ہیں جو عام وصف بشیر و نذیر کی حقیقت ہیں..... کسی نبی میں شانِ نذیری کا غلبہ اور کسی نبی میں شانِ بشیری کا کمال باہم ایک دوسرے پر ترجیح کا سبب نہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے یہ دونوں اوصاف اللہ تبارک و تعالیٰ کی شانِ جلال و جمال کا مظہر ہیں۔"[20]

سید صاحب کی قرآنی فکر پر گفتگو کرتے ہوئے شاید اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے یہاں بتدریج پیش رفت اور فکری ارتقاء پایا جاتا ہے۔ جس طرح دیگر مفکرین تدریجی ارتقاء کے مراحل سے گزرتے نظر آتے ہیں سید صاحبؒ بتدریج بلند سے بلند تر ہوتے گئے ہیں۔ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء میں الندوہ میں آپ کا جو مضمون "القرآن والفلسفۃ الجدیدۃ" پر شائع ہوا اس کا اندازہ کسی قدر دفاعی ہے۔ اس میں آپ عقل و نقل میں مطابقت اور ہم آہنگی کی جستجو کرتے نظر آتے ہیں اور الندوہ جنوری سنہ ۱۹۰۸ء کے مضمون "مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید" میں یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ مسئلہ ارتقاء خود ثابت نہیں ہے اور اگر ثابت ہے تو قرآن مجید اس کا منکر نہیں ہے[21] اور آخر میں علماء کی خدمت میں یہ گزارش کرتے نظر آتے ہیں کہ ہم نے مذکورہ بالا آیتوں کے جو معنی قرار دیئے ہیں ان کا مقصد صرف فلسفیانہ مذاق والوں کو خاموش کر دینا ہے گو مفسرین ان آیتوں کے معنی اور سمجھے ہیں اور مجھے ان کی صحت سے انکار نہیں لیکن عقل و نقل کی تطبیق کی غرض سے ہم نے جو معنی لیے ہیں وہ بھی غلط نہیں، قرآن مجید کے الفاظ دونوں معانی کے متحمل ہیں۔[22]

لیکن نومبر سنہ ۱۹۴۶ء کے معارف میں آپ کی تحریر اقدامی پوزیشن اختیار کر لیتی ہے اور عقل کو ثانوی درجہ دے کر واضح طور سے حکم و شرع کا اصل منبع خداوند قدوس کو قرار دیتی ہے۔ حیات شبلی تحریر کرتے وقت علامہ شبلیؒ کی علم کلام سے سیرت پاک کی طرف واپسی کو بڑے فخریہ انداز میں بیان کرتے ہیں اور اس اہم نکتہ سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ "گم کردہ راہ متکلمین کو چھوڑ کر بحمد اللہ تمام متکلمینِ حق اس نکتہ سے (یعنی یہ کہ علم کلام و فلسفہ میں حیرانی و سرگشتگی کا دین کی خدمت سے کوئی تعلق نہیں ہے) بخوبی آگاہ تھے اور یہی سبب ہے کہ وہ اخیر عمر میں جب

جنگ جویانہ قوتوں میں افسردگی آتی ہے اور عقل کے بلند بانگ دعووں کی حقیقت سے ان کو آگہی ہو جاتی ہے تو دلائل و براہین عقلی کے ذریعہ وحی الٰہی اور تعلیم نبوی کی صداقت کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔"[۲۳]

اسی طرح اپنے ایک دوسرے مقالے میں حتمی طور پر یہ رائے دیتے ہیں کہ شریعت میں احکام کا مدار صرف عقل پر نہیں ہے بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کس بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے یا یوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عقاب مرتب ہوتا ہے۔[۲۴] اسی طرح ایک دوسرے مقام پر کھلے لفظوں میں کہتے ہیں کہ "احکام شریعت اور قانون شریعت کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے اسی کا حکم حکم ہے اور اسی کا قانون قانون ہے اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے رو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب یا حرام، ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے فاعل پر ثواب یا عقاب کا حکم عائد کیا جا سکے، نہیں ہو سکتا اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے۔"[۲۵]

سید صاحبؒ کے فکری ارتقار کا احساس خود مرتب مقالات شاہ معین الدین ندوی مرحوم کو بھی تھا چنانچہ انھوں نے دیباچہ میں خود اس امر کی تشریح کی ہے کہ "دو مضمون القرآن والفلسفۃ الجدیدۃ اور مسئلہ ارتقار اور قرآن مجید مصنف کے ابتدائی دور کے ہیں جو بعد کے ذوق سے مختلف ہیں۔ ان کو اس لیے شامل کر لیا گیا ہے کہ اس سے مصنف کے ابتدائی ذوق اور بعد کی تبدیلی کا اندازہ ہو سکے۔"[۲۶]

حواشی و تعلیقات

۱و۲۔ مقالات سلیمان جلد سوم مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء ص: ۱

۳۔ نعیم حمصی: تاریخ فکرۃ اعجاز القرآن المجمع العلمی دمشق ۱۹۵۵ء ص: ۴

۴و۵۔ زرکلی، اعلام ۵/۱۳۴ و ۶/۳۶۷۔ ڈاکٹر فضل الرحمن گنوری نے اس مصنف کا نام ابن یزید لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ صحیح نام ابن زید ہے اسی طرح البدایۃ والنہایۃ میں عبداللہ بن زید طباعت کی غلطی سے چھپ گیا ہے، حالانکہ پورا نام ابوعبداللہ محمد بن زید بن علی بن حسین واسطی ہے تفصیل کے لیے دیکھیے: فہرست ابن الندیم ۱۷۲، الوافی بالوفیات ۳/۸۲ لسان المیزان ۵/۱۷۲ کشف الظنون ۲/۱۹۷۷ فضل الرحمن گنوری کے لیے دیکھیے: زمخشری کی الکشاف، ایک تحلیلی جائزہ، دینیات فیکلٹی علی گڑھ ۱۹۸۲ء ص ۲۰۰ ۶ تا ۸۔ مقالات سوم ص ۲۹، ۳۲، ۴۲-۶۱، ۶۲

۹- THE NEW ENCYCLOPAEDIA BRITANICA VOL. 15 1977 PP.

۱۰۔ مقالات سوم ص ۸۳ ۱۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مجموعہ تفاسیر فراہی ترجمہ مولانا امین حسن

اسلامی انجمن خدام القرآن لاہور ۱۳۹۳ھ ص ۲۲۴-۲۲۶ ۱۲ تا ۱۶۔ مقالات سوم ص ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۴۷-۳۷۵، ۳۷۷، ۳۹۸

۱۷۔ مثال کے طور پر خواب کی تعبیر بتاتے وقت حضرت یوسفؑ کہتے ہیں: "اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِىْ رَبَّهٗ خَمْرًا" (یوسف: ۴۱) اور دوسرے سے فرمایا کہ "اُذْكُرْنِىْ عِنْدَ رَبِّكَ"۔ اس طرح خواب کی تعبیر بتانے کے بعد شاہی فرستادہ جب یوسفؑ کو زنداں سے نکالنے کے لیے جاتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ "اِرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ" ۱۸۔ زندگی رام پور جلد ۶۹ ص: ۱۹ مضمون خدا کی حاکمیت از سید سلیمان ندویؒ پر مولانا سید احمد عروج قادری کا حاشیہ۔ ۱۹۔ مثال کے طور پر علامہ امداد صابری نے اپنی کتاب "سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" میں اسی قسم کے سوالات اٹھائے ہیں۔

۲۰ تا ۲۲۔ مقالات جلد سوم ص ۳۰۵، ۱۶۴، ۱۷۴ ۲۳۔ حیات شبلی ص ۷۴

۲۴ و ۲۵۔ مقالات سوم ص ۳۶۸، ۳۸۱ ۲۶۔ دیباچہ مقالات سلیمان

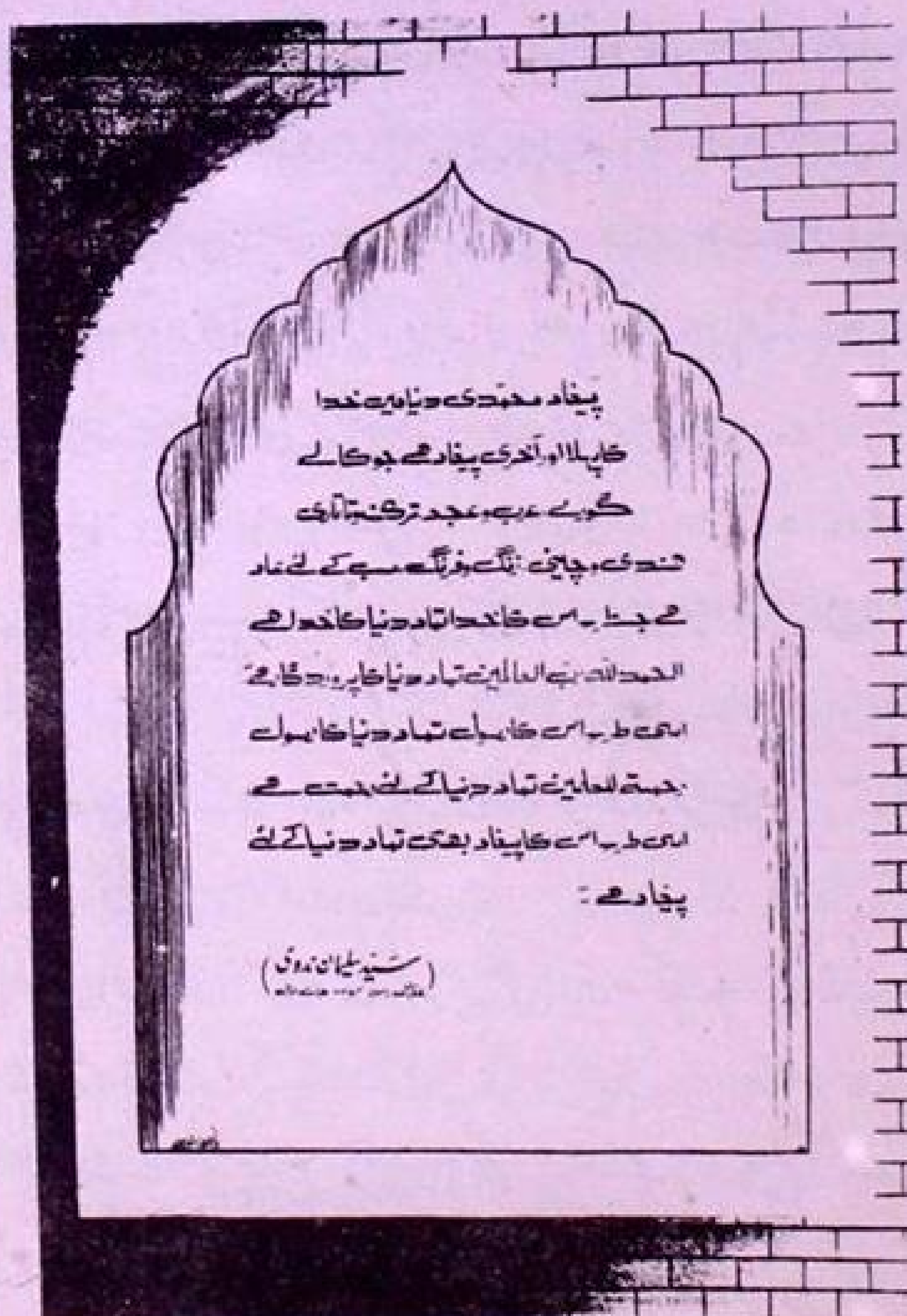

پیغام محمدی دنیا میں خدا
کا پہلا اور آخری پیغام ہے جو کالے
گورے، عرب و عجم، ترک و تاتاری
ہندی و چینی، زنگ و فرنگ سب کے لئے عام
ہے جس طرح اس کا خدا تمام دنیا کا خدا ہے
الحمد للہ رب العالمین، تمام دنیا کا پروردگار ہے
اسی طرح اس کا رسول تمام دنیا کا رسول
رحمۃ للعالمین، تمام دنیا کے لئے رحمت ہے
اسی طرح اس کا پیغام بھی تمام دنیا کے لئے
پیغام ہے۔

(سید سلیمان ندوی)

عبیداللہ کوٹی ندوی★

فقہ سلیمان

مولانا سید سلیمان ندوی علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد تھے، اسلامی علوم و فنون کے بحر ناپیدا کنار میں انھوں نے جس مہارت، ذہانت اور کمال فن کے ساتھ شناوری کی ہے اس کی وجہ سے علامہ اقبال نے ان کو استاد الکل قرار دیا ہے، علوم اسلامیہ میں جن موضوعات سے ان کو بطور خاص دلچسپی تھی ان میں ایک فقہ کا موضوع بھی ہے۔

فقہ کا لفظ علمائے شریعت کے یہاں تین چیزوں پر بولا جاتا ہے۔ فقہ اکبر جسے علم کلام اور عقائد اسلامیہ کا نام دیا گیا۔ فقہ باطن جس کے لیے قرآن و حدیث میں تزکیہ و احسان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور فقہ ظاہر جسے فقہ اسلامی ہی کے نام سے شہرت ملی، علامہ ندوی ان تینوں میں اپنی خدمات اور کارناموں کے لحاظ سے ممتاز رہے ہیں۔

ان کی سیرت النبی (سوم تا ہفتم) خطبات مدراس، رسالہ اہل سنت والجماعت وغیرہ کا تعلق دراصل علم کلام اور عقائد سے ہے۔ دوسری قسم جسے تزکیہ و احسان یا تصوف کا نام دیا جاتا ہے سید صاحب اس میں بھی علمی و عملی حیثیت سے ممتاز تھے چنانچہ ان کے شیخ حضرت تھانوی نے ان کے بارے میں یہ شعر کہا ہے کہ

از سلیماں گیر اخلاص عمل   داں تو ندوی را منزہ از دغل

فقہ کی تیسری قسم وہی ہے جو فقہ اسلامی کے نام سے معروف ہے اور اس میں اسلام کے نظام عبادت معاشرت، معاملات اور جملہ عدالتی و اجتماعی قوانین سے بحث کی جاتی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں طہارت و عبادت کے مسائل، مسلم پرسنل لا، دیوانی و فوجداری، ملکی و بین الاقوامی قوانین اور تمام انفرادی و اجتماعی احکام سے بحث کی جاتی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی فقہ کی اس قسم میں بھی اپنے مسلک، امتیازی اوصاف اپنی خدمات اور فقہی بصیرت کے لحاظ سے ممتاز تھے اور اس میں بھی انھوں نے رہنمایانہ کردار ادا کیا ہے۔ پیش نظر مقالے میں سید صاحب کے اسی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ فقہ اسلامی پر آئندہ خدمات اور تحقیقات

★ رفیق دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

میں ان سے استفادہ کیا جاسکے۔

فقہی مسلک: سید صاحب کے فقہی مسلک کے بارہ میں دو رائیں ہیں کچھ لوگوں کے خیال میں ان کا مسلک وہی تھا جو اپنے اپنے دور میں اکابر محدثین نے اختیار کیا ہے انھوں نے کسی ایک فقہ کی پورے طور پر تقلید نہیں کی، سید صاحبؒ کے یہاں چونکہ تقلید جامد نظر نہیں آتی اس لیے ان کو بھی غیر مقلد سمجھ لیا گیا۔ لیکن دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کو مقلد اور حنفی المسلک سمجھتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حنفی گھرانے میں پیدا ہوئے، وہ حنفی طریقے کے مطابق نماز پڑھتے تھے اور تقلید ائمہ کے خلاف ان کی زبان و قلم سے کبھی کوئی بات نہیں سنی گئی۔ اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہم خود سید صاحب ہی کے بیانات سے کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

سید صاحب اپنی پہلی تصنیف "حیات امام مالکؒ" میں جو بہت بعد میں ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی ہے اپنے دور طالب علمی کا ایک واقعہ لکھتے ہیں اور اس میں اپنے ذوق و مسلک کے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ

> "مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی کا ایک مناظرہ یاد آگیا۔ ہمارے استاد فقہ مولانا مفتی عبداللطیف صاحب مدرس اول دارالعلوم ہیں، جناب مفتی صاحب کو فقہ حنفی کی صحت کلی میں نہایت شدت کے ساتھ غلو ہے اور جس سے میں بدو طفولیت سے محروم ہوں۔"[1]

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب فقہ حنفی سے تو نہیں البتہ اس کی "صحت کلی" اور اس میں "نہایت شدت کے ساتھ غلو" سے اتفاق نہیں کرتے، وہ اپنے دور طالب علمی ہی کے بارے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ

> "آخری سال تھا، صحیح بخاری کا آغاز تھا، ہم درس ساتھیوں میں کچھ غالی حنفی تھے اور کچھ مائل الی الحدیث تھے، آخری لقب کا اطلاق خود مجھ پر تھا۔"[2]

غالی حنفیوں کے مقابلے میں مائل الی الحدیث ہونا، سید صاحب کے ذوقِ تحقیق کا نتیجہ ہے انھوں نے ۱۹۳۰ء/۱۳۴۸ھ میں مولانا اشرف علی تھانوی کے نام ایک خط میں اپنے مسلک کی وضاحت اس طرح کی ہے:

> "فقہ میں متاخرین کا متبع نہیں، مگر اہل حدیث بالمعنی المتعارف نہیں ہوں، ائمہ رحمہم اللہ کا دل سے ادب کرتا ہوں اور کسی رائے میں کلیتہً ان سے عدول حق نہیں سمجھتا۔"[3]

اس کے جواب میں مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں کہ "جناب نے جو بے تکلف اپنا مسلک تحریر فرمادیا اس سے میری عقیدت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوگیا، دو وجہ سے ایک صدق و خلوص پر دال

ہونے سے، دوسرے خود مسلک کے پاکیزہ ہونے سے، تمام اہل حق کا یہی مسلک ہے کبھی جزئی تفاوت سے حقیقت نہیں بدلتی، صرف رنگ بدلتا ہے، چنانچہ اس احقر پر دوسرا رنگ ہے کہ میں بوجہ اپنی قلت روایت و درایت کے متاخرین کا بھی متبع ہوں‘‘[۴۴] مولانا تھانوی سے تعلق کے چھ سال بعد ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء میں سیرۃ النبی جلد پنجم شایع ہوئی تو اس میں سید صاحبؒ نے جمع بین الصلوتین کے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے حنفی مسلک بھی واضح کر دیا ہے لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رجحان دوسری طرف ہے لکھتے ہیں کہ

’’ اوقات نماز سے متعلق آیتوں پر نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے (ان میں) ظہر اور عصر کی نمازیں مجمل ہیں یعنی دونوں کو ایک لفظ قبل الغروب یا اصیل یا طرف النھار کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، آیت سورۂ الروم میں ظہر عصر کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے، مگر شام کی نمازیں اجمال ہے یعنی مغرب اور عشاء دونوں کو حین تمسون (جب رات کرو) کے ذریعے ادا کر دیا گیا ہے، ان آیات سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں‘‘۔ (حاشیہ: حنفیہ کے علاوہ اور دوسرے فقہاء کے نزدیک حقیقتاً دو نمازیں یکجا ایک وقت میں پڑھی جا سکتی ہیں، آنحضرتؐ نے ایسا کیا ہے۵)

پھر مذکورہ بالا تحریر کے تین سال بعد ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۹ء میں سید صاحبؒ نے ابو یحییٰ امام خاں نوشہری کی کتاب پر مقدمہ تحریر فرماتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

’’میں سنت کا پیرو اور توحیدِ خالص کا معتقد ہوں، سنت کو دلیلِ راہ مانتا ہوں، اور علماء کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا جانتا ہوں اور حق کو ائمہ سلف میں سے کسی ایک میں منحصر نہیں جانتا، اس پر آپ مجھے جو چاہیں سمجھیں‘‘۔۶

’’علماء کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا جانتا ہوں‘‘ کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عام اہل علم اور عوام کے حق میں سید صاحبؒ تقلید علماء یا تقلید ائمہ کو ضروری جانتے تھے، لیکن علماء جو قانون اسلامی کے ماہر اور اہل بصیرت بھی ہوں، انھیں جمود کے بجائے اپنی فکر و نظر اور اجتہادی صلاحیت سے برابر کام لیتے رہنا چاہیے، ان کی نظر میں:

’’(اس دور کی بہت سی خرابیوں میں) پچھلے دور انحطاط کے فقہاء اور ان کے فتاوی پر اس قدر جمود کہ گویا وہ غلطیوں سے معصوم اور خطاؤں سے مبرا ہیں اور کتاب و سنت کے اصل ماخذ و مرکز اور ائمہ سلف کے اصل اجتہادات کی طرف تمدنی مشکلات اور مذہبی مسائل کے حل کرنے میں رجوع نہ کرنا اور (یہ) یقین کرنا کہ نئے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ....‘‘۷

سید صاحبؒ نے اپنے انتقال سے ۱۰ برس پیشتر جنوری ۱۹۴۳ء میں معارف میں ’’رجوع و

اعتراف“ کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جس میں انھوں نے دو فقہی مسئلوں (زیورات پر وجوب زکوٰۃ اور تصویر کی حرمت) پر اپنی گزشتہ رائے سے رجوع کا اعلان کیا ہے، اس سے پہلے وہ استعمال میں آنے والے زیورات پر عدمِ وجوب زکوٰۃ کے اور بعض قیود کے ساتھ تصویر کی حلت کے قائل تھے، اسی مضمون میں انھوں نے اپنے مسلک کی وضاحت اس طرح کی ہے:

> ”مذہبی مسائل کی تحقیقات میں میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد میں سلف صالحینؒ کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی تقلید بتمامہ نہیں ہو سکی بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہاؑ کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے، لیکن کبھی کوئی ایسی رائے نہیں اختیار کی جس کی تائید ائمہ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو، خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہم کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے۔“[۸]

سید صاحبؒ جون سنہ ۱۹۵۰ء (شعبان سنہ ۱۳۶۹ھ) میں پاکستان تشریف لے گئے ہیں، اس لئے مذکورہ بالا اقتباس اس سے صرف سات برس پہلے کا ہے جب کہ مولانا تھانویؒ سے ان کو بیعت ہوئے ۱۳ برس ہو چکے تھے اور اسی سال (سنہ ۱۹۴۳ء) چند مہینوں کے بعد مولانا تھانویؒ کا انتقال بھی ہو گیا، ”رجوع و اعتراف“ کے مندرجہ بالا اعلان سے سید صاحبؒ کے مسلک کی وضاحت ایک طرف، اور دوسری طرف مولانا عبد الماجد دریابادی کا یہ تاثر کہ

> ”مسلک میں اپنے کو سلفی کہلانا پسند کرتے تھے، بیعت کے بعد اطاعت و اتباعِ شیخ میں ایسا غلو ہوا کہ اپنے کو گویا شیخ میں فنا ہی کر دیا اور اپنے کو ایک عامی مقلد کے درجہ پر رکھنے لگے“[۹]

غالباً مولانا دریابادی کو غلط فہمی ہوئی، ورنہ سید صاحبؒ کا اپنا مسلک جو بیعت کے تیرہ سال بعد لکھا گیا ہے اس سے بالکل ہی مختلف نظر آتا ہے یا پھر شاید سید صاحبؒ کی خشیت و تواضع، بے نفسی اور مولانا تھانوی کے سامنے انقیاد و احترام کے طرزِ عمل کو مولانا دریابادی، عامیانہ تقلید قرار دیتے ہوں جو ایک مستحسن بات تھی اور اپنے خاص حدود میں عامیانہ تقلید جہاں تک تصوف یا عملی طور پر طاعت و عبادت کا معاملہ ہے، امرِ واقعہ بھی تھی۔ لیکن علمی تحقیقات اور فقہی بصیرت کے لحاظ سے سید صاحبؒ آخر آخر تک ایک عامی مقلد نہیں بلکہ ایک محقق ہی تھے، وہی تحقیقی ذہن جس کی وجہ سے انھوں نے اپنی پہلی تصنیف میں یہ الفاظ لکھے کہ ”جناب مفتی صاحب کو فقہ حنفی کی صحت کلی میں نہایت شدت کے ساتھ غلو ہے، اور جس سے میں بدرطغولیت سے محروم ہوں۔“[۱۰]

مولانا مسعود عالم ندوی کو سید صاحبؒ نے ایک خط میں (سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد) یہ لکھا

کہ "میں نے بیعت میں فقہی مسلک کو آزاد رکھا ہے"۔ مولانا مسعود عالم اسی مضمون میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ "۴۰ء اور اس کے بعد ایک عرصے تک ..... ذہنی طور پر وہ اپنے مسلک تحقیق پر قائم تھے"۔ مگر پھر اسی پیراگراف میں وہ اس کے برعکس یہ بھی لکھتے ہیں کہ "۴۰ء کے بعد ان کے افکار و رجحان میں تبدیلی ہونے لگی ...... انداز فکر بتا رہا تھا کہ فقہی مسلک میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے مگر بہت آہستہ"۔"

مولانا مسعود عالم ندوی حضرت سید صاحبؒ سے اپنی والہانہ عقیدت اور غیر معمولی وفا شعاری اور محبت کے باوجود مسلمانوں کی دینی تربیت و اصلاح کے لیے خود بھی ایک تنظیم سے وابستہ ہو چکے تھے، پھر وہ ذہنی اور عملی دونوں اعتبار سے اہل حدیث تھے، تصوف کے بارے میں بھی ان کے خیالات واضح تھے، سید صاحبؒ کے بارے میں یہ بات لکھی ہے کہ "انداز فکر بتا رہا تھا کہ فقہی مسلک میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے مگر بہت آہستہ"، لیکن یہ تبدیلی تو ان میں بھی پیدا ہو رہی تھی، تصوف کے بارے میں اختلاف ذوق نے ان دونوں کے درمیان جو فرق پیدا کر دیا تھا وہ ان مکاتیب سے ظاہر ہے جو سید صاحبؒ نے ان کے نام لکھے ہیں۔ ان میں تصوف کے تعلق سے توسل کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہے اور اہل حدیث مسلک، وہابیت، حنفیت اور بعض دوسرے امور پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے، توسل کے بارے میں مولانا مسعود عالم ندوی کے جواب میں، ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۳ء کو سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ

"توسل بالذوات بے شبہ جائز ہے احیاء میں تو کسی کو کلام نہیں جس طرح حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کے توسل سے استسقاء کیا۔ رہ گیا اموات کے ساتھ، اموات کے ساتھ توسل کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اعمال خیر و مقبولہ سے توسل کیا جائے جس طرح اپنے اعمال خیر سے توسل جائز ہے جیسا کہ حدیث الغار سے ثابت ہے (کما رواہ البخاری)، اسی طرح دوسرے احیاء و اموات کے اعمال خیر سے بھی، وابتغوا الیہ الوسیلۃ الآیہ کی تفسیر بھی توسل بالاعمال سے کی گئی ہے، البتہ اموات سے خطاب کر کے اگر مستقلاً ان سے مانگا جائے تو یہ شرک ہے اور اگر ان سے یہ کہا جائے کہ میرے لیے وہ خدا سے دعا کریں، تو اہل دیوبند جائز سمجھتے ہیں، لیکن میں اس کو بدعت سمجھتا ہوں کہ یہ طریق دعا منقول و ثابت نہیں، علامہ آلوسی نے (روح المعانی) آیت کریمہ وابتغوا الیہ الوسیلہ کی تفسیر میں اس کو بدعت کہا ہے، بعد کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فتاویٰ میں بھی یہ ملا، مولانا تھانوی بھی یہی فرماتے ہیں اور بعد کو ان رایوں کے توافق سے مجھے تسکین ہوئی۔

شرک یہ ہے کہ خدا کی ذات و صفات و عبادات میں کسی کو شریک بنایا جائے، توسل بالذوات الی اللہ نہ شرک فی الذات ہے نہ فی الصفات نہ فی العبادات، اصحاب نجدیہ کہتے ہیں تو ان کا یہ غلو ہے۔ ہاں اگر ذوات سے کوئی یہ سمجھ کر توسل کرے کہ اللہ تعالیٰ ان کی درخواست کے سامنے مجبور و مضطر ہے تو

بے شبہ یہ شرک ہوگا اور اگر یہ سمجھ کر کہ یہ جامع اعمال خیر ہیں اور ان کے اعمال بظاہر مقبول ہیں تو ان کی ذات سے خدا کی طرف بسبب ان کے اعمال کے توسل کیا جائے کہ شاید ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ میری دعا قبول فرمالیں تو یہ جائز ہے، مگر حضرت عمرؓ کے فعل سے کہ انھوں نے توسل بالنبیؐ کے بجائے توسل بعم النبی فرمایا، یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ امر قابل احتراز ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انھوں نے عمؓ النبی سے کیوں توسل کیا، کسی اور صحابی سے کیوں نہیں کیا، بالآخر عمؓ النبی کی مقبولیت عند اللہ میں خود نبیؐ کی نسبت بھی ملحوظ رہی اور بالآخر بواسطہ توسل بالنبیؐ ہی ہوا۔"[12]

یہ تو توسل کے جواز سے متعلق بحث ہوئی لیکن سید صاحبؒ کا اتباع سنت کا ذوق اس بارے میں بھی نمایاں ہے ان سے سوال کیا گیا کہ "کیا دعا واسطے سے کی جائے تو زیادہ مؤثر ہوتی ہے"۔ فرمایا: "جی نہیں، ادعیۂ ماثورہ بکثرت مروی ہیں مگر ان میں کہیں واسطہ اور توسل ہے؟ شاید ایک آدھ مقام پر ہو، اس لیے اگر توسل بالعمل ہو تو جائز ہے، اور اشخاص سے توسل بھی ان کے اعمال ہی سے ہوتا ہے، جب حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں: اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ مجھ سے مانگو، میں دوں گا، مجھے پکارو میں جواب دوں گا تو پھر واسطے کی کیا ضرورت ہے؟"[13]

مولانا مسعود عالم ندوی، پاکستانی حکومت کی جانب سے جماعت اسلامی کے معتوب ہونے کی بنا پر قید میں ہیں اور سید صاحبؒ کراچی میں ہیں، وہ اپنے اس عزیز ترین شاگرد کو (۱۵ر جولائی ۱۹۵۳ء) علاوہ دوسرے مندرجات کے یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"آپ نے حدیث پاک کے مطالعہ کے لیے یہ وقت اچھا نکالا، مگر راہ وہی اہل حدیث کی ہے، دوسری طرف بھی کچھ جاننے کی ضرورت ہے، مثلاً اس کے ساتھ ابن الترکمانی علی البیہقی بھی دیکھئے، میرا کوچہ بھی آپ ہی کا کوچہ رہا ہے، نیل الاوطار، زاد المعاد اور مصنفات ابن تیمیہ و ابن قیم و شوکانی و نواب صدیق حسن خاں سب پڑھیں، پھر دوسرے پہلو کو بھی دیکھا تو معلوم ہوا کہ حق صرف ایک فرقہ میں منحصر نہیں ہے۔"[14]

اس کے بعد انھیں کو سید صاحب ۳ر اگست ۱۹۵۳ء میں ایک اور مکتوب لکھتے ہیں، ایک مکتب فکر کی حیثیت سے حنفی مسلک کی ان کی نظروں میں جو اہمیت ہے وہ درج ذیل فقرہ سے صاف ظاہر ہے:

"ابن ہمام کی کتابیں اور ابن الترکمانی علی البیہقی بھی دیکھئے، فتح الباری اور عینی میں غور کیجئے، ابن حجر میں بے شبہ وسعت ہے مگر عمق نہیں، عینی میں عمق ہے۔"[15]

سید صاحبؒ کی یہ تحریریں جن کے چند مہینوں کے بعد ان کا انتقال ہوا ہے، ان کے مسلک میں عامیانہ تقلید کی نہیں بلکہ تحقیقی نقطۂ نظر کی نشاندھی کرتی ہیں اس دور آخر میں بھی وہ عامی مقلد نہیں بلکہ ایک محقق تھے، مسلک میں تعصب اور تصلب کو انھوں نے کبھی بھی پسند نہیں کیا، نہ عنفوان شباب میں اور

ہی اپنی عمر کے اس دور میں جسے علم و عقل کی پختگی کا دورِ شباب اور ان کے کمالات کا عہد بلند اقبال کہہ سکتے ہیں، چنانچہ انہی کے نام مکتوب مورخہ ۹؍اپریل ۱۹۴۱ء میں فرماتے ہیں:

> "وہابیت میں غلو اور تشدد نہ چاہیے، تصلب اور تعصب حکمِ دین میں چاہیے، نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں، خواہ حنفیت ہو یا وہابیت، بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔"[۱۶]

وہ فقہی مسائل میں تطبیق حدیث کا خاص ذوق رکھتے تھے، اور اس ذوق کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے، چنانچہ ۱۹۳۹ء میں جب کہ وہ سفرِ حج پر تھے اور مدینہ طیبہ کے رباط بھوپال میں قیام تھا، مجذوب صاحب کی غزل پڑھی جا رہی تھی، مولانا مسعود عالم حاضر ہوئے، انھوں نے طواف سے متعلق ایک سوال کیا جس میں انھیں حنفی مسلک کی تائید میں حدیث شریف کی جستجو تھی، اس سلسلے میں سید صاحب سے ان کی گفتگو طول پکڑتی گئی، اتنے میں وہ صاحب جو ابھی غزل سنا رہے تھے بولے "تم تو حنفی ہو، فقہائے حنفیہ کا مسلک معلوم ہو جانے کے بعد اتنی چھان بین کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے جواب میں مولانا مسعود عالم صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

> "عرض کیا: معاف کیجئے گا میں حنفی نہیں ہوں۔ سید صاحبؒ قبلہ مسکرائے، اور اشارے میں میرے اس ٹھیٹھ وہابیانہ جواب کی داد دی۔"[۱۷]

ایک فاضل جنھوں نے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک ندوہ میں تعلیم پائی اور فارغ ہوئے، وہ اس دوران میں ندوہ میں سید صاحبؒ کی آمد پر اپنا ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ

> "میں نے ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا (سید صاحبؒ نے) مسکرا کر خیریت پوچھی اور کہنے لگے: ایک ہاتھ سے مصافحہ آپ نے فیشن کے ماتحت کیا یا روایت کی وجہ سے، میں نے عرض کیا کہ "روایت کی بنا پر" المصافحہ بالیمنی والی حدیث پڑھ کر سنائی فرمانے لگے: لیکن جناب! آپ جیسے طالب علم حدیث کو اس مسئلہ میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، آپ کو یاد نہیں کہ کفّی بین کفّیَ رسول اللہؐ۔ اس کے بعد مولانا نے مصافحہ کی مختلف روایتیں سنائیں، ان پر بحث کی، روایات سے استنباط کا طریقہ بتایا اور باتوں باتوں میں اتنا کچھ پڑھا دیا کہ مہینوں کے مطالعہ سے بھی بمشکل ہی حاصل ہوتا۔"[۱۸]

حیدرآباد کے قانونِ جنایات پر نظرِ ثانی کے لیے جو فقہ حنفی کی پابندی کے ساتھ مرتب ہوا تھا، سید صاحبؒ کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی گئی، وہاں حیدرآباد ہائی کورٹ کے سابق جج اور چند دیگر قانون داں علماء کے ساتھ سید صاحبؒ نے کئی ماہ قیام کر کے قانون ٹاڈ پر نظرِ ثانی کی، یہ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔ سید صاحبؒ

کے طریقۂ کار، تحقیقی انداز اور ناقدانہ بصیرت کی بناء پر اُن کے بارے میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ

”سید صاحبؒ مسلک کے اعتبار سے تو حنفی ہیں لیکن ایسے حنفی جیسے امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر تھے یعنی وہ یہ خیال نہیں رکھتے کہ کسی ایک مسئلہ میں امام اعظم کی رائے سے اختلاف رکھنا جرم ہے یا اس اختلاف کی وجہ سے آدمی حنفی مسلک کا نہیں رہتا..... وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نہ فقہ کے ابتدائی مرتبین نے اور نہ ان کے بعد ان کے عظیم المرتبت جانشینوں نے کبھی فقہ کو ہر زمانے میں یکساں طور پر بغیر ترمیم، واجب العمل قرار دیا تھا اور نہ آج یہ ممکن ہے۔“[۱۹]

حالات زمانہ کے پیش نظر سید صاحبؒ فتویٰ لکھنے میں اپنی تحقیقی شان کو باقی رکھتے، ایسا نہ ہوتا کہ واقعی ضرورت کے باوجود وہ ایک ہی فقہ کے پابند ہوں، اس سلسلے میں حکمت سلیمانی کا آئینہ دار ایک واقعہ جو قیام پاکستان کے عرصہ میں، سید صاحب کی عمر کے بالکل آخری دنوں میں پیش آیا، اس بات کی وضاحت کے لئے قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے کہ سید صاحبؒ عامی مقلد تھے یا ایک محقق فقیہ، راوی ہیں مولانا غلام محمد (عثمانیہ) مسترشد حضرت علامہ ندویؒ، وہ فرماتے ہیں کہ

”ایک انگریز میاں بیوی مسلمان ہوئے، چند ہی دنوں میں آپس کی ناچاقی میں شوہر نے بیوی سے ایسے کلمات کہہ ڈالے کہ مذہب حنفی کی رو سے طلاق مغلظہ واقع ہو گئی، یہ ماجرا ان کے ایک مسلمان دوست نے سنا تو انھوں نے شوہر سے کہا کہ تمہارا تو نکاح ہی فسخ ہو گیا، اب نو مسلم میاں بیوی بھی پریشان اور اس کے دوست بھی حیران، احتیاطاً ان دوست نے بعض معتبر مفتیوں سے رجوع کیا مگر جواب ہر جگہ سے طلاق قطعی ہی کا ملا۔ پھر وہ حضرت علامہ کی خدمت میں آئے، سارا ماجرا سنایا، علامہ نے فرمایا کہ بھئی مفتی صاحب (مولانا مفتی محمد شفیع) سے پوچھیے، انھوں نے عرض کیا کہ وہاں سے تو یہی جواب ملا، علامہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: تو آپ کا کیا جی چاہتا ہے کہ جواب برعکس ملے؟ اس پر وہ چپ ہو رہے، تب علامہ نے ان سے فرمایا کہ آپ ایک استفتاء لکھ کر کل مفتی صاحب کے سالانہ جلسے میں لائیے مجھے جو کچھ لکھنا ہے میں وہیں لکھ دوں گا، چنانچہ دوسرے روز جلسہ جب ختم ہوا اور مخصوص علماء جن میں مفتی محمد حسن امرتسری، مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور خود مفتی محمد شفیع صاحب تھے چائے نوشی کے لئے ایک کمرہ میں بیٹھ گئے تو علامہ نے ان صاحب سے استفتاء دے کر ایک ایک کو دکھلایا، متفقہ جواب یہ تھا کہ طلاق واقع ہو گئی پھر حضرت علامہ نے اپنے قلم سے اس پر یہ فتویٰ تحریر فرما دیا کہ اہل سنت والجماعت میں مسلک اہل حدیث کی رو سے طلاق واقع نہیں ہوئی، رجوع کرا دیا جائے (روایت بالمعنی) پھر علمائے کرام کو یہ جواب دکھاتے ہوئے فرمایا کہ وہ نو مسلم بیچارے تو ابھی نہ حنفی ہیں اور نہ شافعی، لہٰذا قانون میں کوئی بھی گنجائش نکلتی ہو تو اس کا فائدہ انھیں ملنا چاہیے، اس پر حضرت مفتی محمد حسن صاحب نے برملا فرمایا کہ یہ

جواب حضرت ہی لکھ سکتے تھے ہم چونکہ فقہ حنفی کے مفتی ہیں اس لیے نہیں لکھ سکتے، پھر مفتیٔ اعظم پاکستان نے بھی اس قول کی تائید فرمائی۔"[۲۰]

شاہ ولی اللہ دہلوی کا مسلک اور سید صاحبؒ

سید صاحبؒ کا مسلک، دراصل وہی تھا جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اختیار کیا ہے چنانچہ انھوں نے مذکورہ بالا اقتباسات میں کئی جگہ اس کی وضاحت کی ہے اسی کے ساتھ وہ ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، اور ابن حجر عسقلانی سے بھی متاثر رہے لیکن موخرالذکر تینوں حضرات سے انھوں نے توحید و کلام اور تحقیق حدیث میں زیادہ استفادہ کیا ہے ابتدا میں مائل الی الحدیث ضرور تھے چنانچہ ندوہ ہی کی طالب علمی کے دور میں انھوں نے اپنے "اسی میلان خاطر کی بنا پر ایک بار اتفاقاً رفع یدین بھی کیا۔"[۲۱] مگر یہ ان کا معمول نہ تھا، انھوں نے متعدد مضمونوں میں اپنے کو اہل حدیث قرار دیئے جانے سے انکار کیا ہے، وہ حنفی فقہ ہی کے مطابق مسائل بتایا کرتے افتاء اور قضاء میں بھی فقہ حنفی کی پابندی کرتے لیکن دوسرے مسلک والوں کو ان کی کتب فقہ کے مطابق فتوے بھی دے دیا کرتے، "وہ زندگی بھر اپنے عمل میں حنفی ہی رہے"[۲۲] مگر تحقیق حدیث کے اپنے ذوق کی وجہ سے بعض بعض مسائل میں انھوں نے اپنی منفرد آراء سے بھی مستفید فرمایا، ان کی تحقیقات علمی کا بنیادی سرمایہ قرآن و حدیث اور فقہائے محدثین تھے، انھوں نے مولانا مسعود عالم ندوی کو ایک بار ۱۹۴۳ء میں یہ لکھا کہ

"اور مسائل فقہیہ میں فقہائے محدثین کے طرز کو اختیار کیا جائے۔"[۲۳]

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا مسلک بھی بنیادی طور پر یہی تھا وہ حنفی تھے لیکن

"در فتوی بحال مستفتی کار می کنم مقلد ہر مذہبی کہ باشد او را از ہماں مذہب جواب می گویم"[۲۴]۔ فتوی میں مستفتی کے حال پر نظر رکھ کر کام کرتا ہوں اور وہ جس مسلک کا ہو اسی کے مسلک کے مطابق فتوی بتلاتا ہوں۔

وہ الجزء اللطیف میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"چاروں مسلک اور ان کے اصول فقہ کی کتابوں اور ان احادیث کے غائر مطالعہ کے بعد جن سے وہ حضرات استناد و استدلال کرتے ہیں، نور غیبی کی مدد سے، فقہائے محدثین کی روش پسند خاطر ہوئی۔"

شاہ صاحب کو مختلف مسلکوں کے لوگ اپنی اپنی جانب نسبت دینے اور اپنے پسندیدہ رجحانات کا نمائندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر شاہ صاحب اپنے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ

"اس فقیر کو پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد و عمل میں کتاب و سنت کو مضبوطی سے پکڑا جائے اور ان میں برابر تدبر کیا جاتا رہے۔ ... اور عقائد میں قدمائے اہل سنت کا مسلک اختیار کیا جائے، سلف نے جس چیز کی کھود کرید نہیں کی اس کے پیچھے نہ پڑے اور معقولیان خام جو شبہات پیدا کرتے ہیں ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی جائے اور فروع فقہ میں ان علمائے محدثین کی پیروی کی جائے جو حدیث اور فقہ کے جامع ہوں

اور ہمیشہ فقہی تخریجات کو کتاب و سنت پر ضرور پیش کیا جائے پھر جو اس کے موافق ہو اس کو قبول کرے ورنہ کالائے بد بریش خاوند کا معاملہ اختیار کیا جائے اور یہ یاد رکھا جائے کہ امت کسی بھی زمانے میں فقہاء کے اجتہادات کو کتاب و سنت کی روشنی میں جانچنے سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتی اور ایسے متقشف فقیہ جو کسی عالم کی بات کو دستاویز بنا کر سنت کی جستجو اور اس کی پیروی سے بے نیاز ہو جائیں ان کی بات تک نہ سنی جائے اور ان کی طرف کسی قسم کا التفات نہ کیا جائے بلکہ ان سے دور ہو کر خدا کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کیا جائے“۔[25]

شاہ صاحبؒ متاخرین فقہا کے بارے میں جو نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے کتاب و سنت کی طرف رجوع کے بجائے اپنے متقدم فقہاء ہی کے اقوال سے تخریج و استنباط کرتے ہیں یہ فرماتے ہیں کہ

”متقدمین فقہاء ہی کے کلام سے تخریج اور استنباط کی بحثوں میں لگے ہوئے یہ لوگ جو جدال و مناظرہ کے طور طریق کو اختیار کئے ہوئے ہیں وہ جو کچھ کہہ دیں اس میں ہمارے لیے ان سے اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے اس لیے کہ ان کی طرح اس میدان کے مرد ہم بھی ہیں، اور ان کا اور ہمارا معاملہ برابری کا ہے“۔[26]

متاخرین فقہائے احناف میں، فتویٰ نویسی کے جو اصول بیان کئے گئے ہیں ان میں ائمہؒ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ امام ابویوسف اور امام محمد) کے درمیان اختلاف کی صورت میں، قول راجح کی جستجو اور تعیین میں بھی کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے کے بجائے کچھ اور ہی دستور عمل رہا ہے۔ شاہ صاحب عرفی قسم کے کٹر اور جامد حنفی نہ تھے، رائج الوقت تقلیدی تصورات جن میں متاخرین فقہاء کو بھی وہی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جو متقدمین اور سلف کی تھی؛ شاہ صاحب ان سے بچنے کی تاکید فرماتے ہیں اور فتویٰ نویسی کے لیے درج ذیل صورت تجویز فرماتے ہیں:

”وہ بہتر راہ جو تمام طریقوں میں سنت معروفہ سے قریب تر ہے یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد) میں سے جس کا قول بھی سنت معروفہ (احادیث نبویؐ) سے قریب تر ہو وہ لے لیا جائے پھر ان فقہائے حنفیہ کی ترجیحات کی پیروی کی جائے جو فقیہ ہونے کے ساتھ حدیث کے بھی عالم تھے کیونکہ بہت سے ایسے مسائل ہیں کہ ائمہ ثلاثہ نے اصول میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہا اور نفی بھی نہیں کی اور احادیث ان کو بتا رہی ہیں تو لازمی طور پر ان کو قبول کیا جائے گا اور یہ سب حنفی مسلک ہی ہے“۔[27]

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا یہ طریقۂ کار کہ ”دائما تفریعات فقہیہ را بر کتاب و سنت عرض نمودن“ (فقہ کے فروعی مسائل کو ہمیشہ کتاب و سنت کی روشنی میں پرکھنا چاہیئے) ان کے تحقیق حدیث کے اس ذہن اور ذوق کا آئینہ دار ہے جو ہمیں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے یہاں بھی پوری صراحت کے ساتھ نظر آتا ہے، شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ میں اپنے اسی ذوق تحقیق کی وجہ سے دیگر ائمہ کے بعض اقوال کو

دلائل کی روشنی میں زیادہ قوی پاکر اختیار کیا ہے ان میں چند مسائل تو وہ بھی ہیں جو اس دور میں احناف اور غیر احناف کے درمیان، مسلکی شعار وامتیاز کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں مثلاً مسئلہ قلتین رفع یدین، اذان میں ترجیع اور اقامت میں ایتار اور ان بستیوں میں جمعہ کا جواز جہاں کم از کم چالیس مرد موجود ہوں وغیرہ۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد اس عہد میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا مسلک، در اصل حضرت شاہ صاحب ہی کے مسلک کی تجدید ہے، سید صاحب گو اکثر امور میں حنفی مسلک ہی پر عمل پیرا تھے چنانچہ تراویح بیس رکعت ہی پڑھتے، رفع یدین نہیں کرتے تھے مگر قرآت فاتحہ خلف الامام اور ناگزیر صورت میں جمع بین الصلوتین پر بھی ان کا عمل تھا اس کے علاوہ چند اور مسائل میں ان کی رائے دوسروں سے مختلف تھی۔

شاہ دہلوی، موطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شمار کرتے ہیں بلکہ اس کو اولین حیثیت دیتے ہیں، سید صاحبؒ آغاز عمر ہی سے موطا امام مالک کی اہمیت اور اولیت کے معترف رہے اور مولفین حدیث میں وہ بطور خاص امام مالک کے مداح اور عقیدت مند تھے، دونوں اسلامی اور عصری علوم میں متبحر ہیں دونوں ابن تیمیہؒ کے قدردان اور معترف ہیں، تصوف، علم کلام اور اسرار شریعت کے دونوں محرم راز ہیں، ان میں تصوف اور فقہ وحدیث میں تحقیق اور اعتدال وتوازن پایا جاتا ہے دونوں اپنے اپنے دور میں وسعت نظر، دقت خیال، بصیرت، ایمانی صفات اور اپنے علمی اوصاف کی وجہ سے مرجع انام اور محبوب خواص تھے، اور دونوں کو بلند سے بلند طبقہ میں اعتماد اور اہمیت حاصل تھی، دونوں ہی سلف کے متبع اور کتاب وسنت کی طرف رجوع میں مسلک متاخرین سے بے نیاز لیکن سلف سے منقول تمام ہی مسلکوں کا احترام کرتے ہیں ان کے یہاں تمام مسلکوں میں متعصبانہ تفریق وامتیاز کے بجائے توفیق وتطبیق اور جمع بین المذاہب کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ حنفی ضرور تھے مگر تقلید کی وجہ سے نہیں بلکہ تحقیق کی بنا پر، لیکن وہ اس انتساب کا ذکر و تذکرہ نہیں کرتے اور نہ ہی اس نسبت سے وہ اپنا تعارف کراتے ہیں، ان کے پیش نظر اسلام تھا اور ان کی تمام تر خدمات اسلام اور مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہیں، ان کے نزدیک ملت کے لیے وہی نام بس ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے تجویز ہوا، ھو سمّٰکم المسلمین۔

سید صاحبؒ کے مسلک کی اس مختصر توضیح کے بعد فقہ سلیمان کے بعض دوسرے پہلوؤں کی وضاحت بھی ضروری ہے تاکہ بحث کا کوئی پہلو بھی تشنہ نہ رہے۔

امتیازی اوصاف اور طریقۂ کار: فقہ اسلامی میں مہارت اور فتویٰ نویسی میں اصابت کے لیے

جہاں، قرآن و حدیث میں گہری بصیرت، علوم عربیت میں کمال اور اجتہادات فقہاء سے واقفیت کی ضرورت ہے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مفتی اور فقیہ اپنے عہد کے علوم و افکار سے بھی اچھی طرح واقف ہو، توازن و اعتدال، تحمل و برداشت، حریت فکر اور اصابت رائے کی صفات سے آراستہ ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی شخصیت اپنے علم و عمل میں باوقار ہو اور اس میں قول حق کے لیے جرأت و اظہار حق کی صفت بھی پائی جائے سید صاحبؒ کی شخصیت میں یہ تمام خوبیاں یکجا تھیں،

فقہی جزئیات پر نظر اور قوت استدلال کے سلسلے میں مولانا صبغت اللہ فرنگی محلی کا بیان سید صاحبؒ کے بارے میں ایک چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے کہ شاہجہاں پور میں (۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) حضرت سید صاحبؒ کی زیر صدارت تحریک خلافت کی جانب سے ایک بڑی کانفرنس ہو رہی تھی، تحریک خلافت کی مخالفت اور تکفیری اشتہارات کی اشاعت خوب زور شور سے کی گئی، وہ اشتہارات سید صاحبؒ کو دیئے گئے تو انھوں نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھنے کے بعد ان کا بھی تذکرہ کیا مگر بقول مولانا فرنگی محلی :

”ان اشتہارات کے ذکر میں سید صاحبؒ کی ضرب المثل متانت برقرار رہی، حد یہ ہے کہ لہجہ تک نہیں بدلا، اس کے بعد ان کے متین و مضبوط جوابات نے ...... ان لوگوں کو انگشت بدنداں کر دیا جو ان کو آج تک صرف ایک ادیب و مورخ ہی جانتے تھے، جزئیات فقہ پر عبور، مسائل کا استحضار اور قوت استدلال سب ہی سے خراج تحسین وصول کر رہی تھی“۔[۲۸]

سید صاحبؒ اپنے اعتدال اور توازن کی وجہ سے ان لوگوں کا بھی مرجع تھے جو دیوبندی بریلوی اختلاف کی وجہ سے قول حق کی جستجو میں رہتے چنانچہ :

”نواب بہادر یار جنگ جن کو حضرت علامہ سے ایسا ہی تعلق تھا جیسے ایک باادب شاگرد کو اپنے شفیق استاد سے ہونا چاہیے وہ علامہ کو ایک غیر جانب دار محقق دین مانتے تھے اور فقہی مسائل میں جہاں دیوبندی اور بریلوی اسکول میں اختلاف نظر آتا انھیں کے قول کو قول فیصل سمجھتے تھے“![۲۹]

حجاز مقدس پر شریف حسین کے بجائے آل سعود کی حکومت قائم ہوئی تو اس کے اثرات ہندوستان پر بھی پڑے، فرنگی محل اور بعض دوسرے علماء کی طرف سے ایک فتویٰ التوائے حج کا شائع ہوا، سید صاحب التوائے حج کے کسی طرح بھی روادار نہ تھے، اس جھگڑے میں، پورے ہندوستان خصوصاً شمالی ہند میں جو قلمی جنگ و پیکار جاری تھی اس کی وجہ سے مولانا محمد علی جوہر کا ”ہمدرد“ اور مولانا ظفر علی خاں کا ”زمیندار“ ایک دوسرے کے مخالف کیمپوں میں تھے اور اپنے اپنے حریف پر الفاظ و معانی کی آگ اور تیر برسا رہے تھے لیکن سید صاحبؒ اس معرکہ میں بھی دونوں کے لیے محترم اور ”ممدوح الطرفین تھے“۔[۳۰]

سید صاحبؒ پاکستان میں لاکمیشن کے ایک رکن نامزد ہوئے تو بقول مولانا مفتی محمد شفیع صاحب:

> "لاکمیشن میں حضرت والا کی شخصیت اس قدر وقیع اور وزنی تھی کہ ان کے چند جملے ججوں کو ساکت اور مطمئن کر جاتے تھے۔"[۳۱]

اس کمیشن میں مفتی شفیع صاحب بھی حضرت سید صاحب کی سفارش اور اصرار پر بحیثیت رکن کمیٹی شامل کر لیے گئے تھے اور قانونی بحثوں میں سید صاحبؒ کی طرف سے "نفس جواب کی اصابت و ایجاز کے بھی مفتی صاحب بہت مداح تھے۔"[۳۲]

افتاء اور توضیح مسائل کے موقعوں پر سید صاحبؒ کی جانب سے مروت یا رعایت کے بجائے جرأت اور صاف گوئی کا طرز عمل سامنے آتا، مفتی عبداللطیف صاحب مفتی ریاست حیدر آباد دکن نے ایک رسالہ صدارت عالیہ اور محکمۂ شرعیہ دولت آصفیہ سے "الاستفتاء" کے نام سے شائع فرمایا اس میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ربا (سود) صرف بیع و شراء ہی میں پایا جاتا ہے، قرض کی صورت میں نفع لینا جائز ہے اور وہ ربا نہیں، مولانا تھانویؒ نے اس کے جواب میں اپنے خواہر زادہ مولانا ظفر احمد تھانوی سے "کشف الدجیٰ عن وجہ الربا" کے نام سے ایک رسالہ لکھوایا اور ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ اس پر علمائے عصر کی تصدیقات بھی حاصل کر لی جائیں، انھوں نے ایک نسخہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی خدمت میں بھی اسی غرض سے بھیجا، اس وقت مولانا تھانوی اور علامہ ندوی کے درمیان کوئی ربط قائم نہیں ہوا تھا، مولانا ندویؒ نے مولانا ظفر احمد کے خط اور رسالے کا جواب مولانا تھانوی ہی کے نام بھیجا جس میں وہ فرماتے ہیں کہ

> "حضرت مستفتی (مولانا عبداللطیف صاحب) میرے استاد و شیخ ہیں یہ رسالہ انھوں نے مجھے حیدر آباد (دکن) میں خود دیکھنے کے لیے دیا تھا اور میں اس کو بغور پڑھنے کے لیے ساتھ لایا تھا پڑھ کر میں نے ان کو ان الفاظ کے ساتھ واپس کیا کہ آپ جس کو مکروہ سمجھتے ہیں میں اس کو عین ربٰو کہتا ہوں اور میرے نزدیک تو قیل و قال و روایت سے زیادہ مستحکم دلیل عمل سلف کرام ہے کہ یہ ایسا اور شدید الاحتیاج مسئلہ ہونے کے باوجود کسی نے اس کو جائز نہیں بتایا اور نہ اس پر کبھی عمل کیا، لفظ بیع و دین و قرض کے اصطلاح سے بڑھ کر لغت کا فیصلہ ہے۔"[۳۳]

سید صاحبؒ کے یہاں یہ جرأت اپنی رائے اور فیصلہ پر نظر ثانی کی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے انھوں نے ایک صاحب کو صحیح فتوی دیا مگر بعد میں انھیں استفتاء اور اس کے جواب کا پوری طرح خیال نہیں رہا۔ وہ مولانا غلام محمد صاحب کے قریبی لوگوں میں تھے چنانچہ ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

> "اگر آپ ان کو جانتے ہوں اور یہ کر سکتے ہوں تو یا تو ان کے پتہ سے مطلع کر دیں یا ان کو یہ خبر کر دیں

کہ جو مسئلہ انھوں نے پوچھا تھا وہ دوبارہ مجھے لکھ کر بھیجیں۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ میں نے ان کے جواب میں غلطی کی ہے۔"[۳۴]

سید صاحبؒ کا یہی اعتراف حق اور خود شکنی اس وقت سامنے آئی جب انھوں نے معارف جنوری ۱۹۴۳ء میں اپنے "رجوع و اعتراف" کا اعلان شائع فرمایا، اس اعلان میں انھوں نے دو فقہی مسائل (زیورات پر وجوب زکوٰۃ اور تصویر کی حرمت) پر اپنی گزشتہ رائے سے رجوع کا اعلان کیا تھا بقیہ دو باتوں کا تعلق معراج نبویؐ اور بقائے نار سے تھا ان میں بھی سید صاحبؒ نے گزشتہ تحقیقات کے بجائے جمہور علماء ہی کے مسلک کی تائید کا واضح اعلان فرمایا، اسی مضمون کے آخر میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے لکھ رہا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ بارالہا مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھ اور جب کبھی تقاضائے بشری سے مجھ سے غلطی ہو تو مجھے متنبہ اور معاف فرما اور مسلمانوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھ اور مجھے راہ ثواب دکھا۔"[۳۵]

سید صاحبؒ اپنی قانونی بصیرت اور شریعت اسلامیہ میں اپنی مہارت کی وجہ سے جدید اور قدیم دونوں حلقوں میں محترم اور باوقار تھے اور ان کی ضرورت ہر جگہ محسوس کی جاتی تھی۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۹ء میں پاکستان میں قرارداد مقاصد پاس ہوئی جس کی رو سے دستور پاکستان کا کتاب و سنت کی روشنی میں ڈھالنا ناگزیر ہو گیا تو اب ان ماہرین کی ضرورت تھی جو دستور اسلامی کے کام کو انجام تک پہنچا سکیں چنانچہ مملکت پاکستان کے ذمہ داران اور مولانا شبیر احمد عثمانی دونوں کی تجویز پر یہ طے ہوا کہ پانچ علماء پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو دستوری سفارشات کو اصول شرع پر قائم اور حدود شرع میں باقی رکھ سکے، اس کے بارے میں علوم قدیمہ و جدیدہ کے جامع علامہ ندویؒ ہی کی طرف نظریں اٹھیں اور مولانا عثمانی نے علامہ ندوی کا اسم گرامی اس بورڈ کی صدارت کے لیے تجویز فرمایا اور سب نے اس بات پر اتفاق کرتے ہوئے اپنے فیصلے کو آخری شکل دے دی اور یہ سب کچھ علامہ کی ایما کے بغیر بامید منظوری ہوا۔[۳۶]

یہاں سید صاحبؒ کے اعزازات کی فہرست پیش کرنا مقصود نہیں صرف یہ بتانا ہے کہ سید صاحبؒ اپنے عہد میں اپنی جامعیت، بلند نظری، حوصلہ و جرأت، قرآن و سنت اور فقہ و علم کلام اور جدید و قدیم سے واقفیت اور اپنی دوسری علمی و اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے، ہندوستان میں فقہ اسلامی میں بھی قیادت اور رہنمائی کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے اور یہی وجہ ہے کہ اہم موقعوں پر ہر جگہ ان کی خدمات سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی۔

فقہ کی تدوین اور تنفیذ سے سید صاحب کا تعلق: ۱۹۳۳ء میں حکومت حیدرآباد نے دارالمصنفین

کو فقہ حنفی کی رو سے ایک ضابطۂ جنایات کی ترتیب و تدوین کی خدمت سپرد کی چنانچہ سابق دولت عثمانیہ (ترکی) کے مجلۃ الاحکام کی طرح یہ قانون جنایات بھی دفعہ وار مرتب کیا گیا اور اس کا مسودہ سید صاحبؒ نے حکومت حیدرآباد کو پیش کیا۔[۳۷] ۳۵ء میں پھر ریاست کے ضابطۂ فوجداری پر شرعی حیثیت سے نظر ثانی کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو حکومت حیدرآباد کی طرف سے ایک سابق جج ہائی کورٹ، مفتی ریاست اور سید صاحب پر مشتمل تھی اس کمیٹی نے ایک مہینے میں اپنا کام پورا کیا۔[۳۸] اس کام کے لیے سید صاحب بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے جزئیات پر نظر ثانی کرتے تھے وہ اس کام کے لیے ایک زندہ کتب خانہ اور حوالے کی ایک جیتی جاگتی کتاب کا کام دیتے تھے۔[۳۹]

نواب حمید اللہ خاں صاحب والی بھوپال نے ان کو دعوت دی کہ وہ ریاست بھوپال کے دار القضا اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ میں کر دیں چنانچہ جون ۴۶ء میں وہ بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ مشرقیہ کے امیر (ڈائرکٹر) کے عہدہ پر مامور ہوئے اس زمانے میں قاضی ریاست کو قانوناً وہی درجہ حاصل تھا جو ہائی کورٹ کے جج کا ہوتا ہے ایک وکیل (ارشد تھانوی) جنھیں سید صاحبؒ کے اجلاس پر بحیثیت وکیل اکثر حاضر ہونا پڑا وہ فرماتے ہیں کہ

"سید صاحب بڑے ٹھنڈے دل سے وکلاء کے دلائل سنتے اور قانونی موشگافیوں پر توجہ دیتے تھے مگر درمیان میں ایسے ایسے سوال ہلکے انداز میں کرتے جاتے تھے جو پر جوش فریق کے استدلات کی راہ میں سنگ آمد و سخت آمد کی حرارت پیدا کر دیتے تھے، سماعت مقدمات کے سلسلے میں قاضی ریاست کو ضابطۂ دیوانی اور ضابطۂ فوجداری کے ضروری اختیارات دیئے گئے تھے جن کو سید صاحبؒ ہمیشہ ان حدود تک استعمال فرماتے تھے جو ایک محتاط قاضی شرع برت سکتا ہے انھوں نے کبھی اجراء وارنٹ یا کسی شخص کی گرفتاری کی نوبت نہیں آنے دی، بایں ہمہ کسی فریق کو حصول انصاف میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات بہت آسانی کے ساتھ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتے تھے اور کبھی کسی ناکام فریق نے یہ شکایت نہیں کی کہ وہ بے انصافی کا شکار ہو گیا، مجلس علماء میں اپیل ہو سکتی تھی مگر میرے علم میں کبھی اس کی نوبت نہیں آئی اور نہ کبھی ان کا فیصلہ منسوخ ہوا زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ انھیں کے اجلاس پر نظر ثانی کی درخواست پیش ہو کر معاملہ اور چھن گیا، ایک دفعہ بہت ہی الجھا ہوا مقدمہ ان کے اجلاس پر پیش تھا اور سابق قاضی صاحبؒ کے زمانے سے مثل مرتب ہوتے ہوتے اتنی ضخیم ہو گئی تھی کہ اس کو پڑھنے کے لئے کئی ہفتوں کی ضرورت ہوتی، فریقین کے وکلاء اور تھے، میں کسی ضرورت سے بیٹھا ہوا تھا، مثل پیش ہوئی، سید صاحبؒ نے پیش کار سے کہا، عرضی دعویٰ نکالئے، اسے پڑھا جواب دعویٰ نکلوا کر دیکھا، ہر دو فریق سے چند سوالات کر کے جواب میں تتمۂ بیان قلم بند کیا اور یہ کہکر کہ اس صورت میں شہادتوں کی ضرورت نہیں، ایک صفحہ کا فیصلہ لکھ کر سنا دیا، عجیب بات یہ ہے کہ فیصلہ سن کر فریقین آپس میں صاف ہو گئے اور ساتھ ساتھ

مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے، میں نے سید صاحبؒ سے کہا، اس صنعت کا نام فن شعر میں سہل ممتنع ہے مسکرا کر فرمایا کبھی کبھی شعر بھی تو کہتا ہوں۔"[۴۰]

سید صاحبؒ پاکستان گئے تو نومبر ۱۹۵۱ء میں دستور ساز اسمبلی کے بنیادی حقوق کی سب کمیٹی کے بھی ممبر مقرر کئے گئے، اس کمیٹی میں ان کا سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ اس کے ارکان کے سامنے بار بار قرآن و سنت کی اہمیت واضح فرمائی چنانچہ کمیٹی کے ممبران کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی اور انھوں نے اپنی رپورٹ میں یہ دفعہ رکھی کہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا جو قرآن اور سنت کے خلاف ہو۔[۴۱] پاکستان کے آئین کے سلسلے میں وہاں کی حکومت نے تعلیمات اسلامیہ بورڈ قائم کیا تھا اور حکومت کے ذمہ داران اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی تجویز پر سید صاحبؒ کی عدم موجودگی ہی میں یہ طے پایا کہ دستوری سفارشات کو اصول شرع پر قائم اور حدود شرع میں باقی رکھنے کے لیے جو بورڈ بنایا جائے اس کی صدارت حضرت سید صاحبؒ کے سپرد کی جائے۔[۴۲] سید صاحبؒ پاکستان تشریف لے گئے تو تعلیمات اسلامیہ کا یہ بورڈ قائم کیا جا چکا تھا اور اس کی صدارت ان کو برابر پیش کی جاتی رہی تھی، وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے لیکن ہجرت کے ستائیس مہینہ کے بعد سید صاحبؒ نے یہ عہدہ کچھ شرائط کے ساتھ قبول فرمایا، وہ اپنے ایک مکتوب گرامی میں فرماتے ہیں کہ "یہ عہدہ دو برس پہلے میرے سامنے پیش کیا گیا تھا مگر میں نے بعض شرائط رکھے تھے وہ اب پورے ہو رہے ہیں یعنی آئین کے ساتھ قانون رائج کی اصلاح کا کام اب شروع ہوا ہے تو میں نے ۲ اگست کو قبول کر لیا تاکہ پورے مسودۂ آئین پر رائے دی جاسکے۔"[۴۳] اس بورڈ کی صدارت کے زمانے میں سید صاحبؒ کے مشوروں کو قبول کیا جاتا رہا جس کا اعتراف یہ کہہ کر کیا گیا کہ

> "انھوں نے تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے صدر کی حیثیت سے پاکستان کے دستور کے متعلق علماء اور جدید پود کی جو رہنمائی فرمائی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم افراط و تفریط سے بچ گئے۔"[۴۴]

۱۹۵۰ء میں پاکستان گورنمنٹ نے لا کمیشن مقرر کیا جس کا فریضہ یہ تھا کہ وہ مروجہ قانون پر نظر ثانی کر کے اس کو اسلامی قانون کے حصار میں لے آئے، علامہ ندویؒ بھی کمیشن کے ایک رکن تھے اور اس میں رہ کر انھوں نے خاموشی کے ساتھ مگر ٹھوس کارنامہ انجام دیا۔[۴۵] سید صاحبؒ کا جب انتقال ہوا تو اس کمیشن کے صدر چیف جسٹس پاکستان ابوصالح محمد اکرام نے فرمایا کہ

> "مولانا ندویؒ قانون کمیشن کے رکن تھے، حکومت پاکستان نے یہ کمیشن ملک کی عدالتوں میں اسلامی قانون جاری کرنے کے سلسلے میں مقرر کیا تھا ان کی موت نے ہمیں جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔"[۴۶]

سید صاحبؒ نے فقہ اسلامی کی تدوین اور اس کے نفاذ کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیں یہ ان کا مختصر خاکہ ہے۔ انھوں نے جب کبھی ضرورت پڑی، ''بدور کے تقاضوں کے مطابق اہم شرعی مسائل پر اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا اور فقہی سوالات کے واضح جوابات بھی دیے، درج ذیل سطروں میں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

اردو میں خطبۂ جمعہ: سید صاحبؒ نے ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس ہفتم منعقدہ کلکتہ کی صدارت کی، اس موقع پر مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور دوسرے بڑے علما بھی شریک اجلاس تھے، اس اجلاس میں حضرت سید صاحبؒ نے جو خطبۂ صدارت پڑھا اس میں انھوں نے اردو میں خطبۂ جمعہ پر بھی روشنی ڈالی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

"جمعہ کے خطبوں کی اصلاح بھی ضروری ہے، اہل حدیث اصحاب اور بہت سے علماء نے تو اردو میں خطبہ دینے کے جواز کو تسلیم کر لیا ہے تاہم بہت سے علماء کو صرف اردو زبان میں خطبہ دینے میں تامل ہے اگر اتنا بھی تسلیم کر لیا جائے کہ عربی کے ساتھ ساتھ اردو میں دینا جائز ہے تو بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔ کسی اختلافی مسئلہ کو چھیڑنے کا جرم عائد نہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ غیر مجوزین کے پاس سوائے عمل سلف کے غیر عربی زبان میں خطبہ کے عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ عمل سلف کے استدلال کے متعلق عرض ہے کہ طریق سلف کے مطابق خطبہ میں حسب ذیل خصوصیتیں ہوتی تھیں: وہ عربی زبان میں ہوتا تھا، وہ زبانی پڑھا جاتا تھا کسی کتاب میں دیکھ کر نہیں پڑھا جاتا تھا اس کی صورت تلاوت اور قرأت کی نہیں ہوتی تھی بلکہ مختصر زبانی تقریر کی ہوتی تھی اس میں آیات و احادیث کے التزام کے ساتھ مسائل حاضرہ و متجددہ پر مسلمانوں کی فہمائش ہوتی تھی ایک خطبہ لکھا یا رٹا ہوا صدیوں تک نہیں پڑھا گیا، وہ سلاطین کی مدح و ستائش سے پاک ہوتا تھا اس میں تغنی نہیں ہوتی تھی وہ مقفع و مسجع بے معنی عبارت نہیں ہوتی تھی مگر ان تمام خصوصیات کو تو بلا نکیر ترک کر دینا اور صرف عربی کی خصوصیت پر زور دینا قرین صواب نہیں اگر عربی کی قید نہ رہے تو حصول فوائد کے علاوہ محض ایک بدعت کو قبول کر کے متعدد بدعات سے ہم محفوظ ہو جائیں گے۔"[۴۷]

نابالغ کا نکاح: مولانا عبد الماجد دریابادی کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ "نصوص شرعی کے اشارات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عدم بلوغ کے غیر مستحسن نکاح سے لوگوں کو روکا جائے تو مسلمانوں کا امام ایسا کر سکتا ہے مگر غیر مسلم حکومت میں ایسا نہیں ہو سکتا بجز اس کے کہ مسلمان قضاۃ کا تقرر ہو اور وہ اسلامی مصالح کی بناء پر کوئی حکم دیں اور اس پر کوئی تعزیر جاری کریں مگر نکاح اور اس کے لوازم ناجائز نہیں ہو سکتے۔"[۴۸]

لاؤڈ اسپیکر پر نماز: ۱۹۴۹ء میں سید صاحبؒ نے حج کے لیے حجاز مقدس کا سفر کیا، مکہ معظمہ میں

لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہوتی ہے سید صاحبؒ نے بھی لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے جواز کا فتویٰ اس وقت دیا تھا جب کہ ہندوستان کا کوئی مشہور عالم اس کا قائل نہ تھا وہ جانتے تھے کہ علماء حجاز اس کے جواز کے قائل ہیں اس میں مستحکم دلائل کے بجائے عصری تقاضوں اور دباؤ کی زیادہ آمیزش ہے مرکز اسلام میں دینی امور میں یہ سطحیت سید صاحبؒ کے لیے تکلیف دہ تھی چنانچہ اس کی اصلاح کے لیے یہ حکیمانہ طرز اختیار فرمایا کہ خود اس بارے میں ایک استفتاء مرتب فرما کر علمائے حجاز سے اس پر فتویٰ طلب فرمایا۔ فتوے جواز کے آئے مگر دلیلیں نہایت ناقص تھیں بعض نے اس کے استعمال کو نماز میں عینک کے استعمال پر قیاس کرتے ہوئے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔

سید صاحبؒ چونکہ مستفتی تھے ان کے لیے فتویٰ لکھنا تو مناسب نہ تھا اس لیے انھوں نے مولانا ظفر احمد عثمانی سے (جو پاکستان سے شریک حج ہوئے تھے) یہ فرمایا کہ وہ جواب تحریر فرمائیں، مولانا نے فقہی دلائل کے ساتھ جواز کا فتویٰ لکھا، سید صاحبؒ نے یہ جواب علمائے حجاز کی خدمت میں پیش کر کے ان سے فرمایا کہ آپ حضرات مرکز اسلام میں رہتے ہیں اس لیے فقہی مسائل میں آپ کو زیادہ محتاط رہنا چاہیئے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنے سفر حج سے واپسی پر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

"حضرت سید صاحبؒ نے تو علمائے حجاز میں تہلکہ مچا دیا۔"[۴۹]

رویت ہلال کا اعلان : رویت ہلال کا ثبوت شرعی ہو جانے کے بعد ریڈیو یا ٹیلی فون سے اس کے اعلان کو بھی ثبوت شرعی کے معیار پر پورا اترنا چاہیئے یا نہیں ؟ اس کے متعلق بعض حلقوں نے یہ بات کہی کہ یہ آلات جدیدہ شہادت کے قائم مقام نہیں ہیں یا یہ بات کہ یہ آلات، ذرائع شہادت کے قائم مقام نہیں ہیں۔ لیکن سید ملت کی فقیہانہ نکتہ سنجی کے مطابق ان اعلانات کو شہادت نہیں بلکہ نتیجۂ شہادت سمجھنا چاہیئے ان کی حیثیت قضائے قاضی کے فیصلے اور اعلان کی ہے جس کے لیے شہادت کے مطلوبہ معیار کے پائے جانے کی ضرورت نہیں، چنانچہ ایک استفسار کے جواب میں فرماتے ہیں کہ

"۱۔ کوئی قاضی ریاست اسلامیہ یا غیر اسلامی ریاست میں مسلمانوں کا مقرر کردہ قاضی یا امام شرعی شہادت لینے کے بعد رویت ہلال صوم یا فطر کا اعلان بذریعہ ریڈیو یا تار، ٹیلی فون کرے تو اس کے قضاء کے مطابق عمل کرنا درست ہے کیونکہ یہ شہادت نہیں بلکہ نتیجۂ شہادت ہے، قضاء قاضی کا اعلان ہے مگر ضرورت ہے کہ ان آلات نشر کی پوری نگرانی کی جائے اور اس کا سارا کام مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائے۔

۲۔ رویت ہلال کا فیصلہ اور اعلان کرنے کے لیے تنہا عالم دین یا امام جامع مسجد ہونا کافی نہیں، اس کا مسلمانوں کی جماعت کا مقرر کردہ یا عملاً مسلّم (تسلیم کیا ہوا) ہونا ضروری ہے اگر ایسا شخص ہلال فطر اور ہلال صوم کی شہادت شرعی لے کر کسی آلۂ نشر سے شائع کرے یا ٹیلی فون سے ارسال کرے تو اس کے مطابق عمل کرنا

درست ہے جب کہ آج بھی توپ یا گولہ یا نقارہ یا گھنٹہ سے ہلال یا چاند کے طلوع و غروب کا اعلان حکومت یا کسی مسلمہ جماعت کی طرف سے کیا جاتا ہے اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ سید سلیمان ۲۱ اگست ۱۹۳۶ء از ریاست بھوپال“[۵۰]

کفو کا مسئلہ: سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اسلام میں نسل و نسب اور ذات پات کی تفریق نہیں ہے بلکہ وہی مسلمان بہتر ہے جو صاحب تقویٰ ہو مگر شادی کو کامیاب بنانے کی خاطر کفوء کو ترجیح دی گئی، کفو کے معنیٰ ذات کے نہیں ہم معاشرہ (معاشرتی اعتبار سے برابر ہونے) کے ہیں مثلاً مدینہ کے سید اور سندھ کے سید دونوں سید ہیں مگر دونوں زبان لباس کھانے پینے کے لحاظ سے بالکل ایک دوسرے سے جدا ہیں اسی طرح مدینہ کے ملک اور پنجاب کے ملک معاشرتی لحاظ سے بالکل جدا ہیں اور ایسی شادی کی کامیابی کی توقع نہیں کی جاسکتی اس لیے ہم معاشرہ میں شادی کو ترجیح دی گئی۔“[۵۱]

سیرۃ النبیؐ اور اپنے مقالات (حقوق نسواں) میں سید صاحبؒ نے کفوء کے مسئلہ اور اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔

طلاق مکرہ: شوہر کو زبردستی مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور اس نے بجبر و اکراہ طلاق دے دی تو امام ابو حنیفہؒ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی لیکن امام مالک اور اکثر اصحاب حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہوگی اس پر سید صاحبؒ اپنی کتاب حیات مالک کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ

”اس مسئلہ کے متعلق مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی کا ایک مناظرہ یاد آگیا ہمارے استاد فقہ مولانا مفتی عبداللطیف صاحب مدرس اول دار العلوم ہیں...... طلاق مکرہ کے مسئلہ میں ہماری جماعت میں اختلاف ہوا میرے سوا تمام طلبہ وقوع کے قائل تھے میں حضرت عائشہؓ کی حدیث (لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق: حالت جبر و اکراہ، میں طلاق و عتاق نہیں) پیش کرتا تھا اور ان کی طرف سے ثلاث جدھن وھزلھن سواء (تین چیزوں میں اظہار واقعیت اور مذاق دونوں برابر ہیں۔ ان میں سے ایک طلاق بھی ہے) کی حدیث پیش کی جاتی تھی۔ میں کہتا تھا کہ طلاق مکرہ نہ جد (واقعیت) ہے نہ ہزل (مذاق) ہے۔ ہزل تو متفقاً نہیں ہے مگر جد بھی نہیں ہے کیونکہ جد نام ہے خواہش حقیقی و واقعی کے اظہار کا جو بحالت اکراہ غیر ممکن ہے۔ بالآخر یہ معاملہ جناب مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ مفتی صاحب نے استدلال عقلی کے طور پر فرمایا کہ زبان سے لفظ طلاق ادا کرنا انسان کا ایک فعل ہے اور افعال کا اثر محتاج نیت و ارادہ و اظہار واقعیت وغیر واقعیت نہیں ہے مثلاً اگر کسی کو تم ایک طمانچہ مارو جو تمہارے ہاتھ کا ایک فعل ہے تو اس کا اثر یعنی چوٹ اور صدمہ محسوس اور واقع ہوگا خواہ مارنے والے کے لیے تمہارا ارادہ و خواہش واقعی ہو یا نہ ہو، اسی طرح لفظ طلاق کے نطق کا جو اثر ہے وہ ہر حال میں واقع ہوگا۔ اس استدلال کو سن کر میں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا لیکن پھر علی الفور خدا نے مجھے ایک حجت القا کر دی، میں نے عرض کیا کہ افعال کے اثر دو قسم کے ہیں:

اعتباری و واقعی۔ واقعی وہ جو ہماری تسلیم و اعتبار پر موقوف نہ ہو بلکہ وہ حقیقتاً بلا اعتبار معتبر ہو مثلاً ضرب کے لیے احساس صدمہ۔ دوسرا اعتباری، اگر اعتبار کیجئے تو اثر ہے اور نہ اعتبار کیجئے تو اثر نہیں ہے مثلاً ایک مجنوں کی لفظ طلاق کے ساتھ حرکت زبان، اگر شرع اعتبار کرے تو طلاق ہے نہ اعتبار کرے تو طلاق نہیں ہے اس لیے بجائے استدلال عقلی کے صرف یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ مکرہ کے اس فعل کے اس اثر کا شریعت اعتبار کرتی ہے یا نہیں، اور اس کا فیصلہ حدیث عائشہؓ نے کر دیا کہ نہیں کرتی۔"[۵۲]

مصارف زکوٰۃ اور تملیک: قرآن مجید میں انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها الآیۃ میں جو مصارف زکوٰۃ بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک مصرف فی سبیل اللہ بھی ہے اکثر فقہاء کے نزدیک اس سے جہاد بالسیف مراد ہے لیکن سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ

> "یہ تحدید درست نہیں معلوم ہوتی (اس سے پہلے کی اِس آیت) للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے۔"

سید صاحبؒ نے یہاں ایک اور مسئلہ کی بھی وضاحت کر دی ہے اہل مدارس میں حیلۂ تملیک کا رواج ہے اور اس کے عجیب و غریب طریقے اپنائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، سید صاحبؒ نے مذکورہ بالا آیت کے سلسلے میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ

> "اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے مگر ان کا استدلال جو للفقراء کے لام تملیک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو جیسے ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا۔"[۵۳]

یہ چند مثالیں جو یہاں پیش کی گئیں وہ ان مسائل پر ہیں دعوت فکر دیتی ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ عقلی جمود کے قائل نہ تھے بلکہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی طرح مسائل پر آزادانہ غور و فکر کر کے رائے قائم فرماتے اور جس طرح کہ شاہ صاحبؒ اپنے چند تفردات کے باوجود حنفی ہیں اسی طرح سید صاحبؒ بھی عملی طور پر حنفی مسلک ہی کے پیرو رہے جہاں تحقیق کا موقع نہ ملتا وہ حنفی مسلک ہی پر عمل کرتے لیکن وہ متاخرین کے مقلد نہ تھے، سلف کے متبع تھے جہاں بعض بعض مسائل میں اپنے امام سے ہٹ کر دوسرے امام کی رائے کو اختیار کرنے کو جرم نہیں سمجھا جاتا تھا اور تمام ہی محقق علماء کے یہاں اس کی مثالیں دستیاب ہیں، سید صاحبؒ کے یہاں جو تحقیقی نقطۂ نظر ملتا ہے اس کی وجہ سے بقول مولانا گیلانی:

> "جس جس موضوع پر سید صاحبؒ نے قلم اٹھایا ہے اس میں نئے معلومات یا نئے نقاط نظر سے دنیا کو روشناس کیا ہے۔۔۔۔ ان کی تعداد لاکھوں نہیں تو ہزاروں تک ضرور پہونچ جائے گی، بڑے بڑے مصنفین ن

کتابوں میں بمشکل گنی چنی چند ہی نئی چیزیں ہاتھ آتی ہیں لیکن سید صاحبؒ کی کتابوں میں قدم قدم پر نئے انکشافات اچھوتے معلومات سے پڑھنے والوں کا دامن تحقیق بھرتا چلا جاتا ہے۔"

مولانا گیلانی کی رائے میں قرآن وحدیث کلام و تصوف، تاریخ اسلام اور دوسرے موضوعات کے علاوہ سید صاحبؒ کی ان تحقیقات اور نئے نئے انکشافات کا تعلق فقہ سے بھی ہے۔[۵۴]

وہ اپنی تحقیقات و آراء میں تعصب اور تحزّب (گروہ بندی) سے دور رہتے ہیں چنانچہ ایک خط میں اس کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"تحزّب (گروہ بندی) اور تعصب للتحزّب (گروہی عصبیت) مدارس کی طرح جماعتوں کا بھی پسندیدہ نہیں ہندوؤں کے خوش کرنے کے لئے اسلامی نظریات سے اعراض کفر ہے لیکن ہندوؤں کے ساتھ انصاف برتنا اور وطن کے مختلف عناصر میں صلح و معاہدہ، خلاف شرع نہیں اور نہ بحکم شرع ان سے حسن مفاہمت اور حسن مجاورت و مجاملت ممنوع ہے۔"[۵۵]

موجودہ حالات میں فقہ اسلامی کی ضرورت: سید صاحبؒ نے موجودہ حالات میں فقہ اسلامی کی ضرورت بھی واضح کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ "اسلام کے قانون کی بنیاد کتاب وسنت اور ان سے ماخوذ ائمہ سلف کی فقہ ہے یہ کہنا کہ اسلامی فقہ موجودہ سلطنتوں کے لئے ناکافی ہے انتہائی جہالت ہے ابھی ہماری نئی سلطنتیں تو چوتھائی صدی کی عمر بھی بسر نہیں کر سکی ہیں لیکن ہماری گذشتہ سلطنتیں جو صدہا سال سے دنیا کے طول و عرض میں قائم رہیں اور ان کا مدار انھیں اسلامی قانون پر رہا اور انھوں نے وہ عروج و ترقی حاصل کی اور وہ عدل و انصاف اور رعایا کی خوش حالی اور فارغ البالی کا سامان کیا جس کی نظیر موجودہ سلطنتوں میں بھی نہیں مل سکتی۔ خلافت راشدہ، خلافت بنو امیہ اور خلافت عباسیہ میں جب تک دم رہا براہ راست کتاب وسنت اور ائمہ کے فیصلوں پر عمل رہا لیکن تیسری صدی کے بعد سے جب فقہی فرقے پیدا ہوئے اور تقلید کا آغاز ہوا تب بھی شافعی مالکی اور حنفی فقہیں بڑی بڑی سلطنتوں کا قانون رہیں۔ اسپین اور مراکش، مغرب کی عظیم الشان سلطنتیں فقہ مالکی پر چلیں، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی حکومت فقہ شافعی پر قائم تھی، سلجوقیوں، مصری چرکسیوں، عثمانی ترکوں اور مغلوں اور پٹھانوں کی تمام سلطنتیں فقہ حنفی کے اصولوں پر حکمراں رہیں مگر ان کی دنیاوی ترقیوں فتوحات مالی خوشیوں اور عدل و انصاف میں یہ اسلامی قانون کبھی عائق نہیں ہوئے۔"[۵۶]

سید صاحبؒ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ "اسلامی سلطنتوں میں کبھی ظلم بھی ہوئے مگر یقیناً یہ اسلامی قانون کے ماننے سے نہیں ہوئے بلکہ ان کے نہ ماننے سے ہوئے۔ وہ مظالم قانون پر عمل کرنے کے نہیں بلکہ قانون کے توڑنے کے نتائج ہیں خصوصاً ترکی تاتاری اور مغل سلاطین کہ انھوں نے فقہ اسلامی کے ساتھ ساتھ مسلمان

ہو جانے کے باوجود بھی چنگیز و ہلاکو کے سیاست نامہ کو نہیں چھوڑا اور اس کے لئے جب کبھی ایماندار اور بہادر علماء کا وجود ہوا انھوں نے ایمانی شجاعت کے ساتھ سلاطین کا مقابلہ کیا۔

بہر حال یہ سلطنتیں گو پوری پوری شریعت اسلامیہ پر عامل نہیں رہیں تاہم وہ کامیاب رہیں تو اگر وہ حقیقت میں اسلامی قانون پر کاربند ہوتیں اور سلاطین اپنے کو مطلق العنان نہ سمجھتے بلکہ قانونِ الٰہی کے پابند رہتے تو ان کی ترقی اور عدل و انصاف کے نمونے خدا جانے کیا کیا ہوتے، ہمارے جدید ارکانِ سلطنت کو یہ دھوکہ ہے کہ ہماری سلطنتیں اسلامی قانون کی پابندی سے برباد ہوئیں حالانکہ وہ ان کے سلاطین کی مطلق العنانیوں، اسلامی قوانین کی عدم متابعت اور اسلامی اصول سلطنت کو نہ برقرار رکھنے سے تہ و بالا ہوئیں۔“[۵۷]

نئے نئے مسائل کے پیشِ نظر ہماری ذمہ داریاں: سید صاحبؒ کے نزدیک، نئے نئے مسائل کے حل کرنے کی ذمہ داری ہم پر ہے ورنہ اسلامی فقہ ہماری رہنمائی کے لیے ہر طرح سے کافی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

”ہمارے نوجوان ارکان سلطنت کہتے ہیں کہ آج ہم کو نئی نئی ضرورتیں درپیش ہیں، نئے نئے مسائل سامنے ہیں نئے نئے معاملات اور معاملات کی نئی نئی صورتیں آ گئے ہیں جن کا جواب ہم کو اسلامی قانون سے نہیں ملتا لیکن اس کی وجہ تو یہ ہے کہ آپ نے ہماری پرانی سلطنتوں کی طرح علمائے مجتہدین کے پیدا کرنے کا سامان نہیں کیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کی سلطنت کی ضروریات ہارون رشید کی سلطنت کی ضروریات کے بالکل برابر تھیں، زمانے کے ہر قدم کے ساتھ معاملات کے نقشے بھی بدلتے رہتے ہیں، مگر ہارون رشید کے ساتھ قاضی ابو یوسف کا بھی وجود تھا۔“[۵۸]

ہندوستان میں امارت شرعیہ کی ضرورت: جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے محکوم نظر آتے ہیں ان میں قومی تعمیر اور تنظیم ملی کا آغاز کس طرح کیا جائے، تعمیر ملت کے لیے ہماری منصوبہ بندی کس نوعیت کی ہو اس بارہ میں اصول اور فروع میں فرق کرنا ضروری ہے۔ آغاز کار کے طور پر یا بنیادی اہمیت کے لحاظ سے اصل کرنے کا کام کیا ہے جس سے آہستہ آہستہ تمام مشکلات کے حل کی راہیں آسان ہوتی چلی جائیں اور ملت کی تعمیر بھی مستحکم سے مستحکم تر ہو کر رہے مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ

”مسلمانوں کی حقیقی اصلی جوہری تنظیم وہی ہے جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے قائم ہوئی تھی اور وہ یہ ہے کہ ہر ایسے ملک میں جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں اور اکثریت بھی نہیں ایک امارت یا امامت قائم کی جائے، خاص قواعد شرعی کے ساتھ انتخاب ہو اس کے لیے ایک مجلس شوریٰ ہو اور تمام افراد اس کے ہاتھ پر بیعت ہوں اور اس کے ہر شرعی حکم کو واجب التعمیل سمجھیں جس کا مخالف مذہباً عاصی اور گنہگار اور ملت کے رشتے سے کٹ جانے والا ہو گا۔“[۵۹]

سید صاحبؒ نے اسلامی تاریخ کا جائزہ لے کر تفصیل سے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ مسلمانوں نے تاریخ کے ہر دور میں "اپنی محکومی اور عدم استطاعت کی حالت میں بھی ایک نوع کی تنظیمی مرکزیت قائم رکھی۔ ایران خراسان ترکستان و عراق پر تاتاریوں نے قبضہ کیا تب بھی اور چین کے شہر خانقو میں مسلمان تاجروں کی ایک نوآبادی قائم ہوگئی اس وقت بھی، اور ہندوستان کے مختلف ساحلی شہروں میں بھی جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادیاں تھیں غیر اسلامی اقتدار کے ماتحت مسلمان اپنی تنظیم اور قضا کے ذمہ دار نظر آتے ہیں، کامل امامت کے لیے کامل اقتدار اعلیٰ کی شرط ہے لیکن دوسروں کی ماتحتی میں محدود قسم کے امارت یا امامت قائم کرنی بھی ضروری ہے جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں میں بیان کیا گیا" سید صاحبؒ کے نزدیک

"اس قسم کے نظم ملت سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کی وحدت ملی نمایاں ہو، ان کے تمام مذہبی و ملی کام ایک نظم کے ساتھ ہوں انکی ضرورتیں پوری ہوں ان کے مصارف و مداخل ملی میں ایک تنظیم پیدا ہو اور اصل جماعتی روح ان میں نمایاں ہو۔ دار الافتاء، دار القضاء اور بیت المال کا قیام ہو ان کے غریبوں اور محتاجوں کی باقاعدہ امداد ہو، ان کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح ہو، تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ قائم ہو، ان کے مکاتب و مدارس عالیہ مالی نزاع سے نجات پائیں"۔[60]

سید صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ نظم ملت یا امارت کے نہ ہونے کی وجہ سے پوری ملت انتشار سے دوچار ہے اور اس کے تمام مسائل روز بروز بھیانک شکل اختیار کرتے جارہے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

"اس نظم ملت کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے تمام اعلیٰ و ادنیٰ طبقے، نکاح و طلاق و وراثت کی سخت معاشرتی مشکلات میں ہیں، آج کل آپ میں سے جن اصحاب کے پاس ملک کے اطراف سے فتوے آتے ہوں وہ گواہی دیں گے کہ اعلیٰ طبقے کی عورتیں خلع کے رواج پذیر نہ ہونے کے باعث کس قدر مصیبت میں ہوتی ہیں۔ ظالم شوہروں سے نجات پانے کے لیے انتہا یہ ہے کہ اعلیٰ خاندان کی عورتیں شومیٔ قسمت سے تبدیل مذہب تک کی جرأت کرلیتی ہیں۔ نیچے طبقہ کی مسلمان عورتوں میں فوری و بدعی طلاق کی صورتیں، مفقود الخبری، عدم ادائے نفقہ اور فسخ نکاح کی متعدد صورتیں پیش آتی ہیں جن کے علاج سے ہم اس نظم و امارت کے بغیر قطعاً مجبور ہیں۔ کیا امت محمدیہ کی یہ حالت علمائے کرام اور مسلمانوں کی توجہ کے لائق نہیں۔ اوقاف کی بے ترتیبی مساجد کی کس مپرسی، اماموں کی جہالت اصلاح کی محتاج نہیں؟ جدید اقتصادی و مالی مشکلات کو حل کرنا بھی نظم ملت کے فرائض میں ہے وغیرہ وغیرہ"۔[61]

سید صاحبؒ نے نظم ملت اور قیام امارت کے بارے میں یہ باتیں ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس ہفتم کلکتہ میں بحیثیت صدر اجلاس اپنے خطبۂ صدارت میں بیان کی تھیں، اب حالات میں تبدیلی اور

ضرورتوں میں اضافے کی وجہ سے قیام امارت کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

پیش نظر موضوعات: اردو زبان میں اشتراکیت اور اسلام کے اقتصادی نظام پر غالباً سب سے پہلے سید صاحبؒ ہی نے قلم اٹھایا تھا، انھوں نے الندوہ (۱۹۱۱ء) میں اشتراکیت اور اسلام کے عنوان سے ایک محققانہ مضمون لکھا جس میں اشتراکیت پر سخت تنقید کی گئی ہے اور اس کے مقابلے میں اسلام کے معاشی نظام کی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن سید صاحبؒ اسلامی قانون کے اجتماعی مسائل پر زیادہ وسیع انداز میں کام کرنے کا ارادہ کئے ہوئے تھے اور ان کے پیش نظر یہ تھا کہ اسلام کے سیاسی قانونی معاشی اور دوسرے اجتماعی پہلوؤں پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کی روشنی میں وہ سیرۃ النبی جلد ہفتم میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے سیرۃ النبی جلد ہفتم کے مقدمے، اور معارف کے بعض شذرات سے ان کے وسیع خاکہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں عراق سے لے کر الجزائر تک بیس ملکوں کے علماء اور اہل علم کی جو کانفرنس پاکستان میں "احتفال علماء" کے عنوان سے منعقد ہوئی اس کے پہلے اجلاس کی سید صاحبؒ نے صدارت فرمائی اور اپنے صدارتی خطاب میں سید صاحبؒ نے احتفال علماء کے جو اغراض و مقاصد بتائے ان میں سے دو اہم نکات یہ تھے:

۵- دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق فقہ اسلامی کی تحقیق و تدوین کے لیے ادارہ کا قیام۔

۶- ممالک اسلامیہ کے مروجہ شہری و ملکی قوانین کی جگہ فقہ اسلامی کی ترویج کے لیے موثر جدوجہد کرنا۔[۶۲]

سید صاحبؒ کے ذہن میں قرآن مجید کے مسائل کی ترتیب و تدوین کا ایک تفصیلی خاکہ تھا چنانچہ "فقہ القرآن" کے موضوع پر انھوں نے اپنے ایک عزیز شاگرد (اور ہمارے استاد) مولانا محمد اویس ندوی نگرامی مرحوم سے قرآن مجید کی آیاتِ احکام کو جمع کروایا تھا۔ سید صاحبؒ کا یہ بھی خیال تھا کہ آیات قرآنی کی حیثیت کلیات کی ہے اور احادیث نبویؐ انھیں کلیات کی تشریح ہیں اس لیے سید صاحبؒ کی رائے یہ تھی کہ دقت نظر سے مطالعہ کر کے قرآن مجید سے آیات کو جو کلیات کی حیثیت رکھتی ہیں ان کو تشریحی احادیث کے ساتھ جمع کر دیا جائے۔ اس موضوع سے متعلق سید صاحبؒ نے اپنی یادداشت کی کاپی میں دو عنوان قائم کئے تھے۔

۱- الاستدلالات التی استدل بھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ما قالہ اور اس کے ذیل میں سید صاحبؒ نے ۵۰ استدلالات نبوی کو جمع فرمایا تھا۔

۲- القسم الثانی من الاحادیث التی تفسر القرآن بغیر ذکر القرآن[۶۳]

سید صاحبؒ کی یہ خواہش بھی تھی کہ اسلام کے نظام کاشتکاری اور کتب فقہ سے زراعت اور آبپاشی کے مسائل کو یکجا کر دیا جائے پھر مولانا تھانویؒ سے اس کا ذکر آیا تو یہ طے پایا کہ شروع سے پورے سلسلۂ فقہ کو اردو میں مدون کر دیا جائے، سید صاحبؒ کو اس سلسلے کی تکمیل کا بے حد خیال تھا۔ اپنی وفات سے چند[۶۴]

پیشتر جب ہندوستان تشریف لائے تو بار بار فرماتے کہ

> " اس وقت نئے نئے مسائل سامنے آرہے ہیں اور ایسے علماء کی ضرورت ہے جو ان مسائل کا تشفی بخش جواب دے سکیں، اس لیے فقہ کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ کرنا چاہیے۔ "

انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے طلبہ کے سامنے جو تقریر فرمائی اس میں بھی اس بات کی طرف متوجہ فرمایا۔[٦٣]

سید صاحبؒ کے فقہی مقالات: سید صاحبؒ نے جو سیکڑوں علمی اور تحقیقی مقالات لکھے ان میں ستر مقالات کا تعلق فقہی موضوعات و مسائل سے ہے یہ مضامین اسلام کے انفرادی و اجتماعی امور، معاشرت اور معاملات، بعض جزئی مسائل اور چند اصولی احکام سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اپنے وقت کے مشہور و معروف رسائل "الہلال" "البلاغ" کلکتہ، "الجامعہ" مونگیر، "الندوہ" لکھنؤ، "مستقبل" کراچی اور "معارف" اعظم گڑھ میں شائع ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر مضامین وہ ہیں جن میں عصری ضرورتوں کے پیش نظر فقہ اسلامی کی توضیح و تشریح اور تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مضامین سے سید صاحبؒ کی فقہ اسلامی سے گہری واقفیت اور ان کی بصیرت اور مہارت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سید صاحبؒ نے مختلف مسائل اور معاملات میں فقہ اسلامی کی روشنی میں جو رہنمائی فرمائی ہے اس کی افادیت و اہمیت میں اب اور زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کو جلد از جلد، مختلف جلدوں میں، شایع کیا جائے تاکہ ملت اسلامیہ، سید ملتؒ کے آراء و افکار کے سلسلے میں ان سے بھی استفادہ کر سکے۔

○

حوالہ جات:

(۱) حیات امام مالک ص ۴۷
(۲) الندوہ نومبر ۱۹۴۰ء
(۳و۴) تذکرۂ سلیمان ص ۸۹
(۵) سیرت النبی ج ۴، ص ۱۳۱
(۶) مقدمہ تراجم علماء اہل حدیث ص ۳۴
(۷) خطبۂ صدارت اجلاس ہفتم جمعیۃ علماء ہند منعقدہ کلکتہ سنہ ۱۹۲۶ء ص ۲۸
(۸) معارف جنوری ۱۹۴۳ء
(۹) دیباچہ مکتوبات سلیمانی ج ۱، ص ۱
(۱۰) حیات امام مالک ص ۴۷
(۱۱) معارف سلیمان نمبر ص ۱۳۶
(۱۲) مکاتیب سلیمان ص ۱۳۱-۱۳۲
(۱۳) تذکرۂ سلیمان ص ۳۶۴
(۱۴ تا ۱۶) مکاتیب سلیمان ص ۲۱۷، ۲۲۹، ۱۱۵
(۱۷) معارف سلیمان نمبر ص ۱۵۱

(۱۸ و ۱۹) ریاض سلیمان نمبر مارچ ۱۹۵۴ء، ص ۳۱ و ۳۴-۳۵ (۲۰) برہان دسمبر ۱۹۸۴ء مضمون غلام محمد صاحب

(۲۱) حیاتِ شبلی ص ۱۸ (۲۲) برہان دسمبر ۱۹۸۳ء (۲۳) مکاتیب سلیمان ص ۱۶۲

(۲۴) کلمات طیبات ص ۱۶۱ (۲۵) المقالۃ الوضیئۃ فی الوصیۃ والنصیحۃ

(۲۶) حجۃ اللہ البالغۃ ص ۹ (۲۷) فیوض الحرمین ص ۴۹ (۲۸) ریاض سلیمان نمبر ص ۷۷

(۲۹) تذکرہ سلیمان ص ۳۸۱ (۳۰) مکتوبات سلیمانی حواشی ص ۶۲۴، ۶۲۵

(۳۱ تا ۳۴) تذکرہ سلیمان ۲۴۲، ۸۳-۸۵، ۵۴۶ (۳۵) ایضاً ص ۱۴۵ و معارف جنوری ۱۹۴۳ء

(۳۶) ریاض سلیمان نمبر ص ۱۳۴ (۳۷ و ۳۸) معارف سلیمان نمبر ص ۲۶ و ۲۹ (۳۹ و ۴۰) ریاض سلیمان نمبر ص ۳۴، ۶۳

(۴۱) معارف سلیمان نمبر ص ۴۳ (۴۲) ریاض سلیمان نمبر ص ۱۳۴ (۴۳ و ۴۴) معارف سلیمان نمبر ص ۴۴، ۲۹۴

(۴۵) ریاض سلیمان نمبر ص ۱۳۷ (۴۶) معارف سلیمان نمبر ص ۳۹۱

(۴۷) خطبۂ صدارت اجلاس ہفتم جمعیۃ علماء ہند منعقدہ کلکتہ ۱۹۲۶ء ص ۵۹-۶۰

(۴۸) مکتوبات سلیمانی ج ۱، ص ۲۵۲ (۴۹) تذکرہ سلیمان ص ۲۰۸ (۵۰) معارف سلیمان نمبر ص ۳۲۱

(۵۱) مجلہ بیاد علامہ سید سلیمان ندوی نومبر ۱۹۷۶ء، ص ۴۴ (۵۲) حیاتِ امام مالک، حاشیہ ص ۴۷-۴۸

(۵۳) سیرۃ النبی ج ۵ (۵۴) معارف سلیمان نمبر ص ۲۱۶ (۵۵۵) مکاتیب سلیمان ص ۱۸۶

(۵۶ تا ۶۱) خطبۂ صدارت اجلاس ہفتم جمعیۃ علماء ہند منعقدہ کلکتہ ۱۹۲۶ء، ص ۳۰، ۳۱-۳۲، ۱۵، ۵۷-۵۹

(۶۲) ریاض سلیمان نمبر ص ۱۴۱-۱۴۲ (۶۳ و ۶۴) معارف سلیمان نمبر ص ۲۴۷، ۲۴۹

ظفر الاسلام ★

احکام شرعی کا تدریجی نزول

سیرۃ النبیؐ کی روشنی میں

سید سلیمان ندویؒ کی علمی تخلیقات میں "سیرۃ النبیؐ" بجا طور پر ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ سید صاحبؒ نے اپنی مرتب کردہ جلدوں میں نہ صرف یہ کہ مصنف اوّل اور اپنے استاد گرامی علامہ شبلیؒ کے طریق تحقیق، انداز بیان اور اسلوب نگارش کو باقی رکھا بلکہ سیرت نبوی کے دائرہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی، شمائل اور معمولات سے آگے بڑھا کر پیغام رسالت، تعلیمات نبوی اور احکام شرعی کے گوناگوں پہلوؤں تک وسیع کیا اور سیرت کے مطالعہ کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب نے سیرت طیبہ کے پیرایہ میں عقائد، عبادات، اخلاقیات اور معاملات جیسے مختلف النوع مسائل پر بحث کر کے "سیرۃ النبیؐ" کو ایک انسائیکلوپیڈیا کی صورت دی جیسا کہ حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کا منصوبہ تھا[1] اور خود سید صاحب کے بیان سے بھی اس منصوبہ پر روشنی پڑتی ہے اور اس کی تکمیل کا عزم ظاہر ہوتا ہے[2]۔

"سیرۃ النبیؐ" کے مطالعہ سے واضح طور پر یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ تاریخ و سیرت کے واقعات کا ایک اہم مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ قرآن، حدیث و فقہ کے قیمتی مباحث کا ذخیرہ بھی ہے۔ دیگر مضامین سے قطع نظر "سیرۃ النبی" کے فقہی مباحث کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں احکام شرعی کی تفصیلات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات، احادیث نبوی اور واقعات سیرت کی مدد سے فرائض اسلام اور خاص خاص احکام کے نزول کی تاریخ اور ان کے تکمیلی مراحل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مباحث کے مطالعے سے سیرۃ النبی کی فقہی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں، دوسری جانب سید صاحب کی فقہی بصیرت کا ثبوت ملتا ہے جو آپ کی دیگر تصنیفات "سیرت عائشہ" "امام مالک" اور متعدد فقہی مضامین میں پوری طرح نمایاں نظر آتی ہے۔

احکام شرعی کے نزول کے سلسلہ میں سید صاحب کے خیالات کا مرکزی پہلو یہ ہے کہ یہ احکام خواہ عبادات سے متعلق ہوں یا اخلاقیات و معاملات سے وہ بیک وقت نہیں بتدریج نازل ہوئے، ان میں سے بیشتر مدینہ میں اترے اور جن احکام کا نزول مکہ میں ہوا حالات کی مناسبت سے ان کی بتدریج تکمیل مدینہ میں ہوئی، اور

★ شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اسلام کے تشریعی مراحل اس وقت کمال کو پہنچے جب فتح مکہ کے بعد تمام ملک میں امن وامان قائم ہوا۳ ان کے خیال میں احکام کے تدریجی نزول میں سب سے بڑی مصلحت یہ کارفرما تھی کہ ان کے اولین مخاطب اہل عرب عملاً ان کو اپنی زندگی میں داخل کرلیں، اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب احکام آہستہ آہستہ نازل ہوں اور بتدریج پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ سید صاحب نے اپنے اس خیال کو مکی و مدنی سورتوں کے مضامین کے فرق سے مدلل کیا ہے کہ اول الذکر میں زیادہ تر عقائد اسلام (توحید، رسالت، آخرت) پر زور ملتا ہے جبکہ آخر الذکر میں زیادہ تر اصول دین کی مجموعی تعلیم اور احکام شرعی کی تشریح و توضیح پیش کی گئی ہے۴ مزید برآں سید صاحب نے حضرت عائشہؓ کے اس قول سے بھی مذکورہ رائے کو مؤکد کیا ہے کہ "پہلے عذاب وثواب کی آیتیں نازل ہوئیں، جب دلوں میں استعداد و رقت پیدا ہوگئی تو احکام نازل ہوئے، ورنہ اگر پہلے ہی دن حکم ہوتا کہ شراب نہ پیو تو کون مانتا۔"۵ اسی مرکزی نکتہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے سید صاحب نے سیرۃ النبی کی پہلی، دوسری (اضافی عبارات وحواشی میں) اور پانچویں جلد میں مختلف احکام کی ابتدائی تاریخ اور ان کے ارتقائی مراحل سے بحث کی ہے اور ترتیب میں فرائض اسلام کو مقدم رکھا ہے۔

وضو : اسلامی عبادات میں نماز کو جو اولیت وافضلیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں، اس کی صحت کے لئے متعدد شرطیں ہیں جن میں سب سے اہم طہارت ہے، اور اسی کا ایک حصہ وضو ہے، سید صاحب کے خیال میں نماز کے مثل وضو کی فرضیت کا ثبوت بھی ابتدائے اسلام سے ملتا ہے، جیسا کہ سنن ابن ماجہ، مسند امام احمد بن حنبل اور سیرت ابن ہشام سے ثابت ہے کہ حضرت جبریلؑ نے آغاز وحی میں نبی کریمؐ کو وضو کا طریقہ سکھایا تھا۔ اسی طرح بعض روایات سے صاف طور پر ہجرت سے قبل وضو پر آپ کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔۶ قرآن کی جس آیت سے وضو کی فرضیت ثابت ہوتی ہے وہ ہے "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ (مائدہ)، اس آیت کی بابت محدثین کا عام خیال یہ ہے کہ یہ ہجرت کے چار سال بعد نازل ہوئی، اس آیت اور مذکورہ روایات میں تطبیق دینے کے لئے سید صاحب نے جمہور علماء کی اس رائے سے اتفاق ظاہر کیا ہے کہ قرآن میں وضو کا حکم ہجرت کے چار، پانچ سال بعد نازل ہوا اگرچہ اس پر عمل پہلے سے موجود تھا۔" اس آیت سے وضو کی فرضیت قطعی طور پر ثابت ہوگئی تھی لیکن اس کے ساتھ سکون واطمینان کی شرط نہ تھی، نتیجۃً لوگ وضو میں جلدی کرتے تھے کچھ حصہ بھیگتا اور کچھ خشک رہتا، سید صاحب کی رائے میں سکون واطمینان کے ساتھ وضو سنہ ھ میں لازم قرار پایا، اور اس حکم کا شان نزول یہ تھا کہ ایک سفر کے دوران نبی کریمؐ نے بعض صحابہ کو وضو میں بہت جلدی کرتے دیکھا تو آپؐ نے اس سے منع فرمایا اور اسباغ وضو کا حکم دیا۷ سید صاحب کی تحقیق کے مطابق وضو کے سلسلہ

میں ابتداءً صحابہ کا یہ عمل تھا کہ وہ ہر نماز کے وقت اسے تازہ کرتے تھے خواہ نقضِ وضو پیش آئے یا نہ آئے، لیکن عام وقت کے پیشِ نظر بعد میں اس عمل کی واجبیت کو ختم کر دیا گیا، اور ہر نماز کے وقت تازہ وضو ضروری نہ رہا، اور آنحضرتؐ کی جانب سے عملی طور پر اس کا اعلان فتح مکّہ کے وقت ہوا۔ تیمم کا حکم ۵ھ میں نازل ہوا، اور اس کا شانِ نزول غزوہ بنی مصطلق سے واپسی میں ایک نماز کے وقت پانی کا نہ ملنا تھا۔[9]

نماز: نماز کے بارے میں سید صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ آنحضرتؐ کی بعثت کے ساتھ فرض ہوئی اور خدا کی جانب سے توحید کے بعد سب سے پہلا حکم آپ کو نماز کا ملا جیسا کہ دوسری وحی میں ارشاد ہوا: یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝ (مدثر ۱-۳) سید صاحب کے خیال میں اس آیت میں تکبیر سے مراد نماز ہے، یہ حکم اور اس پر عمل ابتداءِ اسلام ہی سے موجود رہا لیکن اس کے اوقات و رکعات کا تعین اور دوسرے متعلقہ اصول کی وضاحت بعد میں بتدریج پایۂ تکمیل کو پہنچی، اور ان احکام کی تدریج تکمیل میں اس وقت کے حالات کی خاص رعایت کی گئی۔[10] اسلام کے ابتدائی دور میں جب علانیہ نماز پڑھنا کافی دشوار طلب تھا تو دن میں کوئی نماز فرض نہ تھی اور صرف رات میں دیر تک نماز پڑھنے کا حکم تھا جیسا کہ سورہ مزمل کی ابتدائی آیت سے واضح ہوتا ہے یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۝ (مزمل ۱-۴) کچھ عرصہ (تقریباً تین سال) بعد جب علانیہ دعوت کا حکم آیا اور مسلمانوں کی تعداد و طاقت میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوا تو رات کی طویل نماز کے علاوہ دو نمازیں اور فرض ہوئیں ایک رات کے ابتدائی حصہ میں، دوسری صبح سویرے تاروں کے جھلملانے کے وقت۔ ارشاد ہوتا ہے: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۝ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ۝ (طور ۴۸-۴۹) سید صاحب نے اس آیت میں پہلی نماز "من اللیل" سے عشا اور دوسری "ادبار النجوم" سے فجر مراد لیا ہے، اور اس آیت کا نزول مکی زندگی کا ابتدائی دور بتایا ہے، جب پیغمبرؐ اور متبعین پیغمبر کے ساتھ قریش کی ایذا رسانی شروع ہو چکی تھی، اس لئے اس آیت سے قبل آپ کو مصائب پر صبر کرنے اور فیصلۂ الٰہی کے انتظار کا حکم مذکور ہے۔[11] سید صاحب کے خیال میں ابھی تک یہ راتوں کی نماز کی تصریح تھی، دن کی نماز کی بابت سب سے پہلا حکم سورہ دہر سے ملتا ہے جو سورہ طور کے بعد نازل ہوئی۔ حکم ہوتا ہے: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا ۝ وَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِیْلًا ۝ (دہر ۲۵-۲۶) اس آیت میں رات کی دیر تک نماز کے علاوہ واضح طور پر مزید تین اور وقتوں (صبح، سہ پہر، اور ابتدائی شب) کا ذکر موجود ہے۔ لیکن ابھی تک یہ صراحت نہیں ملتی کہ "اصیل" (سہ پہر) سے ظہر مراد ہے یا عصر، اور "من اللیل" (کچھ رات گئے) سے مغرب مقصود ہے یا عشا، بہرحال

ان تین وقتوں کی نمازوں کا حکم ایک دوسری مکی سورہ دہر کی اس آیت میں مزید وضاحت کے ساتھ ہوتا ہے: وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ۔ (ہود-۱۱۴) سید صاحب کی رائے میں قرآن کی یہ پہلی آیت ہے جس میں نماز کے ضمن میں تسبیح یا تحمید کے بجائے صاف صاف لفظوں میں "اقامت صلوٰۃ" کا حکم دیا گیا ہے۔[۱۲] جہاں تک دن اور رات کی نمازوں کے اوقات میں اجمال وابہام کا تعلق ہے سید صاحب کے خیال میں پہلے رات کی نماز کا ابہام دور کیا گیا اور اس مقصد سے سورہ ق کی یہ آیت نازل ہوئی: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۚ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝ (ق ۳۹-۴۰) اس آیت میں رات کی نمازوں کی تعیین کر دی گئی۔ ایک کی بابت کہا گیا کہ کچھ رات گئے "من اللیل" ادا کی جائے اور دوسرے کے بارے میں بتایا گیا کہ سورج ڈوبتے "ادبار السجود" پر پڑھی جائے، ظاہر ہے کہ پہلی سے عشاء مراد ہے اور دوسری سے مغرب۔[۱۳] سید صاحب کے خیال میں دن کی نمازوں کی تعیین جواب تک "اصیل"، "طرفی النہار" اور "قبل الغروب" سے تعبیر کی گئی تھیں سورہ روم سے ہوئی جس کے بارے میں قطعی ثبوت یہ ملتا ہے کہ رومیوں کی شکست کے بعد نبوت کے پانچویں سال سے لے کر نویں سال کے درمیان نازل ہوئی۔ سورۂ روم کی وہ مخصوص آیت یہ ہے: فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝ (روم ۱۷-۱۸) سید صاحب کی رائے میں اس آیت میں لفظ "عشی" سے عصر اور "حین تظہرون" سے ظہر کی نماز کی تفریق کی گئی۔ اس طرح اس پوری آیت سے کم از کم چار وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے۔[۱۴] سید صاحب نے مختلف سورتوں میں نماز کے اوقات کی تفصیلات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مجموعی طور پر اوقات پنجگانہ کا ذکر ان سورتوں میں موجود تھا جو اسراء سے پہلے نازل ہوئیں گرچہ سب سے پہلے اس سورہ میں اوقات صلوٰۃ کے امر کے ساتھ پانچ وقت کی نماز کا حکم ہوا جیسا کہ قرآن میں اس سورہ میں ارشاد ہوتا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (اسراء ۷۸) سید صاحب نے اپنے اس خیال کو محدثین و مورخین کی اس عام رائے سے کہ نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعیین معراج میں ہوئی ان الفاظ میں تطبیق دی ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز کسی نہ کسی صورت میں پہلے سے موجود تھی لیکن ان نمازوں کی قطعی فرضیت اور ان کے اوقات کی بصراحت تعیین شب معراج میں ہوئی جس سے متعلق سورہ اسراء کا نزول ہوا یہ ٹھیک اسی طرح پیش آیا جیسے وضو پر عمل پہلے سے تھا لیکن اس کا حکم قرآن میں مدنی سورتوں میں آیا۔[۱۵] بہرحال سید صاحب کا نقطہ نظر ان علماء سے مختلف نظر آتا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ معراج سے قبل رات کی غیر موقت نماز کے علاوہ اور کوئی نماز فرض نہ تھی یا صرف

صبح و شام کی دو نمازیں فرض تھیں۔

سید صاحب نے نماز اور اس کے اوقات کے مثل اس کی رکعات کے بارے میں بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حالات کی مناسبت سے ان میں بتدریج اضافہ ہوا۔ مکہ میں مسلمان پریشان حالی اور بے اطمینانی سے دو چار تھے، کفار کی مخالفت و معاندت زوروں پر تھی اس لئے ان حالات کی رعایت سے مکہ میں ہر نماز صرف دو رکعتوں پر مشتمل تھی۔ مدینہ ہجرت کے بعد جب کچھ پرسکون حالات میسر آئے تو ظہر، عصر اور عشا میں دو رکعتوں کا اضافہ کیا گیا البتہ مسافر کے لئے ان اوقات میں بھی صرف دو ہی رکعتیں باقی رہیں اسلئے کہ سفر کی حالت میں تخفیف کی وہ علت موجود رہی جو عام نمازیوں کے حق میں دو رکعت کے اضافے سے پہلے پائی جاتی تھی۔ سید صاحب نے فجر میں دو اور مغرب میں تین رکعت باقی رہنے کی توجیہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول سے فرمائی ہے کہ "مغرب میں تین اس لئے ہیں کہ وہ دن کا وتر ہے اور صبح میں دو اس لئے کہ اس میں دو رکعتوں کے بڑھانے کے بجائے قرارت لمبی کردی گئی ہے"[۱۶] نماز کی رکعتوں کی متعینہ تعداد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، صحابہ کے متواتر عمل اور متعدد احادیث سے ثابت ہے ان سب کے علاوہ سید صاحب نے سورہ نساء کی اس آیت سے بھی رکعتوں کی تعداد پر دلیل فراہم کی ہے جو ۵ھ میں نازل ہوئی اور جس میں خوف کی حالت میں قصر نماز میں دو رکعت کی تعیین کی گئی ہے، اس سے بخوبی یہ واضح ہوتا ہے کہ اصل رکعتیں چار ہوں گی۔[۱۷]

سید صاحب کی رائے میں نماز میں خشوع و خضوع اور اس کے آداب رفتہ رفتہ حصول اطمینان کے ساتھ واضح کئے گئے۔ مثلاً لوگ پہلے نماز میں باتیں کرلیتے تھے لیکن آیت (وقوموا للہ قانتین۔ بقرہ ۲: ۲۳۸) کے نزول کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، اسی طرح ابتدائی دور میں نماز پڑھتے وقت اِدھر اُدھر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں محسوس کیا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں اس کی ممانعت بھی کی۔ مکہ میں نماز کی حالت میں سلام کا جواب دینا جائز تھا لیکن مدینہ میں یہ اجازت منسوخ ہوگئی، اس طرح نماز میں خشوع و خضوع کے آداب بتدریج پایۂ تکمیل کو پہنچے، یہاں تک کہ خشوع و خضوع کے ساتھ نماز کی ادائیگی لازم قرار پائی اور خشوع والی نماز کو کامیابی کا ضامن بتایا گیا: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ (المومنون ۱-۲) (بے شک فلاح پانے والے ہیں وہ ایمان والے جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں) آخر میں اس کی اہمیت اس درجہ بڑھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان نمازوں کے اعادہ کا حکم فرماتے جس میں سکون و اطمینان کے ساتھ ارکان کی ادائیگی انجام نہ پائی ہو۔[۱۸]

سید صاحب کی رائے میں نماز پنجگانہ کے علاوہ دوسری اہم نمازیں مدینہ میں شروع کی گئیں مثلاً نماز جمعہ ہجرت کے پہلے سال واجب ہوئی، نماز عید ۲ھ میں مسنون ہوئی اور نماز خوف وکسوف کا حکم بالترتیب ۵ھ و ۶ھ میں نازل ہوا۔[19]

روزہ: قرآن اور احادیث نبوی سے واضح طور پر یہ ثابت ہے کہ رمضان کے روزے ہجرت کے دوسرے سال فرض ہوئے لیکن اس سے قبل مکہ میں بھی مسلمانوں کے روزے رکھنے کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ حضرت جعفرؓ نے نبوت کے پانچویں سال نجاشی بادشاہ کے دربار میں اپنی تقریر میں مسلمانوں کے دیگر اعمال کے ساتھ روزہ کا بھی ذکر کیا تھا اس سے غالباً عاشورا کے دن کا روزہ مراد تھا جس کا اہتمام نبی کریمؐ اور آپ کے اصحاب رمضان کی فرضیت سے قبل کرتے تھے اور جو رمضان کے روزے فرض ہونے کے بعد مستحب قرار پایا۔[20] سید صاحب نے رمضان کے روزوں کی بحث میں بھی اس نکتہ پر خاص زور دیا ہے کہ ان کی فرضیت اور متعلق احکام بتدریج نازل ہوئے۔ چونکہ اہل عرب روزہ کے عادی نہیں تھے اور یہ دقت ومشقت سے بھرا ہوا فریضہ تھا، اس لئے اس کی فرضیت اور اس کے احکام کی تکمیل میں مزید تدریج سے کام لیا گیا تاکہ لوگ پوری طرح اس سے مانوس ہو جائیں اور رفتہ رفتہ اس فریضہ کی انجام دہی کی صلاحیت واستعداد اپنے اندر پیدا کرلیں۔ سید صاحب کے خیال میں رمضان کے روزوں کی فرضیت کے لئے ۲ھ سے بڑھ کر اور کوئی مناسب موقعہ نہیں تھا اس لئے کہ دیگر عبادات کے مثل روزہ بھی امراض باطنی کی ایک دوا ہے اور جن امراض کے لئے یہ دوا خاص طور پر تجویز کی گئی ہے، وہ ہیں شہوات نفسانی کا غلبہ، دنیوی لذات میں حد درجہ انہماک اور دنیا کی عیش وعشرت سے وابستگی، مکہ میں مسلمان جن حالات سے دوچار تھے ان میں اس طرح کے امراض پیدا ہونے کا سوال کہاں پیدا ہوتا تھا، البتہ مدینہ پہنچ کر سکون واطمینان کے حصول، معاشی وسائل میں اضافہ اور فتوحات کی کثرت کے حالات میں انکے پیدا ہونے کا امکان قوی ہوا تو پہلے ہی سے اس کے لئے پرہیز تجویز ہوا اور وہ پرہیز یہی روزہ تھا۔[21] سید صاحب نے روزہ سے متعلق قرآن کی آیت کی روشنی میں بڑی خوش اسلوبی سے اس کی فرضیت اور احکام کی تکمیل میں اسلام کے تدریجی اصول کو واضح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس اہم و پرمشقت فریضہ سے لوگوں میں انسیت پیدا کرنے کے لئے پہلے مدت کی تعیین کے بغیر یہ ارشاد ہوا "یاایھا الذین امنو کتب علیکم الصیام" (بقرہ ۱۸۳) پھر بطور تسلی یہ وضاحت کی گئی کہ یہ کوئی نیا فریضہ نہیں ہے: "کما کتب علی الذین من قبلکم" (بقرہ ۔ ۱۸۳) اس سے مزید انسیت پیدا کرنے اور مخاطب کو اچانک بوجھ کے احساس سے دور رکھنے کے لئے روزے کی مدت کو ہلکا کر کے ان الفاظ میں پیش کیا گیا: "ایاما معدودات" (بقرہ ۱۸۳)

اس کے بعد مسافروں و مریض کے لئے روزے میں آسانیوں کا ذکر کیا گیا تاکہ یہ پیش نظر رہے کہ اسلامی روزوں میں معذوروں کے لئے گنجائش ہے: "فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۰" (بقرہ - ۱۸۴) ان سب سہولتوں اور آسانیوں کے بیان کے بعد روزہ کی اہمیت کی جانب پھر ان الفاظ میں توجہ دلائی گئی وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (بقرہ - ۱۸۴) سید صاحب کے خیال میں ان تمام تمہیدی و وضاحتی بیانات کے بعد اب یہ مناسب موقعہ آیا کہ مدت صیام کی تعیین کی جائے جسے پہلے مجمل انداز میں "ایاما معدودات" سے تعبیر کیا گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ اعلان کیا جائے کہ ایک مہینہ کے روزے فرض کئے گئے ہیں اس خاص مہینہ کی عظمت و برکت پر روشنی ڈالی گئی: "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۰" (بقرہ - ۱۸۵) اب آخر میں صاف صاف لفظوں میں یہ فرمایا گیا کہ یہی وہ بابرکت مہینہ ہے جس کے روزے فرض کئے گئے، فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، (بقرہ - ۱۸۵) اس آیت کے اس ٹکڑے سے "ایاما معدودات" کا ابہام پوری طرح رفع ہو گیا اور یہ متعین ہو گیا کہ رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض کئے گئے ہیں۔ مذکورہ آیتیں ۲ھ میں نازل ہوئیں، اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوا کہ رمضان کے روزے ۲ھ میں فرض ہوئے۔[۲۳]

زکوٰۃ: سید صاحب کی رائے میں جس طرح نماز ابتداء اسلام سے موجود تھی اور اس کے احکام رفتہ رفتہ نبی کریمؐ کی مدنی زندگی میں مکمل ہوئے اسی طرح مالی خیرات اور زکوٰۃ کی ترغیب اور اس پر عمل بھی اسلام کے شروع زمانہ ہی سے ملتا ہے۔ قرآن کی اولین سورتوں میں سے سورہ مزمل میں صاف صاف لفظوں میں ارشاد ہے: وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَأَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۰ (مزمل - ۲۰) اس کے علاوہ قرآن کی مختلف مکی سورتوں (بلد، ماعون، فجر، روم وغیرہ) میں صدقات و خیرات پر زور اور بعض میں زکوٰۃ کا ذکر صراحۃً موجود ہے، اسی طرح نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر اور مدینہ میں ۵ھ میں آنحضرتؐ کی جانب سے وفد عبدالقیس کو دی گئی ہدایت میں زکوٰۃ کا بیان موجود ہے۔[۲۴] سید صاحب زکوٰۃ و صدقات کے ان تمام حوالوں کو جو قرآن و حدیث میں ۸ھ سے قبل ملتے ہیں عام زکوٰۃ و مالی خیرات پر محمول کرتے ہیں اور باقاعدہ زکوٰۃ کی فرضیت کو فتح مکہ کے بعد ۸ھ سے منسوب کرتے ہیں۔ سید صاحب کے خیال میں شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ خیرات کے مترادف استعمال ہوتا تھا اور مکہ میں اس کی فرضیت کا سوال کہاں پیدا ہو سکتا تھا جب کہ مسلمان وہاں بے اطمینانی اور پریشانی حالی کی

زندگی سے دوچار تھے۔ ان حالات میں ان کے لئے اتنا ہی بہت تھا کہ وہ کسی یتیم کو مدد بہم پہنچائیں یا کسی مسکین و بھوکے کو کھانا کھلا دیں۔ اس لئے اس دور کی آیتوں میں زیادہ تر انھیں اعمال پر ابھارا گیا ہے صدقہ و خیرات کے سلسلہ میں خاص زور اور سخت تاکید اس وقت سامنے آئی جب مدینہ آکر مسلمانوں کو کچھ اطمینان ملا اور تجارت و کاروبار کا سلسلہ شروع ہوا، اور ۲ھ میں روزہ کے ساتھ صدقۃ الفطر کی واجبیت اسی کا ایک خاص حصہ تھا۔[۲۵] سید صاحب کے خیال میں مدینہ میں حالات کی مناسبت سے انفاق مال کی تاکید میں مزید اضافہ ہوا اور اس کے مقدار کی تعیین بتدریج عمل میں آئی۔ انفاق کی اہمیت دل میں جاگزیں ہونے کے بعد صحابہ نے نبی کریمؐ سے جب انفاق کی بابت سوال کیا کہ اس کی مقدار کیا ہونی چاہیئے **یسئلونک ماذا ینفقون** (بقرہ۔۲۱۹) تو خود قرآن نے اس کا جواب فراہم کیا **قل العفو** (بقرہ۔۲۱۹)۔ سید صاحب کے مطابق زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا یہ پہلا قدم تھا اور اس وقت عام مسلمانوں کی حالت کا تقاضا یہی تھا کہ ضرورت سے زائد جو چیز بچ رہے اسے اللہ کی راہ میں خیرات کر دیا جائے تاکہ فقر و تنگ دستی کے شکار مسلمانوں کی اعانت ہو سکے۔[۲۶] کچھ عرصہ بعد جب تجارت میں ترقی ہوئی، فتوحات میں اضافہ ہوا اور کمائی کافی بڑھ گئی تو یہ حکم ہوا **یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ** (بقرہ۔۲۶۷) اور پھر مزید تاکید کے طور پر یہ انتباہ کیا گیا کہ پوری پوری نیکی اور ثواب پانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پسندیدہ چیزیں خدا کی راہ میں قربان کی جائیں: **لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ** (آل عمران ۹۲) سید صاحب کی رائے میں قرآن کی ان تعلیمات اور رسول خداؐ کی تربیت کے اثر سے صحابہ کا یہ حال ہو گیا کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ہر وقت مشتاق و بیقرار رہتے اور اس میں رغبت یہاں تک بڑی کہ بہت سے صحابہ محض اس مقصد سے بازار محنت کے لئے جاتے کہ جو کچھ ہاتھ آتا اسے خدا کی راہ میں صدقہ کر دیتے۔

ان حالات میں اب یہ مناسب وقت آیا کہ حکم زکوٰۃ نافذ کیا جائے اور اس کے متعلق احکام و قوانین مرتب کئے جائیں۔ فتح مکہ کے بعد قرآن نے پہلے یہ حکم الٰہی سنایا **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا** اور پھر زکوٰۃ کی قطعی فرضیت کے بعد اس کے مصارف بیان کئے جیسا کہ اس کی تفصیل سورہ توبہ میں ملتی ہے۔ ان احکام کی روشنی میں نبی کریمؐ نے ۹ھ کی ابتدا میں زکوٰۃ کا باقاعدہ نظام مرتب کیا اور اس کی تحصیل کے لئے تمام عرب میں عاملین کا تقرر کیا۔[۲۷] ان تفصیلات سے بخوبی یہ واضح ہوا کہ سید صاحب کی تحقیق کے مطابق زکوٰۃ ۲ھ میں فرض ہوئی اور متعلقہ احکام کی تفصیلات بعد میں واضح کی گئیں۔ سید صاحب کی رائے یہاں ان علماء سے مختلف ہے جن کے نزدیک زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی اور اس کی تعداد، نصاب مصارف وغیرہ سے متعلق احکام مدینہ میں مرتب ہوئے۔[۲۸]

حج : اس رکن اسلام کے بارے میں بھی سید صاحب کا یہی نقطۂ نظر ہے کہ اس کی فرضیت اس وقت عمل میں آئی جب اس کے مناسب حالات رونما ہوئے۔ فتح مکہ سے قبل مسلمانوں کے لئے مکہ جانا ممکن نہ تھا، اس لئے حج اس کے بعد ہی فرض ہوا۔ فتح مکہ سے قبل اسلامی تعلیمات اور عبادات کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان میں نماز، روزہ، زکوٰۃ کے ساتھ حج کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ فتح مکہ کے بعد جب اسلام کو غلبہ نصیب ہوا اور پورے عرب میں امن وامان کی فضا قائم ہوئی تو پیغمبر خدا اور آپؐ کے متبعین کو یہ موقع فراہم ہوا کہ شعار ابراہیمی کو زندہ وتابندہ کریں۔ ان مناسب حالات کے حصول کے بعد ۹ھ میں فریضۂ حج ان الفاظ میں عائد کیا گیا: وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا" (آل عمران ۹۷) سید صاحب کے خیال میں حج اور دیگر عبادات کی فرضیت اور ان کے احکام کے نزول میں ایک نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ حج کی فرضیت اور اس کے احکام کی تکمیل میں وہ تدریجی مراحل نہیں پائے جاتے جن سے دوسرے فرائض کو گذرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز، زکوٰۃ وغیرہ کی بہ نسبت اہل عرب حج سے پہلے سے کافی مانوس تھے ان کا یہ قدیم شعار تھا، اگرچہ انہوں نے اس میں بعض مشرکانہ رسوم واعمال داخل کر لئے تھے، اس لئے حج کی مروجہ خرابیوں کی نشاندہی واصلاح کر کے بیک دفعہ اس کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا گیا اور ساتھ ہی اس کے احکام واصول وآداب کی تفصیلات پیش کر دی گئیں، جیسا کہ سورہ بقرہ (۱۹-۲۵، ۱۹۴-۲۰۰) اور سورہ حج (۲۲) کی متعلقہ آیتوں سے واضح ہوتا ہے[۲۹]

فرائض اسلام کے علاوہ شریعت کے دوسرے احکام بالخصوص وراثت ووقف اور حدود وتعزیرات سے بحث کرتے ہوئے بھی سید صاحب نے اسلام کے تشریعی عمل میں تدریجی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ ان کی رائے میں اس نوع کے احکام جاری کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اسلام کو قوت نافذہ حاصل ہو، اسی لئے یہ اور وہ تمام احکام جن کا تعلق قانون ملکی سے تھا بعثت کے کافی عرصہ بعد بلکہ ہجرت کے تیسرے چوتھے سالوں سے نازل ہونا شروع ہوئے، جب اسلام کی ریاستی تنظیم وجود میں آچکی تھی[۳۰]

وراثت : سید صاحب کے مطابق معاملات کے ضمن میں سب سے پہلے قانون وراثت نازل ہوا۔ مدینہ ہجرت کے بعد ابتدائی دور میں خونی یا خاندانی رشتہ کی بنیاد پر وراثت کی تقسیم ممکن نہ تھی، اس لئے کہ گھر وخاندان بٹا ہوا تھا، بیٹا مسلمان ہے تو باپ کافر، ایک بھائی اسلام قبول کر چکا ہے تو دوسرا اس سے محروم۔ اس لئے نبی کریمؐ نے ان حالات میں مہاجرین وانصار کے مابین مواخات کی بنیاد پر قانون وراثت جاری کیا، لیکن جب رفتہ رفتہ اور خاص طور سے غزوہ بدر کے بعد مسلمانوں کے موافق حالات رونما ہوگئے، ان کی تعداد وقوت میں اضافہ ہوا اور پورے پورے خاندان اسلام کی نعمت سے سرفراز ہوئے تو ۳ھ میں

قرآن کی آیت توریث نازل ہوئی وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ (انفال - ۷۵) اس آیت سے مواخات کی بنیاد پر قانون وراثت منسوخ ہوگیا اور خاندان و ذوی الارحام میں وراثت جاری ہوئی[۳۱] سید صاحب نے یہاں وضاحت فرمائی ہے کہ وراثت کی آیت نازل ہونے سے قبل وصیت کا اصول بھی جاری تھا۔ ہر مسلمان کے لیے ضروری تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے مال میں سے اپنے والدین واقربا کے لیے وصیت کرجائے جیساکہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ (بقرہ - ۱۸۰) آیت وراثت کے نزول کے بعد بھی وصیت کا اصول جاری رہا۔ البتہ وصیت کی کوئی حد اب تک مقرر نہ تھی جس کی وجہ سے وراثت کے شرعی مستحقین کی حق تلفی ہو سکتی تھی اس لئے نبی کریمؐ نے مال و جائداد میں ایک ثلث سے زیادہ وصیت کرنے کی ممانعت کرکے اس کی تحدید کی۔ جہاں تک وراثت کی تقسیم کے اصول مستحقین وراثت کا تعین اور ان کے حصوں وغیرہ کا تعلق ہے ان کی بابت قرآن کے احکام ۳ھ میں نازل ہوئے جن کی تفصیلات سورہ نساء (۱۱ - ۱۲) میں ملتی ہیں[۳۲]

وقف: وقف اسلامی شریعت کے اہم مسائل میں شامل ہے۔ اسلام میں اس کی ابتدا ہجرت کے پہلے سال اس وقت ہوئی جب نبی کریمؐ نے مسجد نبوی کے لئے دو یتیموں کی زمین بقیمت لینا چاہا لیکن انہوں نے یہ کہکر اس کی قیمت لینے سے انکار کر دیا کہ وہ اس کی قیمت صرف خدا سے چاہتے ہیں اس طرح ان کی عطیہ کردہ یہ زمین وقف قرار پائی۔ یہ وقف کی ایک سادہ سی صورت تھی۔ اس کی مزید وضاحت ہجرت کے چار پانچ سال بعد اس وقت سامنے آئی جب آیت لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون کے نزول کے بعد حضرت ابو طلحہؓ، حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اپنی ایک قیمتی زمین خدا کی راہ میں اجر و ثواب کی نیت سے صدقہ کرنیکی خواہش ظاہر کی۔ ان کی خواہش کے مطابق یہ زمین وقف تسلیم کی گئی اور اس کا منافع ان کے اعزہ کے لئے مخصوص کیا گیا۔ وقف کی ابتدا اور اس کے معمول بہ ہونے کے باوجود اب تک اس کے اصول و ضوابط متعین نہیں ہوئے تھے۔ سید صاحب کے مطابق ۷ھ میں غزوہ خیبر کے بعد ان کی وضاحت کی گئی اور اس کا شان نزول یہ تھا کہ حضرت عمرؓ خیبر میں اپنی ایک زمین کو وقف کرنے کے لئے نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: "ان شئت حبست اصلها و تصدقت بها۔" اور آپ نے اس کے مزید ضوابط ان الفاظ میں بیان فرمائے "انه لایباع اصلها ولا یوهب ولا یورث"۔ اس سے یہ اصول متعین ہوا کہ وقف کی اصل جائداد کا فروخت کرنا، ہبہ کرنا اور وراثت میں تقسیم کرنا جائز نہیں ہے۔

حدود و تعزیرات: سید صاحب کے نزدیک حدود و تعزیرات بھی ان احکام میں شامل تھے جنھیں نافذ کرنے کے لئے حکومت کی طاقت ضروری تھی۔ اس لئے ان کا نزول بھی مدینہ میں ہی ہوا اور یہ تبدریج اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچے جب اسلام ایک حکمراں طاقت بن گیا۔

قصاص: اسلام میں انسانی جان کی حرمت، قتل کی ممانعت اور قصاص کے اصول ہجرت سے پہلے ہی موجود تھے جیسا کہ مکی سورتوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے، خود واقعہ معراج (جو باختلاف روایت ۵؁ نبوی یا ۹؁ نبوی یا ۱۲؁ نبوی میں پیش آیا) کے بعد جو سورہ نازل ہوئی اس میں اس نوع کے احکام ملتے ہیں، خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۳۳) سید صاحب اس آیت اور اسی نوع کی دوسری مکی آیتوں میں اس طرح کی ہدایات کے بارے میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی حیثیت اخلاقی احکام و ہدایات کی ہے۔ ان کی رائے میں قصاص کا صریح حکم غزوہ بدر کے بعد آیا جب "اسلام کے بازوؤں میں حاکمانہ زور" آچلا تھا۔[۴۲]

سید صاحب کے خیال میں قانون قصاص سے متعلق سب سے پہلے سورہ مائدہ کی چند آیتیں نازل ہوئیں اور اس سورہ کا زمانہ نزول باختلاف روایت ۳؁ھ اور ۵؁ھ کے درمیان ہے۔[۴۳] اس مسئلہ پر قرآن کی وضاحت اس وقت سامنے آئی جب مدینہ کے مشہور یہودی قبائل بنو قریظہ و بنو نضیر کے مابین قتل کا ایک مقدمہ کھڑا ہوا اور وہ نبی کریم ؐ کی خدمت میں فیصلہ کے لئے حاضر ہوئے۔ قرآن نے اس بارے میں قانونِ تورات کا حوالہ دیتے ہوئے صراحت کی وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ (مائدہ - ۴۵) گرچہ اصلاً یہ حکم یہودیوں کے لیے تھا لیکن ایک دوسری آیت سے یہ واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کے لئے بھی یہی قانون قصاص ہے،[۴۵] جیسا کہ ارشاد ہوا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (بقرہ - ۱۷۸) یہودیوں کے قانون میں خون بہا یا دیت کی کوئی دفعہ نہ تھی، گرچہ عرب میں یہ اصول جاری تھا۔ ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام میں اسے باقی رکھا گیا۔ قرآن نے دیت کے اصول ان الفاظ میں بیان فرمائے فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ (بقرہ - ۱۷۸) سید صاحب کے مطابق قانون قصاص کی مشروعیت کے بعد شروع میں قتل عمد و قتل خطا میں قانوناً کوئی امتیاز نہ تھا۔ لیکن ۳؁ھ میں قتل خطا کے ایک واقعہ کے بعد اس کے مخصوص احکام نازل ہوئے جس کی رو سے اس کی سزا ایک مسلمان غلام کی آزادی اور خونبہا کی ادائگی

قرار پائی۔ قرآن نے اس کے متعلق یہ صراحت کی وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۔ (نساء۔ ۹۲) اس آیت میں "قتل خطا" کے خونبہا کی کوئی تحدید نہیں تھی۔ نبی کریمؐ نے اس کی وضاحت فتح مکہ کے موقع پر فرمائی، جس کی رو سے اہل قریہ کے لئے اس خونبہا کی مقدار ۴۰۰ دینار مقرر ہوئی[۳۶]

رہزنی وسرقہ: سید صاحب کی تحقیق کے مطابق اسلام میں رہزنی کی سزا ۶ھ میں متعین ہوئی، اس سے قبل اس کی حد کے مقرر ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ۶ھ میں مدینہ کے باہر مویشی چرانیوالے چند مسلمانوں کے جانور لوٹ لئے گئے اور وہ مسلمان نہایت بے رحمی سے قتل بھی کر دیے گئے، ان غارتگر قاتلین (رہزنوں) کو اصول قصاص کے مطابق سزا دی گئی۔ اس پر قرآن میں اس طرح کے مجرمین کے لئے مخصوص احکام نازل ہوئے[۳۷]۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۔ (مائدہ۔ ۳۶) جہاں تک سرقہ کی حد قطع ید کا تعلق ہے سید صاحب نے بصراحت یہ لکھا ہے کہ عرب میں اسلام سے پہلے چوری کی یہی سزا رائج تھی اور اسلام میں اسے باقی رکھا گیا، قرآن نے اس سزا کا تعین اس آیت کے ذریعہ کیا وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا (مائدہ۔ ۳۸) اس آیت کی بابت عام خیال یہ ہے کہ یہ ۳ھ و ۸ھ کے درمیان نازل ہوئی۔ اس حد کے نفاذ کے اصول و ضوابط بعد میں نبی کریمؐ کی وضاحت کے مطابق متعین ہوئے۔

زنا: تورات میں زنا کی سزا رجم یا سنگسار کرنا تھا، ۳ھ میں ایک یہودی مجرم کا مقدمہ آپؐ کے سامنے پیش ہوا تو آپؐ نے قانون تورات کے مطابق اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ قرآن میں زنا کی سزا سورہ نور میں واضح کی گئی، جس کا سن نزول ۵ھ ہے۔ اس سورہ میں قذف یعنی پاکدامن عورت پر تہمت لگانے کی سزا بھی نازل ہوئی۔ قرآن نے زنا کی سزا سو کوڑے مقرر کی، سید صاحب نے حضرت عمرؓ کی ایک روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرآن نے رجم کی سزا بھی باقی رکھی تھی، لیکن اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی۔ نبی کریمؐ کے ارشادات وعمل سے بعد میں شادی شدہ کے لئے رجم اور غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑے کی سزا مقرر ہوئی۔ ۸ھ میں اس جرم کے ارتکاب پر نبی کریمؐ نے ایک مسلمان کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تو اس سے یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہوگیا[۳۸]۔

شراب: حرف خمر کے بارے میں یہ عام خیال ہے کہ اس کا حکم تدریجی و ارتقائی منزل سے گذرا۔ سید صاحب کی رائے میں دیگر احکام کی بہ نسبت اس میں تدریجی اصول کی مزید رعایت کی گئی، اس کی وجہ

یہ ہے کہ عربوں کے سماج میں جو برائیاں سب سے زیادہ جڑ پکڑے ہوئے تھیں اسلام نے ان کی حرمت میں اس لحاظ سے اور زیادہ تدریج سے کام لیا اور یہ بخوبی معلوم ہے کہ شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور اس سے بڑھ کر انھیں کوئی چیز محبوب نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ شراب تدریج حرام قرار دی گئی، ہجرت سے قبل اس مسئلہ پر بالکل خاموشی تھی اس لئے اسے اباحت سے تعبیر کیا گیا، مدینہ آکر صحابہ میں اس کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور خود حضرت عمرؓ نے اس مسئلے کی وضاحت کے لئے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی تو قرآن نے پہلے اس کے افادیت وضرر کا تناسب بیان کیا **يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ، قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ، وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا،** (بقرہ-۲۱۹) اس آیت سے شراب کی بابت اسلام کے نقطۂ نظر کی کچھ وضاحت ہوئی تاہم صریحی ممانعت نہ ہونے کی وجہ سے پینے پلانے کا عمل جاری رہا، یہاں تک جب اس کی وجہ سے نماز میں خلل کا ایک واقعہ پیش آیا تو قرآن نے نماز کے وقت اس کی ممانعت کا اعلان کیا: **لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ** (نساء-۴۳) یہ شراب کی ممانعت کا عام حکم نہ تھا بلکہ صرف نماز کے اوقات تک محدود تھا، حضرت عمرؓ نے پھر خدائے تعالیٰ سے دعا کی کہ شراب کے بارے میں واضح حکم نازل ہو، اسی اثنار میں شراب خوری کے نتیجے میں مارپیٹ کا ایک شدید واقعہ پیش آیا اس پر قرآن میں اس کی قطعی حرمت کا حکم ان الفاظ میں نازل ہوا **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝** (مائدہ-۹۱) اس آیت کی بابت اکثر محدثین ومفسرین کا خیال ہے کہ ۶ھ میں نازل ہوئی اس لئے سید صاحب ۶ھ کو حرمت شراب کی اصل تاریخ قرار دیتے ہیں،[۳۹] اور متعدد دلائل کی بنیاد پر بعض علماء کے اس قول کو قابل قبول نہیں سمجھتے کہ شراب ۸ھ میں حرام ہوئی۔[۳۹] مذکورہ آیت کی بنیاد پر شراب نوشی قطعاً حرام ہو گئی، لیکن اس کی خرید وفروخت اور تجارت کا مشغلہ جاری رہا لیکن ۸ھ میں نبی کریمؐ نے اس کی حرمت کا بھی اعلان فرمایا:

"ان اللہ ورسولہ حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام ."

(صحیح بخاری، باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ والاصنام)

جہاں تک شراب نوشی کی حد کا تعلق ہے نبی کریمؐ کے زمانہ میں اس کے مرتکب کو چالیس کوڑے مارے جانے کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے صحابہ کے مشورے سے اس کی حد ۸۰ کوڑے متعین کی اور بعد میں بھی یہی معمول بہ رہا۔[۴۰]

سود: سود خوری بھی عرب کی ان عام برائیوں میں شامل ہے جو اسلام سے قبل انکی معاشی زندگی

کا جزو لاینفک تھیں۔ اس لیے سید صاحب کے خیال میں اس کی حرمت کے احکام بھی نہایت تدریج سے نازل ہوئے جیساکہ قرآن کی متعلقہ آیات سے ظاہر ہوتا ہے، اس کی قطعی حرمت کے اعلان سے قبل قرآن نے مختلف انداز میں اس کی شناعت اور اس کے اثرات بد کی وضاحت کی تاکہ اس کی گھناؤنی تصویر بالکل سامنے آجائے، پہلے چاندی و سونے کے ادھار خرید و فروخت کو سود قرار دے کر اس کی ممانعت کی گئی، پھر دو گنے و تین گنے سود کھانے سے روکا گیا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران - ۱۳۰) اس کے بعد ہم جنس چیزوں کا گھٹ بڑھ کر تبادلہ کرنا ناجائز قرار دیا گیا اور یہ حکم غزوہ خیبر کے موقع پر ۷ھ میں نازل ہوا۔ قرآن نے ۹ھ میں صاف طور پر سود کی حرمت کا اعلان کیا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ ۲۷۸ - ۲۷۹) اس آیت کے نزول کے بعد جب سود کی حرمت قطعی طور پر ثابت ہوگئی تو آپ نے مسجد میں سب مسلمانوں کو جمع کر کے اس کا اعلان فرمایا اور ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے ان تمام سودی معاملات کو کالعدم قرار دیا جو اس آیت کے نزول سے قبل طے ہوئے تھے؟[41] سید صاحب نے اپنی بحث کا خاتمہ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول سے کیا ہے کہ سود کی حرمت کا حکم اسلام کے سلسلۂ احکام کی سب سے آخری کڑی ہے؟[42]

مذکورہ بالا تفصیلات سے سید صاحب کا یہ نقطۂ نظر اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ اسلامی فرائض اور اہم احکام کی مشروعیت و تکمیل بتدریج عمل میں آئی، اور یہ حکمت عملی اس لئے اختیار کی گئی تاکہ لوگ فکری طور پر انھیں دل و دماغ میں جاگزیں کرلیں اور عملی طور پر ان کے پابند ہو جائیں، اسلام اور پیغمبر اسلام کا طریقۂ تعلیم محض احکام شریعت سے واقف کرانا اور تعلیمات و ہدایات کا پیش کرنا نہیں تھا بلکہ اہل اسلام کی زندگی میں ان کو داخل کرنا تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب حالات کی مناسبت سے رفتہ رفتہ احکام نازل کئے جاتے اور بتدریج ان کی تکمیل ہوتی جیساکہ صحیح معنوں میں وقوع پذیر ہوا۔ سید صاحب کے مباحث اس لحاظ سے کافی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان سے قرآنی آیات کی نزولی ترتیب اور سیرت نبوی کے واقعات کی روشنی میں احکام شرعی کی تاریخ اور ان کے تدریجی و ارتقائی مراحل کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے، سید صاحب کے مباحث کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے عام مورخین اور سیرت نگاروں کے بیانات کو من و عن قبول کرنے کے بجائے قرآنی آیات، احادیث شریفہ کے تفسیری ذخیرہ اور مختلف احکام کے شان نزول کی مدد سے شرائع اسلام کی ابتدا اور تکمیل کی تاریخ متعین کی ہے اسی لئے بعض مقامات پر ان کی رائے دوسرے علماء و

سیرت نگاروں سے مختلف نظر آتی ہے۔ مندرجات بالا سے نہ صرف یہ کہ قرآنی علوم و فقہ میں سید صاحب کی گہری دلچسپی اور مہارت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے بلکہ سیرت النبی کی فقہی خصوصیات بھی پوری طرح نمایاں ہوتی ہیں۔

حواشی و تعلیقات :

۱۔ مکاتیب شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، مطبعہ معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء، حصہ اول مکتوب نمبر ۱۰۴۔ ص۲۰۲
۲۔ سیرۃ النبی، مؤلفہ سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء، جلد پنجم ص۲ ۔ ۳۔ سیرت النبی، مؤلفہ علامہ
شبلی نعمانی مع اضافہ و تکملہ از سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۳۶ء، جلد دوم۔ ص۱۰۰۔ ۱۰۱ ،
۴۔ سیرۃ النبی، جلد دوم، ص۱۰۳ ، ۵۔ ایضاً، ص۱۰۳ بحوالہ صحیح بخاری باب تالیف القرآن ،
۶۔ ایضاً ، ص۱۰۶۔ ۱۰۷ ، ۷۔ ایضاً، ص۱۰۷ ، ۸۔ ایضاً، ص۱۰۷ بحوالہ صحیح مسلم باب وجوب غسل الرجلین
۹۔ ایضاً، ص۱۰۸ ، ۱۰۔ سیرۃ النبی، جلد پنجم، ص۶۸ ، ۱۱۔ ایضاً ، ص۱۲۵۔ ۱۲۶ ،
۱۲۔ ایضاً، ص۱۲۷ ، ۱۳۔ ایضاً ص۱۲۹ ، ۱۴۔ ایضاً ص۱۲۹۔ ۱۳۰ ، ۱۵۔ ایضاً ص۱۳۲ ،
۱۶۔ ایضاً، ص۱۵۹۔ بحوالہ مسند احمد بن حنبل ، ۱۷۔ ایضاً ص۱۶۲ ، ۱۸۔ ایضاً، ص۱۶۲۔ ۱۷۰، نیز دیکھئے
جلد دوم ص۱۱۱۔ ۱۱۲، بحوالہ صحیح بخاری باب امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من لا یتم الصلوٰۃ بالاعادۃ ، ۱۹۔ سیرۃ النبی
جلد دوم، ص۱۱۴۔ ۱۱۶، نیز جلد اول ص۵۴۶ ، ۲۰۔ سیرۃ النبی، جلد دوم ص۱۱۷ ، ۲۱۔ سیرۃ النبی، جلد پنجم ص۲۹۳۔
ص۲۹۳ ، ۲۲۔ علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی کی دوسری جلد (ص۱۱۹) میں یہ بیان فرمایا ہے کہ رمضان کے پورے
مہینہ کے روزے فرض ہونے سے پہلے سال میں صرف ۳ روزے رکھنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن سید صاحب کی بحث
میں اس طرح کی کوئی صراحت نہیں ملتی ، ۲۳۔ سیرۃ النبی، جلد پنجم، ص۲۹۵۔ ۲۹۸، جلد دوم ص۱۱۷ ،
۲۴۔ سیرۃ النبی، جلد پنجم، ص۲۱۰۔ ۲۱۲ ، ۲۵۔ ایضاً، ص۲۱۱۔ ۲۱۲ ، ۲۶۔ ایضاً، ص۲۱۳ ،
۲۷۔ ایضاً، ص۲۱۳۔ ۲۱۵ ، ۲۸۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں مفتی عزیز الرحمٰن، تاریخ الاحکام، مدنی دار التالیف
بجنور ۱۹۵۹ء ص۱۳۲۔ ۱۳۵ ، ۲۹۔ سیرۃ النبی، جلد دوم ص۱۰۰۔ ۱۰۱، ۱۰۵، جلد پنجم ص۲۴۹ ، ۳۰۔ سیرۃ النبی
جلد دوم، ص۹۹۔ ۱۰۰، ۱۲۷ ، ۳۱۔ سیرۃ النبی، جلد دوم، ص۱۲۷۔ ۱۲۸ ، ۳۲۔ ایضاً ص۱۲۸۔ ۱۳۰
۳۳۔ ایضاً، ص۱۳۰۔ ۱۳۱، بحوالہ صحیح بخاری باب الوقف ، ۳۴۔ ایضاً، ص۱۳۲۔ ۱۳۳ ، ۳۵۔ ایضاً ص۱۳۴۔ ۱۳۵
۳۶۔ ایضاً، ص۱۳۵ ، ۳۷۔ ایضاً، ص۱۳۵۔ ۱۳۶ ، ۳۸۔ ایضاً، ص۱۳۴۔ ۱۳۸، ۳۹۔ ایضاً، ص۱۳۹، ۱۴۱۔ ۱۴۵
۴۰۔ ایضاً، ص۱۳۸ ، ۴۱۔ ایضاً، ص۱۴۶۔ ۱۴۸ ، ۴۲۔ ایضاً، ص۱۴۸، بحوالہ صحیح بخاری باب تفسیر آیہ
واتقوا یوما (بقرہ)

عبدالباری ★

ممتاز تاریخ نگار

بحوالہ "عرب و ہند کے تعلقات"

سید صاحب ایک مورخ تھے، یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ "ان کا اصلی فن تفسیر، حدیث، اور علم کلام ہی تھا۔"[1] "ارض القرآن ان کی علمی کاوشوں کا حقیقی جولان گاہ رہی ہے۔ "ان کا اصلی موضوع تفسیر اور تدبر قرآن ہے۔"[2] "سیرۃ النبی ان کی علمی زندگی کا ماحصل ہے۔" "خیام ان کی ادبی تحقیقات کا شاہکار ہے۔"[3] اور "عرب و ہند کے تعلقات ان کی تاریخی تحقیقات کا مایہ ناز سرمایہ ہے۔"[4] یہ اور ان جیسے دیگر بہت سارے اقوال میں الجھنا بسا اوقات ہمارے لئے حقائق کو صحیح رخ سے دیکھنے، پرکھنے، اور کارناموں کی قدر و قیمت کی ٹھیک ٹھیک روپ ریکھائیں اجاگر کرنے میں مفید نتائج تک رسائی کے بجائے ان سے دوری کا سبب بن جاتے ہیں۔

سچ بات تو یہ ہے کہ سید صاحب کی مختلف الجہات شخصیت اور ان کی علمی و ادبی کاوشوں کے تنوعات کی زنگارنگی، انسانی ذہن کو مزعومات کے مختلف الگ الگ خانوں میں رہ کر سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ لیکن سید صاحب کی شخصیت کو قریب سے دیکھنا اور سمجھنا ہو اور ان کی علمی خدمات کے کسی بھی گوشے سے کماحقہ، روشناس ہونا ہو تو علامہ اقبالؒ کے اس قولِ فیصل کو سامنے رکھ لیجئے — "علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان کے اور کون ہے؟ آج وہ ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں۔"[5] بات بہت حد تک بنتی نظر آئے گی۔

یہ امر معنی خیز بھی ہے اور ایک عجیب اتفاق بھی کہ تاریخ سے غیر معمولی دلچسپی رکھنے والے اس ہندی مورخ کا وطنی تعلق اس خطۂ ارضی سے رہا ہے جہاں اولوالعزم بادشاہوں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے، اور جسے مفکروں اور دانشوروں کا قدیم گہوارہ اور قدیم ہندوستانی تاریخ و ثقافت کا گڑھ سمجھا گیا ہے۔ وطن مالوف دیسنہ سے بودھ گیا، راجگیر، نالندہ، پاٹلی پتر اور اس کے کھنڈرات گویا گھر آنگن کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخی واقعات سے دلچسپی عہد طفولیت سے ہی سید صاحب کے تحت الشعور کا

★ شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

حصہ بنے رہے۔

سید صاحب کو ایک کامیاب مؤرخ بنانے میں خود ان کے مزاج کی سنجیدگی اور سلامت روی کو بڑا دخل رہا ہے۔ جذباتیت اور غیر متعلق باتوں سے پرے رہنا ان کے مزاج کا خاصہ رہا ہے، جس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو واقعات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک واقعہ طالب علمی کا ہے، پھلواری شریف کے تعلیمی ایام میں ایک شریر طالب علم نے سید صاحب کو تنگ کرنا چاہا، اور خود سے ہاتھا پائی پر اتر آیا، ان کے ایک ہم سبق رشتہ دار نے بچانا چاہا تو وہ شریر ان سے بھی مرنے مارنے پر اتر آیا۔ سید صاحب لڑائی بھڑائی کا یہ منظر علٰحدہ کھڑے دیکھتے رہے، جب دوست نے شکایت کی تو بولے: "میں نے کب کہا تھا کہ تم میری طرف سے لڑنے لگو، وہ خود ہی بک بک کرتے کرتے خاموش ہو جاتا۔" دوسرا واقعہ پاکستان ہسٹری کانگریس کے اجلاس منعقدہ ڈھاکہ ۱۹۵۳ء کا ہے، سید صاحب نے اپنے صدارتی خطبہ میں بنگالی زبان کو اردو رسم الخط میں لکھنے کی تجویز پیش کی تھی، اور بنگالیوں نے جلسہ کو درہم برہم کرتے ہوئے پتھراؤ کیا تھا، کچھ ہی دیر بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے اساتذہ معافی مانگنے آئے تو بلا غم و غصہ فرمایا: "جو کچھ میں نے کہا وہ تاریخی حقائق ہیں اور مظاہرہ اور ہنگامہ کرنے سے یہ حقائق تو بدل نہیں سکتے۔"[٦]

اس کے علاوہ عالم اسلامی کا سیاسی انتشار اور معاشرتی انحطاط، برصغیر ہند کی قومی و ملّی فضا، برطانوی تسلّط کے اثرات، سرسید تحریک، استاذ خصوصی علامہ شبلی سے تلمذ اور خود ندوۃ العلماء کا وجود، سید صاحب کے لئے ملّی زندگی کے مسائل اور اسلامی تاریخ و ثقافت سے گہری وابستگی کا سبب بن گئے۔ مزید برآں سید صاحب کی وسعت نظر اور وسعتِ قلبی نے بھی انھیں ایک مذہبی عالم سے ایک بڑا مورخ بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ سید صاحب کی علمی زندگی میں جب مضامین نگاری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو بالکل ابتدا ہی سے تاریخی مضامین ملنے لگتے ہیں، اور شاید ان کی زندگی کا آخری مضمون "دیبل" بھی تاریخ کے موضوع ہی سے متعلق تھا، لیکن سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ تاریخی کتب کے علاوہ ان کے تقریباً ۸۰ تاریخی مضامین میں شاید مشکل سے دو یا تین ایسے مضامین ہوں گے جن میں صرف سلطنت کے اداری تذکرے، سلاطین کے سلاسل اور ان کی سیاسی بھاگ دوڑ سے بحث کی گئی ہو، اس کے برعکس تقریباً کل کے کل مضامین خواہ ان کا تعلق اسلامی تاریخ سے ہو یا ہند کی اسلامی تاریخ سے، صرف سماجی تاریخ اور ثقافتی زندگی کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا تاریخ نویسی کے فن میں انہوں نے اپنے آپ کو صرف SOCIAL AND CULTURAL HISTORY کے لئے وقف کر دیا تھا۔

موضوع کے اعتبار سے اسلامک کلچر سے ان کی دلچسپی شروع سے رہی۔ علی گڑھ منتھلی نومبر ۱۹۰۵ء میں

"اہل اندلس کے اخلاق اور عہد" "الندوۃ فروری ١٩٠٩ء میں" اسلام اور تمدن"، معارف ١٩١٤ء میں "اصول تمدن کیا ہے"، البلاغ فروری ١٩١٦ء میں" اصلاح معاشرت اور اسلام" اور معارف ١٩١٨ء میں "ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں"، جیسے مضامین کا چھپنا اور لندن کے ROYAL ASIATIC SOCIETY کے جلسۂ مارچ ١٩٢٠ء میں پڑھے گئے چینی سفیر کے مقالے "چینی تمدن" پر معارف میں تبصرہ اور انجمن حمایت اسلام کے بیالیسویں جلسۂ اپریل ١٩٢٧ء میں THE SPIRIT OF ISLAMIC CULTURE پر سید صاحب کی تقریر اس حقیقت کی کھلی نشاندہی کرتے ہیں۔

جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا سید صاحب کا شعور بالیدگی اختیار کرتا گیا، وہ اور زیادہ تاریخ کے تمدنی اور ثقافتی حصے سے قریب ہوتے چلے گئے، ان کا خیال تھا کہ "تاریخ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا نام نہیں ہر زمانے میں ملک کی عام علمی، تمدنی، معاشرتی اور اخلاقی کیفیات کا جائزہ لینا تاریخ کا اہم موضوع ہے"[۸] سیاسی سطوت کے ساتھ ساتھ تمدنی عظمت کی صحیح تصویر بھی ازبس ضروری ہے۔

تاریخی شعور کی پختگی بالآخر انہیں ایک مخصوص فلسفۂ تاریخ تک پہونچا دیتی ہے۔ ان کے خیال میں تاریخ نویسی ایسی ہونی چاہیے "کہ گذشتہ قوموں کے واقعات سے موجودہ نسلوں کی ذہنی پیاس بجھے اور وہ اپنے ماضی کی صحیح تصویر دیکھ کر اپنے مستقبل کو امید افزا پائیں" کیونکہ اگر ماضی شاندار ہے تو مستقبل کو شاندار بنانے میں حوصلہ بڑھتا ہے، اور قومی خودی پیدا ہوتی ہے، اس لئے "کسی قوم کو نقصان پہنچانے کا ایک کارگر حربہ یہی ہوتا ہے کہ اسکا ماضی خود اس کے سامنے بہت ہی برے اور نفرت انگیز طریقے پر پیش کیا جاتا ہے، جس سے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر اپنی تمام تاریخی اور تمدنی روایت سے رفتہ رفتہ متنفر ہو جاتی ہے"[۹] اس طرح سید صاحب کے نزدیک موجودہ دور میں مسلمانوں کی "تمدنی تاریخ" لکھنے کی ضرورت ایک زندہ حقیقت بن جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا ہے تو مسلمانوں کی قومی زندگی کو ایک بڑا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

اسلامی تاریخ نویسی کے ایک حصے کے نقائص کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ معاصر فارسی تاریخیں عہد سپہ گری میں ایرانی مذاق کے مطابق لکھی گئیں، اس زمانہ میں سب سے بڑا ذاتی وصف سپہ گری میں کمال حاصل کرنا تھا، ہر فرد اپنا جوہر میدانِ جنگ میں دکھانا اپنا فخر سمجھتا تھا، اہل قلم، اہل سیف کی طرح لڑائی کے میدان میں شریک نہ ہو سکتے تھے، تو اپنی سپہ گری کے سارے جذبات کاغذ کے صفحات پر منتقل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس لئے ان کی ساری تاریخیں جنگ وجدل اور معرکہ آرائی کا مرقع ہیں، جن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کی تاریخ محض کشت وخون کی داستان ہے، مورخوں کے ان ذاتی رجحانات کی بنیاد پر تاریخ کے بہت سے اہم رُخ پر پردے پڑ گئے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے سلاطین نے

لڑنے بھڑنے کے سوا کوئی اور کام ہی نہیں کیا"۔ ——————

——— "ان ایرانی مذاق کے مورخوں نے بادشاہی درباروں سے باہر نکل کر دنیا کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے نزدیک بادشاہ کا دربار ہی ساری دنیا تھی"۔ عرب مورخوں کے یہاں حالات قدرے تشفی بخش ہیں لیکن وہاں بھی تاریخ نویسی کا حق ادا نہیں ہوتا۔ سید صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں: "عرب اور ایرانی مؤرخوں کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے، عرب مؤرخ دربار کا مؤرخ نہیں ہوتا، بلکہ زمانہ کا مؤرخ ہوتا ہے، اس لئے تاریخ کی تقسیم بادشاہوں کے نام پر نہیں بلکہ سال پر ہوتی ہے۔ طبری، ابن اثیر، ابوالفدا وغیرہ مورخوں نے اسی طرز پر اپنی تاریخوں کی بنیاد ڈالی ہیں۔ عرب کا مؤرخ نہ صرف بادشاہوں کی جنگ وصلح کے واقعات زیر تحریر لاتا ہے بلکہ ضمناً اس زمانہ کے تمدنی، علمی اور معاشی حالات بھی ضرور قلم بند کرتا جاتا ہے، گو ان میں ترتیب نہیں ہوتی"۔ سطور بالا کی روشنی میں ہم یہ اندازہ کرنے میں خود کو حق بجانب محسوس کرتے ہیں کہ تاریخی شعور کی جن بلندیوں تک سید صاحب کی رسائی ہو چکی تھی ان کا یہ فطری تقاضا تھا کہ اسلامی تاریخ کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا جائے، اور تاریخ نویسی میں اب تک کی کوتاہیوں کا ازالہ کرتے ہوئے اس خلا کو بھی پر کیا جائے، جو اب تک پر نہیں ہو سکا تھا۔ عربی تاریخوں میں بھی تمدنی، علمی، اور معاشی حالات ضمناً آئے تھے اور ان میں ترتیب بھی نہیں ہوتی تھی، ضرورت تھی کہ عام تاریخ نویسی سے ہٹ کر مکمل اور جدید ڈھنگ سے ایک ایسی تاریخ لکھی جائے جو صرف تہذیب و تمدن سے متعلق ہو۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ عالم اسلامی میں میری اطلاع کی حد تک پہلی مرتبہ ۱۹۲۹ء میں ایک ساتھ دو کتابیں خاص اسلام کی "تمدنی تاریخ" سے متعلق وجود میں آئیں۔ ایک مصری مؤرخ احمد امین کی "فجر الاسلام" اور دوسری سید سلیمان ندویؒ کی "عرب وہند کے تعلقات"۔ فجر الاسلام کے سلسلے، عربوں کی ثقافت وتمدن کی ایک مجموعی تاریخ ہے۔ "عرب وہند کے تعلقات" ثقافت کے اس حصے سے بحث کرتی ہے جس میں صرف عرب وہند کے کلچرل روابط سے بحث کی گئی ہے، احمد امین کے فجر الاسلام کے سلسلوں اور سید صاحب کی کتاب میں بڑا فرق ہے۔ فجر الاسلام تاریخ ادب عربی کے لئے عربوں کی علمی و ذہنی کاوشوں INTELLECTUAL ENDEVOURS کی داستان پیش کرتی ہے، اس میں تاریخی تحقیق کا وہ معیار بھی نہیں ملتا۔ جو سید صاحب کے حصے میں آیا بلکہ بعض حقائق کی وہ تصویر سامنے آگئی جو اسلامی تاریخ سے قطعاً تال میل نہیں کھاتی۔ عہد عباسی کے مذہبی حالات کے عنوان سے احمد امین کی تحریروں کا ذرا مطالعہ کیجئے، آپ کو وہ باتیں ملیں گی جن سے پورے اسلامی معاشرے کا ایک نہایت مبتذل نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

"عرب وہند کے تعلقات" کلچرل روابط کے مخصوص فن پر ایک ایسی تفصیلی اور تحقیقی اسلام کی پہلی

باضابطہ تمدنی تاریخ ہے جس کی نظیر ہمیں خود اسلامی تاریخ نویسی میں کہیں نہیں ملتی۔

تاریخ نویسی میں سید صاحب غیر معمولی بصیرت، تنقیدی شعور، اور ایک اچھے مورخ کا منصفانہ اور محققانہ رنگ پیش کرتے ہیں۔ مشاہدۂ فطرت، معائنۂ حقیقت اور مطالعۂ واقعات ان کی تاریخ نویسی کے اہم اجزاء ہوتے ہیں۔ سید صاحب نے ہند کے دو مورخوں کو اہم بتایا ہے، ایک امیر خسرو اور دوسرے میر غلام علی آزاد بلگرامی، کہتے ہیں: "میر غلام علی آزاد سے بڑا ہندوستان کا کوئی مسلمان مورخ اور عربی شاعر اس ملک میں پیدا نہیں ہوا۔ انہوں نے "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان"[13]۔ عربی میں لکھ کر ہندوستان کی زمین کو آسمان بنا دیا۔ مسلمان مورخوں کے لیے ان بزرگوں کا یہ طریقہ ان کی تقلید کے قابل ہے"[14]۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی و علمی ترقی پر مقالہ لکھتے ہیں تو ہندو مورخین کے سوانحی خاکوں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے اپنی سلامت طبع اور مورخانہ رواداری کا غیر معمولی ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اسی مقالے میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "مسلمانوں کے آفتاب دولت نے ہندوستان کے افق سے طلوع ہو کر ملک میں جو روشنی پھیلائی ہے ہم چاہتے ہیں کہ تاریخ کے منشوری شیشہ کے ذریعہ سے اس کی تحلیل کر دیں تاکہ ہر صاحب بصیرت کو نظر آجائے کہ واقعہ کیا ہے[15]!"۔ پھر برادران وطن کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "آج یورپ کے دعوائے آزادی و مساوات کے شور و ہنگامے نے دنیا کو چھا لیا ہے۔ ممالک مفتوحہ میں اشاعت تعلیم کی کثرت ان کا بیان ہے کہ صرف ہمارے دورِ حکومت کی خصوصیت ہے، ہم کہتے ہیں کہ بجا ہے اور درست ہے۔ جاؤ اور انگریز قلم کی تصنیفی فہرست کا ایک ایک ورق پڑھ ڈالو، ان کی انسائیکلوپیڈیا میں الٹ ڈالو ان کی تاریخ اور تذکروں کو چھان ڈالو، اس تفحص، اس تلاش اور اس محنت کے بعد ہم کو بتاؤ کہ مغرور انگریز قلم کی آب حیات نے تمہارے کتنے علماء و فضلاء اور شعراء کے نام زندہ کیے اور کتنے اس قابل سمجھے گئے کہ حکمراں قوم نے اپنی شاہی زبان میں اور اس پریس کے عہد میں ان کے تذکرے لکھے؟ پھر کیا ظالم بت شکن اور ملیچھ مسلمانوں کی یہ علمی آزادی و مساوات نہ سمجھی جائے گی کہ انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں قوموں کے فضلاء کو ایک نظر سے دیکھا، اور اس حکمراں قوم نے اپنی شاہی زبان کے علمی درباروں میں دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی[16]!"۔ تاریخی ادب سے متعلق ان کی تحقیقات کے جائزے میں اگر فن کی بات کی جائے تو عمومی حیثیت سے "سیرۃ النبیؐ"[17] اور مختلف تذکرے بھی تاریخ کے فن کا ایک حصہ قرار پاتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف سید صاحب کی سیرت رسولؐ سے متعلق "سیرۃ النبیؐ"، "رحمت عالم"، "خطبات مدراس" اور دوسری طرف تذکرے سے متعلق "سیرۃ عائشہؓ" "حیاتِ شبلی" اور "خیام" میں بھی ہم ان کے قلم کی تاریخی موشگافیوں کی جھلک پاتے ہیں۔ قرآنیات پر اپنی کتاب "ارض القرآن" کو بھی سید صاحب نے "سیرۃ النبیؐ" کا دیباچہ بتایا

ہے، جس میں قدیم عرب کی محققانہ تاریخ اور جغرافیہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں یہ دراصل نسل انسانی کے تہذیبی ارتقاء کا جائزہ ہے"[۱۲]۔ شاید اسی رخ کو سامنے رکھتے ہوئے سید صاحب کا دعویٰ تھا کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی۔ "یادرفتگاں" میں وفیات کے عنوان سے جو کچھ آپ کے قلم سے سامنے آیا، ان کے بارے میں سید صاحب نے خود کہا ہے کہ اس سے آئندہ مورخ کو بڑی مدد ملے گی، معارف کے "باب الانتقاد" میں تاریخی مضامین اور کتب پر تبصرے بھی ان کی تاریخی بصیرت کے غماز ہیں، اور بجا طور پر ان کی تاریخ نگاری کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔

سید صاحب کی علمی و ادبی کاوشوں کا وہ حصہ جو خاص "تاریخی ادب" سے متعلق ہے، ہم اسے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) **تاریخی کتب:** اس حصے میں "عرب و ہند کے تعلقات" اور "عربوں کی جہاز رانی" دو کتابوں کا نام آتا ہے۔

(۲) **تاریخی مضامین:** میرے جائزے کے مطابق ان مضامین کی تعداد تقریباً ۸۲ تک پہنچتی ہے جن کو درج ذیل سات ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ہند اور سندھ کی تاریخ سے متعلق
۲۔ اسلامی تاریخ و ثقافت سے متعلق
۳۔ مورخین سے متعلق
۴۔ تاریخی کتب سے متعلق
۵۔ انجمنوں یا کانفرنسوں سے متعلق خطبات و مقالات
۶۔ سفرنامے
۷۔ مقدمات، دیباچے اور تعارفی نوٹس۔

آئیے اب سید صاحب کی اہم ترین کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" کا جائزہ لیں۔ میرے سامنے اس کتاب کا ۱۹۷۹ء کا ایڈیشن ہے جو مطبع معارف اعظم گڑھ سے طبع ہوا ہے۔ کتاب پانچ ابواب کے ساتھ ۴۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۲۹ء میں ہندوستان اکیڈمی الہ آباد میں دئے گئے خطبات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ سعید الحق دسنوی کے ہاتھوں اس کتاب کا پہلا انگریزی ترجمہ قسط وار اسلامک کلچر حیدرآباد میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۳ء تک چھپتا رہا۔ دوسرا ترجمہ پروفیسر محمد صلاح الدین صدر شعبہ عثمانیہ یونیورسٹی نے پیش کیا، جو ڈاکٹر عبداللطیف کے مختصر انگریزی دیباچے کے ساتھ

INSTITUTE

OF INDO-MIDDLE EAST CULTURAL STUDIES نے ۱۹۶۲ء میں حیدر آباد سے شائع کیا۔

ان محرکات کا اگر پتہ چلایا جائے جن کی بنا پر سید صاحب کے ہاتھوں اس وقیع کتاب کا وجود عمل میں آیا۔ تو ہمیں کئی باتیں قدرِ مشترک کے طور پر نظر آئیں گی۔ سید صاحب کے "تمدنی تاریخ" کے نظریے کے سلسلے میں گزشتہ مباحث سے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ان کی تاریخی نگارشات ترقی کے مختلف مراحل سے گزر کر جب اس موڑ پر پہنچیں جسے ہم شباب کا دور کہہ سکتے ہیں تو ان کے سحر طراز قلم کی رعنائی "عرب و ہند کے تعلقات" میں ظاہر ہوئی۔

ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ سید صاحب کی اسلام کی تمدنی تاریخ سے جیسے جیسے دلچسپی بڑھتی گئی ان کے تاریخی شعور کو بھی بالیدگی حاصل ہوتی چلی گئی، اور ایک وقت وہ بھی آیا جب ان کے ذہن میں یہ بات صاف ہو گئی کہ اسلامی تاریخ میں اسلامی تمدن و ثقافت کا جزو نہ صرف ضروری ہے بلکہ کسی قوم کی CULTURAL HISTORY کو اگر تاریخ میں بگاڑ کر پیش کیا جائے تو یہ چیز ایک حربہ بھی بن سکتی ہے۔ اسی احساس کی کرشمہ سازی تھی کہ سید صاحب کو اس بات کے سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ دانش ورانِ یورپ اور مارکسی نظریات کے حامل مفکرین و مؤرخین کی پیش کردہ CULTURE OF AJAM کی تھیوری اسلامی تاریخ اور اسلامی تمدن کے خلاف دراصل ایک حربہ ہے، اس تھیوری میں یہ تصور پیش کیا گیا تھا کہ اصل اسلامی روح جو "عرب کلچر" کی شکل میں پیدا ہوئی اس کے تہذیبی و تمدنی آثار ایران و عجم سے شروع ہوتے ہیں کیونکہ تہذیب تو شہروں سے شروع ہوتی ہے، عرب کا ریگستان اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

پھر ایرانی تہذیب و تمدن کی تنقیص و تنقید پیش کر دی گئی، اس طرح انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "عرب کلچر" کی شکل میں اسلامی کلچر تو اوائل اسلامی عہد میں ہی دم توڑ گیا تھا۔ جس اسلامی کلچر کی بات کی جاتی ہے وہ سراسر عجمی تھا۔ اور خود "عجم کلچر" بقول پروفیسر محمد حبیب ہلاکو کی ستم خیزیوں کے بعد تیرہویں صدی عیسوی میں جسم و جان کے ساتھ ہندوستان چلا آیا تھا اور صرف یہیں پروان چڑھا۔[۱۸] پھر ہندوستان میں بھی مستشرقین نے علم و تحقیق کی راہ سے اسلامی تاریخ اور ثقافت پر حملے کی ابتدا کر دی۔ سر ہنری ایلیٹ کی کتاب HISTORY OF INDIA AS TOLD BY IT'S OWN HISTORIANS اسی سلسلے کی ایک اہم ترین کڑی ہے۔ سید صاحب نے قرینۂ اغلب ہے کہ اسی خطرناک صورت حال سے نبرد آزمائی کے لئے خصوصیت سے ہند کی سرزمین کا انتخاب کرکے عرب و ہند کے تعلقات کی عہد ساز کلچرل تاریخ تصنیف کی۔ اس کتاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے

کہ ثقافتی تاریخ کچھ اس طرح سے پیش کی جائے جو جدید تحقیق و تنقید کے معیار پر پوری اترتی ہو اور مغربی تاریخ نویسی کے مقابلے میں پیش کی جا سکے۔ ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں ایلیٹ صاحب کی کتاب تقریباً حرفِ آخر سمجھی جاتی تھی۔ سید صاحب نے نہ صرف اس کتاب کی کم مائیگی کو ظاہر کر کے اس کے ناپاک ارادوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر رکھ دیا" بلکہ تاریخ کے فن کو بہت آگے بڑھا دیا۔ "عرب و ہند کے تعلقات" میں تقریباً پندرہ بیس عرب مؤرخین اور جغرافیہ نویسوں اور ان کی اہم ترین تاریخی کتب کی تفصیل پیش کرنے کے بعد وہ یوں تحریر فرماتے ہیں: "اگر ان تمام کتابوں سے ہندوستان کے متعلق حالات و بیانات کو یکجا کر دیا جائے تو ایلیٹ صاحب کے ادھورے کام کی تکمیل ہو جائے، اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کے متعلق بہت سے نئے معلومات ہمارے سامنے آ جائیں۔ اس کا افسوس ہے کہ یورپین مؤرخوں نے قدیم ہندوستان کے بیان میں یونانی بیانات کو جو اہمیت دی ہے، اور اس کی بال کی کھال نکالنے، اور جھوٹ کو سچ کر دکھانے، اور ایک ایک نام کی تحقیق و تطبیق میں جو محنت کی ہے اگر اس کا کچھ حصہ عربوں کے بیانات پر بھی وہ صرف کرتے، تو یونانی اور فارسی تاریخوں کے درمیان جو چند صدیوں کا غار رہ جاتا ہے وہ بہت کچھ پٹ جاتا"[١٩]۔

بقول شاہ معین الدین ندوی "انگریزوں نے سیاسی مصالح کی بنا پر جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہندوؤں سے مسلمانوں کا تعلق محض فاتحانہ اور حاکمانہ ہے، اور وہ سندھ کی اسلامی حکومت کو چھوڑ کر ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق غزنوی عہد سے شروع کرتے ہیں جس کا مقصد ان کے نزدیک ہندوستان کی دولت سمیٹنا تھا۔ مگر عربوں کا تعلق بہت پہلے سے تھا" عرب ایک تاجر قوم اور مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی کڑے تھے، ظہورِ اسلام کے بعد، ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے بہت پہلے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان علمی، مذہبی اور تمدنی ہر قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے، اور ہندوستان کے جنوبی ساحلی علاقوں میں ان کی آبادیاں قائم ہو گئی تھیں۔ "عرب و ہند کے تعلقات" میں ان تمام پہلوؤں کو بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے"[٢٠]۔

جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے "عرب و ہند کے تعلقات" میں سید صاحب کا طرزِ نگارش صرف "تاریخی ادب" کے دائرے میں نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے سادگی و پرکاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔ "سیرۃ النبی" میں استاذِ خصوصی علامہ شبلیؒ کے قلم سے قلم ملا کر چلنے والا، اور "الہلال" میں مولانا ابو الکلام آزاد کی تحریروں سے تحریریں ملا کر پیش کرنے والا سید جب تاریخ و تحقیق کی روشنی میں "عرب و ہند کے تعلقات" کا جائزہ لیتا ہے تو ایسی سادگی و پرکاری کی مثال پیش کرتا ہے، جسے اردو میں سہلِ ممتنع کی اچھوتی مثال کہہ سکتے ہیں،

اگر غور سے دیکھا جائے تو سلامت طبع کا جوہر، عربی و فارسی کے ساتھ اُردو زبان پر غیر معمولی قدرت اور ادبی ذوق، علوم اسلامی میں تبحّر اور وسعت مطالعہ، علمی مسائل میں تفقّہ کا وہ رنگ جو تاریخی حقائق کی بصیرت اور تحقیق و تنقید کو باہم آمیز لے کر چلنے سے پیدا ہوتا ہے، اور قرآنی اسلوب کا تتبع وہ عناصر ہیں جنھوں نے سید صاحب کی تحریروں کی سلامت روی کو خاص طور سے "تاریخی ادب" کے دائرے میں سادگی و پرکاری کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جو ان کے اسلوب کو مخصوص رنگ و آہنگ عطا کرتے ہیں، ہمیں یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ "عرب و ہند کے تعلقات" میں سید صاحب کے اسلوب نے فن کے دائرے میں اردو کو ایک سائنٹفک زبان کا تحفہ پیش کیا ہے جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

لفظ "برامکہ" کی تحقیق پیش کرتے ہوئے تاریخی شواہد کی روشنی میں یوں لکھتے ہیں: "حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کی تشریح اس راز کے فاش ہونے پر موقوف ہے کہ بلخ کا یہ معبد کیا درحقیقت مجوسیوں کا آتشکدہ تھا؟ اور کیا اس خاندان کا مذہب اسلام سے پہلے آتش پرستی تھا؟ اس کا جواب ایرانیوں کی طرف سے تو یہی ملے گا کہ ایسا ہی ہے، یہ معبد آتشکدہ تھا اور ان کا مذہب آتش پرستی تھا۔"[21]

"لیکن میرے نزدیک یہ قطعاً غلط ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ برامکہ بودھ مذہب کے پیرو تھے، اور ان کا اصل تعلق ہندوستان سے تھا نہ کہ ایران سے۔ یہ سچ ہے کہ برامکہ کو زمانہ کے بعض ہجو گو شاعروں یا بدظن لوگوں نے صریحاً مجوسیت کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ عربوں کو عجم کے باشندوں میں مجوسیوں کے سوا کوئی اور مذہب اور قومیت معلوم نہ تھی، دوسری بات یہ ہے کہ ایرانیوں اور برمکیوں کی سیاست کا اقتضا یہ تھا کہ وہ آپس میں عجمی بن کر ایک دوسرے کے معین و مددگار بنے رہیں، گو کہ آخر تک یہ تعاون دونوں سے نہ نبھ سکا۔ اور یہی سبب برامکہ کے زوال کا ہوا۔"[22]

حوالے: ۱- مقالات سلیمان، حصہ اول ص ۱ ۲- ابوالحسن ندوی، پرانے چراغ ص ۴۳ ۳ و ۴- مقالات سلیمان حصہ اول ص ۲ ۵- عبدالقوی دسنوی، یادگار سلیمان ص ۹ ۶- زبیر صدیقی، معارف سلیمان نمبر ص ۲۴۳ ۷- تفصیل کے لیے یادگار سلیمان کے آخر میں مضامین کی مرتبہ فہرستیں ملاحظہ کی جائیں ۸ تا ۱۲- مقالات سلیمان، حصہ اول ۲۹۸، ۳۸۹- ۳۹۱ ۱۳- تحقیق کردہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی، ۱۹۸۶ء میں علی گڑھ سے دو حصوں میں شائع ہوئی ۱۴ تا ۱۶- مقالات سلیمان حصہ اول ۳۸۳، ۳۳-۳۴، ۳۶-۳۷ ۱۷- معارف سلیمان نمبر ص ۲۷۶

18. Prof. MOHD. HABIB: INTRODUCTION TO THE ALIGARH EDITION (1952) OF ELLIOT & DOWSON'S HISTORY OF INDIA AS TOLD BY ITS OWN HISTORIANS VOL. II. P. 44

۱۹- عرب و ہند کے تعلقات ص ۴۳ ۲۰- معارف سلیمان نمبر ص ۱۹۵ ۲۱ و ۲۲- عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۰۶، ص ۱۱۳

حبیب ریحان ندوی★

نقد و نظر

راقم الحروف اپنی علمی بے بضاعتی سے پوری طرح واقف ہے اور وقت کی کمی بھی کسی تفصیلی کام کے پیش کرنے سے مانع ہے۔ اس لیے یہاں "مطالعہ سلیمانی: تبصرہ و تنقید" کے نام سے سید صاحب کی بعض علمی و تحقیقی و ادبی عبارتیں درج کی جائیں گی، اور ان پر مختصر تبصرہ و تنقید کی جائے گی۔ یہ موضوع بہت تفصیلی ہے، تشنگی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

جس عظیم اسلام کی ترجمانی سید صاحب نے عمر بھر کی اور اسلامی تعلیمات کو عام فرمایا، اس اسلام کے مکمل قیام کی کوششیں صدیوں سے ہو رہی ہیں اور ہندوستان میں بھی ہوتی رہی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے سید صاحب سے سوال کیا تھا کہ کیا بات ہے احیاءِ اسلام کی جتنی بھی تحریکیں اٹھتی ہیں بالآخر سب کا انجام ناکامی پر ہوتا ہے۔ سید احمد شہید رائے بریلوی، مولوی محمد اسمٰعیل شہید دہلوی، ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی، مولانا محمد علی، بہادر یار جنگ سب کا انجام کسی نہ کسی صورت میں ناکامی ہی پر ہوا۔ سید صاحب نے اس مشکل سوال کا جواب جس درجہ حقیقت پسندانہ اور منصفانہ دیا ہے، یہ انھیں کا مقام ہے اور ان کے اصول تنقید کو بھی اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ کسی چیز پر حکم لگاتے وقت وہ تمام تاریخی و سیاسی پس منظر سے بھی واقف ہوتے ہیں اور اشخاص کی محبت اور ان کی مخلصانہ جدّ و جہد کا اعتراف کرتے ہوئے بھی وہ کامیابی و ناکامی کے تحلیلی نتائج بیان کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ غور کیجئے سید صاحب نے درج ذیل عبارت میں اصلاح حال اور نظام اسلامی کے کامیاب اور احیاء اسلام کی کوششوں کے بار آور نہ ہونے کا طریقہ علم و عمل اور دین و عقل کی ہم آہنگی کے ساتھ وہی بتایا ہے جو درس گاہ نبوی کے تربیت یافتوں میں تھا: "آگے آپ نے جس عقدہ کا حل مجھ سے چاہا ہے، اس کے حل کرنے کے اہل آپ ہی ہیں کہ آپ کی نظر مشرق و مغرب پر ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ لوگ اسلام کا نام لے کر اٹھے مگر مسلمان ہو کر نہیں اٹھے، اب بھی یہی ہو رہا ہے کہ شیر کی کھال اوڑھ کر شیر بننا چاہتے ہیں جو دین دار ہیں وہ دنیا سے جاہل اور جو دنیا دار ہیں وہ دین سے غافل، حضرت فاروقؓ کی شان میں

★ معہد الامام مالک الدینی، البیضاء، لیبیا۔

ایک سفیرِ اسلام نے کہا کہ وہ نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں اور نہ خود کسی سے دھوکہ کھاتے ہیں۔ جہاں دین ہے وہاں عقلِ عملی نہیں ہے، جہاں عقلِ عملی ہے وہاں دین نہیں ہے، جہاں جوش ہے وہاں ہوش نہیں اور جہاں ہوش ہے وہاں جوش نہیں۔"[1]

سید صاحب کی یہ عبارت بہت اہم ہے اور حق و انصاف پر مبنی ہے جس سے ان کی ناقدانہ بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے، ایک مقولہ ہے: "شیخ الاسلام ہمیں محبوب ہیں لیکن حق ان سے بھی زیادہ محبوب ہے۔" ابن قیم کا یہ قول گویا سید صاحب کی تنقید و تبصرہ کا سب سے اہم اور پہلا اصول ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کا علمی و تحقیقی جو مقام ہے اور سید صاحب ان کا جس طرح احترام کرتے ہیں اور ان کو اپنا محسن مانتے ہیں اور عہدِ جدید کا معلمِ اول اور جدید و قدیم کا سنگم سمجھتے ہیں اس کے باوجود وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ شبلی عظیم انسانوں ہی کی طرح ایک انسان ہیں اور خطاء و نسیان کیونکہ خاصۂ بشر ہے اس لئے وہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اسی لئے سید صاحب نے اپنے استاد کے بعض مسامحات کی نشاندہی کی ہے اور شدید محبت کے باوجود ان کی مجتہدانہ آراء سے بھی اختلاف کیا ہے، جو سید صاحب کی علمی امانت عدمِ تعصب اور روشن خیالی کی علامت ہے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ تنقید کے معنی بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ یقیناً تنقیص پر مبنی ہے اور دوسری بات یہ کہ تنقید نگار اس طرح اپنے آپ کو بڑا عالم سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے، حالانکہ اگر سلف میں یہ نظریہ کام کرتا تو نہ ابو یوسف پیدا ہوتے نہ مزنی نہ ابن القاسم۔

سید صاحب سیرۃ النبیؐ جلد اول دیباچہ طبع چہارم میں تحریر فرماتے ہیں: "کچھ مقام ایسے بھی تھے جہاں اس ہیچمدان جامع کو مصنف کے نظریہ سے اختلاف تھا، اس دفعہ وہاں حاشیہ بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کر دیا، کہیں کسی واقعہ کے اجمال کی تفصیل یا رفعِ شبہ کی ضرورت تھی، وہاں اس ضرورت کو پورا کیا بعض مسامحات پر تنبیہ مناسب تھی وہ کی گئی۔" آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں: "اس نسخہ کی تیاری میں جن خاص باتوں کا خیال رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں: (۱) پوری کتاب کے واقعات کو از سر نو حدیث و سیر کی کتابوں سے ملا کر دیکھا گیا ہے اور اس میں جہاں نقص نظر آیا دور کیا گیا ہے۔ (۲) تصحیحِ بیان، دفعِ شبہ، رفعِ ابہام اور تشریح کے لئے بہت سے توضیحی حواشی بڑھائے گئے ہیں۔ (۳) مصنف کا کوئی بیان اگر نقد اور تنبیہ کے قابل معلوم ہوا تو اس پر نقد اور تنبیہ کی گئی ہے۔" قطع نظر اس سے کہ سید صاحب کی آراء یا توضیحی حاشیے یا تنقید صحیح تھی یا غلط، یا کچھ باتیں صحیح تھیں اور کچھ خطا، کیونکہ اس کے لئے تفصیلی اور تقابلی مطالعہ کی ضرورت ہے، لیکن سید صاحب کی جرأت ناقدانہ کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ سید صاحب چونکہ سلفِ صالح کے نمونے تھے اور شبلی کے تربیت یافتہ تھے اس لئے ان میں اتنی علمی امانت اور جرأت موجود تھی۔ اور یہ ایک فطری، عقلی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شرعی حقیقت ہے کہ کوئی بھی امام فقہ

مجتہد عصر، استاذ الکل، شیخ وقت کتاب وسنت کی روشنی اور شریعتِ اسلامیہ کے احکام کی رو سے تقلید محض کے قابل نہیں، کیونکہ تسلیم ورضا کے شرعی اصول صرف یہ ہیں کہ غیر مشروط اور کامل اطاعت صرف خدا اور رسول خدا کی ہے اور غیر مشروط اتباع صرف کتاب وسنت کی ہے۔ حضراتِ شیخین (ابو بکر و عمرؓ) سے بڑھکر اعلم الناس، افقہ الناس، مجتہد، عادل، امام وقت، نائب نبیؐ اور خلیفہ کامل اور کون ہو سکتا ہے لیکن صحابہ کرام سیاسی و دینی معاملات میں ان سے اختلاف بھی کرتے تھے اور کتاب وسنت کے شرعی دلائل کے بغیر ان کی کسی بات یا رائے کو نہیں مانتے تھے، اسلافِ امت کی علمی وفقہی حیات طیبہ میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

راقم سید صاحب کا شاگرد متعدد وجوہ سے ہے، اسی لئے جس طرح علم وتحقیق ومطالعہ میں راقم "شبلی وسلیمان" کی شاگردی اپنے لئے فخر محسوس کرتا ہے، اسی طرح تنقید میں بھی سید صاحب کے اصولوں کی روشنی میں مجھے اس بات کی ہمت وجرأت ہوئی کہ انتہائی اختصار کے ساتھ چند عبارتیں درج کر کے ان پر ناقدانہ تبصرہ کروں، اور یہ تنقید دراصل سید صاحب کے حکم کی تعمیل میں کی جا رہی ہے۔ سید صاحب خطبات مدراس کے دیباچہ طبع سوم میں تحریر فرماتے ہیں: "اب تیسرے ایڈیشن میں کہ موقع ملا کہ اس پر نظر ثانی کی جا سکے، اس پر بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ایک عاجز انسان کی ہر جنبش قلم ہر اعتراض اور ہر حرف گیری سے پاک ہو سکتی ہے۔" سیرۃ النبیؐ جلد اول میں تحریر فرماتے ہیں: "اب موجودہ نسخہ میں انسانی استطاعت کے مطابق پوری تصحیح کی کوشش کی گئی ہے، تاہم الانسان الانسان ہے، خطاء ونسیان اس کا خمیر ہے، کسی ناظر کتاب کو اب بھی کوئی غلطی معلوم ہو تو وہ ضرور مطلع فرما کر ممنون کرم کریں۔" سبحان اللہ! سید صاحب کی وسعت قلبی، امانتِ علمی اور واضح حق تک پہنچنے اور غلطی سے حتی الامکان بچنے کی خواہش کا اندازہ آپ نے اس عبارت سے کیا، سید صاحب نے یہ شرط تک نہیں لگائی ہے کہ کوئی عالم فاضل مجھے میری غلطی بتائے بلکہ کسی بھی ناظر کو اس بات کی دعوت دی ہے، یہی عالمانہ اور محققانہ مقام ہے اور سلفِ صالح کی یہی مابہ الامتیاز شان ہے۔

حضرت مسیح نے کسی کو بپتسمہ نہیں دیا: سید صاحب حضرت مسیحؑ کے متعلق خطبات مدراس میں تحریر فرماتے ہیں: "لڑکپن میں ایک دو معجزے دکھائے، اس کے بعد وہ غائب ہو جاتے ہیں اور پھر یک بیک تیس برس کی عمر میں بپتسمہ دیتے ہوئے اور پہاڑوں اور دریاؤں کے کنارے ماہی گیروں کو وعظ کہتے نظر آتے ہیں۔"[2] اس عبارت کے ایک لفظ بلکہ ایک حرف پر تبصرہ کرنا مقصود ہے اور وہ ہے "بپتسمہ دیتے" اگر دال کی جگہ لام یعنی "لیتے" ہو اور اصلی عبارت میں کاتب کی غلطی ہو تو پھر کسی

تبصرہ کی ضرورت نہیں لیکن عبارت کے سیاق سے "دیتے" ہی کا لفظ مترشح ہوتا ہے، نیز سید صاحب نے اس پر بار بار نظرِ ثانی بھی فرمائی تھی اور کتاب سنہ ۱۹۲۶ء سے بھی پہلے چھپ چکی تھی اور سنہ ۱۹۵۳ء تک سید صاحب حیات تھے۔

تمام مسیحی فرقوں اور چرچ اور تاریخ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ حضرت مسیح نے بذاتِ خود کسی کو بپتسمہ نہیں دیا اور اناجیل میں بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے آپ کے خود بپتسمہ دینے کی تائید ہوتی ہو، یہ ضرور ملتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے یوحنا المعمدان (حضرت یحییٰؑ) سے بپتسمہ لیا[۳] اور اسی وجہ سے بپتسمہ کی رسم کے خلاف یوروپ میں کئی علماء اور فرقوں نے آواز اٹھائی اور ان کی دلیل یہ تھی کہ مسیحؑ نے کسی کو بپتسمہ نہیں دیا اور ہم مسیح کے شاگرد ہیں نہ کہ یوحنا کے[۴]۔ انجیل یوحنا میں بھی یہ تصریح موجود ہے کہ آپ نے خود کسی کو بپتسمہ نہیں دیا[۵]۔ اس لئے انیس صائغ نے صاف الفاظ یہ لکھ دیئے ہیں "لم یعمد المسیح أحداً"[۶] ترجمہ: "مسیح نے کسی کو بپتسمہ نہیں دیا"[۷]۔ یوحنا کی ایک عبارت سے شبہ ضرور ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسری عبارت سے اس کی تردید بھی ہو جاتی ہے[۸]۔ اس موضوع کی تحقیق اگر مزید مطلوب ہو تو راقم کا مضمون بعنوان "حضرت مسیح نے کسی کو بپتسمہ نہیں دیا"[۹] ملاحظہ فرمائیں۔

اہلِ صفہ کی تعداد: درسگاہ نبوی کے شاگردوں کی مختلف جماعتوں کی تفصیل بہت علمی و ادبی پیرایہ میں بیان فرماتے ہیں، اس ضمن میں رقمطراز ہیں: "ایک چھوٹی جماعت ان ستر صحابہ (اہلِ صفہ) کی ہے جن کے پاس سر رکھنے کے لئے مسجد نبوی کے چبوترہ کے سوا کوئی جگہ نہ تھی"[۱۰]۔

سید صاحب اگر اہلِ صفہ کی تعداد کو اس طرح ستر کے عدد میں محصور نہ فرماتے تو بہتر تھا، کیوں کہ مذکورہ بالا عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اہلِ صفہ کی تعداد ستر ہی تھی وہ اس سے نہ کم ہوتے تھے نہ زیادہ حالاں کہ واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ اہلِ صفہ وقتاً فوقتاً گھٹتے اور بڑھتے رہتے تھے، دراصل مہاجرین جو مکہ سے آئے تھے ان میں سے بعض انصار کے گھروں میں اترے تھے پھر دوسرے مقامات پر جو لوگ مسلمان ہوتے رہے وہ مدینہ شریف آتے رہے۔ یہ اور مکہ کے مہاجرین میں سے جو غیر شادی شدہ تھے اور یوں بھی عام مسلمانوں میں سے جو فقیر اور بے شادی شدہ ہوتے تھے وہ موخرۃ المسجد کے شمالی علاقے میں ایک چبوترہ (صفہ) پر رہا کرتے تھے ان کے نفقہ اور سکونت کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر ہوتی تھی۔ اور حضور پاکؐ اسلامی اسٹیٹ کے فرمانروا کی حیثیت سے ان کی کفالت و سکونت کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے تھے اور مالِ غنیمت اور زکوٰۃ و صدقات کی رقوم اور مالدار مسلمانوں کے چندوں سے ان کی ضروریات پوری فرماتے تھے، وہ گویا اسلام کے مہمان تھے۔ ان میں سے جو کہیں سفر کر لیتے تھے۔ یا مالدار ہو جاتے

تھے۔ یا شادی بیاہ کرلیتے تھے وہ صفہ سے چلے جاتے تھے اور دوسرے لوگ صفہ میں آجاتے تھے، ان کی تعداد کبھی دس کبھی بیس تیس اور کبھی چالیس اور کبھی ستر اور کبھی اس سے بھی بہت زیادہ ہوجاتی تھی اور ان کی مجموعی تعداد کے بارے میں تقریبًا چار سو کی روایت اکثر علمار نے بیان کی ہے، چھ سو، سات سو، اور نو سو تک کے اقوال بھی ملتے ہیں۔

اہل صفہ کے احوال و مناقب و تعداد کے بارے میں بے شمار علمائے اسلام نے گفتگو کی ہے یہاں اس کی تفصیل اور علمی تحقیقات و اختلافات و راجح اقوال بیان کرنے مقصود نہیں ہیں، تفصیل کے لیے قاضی عیاض، حافظ ذہبی، حافظ ابن حجر، حافظ ابن تیمیہ، سیوطی، دار قطنی، ابن جوزی، ابو نعیم اور بے شمار علمار کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے اور اہل صفہ کے متعلق تصنیفات بھی موجود ہیں، یہاں ہم صرف تعداد کے سلسلے میں چند اقوال عبد الحیٔ کتانی سے نقل کرتے ہیں: "اصابہ فی معرفۃ الصحابہ میں اسقع بن واثلہ کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ ابو نعیم نے دلائل میں تخریج کی ہے کہ "ہم صفہ میں بیس آدمی تھے، ہمیں بھوک لگی اور میں ان میں سب سے چھوٹا تھا"... "ابن التلمسانی نے شفا سے انہوں نے کشاف سے نقل کیا ہے کہ اصحاب صفہ مہاجرین و انصار میں سے تقریبًا چار سو آدمی تھے"... اہل صفہ میں تقریبًا مستقل رہنے والوں کی تعداد چار سو تھی": وکان **الراتبون فی الصفۃ نحو أربعمائۃ رجل**... تکملۃ السیوطی لتفسیر المحلی میں ہے کہ آیت الذین احصروا فی سبیل اللہ اہلِ صفہ کے بارے میں نازل ہوئی اور وہ چار سو مہاجرین تھے جو تعلیم قرآن میں مشغول رہتے تھے اور سرایا کے ساتھ خروج کرتے تھے ... اصحاب صفہ کے نام، مناقب و احوال ابن الاعرابی اور سلمی نے کتاب تاریخ اہل الصفہ میں، حاکم نے اکلیل میں اور ابو نعیم نے حلیہ میں بیان کئے ہیں، تو وہ سو سے زیادہ ہیں اور ہر ایک کے پاس ایسے نام ہیں جو دوسرے کی کتاب میں نہیں ہیں... حافظ ابن تیمیہ نے بھی ان کی تعداد چار سو بتائی ہے اور دوسرا قول یہ لکھا ہے کہ چار سو سے بھی زیادہ تھے ... لب اللباب میں ابو العباس احمد بن قاسم الصومعی نے لکھا ہے کہ وہ چالیس تھے پھر چار سو تک پہنچ گئے اور قتادہ کا قول ہے کہ وہ نو سو تک پہونچ گئے تھے[1]

کتانی نے ابن تیمیہ کا جو قول نقل کیا ہے اس کے علاوہ دوسرے اقوال اور بعض مفید باتیں بھی شیخ الاسلام نے اس مسئلہ پر متعدد سوالات کے جواب میں لکھی ہیں جو مطالعہ کے قابل ہیں، ہم یہاں اختصار کے ساتھ تعداد کے متعلق اقوال نقل کریں گے: "تمام اہل صفہ ایک وقت میں جمع نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں سے کوئی شادی کرلیتا تھا یا اسے کوئی جگہ مل جاتی تھی اور وہ اس میں منتقل ہوجاتا تھا، اور لوگوں کے بعد دوسرے لوگ آتے رہتے تھے، کبھی کم ہوجاتے تھے، کبھی بڑھ جاتے تھے، پس کبھی وہ دس یا اس سے بھی کم ہوتے تھے، کبھی بیس اور تیس اور اس سے زیادہ ہوتے تھے، اور کبھی ساٹھ اور ستر، اور جملہ اصحاب صفہ کی تعداد کے بارے

میں کہا گیا ہے کہ وہ چار سو صحابی تھے، اور کہا گیا ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ تھے، اور ان میں سے ہر ایک کا نام معلوم نہیں ہے۔" دوسری جگہ لکھتے ہیں: "ان کی صفت خدا نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ الخ اور ان میں سے ایک دن یوم بئر معونۃ میں ستر شہید ہوئے جن کے غم میں حضور پاک ﷺ نے ایک ماہ تک دعائے قنوت پڑھی... ان کے عدد کے سلسلے میں... کہا گیا ہے کہ وہ چھ سو یا سات سو یا اس کے بقدر تھے اور وہ ایک وقت میں سب جمع نہیں رہتے تھے، بلکہ شمال مسجد کے صفہ پر فقرائے مہاجرین پناہ لیتے تھے اور جو شادی کر لیتا تھا، یا سفر کر لیتا تھا، یا غازی بن کے نکل جاتا تھا وہ اس سے نکل جاتا تھا، ایک وقت میں کبھی ستر بھی ہو جاتے تھے یا اس سے کم یا اس سے زیادہ۔"[۱۲]

اس تفصیل سے حسب ذیل باتیں متعین ہوتی ہیں:

۱۔ عبدالحیٔ کتانی نے تراتیب اداریہ میں تقریباً آٹھ صفحات اہل صفہ کے حق میں لکھے ہیں اور بے شمار علماء اسلام کے اقوال درج کئے ہیں، انھوں نے ایک قول یہ لکھا ہے کہ ایک وقت وہ بیس تھے، ایک قول یہ لکھا ہے کہ پہلے چالیس تھے پھر چار سو ہو گئے۔ اس کے علاوہ تمام قول یہی بیان کئے ہیں کہ وہ تقریباً چار سو تھے اور ایک قول نو سو کا بھی لکھا ہے۔

۲۔ ابن تیمیہ نے لکھا ہے دس یا اس سے بھی کبھی کم ہوئے ہیں اور بیس تیس اور ساٹھ ستر بھی ہوئے ہیں اور اس سے زیادہ بھی ہوئے ہیں، اور ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، ہر وقت ایک ہی نہیں تھی، اور یہ کہ ان سب کے نام معلوم نہیں، اور یہ کہ جملہ اصحاب صفہ کے بارے میں یہ قول ہے کہ وہ چار سو تھے اور چھ سو، سات سو کا قول بھی ہے۔ اس تفصیل کے بعد یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ اہل صفہ کی تعداد ہمیشہ اور ہر وقت ستر میں محصور نہیں کہی جا سکتی بلکہ تراتیب اداریہ میں تو ستر کا عدد تک نہیں پایا جاتا اور ابن تیمیہ نے ستر کا عدد حصر کے لئے استعمال نہیں کیا ہے بلکہ بیس تیس اور ساٹھ کے ساتھ ستر کا لفظ بھی یہ بتانے کے لئے استعمال کیا ہے کہ ان کی تعداد ہمیشہ مختلف رہی تھی اس سے بہت کم بھی ہو جاتی تھی اور زیادہ بھی۔

۳۔ کتانی نے ابن التلمسانی سے بواسطہ شفا و کشاف یہ قول نقل کیا ہے کہ "وہ مہاجرین و انصار میں سے تقریباً چار سو آدمی تھے" لیکن تمام دوسری نصوص سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دراصل وہ فقراء مہاجرین تھے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ فقرائے انصار کے لئے اس صفہ کے دروازے بند ہوں، اس لئے ممکن ہے بعض انصار بھی کبھی کبھار اس میں شامل ہو جاتے ہوں، اس لئے ابن تیمیہ نے پہلے لکھا ہے کہ "وہ چار سو صحابی تھے۔" پھر یہ بھی لکھا ہے کہ "عام اہل صفہ میں فقرائے مہاجرین ہی تھے کیوں کہ انصار اپنے گھروں میں تھے۔"[۱۳]

۴۔ جملہ اصحاب صفہ کے بارے میں چار سو کا قول تقریباً متواتر اور کثرت سے وارد ہوا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن چھ سو سے نو سو تک کے اقوال بھی موجود ہیں اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ جو لوگ باقاعدہ اور کچھ مدت تک صفہ میں قیام پذیر رہے ہوں ان کی تعداد چار سو ہو، کتانی کے ایک قول وکان الراتبون فی الصفة نحوا ربعمائة رجل[۱۴] سے راقم نے یہ استدلال کیا ہے، ممکن ہے یہ استدلال غلط ہو، اور جو لوگ کبھی کبھار قلیل مدت کے لئے رہ گئے ہوں وہ چھ سات یا نو سو تک پہونچ گئے ہوں، والعلم عنداللہ۔

حضورؐ کی نمازوں اور رکعتوں کی تعداد: سید صاحب نے حضور پاکؐ کے عملی پہلو پر بہت جامع تبصرہ فرمایا ہے اور آپ کے اعمال و اخلاق و احکام کے عملی طریقوں کو واضح فرمایا ہے لکچر میں ایک جگہ فرماتے ہیں: "آپ نے لوگوں کو نماز کا حکم دیا، مگر خود آپ کا کیا حال تھا، عام پیروؤں کو پانچ وقتوں کی نماز کا حکم تھا، مگر خود آپ آٹھ وقت نماز پڑھتے تھے، طلوعِ آفتاب کے بعد اشراق کچھ دن چڑھنے پر چاشت، پھر ظہر، پھر عصر، پھر مغرب، پھر عشاء، پھر تہجد، پھر صبح، عام مسلمانوں پر صبح کو دو رکعتیں، مغرب کو تین اور بقیہ اوقات میں چار چار رکعتیں فرض ہیں گویا کل شب و روز سترہ رکعتیں ہیں مگر آنحضرت صلعم ہر روز کم و بیش پچاس ساٹھ رکعتیں ادا فرماتے تھے"[۱۵] ان آٹھ وقت کی نمازوں میں سے ایک وقت یعنی اشراق کی نماز تو خود سید صاحب نے عبادات نبوی کے بیان میں کم کر دی ہے، لکھتے ہیں: "فرض پنجگانہ کے علاوہ آپ کم از کم سنن و نوافل کی ۳۹ رکعتیں روزانہ معمولاً ادا کرتے تھے۔ دو صبح، چار چاشت، چھ ظہر، چھ عصر، چار پہلے اور دو بعد نماز (حسب روایت حضرت عائشہؓ) دو مغرب، چھ عشاء، تیرہ عشاء، و وتر"[۱۶] (عشاء یہاں غلط معلوم ہوتا ہے یعنی طباعت کی غلطی ہے مراد تہجد ہے) اس عبارت میں عصر کی سنتوں کا ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے لیکن اس کی کوئی تفصیل سرِ دست ہم بیان نہیں کریں گے، آگے چل کر ضمناً اس کا تذکرہ بھی آئے گا۔

حضور اور چاشت: اب ضحی یعنی چاشت کی نماز کے مسئلہ کی دو نوعیتیں ہیں، ایک تو یہ کہ کیا حضورؐ نے اس کو کبھی پڑھا یا نہیں؟ اور اگر پڑھا تو کبھی کبھار سفر وغیرہ یا اور کسی سبب سے یا یہ کہ یہ نماز آپ کی خصوصیت تھی اور آپ اس کو ہمیشہ پڑھتے تھے؟ تیسری بات یہ کہ عام لوگوں کے لئے اس نماز کے پڑھنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ سید صاحب نے تیسرے موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کی اور عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ نماز حضور رسالتمآبؐ ہمیشہ پڑھتے تھے اور پابندی سے پڑھتے تھے، کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے چوتھی بات اسی عبارت میں حضورؐ کی نفل نمازوں سے متعلق ہے خطبات مدراس میں فرض اور نفل کی تعداد کم و بیش پچاس ساٹھ لکھی ہے اور سیرۃ النبی میں سنن و نوافل کی ۳۹ رکعتیں روزانہ معمولاً لکھی ہیں۔ انتہائی

ختصار کے ساتھ ان چاروں موضوعات پر ہم نمبر وار گفتگو کریں گے۔

صحیح احادیث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ حضورؐ معمول کے طور پر ہمیشہ صلاۃ الضحیٰ ادا فرماتے تھے۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی نفی والی حدیث کا جواب بار بار یہ دیا جاتا رہا ہے کہ اثبات والی روایات نفی پر مقدم ہیں، یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن اثبات والی احادیث کسی نہ کسی سبب سے متعلق ہیں، مثلاً بخاری میں فتح مکہ کے دن ام ہانی کے گھر میں آٹھ رکعت پڑھنا، یا حضرت انسؓ کا بیان کہ حضور پاکؐ نے انصار کے ایک بہت ضخیم آدمی جو حضورؐ کے ساتھ نماز پڑھنے مسجد میں نہیں جا سکتے تھے ان کے گھر جا کر دو رکعت پڑھیں (تاکہ وہ اس جگہ نماز پڑھا کریں)، حضرت انسؓ سے پوچھا گیا کیا نبیؐ ضحیٰ پڑھتے تھے؟ انھوں نے کہا اس دن کے علاوہ میں نے پڑھتے نہیں دیکھا۔ یہ بھی بخاری کی حدیث ہے۔ اس طرح مسلم شریف کی حدیث میں حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا، کیا نبیؐ ضحیٰ پڑھتے تھے؟ کہا نہیں مگر یہ کہ آپؐ سفر سے واپس آئیں۔ امام بخاری نے سفر و حضر میں ضحیٰ کا باب الگ الگ باندھا ہے۔ الغرض صلاۃ الضحیٰ کی نفی و اثبات میں بے شمار تفصیلات ہیں لیکن ان سب کو پیش نظر رکھکر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضور رسالتمابؐ نے صلاۃ الضحیٰ پڑھی ہے لیکن نہ صرف یہ کہ ہمیشہ نہیں پڑھی بلکہ کبھی کبھار اور کسی نہ کسی مناسبت سے پڑھی ہے۔ لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت جو بخاری میں ہے اور جس میں صلاۃ الضحیٰ کی انھیں وصیت رسول پاکؐ نے کی ہے اس سے اس کی مشروعیت اور جواز و استحباب بعض حضرات کے نزدیک اور واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض علماء کے نزدیک ایسا نہیں ہے اس کی تفصیل اقوال علماء میں کی جائیگی

ابن تیمیہ کے قول سے اس بات کی مکمل تردید ہو جاتی ہے کہ آپ صلاۃ الضحیٰ پابندی سے پڑھتے تھے اس عبارت میں شیخ الاسلام نے کئی نمازوں کو نہ صرف یہ کہ ضعیف بلکہ باطل اور موضوع ثابت کیا ہے جنھیں بعض اہل عراق اور بعض اصحاب شافعی و احمد نے صحیح مان لیا ہے: ”ان حضرات کی کتابوں میں (اوقات و اعداد) مقررہ کی نمازوں کی تعداد ملتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں ایسی احادیث ملتی ہیں جو اہلِ معرفت بہ سنت نبوی کے نزدیک حضورؐ پر جھوٹ ہیں جیسے یہ روایت کہ ”آپ نے عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھیں“ یا یہ کہ ”آپ نے عصر کی سنتیں قضا کیں“ یا یہ کہ ”آپ نے ظہر سے پہلے چھ رکعتیں پڑھیں اور اس کے بعد چار“ یا یہ کہ ”آپ ضحیٰ کی پابندی کرتے تھے“۔“[۱۷۱]

محدثین کے نزدیک اس وضاحت کے باوجود بعض حضرات نے اسے حضورؐ کی خصوصیات میں شمار کیا ہے اور اس کو آپ پر بمنزلہ فرض مانا ہے۔ لیکن سید صاحب کو یہ بات ماننے میں تامل ہے سیرۃ النبی جلد سوم باب خصائص ذاتی میں تحریر فرماتے ہیں: ”اسی طرح چاشت کے وقت نماز عام مسلمانو

کے لئے نفل ہے، مگر بعض احادیث میں ہے کہ یہ نماز آپ پر بمنزلۂ فرض کے تھی۔۔۔ مگر یہ بطریق صحاح مذکور نہیں، اس لئے ہمیں ان کو خصائص نبوی میں شمار کرنے میں اب بھی تامل ہے" حاشیہ میں لکھتے ہیں حوالہ خصائص کبریٰ سیوطی۔[۱۸]

سید صاحب کا یہ تامل بالکل بجا ہے، صحیح ترین احادیث کی رو سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آپؐ نے یہ نماز پابندی سے ادا نہیں کی ہے اور یہ کیسی خصوصی اور فرض نماز ہے جس کی خبر اکابر صحابہ اور آپ سے قریب ترین صحابہ کو نہیں ہو پائی "کہ یہ نماز آپ پر فرض ہو چکی ہے؟ میرے سامنے سیوطی کی نقل کردہ کئی ایسی احادیث ہیں جن سے اس نماز کا کبھی کبھی پڑھنا ثابت ہوتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ پابندی سے پڑھتے تھے اور پھر طویل مدت کے لئے چھوڑ دیتے تھے، دو حدیثوں میں ہے کہ انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا، ایک میں ہے کہ صرف ایک دفعہ پڑھی، ایک میں ہے کہ مجھے صلاۃ ضحیٰ کا حکم دیا گیا اور تمہیں نہیں۔"[۱۹] الغرض یہ احادیث اپنی سند اور معنی کے لحاظ سے احادیث صحیحہ متواترہ کے درجہ تک ہرگز نہیں پہنچ سکتیں اور نہ ان سے کوئی ایسا اہم مسئلہ طے ہو سکتا جو صحاح کے خلاف ہو۔

عام لوگوں کے لیے چاشت کی نماز: طویل تفصیلات سے بچتے ہوئے چاشت کی نماز کا شرعی حکم علماء کے نزدیک کیا ہے؟ ابن قیم نے چھ قول نقل کئے ہیں جو ہم انتہائی اختصار کے ساتھ فتح الباری سے نقل کرتے ہیں: "۱۔ مستحب ۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کسی سبب سے مستحب ہے سبب کے بغیر نہیں جیسے حضورؐ نے فتح مکہ کے دن پڑھی، حضرت خالد بن الولیدؓ نے فتح جیرہ کے دن پڑھی یا ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے جب ابوجہل کے سر کی بشارت دی گئی تب پڑھی، یا آپؐ سفر سے واپسی پر پڑھتے تھے۔ ۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اصلاً مستحب نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے نہیں پڑھی ۴۔ چوتھا قول یہ ہے کہ کبھی پڑھنا مستحب ہے، اور کبھی چھوڑنا، حدیث ابی سعید میں ہے کہ حضور پاکؐ صلاۃ ضحیٰ پڑھتے تھے تو ہم کہتے تھے کبھی چھوڑیں گے نہیں اور چھوڑ دیتے تھے تو ہم کہتے تھے کبھی پڑھیں گے نہیں، حضرت ابن عباسؓ دس دن پڑھتے تھے اور دس دن چھوڑ دیتے تھے، ثوری نے منصور کے حوالے سے کہا وہ اس بات کو برا سمجھتے تھے کہ فرض نماز کی طرح اس کی پابندی کریں ۵۔ پانچواں قول یہ ہے کہ اس کی پابندی گھروں میں مستحب ہے ۶۔ چھٹا قول یہ ہے کہ یہ بدعت ہے، یہ قول عروہ بن عمر کی روایت سے صحیح ہے، حضرت انسؓ سے پوچھا گیا، آپ نے کہا نمازیں پانچ ہیں۔"[۲۰] یقیناً حضرت انس کے قول کا مطلب یہ ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں ورنہ سنتیں اور تہجد وغیرہ کی نمازیں تو مشروع و مستحب و مسنون ہیں۔ اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فرض نماز کی طرح سمجھ کر پڑھنا ان کے

نزدیک بدعت ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ نفل کو فرض سمجھنا بھی بدعت کی تعریف ہے۔

چاشت کی تعداد کے بارے میں کئی اقوال ہیں، افضل ترین چار رکعتیں ہیں کیونکہ کثرت احادیث سے یہ ثابت ہے، نووی نے روضہ میں آٹھ افضل بتائی ہیں اور اکثر کی تعداد بارہ تک علماء نے لکھی ہے۔[۲۱] لیکن جلال الدین سیوطی نے دو، چار، چھ، آٹھ رکعتیں بھی لکھی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ فقہا کا یہ قول کہ بارہ سے زیادہ نہیں اس کی کوئی دلیل نہیں[۲۲]۔

حضورؐ کی رکعتوں کی تعداد: جن مسائل پر گفتگو کی گئی ان کے بعد رکعتوں کی تعداد خود بخود کم ہو جانی چاہیے۔ اس سلسلہ میں حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: "یہ وہ سنن راتبہ ہیں جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں آپ کے قول و فعل دونوں سے ان کا دار و مدار انہیں تین ابن عمرؓ، عائشہؓ اور ام حبیبہؓ کی حدیثوں پر ہے۔ صحیحین میں ہے کہ آپ "فجر سے پہلے دو رکعت، اور ظہر کے بعد دو رکعت مغرب کے بعد دو رکعت اور عشاء کے بعد دو رکعت ادا کرتے تھے" ظہر سے متعلق ابن عمر کی حدیث میں ہے قبل ظہر دو رکعتیں اور حضرت عائشہ رضؓ سے ہے کہ قبل ظہر چار رکعتیں، ام حبیبہؓ سے روایت ہے کہ جو رات اور دن میں فرض کے علاوہ بارہ تطوع (نفل و سنن) پڑھے گا اللہ اس کے لئے جنت میں محل بنائے گا"۔ سنن میں اسکی تفصیل اس طرح ہے ۴ ظہر سے پہلے، ۲ ظہر کے بعد، مغرب کے بعد دو رکعتیں، عشاء کے بعد دو رکعتیں، فجر سے پہلے دو رکعتیں.... اور حضور پاکؐ رات میں وتر ملا کر گیارہ یا تیرہ رکعتیں ادا کرتے تھے، اس طرح آپ کی رات دن کی مجموعی رکعتیں فرض و نفل ملا کر تقریباً چالیس کے قریب ہوتی تھیں[۲۳] آخر میں ایک بات اور واضح کر دینی ضروری ہے کہ اوقات مقررہ و تعداد مقررہ اور ایسی صلوات مقررہ کا پڑھنا صحیح نہیں ہے جو سنتِ صحیحہ سے ثابت نہ ہوں لیکن عام نوافل کی کثرت بہ نیت نفل ہر وقت صحیح ہے اور تقرب الٰہی کا بہترین وسیلہ ہے بشرطیکہ ان کو واجب و لازم نہ سمجھے۔

لفظ صلعم کا استعمال: خطبات مدراس کی گذشتہ عبارت میں اور کئی دوسرے مقامات پر حضور رسالتمآبؐ کے نام گرامی کے ساتھ صلعم کا لفظ لکھا گیا ہے گو اکثر جگہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ نہ سید صاحب کی ایجاد ہے نہ مولانا شبلی کی بلکہ اردو زبان میں یہ اصطلاح رائج تھی جس کی پیروی کی گئی ہے لیکن یہ لفظ "صلعم" ایک عجیب طلسم ہے یہ نہ عربی کا لفظ ہے نہ اُردو کا اور "صلی اللہ علیہ وسلم" کے اختصار کے طور پر اس کا استعمال نامناسب ہے "یہ نہ درود ہے اور نہ اس کا قائم مقام ہے" ذکر اذکار اور تلاوت جیسی تعبدی چیزوں میں غیر مفہوم الفاظ کا استعمال یوں بھی صحیح نہیں اس لئے اس کا استعمال صحیح نہیں ہونا چاہیئے۔ اختصار کی غرض سے اگر صرف (ص) بنا دیا جائے تو گویہ "صلی اللہ علیہ وسلم" کا

قائم مقام تو نہ ہو لیکن نازیبا بھی نہ ہو کہ یہ عربی کا ایک معلوم و معروف حرف ہے۔

ہر چند کہ زندگی میں ایک بار درود پڑھنا فرض ہے اور امام شافعی کی شاذ رائے کے سوا کسی نے اس کو نماز میں واجب کا درجہ نہیں دیا ہے لیکن بہر حال جب بھی حضور نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آئے درود پڑھنا مستحب ہے اس لئے عبارت میں "صلی اللہ علیہ وسلم" ہی لکھنا مناسب اور مستحب ہے۔ خود سید صاحب نے تحریر فرمایا ہے: "حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کے ساتھ صلعم کے اختصار کے بجائے پورا صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ اس تساہل سے درود پڑھنے کی برکت سے ناظرین کو محرومی نہ ہو۔"[۲۴]

سید صاحب نے صرف اس برکت کو مدنظر رکھا ہے، اس لفظ کے نامناسب اور غیر مفہوم ہونے کے پہلو پر روشنی نہیں ڈالی ہے، لیکن سید صاحب کی اس تصریح کو چھپے ہوئے مدت گزر گئی لیکن اب تک خطبات مدراس کے جو تازہ نسخے چھپ رہے ہیں ان میں لفظ صلعم کیوں موجود ہے؟ یہ لفظ اسی طرح اردو میں مستعمل ہو چکا ہے جیسے بسم اللہ کی جگہ پر ۷۸۶ کا ہندسہ، حالانکہ یہ نہ بسم اللہ کے قائم مقام ہے نہ اس سے سنت ادا ہوتی ہے نہ اس کی کوئی علمی حیثیت ہے اور نہ شرعی طور پر صحیح ہے، بعض حضرات کاغذ پر بسم اللہ لکھ کر اس کی بے ادبی کا خدشہ ظاہر کرتے ہیں لیکن یہ عقلی اندیشہ نبوی طریقے کے سامنے کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا، آپ نے کفار و اہل کتاب کو جو خطوط ارسال فرمائے تھے ان میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی گئی تھی۔

زیوروں میں زکوٰۃ: آخر میں ایک اور عبارت پر مختصر سا تبصرہ ضروری ہے۔ سید صاحب نے ۱۹۴۳ء میں "اعتراف و رجوع" کے نام سے ایک مختصر تحریر لکھی تھی جس میں لکھا تھا: "زیوروں کی زکوٰۃ کے وجوب و عدم وجوب کے مسئلہ پر صحابہ کرامؓ سے لے کر اب تک اختلاف چلا آتا ہے، روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ عدم وجوب کی قائل تھیں، سیرت عائشہؓ میں ان کے اس مسلک کی تشریح میرے قلم سے کچھ اس انداز سے نکلی جس سے اس مسئلہ پر ان کی رائے کی تائید ظاہر ہوتی ہے... اس لئے اس غلط فہمی کو دور کر دینا اور کہہ دینا ہے کہ میں زیوروں میں جمہور کے فیصلہ کا قائل اور اس پر بحمدہ عامل ہوں۔"[۲۵] سید صاحب مجتہد وقت تھے انھیں اس بات کی مکمل آزادی تھی کہ صحابہ کرامؓ اور ائمہ اعلام کے درمیان ہمیشہ سے مختلف فیہ قول میں سے دلائل کی روشنی میں جس قول پر چاہیں فتویٰ دیں۔ راقم یہاں اس مختلف فیہ مسئلہ پر بحث کر کے کسی رائے کو ترجیح اس لئے نہیں دینا چاہتا کہ مختلف مذاہب فقہ نے اس مسئلہ پر جتنی تفصیلی بحثیں کی ہیں ان سے زیادہ مفصل بحث نہیں کی جا سکتی اور ان کی روشنی میں

ہر صاحب مذہب و ہر صاحب رائے اپنی رائے کو ترجیح دیتا ہے۔ اور یہ مسئلہ مباحثہ یا مناظرہ سے طے نہیں ہو سکتا۔ لیکن سید صاحب کے قول سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عدم وجوب زکوٰۃ کا قول حضرت عائشہؓ اور چند صحابہؓ کا ہے، ان کے علاوہ اکثریت اور جمہور صحابہ کا قول ایجاب زکوٰۃ کا ہے[۲۵] اس کی مختصر تشریح کرنی ضروری ہے جس میں دلائل اور اصحاب مذاہب کے اقوال پیش کرنے کے بجائے صرف یہ بتاؤں گا کہ کن کن صحابہ و تابعین و ائمہ کا کیا قول ہے؟

صحابہ کرام میں حضرت عائشہؓ، حضرت اسماءؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت انسؓ و حضرت جابرؓ کا قول عدم زکوٰۃ کا ہے[۲۶]۔ ابن حزم نے بھی یہ نام لئے ہیں لیکن حضرت عائشہؓ کے دو قول نقل کئے ہیں اور عدم ایجاب کے قول کی نسبت ان کی طرف صحیح بتائی ہے، پھر اگر جمہور ائمہ فقہ مذاہب کو لیا جائے تو امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ تینوں کا قول زیورات میں عدم ایجاب زکوٰۃ ہے، یہی امام شعبی، عمرہ بنت عبدالرحمٰن، طاؤس، حسن اور سعید بن المسیب کا قول بھی ہے[۲۷]۔ قتادہ، ابو عبید، اسحاق، ابو ثور کا نام بھی انھیں حضرات میں ہے۔ جن صحابہ کرام سے ایجاب زکوٰۃ کا قول مروی ہے وہ یہ ہیں حضرت عمرؓ، ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، اور عبداللہ بن عمرو بن العاص نیز ائمہ مذاہب میں سے امام ابو حنیفہ کا یہی قول ہے، سعید بن المسیب، سعید بن جبیر، عطاء، مجاہد عبداللہ بن شداد وغیرہ کا قول بھی یہی ہے[۲۸]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعید بن المسیب سے دو قول مروی ہیں۔ اس مختصر فہرست کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ عدم ایجاب زکوٰۃ کا قول صحابہ میں کم تعداد کا نہیں ہے بلکہ تقریباً دونوں قول برابر ہیں، نیز اگر ائمہ فقہ کو دیکھا جائے تو ائمہ متبوعین اربعہ میں سے تین اماموں کا قول عدم ایجاب زکوٰۃ کا ہے، ان میں بھی تفصیلات میں تنوع اور اختلاف ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

سید صاحب کا مقام بلاشبہ مجتہد کا مقام ہے آپ تاریخ و سیرت ہی کے امام نہیں بلکہ قرآنیات اور سنت و فقہ کے بھی بہت بڑے ماہر تھے۔

سلام ہو تیری روح پر سید والا جاہ   علم و فضل و کمال کے بادشاہ!

حوالے: ۱۔ نشان منزل، خاص نمبر اگست ۱۹۶۰ء   ۲۔ خطبات مدراس ص ۲۸   ۳۔ متی ۳۰: ۱۳ - ۱۶
۴۔ رسائل انجلیزیہ والیثر، عربی ترجمہ بنام رسائل فلسفیہ ص ۱۳   ۵۔ یوحنا ۴: ۱-۳   ۶۔ قاموس الکتاب المقدس
ص ۹۳۷ حرف عین   ۷ و ۸۔ یوحنا ۲: ۲۲، ۴: ۱-۳   ۹۔ صدق جدید لکھنؤ ۲۱ اگست و ۷ ستمبر ۱۹۷۳ء
۱۰۔ خطبات مدراس ص ۹۸   ۱۱۔ التراتیب الاداریہ ج ۱، ص ۴۷۶-۴۸۰

۱۲ و ۱۳ - مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ج۱۱، ص۴۱ و ص۸۰ - ۸۱ و ص۷۵

۱۴ - التراتیب الاداریہ ج۱، ص۲۴۷ ۱۵ - خطبات مدراس ص۱۱۱

۱۶ - سیرۃ النبی ج۲، ص۲۵۳ ۱۷ - مجموعۃ فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ج۲۴، ص۲۰۱

۱۸ - سیرۃ النبی ج۳، ص۸۳۹ ۱۹ - الحاوی للفتاوی للسیوطی ج۱، ص۴۰ - ۴۱

۲۰ و ۲۱ - فتح الباری لابن حجر المطبعۃ السلفیۃ القاہرۃ ج۲، ص۵۵ و ص۵۴

۲۲ - الحاوی للفتاوی ج۱، ص۲۷ ۲۳ - مجموعۃ فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ج۲۳، ص۳۰

۲۴ - سیرۃ النبی ج۱، ص۴ ۲۵ - حیات سلیمان ص۶۸۰ .

۲۶ - مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ج۲۵، ص۱۷، المغنی لابن قدامہ ج۲، ص۶۵

۲۷ - المحلی ج۶، ص۹۴ ۲۸ - المغنی ج۶، ص۲۰۵ - ۲۰۶

> "دنیا میں کوئی شخص نہیں چاہتا کہ اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ کمزوری کا بھی بے خطر برملا اعلان کرے، خصوصاً وہ لوگ جو ایک جماعت کی رہبری اور رہنمائی اور وہ بھی روحانی و اخلاقی ہادی بنا ہو، لیکن دیکھو کہ قرآن مجید میں متعدد آیتیں ایسی ہیں جن میں آنحضرت صلعم کو ان کی ظاہری لغزشوں پر تنبیہ کی گئی ہے، لیکن ان میں سے ہر آیت آپ نے پڑھ کر سنائی لوگوں نے یاد کی، ہر محراب و مسجد میں پڑھی گئی اور اب تک جہاں محمد صلعم کا نام ہے وہ آیتیں ان کے ماننے والوں کی زبانوں پر ہیں حالانکہ اگر ان معمولی فروگذاشتوں کا قرآن پاک میں ذکر نہ ہوتا تو آج دنیا کو ان کا علم بھی نہ ہوتا مگر ایک پاک زندگی کی ہر چیز روشن ہوئی تھی اور وہ کی گئی۔"

(سید سلیمان ندوی :
[illegible])

محمد یٰسین مظہر صدیقی★

تنقیدی بصیرت

بحوالہ سیرت النبیؐ

علامہ سید سلیمان ندوی کی تمام نگارشات، خواہ وہ کتابوں کی صورت میں ہوں یا مضامین کی شکل میں، اپنے مصنف کی تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ سید صاحب فن نقد کی باریکیوں، جرح و تعدیل کے اصول، سیرت نگاری کے تقاضوں اور مورخانہ ژرف نگاہی کے ساتھ ساتھ علمی دیانت، فکری صلابت اور فنی تقویٰ کا نہ صرف علم و شعور رکھتے تھے بلکہ ان کو اپنی تحریروں میں انتہائی خوبی کے ساتھ برتنا بھی جانتے تھے۔ وہ مآخذ کی فراہم کردہ معلومات و مواد کو روایت و درایت دونوں کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ موضوع بحث سے متعلق تمام روایات و اخبار کا پہلے وہ جائزہ لیتے پھر عیارِ روایت پر پرکھتے، درایت کی نگاہ سے اس کی تحلیل کرتے اور آخر میں ترجیح کے اصول کو کام میں لاتے اور قاری کو عالمِ گومگو میں چھوڑے بغیر دو ٹوک فیصلہ دیتے تھے۔ وہ محض جامع روایات، ناقل اخبار اور واقعات کی کھتونی کرنے والے نہ تھے بلکہ وہ پوری علمی بصیرت اور فنی تقویٰ کے ساتھ تنقید و تحلیل سے کام لیتے اور اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے تھے۔ خواہ اس نقد سلیمانی کی چوٹ کسی مصنف، تصنیف یا رائے و نظریہ پر پڑے۔ حتیٰ کہ نقد و استدراک کے بے رحم دائرے سے انہوں نے اپنی ذات گرامی کو بھی ماورا نہیں جانا تھا۔ چنانچہ تسامحاتِ ذاتی اور غلط روی قلم سلیمانی کا احساس ہوتے ہی وہ نہ صرف اس کا برملا اظہار کرتے بلکہ ضرورت ہوتی تو سابقہ آرا و خیالات سے رجوع بھی فرمالیتے تھے۔

یوں تو تمام نگارشات سلیمانی اس تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہیں، لیکن اس مختصر مقالے میں صرف سیرت النبیؐ کے حوالے سے گفتگو کی جائے گی کیونکہ تمام تصانیف کا تجزیہ و تحلیل کرنے کے لیے متعدد دفاتر کے علاوہ سلیمانی ژرف نگاہی، مختلف علوم و فنون کی بصیرت اور انتہائی علمی صبر و ضبط کی ضرورت ہے جو سرِ دست میسر نہیں۔

★ شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اہل علم اور سخن شناسوں پر یہ حقیقت مخفی نہیں کہ سیرت النبی کی ابتدائی دو جلدیں استاذ الکل علامہ شبلی نعمانی اور شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی کی مشترکہ علمی کاوشیں اور فنی میراث ہیں[1]۔ ایک تجزیاتی مطالعہ نے استاد و شاگرد کے اس علمی اشتراک کے درمیان نہ صرف خط فاصل کھینچا ہے بلکہ ان کی کمیت و کیفیت کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے[2]۔ بقیہ چار ضخیم و مکمل جلدیں اور ایک نامکمل جلد سلیمانی رقمطرازی کا شاہکار ہیں اور ان میں جہاں کہیں کسی دوسرے قلم کی گلکاری نظر آتی ہے اس کا بھرپور اعتراف نہ صرف دیباچہ میں کیا گیا ہے بلکہ متن کتاب میں اس کی واضح نشاندہی کر دی گئی ہے[3]۔ یہ علامہ ندوی کے علمی تقویٰ کی نادر مثال ہے جو ہماری علمی دنیا میں خال خال نظر آتی ہے۔ نقد سلیمانی کا ایک اور مطالعہ جس میں شاگرد رشید نے اپنے استاد محترم کی بعض آراء و نظریات سے اختلاف اور استادانہ تسامحات پر تنقید کی ہے، اس سے پہلے پیش کیا جا چکا ہے[4]۔ لہٰذا اس مطالعے میں نقد استاد سے بالعموم صرف نظر کیا جائے گا تاکہ تکرار کے الزام و ارتکاب سے بچا جا سکے۔ البتہ کہیں اس کا حوالہ برائے تکمیل مطالعہ آ جائے گا۔

استاد مکرم کے مقدمہ بر فن روایت میں روایت احاد کی ظنیت اور قطعیت کے بارے میں علامہ ندوی نے بحث کرتے ہوئے فقہائے احناف کے اس اصول کی یک گونہ تائید کی ہے کہ ”یہ ظنی الثبوت ہیں۔ ان سے قطعیت نہیں ثابت ہوتی۔ اصل یہ ہے کہ روایت احاد کی صحت اور عدم صحت یا ظن و قطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کا بعد خود اصل روایت کی اہمیت اور عدم اہمیت پر مبنی ہے[5]۔“ سید صاحب کے فقہی مسلک کو جاننے کے بعد ان کی یہ رائے اور فقہ حنفی کی تائید ان کی علمی اور تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ اس طرح سورہ حج کی آیت ۱ میں پیروان شریعت اسلامی کا مسلم نام رکھنے والے کی ضمیر کو سید صاحب نے بعض مفسرین کی متابعت میں اللہ تعالیٰ کی طرف پھیرا ہے اور دوسری رائے پر کہ اس کا مرجع حضرت ابراہیمؑ[6] ہیں اپنی رائے کو ترجیح دی ہے[7]۔ ان دونوں مثالوں میں سلیمانی شعور نقد اتنا واضح نظر نہیں آتا جتنا کہ خواب براہیمی کے رویائے عینی یا رویائے تمثیلی ہونے کی بحث میں۔ علامہ ندوی نے پہلے امام ابوبکر بن العربی مالکی مصنف احکام القرآن اور ان کے ہمنوا علماء کی رائے بیان کی ہے کہ انہوں نے ذبح اسمٰعیل کے خواب پدری کو تمثیلی گردانا ہے اور اسی کی متابعت مصنف شبلی نے کی ہے پھر جمہور علماء کے مسلک کو بیان کیا ہے جو اس رویائے براہیمی کو عینی قرار دیتے ہیں اور اسی کو علامہ ندوی نے ترجیح دی ہے اور اپنے استاد گرامی پر نقد کیا ہے کہ موصوف نے ذبح اسمٰعیل کو اجتہادی غلطی کہا تھا۔ کیوں کہ ان کے خیال میں یہ رویائے تمثیلی تھا جس کو حضرت ابراہیمؑ نے اجتہادی غلطی کے سبب عینی سمجھ لیا تھا[8]۔ تعمیر کعبہ کے ضمن میں سید ندوی نے اپنے استاد پر پھر نقد کیا ہے کہ ”محققین کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی منہدم و بے نشان عمارت

کی دوبارہ بنیاد اٹھا کر بلند کی" جبکہ علامہ شبلی نے خیال عام سے اتفاق کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ "دونوں نے ملکر ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی[9]"۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اصل تعمیر کعبہ اور بیت اللہ کی حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے ہاتھوں تعمیر نو پر بڑی تحقیقی اور تنقیدی بحث سیرۃ النبیؐ جلد پنجم اور ارض القرآن جلد اوّل میں کی ہے اور مختلف نظریات و تحقیقات پر بحث کرکے اپنی رائے کو بڑی بصیرت کے ساتھ ثابت کیا ہے[11]۔

علامہ شبلی نعمانی نے بحیرا راہب کے قصہ کو موضوع قرار دیا ہے اور اس پر چھ تنقیدی دلائل قائم کئے ہیں جن میں عیارِ روایت و درایت دونوں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ علامہ ندوی نے استاد گرامی کی تائید میں نقد مزید سے کام لیا ہے اور نہ صرف راوی عبدالرحمٰن بن غزوان کو مجروح قرار دیا ہے بلکہ "واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ سند میں .... دوسرے تمام رواۃ بھی جرح کے قابل ہیں۔" سید صاحب قبلہ نے ان پر مزید سات تنقیدی دلیلوں کا اضافہ کیا، اور ثابت کیا ہے کہ یہ روایت مرسل، منقطع، ضعیف، منکر اور موضوع ہے[12]۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تجارتی سفروں کے سلسلہ میں مارگولیتھ وغیرہ مستشرقین کے اس خیال خام کی بدلائل تردید کی ہے کہ آپ نے سمندری سفر کئے تھے یا کبھی مصر تشریف لے گئے تھے[13]۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے ضمن میں علامہ شبلی نعمانی نے ابن سعد، بلاذری، ابن اثیر، اور ابن عساکر کی مشہور روایت قبول کی ہے، اور بقیہ روایات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ علامہ ندوی نے اس سلسلہ کی تمام روایات کا حصر کرکے ان پر نقد کیا ہے کہ "اس میں شک نہیں کہ بزاز، طبرانی، بیہقی اور ابونعیم میں یہ روایت بھی ہے لیکن حد درجہ کمزور ہے۔" "کیونکہ اس میں حضرت عمر کے سورہ حدید کی ابتدائی آیات پڑھنے کا ذکر ہے جبکہ ان کا قبول اسلام مکی واقعہ ہے۔ دوسری روایت جس میں سورۂ طٰہٰ پڑھنے کا ذکر ہے": "بہ سند ابن سعد، ابویعلیٰ، دارقطنی اور بیہقی میں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے۔ لیکن یہ حد درجہ کمزور ہے۔ یہ دو طریقوں سے مروی ہے اور ان دونوں میں ایسے رواۃ ہیں جو قبول کے لائق نہیں اور محدثین نے اس کی تصریح کی ہے": "دوسری روایت مسند ابن حنبل میں ہے جو خود حضرت عمرؓ سے مروی ہے..... اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں لیکن ابتدائی راوی کی ملاقات حضرت عمر سے ثابت نہیں اس لئے اس میں انقطاع ہے، لیکن حضرت عمر کے اسلام کے بارہ میں سب سے محفوظ روایت یہی ہے۔" علامہ ندوی نے ان روایات کے سلسلہ میں ابن اسحاق پر تنقید کی ہے کہ وہ دونوں روایتوں کو گھٹا بڑھا کر بلا سند بیان کرتے ہیں۔ پھر حافظ ابن حجر پر نقد کیا ہے کہ انہوں نے دونوں روایتوں کو لکھ تو دیا مگر ان میں ترجیح نہیں قائم کی۔ سید صاحب نے بصورت مفروضہ دونوں واقعوں کی صحت کی صورت میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے

کہ مسند ابن حنبل کی روایت کا تعلق اول واقعہ سے اور پہلی روایت کا دوسرے واقعہ سے ہے۔ اس ضمن میں نقد ذات کی ایک مثال بھی ہمیں دستیاب ہوتی ہے۔ سید صاحب قبلہ نے ابن سعد وغیرہ کی روایت کو طبع اوّل میں ..... "لکھا تھا کہ وہ 'بسند صحیح' مذکور ہے، مگر تحقیق سے یہ واقعہ اس 'رتبہ صحیح' کا نہیں ثابت ہوا۔" اس کے بعد علامہ ندوی نے دار قطنی، ذہبی، اور صاحب کنز العمال کی آرا بیان کی ہیں، جن کے مطابق اس کے متعدد راوی پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں لیکن اس کے باوجود نقد سلیمانی کی گہرائی دیکھئے کہ فرماتے ہیں: "بایں ہمہ کہ یہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے نہایت کمزور ہے تاہم اس میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں سے متعدد ٹکڑوں کی صحیح روایتوں سے تائید ملتی ہے۔" اس کے بعد علامہ نے ان ٹکڑوں کی نشاندہی کی ہے اور بخاری ترمذی اور حاکم وغیرہ کے معتبر حوالے دیئے ہیں۔[۱۴]

حبشہ کے مہاجرین اول کی تعداد اور ان کی تعیین میں کسی قدر اختلاف ہے۔" سیرت نگار ندوی نے ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، اور ابن سید الناس وغیرہ اہل سیر کی روایات کو بیان کرنے کے بعد واقدی پر ابن حجر کی تنقید سے اتفاق کیا ہے اور مختلف روایات کا تجزیہ پیش کیا ہے لیکن اس میں اپنی کسی حتمی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔[۱۵] علامہ ندوی نے اسلام ابی طالب کے ضمن میں اپنے استاد گرامی پر نقد کرتے ہوئے بخاری اور ابن اسحاق کی روایتوں کے فرقِ مراتب کو واضح کیا ہے۔ اور پھر بخاری کی روایت بسند مسیب کی تائید حضرت عباس کی روایت سے کی ہے۔ بلکہ آگے چل کر اسلام ابی طالب کی تائید و روایت کو ضعیف و موضوع قرار دیا ہے۔[۱۶] اسی طرح بیعت عقبہ اولی اور ثانیہ کے شرکا کے بارے میں تمام روایات کی تنقیح و تنقید پیش کی ہے۔[۱۷]

ہجرت کے باب میں بعض معجزات کا ذکر روایات میں آتا ہے۔ چنانچہ غار ثور میں قیام کے دوران ببول کے درخت اگنے اور دو کبوتروں کے آکر اس میں گھونسلہ بنانے اور انڈے دینے کی روایت بھی بیان کی جاتی ہے، علامہ شبلی نے مختصراً دونوں روایتوں پر روایتی لحاظ سے نقد و جرح کی ہے۔ جبکہ علامہ ندوی نے "مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت" کے باب میں ایسی تمام روایات کو عیار نقد پر کسا ہے اور کھوٹا پانے کی صورت میں ان کو مسترد کر دیا ہے، چنانچہ انھوں نے ابن اسحاق، ابن سعد، دلائل بیہقی اور ابو نعیم کے علاوہ ابن مردویہ اور بزاز کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ان تمام روایات کو بدلائل مسترد کیا ہے۔[۱۸]

ہجرت کے بعد ابتداءِ اذان کے ضمن میں علامہ ندوی نے حضرت عمر کی تجویز کی تشریح کی ہے اور بالواسطہ اپنے استاد گرامی پر نقد کیا ہے کہ وہ اس کے آغاز کا سارا شرف حضرت عمر کو دیتے ہیں۔[۱۹]

نقد سلیمانی کا ایک شاندار مظاہرہ جنگ بدر کے سلسلہ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ علامہ ندوی نے غزوہ

بدر کا ذکر حدیث میں" کے عنوان سے ایک فصل کا اضافہ کیا ہے۔ پہلے حضرت کعب بن مالک والی حدیث کو بیان کیا ہے اور ان کے بقول اس حدیث کے سوا "اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گذرا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کے لوٹنے کے لئے نکلے تھے"۔ اس کے برخلاف حضرت انس کی حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے۔" اور اس میں قافلۂ ابوسفیان اور اس کے لوٹنے کے بجائے قریش مکہ کے لشکر کا ذکر ہے۔ ان دونوں حدیثوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد علامہ ندوی نے ثابت کیا ہے کہ مکی لشکر کی آمد کی خبر آپؐ کو مدینہ میں مل گئی تھی اور اسی کے بعد آپ نے مہاجرین و انصار سے مشورت طلب کی تھی۔ اپنی تائید میں مسند ابن حنبل، مصنف ابن ابی شیبہ، تاریخ طبری اور دلائل بیہقی کی اس روایت کو پیش کیا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سند سے مروی ہے[۲۰]۔ طبع چہارم سے قبل سید صاحب نے حضرت کعب بن مالک کی حدیث پر تنقید کی تھی جو بعد میں ان کو نامناسب معلوم ہوئی کہ اس سے "ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوء ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا"۔ اس لئے اس پر شرمندگی کا اظہار، نادانی اور غلطی کا اقرار کیا اور اس عبارت کو قلم زد ہی نہیں کیا بلکہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برأت کی اور اللہ تعالیٰ سے عفو کے خواستگار ہوئے[۲۱]۔

غزوہ مریسیع کی تاریخ وقوع کے سلسلہ میں امام بخاری کی مسامحت اور بنو مصطلق پر حملہ نبوی کے بارے میں حضرت نافع کی حدیث کو منقطع قرار دینے پر علامہ شبلی کی گرفت[۲۲] کے بعد سید ندوی نے حضرت ریحانہ کے ازدواج کے بارے میں تین قسم کی روایتیں بیان کی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ابن مندہ، ابن اسحاق اور واقدی کی روایات بالترتیب بیان کرنے کے بعد آخر الذکر کو قبول کیا ہے کہ اس کی تائید امام زہری وغیرہ کی روایات سے ہوتی ہے[۲۳]۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ علامہ ندوی واقدی کے بارے میں حسن ظن نہیں رکھتے تھے تاہم ان کی روایت قبول کرنے میں ان کا سو ظن مانع نہیں ہوا کہ وہی روایت "اثبت" ہے[۲۴]۔ اسی طرح انہوں نے بنو نضیر کی جلاوطنی کے بعد بنو قریظہ سے تجدید معاہدہ کا سراغ دینے والی واقدی کی روایت قبول کی ہے[۲۵]۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی پر اس نامۂ رسالت کے بارے میں نقد کیا ہے جو مسند ابن حنبل میں ہے اور جس میں یہ مذکور ہے کہ قیصر روم نے حضرت دحیہ کے ہاتھ ایک خط بارگاہ نبوی میں بھیجا تھا اور اس کو حضرت معاویہ نے سنایا تھا۔ علامہ شبلی نے اس خط کی روایت کو محض اس لئے مسترد کر دیا کہ اس میں حضرت معاویہ کے پڑھنے کا ذکر ہے۔ مگر علامہ ندوی نے حسب تحقیق حافظ ابن حجر اس کو دوسرا واقعہ بتایا ہے اور اس کی تاریخ تبوک کے دوران قرار دی ہے اور اس طرح اس روایت کی صحت کا اثبات کیا ہے اور تائید میں ابوعبید قاسم بن سلام کی کتاب الاموال کا حوالہ دیا ہے جس میں اسی سند کے ساتھ یہ

روایت موجود ہے[۲۶]۔ علامہ ندوی نے غزوۂ موتہ کے واپس ہونے والے مجاہدین کو فراری قرار دینے والی ابن اسحاق کی روایت پر تنقید کی ہے اور ضمناً استاد شبلی پر بھی نقد کیا ہے کہ انہوں نے اس روایت کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد صحیح بخاری کی روایت کے حوالے سے تنقیح کی ہے کہ مجاہدین اسلام کو اس غزوہ میں بھی فتح ملی تھی اور پھر "فراری" کا مصداق فوج کے اس خاص دستہ کو قرار دیا ہے "جو جلدی کر کے پہلے مدینہ چلا آیا تھا۔"[۲۷]

فتح مکہ کے ضمن میں قریش مکہ کے اشتہاریان قتل کی تعداد کے بارے میں روایات میں بڑا اختلاف ہے۔ علامہ ندوی نے حافظ مغلطائی، ابن اسحاق، ابوداؤد، اور دارقطنی کی روایت کی تنقیح کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ "تحقیق کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر تعداد کم ہوتی جاتی ہے"۔ چنانچہ دس اشتہاریوں میں سے سات معاف کر دیئے گئے اور چار قتل کیے گئے۔ یہاں علامہ ندوی سے تعداد میں چوک ہو گئی ہے کیونکہ بایں صورت کل تعداد گیارہ بنتی ہے۔ اس کے بعد ابوداؤد کی تین روایتوں پر مفصل بحث کی ہے اور ان کے رواۃ پر جرح کی ہے۔ پھر اپنی تعداد میں حاکم اور دارقطنی کی روایات پیش کی ہیں اور ابن حجر کی تہذیب کے حوالے سے علمائے رجال کی جرحیں بدلائل بیان کی ہیں[۲۸]۔ غزوہ حنین کے وہلہ اول میں شبلی کے خیال کے مطابق "رفقائے خاص میں سے بھی کوئی پہلو میں نہ تھا"۔ لیکن علامہ ندوی نے ابن اسحاق کی اس روایت کو قبول کرنے پر استاد گرامی پر نقد کیا ہے اور پھر بخاری اور مسلم، ابونعیم، ترمذی، مصنف ابن ابی شیبہ اور بیہقی کی احادیث، مورخ ابن اسحاق و طبری، ابو حیان اندلسی اور آلوسی کی روایات تفسیر و تاریخ اور شراح حدیث نووی اور ابن حجر کی تشریحات سے عقدہ کی گرہ کشائی کی ہے اور بخاری میں حضرت انس والی حدیث جس نے سارا اشتباہ پیدا کیا ہے کی تشریح پیش کی ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ پسپائی وہلہ دوم کا واقعہ ہے نہ کہ وہلہ اول کا[۲۹]۔ اسی طرح شبلی نعمانی کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ طلقاء مکہ اسلام نہیں لائے تھے بلکہ عمدۃ القاری اور شرح مسلم نووی کے حوالے سے ان کے اسلام لانے کا اثبات کیا ہے[۳۰]۔ علامہ ندوی جو عام حالات میں ارباب سیر پر اہل حدیث کی روایات کو ترجیح دینے کے قائل ہیں[۳۱]، ایلاء کے واقعہ کی تاریخ کے سلسلہ میں بعض محدثین پر نقد کرتے ہیں جو اس کے ۵ھ میں واقع ہونے کے قائل ہیں اور انہوں نے یہ تنقید حافظ ابن حجر اور محدث دمیاطی کے دلائل و براہین کی بنیاد پر کی ہے[۳۲]۔ اسی طرح ایلاء کی مدت کے خاتمے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشربہ ام ابراہیم سے اترآنے اور حضرت عمرؓ سے گفتگو اور مکالمہ کے سلسلہ میں اپنے استاد پر نقد کیا ہے جنہوں نے مکالمہ مذکورہ بالا اور راوی کے آخری فقرہ کو ایک ہی دن کا واقعہ سمجھا ہے[۳۳]۔ علامہ ندوی نے اسی طرح حضرت ماریہ قبطیہ کے بارے میں نسائی کی ایک روایت کو اس کے ایک راوی کے سبب مجروح قرار دیا ہے[۳۴]۔ اسی طرح حج اسلام کو حج اکبر قرار دینے اور سورہ برأت کی ابتدائی آیات کے

تاریخ نزول و اعلان کے سلسلہ میں اپنے استاد سے اختلاف کیا ہے اور اپنی تنقیدی بصیرت سے کام لیا ہے۔[۲۵]

جلد دوئم کا دوسرا باب تبلیغ و اشاعت اسلام کے عنوان سے ہے۔ اس میں ایک سریہ کے اشاعت اسلام کے لیے بھیجے جانے کا ذکر سید صاحب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اس روایت میں اگرچہ یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ فوج اشاعت اسلام کے لیے بھیجی گئی تھی... تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اشاعت اسلام تھا کیونکہ اگر لڑائی مقصود ہوتی تو حفظِ قرآن کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ آپ ہر ایک سے قرآن پڑھوا کر سنتے۔" سید صاحب کی تنقیدی بصیرت اور علمی ژرف نگاہی نے عدم تصریح کے باوجود روایت کے مقصود کو پالیا ہے۔[۲۶] علامہ شبلی نے یمن کے ایک صاحب اثر خاندان ہمدان کے قبول اسلام کے سلسلہ میں زرقانی کی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ علامہ ندوی نے اس پر بخاری کی روایت کا اضافہ کیا ہے اور تصریح کی کہ اس واقعہ کے بارے میں بعض روایات صحیح نہیں خاص کر وہ روایت جس میں ہمدان کو ثقیف سے مسلسل لڑنے کی ہدایت نبوی کا ذکر ملتا ہے۔ سید صاحب نے حافظ ابن قیم کی تصریح پر اعتبار کیا، جو بالکل صحیح ہے۔[۲۷]

"حکومت الٰہی" کا نظریہ سلیمانی عطیہ ہے اور غالباً سب سے پہلے اس کو روشناس کرنے کا سہرا سید صاحب کے سر بندھا ہے۔ لیکن انکی علمی پختگی، فکری صلابت اور تنقیدی لیاقت نے انھیں افراط و تفریط سے بچائے رکھا، علامہ کا خیال ہے کہ "حکومت الٰہی و استخلاف فی الارض نبوت کے ضروری لوازم نہیں، لیکن جب دعوتِ الٰہی سیاست ملکی کی دیواروں سے آکر ٹکراتی ہے یا جب اصلاحات کا دامن ملک کی بدامنی و انتشار حال کے کانٹوں میں اُلجھ جاتا ہے تو پیغمبر ابراہیم اور موسیٰ کے قالب میں آگے بڑھتا ہے اور قوم و ملک کو نمارده و فراعنہ کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل بعثت کا مقصد دعوت مذہب، اصلاح اخلاق اور تزکیۂ نفوس تھا۔ اس کے علاوہ اور تمام فرائض محض ضمنی تھے، اس بنا پر انتظامات ملکی آپ نے اسی حد تک قائم کیے جہاں تک ملکی بدامنی کے باعث دعوت توحید کے لئے عوائق پیش آئے تھے، تاہم یہ کام بھی کچھ کم اہم نہ تھا۔"[۲۸]

بعض اسلامی احکام کے نزول اور تدریجی تکمیل کے ضمن میں تاریخ اور سنین کا اختلاف نظر آتا ہے، اس کا ایک سبب تو ارباب سیر اور مورخین و محدثین کے بیانات کا اختلاف ہے۔ "اصل یہ ہے کہ احکام کے سنین اور تاریخیں کتب حدیث میں بالتصریح مذکور نہیں ہیں۔ محدثین اور ارباب روایات کے قیاسات اور استنباطات ہیں اور اسی بنا پر باہم ان میں اختلافات ہیں، ہم نے کوشش کی ہے کہ صحیح اور معتبر دلائل کی رہنمائی سے اس راستہ کو طے کریں۔" چنانچہ سید صاحب نے اس کے مطابق اسلام کے عقائد اور دینی اصولوں

کے نزول اور تدریجی تکمیل کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور تمام روایات کے استقصا کے بعد ان کی تنقیح و تحلیل کی ہے۔ پھر اسی نہج پر عبادات کا تجزیہ پیش کیا ہے جو تیمم کے باب پر ختم ہوتا ہے[۴۰]۔ نماز کے بیان تاریخ میں سید صاحب فرماتے ہیں کہ اس بارے میں "محدثین مختلف الرائے ہیں" اور پھر ابن حجر کی بحث کا خلاصہ پیش کیا، جس میں نماز کی فرضیت کے بارے میں مختلف آراء کا ذکر ہے۔ چنانچہ حربی، امام شافعی اور بعض دوسرے غیر مذکور محدثین کی رائیں بیان کی ہیں اور یہ گرہ کھولی ہے کہ "قرآن مجید میں اوقات نماز کے مختلف بیانات کیوں ہیں[۴۱]"۔ علامہ شبلی نے فرضیت نماز کو معراج کا عطیہ الٰہی قرار دیا، مگر اس کی تاریخ پانچویں سال نبوت کو قرار دیا ہے جبکہ سید صاحب نے اس کو نویں سال کا واقعہ تسلیم کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے[۴۲]۔

معاملات کے باب میں آیت میراث کی شان نزول کے متعلق علامہ ندوی نے تین واقعے بیان کئے ہیں "اول یہ کہ حضرت جابر سنہ ۱۰ھ میں بیمار پڑے تو یہ آیات اتریں، دوسرا... یہ کہ حضرت حسان کے بھائی عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد ان کی بیوی ام کجہ کی فریاد پر اتری۔ تیسرا شان نزول یہی سعد بن ربیع کا واقعہ ہے..." سید ندوی نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے: "بالکل ممکن ہے کہ سعد بن ربیع کے علاوہ اور واقعے بھی اس قسم کے پیش آئے ہوں۔" انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ ہی روایت اول پر نقد کیا کہ "یہ روایت تمام صحاح ستہ میں ہے لیکن درحقیقت اس روایت میں راویوں سے کسی قدر مسامحت ہوئی ہے کیونکہ وراثت سنہ ۱۰ھ سے پہلے جاری ہو چکی تھی اور دوسرے یہ کہ حضرت جابر اس وقت لاولد تھے اس لئے صحیح یہ ہے کہ حضرت جابر کا واقعہ وراثت کی ایک خاص صورت لاولدیت یعنی (کلالہ) سے متعلق ہے جیسا کہ مسلم کی دوسری روایتوں میں (کتاب الفرائض) اس کی تصریح ہے۔" اسی طرح علامہ ندوی نے حضرت عبدالرحمٰن کے بارے میں طبری کی روایت کو ضعیف قرار دیا ہے[۴۳]۔

حرمت شراب خوری کے سلسلہ میں سید صاحب نے دو تاریخیں سنہ ۳ھ اور سنہ ۸ھ دو مختلف مقامات پر بیان کی ہیں جو بالترتیب ارباب سیر اور علامہ ابن حجر کی تحقیق ہے۔ سید صاحب اگرچہ اس باب میں محدثین کے ہمنوا ہیں تاہم انہوں نے ابن حجر پر اپنے استاد علامہ شبلی کی اس تنقید سے اتفاق کیا ہے کہ سنہ ۸ھ میں فتح مکہ میں حرمت شراب خوری کے بارے میں ان کا خیال اور استدلال صحیح نہیں۔ علامہ ندوی فرماتے ہیں کہ "اس کے علاوہ ایک اور نکتہ بھی ہے جس کی طرف ہمارے محدثین نے توجہ نہیں کی، وہ یہ ہے کہ ... شراب کا پینا گو سنہ ۳ھ میں حرام ہو چکا تھا لیکن شراب کی تجارت بند نہیں ہوئی تھی"۔ سید صاحب کا خیال ہے کہ تجارت شراب حرمت ربا کے ساتھ سنہ ۸ھ میں حرام ہوئی۔ اور اپنی تائید میں بخاری و مسلم وغیرہ کی احادیث نقل کی ہیں۔ سید صاحب نے اس سلسلہ میں حضرت ابوسعید خدری اور حافظ ابن حجر کے تسامح کا بھی ذکر کیا ہے[۴۴]۔

اسی طرح سورہ نصر کی تاریخ نزول کے سلسلہ میں علامہ سلیمان ندوی نے واحدی کی روایت کی تائید کی ہے اور ابن قیم کی روایت پر نقد کیا ہے جو دراصل بیہقی کی روایت ہے۔ اس کو روایت اور درایت دونوں حیثیتوں سے ضعیف قرار دیا اور ثابت کیا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول فتح مکہ سے متصل ہے۔[۴۵] لیکن حجۃ الوداع کے موقعہ پر منیٰ میں نماز ظہر ادا کرنے کے سلسلے میں علامہ ندوی نے حافظ ابن قیم کا فیصلہ بوجوہ بہتر دلائل کے قبول کیا ہے اور علامہ ابن حزم کے خیال کو جو مکہ میں نماز ظہر کی ادائیگی کی روایت کو قبول کرتے ہیں مسترد کر دیا ہے۔[۴۶]

وفات نبوی کے باب میں علامہ سلیمان کی تنقیدی بصیرت کا مظاہرہ تاریخ وفات اور مدت بیماری سے متعلق روایات پر محاکمے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ سب سے پہلے سریہ اسامہ میں حضرات شیخین کی شمولیت کے بارے میں ابن اسحاق اور واقدی کی روایت پر علامہ ابن تیمیہ کے حوالہ سے نقد کیا ہے کہ یہ سب روایتیں بے سند ہیں۔[۴۷] پھر ابتدائے مرض کے دن و تاریخ، مدت علالت اور تاریخ وفات کی تعیین میں مختلف روایات پر محاکمہ کیا ہے۔ چنانچہ بخاری، کلبی، ابو مخنف، طبری، یعقوبی، مسعودی، واقدی، ابن سعد، بیہقی، موسیٰ بن عقبہ اور سہیلی وغیرہ کی روایات و آراء پر بحث کرکے اور ان روایات کی بنا پر ایک توقیتی نقشہ بنا کر اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ "وفات نبوی کی صحیح تاریخ ہمارے نزدیک یکم ربیع الاول ۱۱ھ ہے۔" اپنے اس خیال کی تائید میں ابن جریر طبری، ابن کثیر، اور بغوی جیسے مفسرین اور ابونعیم جیسے اہل سیرت کی تائیدی روایات پیش کی ہیں۔[۴۸] اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نماز پڑھانے اور آخری بار عوام میں تشریف لانے کی متعدد روایات کی تنقیح کی اور ثابت کیا ہے کہ "مسلسل امامت کا انقطاع مغرب کی نماز (شب جمعہ) پر ہوا" اور ظہر کی امامت اتفاقی تھی۔ اس سلسلہ میں علامہ ندوی نے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی کی احادیث کے تجزیہ کے علاوہ حافظ ابن حجر پر سخت محاکمہ کیا ہے کہ ان کی تطبیق قطعی قابل قبول نہیں ہے۔[۴۹] آخر میں حضرت ابوبکر کی مدت امامت کے بارے میں بخاری، مسلم، اور واقدی و ابن سعد کا جائزہ لیا ہے کہ انہوں نے تین دن یا سترہ نمازوں کی امامت کی۔[۵۰] مرض الموت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصیت لکھانے کے سلسلے میں جو معرکۃ الآرا بحث چھڑ گئی ہے اس میں سید صاحب نے بخاری کی روایت کا حوالہ دیکر منطقی دلائل سے جمہور کا عقیدہ ثابت کیا ہے۔ اسی طرح آخری خطبہ نبوی کی تاریخ و دن کے ضمن میں مختلف و متصادم روایات کا تجزیہ کیا ہے اور بخاری اور مسلم کی احادیث اور حافظ ابن حجر کی تحقیق کے حوالے سے فیصلہ کیا ہے کہ وہ وفات نبوی سے پانچ روز پیشتر بروز جمعرات نماز ظہر کے بعد کا واقعہ ہے۔ اور اس سلسلہ میں مسند امام شافعی، کتاب الام امام شافعی اور ابن سعد کی روایتوں پر تنقید کی ہے جو اسے دوشنبہ کی صبح کی نماز کے بعد کا واقعہ قرار دیتی ہیں۔[۵۱] اسی ذیل میں وقت وفات نبوی کے

بارے میں اختلاف روایات کا تجزیہ کیا ہے اور ابن اسحاق، بخاری، اور مسلم کی روایات کے تضاد اور حافظ ابن حجر کی تطبیق کا ذکر کیا ہے[۵۲] تدفین کے سلسلے میں ابن سعد وغیرہ کی ان روایتوں کی تنقید کی ہے جو چہار شنبہ کا واقعہ بتاتی ہیں جبکہ خود ابن سعد اور ابن ماجہ کی روایات سے وہ سہ شنبہ کا واقعہ معلوم ہوتا ہے اور یہی صحیح ہے[۵۳] سید صاحب قبلہ نے اس جلد میں قبر میں آتارنے والے اشخاص، ترکۂ نبویؐ متروکات نبوی، مہر نبوت اور اسپ دوانی وغیرہ بہت سے امور پر تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے[۵۴]

سیرت النبی کی جلد سوئم علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی بصیرت اور نقادانہ صلاحیت کی قدم قدم پر مثالیں پیش کرتی ہے۔ پہلے تین باب دلائل و معجزات، فلسفہ قدیمہ و علم کلام اور معجزات علامہ کی تنقیدی بصیرت کا شاہکار ہیں، اور انہوں نے دل کو چھو لینے والے اور دماغ روشن کرنے والے دلائل سے معجزات نبوی کے امکان و وقوع کو ثابت کیا ہے۔ عالم مثال کی بحث میں علامہ نے بڑے خوبصورت پیرائے میں افلاطون کے عالم مثل اور علمائے اسلام کے عالم مثال کے فرق کو نمایاں کیا ہے اور موخر الذکر میں امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی، امام غزالی، امام خطابی، حافظ ابن حجر، شیخ الاشراق، سیوطی اور سب سے بڑھ کر شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحقیقات و نظریات کو پیش کیا ہے اور شیخ الاشراق پر نقد کیا ہے کہ انہوں نے افلاطونی عالم مثل اور اسلامی عالم مثال کو باہم خلط ملط کر دیا ہے[۵۵] معجزات و خرق عادت کے باب میں حکمائے اسلام فارابی، ابن سینا، ابن مسکویہ وغیرہ کا خیال ہے کہ نظام فطرت اور سلسلۂ اسباب و علل ناقابل شکست و ناقابل تغیر ہیں۔ جبکہ معتزلہ کے نزدیک ان میں شکست و تغیر ممکن ہے اور خرق عادت کلیۃً محال نہیں[۵۶] اشاعرہ کا عقیدہ ہے کہ "نہ تو عالم میں حقیقۃً قوانین فطرت ہیں اور نہ خود اشیاء کے اندر خواص ہیں بلکہ ہر شے سے جو فعل سرزد ہوتا ہے اس کو درحقیقت اللہ تعالیٰ اسی وقت اس میں پیدا کر دیتا ہے اشاعرہ کے اس عقیدے کا نہ صرف مدعیان عقل نے بلکہ ارباب ظواہر تک نے مضحکہ اڑایا ہے"۔ اور اس ضمن میں علامہ نے ابن تیمیہ، ابن حزم، اور شبلی نعمانی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد بڑے پر زور انداز میں دلائل قطعی کے ساتھ اشاعرہ کے عقیدہ کا اثبات کیا، نقادان کا مسکت جواب دیا اور ان کی غلطیوں کو واضح کیا ہے[۵۷] اور آخر میں معجزات نبوی کو ثابت کیا ہے۔ ان کا یہ تجزیہ بڑا دلچسپ اور حقیقت انگیز ہے کہ اصل معجزۂ نبوی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے کی صداقت اور پیغام کی حقانیت تھی جو انقلاب کا سبب بنی۔ صرف معجزہ یعنی مادی معجزہ نبوت کی دلیل نہیں تھی[۵۸]

علامہ ندوی نے قرآن مجید میں آیات و دلائل پر جو باب باندھا ہے وہ ان کی نقادانہ بصیرت، موضوع بحث پر قدرت اور قرآن مجید کی فہم کا سلیمانی معجزہ ہے۔ علامہ اس میں انبیائے سابقین کے معجزات

ان کی حقیقت، آیات اللہ کے تجزیہ، آیات و دلائل کی ظاہری اور باطنی اقسام اور ان کی واقعاتی شہادتیں، معجزات محمدی کی ظاہری اور باطنی خصوصیات و اثرات اور معجزہ دکھانے کی حکمت الٰہی بیان کرنے کے بعد مسئلہ اسباب و علل میں افراط و تفریط سے بحث کرتے ہیں اور دونوں فریقوں پر جو بالترتیب سنت الٰہی میں تغیر و تبدل کو محال اور نظام و قوانین فطرت کی پابندی کو شانِ قدرت الٰہی کے منافی ٹھہراتے ہیں نقد کرتے ہیں کہ "دونوں فریق افراط و تفریط کے دو کناروں پر ہیں اور انہوں نے قرآن مجید کی تمام آیتوں پر غور و تدبر کی نظر نہیں ڈالی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اشیاء کے خواص و طبائع اور عقلی مصالح و حکم کا انکار کیا ہے۔" پھر انہوں نے بدلائل قطعی ثابت کیا ہے کہ "قرآن مجید اسباب و مصالح کا قائل ہے۔ لیکن علت حقیقی قدرت و مشیت ہے۔" پھر انہوں نے سنت اللہ کا مفہوم واضح کرتے ہوئے اس فریق پر تنقید کی ہے جو "خرق عادت اور خلاف اسباب و علل کے محال ہونے پر قرآن مجید کی ان آیتوں سے استدلال کرتا ہے جن میں سنت الٰہی کے عدم تبدیل کا ذکر ہے۔ درحقیقت دانستہ یا نادانستہ مفہوم قرآن کی تحریف کا مجرم ہے۔" اس کے بعد معجزہ کی باعتبار خرق عادت چار قسمیں اور اہل ایمان اور اہل کفر پر اثر کے لحاظ سے معجزات کی دو دو قسمیں بتائی ہیں۔ اور آخر میں معجزہ شق القمر پر مفصل و مدلل بحث کی ہے کہ وہ آخری معجزہ محمدی تھا اور غزوۂ بدر معجزہ ہلاک تھا کہ آخری معجزہ کے بعد کفر پر قائم رہنا ہلاکت ہی کا مستحق ہوتا ہے۔ آخر میں معجزہ اور سحر کا فرق واضح کیا ہے۔[۵۹]

اس کے بعد کا باب جو آیات و دلائل نبوی کی تفصیل کے نام سے ہے خصائص النبوۃ، قرآن مجید میں مذکورہ آیات و دلائل کی صحیح اور مستند روایات، غیر مستند روایات اور ان پر تنقید، کتب سابقہ کی بشارتیں اور خصائص محمدی سے بحث کرتا ہے۔ ان تمام ذیلی فصلوں میں علامہ ندوی کی تنقیدی بصیرت واشگاف انداز میں نظر آتی ہے بالخصوص معجزات نبوی کی غیر مستند روایات کے ذیل میں۔ معراج نبوی کے باب میں اس کے وقت و تاریخ اور تعداد و وقوع کے بارے میں علماء کا کافی اختلاف ہے۔ علامہ سلیمان نے ایک معراج نبوی کی روایت کو جس پر جمہور علماء کا اتفاق و اجماع ہے قبول کیا ہے اور تعدد کے قائلین پر سخت تنقید کی ہے کہ انہوں نے محض روایات کے اختلاف کو دور کرنے کی خاطر تعدد وقوع کا خطرناک نظریہ اپنایا ہے جو "فرض محض ہے اور جس کو واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔" وقت اور تاریخ کے اختلاف کے بارے میں تمام روایات کا استقصار کیا ہے اور پھر ان کے ذیل میں متعدد رواۃ مثلاً سدی، واقدی، ابن سعد، ابن کثیر، ابن اثیر، اور قاضی عیاض کی روایات پر نقد کیا ہے اور امام بخاری، اور ابن سعد کی ایک روایت کی توثیق کی ہے کہ "ہمارے نزدیک قرآن مجید سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ معراج اور ہجرت کے بیچ

کوئی زمانہ حائل نہ تھا بلکہ معراج درحقیقت ہجرت ہی کا اعلان تھا"۔ تمام صحیح، مرفوع، قوی، ضعیف، موقوف، مرسل اور منکر روایتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد علامہ ندوی نے معراج کے متعدد واقعات کو "سرتاپا لغو اور باطل" قرار دیا ہے اور روایتی و درایتی دونوں معیاروں سے گذرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ معراج میں رویت الٰہی کے مسئلہ پر صحابہ کرام تک میں اختلاف رائے تھا۔ علامہ نے تمام آرا و اقوال کا تجزیہ کرنے کے بعد نظریہ عدم رویت کو ترجیح دی۔ اسی طرح معراج جسمانی یا روحانی کے مسئلہ پر سید صاحب نے جمہور سلف صالحین کے مسلک سے اتفاق کیا ہے اور عقلی دلائل کے علاوہ قرآن کریم کی سورہ اسرار کی آیت کریمہ سے اپنے دعوے کی تائید کی ہے۔ پھر روحانی معراج یا نظریہ رویا کے قائلین کا موقف اور صوفیہ کا مسلک واضح کیا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کے بیان پر اس بحث کو ختم کیا ہے[۶۰]۔ دوسری فصل قرآن مجید اور معراج، معراج کے اسرار، اعلانات، احکام، بشارتوں، اور انعامات سے بحث کرتی ہے اور جابجا اپنے مصنف کے تنقیدی شعور کا ثبوت فراہم کرتی ہے[۶۱]۔

شق صدر یا شرح صدر کے بارے میں وقت و تاریخ و تعدد پر بھرپور تبصرہ سلیمانی قلم سے نکلا ہے۔ بچپن میں شق صدر کی روایت پر تنقید کی ہے اور آغاز وحی کے وقت شرح صدر کی روایات کو ترجیح دی ہے اور پھر شرح صدر کی حقیقت کو آشکارا کیا ہے[۶۲]۔ ایک مختصر فصل میں قرآن مجید میں مذکورہ دلائل و معجزات محمدی کا جائزہ لیا ہے[۶۳]۔

سید سلیمان ندوی کا معجزۂ قرآن پر باب درحقیقت اردو میں اعجاز بیانی کا شاہکار ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ انبیائے سابقین کے معجزات عارضی تھے، ہوئے اور ہو کر مٹ گئے، لیکن معجزۂ قرآن دائمی اور ابدی ہے۔ اس کے بعد سید صاحب نے وجوہ اعجاز کے بارے میں مختلف مکاتب فکر جیسے معتزلہ، ظاہریہ، متکلمین وغیرہ کی آرا کا ذکر کیا ہے اور اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ "قرآن مجید کے وجوہ اعجاز اس قدر کثیر ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ پھر فصاحت و بلاغت، یکسانی و عدم اختلاف، قوت تاثیر، تعلیم و ہدایت، امی کا واسطہ، حفظ و بقا کا وعدہ، لاجواب ہونا، قوت دلائل وغیرہ کو اہم وجوہ اعجاز قرار دیا ہے[۶۴]۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت پر سلیمانی بحث تنقیدی بصیرت کا عمدہ ثبوت ہے[۶۵]۔ اس کے بعد صحیح روایت سے ثابت معجزات نبوی کے بیان میں علامات نبوت قبل بعثت، اشیاء میں اثر، شفائے امراض، استجابت دعا، اشیاء میں اضافہ، پانی جاری ہونا، اخبار غیب یا پیشنگوئی پر بڑی عمدہ تنقیدی بحثیں ہیں۔ اشیاء میں اثر کی فصل میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی بکریاں چرانے اور بے دودھ کی بکری کے دودھاری ہونے کے معجزہ کے ضمن میں سید صاحب نے متعدد روایات پر نقد کیا ہے۔ ان کے علاوہ متعدد دوسری روایات کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے[۶۶]۔

سلیمانی تنقیدی بصیرت کے جلوے اس جلد کے بقیہ ابواب میں بھی جابجا نظر آتے ہیں جن کا احاطہ کرنا دفاتر سیاہ کرنے کے مترادف ہے۔

سیرت النبیؐ کی جلد چہارم جو منصب نبوت سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے اپنے مصنف علام کی تنقیدی بصیرت کے نمونے ورق ورق میں سجائے ہوئے ہے۔ بنیادی طور سے یہ جلد عقائد اسلامی سے بحث کرتی ہے۔ چونکہ بحث کا دائرہ بہت وسیع اور تنقیدی اشارات بہت زیادہ ہیں اس لئے صرف چند نمائندہ مثالوں پر اکتفا کی جارہی ہے۔ منصب نبوت پر بحث کرتے ہوئے مصنف گرامی اجتہاد نبوی میں خطا کے موضوع پر رقمطراز ہیں کہ " اس سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد نبوی میں غلطی ہو جانا ممکن ہے مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں، ادھر لغزش ہوئی اور ادھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی"۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ پوری زندگی میں " کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی اور عجب تر یہ کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کا تعلق حکم دینی، شریعت ابدی، اعتقاد و عبادات یا شرعی معاملات سے ہو، بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی تمام تر حیثیت شخصی یا جنگی ہے"۔ پھر سید صاحب نے اس خطا کے معنی و مفہوم واضح کئے ہیں اور ترتیب وار ان پانچ امور کی نشاندہی کی ہے۔ اور اس غلط استدلال کا مداوا کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے اغلاط سے پاک نہیں ہوتے تھے اس لئے ان پر عمل کرنا لازمی نہیں تھا۔[68] بعثت کے وقت عرب دنیا کی اخلاقی حالت میں شراب خوری پر بحث کرتے ہوئے علامہ ندوی نے ان تمام روایات کی تنقیح و تنقید کی ہے جن میں کسی صحابی کے بحالت نشہ نماز میں قرآن غلط پڑھنے کا ذکر ہے۔ چنانچہ عطاء بن سائب اور ابو عبد الرحمٰن اسلمی پر جو اس روایت کے مرکزی راوی ہیں تنقید کی ہے اور حضرت علی اور عبد الرحمٰن بن عوف کی برأت کی ہے۔ ساتھ ہی علامہ شبلی کی رائے سے اختلاف کیا ہے جنھوں نے اس کی روایت قبول کر لی تھی۔[69] اس جلد کا ایک مہتم بالشان مبحث دوزخ کی ابدیت اور غیر ابدیت کا مسئلہ ہے۔ علامہ ندوی کی رائے اس مسئلہ میں جمہور کے ساتھ نہیں ہے تاہم مسئلہ ابدیت نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ علامہ ندوی کا عقیدہ بعض علماء کی مانند یہ ہے کہ دوزخ رحمتِ الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی کیوں کہ اللہ کے غضب پر اس کی رحمت کو سبقت حاصل ہے اور قرآن مجید کی کوئی آیت دوزخ کے تسلسل وجود پر دلالت نہیں کرتی اور جن آیات سے اس کے دوام کا شبہ ہوتا ہے مصنف علام نے بدلائل اس کا ازالہ کیا ہے۔ سید صاحب نے اس باب میں عام اہل سنت، مرجیۂ، خوارج، معتزلہ، اور زیدیہ وغیرہ کے دلائل سے بحث کی ہے، اہل سنت میں متاخرین میں حافظ ابن قیم غیر ابدیت نار کے پرجوش حامی ہیں اور اولین میں صحابہ کرام اور تابعین

کے نام بھی ہیں، چنانچہ ان میں حضرات ابو امامہ، جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، عمر بن خطاب، عبداللہ بن عمرو بن عاص اور عبداللہ بن مسعود کے اسماء گرامی کی تصریح کی ہے۔ علامہ سلیمان ندوی نے ان پانچ قرآنی آیات کی تصریح کی ہے جن سے دوام نار کا نظریہ ثابت ہوتا ہے لیکن پھر ان آیات میں ابدیت و دوام کے معانی کے حامل الفاظ کی تشریح کرکے بتایا ہے کہ ان سے دوام کا محض شبہ ہوتا ہے۔ اس کا واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن جمہور کے مسلک کی ترجمانی کردی لیکن اس میں وہ زور و قوت نہیں جو ان کے پہلے بیان میں ہے۔

پانچویں جلد جو عبادات اسلامی کی تشریح پیش کرتی ہے سلیمانی نقد کے اشارات سے خالی نہیں۔ اوقات نماز پر بحث کرتے ہوئے علامہ نے مستشرقین کے اس شبہ کا ازالہ کیا ہے کہ عہد نبوی میں صرف تین وقتوں کی نمازیں فرض تھیں۔ مستشرقین کو یہ شبہ موطا امام مالک، مسلم، اور ترمذی کی ان روایات سے ہوا ہے جن میں جمع بین الصلاتین کا ذکر ہے۔ حق یہ ہے کہ اوقات نماز کی پوری فصل علامہ کی تنقیدی بصیرت کا ایک شاندار نمونہ ہے[1]۔ قبلہ کی تعیین میں مستشرقین اور یہود پر تنقید کی ہے[2]۔ مصارف زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ سے مراد اکثر فقہا نے جہاد لیا ہے مگر سید صاحب کے خیال میں یہ تحدید صحیح نہیں ہے[3]۔ اسی طرح زکوٰۃ کے نظام کو صحیح طریقے سے نافذ کرنے کی صورت میں اشتراکیت کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں[4]۔ روزہ کی ابتدائی تاریخ کے بیان میں مشہور فلسفی ہربرٹ اسپنسر پر تنقید کی ہے اور اسی طرح روزہ کے دنوں کے بارے میں "ایاماً معدودات" کی تشریح میں ان لوگوں پر نقد کیا ہے جو ایام کو جمع قلت بتا کر دس دنوں سے کم پر تحدید کرتے ہیں[5]۔ دوسرے مذاہب میں روزہ سے مقصود دکھ دینا تھا لیکن سید صاحب کے بقول اسلام نے اس کو رحمت بنا دیا چنانچہ روزہ کی حقیقت سے ناآشنا لوگوں پر مصنف نے سخت تنقید کی ہے۔ مقام قربانی کے بارے میں یہودی تحریف پر بھی مختصر نقد ملتا ہے[6]۔ اس طرح سید صاحب نے خانۂ کعبہ کی قدامت اور حج میں تجارت اور بیوپار کو حج کے تقدس و حرمت کے خلاف سمجھنے کی روایات کے بارے میں تنقید سے کام لیا ہے[7]۔ اور آخر میں سید صاحب نے جہاد کی بحث میں ان لوگوں پر نقد کیا ہے جو اس کے وسیع تر مفہوم "حق کی بلندی اور اس کی اشاعت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا" کے بجائے "دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ" کے تنگ میدان میں محصور کر دیتے ہیں۔[8]

اسلام کی اخلاقی تعلیمات جو روح اسلام کا درجہ رکھتی اور جلد ششم کا موضوع ہیں دوسرے مذاہب کی اخلاقی تعلیمات سے کہیں زیادہ بلند پایہ، متوازن اور قابل عمل ہیں۔ "کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ آگیا ہے۔" اور ان کی موجودہ تعلیمات پر بھرپور مگر متوازن تنقید کی گئی ہے اور اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ علم کلام اور مناظرہ کا رنگ نہ آنے پائے۔ دنیاوی معلمین اخلاق سقراط افلاطون

اور ارسطو کی تعلیمات کے کھوکھلے پن اور بے اثری کو اجاگر کیا ہے اور پھر انبیائے کرام کی تعلیمات کی ہمہ گیری اور دور رسی کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد اخلاق و تعلیمات محمدی کا موازنہ حضرات عیسیٰ و موسیٰ علیہ السلام سے کیا ہے۔ اس پوری بحث میں حکمائے اخلاق کے نظریات و خیالات سے تائید بھی فراہم کی ہے اور ان کے مادہ پرستانہ فلسفہ پر تنقید بھی۔[۷۹] ہندوستانی مذاہب کے فلسفہ آواگون اور تناسخ پر یہ نقد کیا ہے کہ اس نے "انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گنہگار اور داغدار ٹھہرایا ہے"۔[۸۰] رہبانیت و اجتماعی زندگی، عفو و عدل کے امتزاج، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، برائی کی جگہ نیکی اور صبر و تحمل جیسے اہم امور اخلاق کا تقابلی اور تنقیدی موازنہ ابتدائی چار ابواب میں ملتا ہے۔[۸۱] اسی طرح حقوق و فرائض کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے۔ انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے"۔[۸۲] اس کے بعد بودھ اور ہندو مت اور یہودیت اور عیسائیت پر نقد کیا ہے۔[۸۳] والدین کے حقوق، اولاد کے حق، حقوق زوجین، اہلِ قرابت کے حقوق، ہمسایہ کے حقوق، یتیموں کے حقوق، بیوہ، حاجتمند، بیمار، غلاموں، اور مہمانوں حتیٰ کہ انسانی برادری اور جانوروں کے حقوق کے مباحث میں دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے قدم قدم پر تنقیدی موازنہ ملتا ہے۔ یہی حال فضائل اخلاق اور رذائل اخلاق کے ابواب میں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علامہ نے روایات و تعبیرات علماء پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے چنانچہ قتل اولاد کے سلسلہ میں ایک مسئلہ پر امام مالک کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔[۸۴] اور سورہ بقرہ آیت ایک میں مذکور لفظ "رزق" سے جن مفسرین نے زکوٰۃ مراد لی ہے ان پر نقد کرتے ہوئے کہا ہے کہ "صحیح یہ ہے کہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں"۔[۸۵] اسی طرح سورۂ نور کی آیت ۳ میں زانی کے عفیفہ یا اس کے برعکس رشتۂ ازدواج پر بڑے نقد سے کام لیا ہے۔[۸۶] کافروں سے درگذر اور اعراض کی آیات میں علامہ ندوی نے متعدد مفسرین کی آراء بیان کرنے کے بعد ان پر تنقید کی ہے جو ان کے ہر انفرادی اور اجتماعی قصور پر بھی عفو و درگذر کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس قسم کی تنقید سلیمانی کی اور مثالیں بھی تلاش کی جا سکتی ہیں۔

عظیم سلسلہ سیرت کی آخری کڑی نظام حکومت سے متعلق ہے۔ اس میں صرف تین مضامین خاص ہیں، پہلے مضمون اللہ کی حاکمیت میں یہود و نصاریٰ پر نقد کیا ہے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ راہبوں اور کاہنوں کی اطاعت کو بھی دین بنا رکھا تھا۔ اسی طرح معتزلہ و اشاعرہ کے اختلاف اور بعض اہل اصول پر تنقید کی ہے جنھوں نے معتزلہ کی جانب عقل کو واضع قانون و حاکم ہونے کی نسبت کر دی ہے۔ اور آخر میں قانون شرع کے دوامی ہونے پر شبہات کا ازالہ کیا ہے۔[۸۷] دوسرے مضمون سلطنت و دین کے تعلق میں یہودیت

وبرہمنیت اور جدید تصور سلطنت پر تنقید کر کے اسلامی نظام کو "سلطنت و دین کا معتدل مجموعہ" قرار دیا ہے۔ علامہ ندوی نے اس ضمن میں علماء کی گوشہ گیری اور صوفیا کی خانقاہ نشینی اور اس کے پیدا کردہ تصور کہ "قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے جس سے اہل علم و اہل اتقا کو کنارہ کش رہنا چاہیئے" پر بھی بھرپور تنقید کی ہے۔ قرآن مجید میں مذکورہ لفظ خلافت کی معانی و مفاہیم کی تعیین میں بھی سید صاحب نے تنقیدی نظر سے کام لیا ہے اور مختلف مفسرین میں قاضی بیضاوی کی تشریح کو زیادہ حکیمانہ بتایا اور خود اپنا اصول ترجیح بھی بیان کیا ہے۔[88] تیسرے مضمون میں عہد نبوی میں نظام حکومت میں اس عمومی خیال پر کاری ضرب لگائی ہے کہ عربوں کو ملوکیت سے نفرت تھی بلکہ واضح کیا ہے کہ "خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظام سلطنت یا نظام تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظام سلطنت اور نظام تمدن کا خیال آتا تھا" اور اپنی بات کی تائید میں لخمی، غسانی اور یمنی سلطنتوں کے حوالے دیے ہیں۔ اور پھر عام دنیاوی سلطنتوں اور نظام نبوی کے فرق کو واضح کیا، اور واقعات و شواہد سے اس کو مدلل کیا ہے۔ سید صاحب نے اگرچہ اپنے خیال کو مدلل اور مفصل نہیں بیان کیا ہے تاہم ان کا یہ بیان کہ "صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی" خاصا معنی خیز اور اہم ہے اور اس خیال عام کی کاٹ کرتا ہے جو خلفاء اربعہ بلکہ حضرات شیخین ہی کی خلافت کے بعد کے زمانے کو ملوکیت کے آغاز و عروج کا زمانہ قرار دیتا ہے۔[89] یہ جلد اپنے بعض دوسرے تنقیدی اشارات کے لحاظ سے بھی "بقامت کمتر بقیمت بہتر" کی مصداق ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی تنقیدی بصیرت کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ وہ متعلقہ مسئلہ پر تمام روایت و اخبار، آراء و اقوال اور تشریحات و تفسیرات کا استقصا کرتے ہیں جس کو جدید فن تاریخ نویسی میں کل مواد پر قدرت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور حق یہ ہے کہ جس کے بغیر سیرت نگاری یا تاریخ نویسی کے تقاضوں سے صحیح معنی میں عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا۔ چنانچہ وہ تمام دستیاب روایات و احادیث جمع کرتے ہیں خواہ وہ تائیدی ہوں یا مخالف، قوی ہوں یا ضعیف، صحیح ہوں یا منکر۔ پھر ان کا دوسرا قدم روایات مجموعہ کی تنقیح و تحلیل ہوتا ہے کہ وہ کھرے سے کھوٹے کو، صحیح سے غلط کو اور دانے سے بھوسی کو الگ کرتے ہیں۔ اور ایسا کرنے میں وہ اصول روایت اور قوانین درایت دونوں سے کام لیتے ہیں۔ تیسرے مرحلے میں وہ اصول نقد و استدراک کو کام میں لاتے ہیں اور صحیح کی تائید اور غلط کی تردید کرتے ہیں۔ اگر متعدد روایات میزان نقد پر کھری اتریں تو اس صورت میں وہ اصول ترجیح سے کام لیتے ہیں اور دو ٹوک انداز میں ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ کیے بغیر نہ صرف راجح و مرجح روایت کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ اپنی واضح رائے اور محکم فیصلے سے بھی آگاہ کرتے ہیں اور قاری کو عالم گومگو اور ورطۂ حیرت میں نہیں ڈالتے۔ نقد و استدراک

کی ضرب کس پر اور کہاں پڑ رہی ہے وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کا مطمح نظر حق کی تلاش و تائید ہے۔ چنانچہ ان کی تنقید کا نشانہ کبھی ان کے اپنے محبوب و محترم استاد بنتے ہیں، کبھی ارباب سیر اور کبھی محدثین کرام۔ حتی کہ ان کی اپنی ذات بھی اس کی کاری ضرب سے محفوظ نہیں رہتی۔ اس نقد و استدراک میں ان کی نیت بخیر، ان کا خلوص مسلم اور ان کا مقصود و مدعا حرف گیری سے بلند ہوتا ہے۔ دراصل سید صاحب کی تنقیدی بصیرت ان کی علمی گہرائی، فکری گیرائی، اور فنی تقویٰ کے خمیر سے اٹھی ہے اور اس کا اولین و آخرین مقصد اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں قلمی جہاد ہے۔ یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت کے لیے قلمی جدوجہد۔

○

حواشی و تعلیقات:

۱۔ ملاحظہ ہو سیرت النبی، جلد اول (مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء) میں جامع سید سلیمان ندوی کا دیباچہ ص ۵-۱۰ اور جلد دوم (طبع نہم ۱۹۷۳ء) میں جامع کا دیباچہ ص ۱-۲۔ ان دونوں دیباچوں میں سید صاحب قبلہ نے اعتراف و اعلان کیا ہے کہ یہ دونوں جلدیں مولانا شبلی نعمانی کے قلم سیرت رقم کی نگاشتہ ہیں اور سید صاحب نے ان میں جابجا ضروری اضافے کیے ہیں۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر محمد سید ہاشم کا یہ مفروضہ کہ ان دونوں جلدوں کے اصل مصنف سید سلیمان تھے، بے بنیاد ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے تمام شواہد و دلائل دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہیں کیونکہ یہ معلوم حقیقت ہے کہ سید صاحب دفتر سیرت کے ایک کارپرداز اور علامہ شبلی کے قلمی معاون تھے جو مواد کی فراہمی میں استاد مکرم کو مدد دیتے تھے، مواد کی تنقیح و تحلیل، تہذیب، و تالیف اور ترتیب کا کام شبلی نے انجام دیا تھا۔ بہرحال یہ مناسب اور موزوں مقام نہیں ہے جہاں سیرت النبی کے اصل مصنف شبلی کی تائید میں پورے دلائل بیان کیے جائیں۔ ڈاکٹر ہاشم کے مفروضہ کے لیے ملاحظہ ہو: ان کا مضمون سیرت النبی جلد اول و دوم کا مولف؟ علامہ شبلی یا سید سلیمان ندوی" تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جلد ۳ شمارہ ۲۲ ص ۲۷۔

۲۔ راقم سطور کا مقالہ "شبلی کی سیرت النبی پر اضافات سلیمانی" جو سید سلیمان ندوی سیمینار منعقدہ زیر اہتمام شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۲ر تا ۲۴ر نومبر ۱۹۸۴ء پڑھا گیا اور سیمینار کے مقالات کی صورت میں بعنوان "سید سلیمان ندوی" شائع ہوا۔ ملاحظہ ہو مذکورہ بالا: شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۸۵ء ص ۱۰۵-۱۱۸۔

۳۔ دیباچہ کی صراحت کے مطابق سید سلیمان ندوی نے اس کی کامل احتیاط کی ہے کہ "جامع کا کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف مصنف کی عبارت میں نہ ملنے پائے" چنانچہ ان تمام جزئی اضافوں کو قوسین کے اندر جگہ دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو دیباچہ اول، جلد اول ص ۱۰، ۴۔ ملاحظہ ہو راقم سطور کا مقالہ "شبلی کی سیرت النبی کا مطالعہ نقد سلیمانی کی روشنی میں" تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جلد ۳، شمارہ ۲، ص ۵۸-۷۴ ۵۔ سیرت النبی" جلد اول ص ۹۱۔

۶۔ سید صاحب کے فقہی مسلک کے لئے ملاحظہ ہو: محمد عمران خاں ندوی، مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۳۶ء میں سید صاحب کا مضمون خاص کر ص ۱-۶؛ غلام محمد: تذکرہ سلیمان، ادارہ مجلس علمی کراچی ۱۹۶۰ء ص ۱۴۶-۸، ۷۔ سیرت النبی جلد اول ص ۱۲۹ حاشیہ ع۱ اور ص ۱۳۴ حاشیہ ع۱، ۸۔ سیرت النبی جلد اول ص ۱۴۵-۸، حاشیہ ع۱ نیز ملاحظہ ہو سید صاحب کا مضمون "ذبح عظیم" معارف ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ اور معارف صفر ۱۳۵۶ھ کے شذرات ۹۔ سیرت النبی جلد اول ص ۱۵۴، حاشیہ ع۱ ۱۰۔ سیرت النبی جلد پنجم، ص ۲۴۴-۴۶، ۱۱۔ سید سلیمان ندوی ارض القرآن، اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء، جلد دوم ص ۴۲-۶، ۱۲۔ سیرت اول، ص ۱۷۸-۸۱ مع حواشی، اور جلد سوم (اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء) ص ۷۶۱-۳، ۱۳۔ سیرت اول ص ۱۹۰، حاشیہ ع۱، ۱۴۔ سیرت اول ص ۲۲۳-۶، نیز جلد سوم ص ۶۲۴-۹ مکمل بحث کے لئے، ۱۵۔ سیرت اول ص ۲۳۵، حاشیہ ع۱، ۱۶۔ سیرت اول ص ۲۶۸، حاشیہ ع۱، ۱۷۔ سیرت اول ص ۲۶۲-۳ حاشیہ ع۲-۳، ۱۸۔ سیرت اول ص ۲۷۲، سوم ص ۷۶۶-۸، ۱۹۔ سیرت اول ص ۲۸۳-۴ حاشیہ ع۲ ۲۰۔ سیرت اول ص ۳۵۰-۲، ۲۱۔ سیرت اول ص ۴۰۵-۶ (دیباچہ طبع چہارم) حاشیہ ع۱، ۲۲۔ سیرت اول ص ۴۱۵، حاشیہ ع۲، ۲۳۔ سیرت اول ص ۴۲۳، حاشیہ ع۲، ۲۴۔ واقدی کے بارے میں ملاحظہ ہو: مقالات سلیمان، حصہ دوم، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۱-۳۸، اور ص ۱۳۹-۹۵ میں دو مضمون بعنوان: "محمد بن عمر الواقدی اور سیرت میں علمائے مستشرقین کی ایک نئی غلطی" اور "پھر واقدی (امام زہری پر الزام)"، ۲۵۔ سیرت اول ص ۴۲۳، حاشیہ ع۲، ۲۶۔ سیرت اول ص ۴۶۲ حاشیہ ع۱، ۲۷۔ سیرت اول ص ۵۰۷-۸ حاشیہ ع۲، ۲۸۔ سیرت اول ص ۵۲۳ حاشیہ ع۱، ۲۹۔ سیرت اول ص ۵۴۳-۴ حاشیہ ع۱، کا تتمہ قوسین میں، ۳۰۔ سیرت اول ص ۵۴۷ حاشیہ ع۱ ۳۱۔ سیرت اول ص ۵۴۸، ۳۲۔ سیرت اول ص ۵۴۷ حاشیہ ع۱، ۳۳۔ سیرت اول ص ۵۵۴-۵ حاشیہ ع۱، ۳۴۔ سیرت اول ص ۵۶۱ حاشیہ ع۲، ۳۵۔ سیرت اول ص ۵۶۹ حاشیہ ع۲، ۳۶۔ سیرت دوم ص ۲۳، ۳۷۔ سیرت دوم ص ۳۸ حاشیہ ع۲ ۳۸۔ سیرت دوم ص ۵۷، سید صاحب کی سبقت خیال و نظریہ پر ملاحظہ ہو میرا مضمون اضافات سلیمانی پر، ۳۹۔ سیرت دوم ص ۱۰۲ حاشیہ ع۱، بحث کے لیے پورا باب ملاحظہ ہو، ۴۰۔ سیرت دوم ص ۱۰۱-۹، ۴۱۔ سیرت دوم ص ۱۱۱ حاشیہ ع۱، ۴۲۔ سیرت دوم ص ۱۱۳ حاشیہ ع۱، ۴۳۔ سیرت دوم ص ۱۳۰ حاشیہ ع۱، ۴۴۔ سیرت دوم ص ۱۴۴-۹ حاشیہ ع۱ اور دوسرے حواشی، ۴۵۔ سیرت دوم ص ۱۵۰ حاشیہ ع۲، ۴۶۔ سیرت دوم ص ۱۶۷ حاشیہ ع۱، ۴۷۔ سیرت دوم ص ۱۷۲، حاشیہ ع۱، ۴۸۔ سیرت دوم ص ۱۷۲-۳ حاشیہ ع۱، ۴۹۔ سیرت دوم ص ۱۷۴-۷ حاشیہ ع۱، ۵۰۔ سیرت دوم ص ۱۷۵ حاشیہ ع۱، ۵۱۔ سیرت دوم ص ۱۷۶ حاشیہ ع۱ نیز ملاحظہ ہو ص ۱۸۲ حاشیہ ع۱، ۵۲۔ سیرت دوم ص ۱۸۳ حاشیہ ع۱، ۵۳۔ سیرت دوم ص ۱۸۴، حاشیہ ع۱، ۵۴۔ سیرت دوم ص ۱۹۶ حاشیہ ع۲، ص ۱۸۷-۹۷، ۵۵۔ سیرت سوم ص ۲۳-۲۷ شاہ ولی اللہؒ کے خیال کے لیے ملاحظہ ہو ص ۸-۲۲، ۵۶۔ سیرت سوم ص ۳۹-۵۲، ۵۷۔ سیرت سوم ص ۴۰ حاشیہ ع۱ نیز ملاحظہ ہو ص ۴۱-۵۲، ۵۸۔ سیرت سوم ص ۴۳-۴۶ اور صفحات

مابعد کی بحث ، ۵۹۔ سیرت سوم ص۲۳۰-۲۱۱ ، ۶۰۔ سیرت سوم ۶۰-۲۴۰ اور ص۲۵۲-۲۹۳ ، ۶۱۔ سیرت سوم ص۸۳-۴۵۳ ، ۶۲۔ سیرت سوم ص۵۰۳-۴۸۴ ، ۶۳۔ سیرت سوم ۱۰-۵۰۵ ، ۶۴۔ سیرت سوم ص۲۹-۵۱۱ ، ۶۵۔ سیرت سوم ص۳۱-۵۳۰ ، ۶۶۔ سیرت سوم ص۶۸-۶۰۴ اور ص۳۶-۶۲۹ ، ۶۷۔ سیرت سوم ص۷۷-۶۷۷ ، ۶۸۔ سیرت چہارم (اعظم گڑھ) ص۳۶-۱۲۴ اور ص۳۲-۱۳۶ ، ۶۹۔ سیرت چہارم ص۸۳-۲۷۶ حاشیہ ۱ ، ۷۰۔ سیرت چہارم ص۸۰۲-۷۸۰ سید سلیمان ندوی نے بعد میں اپنی رائے سے رجوع کرلیا تھا اور جمہور کے مسلک کے قائل ہو گئے تھے ملاحظہ ہو غلام محمد ، تذکرہ سلیمان ص۱۴۸ ، ۷۱۔ سیرت پنجم (اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء) ص۹۲ حاشیہ ۱ ، ۷۲۔ سیرت پنجم ص۱۰-۱۰۲ ، ۷۳۔ سیرت پنجم ص۱۷۶ حاشیہ ۱ ، ۷۴۔ سیرت پنجم ص۵-۱۹۴ ، ۷۵۔ سیرت پنجم ص۲۲۲ حاشیہ ۱ ، ۷۶۔ سیرت پنجم ص۶-۲۲۵ اور ص۵۰-۲۴۹ ، ۷۷۔ سیرت پنجم ص۵-۲۵۱ اور ص۲۶۹ حاشیہ ۱ ، ۷۸۔ سیرت پنجم ص۲۹۹ ، ۷۹۔ سیرت ششم (اعظم گڑھ ۱۹۲۹ء) ص۲۲-۲۹ ، ص۵۲ ، ص۶۵ ، ص۶۷ ، ص۹۲-۹۰ ، ص۸-۹۵ ، ص۳۸-۱۱۷ ، ص۵-۱۴۲ ، ص۵۰-۱۴۹ خاص کر ، ۸۰۔ سیرت ششم ص۷ ، اور ص۵-۷۴ ، ۸۱۔ سیرت ششم ص۱۸۵ تک ، ۸۲۔ سیرت ششم ص۲۱۰ ، ۸۳۔ سیرت ششم ص۲۲۷ حاشیہ ۱ ۸۴۔ سیرت ششم ص۲۸۱ ، ۸۵۔ سیرت ششم ص۴۱۷ ، ۸۶۔ سیرت ششم ص۵-۴۹۴ حاشیہ ۱ ، ۸۷۔ سیرت ہفتم (اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء) ص۲۱۳-۱۹۴ ، ۸۸۔ سیرت ہفتم ص۴۳-۱۲۶ ، ۸۹۔ سیرت ہفتم ص۱۲۵-۹۴۔

◆

علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں
سوائے
سید سلیمان ندوی
کے اور کون ہے
(علامہ اقبال)

سید ابراہیم ندوی*

محقق و تنقید نگار

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی جامعیت اور ان کے علوم و فنون کا تنوع ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے سید صاحبؒ کے بارے میں بالکل درست فرمایا کہ "میں نے ہندوستان اور بیرون ہند کی سیاحت اور ممالک اسلامیہ سے قریبی واقفیت کے سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی جیسا جامع فنون اور متنوع الذوق نہیں دیکھا!"

حقیقت یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ علم و فن کے اعتبار سے اس دور کے جاحظ تھے اور اگر علم کے ساتھ عمل کو بھی مربوط کر دیا جائے تو وہ جاحظ سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ وہ بے مثال سیرت نگار، عظیم الشان مؤرخ، غیر معمولی عالم، فقیہ اور مفسر، لسانیات اور عمرانیات کے ماہر اور اردو ادب کے عظیم نقاد، محقق اور انشاء پرداز تھے۔ ان کی تمام تصانیف میں قدر مشترک کے طور پر بے مثال تحقیق اور بلند پایہ تنقید نگاری کا وصف جلوہ گر ہے، خواہ وہ طویل تصنیف ہو یا مختصر خطبہ ہو یا مقالہ ہر جگہ تحقیق کی روح کارفرما ہے، بلاشبہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے محقق تھے۔

اس مقالہ میں سب سے پہلے سید صاحبؒ کے ان علمی اور تحقیقی خدمات کا تذکرہ ہوگا، جو انہوں نے اردو زبان میں انجام دیں۔ حقیقتاً سید صاحبؒ نے اردو زبان کی ترقی میں بہت اہم رول ادا کیا ہے، اور جو تحقیقی اثاثہ چھوڑا ہے، اس کا معیار بہت بلند ہے۔

آج ہندوستان میں سینکڑوں اکیڈمیاں قائم ہیں لیکن ان کے مقاصد محدود ہیں۔ سید صاحب بذاتِ خود ایک اکیڈمی تھے، بلکہ یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ ان کی وجہ سے ہندوستان میں بہت سی اکیڈمیاں اور علمی ادبی انجمنیں آباد تھیں، انھوں نے اردو ادب کے دامن کو علم و ادب کے بیش بہا خزانوں سے مالا مال کرکے اردو ادب میں لافانی مقام حاصل کیا۔ اردو زبان کے ارتقاء میں سید صاحبؒ کی تحقیقی خدمات کا جائزہ لینے کے لیے "نقوش سلیمانی" کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے، اردو زبان کے ارتقاء کے بارے میں تحقیقی

---

* صدر شعبۂ عربی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

مواد فراہم کرتے ہوئے جس نظریہ کو پیش کیا ہے وہ ہو سکتا ہے کہ سب کے لئے قابل قبول نہ ہو، لیکن سب ہی اس کی اہمیت کے معترف ہیں۔

”نقوش سلیمانی“ میں اردو زبان کی تاریخ پر متعدد مضامین ملتے ہیں، اردو زبان کس طرح وجود میں آئی اُس کے بارے میں سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: ”سولھویں صدی میں اہل یورپ کا یہاں کے سواحل پر گذر ہوا۔ جن میں سے پیشرو پرتگالی اور ان کے بعد فرنچ اور سب سے آخر میں انگریز تھے۔ ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں مختلف قوموں مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا۔ ناگزیر ہے کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو، وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اردو ہے“[٢]

دلائل کی روشنی میں سید صاحبؒ نے یہ ثابت کیا کہ یہ زبان کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کی نہیں ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں ”اردو زبان تنہا کسی قوم کی زبان نہیں ہے، اس میں ہندی، اسلامی، یورپین تمام زبانوں کا ذخیرہ ہے“ اور اس لئے اُس کی ملکیت کا تمام باشندگانِ ہند بجا طور سے دعویٰ کر سکتے ہیں“ اور اس کو مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں“ بلکہ وہ ہندوستان کی مشترک زبان ہے۔ سید صاحبؒ کے سامنے ہندوستان کے مستقبل کا نقشہ تھا“ اور وہ اپنی متاع عزیز یعنی اردو کی حوادث ایام سے حفاظت کرنا چاہتے تھے، غالباً یہی جذبہ سید صاحبؒ کی تحریر میں کارفرما تھا، اور اسی جذبہ کے تحت انھوں نے اسی مقالہ میں تحریر فرمایا ہے کہ ”میں اسی بنا پر ہندوستان کی مشترک زبان کو اردو کہنا اصطلاح کی غلطی سمجھتا ہوں، اردو کے ابتدائی مصنفین نے اس کو ہمیشہ ”ہندی“ کہا ہے“ اور انگریزوں کی زبان میں اس کا نام اب تک ”ہندوستانی“ ہے[٣]۔“

ان کے مخاطب صرف مسلمان نہ تھے بلکہ وہ ہندوستان کے ایک عظیم انسان کی شکل میں پوری قوم کو دعوت فکر و نظر دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ”اس زمانے میں جب کہ ہر ملک میں یہ آواز بلند ہے کہ ملک کی باگ اہل ملک کے ہاتھوں میں دے دی جائے، یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ایران میں ایرانی اور مصر میں مصری اور عراق میں عراقی کی طرح ”ہندوستان میں ہندوستانی“ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان میں صرف ہندوستانی ہوں، لیکن میں اطمینان دلاتا ہوں کہ ”ہندوستانی“ سے میری مراد ”ہندوستانی باشندے“ نہیں ”ہندوستانی بھاشا“ ہے“ اور میری تقریر کا مقصود سیاسی سوراج نہیں، بلکہ زبانی سوراج ہے[٤]۔“ متحدہ قوم کے لئے متحدہ زبان کی اہمیت پر سید صاحبؒ نے جس انداز میں روشنی ڈالی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان کے کسی لیڈر نے اتنے واضح انداز میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا، لیکن اہل ملک نے ان کے مشورہ پر کہاں تک عمل کیا یہ اب کوئی مخفی بات نہیں۔

اُردو اور ہندی کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے ان کا تجزیہ کرتے ہوئے علامہ موصوف کے ذہن رسانے حقیقی دشمن کی نقاب کشائی کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "انگریزوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ہندوستان کو حکومت کرنا ہے تو اس متحدہ قومیت کے درخت پر جو صدیوں کی خونریزی سے سینچ کر تیموریوں کی باغبانی سے تیار ہوا تھا، پہلے کلہاڑی مارنا ضروری ہے۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے امتیازات کے حدود کو جس قدر ممکن ہو ابھارا جائے، چنانچہ فورٹ ولیم میں اُردو اور ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے، ایک مسلمانوں کے سر پر تھوپا، اور دوسرے کو ہندوؤں کے سر مڑھا۔ اور اس کا نام علمی قدردانی اور ادب نوازی رکھا۔[5]"

اسی سلسلے میں وہ قوم کو متنبہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں: "ہندوستان میں زبان کا انقلاب ہو کر رہیگا، جس قدر ہندوستان زیادہ متحد ہوتا جائے گا اس کی متحدہ زبان کا امکان بڑھتا جائے گا، جو لوگ ہندوستان میں دو زبانیں پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کو ہوشیار رہنا چاہیئے کہ وہ اس موجودہ ہمالیہ سے بڑھ کر ایک اور ہمالیہ بنا رہے ہیں، ہندوستان کو دو متفرق زبانوں میں تقسیم کرنے سے دونوں قوموں کے درمیان ایک ہمالیہ کھڑا ہو جائے گا، جو قیامت تک ٹوٹ نہ سکے گا۔"[6]

سید صاحب کے ان خیالات سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کیلئے ایک قومی زبان کے قائل تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ تمام ہندوستان میں ہندوستانی زبان کی ترویج و اشاعت ہو تاکہ اس کی وجہ سے عوام میں اتحاد پیدا ہو۔ ہندوستان کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سید صاحب کی یہ تجویز ہندوستان کے اتحاد کے لیے بے انتہا اہم اور مفید تھی، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے سارے عوام سے محبت رکھتے ہیں، اور متحدہ ہندوستان کا تابناک نقشہ ان کے سامنے تھا۔

سید صاحبؒ کے ان تحقیقات عالیہ سے حکومتِ ہند کو فائدہ اٹھانا چاہیئے تھا، ان سے متحدہ قومیت کی تحریک کو تقویت ملتی، اور اس کے تمام لسانی مسائل حل ہو سکتے تھے، اس لیے کہ سرزمین ہند پر بہت سے مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں، ان کے درمیان اتحاد ایک زبان کے ذریعہ ہی ہو سکتا تھا۔ سید صاحب کے اردو زبان پر اس تحقیقی مقالے سے نہ صرف مسلمان بلکہ پورا ہندوستان مستفید ہو سکتا ہے۔

"نقوش سلیمانی" میں اردو زبان کے علاوہ دیگر مضامین بھی ملتے ہیں، جن میں اکبر کا ظریفانہ کلام، ہاشم علی کا مجموعہ مراثی اور ان کے علاوہ مکاتیب شبلیؒ، گلستانِ امجد، کلام شاد کے مقدمات قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام مضامین میں تحقیق کا عنصر کارفرما ہے، اور تنقیدی اصول کے مطابق کلام کا تجزیہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ ڈلیسن کے قول کے مطابق ناقد کے لئے ضروری ہے کہ وہ محاسن کی تحقیق کرے، نہ کہ معائب کی۔ اور اس

کے بنیادی فرائض میں سے یہ ہے کہ وہ حسن وجمال کی جستجو کرے جو ادیب میں مخفی ہے۔ میتھوارنلڈ کے اصول کے مطابق ناقد کو چاہیئے کہ وہ اشیاء کا مطالعہ اس طرح کرے جیسا کہ وہ حقیقت میں ہیں، اس لیے کہ انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ اعلیٰ مثال کی منزل کو حاصل کرے، اور خطا و نسیان سے بالکل محفوظ رہے، لیکن ناقد کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ذہن اخاذ ہو، اس کا دل وسیع ہو اور اس کی نگاہ تیز ہو تاکہ وہ بنیادی باتوں کا صحیح تجزیہ کرے اور تحفظ ذہنی سے کام نہ لے، بلکہ وہ اپنی تنقید میں آزاد ہو۔

مغربی ناقدوں نے تنقید کے جو اصول بیان کئے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ بنیادی تنقید کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ الہامی ہو، اور ادیب یا شاعر کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی ہمت افزائی کی جائے، اور ان کے لیے ترقی کی راہ ہموار کی جائے، بڑا یا عظیم تنقید نگار وہی ہے جو ادب کے مفہوم کو سمجھنے میں ہماری مدد کرے، اور حقیقی ناقد وہی ہے جو تنقید کرنے سے پہلے شاعر کے کلام یا ادیب کے مقالے کا بہ نظر غائر مطالعہ کرے اور ان کے تصانیف میں جو قوت جمال اور ادبی ثروت پنہاں ہے، اس کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرے کہ ہم اس سے صحیح طور پر محظوظ ہو سکیں۔

سید صاحبؒ کے علمی اور تنقیدی مضامین پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مشرقی محقق ہوتے ہوئے بھی مغربی تنقید کی روح سے واقف تھے۔ انہوں نے اپنی تنقیدوں کے ذریعہ بہت سے ادباء اور شعراء کو روشناس کرایا جو قعر گمنامی میں تھے۔ نقوش سلیمانی کے علاوہ "معارف" میں بہت سے ادباء، علماء اور شعراء کی تالیفات اور دواوین کا تعارف کراکے ان کو علمی حلقوں میں شہرت عطا کی۔ "باب الانتقاد" میں سینکڑوں کتابوں پر عالمانہ تبصرے کئے۔ اس طرح سید صاحب نے تنقید نگاری میں بھی ایک عظیم سرمایہ چھوڑا ہے جو ان کو اپنے دور کا ایک اعلیٰ ناقد بنانے کے لئے کافی ہے۔

ان مضامین کے علاوہ نقوش سلیمانی میں اردو، عربی الفاظ کی ایسی تحقیقی و تنقیدی بحث ملتی ہے، جن سے ان الفاظ کے صحیح تلفظ کا علم ہوتا ہے جس سے سید صاحبؒ کی تحقیقی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے، بلاشبہ یہ مضامین علم لسانیات میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک ایک لفظ کی تحقیق کے لئے علامہ موصوف نے نہ معلوم کتنی کتابوں کا مطالعہ کیا اور کس طرح ان کا ذہن صحیح الفاظ تک پہونچا حالانکہ یہ الفاظ اپنی اصلی شکل سے بالکل دور ہو چکے تھے اور امتداد زمانہ کی وجہ سے ان الفاظ کی ظاہری صورت بدل چکی تھی۔ سید صاحب نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ان الفاظ کا تقابلی مطالعہ کیا سید صاحب کے یہ محققانہ مضامین ان کے تحقیقی مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ نقوش سلیمانی کے آخری صفحہ کو ملاحظہ کیجیے، جس میں سید صاحب نے "استدراک" کے عنوان سے بعض الفاظ کی تحقیق سے مراجعت کرلی۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے جو اپنے دور کے غیر معمولی ماہر لسانیات تھے، ان

کی تحقیق پر اپنے خیال میں تبدیلی پیدا کرلی۔ یہ نقش "نقوشِ سلیمانی" کا سب سے اعلیٰ اور ارفع نقش ہے، کیونکہ معمولی تحقیق کرنے والے بھی بہت کم اپنی رائے میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک قابلِ تقلید مثال ہے کہ اگر کوئی صحیح بات اپنی تحقیق کے خلاف ثابت ہو جائے تو حق کے جویا عالم و محقق کو مراجعت الی الحق کر لینا چاہیئے، اور اس کو اپنے وقار کا مسئلہ PRESTIGE ISSUE نہیں بنانا چاہیئے۔

سید صاحبؒ کی دوسری تحقیقی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" ہے۔ اس جلیل القدر تصنیف کے بارے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی جو خود بھی مشہور عالم اور انشا پرداز تھے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں: "ضرورت تھی کہ گہری نگاہیں گوہرِ مقصود کا پتہ لگائیں، خس و خاشاک کو دور کر کے اصلیت کی تہہ تک پہنچیں اور آج جب کہ دل ملانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، دکھائیں کہ کبھی اس سرزمین پر محبت و ہمدردی کا ابرِ رحمت بھی برسا تھا۔ اس کے لئے تصنع کی حاجت نہ تھی، واقعات کو بگاڑنے اور بنانے کی ضرورت نہ تھی، حرف چہرۂ حقیقت کو بے نقاب کر دینا کافی تھا، مگر شاہدِ مقصود تک باریابی ہر ایک کی قسمت میں نہیں آئی ہے، کارکنانِ قضا و قدر نے یہ فتحیابی "سلیمانِ وقت" کے لئے محفوظ و مخصوص فرما دی تھی۔"

سید صاحبؒ نے اس کتاب میں اپنی تحقیق کے جوہر دکھائے ہیں۔ ایک طرف اسلامی مورخین مسعودی، سلیمان تاجر، ابن حوقل، ابن بطوطہ، یاقوت، رومی، قفطی، ابن اثیر، ابن خلدون اور البیرونی کی کتابوں سے استفادہ کیا اور ان کے بہت سے نظریے اور خیالات کی تصحیح بھی کی، تو دوسری طرف مغربی مورخین کے افکار و خیالات کا مطالعہ اور ان کے اقوال پر ناقدانہ نظر ڈالی۔ سید صاحبؒ کا یہ اصول تھا کہ اگر کوئی بات انکے تحقیقی معیار پر پوری اترتی تھی تو وہ بلا تامل اخذ کر لیتے تھے، ورنہ وہ دلائل کی روشنی میں مورخ کی غلطی کو پیش کرتے تھے، خواہ وہ مورخ قدیم ہو یا جدید، مشرقی ہو یا مغربی، وہ بغیر کسی جھجک کے ان پر تنقید کرتے تھے۔ ہندوستان کے ایک مشہور مورخ مولانا آزاد بلگرامی کے مبالغہ آمیز بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "میر آزاد بلگرامی نے "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" میں کئی صفحے ہندوستان کے ان فضائل کے بیان کے نذر کئے، اور اس میں یہاں تک کہا ہے کہ جب آدمؑ سب سے پہلے ہندوستان اترے، اور یہاں ان پر وحی آئی، تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہی وہ ملک ہے جہاں خدا کی پہلی وحی نازل ہوئی، اور چونکہ نورِ محمدؐ حضرت آدمؑ کی پیشانی میں امانت تھا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اسی سرزمین میں ہوا۔" حضرت علامہ موصوف اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں کہ یہ تمام روایتیں فنِ حدیث کے لحاظ سے بہت کم درجہ پر ہیں، یعنی یہ باتیں قابلِ اعتبار نہیں ہیں، بلکہ ان کو افسانہ سمجھنا چاہیئے۔"

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صاحب نے سید صاحب کے تحقیقی کارنامہ کا اس طرح تذکرہ کیا ہے: "سلیمانِ زماں نے دیو و پری کی داستانوں کا سننا عار سمجھا اور نکتہ سنج، حقیقت نگار مصنفین اور سیاحوں کو اپنا رفیقِ طریق بنایا

جن کی فکر و نظر میں اسلامی وسعت اور صدق پسندی تھی"۔

ان مؤرخین میں سب سے زیادہ سید صاحب البیرونی سے متاثر ہوئے، البیرونی کے بارے میں مشرقی و مغربی مورخوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے البیرونی کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس کا کچھ اور ہی انداز ہے، وہ لکھتے ہیں: "بہرحال البیرونی ہندوستان میں اس وقت داخل ہوا، جب ہندوستان کی سرزمین سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے زیر و زبر ہو رہی تھی، مگر عین اسی وقت علم و فن کا دوسرا سلطان تن تنہا نہایت اطمینان اور چین سے ہندوستان کی علمی فتوحات میں مصروف تھا، اور اس سیاسی لڑائی اور خلفشار پر دل ہی دل میں جل رہا تھا[۹]۔" سید صاحب کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عین اس وقت جب سلطان محمود غزنوی ہندوستان کی دولت لوٹ رہا تھا، ایک دوسرا سلطان العلوم ہندوستان میں علم کی دولت لٹا رہا تھا۔

عرب و ہند کے تعلقات پر نہ صرف اردو میں بلکہ دنیا کی کسی زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، سید صاحبؒ پہلے مصنف تھے جنھوں نے اس اہم موضوع پر قلم اٹھایا اور اپنی تحقیقی صلاحیت سے اس کتاب کو اعلیٰ و ارفع بنا دیا۔ اس کتاب میں سید صاحبؒ نے ایسے مورخوں کے اقوال لینے سے احتراز کیا ہے، جن کے کلام میں مبالغہ آمیزی پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں خیالی مضامین اور عبارت آرائی نہیں ملتی۔ اس کتاب میں پانچ ابواب ہیں پہلے باب کا عنوان تعلقات کا آغاز اور ہندوستان کے عرب سیاح ہے، اس باب میں سب سے اہم تحقیق یہ کی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السّلام جب آسمان کی جنت سے نکالے گئے، تو وہ اسی زمین کی جنت میں جس کا نام ہندوستان جنتِ نشان ہے اتارے گئے، سراندیپ (لنکا) میں انہوں نے پہلا قدم رکھا جس کا نشان اس کے ایک پہاڑ پر موجود ہے۔ اس طرح سید صاحبؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان مسلمانوں کا پدری وطن ہے۔ اس کتاب کا دوسرا باب تجارتی تعلقات پر حاوی ہے، جو قدیم زمانے میں ہندوستان اور عربوں کے درمیان قائم تھے۔ تیسرا باب عرب اور ہند کے علمی تعلقات پر مشتمل ہے، اس باب میں سید صاحبؒ نے متعدد مورخوں اور سیاحوں کے بیانات سے یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم زمانے میں عرب علماء کثیر تعداد میں ہندوستان آئے، اور اسی طرح ہندوستان کے بہت سے اسکالرس عباسی دور میں بغداد پہنچے، اس طرح انھوں نے ہندوستانی علوم کی اشاعت عرب دنیا میں کی، علامہ موصوف کا سب سے اہم کارنامہ اس باب میں برامکہ کی تحقیق ہے، عام طور سے یہ مشہور ہے کہ برامکہ مجوسی تھے، یعنی آتش پرست ایرانی، بلخ میں نوبہار نامی ایک آتش کدہ تھا۔ جس کو منوچہر نے بنوایا تھا، اس کے بارے میں اسلامی مورخین لکھتے ہیں کہ برامکہ اسی آتش کدہ کے پیر مغاں تھے۔ سید صاحب ان اسلامی مورخوں کی اس تحقیق پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں، پھر لفظ برمک کی اصلیت پر سیر حاصل

بحث کرتے ہیں اور تحریر فرماتے ہیں کہ: "قدیم مورخوں اور لغت نویسوں نے اس لفظ کی تحقیق کی طرف توجہ نہیں کی، بعد کے فارسی مورخوں اور لغت نویسوں نے اس کو مُکیدَن (چوسنا) کے فارسی مصدر سے بتایا ہے، جس پر "بر" کا لفظ بڑھا کر بَرمُکیدَن استعمال ہونے لگا، اس طرح اس لفظ کی اصلیت تیار کی، پھر اس لفظ کے سہارے ایک بے بنیاد کہانی کی عمارت تیار کر لی... کہتے ہیں کہ پہلا برمک مسلمان ہو کر جب خلیفۂ وقت کے سامنے حاضر ہوا تو خلیفہ نے اس کو ڈانٹ کر کہا کہ تجھ کو بادشاہوں کے دربار میں آنے کا سلیقہ نہیں، تو اپنے ساتھ زہر لے کر دربار میں آیا، (اس کی انگوٹھی کے نیچے زہریلا پتھر تھا)، برمک اول نے کہا یہ میرا قصور ہے، میری انگوٹھی کے نیچے زہر ہے تاکہ اگر کبھی مجھ پر ایسا وقت آجائے کہ مجھے اپنی عزت بچانے کے لئے جان دینی پڑے تو میں اس انگوٹھی کو چوس لوں اور جان دے دوں"![۱۰]

آپ نے یہ دلچسپ داستان تو سن لی، لیکن آپ محققِ زماں علامہ سید سلیمان ندوی کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

"یہ کہانی تمام تر جھوٹ ہے اور صرف فارسی قصہ نویس کی گپ ہے، کیونکہ دمشق کے دربار کی زبان فارسی نہیں تھی بلکہ عربی تھی، علاوہ ازیں اس قصہ کا ماحصل یہ ہوگا کہ برمک کا لفظ ۸۶ھ ہجری کی پیداوار ہے، حالانکہ عرب کے تمام مستند مورخوں نے یہی لکھا ہے کہ یہ بلخ کے افسر پجاری کا پرانا لقب ہے جو ۸۶ھ سے بہت پہلے تھا"

سید صاحبؒ ایک دوسرے مشہور مورخ کی رائے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ برمک جس کی اصل فارسی میں برمغ ہے، جس کی جمع مغان ہے اور اسی سے پیرِ مغان مستعمل ہے۔ اس رائے کے بارے میں سید صاحب فرماتے ہیں اس کی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی ہے کہ فارسی (غ) کو عربی میں (ک) سے بدل دیا گیا ہو، اگر برمغ کی عربی بنائی جاتی تو برمج بن سکتا تھا نہ کہ برمک۔ وہ مغربی مورخوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تعجب ہے کہ پرانے مورخوں کو چھوڑ کر یورپ کے نئے مورخوں کی بھی ادھر نظر نہیں پڑی، اور پروفیسر براؤن جیسے محقق سے یہ حقیقت چھپی رہی، کیونکہ وہ بھی نوبہار کو آتش کدہ اور برامکہ کو مجوسی کہتے تھے۔ ان تمام اقوال کی تردید کرتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں کہ میرا دعویٰ ہے کہ برامکہ بدھ مذہب کے پیرو تھے، اور ان کا اصل تعلق ہندوستان سے تھا نہ کہ ایران سے۔ سید صاحب کا یہ دعویٰ بغیر دلیل کے نہ تھا بلکہ دلائل سے اس حقیقت کو آشکارا کیا۔ برمک کی اصلیت بتلاتے ہوئے سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ وہ سنسکرت لفظ پرمُکھ کی بدلی ہوئی شکل ہے، کیونکہ پرمکھ کے معنی سنسکرت میں برتر اور عظیم کے ہیں۔ ان کی یہ تحقیق جدید مورخوں کے لئے بہت زیادہ ممد و معاون ثابت ہوگی، جو قدیم تاریخ کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں، اور ان کے اس تنقیدی تجزیہ سے آنے والے مورخوں کو ایک روشنی حاصل ہوگی جس کی مدد سے وہ اس میدان میں آگے بڑھ سکتے ہیں، جو داستانوں اور خرافات کے انبار میں دب گئے، اور سید صاحب کے اس قول فیصل کے سامنے تمام مورّخ

سر جھکا لیتے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے بھی سید صاحب کی اس اعلیٰ تحقیق کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ

"اس باب کی جان سخن برامکہ کے لفظ کی بے نظیر تحقیق ہے جس پر میں اپنے عزیز کو دلی مبارکباد دیتا ہوں، اور کہتا ہوں کہ تحقیق کا یہ نقش ایک بہاری قلم کے انتظار میں پس پردہ تقدیر تھا۔ آخر آمد زپس پردہ تقدیر پدید"[12]

علامہ موصوف کی سب کتابیں تحقیق کے معیار پر پوری اترتی ہیں، یہی حال آپ کے خطبات کا تھا، پروفیسر رشید احمد صدیقی سید صاحب کی تحقیقی جستجو کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جب سید صاحب علی گڑھ تشریف لاتے تھے، یہاں کے اساتذہ اور طلبہ کو مخاطب کرتے تھے تو میں دیکھتا تھا کہ بہت سے جامعہ کے اساتذہ جن کو اپنی تاریخ دانی پر ناز ہے کاغذ اور پنسل لے کر بیٹھ جاتے تھے اور سید صاحب کی تحقیقی تقریر سے وہ نکات نوٹ کر لیتے تھے جو ان کے لئے مفید ثابت ہوتے تھے۔" پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اس بیان سے سید صاحبؒ کی تحقیقی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

سید صاحبؒ کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات پر علامہ اقبال کا یہ مقولہ کہ "علوم اسلامی کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سید سلیمان ندوی کے سوا اور کون ہے۔" تو ضرب المثل کی حد تک مشہور ہو گیا ہے، اور حقیقتاً یہ ایک عظیم مفکر کا اپنے وقت کے جلیل القدر عالم کے لئے معتبر ترین خراج عقیدت ہے جو اس نے تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں پیش کیا۔

◆

حوالے:

۱۔ پرانے چراغ حصہ اول ص۵۷

۲ تا ۶۔ نقوش سلیمانی ۵، ۱۹-۲۰، ۶۱، ۷۴

۷۔ مقالات شیروانی ص۲۷۳۔

۸ تا ۱۱۔ عرب و ہند کے تعلقات ۲، ۱۷۵، ۱۰۳-۱۰۴

۱۲۔ مقالات شیروانی ص۲۷۶۔

◆

سید احتشام احمد ندوی★

سُلیمانی نظریۂ لسانیات

"نقوش سلیمانی" میں یوں تو بہت سے جواہر ہیں، مگر علامہ سید سلیمان ندوی نے سب سے بڑا جو نقش ثبت کیا ہے وہ ان کا لسانی نظریہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کا آغاز صوبۂ سندھ سے ہوا، چونکہ یہی وہ سرزمین ہے جہاں عرب مسلمان سب سے پہلے آئے، اور انہوں نے یہاں حکومت قائم کی جو تین سو برس قائم رہی، جن لوگوں نے لسانی نظریے اُردو کے آغاز اور نشو ونما کے بارے میں قائم کیے ہیں وہ سب کسی نہ کسی حد تک قیاس آرائی کرتے ہیں یا گریرسن اور چیٹرجی سے خیالات مستعار لیتے ہیں۔ کوئی نظریہ اردو کے ماخذ کے بارے میں سو فیصدی مسلمہ نہیں ہے، سب سے پہلے محمود خاں شیرانی نے "پنجاب میں اردو" شائع کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ بھی اسی نظریے کے حامل ہیں۔ بعد میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو ہریانی زبان سے نکلی ہے جو دہلی سے ملحق علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ عام طور سے اردو والے اسی نظریے سے متاثر نظر آتے ہیں، مگر اس لسانی نظریے پر ڈاکٹر زورؔ ضرب کاری لگاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مقدمہ تاریخ زبان اُردو میں "مسعود صاحب سے اہم فرد گذاشت یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کرکے نتائج اخذ کیے ہیں، حالانکہ اردو نے جس وقت پنجاب میں نشو ونما حاصل کی، اس وقت ہریانی اور کھڑی بولی تو کجا خود برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالم وجود میں نہیں آئی تھی، اور خود انہوں نے پروفیسر شیرانی کے اس نظریے کو قبول کیا ہے کہ ہریانی کی پیدائش مسلمانوں کی دہلی میں آمد کے بعد عمل میں آئی ہے۔'

اس طرح ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے نظریہ کی زور صاحب نے بنیاد ہی ڈھادی، جب ہریانی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی تو اس کو اردو کا ماخذ قرار دینے کا موقع کہاں ہے؟ یعنی جس وقت دکنی ادب وجود میں آیا اس وقت ہریانی کا وجود ہی نہ تھا۔ چونکہ یہ رائے اُردو کے ماہر لسانیات کی ہے جس کی نظر اس موضوع پر بہت گہری ہے، جس نے خود اس موضوع پر انگلستان میں کام کیا تھا اور جس نے

★ صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا۔

ہندوستانی صوتیات پر پیرس سے ایک کتاب شائع کی تھی، اس لئے ظاہر ہے کہ جب غلط مفروضہ پر بنیاد رکھی گئی تو نتیجہ کہاں سے صحیح ہوگا؟ اس بنا پر جب ڈاکٹر مسعود صاحب پنجابی کی قدامت کا مقابلہ ہریانی سے کرتے ہیں تاکہ اس طرح ہریانی کا رشتہ اُردو سے قائم کرلیں تو ڈاکٹر زورؔ تعجب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: "البتہ شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابلے ہریانی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑے گا۔[۲]" ڈاکٹر زورؔ صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں: "قصہ مختصر یہ ہے کہ ہریانی کو اردو کا ماخذ ثابت کرنے کی کوشش میں ڈاکٹر مسعود حسین صاحب کی پوری کتاب ایسے گنجلک اور متضاد بیانات سے معمور ہوگئی ہے کہ ان پر سرسری تبصرہ کے لئے بھی کافی وقت اور فرصت درکار ہے۔"[۳]

اب باقی بچتی ہے پنجابی جس کی تائید زور صاحب کرتے ہیں، یہ نظریہ دراصل پروفیسر شیرانی کا ہے، مگر یہ یاد رہے کہ زور صاحب پنجابی کو اردو کا ماخذ قرار نہیں دیتے، بلکہ وہ اُردو کو پنجابی کی بہن بتاتے ہیں، پھر ماں کون ہے؟ یہ خود ان کی زبان سے سنیے: "پنجابی زبان اردو کی ماں نہیں ہوسکتی، بہن ہوسکتی ہے۔" اب غور فرمائیے کہ اس طرح پنجابی اردو کا ماخذ نہیں بنتی، یوں تو خود برج بھاشا بھی اُردو کی بہن ہے۔ "موجودہ زمانے کے ماہرین لسانیات یعنی پروفیسر موسیو جیولس بلاک، پروفیسر ٹرنر، پروفیسر بیلی، پروفیسر چیٹرجی، اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی تحقیقات کی رو سے اردو کا سرچشمہ وہ زبان ہے جو پنجابی اور برج بھاشا دونوں کی ماں تھی، یعنی وہ پراکرت زبان جو مسلمانوں کی آمد کے وقت پشاور سے لے کر الہ آباد تک بولی جاتی تھی۔"[۴]

لیکن خود پراکرت سے بہت سی زبانیں پھوٹ نکلیں، جو آپس میں بہنیں ہیں، انھیں میں سندھی بھی ہے۔ یہ یاد رہے کہ مغربی پنجاب میں لہندا کا اثر ہے، اور لہندا خود بھی پراکرت کی بیٹی ہے۔

اب ان دلائل پر غور فرمائیے جو پنجابی کے حق میں دیئے جاتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس بارے میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا ہے، چونکہ پراکرت سنسکرت سے نکلی، اور جو مغربی بولی شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہے، اس میں کئی زبانیں ہیں، مگر ڈاکٹر شوکت سبزواری مغربی بولی کا ہی انکار کرتے ہیں، لیکن دوسرے ماہرین لسانیات اس کو تسلیم کرتے ہیں، مشرقی بولی سے بنگالی، آسامی، میتھلی، پالی اور اودھی وغیرہ نکلیں۔ مغربی بولی سے اردو، ہریانی، پنجابی، گجراتی، قنوجی، برج، اور راجستھانی وغیرہ زبانیں وجود میں آئیں۔

چونکہ اُردو اور ہندی کو مغربی بولی کی ایک شاخ تسلیم کیا گیا ہے، جو شورسینی اپ بھرنش سے

نکلی ہیں، مگر سندھی اور لہندا زبانیں مغربی بولی کے دائرہ سے باہر ہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سندھی اُردو کا ماخذ کیوں نہیں بن سکتی؟ جبکہ وہ بھی آریائی زبان ہے، بالکل اسی طرح جس طرح پنجابی اور ہریانی ہے۔ یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ پروفیسر شیرانی پنجابی کو، اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں ہریانی کو اردو کا ماخذ تسلیم کرتے ہیں، حضرت سید صاحبؒ نے سندھی کو اردو کا ماخذ قرار دیا ہے، مگر جو دلائل پنجابی کے اردو کے ماخذ بننے کے ہیں وہ درحقیقت سندھی پر منطبق ہوتے ہیں، اور عالم یہ ہے کہ سکھوں کی پنجابی کا خط تک تو فارسی نہیں ہے گورمکھی ہے، مگر ہندوستان کی ساری زبانوں میں صرف دو زبانوں نے اپنا رسم الخط عربی قرار دیا ہے، ایک سندھی زبان ہے جس کا رسم الخط خط نسخ ہے، یعنی وہی جو عربی کا ہے، دوسری اُردو ہے جس کا خط فارسی ہے جو عربی رسم الخط کی ایک شاخ ہے، اور عربی لغت کی کتابوں میں خط فارسی کے نمونے بھی درج کیے گئے ہیں۔ اس صورت حال میں حضرت سید صاحب کا نظریہ زیادہ منطقی، قرین قیاس، تاریخی، سماجی اور لسانی اعتبار سے قابل قبول ہے، یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کے نظریہ نے ان سب حضرات کو غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

اب اس سلسلے میں حضرت سید صاحب کے نظریہ کا اثر ملاحظہ فرمائیں اور اس پر تبصرہ سنیں۔ جو ڈاکٹر زور نے کیا ہے:

سنہ ۱۹۴۲ء میں ہماری زبان کے ایک قابل احترام شاعر اور ادیب برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اپنی کتاب کیفیہ شائع کی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اردو کے پنجاب میں ہونے کی مخالفت بھی کی، پنڈت کیفی کے اس گومگوانہ بیان کا اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کتاب سے دو سال قبل مولانا سید سلیمان ندوی جیسے فاضل مصنف کی کتاب "نقوش سلیمانی" سنہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہو چکی تھی، جس میں مولانا کے مختلف مضامین اور خطبے شامل ہیں، ان میں سے بعض بہت ہی قدیم یعنی سنہ ۱۹۱۵ء کے لکھے ہوئے تھے، لیکن سنہ ۱۹۲۳ء کے ایک مقالے میں مولانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو سندھ میں بنی، چنانچہ طویل بحث کے بعد جو نتیجہ اخذ فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ "قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اُردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں بنا ہوگا۔"[5]

اُردو شاہ جہاں کے عہد کی بتائی جاتی ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ عربوں، خلجیوں، تغلقوں ہی کے زمانے میں یہ پیدا ہو چکی تھی... اُردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا کام نہیں، بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک لازمی و ناگزیر نتیجہ ہے۔[6]

ایک اور مضمون میں مولانا نے یہ رائے قائم فرمائی ہے کہ "یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔"[7]

واضح ہو کہ مولانا سید سلیمان کے یہ عجیب و غریب متضاد بیانات "پنجاب میں اردو" کے اور "ہندوستانی لسانیات" کی اشاعت کے بعد شائع ہوتے ہیں، جن میں اصل مسئلہ کو پوری طرح واضح کر دیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان تحقیقی اور لسانی کتابوں کے مطالعہ کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائی، لیکن ان متضاد بیانات اور رایوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد جب پنڈت کیفی نے قلم اٹھایا تو قطعی طور پر کسی نتیجے پر پہنچنے سے گریز کیا، اور چونکہ دونوں اصحاب لسانیات سے زیادہ تاریخ و ادب اور نقد و شعر کے ماہر تھے اس لئے اپنے علم و فضل اور وسعت معلومات کے باوجود اصل مسئلے سے دور ہو گئے۔ یا شاید انہوں نے دوسرے مصنفوں کی تحقیق یا نظریے سے ہم خیال ہونے کو اپنے تبحر علمی کے لئے کسر شان تصور کیا۔

غرض "نقوش سلیمانی" اور "کیفیہ" کی اشاعت کے بعد اردو کے آغاز و ارتقاء اور جائے پیدائش کے بارے میں اردو اور ہندی کے ارباب قلم پھر تذبذب میں پڑ گئے اور اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے والے مسلم الثبوت نظریہ کو نظر انداز کرنے کا رجحان شروع ہو گیا[۹]۔

یہاں حضرت سید صاحب پر جدید لسانی نظریات و تحقیقات کو نظر انداز کرنے اور ان کا مطالعہ نہ کرنے اور تضاد بیانی کا الزام لگایا گیا ہے۔ جہاں تک لسانی نظریات کا تعلق ہے وہ دو اور دو چار کی طرح واضح نہیں ہوتے، جب سائنس کے نظریات جو حقائق پر مبنی ہوتے ہیں ان میں تبدیلی اور تضاد کا سلسلہ جاری ہے تو انسانی علوم میں اس کی گنجائش زیادہ ہے، چنانچہ اسی مقالے میں خود زور صاحب سارے ماہرین لسانیات پر تضاد بیانی کا الزام عائد کرتے ہیں، یہ کیفیت اس مقالے میں خود ان کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے:

"ڈاکٹر چیٹرجی کلکتہ یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر اور ہندوستان کے سب سے بڑے ماہر لسانیات اور محقق ہیں، یہاں اس کا موقع نہیں کہ ڈاکٹر چیٹرجی کے بظاہر متضاد بیانات کے اسباب اور حسن و قبح پر تنقیدی نظر ڈالی جائے البتہ اس امر کا اظہار کر دینا ضروری ہے کہ یہ مبہم بیانات بھی ان غلط فہمیوں کا باعث ہیں جو بعد کے اردو ارباب قلم کی لسانیاتی تحریروں کو گمراہ کر دینے کا باعث ہوئے۔"

اب بتائیے جس کو زور صاحب امام لسانیات تسلیم کرتے ہیں اسی کے اوپر تضاد بیانی اور ابہام کا الزام لگاتے ہیں ع کون رہ بتا سکے جب خضر بھکانے لگے

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور کیفی پر پہلے ہی وہ یہی تبصرہ فرما چکے ہیں۔ شیرانی کو اس بنا پر معاف کر دیا ہے کہ وہ بھی زور کے نظریہ کے حامی ہیں، یعنی یوں کہئے کہ زور صاحب ان کے نظریہ کے علمبردار ہیں۔

حضرت سید صاحب نے وضاحت سے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی مورخین پر یہ اعتراض کیا ہے، اور بالکل صحیح صورت حال پیش کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ مورخین ہند، عہد حکومت کو مفصل بیان کرتے ہیں،

سکندر مقدونی کے حملے کی ایک ایک تفصیل گناتے ہیں، مگر سندھ پر عربوں کی حکومت پر چند جملے لکھ کر محمود غزنوی، غوری اور پھر دوسرے خاندانوں کی حکومت پر آجاتے ہیں[۹]۔ محمود پر خوب تفصیل سے لکھتے ہیں، اس طرح عربوں کی حکومتِ سندھ کی لسانی تہذیبی اور تاریخی عظمت کو دبا دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ اسلام کا نقش اولین تھا اور اس کے اثرات دوررس ہیں، حضرت سید صاحب نے جو دلائل دیئے ہیں، وہ سب وہی ہیں جو خود ان لسانیات کے مدعیوں نے پیش کیے ہیں، یہاں ان کے چند دلائل پیش کرتا ہوں :

پنجابی کو اردو کا ماخذ قرار دینے کا دراصل کوئی جواز نہیں ہے، مگر عجیب طرح محمود خاں شیرانی سندھ کو نظرانداز کر کے لاہور پر آجاتے ہیں اور درمیان میں سندھ کو بھول جاتے ہیں۔ سندھ یاد تو رہتا ہے مگر اس سے اغماض برتتے ہیں، حالانکہ ان کی یہی دلیل سندھ پر لاگو ہوتی ہے اور زیادہ مطابقت رکھتی ہے، فرماتے ہیں کہ "عربوں نے جب ایران فتح کیا تو سیاسی اور سرکاری اغراض کے لئے ایران کی مختلف زبانوں میں سے ایک کو چن لیا" یہ زبان مشرقی ایران میں بولی جاتی تھی، اگرچہ ہم غلطی سے اس کو خطِ فارسی کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں" اس طرح جب مسلمان سندھ و پنجاب پر قابض ہوئے تو یہاں بھی یہی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی، اگر سندھ میں نہیں تو پنجاب میں یقیناً انھیں کوئی نہ کوئی زبان اختیار کرنی پڑی ہوگی"

یعنی مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ رہنے کے لئے، باہم گفتگو کے لئے، مسائل کے لئے، سودا سلف کے لئے کسی زبان کی ضرورت تھی، شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ سندھ میں ۳۰۰ برس تک یہ ضرورت پیش ہی نہیں آئی، مگر جب وہ پنجاب پہنچے تو انہوں نے اپنی زبان پنجابی سے اخذ کر لی۔ یہ منطق بھی خوب رہی۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ پنجاب پر مسلمانوں کی حکومت ۱۷۰ برس تک رہی، مگر سندھ پر ۳۰۰ برس رہی۔ بلکہ جیسا کہ حضرت سید صاحب نے لکھا ہے بعد میں دو سلطنتیں آخر تک یعنی افغانیوں کے دور تک ان کے قبضے میں رہیں ان پر اسماعیلی شیعہ قابض تھے، اس طرح ۵۰۰ برس تک عربوں کا اثر قائم رہا۔

پنجاب میں اردو کے پیدا ہونے کی دلیل اگر یہی ہے تو اس سے زیادہ کمزور کوئی نظریہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان ۳۰۰ برس بولے ہی نہیں، چپ رہے، ان کو گفتگو اور عام زبان کی ضرورت پنجاب پہونچ کر محسوس ہوئی، یعنی ایک زبان ۱۷۰ برس میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن ۳۰۰ برس میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ بات عقل اور منطق کے بالکل خلاف ہے، وہ سارے دلائل جو وہ پنجابی کے حق میں دیتے ہیں وہ سب سندھی سے اور سید صاحب کے نظریہ سے مطابقت رکھتے ہیں۔ رہ گئی اردو اور پنجابی الفاظ، تراکیب اور صوتیات میں مطابقت و مماثلت تو وہ ان تمام زبانوں میں موجود ہے جو شورسینی سے نکلی ہیں۔ اب ایک اعتراض یہ رہ جاتا ہے کہ سندھی مغربی بولی میں نہیں آتی تو ولا مغربی کی اصل مشکوک ہے، ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس کے وجود سے

انکار کیا ہے، پھر ڈاکٹر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ سندھی مغربی بولی کی شاخ ہے، ان کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے: "یہ زبان (دکنی) بھی جدید ہند آریائی کی ایک شاخ ہے، اور اس کا آغاز بھی جدید ہند آریائی زبانوں پنجابی، سندھی، مغربی ہندی، راجستھانی، گجراتی، مرہٹی، اڑیا، بنگالی اور آسامی کے ساتھ ساتھ ہوا، لیکن ادبی نشو و نما کے لحاظ سے یہ اودھی کی معاصر ہے۔"

یہ واضح رہے کہ پروفیسر عبدالقادر سروری کی نظر لسانیات پر تھی، انھوں نے سندھی کو مغربی بولی میں شمار کیا، مگر سندھی کا تعلق لہندا سے ہے، اور لہندا مغربی پنجاب میں رائج تھی؛ بہر حال یہ یقینی بات ہے کہ سندھی کو کوئی ماہر لسانیات غیر آریائی زبان نہیں ثابت کر سکتا، جب سندھی ایک آریائی زبان ہے تو اس سے اور پنجابی سے جو خود ایک آریائی زبان ہے خاندانی تعلق ضروری ہے، مزید یہ کہ عربی ایک سامی زبان ہے، سامی اور آریائی زبانوں کا ملاپ خود ایران میں ہوا، پہلوی غائب ہو گئی، اور موجودہ فارسی کا نیا روپ جو اسلام اور عربی کی ترجمانی کرتا ہے سامنے آیا، یہی کچھ عربی اور سندھی کے ملاپ سے ہوا، دونوں حالات یکساں ہیں، دونوں کیفیتیں مشابہ ہیں، ہم بلا وجہ یہ کیوں فرض کر لیں کہ تین سو برس تک مسلمانوں اور ہندوستانیوں کو ایک عام زبان کی ضرورت پیش نہیں آئی، ضرور ہیں سامی اور آریائی کا فرق نہیں بھا پتیں، پھر ٣٠٠ برس انتظار کر کے پنجاب آئیں، اور آلِ غزنہ کی ایک سو ستر سال کی حکومت" میں پنجاب میں اردو کا غیر فطری جنم دکھائیں؟ نہ زبان انتظار کرتی ہے، نہ ضرورت رکھتی ہے، یہ قوموں کا اور تاریخ کا بہاؤ ہے، اس پر پردہ ڈالنا ٹھیک نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت سید صاحب کے نظریہ پر تفصیلی بحث کی جائے، لسانیاتی اور سماجی دلائل پیش کئے جائیں، صوفیوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ نظریہ سارے نظریات میں چمکے گا، اور کھرا کھوٹا ظاہر ہو جائے گا۔ عقل، منطق اور تاریخ حضرت سید صاحب کے ساتھ ہے۔ پہلے انہوں نے بتلایا کہ اردو کا ہیولیٰ سندھ میں تیار ہوا، پھر پھیلا اور مقامی اثرات اس پر پڑے۔ گجری، دکنی، بہاری اور پنجابی انداز و اثرات بھی ظاہر ہوئے، مگر زبان کا ہیولیٰ سندھ میں ٣٠٠ برس میں مکمل ہو چکا تھا، مقامی اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

لہندا اور سندھی کا شمار مغربی بولی میں نہیں ہوتا، وہ اس دائرہ سے باہر ہے جس میں پنجابی، راجستھانی، برج، قنوجی اور ہریانی وغیرہ شامل ہیں۔ اردو کے ابتدائی ناقدین و مورخین برج کو اردو کا ماخذ تصور کرتے تھے، مگر وہ کھڑی بولی نہیں ہے، اس کا شمار پڑی بولی میں ہے، لہذا وہ اردو کی ماں نہیں ہو سکتی، پنجابی پر محمود شیرانی زور دیتے ہیں مگر وہ عقل اور منطق کے خلاف ہے۔ اب سید ہاشمی فرید آبادی کا تبصرہ سنیے: "اگر نئی زبان مسلمانوں کے ہندوستان آنے اور بس جانے سے

پیدا ہوئی تو اس کی ولادت گاہ یہی دیبل (کراچی)، منصورہ (برہمن آباد) پھر ملتان کی بستیاں تھیں، اور جیسا کہ ہمارے ایک فاضل دوست نے حال ہی میں دعویٰ کیا ہے اردو کا مولد سندھ قرار پائے گا۔ یہی برصغیر ہند میں پہلا اسلامی مقبوضہ تھا یہیں عراق و عرب کے آبادکاروں نے سب سے پہلے سکونت اختیار کی تھی۔ "[۱۲]

"تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت" میں مرقوم ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں جغرافیہ نویس اصطخری سندھ آیا تو منصورہ اور اس کے مضافات میں سندھی اور عربی کا رواج پایا۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ خود سندھی کو لسانی تحقیق کرنے والوں نے مغربی ہندی کے بیرونی دائرہ کے اندر جگہ دی ہے، مسلمان فاتحین کا سب سے پہلے اسی مغربی ہندی سے سابقہ پڑا اور ان کی قدیم ترین ادبیات میں ہندی یا ہندوی سے یہی مغربی ہندی اور اس کی دور دور تک پھیلی ہوئی شاخیں مراد لی جاسکتی ہیں۔[۱۳]

لہندا اور سندھی دونوں مغربی ہندی کے دائرے سے باہر تصور کی جاتی ہیں۔ ان کو باہر کیوں کیا گیا جبکہ لہندا اور پنجابی میں فرق برائے نام ہے، سندھی اور لہندا دونوں آریائی زبانیں ہیں، لہندا کا رسم خط لنڈا تھا، سکھوں نے گورمکھی خط دراصل لہندا سے لیا ہے، لنڈا رسم الخط میں اصلاح و ترمیم کرکے اس کا نام گورمکھی رکھا گیا ہے۔ سید ہاشمی صاحب نے اگرچہ سندھی کے اردو کا ماخذ بننے پر اصل لسانی اعتراض نقل کردیا ہے، مگر عملاً تسلیم بھی کرلیا ہے کہ دراصل اردو سندھ سے شروع ہوئی۔ اگر یہ گتھی سلجھ جائے تو پھر لسانی طور پر سندھی اور عربی کے ملاپ سے اردو زبان بننے میں کوئی اعتراض نہ ہوسکے گا۔

گریرسن نے جو آریائی زبانوں کا نقشہ بنایا ہے اس میں سندھی اور لہندا کو مغربی ہندی سے باہر جگہ دی ہے۔ سینتی کمار چٹرجی نے سندھی، لہندا اور پنجابی تینوں کو ایک گروپ مانا ہے اور تینوں کو ایک گروپ میں جگہ دی ہے، اس صورت حال میں جو اعتراض سندھی پر ہے وہی پنجابی پر بھی وارد ہوتا ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ پنجابی اور لہندا میں فرق کرنا بڑا مشکل ہے، دونوں بالکل یکساں ہیں۔ چٹرجی نے مغربی بولی یا مغربی ہندی میں صرف گجراتی کو شمار کیا ہے۔ گریرسن کا اصل نظریہ یہ ہے کہ سندھی اور لہندا میں کچھ تبدیلیاں گرامر میں بھی اور الفاظ کی تشکیل میں بھی ایسی واقع ہوئی ہیں جو مغربی ہند کے گروپ سے الگ ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ جب تک مسعود سعد سلمان کا ہندوی دیوان دریافت نہ ہوجائے شیرانی کا نظریہ قابل قبول ہے۔[۱۴]

پنجابی میں دوہرے مصمتے استعمال ہوتے ہیں، ہتّھ بولتے ہیں، اردو میں یہ مصمتہ ساقط ہوجاتا ہے، ہاتھ بن جاتا ہے، مگر ہریانی میں ایک مصمتہ ساقط نہیں ہوتا بلکہ دراز ہوجاتا ہے، دوہرا مصمتہ اس حد تک ہے کہ قاضی کو قضّی اور راضی کو رضّی بولا جاتا ہے جو پنجابی کا اثر ہے[۱۵] سینتی کمار چیٹرجی بالکل بعد میں آئے، اور انہوں نے ان تمام اختلافات کا مطالعہ کیا۔ اور ہندوستانی زبانوں کو ان کے مخارج اور مصوّتوں کے لحاظ سے تقسیم کیا، یعنی زبانوں کی تقسیم میں محض جغرافیہ ہی کو پیش نظر نہیں رکھا گیا بلکہ اپنی تقسیم میں گرامر، لفظ کی تشکیل کے مبادی اور آوازوں کا بھی لحاظ کیا ہے، اور اس نقطۂ نظر سے انہوں نے سندھی، لہندا اور پنجابی کو ایک گروپ قرار دیا ہے، مگر گریرسن نے زبانوں کی تقسیم میں جغرافیائی علاقوں کو مدِّ نظر رکھا، لیکن دوسرے مفکرین نے اس کی غلطی کا بہت جلد اندازہ کرلیا۔

سوال یہ ہے کہ ان تمام زبانوں میں بنیادی فرق نہیں ہے، یہ سب[۱۶] سنسکرت سے نکلی ہیں۔ پراکرت، اپ بھرنش شورسینی اور پھر ان سے پھوٹی موجودہ جدید زبانیں ہیں۔ سندھی، ہندا کا تعلق بھی پراکرت سے ہے، تبدیلیوں کے مخصوص انداز اور گرامر کے بعض فروق کو اتنی اہمیت دینا کہ اردو سندھی سے نہیں نکل سکتی، اس لئے کہ اس کو گریرسن نے باہری بولی میں رکھا ہے، وہ مغربی ہندی کے گروپ میں نہیں، جبکہ چیٹرجی نے یہ گروپ ہی غائب کر دیا ہے، وہ صرف اتری زبانوں کا گروہ مانتے ہیں، اور اس میں سندھی، لہندا اور پنجابی کو شمار کرتے ہیں، اس لیے درحقیقت اس طرح کے اعتراضات بے معنی ہیں۔ اولاً ہندی جو اردو سے نکلی ہے بلکہ عمداً بنائی گئی ہے وہ اپنا سرچشمہ پنجابی کو قرار دیتی ہے نہ ہریانی کو، لطف کی بات یہ ہے کہ اس نے برج کے سارے سرمائے کو اپنا لیا ہے، جبکہ برج پڑی بولی ہے کھڑی نہیں ہے، ہندی اور اردو دونوں کھڑی بولیاں ہیں، ہندی نے مشرق میں اودھی کو اپنا لیا اور مغرب میں برج کو۔ ڈاکٹر زور نے لکھا ہے کہ برج اور ہریانی اس وقت موجود نہیں تھیں جس زمانہ میں دکن میں اردو ادب پروان چڑھ رہا تھا۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ مسلمانوں کے آنے سے نئی زبان بنی، لیکن نیا ادب یقیناً مسلمانوں کا مرہون منت ہے۔ اردو مسلمانوں کی ساختہ نہ سہی مگر پرداختہ ضرور ہے، بولی پہلے سے تھی مسلمانوں نے اس کی پرورش و نگہداشت کی، پروان چڑھایا اور مقبول عام بنایا۔ اب میں ذیل میں آریائی زبانوں کا ایک نقشہ پیش کرتا ہوں، شمالی ہند کی زبانوں کا ایک نقشہ جو گریرسن (G.A. GRIERSON) نے پیش کیا ہے ملاحظہ فرمائیے:

مغربی بولی کے باہر کی زبانیں:

شمالی مغربی زبان کا گروپ: لہندا۔ سندھی۔

جنوبی زبانوں کا گروپ : مراٹھی
پوربی بولی کا گروپ : اڑیا ۔ بنگالی ۔ آسامی ۔ بہاری

درمیانی زبانیں :
مغربی بولی کا گروپ : پنجابی ۔ گجراتی ۔ بھیلی ۔ خاندیشی ۔ راجستھانی
پہاڑی بولیاں : نیپالی (یا پوربی پہاڑی بولی) بیچ کی پہاڑی بولی ۔ مغربی پہاڑی بولی[۱۶]۔

آریائی زبانوں کا یہ پہلا سروے ہے، اس میں گریرسن نے لہندا اور سندھی کو شورسینی اپ بھرنش سے باہر جگہ دی ہے، مغربی بولی میں ان دونوں کو شامل نہیں کیا، ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی کا نقشہ یہ ہے :

شمالی ہند کی زبانیں : سندھی ۔ لہندا ۔ پنجابی
مغربی زبانوں کا گروپ : راجستھانی ۔ مغربی ہندی ۔ مشرقی ہندی ۔ پہاڑی
پہاڑی بولیاں : نیپالی (یا پوربی پہاڑی بولی) ۔ بیچ کی پہاڑی بولی ۔ مغربی پہاڑی بولی ۔
جنوبی زبانیں : مراٹھی[۱۷]

روڈلف ہارنل (RUDOLF HOERNLE) کا نقشہ یہ ہے :

مغربی بولیاں : پنجابی ۔ سندھی ۔ گڑھوالی ۔ مراٹھی وغیرہ
مشرقی بولیاں : بنگالی ۔ آسامی ۔ اڑیا وغیرہ

اگرچہ یہ نقشہ مکمل نہیں لیا گیا ہے، مگر ہارنل نے سندھی کو مغربی بولی میں شمار کیا ہے، لیکن ایک دوسرے موقع پر انہوں نے سندھی کو مغربی بولی کے گروپ سے باہر رکھا ہے[۱۸]۔

ان سب بولیوں میں مشابہت بہت ہے ۔ سندھی دریائے سندھ کے دونوں طرف بسنے والے بولتے ہیں، اس میں فارسی کے الفاظ کثرت سے ہیں اس لئے کہ اس کے بولنے والے مسلمان ہیں (مگر چونکہ مصنف خود عربی سے ناواقف ہیں اس لئے عربی کو بھی فارسی تصور کرتے ہیں) سندھی بھاشا فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے (یہاں پھر مصنف کو غلط فہمی ہوئی، سندھی خطِ نسخ عربی خط میں لکھی جاتی ہے)۔

سندھی زبان کی پانچ بولیاں خاص ہیں، جن میں سے درمیانی بولی کو ترقی حاصل ہوئی، اور یہی ادبی زبان کا مرتبہ حاصل کر سکی ۔ قدیم دور میں سندھ براچڈ دیش کہلاتا تھا، یہاں کی پراکرت، اور اپ بھرنش اسی دیش کے نام پر براچڈ کے نام سے معروف ہیں ۔ سندھ کے جنوب میں کچھ ہے جہاں کچھی زبان کا رواج ہے، یہ سندھی اور گجراتی سے مل کر بنی ہے ۔ سندھی زبان میں ادب زیادہ نہیں ہے[۱۹]!

اس بیان سے اصل فرق ظاہر ہو گیا کہ سنسکرت سے پراکرت بنی، اور پراکرت سے اپ بھرنش، اور براچڈ اپ بھرنش سے لہندا اور سندھی پیدا ہوئیں۔ مگر مغربی بولیوں کا تعلق شورسینی سے ہے، جس طرح ہریانی اور پنجابی، بالآخر سنسکرت پر ختم ہوتی ہیں بالکل اسی طرح سندھی بھی سنسکرت سے نکلی اور اس پر بھی وہی احکام لاگو ہوتے ہیں جو دوسری آریائی زبانوں سے متعلق ہیں۔ ہم سندھی کے مسئلے کو لسانیاتی بنیادوں کا بہانہ بنا کر ان حقائق سے انکار نہیں کر سکتے۔ جو حضرت سید صاحب نے پیش کئے ہیں، سید صاحب کے نظریے نے کیفی کو مذبذب کر دیا، سنیتی کمار چیٹرجی بھی کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ہندوستانی لسانیات کے ماہرین کو اس سوال کا جواب دینا پڑے گا کہ عربی کے ۳۰۰ برس کے سندھی زبان سے ملاپ نے کیا اثرات یہاں کی زبان پر مرتب کئے؟ لاہور اور دہلی کو ہم کیوں زبان کا مرجع و ماخذ بنائیں اور ۳۰۰ برس کی طویل مدت کو کیوں نظر انداز کر دیں؟

ڈاکٹر جالبی صاحب نے بھی حضرت سید صاحب کے نظریہ کی پوری تائید کی ہے، اور نتائج اس نظریہ کو بنیاد بنا کر اخذ کئے ہیں، اور سندھ میں اردو پر کتاب کے آخر میں ایک باب لکھا ہے، جس میں خود حضرت سید صاحب کا اقتباس بھی پیش کیا ہے، اور ان کے نظریے کی بھرپور ترجمانی کی ہے، ان کی بحث کے چند اہم حقائق یہ ہیں:

۱۔ پہلے سندھی اور لہندا ایک ہی تھیں، بعد میں تاریخی اور اجتماعی اثرات سے دو الگ الگ زبانیں بن گئیں۔

۲۔ پنجابی زبان شورسینی اپ بھرنش سے نہیں نکلی پساچی اپ بھرنش سے اس کا جنم ہوا ہے، وہ کہتے ہیں: "برج بھاشا اور اودھی کا جنم شورسینی اپ بھرنش سے ہوا" مگر کیکئی اور ٹکی پساچی اپ بھرنش کی شاخیں ہیں، کیکئی سے سندھی اور ملتانی نکلیں اور ٹکی سے لہندا اور پنجابی۔ البتہ شورسینی کے اثرات سندھی اور پنجابی پر بہت گہرے ہیں۔ محمد بن قاسم کی فتح کے وقت سندھ میں ایک ایسی کھچڑی زبان تھی جو پساچی اور شورسینی اثرات کی حامل تھی۔

سندھ کو جس فوج نے فتح کیا اس میں عربوں کے ساتھ ایرانی بھی شامل تھے۔ یعنی خالص عرب فوج نہ تھی، لہٰذا فارسی بولنے والے بھی کثیر تعداد میں سندھ پہنچے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا بھی یہی خیال ہے کہ "مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا، جس کی حد اس زمانے میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھہ کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ موجودہ اردو انھیں

بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے یعنی جس کو آج ہم اُردو کہتے ہیں اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا۔ اور آگے چل کر دارالسلطنت دہلی کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری زبان بن گئی۔"[۲۰]

سید حسام الدین راشدی لکھتے ہیں: "یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے اور یہیں ان کی زبان عربی اور فارسی کا ہندی زبانوں سے ارتباط و اختلاط شروع ہوا، لہٰذا یہ ایک واضح اور یقینی امر ہے کہ اُردو کا اصل مولد سندھ ہے۔"[۲۱]

ان اقتباسات کو نقل کرنے کے بعد جمیل جالبی لکھتے ہیں: "غرض کہ یہ زبان اپنی ابتدائی شکل میں سندھ و ملتان کے علاقے میں عربوں کے زیر اثر بننی شروع ہوئی، محمود غزنوی کے بعد جب آلِ غزنہ نے سندھ و پنجاب اور میرٹھ تک کے علاقے پر اپنی حکومت قائم کرلی اور لاہور کو اپنا دارالحکومت بنایا تو یہ نئی زبان ۱۰۲۶ء سے ۱۱۹۳ء تک اپنے خدوخال اس علاقے میں سنوارتی رہی، جب شہر دہلی غوریوں کے زیر نگیں آگیا اور قطب الدین ایبک برعظیم کا پہلا بادشاہ بنا تو اختلاط و ارتباط کا عمل اور تیز ہوگیا، ۱۲۱۱ء میں التمش اپنا دارالحکومت لاہور سے دہلی لے آیا اور اس کے ساتھ پنجاب، ملتان اور سندھ کی اس کھچڑی زبان کا اقتدار دہلی پر قائم ہوگیا۔"[۲۲]

مذکورہ بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ پنجابی اور سندھی ایک ہی اپ بھرنش سے نکلی ہیں لہٰذا وہ لسانی اعتراض کہ سندھی چونکہ گریرسن کی تقسیم میں مغربی بولی سے باہر کی زبان ہے۔ لہٰذا وہ اُردو کی ماں نہیں بن سکتی بالکل غلط ثابت ہوگیا، گریرسن نے پنجابی کو شورسینی کی شاخ بتایا ہے۔ چٹرجی اور ہارنل نے بھی سندھی کو پنجابی گروپ میں رکھا ہے، لہٰذا یہ اعتراض تو ساقط ہوگیا، مگر یہ بات صحیح ہے کہ پنجابی کو شورسینی اپ بھرنش میں جگہ نہ دینی چاہیئے، وہ پیساچی اپ بھرنش سے نکلی ہے جیسا کہ جمیل جالبی صاحب نے لکھا ہے۔ اگر سندھی اردو کا مولد نہیں بن سکتی تو پنجابی پر بھی یہی قانون لاگو ہوگا۔ لہندا اور ملتانی پر بھی، اس طرح ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اُردو کا ہیولیٰ بقول حضرت سید صاحب کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملنے سے سندھ میں تیار ہوا، پھر یہ زبان لاہور پہونچی، وہاں سے دہلی اور پھر سارے ہندوستان میں پھیلی، اس طرح تاریخی اور سماجی دلائل کے علاوہ خود لسانی دلائل سے حضرت سید صاحب کے نظریہ کی صداقت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ویسے جمیل جالبی صاحب کے بیانات میں تضاد کچھ کم نہیں ہے وہ یہ بھی یقین کرتے ہیں کہ اردو کا ہیولیٰ سندھ میں تیار ہوا[۲۳]، اردو پنجاب میں بنی[۲۴]، اردو کا اصل دیس صوبۂ سرحد ہے[۲۵]، اُردو بلوچستان سے نکلی[۲۶]، پراکرت اور سنسکرت سے نہیں نکلی[۲۷]، اپ بھرنش ابھیروں کی

زبان ہے[28]۔ الغرض ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی کتاب تنقید کی محتاج ہے۔

اب آخر میں خود حضرت سید صاحب کی ایک ایسی عبارت پیش کرتا ہوں جو ان کی لسانیاتی و تنقیدی بصیرت پر دلائل کرتی ہے وہ نقوش سلیمانی میں فرماتے ہیں: "ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی، لیکن تہذیب و سلیقہ لکھنؤ میں سیکھا۔"[29]

یہ واضح حقیقت ہے کہ حضرت سید صاحب کے نظریہ نے اردو کے لسانی نظریوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا، اس نے سارے مفکرین کو متاثر کیا، اور جو کتابیں جدید انداز سے لکھی جا رہی ہیں ان میں اس نظریہ کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے علاوہ جو بھی دوسرے علمی مباحث پیش کرنے والی کتابیں اور رسالے ہیں وہ اس نظریے میں حقائق کا نور اور تاریخ کی جلوہ گری پاتے ہیں۔ امید ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ یہ نور پھیلے گا اور یہ جلوہ عام ہوگا۔

○

حوالے و حواشی:

۱۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص۱۰

۲ تا ۴۔ نقوش لاہور ادبی معرکے نمبر، اول ص ۱۴۴، ۱۰۱، ۱۴۰، ۱۲۲،

۵ تا ۷۔ نقوش سلیمانی ص ۲۱، ۲۰، ۶، ۲۵۱

۸۔ نقوش، ادبی معرکے نمبر اول ص ۱۴۲

۹۔ عرب و ہند کے تعلقات، طبع دوم ص ۵۲، ۱۰، ۲۵۵

۱۰۔ اردوئے معلیٰ، لسانیات نمبر ص ۳۷

۱۱۔ نقوش ادبی معرکے نمبر، اول ص ۱۴۴

۱۲۔ ان حملہ آوروں میں ایرانی بھی کثرت سے تھے، اور عرب اور ایرانی، عربی اور فارسی بولتے تھے۔

۱۳ تا ۱۵۔ نقوش ادبی معرکے نمبر، اول ص ۲۸۱، ۸۲، ۱۲۹-۱۳۰

۱۶ و ۱۷۔ دھیرندر ورما ہندی بھاشا کا اتہاس طبع دوم ص ۴۱ - ۴۲

۱۸- A COMPARATIVE GRAMMAR OF GAUDIAN LANGUAGES

۱۹۔ ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۵۴

۲۰ تا ۲۸۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، ص ۱۷، ۶۷-۶۴۳، ۵، ۶۰، ۷، ۱۱، ۶۹۹، ۶۰۱، ۶۴۲، ۴۷-۴۳

۲۹۔ نقوش سلیمانی ص۳۰۔ یہاں اردو ناقدوں کی اس رائے کی طرف اشارہ ہے کہ خیال دہلوی شعرا کا معتبر ہے مگر زبان لکھنؤ کی۔

○

سید حامد حسین *

تحقیقاتِ الفاظ

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی تحقیق کے لئے جن میدانوں کا انتخاب کیا، ان میں سے ایک اہم میدان الفاظ کی اصل، ان کے معنی اور ان کے مشتقات سے تعلق رکھتا ہے۔ جون ۱۹۳۶ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی ادبی کانفرنس میں انہوں نے ایک مضمون پڑھا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا: "لغت کا کام عام طور سے لفظوں کے معنی بتانا سمجھا تا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی طرح ان سے متعلق ہر چیز ایک مستقل تاریخ رکھتی ہے۔ زبان قوم کی تاریخ کا نہایت اہم جز ہے۔ اس لئے زبان اور اس کے لفظوں کی تاریخ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور یہ تاریخ ہمارے لغت کا بڑا اہم باب ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کی طرف ابھی تک ہمارے زبان کے لغت نویسوں نے توجہ نہیں کی ہے"!

یہ مضمون رسالہ "ہندوستانی" کے جولائی ۱۹۳۶ء کے شمارے میں "بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں سید صاحب نے تقریباً ۴۹ الفاظ کی اصل ابتداء اور تاریخ سے بحث کی۔ مئی ۱۹۳۹ء میں اس مضمون کا دوسرا حصہ "معارف" میں چھپا، اس کے اگلے ہی ماہ "معارف" میں "تہنید" کے عنوان سے ایک اور مضمون شائع ہوا جس میں سید صاحب نے اس صورتحال کو واضح کیا کہ کس طرح اردو میں اپنائے جانے کے بعد کئی عربی، فارسی اور سنسکرت الفاظ نے نئے معنی اور نئی شکل اختیار کرلی ہے۔

ان تین مضامین میں الفاظ کے مآخذ اور مخارج کے بارے میں سید صاحب کی تحقیقات نے ایک مرتب شکل اختیار کرلی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کی تحقیق سید صاحب کے محققانہ عمل کا ایک اہم اور بعض جگہ بنیادی پہلو ہے۔ سید صاحب کی پہلی سیر حاصل تصنیف بھی لسانی موضوع سے خاص تعلق رکھتی ہے۔ "لغات جدیدہ" میں جو کہ پہلی بار ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی تھی نہ صرف جدید عربی میں مستعمل تقریباً پانچ ہزار الفاظ کی تشریح پیش کی گئی ہے بلکہ اس میں "عربی زبان کے مولّد و دخیل الفاظ پر محققانہ بحث" بھی شامل ہے۔ کتاب کے ضمیمے میں بہ ترتیب زبان یہ بتایا گیا ہے کہ چینی، حبشی، عبرانی، سریانی، لاطینی، اتالین، ترکی،

---

* صدر شعبۂ انگلش، گورنمنٹ موتی لال سائنس کالج بھوپال

یونانی، سنسکرت وغیرہ زبانوں سے کون کون سے الفاظ عربی میں آئے ہیں، اور ان کی اصل کیا ہے، سید صاحب کی دیگر تصانیف کا تعلق براہ راست مطالعہ الفاظ سے نہیں ہے، لیکن ان میں بھی جا بجا الفاظ سے متعلق مباحث نہ صرف شامل ہیں بلکہ اکثر کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔ "عربوں کی جہاز رانی" میں انہوں نے اپنی تحقیق کا آغاز ہی عربی میں سمندر، جہاز اور جہاز رانی سے متعلق قدیم الفاظ کی چھان بین سے کیا ہے۔ اسی طرح "عرب و ہند کے تعلقات" میں بھی انہوں نے ہندی اصل کے عربی الفاظ پر بحث کے ذریعے مفید نتائج تک رسائی حاصل کی ہے۔ یہاں تک کہ "سیرۃ النبی" کے صفحات پر بھی مختلف الفاظ کے معانی، ان کی اصل اشتقاقات و مرادفات پر مباحث دیکھنے کو ملتے ہیں، جیسے لفظ "والہانہ" کے بارے میں تحریر کرتے ہیں :

"ولہ" کے اصل معنی عربی میں اس غم اور محبت اور تعلق خاطر کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد میں مطلق عشق و محبت کے معنی پیدا ہو گئے، اور اسی سے ہماری زبان میں والہ (شیدا) مستعمل ہے"۔[۲]

لفظ "تہذب" کے بارے میں لکھتے ہیں: "مصدر تہذیب ہے، "تہذیب" کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی شاخیں اس لئے چھانٹ دی جائیں تاکہ ان میں سرسبزی و شادابی پیدا ہو، اور ترقی کی نئی زندگی انکو مل جائے"[۳]

"فحش گوئی" کے عنوان کے تحت لفظ پاخانہ کے بارے میں واضح کرتے ہیں: "پائخانہ بھی ایک استعارہ ہے جس کی اصل 'پائیں خانہ' ہے۔ چونکہ پائخانے عمومی مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں اس لئے استعارۃً ان کو پائیں خانہ کہا گیا۔ پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہو گیا اور کثرت استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی۔"[۴]

لفظ "شکر" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "لغت میں "شکر" کے اصلی معنی یہ ہیں کہ جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تر و تازگی پوری ہو اور دودھ زیادہ دے، اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کر دے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے۔"[۵]

اسی طرح دوسری تصانیف میں الفاظ کے اصل معانی اور ان کی تشکیل و تاریخ کے بارے میں توضیحات دیکھی جا سکتی ہیں، مثلاً "سیرت عائشہؓ" میں لفظ "خرافات" کے بارے میں یہ اشارہ ملتا ہے: "کبھی کبھی دل بہلانے کو آپ کہانی بھی کہا کرتے تھے، ایک دفعہ اثنائے گفتگو میں خرافہ کا نام آیا، پوچھا کہ خرافہ کو جانتی ہو کون تھا، قبیلہ عذرہ کا ایک آدمی تھا، اس کو جن اٹھا کر لے گئے، وہاں اس نے جو بڑے بڑے عجائبات دیکھے تھے، واپس آکر ان کو لوگوں سے بیان کیا تھا، اس بنا پر جب کوئی عجیب بات اب لوگ سنتے ہیں تو کہتے ہیں یہ تو خرافہ کی بات ہے۔ ہماری زبان میں اسی کی جمع خرافات مستعمل ہے"۔[۶]

"خیام" پر اپنی تحقیقی تصنیف میں سید صاحب لفظ "قوال" کے بارے میں بتاتے ہیں: "رباعی کا ایک نام قول تھا، اور غالباً اور اسی سے مشتق کر کے صوفیوں میں "قوال" کے معنی "گویے" کے ہیں، کیونکہ غالباً اس کے ابتدائی معنی "قول" (رباعی) گانے والے کے ہوں گے۔ بعد کو ہر صوفیانہ مطرب کو قوال کہنے لگے۔"

"حیاتِ شبلی" میں ایک جگہ حاشیہ میں لفظ "جامعہ" کے بارے میں یہ دلچسپ معلومات فراہم کرتے ہیں، "جامعہ کا لفظ جامعہ ملیہ دہلی کے بعد سے تو عام ہے، مگر یہ لفظ ہماری زبان میں پہلے مولانا ہی کے قلم سے نکلا، اور بعد کو اشاعت پذیر ہوا۔ جامعہ ملیہ کے نام کی تاریخ بھی ایک اتفاقی واقعہ ہے، مسلم یونیورسٹی سے ٹوٹ کر اس کے بالمقابل جو نئی قومی مسلم یونیورسٹی قائم کی گئی اس کا لیٹر پیپر یعنی خط کا کاغذ مولانا ابوالکلام نے چھپوایا تھا، انہی نے نیشنل مسلم یونیورسٹی کے انگریزی لفظوں کے ساتھ اس کا عربی ترجمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی کر دیا، پھر بعد کو یہ لفظ چل نکلا۔ جامعہ مصر کی نئی عربی زبان میں یونیورسٹی کو کہتے ہیں جو یونیورسٹی کا گو لفظی ترجمہ ہے، لیکن چونکہ جامع عربی میں مسجد اعظم کو کہتے ہیں، اور شروع میں مسجد میں ہی درسگاہیں تھیں، اس لئے جامع کے ساتھ جامعہ کا لفظ خاص مناسبت رکھتا ہے۔[۸]"

"جاہل جٹ" کی ترکیب اکثر سننے میں آتی ہے۔ سید صاحب نے لفظ "جٹ" کا تاریخی پس منظر اپنے ایک مقالے میں پیش کیا ہے: "یہ سندھ کا قبیلہ تھا جو غیر متمدن اور جنگجو اور نوشت و خواند سے عاری تھا، اسی سے ہندوستان میں جٹ کی اصطلاح پیدا ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ جٹ اور جاٹ ایک لفظ ہوں۔ پنجابی میں بیچ کا الف اکثر گر جاتا ہے، جیسے کھاٹ سے کھٹ وغیرہ۔ جٹ کے نام سے پنجاب سے زیادہ سندھ کے لوگ واقف ہیں کہ انہوں نے سندھ کی جنگی تاریخ میں کافی حصہ لیا ہے، اور ان کا اصل پیشہ شتربانی ہے جس سے وہ کبھی کبھی جہاں بانی تک پہنچے[۹]"

اس طرح سید صاحب کے مقالات، مکاتیب، شذرات رسالہ "معارف" اور جملہ تصانیف میں جا بجا تحقیقات الفاظ کی مثالیں ملتی ہیں، ان سب تحریروں میں سید صاحب نے جن اردو الفاظ کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں ان کی تعداد ایک سرسری اندازے کے مطابق چھ سو سے تجاوز کرتی ہے۔ عربی الفاظ ان سے سوا ہیں، جن کا ایک بڑا ذخیرہ جو کہ تقریباً پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے "لغاتِ جدیدہ" میں ملتا ہے، اس کے علاوہ "سیرۃ النبی"، "عربوں کی جہازرانی"، "عرب و ہند کے تعلقات" اور بعض دوسرے تاریخی اور تحقیقی مقالات میں بھی عربی الفاظ پر بحث شامل ہے۔ اس طرح سید صاحب نے مجموعی طور پر تقریباً سات ہزار الفاظ کے معنی و مخارج کے بارے میں مفید مباحث پیش کئے ہیں۔

الفاظ کے بارے میں سید صاحب کی تحقیقات کے تین خاص پہلو ہیں:

۱۔ الفاظ کی اصل، ان کے اصل معنی اور ان کے مشتقات و مرادفات،

۲۔ الفاظ کی عہد بہ عہد ترقی کی تاریخ، اور

۳۔ ناموں کے بارے میں تحقیق اور ان کی تاریخ

سید صاحب کی تحقیقاتِ الفاظ کا زیادہ تر حصہ پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہے جس کے تحت وہ لفظ کے اصلی معنی سے بحث کرتے ہیں، اور جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے وہاں اس مادے سے نکلنے والے دوسرے الفاظ کو بھی زیر بحث لاتے ہیں، مثلاً "عربوں کی جہاز رانی" میں وہ لفظ "قاموس" کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: "قاموس سمندر کے معنی میں ہے، اس سے عربی کے مشہور لغت نویس مجدالدین فیروز آبادی المتوفی ۸۱۷ھ نے اپنے لغت کی کتاب کا نام "القاموس المحیط" رکھا، اور وجہ یہ بتائی کہ "لانہ، البحر الاعظم"۔ اس لفظ کا ماخذ قمس ہے جس کے معنی غوطہ لگانے کے ہیں، قموس اس گہرے کنوئیں کو کہتے ہیں جس میں ڈول ڈوب جائے، قمیس سمندر کو کہتے ہیں، اس کی جمع قمامیس ہے، اسی لفظ کی دوسری صورت قومس ہے، ایک اور لفظ قلمس ہے جس کے معنی بھی اس کنوئیں اور دریا کے ہیں جس میں پانی بہت ہو۔"

لیکن سید صاحب کی تحقیقاتِ الفاظ کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے جس کے تحت انہوں نے الفاظ میں وقت کے ساتھ ساتھ آنے والی تبدیلیوں سے بحث کی ہے، مثلاً اپنے ایک مضمون میں وہ لفظ "ڈاک" کے سلسلے میں بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں ڈاک کے لئے مسلمانوں کے ساتھ پہلے "برید" کا لفظ آیا، پھر ترکی لفظ "اولاغ" چلا، مگر پھر جیسا کہ تغلقوں کی تاریخ اور ابن بطوطہ کے سفرنامے میں ملتا ہے، ہندوستانی لفظ "دھاوہ" نے رواج پایا، اور جہانگیر کے عہد یا اس سے کچھ پہلے "ڈاک" کا لفظ بولا جانے لگا۔"

تیسرے قسم کی تحقیقات کا تعلق مقامات، اشخاص، اور اشیاء کے ناموں سے ہے، اور اس سلسلے میں سید صاحب نے نہ صرف علم لغت سے فائدہ اٹھایا ہے، بلکہ انہوں نے تاریخ کے مآخذ کو بھی کھنگالا ہے، مثلاً لفظ "اشرفی" کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: "اشرفی نام بھی باہر سے آیا ہوا ہے ..... جس بادشاہ کی طرف سے وہ منسوب ہے وہ اشرف تھا ... مصر کے چرکسی بادشاہوں میں سے ایک برسبائی تھا، اس نے ۸۲۵ھ سے ۸۴۱ھ تک حکومت کی، اس کا شاہی لقب الملک الاشرف تھا، یہی اشرف، اشرفی کا مصدر و معدن ہے، مشہور عرب جہاز راں ابن ماجد اسد البحر نے .... الفوائد فی اصول البحر والقواعد کے نام سے جہاز رانی پر ایک کتاب لکھی ہے جو چند سال ہوئے کہ فرانس میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کا زمانہ نویں صدی ہجری کا اخیر اور دسویں صدی کا شروع ہے .... ابن ماجد ایک خاص سلسلے میں لکھتا ہے: "گیارہواں بادشاہ

بربائی اشرف ہے جو اشرفی سکہ کا چلانے والا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کا سکہ مصر سے چل کر بحر ہند میں داخل ہوا تھا اور وہاں سے پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔[12]"

سید صاحب نے اس طرح اردو میں علم لغت کو تاریخی بنیادوں پر استوار کرنے کی طرح ڈالی ہے، اور اس کے لئے انہوں نے صرف لغت کے مروجہ مآخذ کی جانب رجوع کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ کتب سیر و تواریخ، سفرناموں، یادداشتوں، ملفوظات و مکاتیب اور دیگر تحریروں سے بھی پوری پوری مدد لی ہے، اور اس کے نتیجے میں بعض نئے پہلو ابھر کر آئے ہیں اور لغت پر کام کرنے والوں کے لیے نئی گنجائشیں پیدا ہوئی ہیں مثلاً انگریزی زبان میں T. BURROW اور M. B. EMENEAU کی مرتب کردہ: A DRAVIDIAN ETYMOLOGICAL DICTIONARY[13] میں لفظ "الائچی" کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمل زبان میں الائچی کے درخت کو، اور ملیالم میں خود الائچی کو "ایلم" کہا جاتا ہے، جس کا مادہ "ایل" ہے۔ تمل میں دانۂ الائچی کے لئے "ایلواریچی" اور کنڑ میں الائچی کو "ایل رکی" کہتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں سید صاحب نے "عرب و ہند کے تعلقات" میں ابوالفدا اور ابن بطوطہ کے حوالے سے یہ تحریر کیا ہے کہ "کارومنڈل اور ملیبار کے بیچ میں ایک راس کا نام راس ہیلی ہے، الائچی کا یہی مخزن ہے، خیال یہ ہے کہ سنسکرت میں اس کو "ایل" اور فارسی میں اس کو جو ہیل کہتے ہیں، وہ نام اسی راس ہیل سے لیا گیا ہے۔ اسی "ایل" سے اردو میں ایلاچی (الائچی) کہتے ہیں۔[14]"

اسی طرح ایک انگریز محقق A. J. BLISS نے اپنی DICTIONARY OF FOREIGN WORDS AND PHRASES IN CURRENT ENGLISH[15] میں لفظ "پگوڈا" کے بارے میں یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ فارسی لفظ "بت کدہ" سے نکلا ہو۔ اس بیان کو اگر سید صاحب کی "عرب و ہند کے تعلقات" میں شامل اس توضیح کے ساتھ پڑھا جائے جو لفظ "بت" کے سلسلے میں پیش کی ہے تو صورت حال اور دلچسپ ہو جاتی ہے، سید صاحب تحریر کرتے ہیں: "اس کو عام طور پر ایک فارسی لفظ سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ لفظ "بدھ" سے "بد" اور "بد" سے "بت" بنا ہے، چونکہ بدھ کی مورتی کی پوجا ہوتی تھی، اس لئے "بدھ" کے معنی ہی فارسی میں "بت" ہوئے، اسی لئے عربی میں اس بت کو "بد" کہتے ہیں، اور اس کی جمع "بددہ" آتی ہے۔[16]"

سید صاحب کی تحقیقات الفاظ کے تفصیلی جائزے کے لئے ایک طویل مقالے کی ضرورت ہوگی، مختصراً ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس میدان میں بھی سید صاحب نے اپنی محققانہ صلاحیتوں کا پورا استعمال کرتے ہوئے نئی روشنی فراہم کی ہے، اور ماہرین لغت کو اس نوعیت کی تحقیق کے لئے اہم رہنمائی حاصل ہوئی ہے۔

سید صاحب نے خود کو صرف لغت پر کام کے لئے محدود نہیں رکھا اور الفاظ کے بارے میں ان کی یہ تحقیقات القرآن کے دیگر محققانہ مباحث کا حصہ بن کر آئیں، اس لئے اس قسم کے اندراجات کے شرح و بسط اور مشمولات و محمولات میں بڑا تنوع نظر آتا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ سید صاحب کی یہ تحقیقات بجائے خود مزید تحقیق کے لیے بنیادی اہمیت کی مالک ہیں، اور وہ ماہرین لغت کے لئے اہم اشارات کا کام کر سکتی ہیں۔

حوالے:۔
١۔ نقوش سلیمانی ص٢٨٩ ٢ تا ٥۔ سیرۃ النبی چہارم ٥٢٣، ٧٧١، ششم ٨٧٧، پنجم ٤٨٤،
٦۔ سیرۃ عائشہ ٥٣ ٧۔ خیّام ٢٥٥ ٨۔ حیات شبلی ٦٨٨ ٩۔ مقالات سلیمانی اول ٤٠٩
١٠۔ عربوں کی جہازرانی ٤ ١١ و ١٢۔ نقوش سلیمانی ٣٠٠-٣٠٣، ٢٩٢-٢٩٦ ١٣۔ آکسفورڈ
یونیورسٹی پریس ١٩٦١ء ١٤۔ عرب و ہند کے تعلقات ٦٧ ١٥۔ سن اشاعت ١٩٦٦ء ١٦۔ عرب و
ہند کے تعلقات ٢٣١

* * *

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی*

لُغوی تحقیق

بحوالہ ارضُ القرآن

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتاب تاریخ "ارض القرآن" کی حیثیت ایک ہشت پہلو ہیرے کی سی ہے، اس کتاب کے لکھنے کا مقصد تو یہ تھا کہ قدیم و جدید معلومات کی روشنی میں ارض قرآن یعنی عرب کے حالات کی تحقیق اس طرح کی جائے جس سے قرآن مجید کی صداقت مزید روشن اور آشکارا ہو جائے، مگر حضرت سید صاحب کی طرز فکر اور طریقۂ نگارش نے اس کتاب کو چند اور نوعیتوں کے لحاظ سے بہت دلکش اور مفید بنا دیا، مثلاً اعلام و اشخاص قرآنی کے متعلق انہوں نے آیات کی تفسیر اور تشریح اس طرح کی جو عام مفسرین کی ترجمانی سے قدرے مختلف ہے، اور ان کی ان تفسیری وضاحتوں کے بعد بقول مولانا مناظر احسن گیلانی "قرآن فہمی میں ایک فکری تغیر رونما ہو گیا" اس سلسلہ میں عاد، لقمان اور ہود سے متعلق ان کی تفسیری وضاحتیں، علماء اور عوام دونوں کے لیے جدید ہونے کے ساتھ ساتھ مطالعہ و تحقیق میں مزید معلومات کے لیے نہایت مفید ہیں۔

اس کتاب کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ گو اس کا موضوع علم آثار و حفریات کی وجہ سے خشک اور غیر دلچسپ ہے، مگر سید صاحب کے قلم کی شگفتگی، پڑھنے والے کے ذہن کو خوشگوار اور پر مسرت لمحات بخشتی ہے، انتہائی خشک اور دقیق بحث میں کوئی ایسا جملہ آجاتا ہے جو زبان و بیان کی لذت سے آشنا کر جاتا ہے، کہیں کہیں تو پورے کے پورے پیراگراف ادب عالیہ کے شاہکار نمونے نظر آتے ہیں، اسی وجہ سے بعض باذوق قارئین نے یہ کہا کہ "سید صاحب اسی طرح کتابیں لکھتے رہیں اور ساری عمر مشکوریت کا سلسلہ جاری رہے" اور "جب تک ختم نہ کر لی کتاب نہ چھوڑی"۔[1]

"ارض القرآن" کی اس خاص صفت ادبیت کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس لحاظ سے اس کی اہمیت اور بھی دو چند ہو جاتی ہے کہ یہ کسی ادبی موضوع سے متعلق کتاب نہیں ہے، سوانح اور سیرت میں کسی حد تک ادب کے وجود کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے، مگر جغرافیہ اور اثریات کی تحقیق اور غلط استدلال کے ابطال و تردید میں خالص ادبی چاشنی کی لذت سے آشنا کرنا، سید صاحب کے ادب نواز قلم کا اعجاز کہا جا سکتا ہے، مگر ہم اس وقت اس ادبی خوبی کا جائزہ نہیں لے رہے ہیں، ہمارے پیش نظر اس کتاب کی ایک اور اہم خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد افراد، قبائل اور مقامات کے نام آئے ہیں، ان میں بہت سے الفاظ اردو میں بھی معروف و مستعمل

---

* رفیق دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔

ہیں، سید صاحب نے قرآنی آیات اور تاریخی روایات اور جدید معلومات کی روشنی میں ان الفاظ سے بحث کی ہے اس سلسلہ میں انہوں نے ان الفاظ کی لغوی تحقیق بھی کی ہے، اس طرح لغت ولسانیات کا ذوق رکھنے والوں کے لئے انہوں نے لطف ولذت کا سامان فراہم کیا ہے۔

لغت ولسانیات کے مباحث سید صاحب کا اصل موضوع کبھی نہیں رہے، لیکن ان مباحث سے سید صاحب کو ہمیشہ دلچسپی رہی، چنانچہ وقتاً فوقتاً ان کے قلم سے لغت ولسانیات سے متعلق تحریریں نکلتی رہیں۔ ان کی کتاب "لغات جدیدہ" کا زمانہ طباعت، وہی ہے جس میں "ارض القرآن" کی اشاعت ہوئی، گو "لغاتِ جدیدہ" عربی، اردو الفاظ کی ایک ڈکشنری ہے لیکن سید صاحب کے تحقیقی ذوق نے عربی زبان کے دخیل اور مولد الفاظ پر بحث کی گنجائش نکال لی ہے، اور جدید اسالیب بیان پر ان کا مختصر سا دیباچہ، اپنے موضوع پر ایک وقیع تحریر ہے، جس میں زبانوں کے تغیرات، اصناف الفاظ جدید، مولد ومعرب، تعریب کے لئے بعض حروف کی تبدیلی وغیرہ پر نہایت جامع تبصرہ ہے۔ اسی طرح اس کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل کیا ہے جس میں مختلف زبانوں کے الفاظ کے عربی زبان میں عمل دخل کو واضح کیا ہے اور جرمنی، چینی، رومی، حبشی، عراقی، اسپینی، انگریزی، قبطی ومصری، سنسکرت، سریانی لاطینی، فرنچ، اطالوی، ترکی، فارسی، اور سواحل ہند کی زبانوں کے الفاظ، ان کی معرب شکل اور ان کے معانی کی ایک مفصل فہرست دی ہے، اس کے علاوہ "عربوں کی جہازرانی" میں لغات عرب کے زیر عنوان ایک محققانہ بحث کی ہے جس میں دریا اور سمندر کے عربی نام کشتی اور جہاز کے الفاظ اور بندرگاہوں کے الفاظ کی لغوی تحقیق کی ہے اور ان کے اشتقاقی مصادر سے بحث کی ہے۔ یہاں جی چاہتا ہے کہ سید صاحب کے انداز تحقیق کا ایک نمونہ پیش کیا جائے، وہ لکھتے ہیں: "خلیج فارس کے جہازرانوں میں بعد کو ایک لفظ ناخوذہ کا مستعمل ہوا ہے، اس کی جمع نواخذہ بنائی گئی ہے، یہ لفظ ہندی فارسی ترکیب سے بنا ہے، جس کو ہم ناخدا کے لفظ سے جانتے ہیں۔ یہ ناؤ خدا یعنی خدائے ناؤ کی مقلوبی ترکیب ہے، اسی طرح بحر روم کے عرب بحیروں میں جہاز چلانے والے کے لئے نوتی کا لفظ مستعمل ہے، یہ لفظ شعرائے جاہلیت (اعشیٰ) اور صحابہ کرام کے زمانہ میں ہم کو ملتا ہے (لسان العرب فی کلام ابن عباسؓ) اہل لغت اس کے معنی یہ بتاتے ہیں النوتی "الملاح الذی یدبر السفینۃ۔ نوتی، ملاح جو جہاز کا پورا انتظام کرتا ہے۔ اس لفظ کو عربی وزن میں کر کے نوّات کی صورت میں بھی بولا گیا ہے، ایک آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے انہم کانوا نواتین ای الملاحین، وہ لوگ نوات یعنی ملاح تھے، یہ لفظ گو عربی میں قدیم زمانہ سے مستعمل ہے مگر یہ خاص عربی نہیں، جوہری نے صحاح میں تصریح کی ہے کہ یہ اہل شام کا محاورہ ہے، دیکھو صحاح میں لفظ نوت "وھو من کلام اہل الشام" اس سے پتہ چلتا ہے کہ رومی راستہ سے یہ لفظ شام ہو کر عرب میں آیا ہے، یہ اصل میں لاطینی لفظ (NAUTIANS) ہے جس سے

فرنچ میں NAUTIQUE اور انگریزی میں NAVY، نیوی گیشن، نیول، نائیکل وغیرہ لفظ بنے ہیں، لیکن کیا ہمارا ہندی ناو اُن لفظوں کی اصل نہیں بن سکتا، جنوبی ہندوستان میں ایک شریف عربی النسل قوم نائت اور نوائت آباد ہے، خیال ہوتا ہے کہ وہ انھیں نواتین یعنی عرب جہازرانوں کی اولادیں ہیں جو بعد کو سواحل ہند پر آباد ہو گئی تھیں۔"[۲]

اسی طرح "عرب و ہند کے تعلقات" میں انہوں نے عربی زبان میں ہندوستانی الفاظ کے دخیل ہونے پر شاندار لغوی بحث کی ہے اور لغت عربی کی قدیم شہادت اور قرآن پاک میں تین ہندی لفظ اور اسی قسم کے عنوانوں کے تحت جو بحث کی ہے اس کو اُردو میں لسانیات کے موضوع کے تعلق سے ایک بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

سید صاحب کی ایک اور کتاب "نقوش سلیمانی" میں بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق، اردو کیوں کر پیدا ہوئی؟ اور تہنید کے عنوانات سے جو مقالے شامل ہیں وہ لغت و لسانیات کے ہر طالب علم کے لئے تحقیق و تدقیق اور نظر و فکر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ سید صاحب کے معاصر اور مستند اہل زبان مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے ان مضامین کے بارے میں لکھا ہے کہ "سید صاحب نے یقیناً لسانیات پر کوئی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی، لیکن اس ہلکے سے نمونے سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انھیں فن لغت و اشتقاق الفاظ سے کتنی مناسبت تھی، اس میدان میں اپنا ذہن کہاں کہاں دوڑاتے رہتے، کن کن آسمانوں سے تارے توڑ توڑ کر لایا کرتے اور خشک لغوی تحقیق کو کتنا شگفتہ بنا کر رکھتے۔"[۳]

ہم نے "ارض القرآن" کا مطالعہ جب اس زاویے سے کیا تو اندازہ ہوا کہ سید صاحب کے ابتدائی دور کی اس تصنیف میں لغوی و لسانی تحقیق کے بہت سے نمونے، جواہر ریزوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں، ہم نے ان کو سمیٹنے کی کوشش کی اور یہی کوشش ہمارے اس مقالہ کا موضوع ہے۔

عربی کے بعض قرآنی الفاظ اردو میں معروف ہیں مثلاً عرب، عاد، حضرموت، ارم، شداد، ہود، عدن، سبا صابی، حنیفیت، لات، عزیٰ، منات، رحمن، شعیب، ہاجرہ، مکہ، نبط، اوس، خزرج، قریش، ابولہب، عربی مبین، بعل، شمس، رام، مجوسیت، قیس، حبش، نجاشی، ابرہہ وغیرہ، سید صاحب نے ان الفاظ کی لغوی تحقیق کو نہایت دلکش شکل بخشی ہے، الفاظ کے تغیر اور مختلف زبانوں میں ان کے تلفظ کے اختلاف پر ایک اصول پیش کرتے ہیں، اس اصول سے خود سید صاحب کے لغوی فہم و ادراک پر روشنی پڑتی ہے، وہ لکھتے ہیں: "اختلاف السنہ کی بنا پر نام بہت کچھ بدل جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک ہی شخص کا نام مختلف زبانوں کے تلفظ سے بگڑ کر ممکن ہے کہ وہ چند اشخاص کے مختلف نام سمجھے جائیں، یونانی، یورپین اور عربی زبانوں میں آج بھی ایک ہی نام کو دیکھو تو ان کے اختلاف تلفظ سے سخت حیرت ہوگی، قرآن کے اعلام پر تو کئی ہزار برس گزرے، مسلمان فلاسفر اور حکماء

جن کو ابھی صرف ایک ہزار برس بھی نہیں ہوا، یوروپین زبانوں میں ان کے عجیب عجیب نام ہوگئے ہیں، جن کو اصل سے کوئی تعلق نہیں اور کبھی کوئی عرب ان کو عربی نام نہیں تسلیم کرے گا، ابو علی سینا کو ایوی سینا سے کوئی نسبت ہے، ابن رشد کو ایوی روس سے کیا تعلق، ابن ہیثم کو ایل ہیزن سے کیا مناسبت ہے، ایل بوکاسیس کو ابوالقاسم زہراوی کون سمجھے گا؟

اسی طرح عبرانی نام عربی میں آکر اور یورپ میں یونانی میں جاکر کچھ کا کچھ ہوگیا ہے، عبرانی میں یقطان یونانی میں جقطان اور عربی میں قحطان، عبرانی میں یارح ہے، یونانی میں جرح ہے اور عربی میں یعرب ہے۔[۳،۴]

سید صاحب کے اس بنیادی اقتباس کو نقل کرنے کے بعد اب ہم سید صاحب کی لغوی تحقیقات کو پیش کرتے ہیں:

عرب: "ارض القرآن" میں سب سے پہلے انہوں نے لفظ عرب سے بحث کی ہے اور یہ سوال قائم کیا ہے کہ عرب کو عرب کیوں کہتے ہیں؟ اور اس سوال کا ایک عام جواب یہ ہے کہ عرب، اعراب سے مشتق ہے، جس کے معنی زبان آوری اور اظہار مافی الضمیر کے ہیں، چونکہ عرب کی قوم نہایت زبان آور فصیح اللسان تھی، اس لئے اس نے اپنا نام عرب رکھا اور اپنے سوا تمام دنیا کو عجم یعنی بے زبان کے نام سے پکارا، سید صاحب اس جواب سے مطمئن نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ "حقیقت میں یہ صرف نکتہ آفرینی اور دقت رسی ہے، دنیا میں ہر قوم اپنی زبان کی اسی طرح جوہری ہے جس طرح عرب۔"[۵]

عرب کو عرب کہنے کی ایک اور وجہ بیان کی جاتی ہے، علمائے انساب کا یہ کہنا ہے کہ اس ملک کا پہلا باشندہ یعرب بن قحطان تھا جو یمنی عربوں کا پدر اعلیٰ ہے، اس لئے اس ملک کے باشندوں اور خود ملک کو عرب کہا جانے لگا، لیکن سید صاحب اس رائے کی سختی سے تردید کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ "یہ بالکل خلاف قیاس اور معلومات تاریخ کے مخالف ہے، نہ یعرب اس ملک کا پہلا باشندہ تھا اور نہ لفظ عرب کسی قاعدہ لسانی کے موافق یعرب کی طرف منسوب ہوسکتا ہے، اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یعرب کا مسکن یمن تھا، اس لئے سب سے پہلے خود یمن کو یعنی جنوبی عرب کو عرب کہنا چاہئے لیکن اس کے بالکل برخلاف، عرب کا لفظ پہلے شمالی عرب کے لئے مستعمل ہوا ہے۔"[۶]

سید صاحب اس سلسلے میں اہلِ جغرافیہ کے قول کو صحیح سمجھتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ "عرب کا پہلا نام عَرَبَہ اور عربۃ تھا جو تخفیفاً بعد کو عموماً عرب بولا جانے لگا اور اس کے بعد ملک کے نام سے خود قوم کا نام بھی قرار پاگیا، چنانچہ شعرائے عرب کے اشعار سے بھی جو عرب کی تنہا ڈکشنری ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اسد بن جاحل کہتا ہے ع

وعربۃ ارض جد فی الشر اہلہا   کماجد فی شرب النقاخ ظماءہ

ابن منقذ ثوری کا شعر ہے ؎

لنا اہل لم یطمث الذل بینہا عربۃ ماواہا بقرن فابطما!

اسلام کے بعد بھی یہ نام باقی رہا، ابو سفیان کلبی رسول اللہ کی مدح میں کہتے ہیں ؎

ابونا رسول اللہ و ابن خلیلہ بعربۃ بوانا فنعم المرکب "

ان اشعار کو پیش کرنے کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں: "اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اس ملک کا نام عرب کیوں قرار پایا؟ اصل یہ ہے کہ تمام سامی زبانوں میں عرب صحرا اور بادیہ کا مفہوم رکھتا ہے، عبرانی میں عربا، بیابان اور میدان کو کہتے ہیں اور خود عربی زبان میں اس مفہوم قدیم کے بقایا موجود ہیں، عرابہ، بدویت کے معنی میں اور اعراب، اہل بادیہ اور صحرا نشینوں کے لیے اب تک مستعمل ہے، چونکہ عرب کا ملک زیادہ تر ایک بیابان بے آب و گیاہ ہے اور خصوصاً وہ حصہ جو حجاز سے بادیہ عرب و شام اور سینا تک پھیلا ہوا ہے اس لئے اس کا نام عربا قرار پایا اور پھر رفتہ رفتہ وہاں کے باشندوں کو عرب کہنے لگے۔"[۸]

اپنی اس دلیل کی تائید میں وہ قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں سے بھی ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "قرآن مجید میں وہ لفظ عرب، ملک عرب کے لئے کہیں نہیں بولا گیا ہے، حضرت اسماعیلؑ کی سکونت کے ذکر میں واد غیر ذی زرع یعنی وادی ناقابل کاشت اس کو کہا گیا ہے، اکثر لوگ اس نام کو عرب کی طبعی حالت کا بیان سمجھتے ہیں لیکن اوپر جو تحقیق بیان ہوئی ہے اس سے واضح ہے کہ یہ لفظ عرب کا بعینہ لفظی ترجمہ ہے، چونکہ اس عہد میں اس غیر آباد ملک کا کوئی نام نہ تھا اس لئے خود لفظ 'غیر آباد ملک' اس کا نام پڑ گیا۔ تورات میں بھی اسماعیلؑ کا مسکن مدبار بتایا گیا ہے جس کے معنی بیابان اور غیر آباد خطہ کے ہیں اور جو بالکل عرب کا ترجمہ اور وادی غیر ذی زرع کے مترادف ہے۔"[۹]

اس تحقیق کے بعد بھی سید صاحب کے قلم کی بادیہ پیمائی رکتی نہیں ہے، بلکہ ان کی نگاہ، مزید کچھ اور کی جستجو میں اور بلندی پر جا کر ٹھہرتی ہے کہ عرب کا لفظ سب سے پہلے کب اور کہاں استعمال ہوا ہے؟ کیا عبرانی کے علاوہ دوسری تاریخوں میں بھی اس کے نام کا استعمال ہوا ہے؟ اور اسلام سے پہلے یہ لفظ کس خاص خطہ زمین کے لئے مخصوص تھا؟ سید صاحب ان سوالوں کے جوابات دیتے ہیں: "لفظ عرب سب سے پہلے سنہ ۱۰۰۰ ق م میں حضرت سلیمان کے عہد میں مسموع ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد عام طور سے اس کا استعمال عبرانی، یونانی اور رومانی تاریخوں میں نظر آتا ہے۔ ایسریا کے کتبات میخی میں سنہ ۸۰۰ ق م میں عرب کا نام عربی لیا گیا، قبل اسلام یہ لفظ پورے ملک کو جو یمن سے شام تک وسیع ہے، محیط تھا۔

بہر حال ملک عرب کا پہلا نام یورب کی زمین ہے اور دوسرا نام جنوب کی زمین ہے اور ان دونوں

ناموں سے وہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے بھی پکاری گئی ہے۔"[۱۰]

پورب کی زمین اور جنوب کی زمین نام پڑنے کی جو وجہ سید صاحب نے تحریر کی ہے وہ ان کے انداز تحریر اور ان کے طریقہ استنباط کی بہترین مثال ہے، وہ لکھتے ہیں: "عرب گو امم سامیہ کا مولد و منشا ہے لیکن عجب نہیں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد ان کو یاد بھی نہ رہا ہو کہ یہ اس عہد کا واقعہ ہے جب نوع انسان، دارِ عالم کے آغوش میں طفل شیر خوار تھا، بچے عہد طفولیت میں اشاروں کے سوا، لفظوں میں کسی چیز کا نام نہیں بتاتے، امم سامیہ جو مسیحؑ سے ڈھائی تین ہزار برس پہلے بچہ تھیں، عموماً پورب کی سرزمین کے سوا اپنے مولد کا نام کچھ اور نہیں بتائیں، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس وقت انسان خود 'نام' کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔"[۱۱]

اس طرح سید صاحب نے صرف لفظ عرب کی تحقیق میں قرآن اور ادب جاہلیت اور ادب اسلامی کے مصادر کے علاوہ بائبل کے رسالوں استثنا، تکوین، قضاۃ، سلاطین، ارمیاہ، متی، تکوین، سفر الملوک اور تاریخ بابل راجرس کے بے شمار صفحات کی ورق گردانی کی، اس سے ان کی علمی جستجو اور تحقیقی کدوکاوش کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

عاد: اردو میں عاد ارم کا لفظ تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے غیر مانوس نہیں ہے، اس لفظ کو یونانی جغرافیہ نویسوں نے حضرموت کا ایک قبیلہ ADRAMEITE عادرمی ٹائی بتایا ہے اور بعض لوگ اس کو خود حضرموت سمجھتے ہیں لیکن سید صاحب کا لسانیاتی وجدان یہ فیصلہ کرتا ہے کہ "عادرمی ٹائی میں ٹائی صرف قبیلہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے، اصل لفظ عاڈرم ہے، جو عاد ارم کی نہایت صحیح صورت ہے، حضرموت کی یونانی میں یہ شکل ہے خڑموٹی ٹائی، اس لئے یہ ظاہر ہے کہ ان سے دو قبیلے مراد لینے چاہئیں۔"[۱۲]

اس لفظ عاد کی تحقیق میں وہ لکھتے ہیں کہ "تاریخ قدیم کے بعض یوروپین مصنفین عاد کو صرف ایک فرضی اور مذہبی میتھالوجی سمجھتے ہیں، لیکن یہ انتہائی غلطی ہے، تحقیقات جدیدہ نے فیصلہ کیا ہے کہ عرب کے قدیم باشندے امم سامیہ ایک کثیر الافراد باعظمت جمعیت تھی جس نے بابل، مصر و شام میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں، یہ حقیقت اور واقعہ ہے، اہل عرب اگر اپنی زبان میں ان قدیم باشندوں کو امم بائدہ اور ان کی جماعت کے افراد کو عاد و ثمود وطسم و جدیس کہتے ہیں تو کیا اس وضع اسمار کے جرم میں حقیقت اور واقعہ مٹ جائے گا۔"[۱۳]

اس تمہید کے بعد وہ لفظ عاد سے بحث کرتے ہیں کہ اس کی اصلیت کہاں ملتی ہے؛ عربی میں اس کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کا ذکر قرآن کے علاوہ اور کہاں آیا ہے؟ ان کے الفاظ یہ ہیں: "السنہ سامیہ میں لٹریچر کے لحاظ سے عبرانی عربی سے قدیم زبان ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قدیم الفاظ کی اصلیت، عربی سے زیادہ اس میں محفوظ ہے، عاد کے لغوی حیثیت سے عربی میں کوئی معنی نہیں ملتے۔

عبری میں عاد کی اصلیت موجود ہے، عاد کے معنی بلند و مشہور کے ہیں، اور عجیب تر یہ ہے کہ ارم اور شم (سام)

کے بھی یہی معنی ہیں، ان معنوں کا بقیہ اثر عربی میں بھی موجود ہے، ارم کے معنی پہاڑی اور سنگ نشان راہ کے لغت میں مذکور ہیں اور شم سے شم اور سمو تو اب تک مستعمل ہے۔ توراۃ میں عاد مذکر کے نام کے لئے اور عادۃ عورتوں کے لئے کئی جگہ آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں یہ نام عموماً مستعمل تھا۔"[۱۴]

حمورابی: ایک لفظ حمورابی ہے جو سامی قوم کا ایک بادشاہ تھا، کتبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مشہور اور ممتاز بادشاہ تھا، یہ لفظ بھی سید صاحب کی لغوی تحقیقات کے دائرہ میں آیا اور پھر لغت و تاریخ اور مذہب کا ایک قیمتی نتیجہ سید صاحب کی تحقیق کے ثمرہ کے طور پر برآمد ہوا وہ لکھتے ہیں: "تورات میں سب سے پہلا جو سیاسی واقعہ مذکور ہے وہ حضرت ابراہیم کے عہد میں شمالی عرب میں عراق اور شام کے بادشاہوں کی باہمی جنگ ہے، اس موقع پر شنعار (بابل) کے بادشاہ کا نام امرافیل یا امورافیل مذکور ہوا ہے، الف اور ح کا اور ب پ کا اور ف کا مبادلہ السنہ سامیہ میں بہت متداول ہے، اس لئے عجب نہیں کہ امرافیل اصلاً امورافی ہو اور امورافی حمورابی کا عبری تلفظ ہو، ایل کا لفظ بمعنی خدا صرف عبری ناموں کی مناسبت سے کیا گیا ہے جیسے اسرائیل، شماعیل، حزقیل، وغیرہ، امرافیل اور حمورابی کے اتحاد کی بڑی دلیل دونوں کا تقریباً اتحاد عصر اور اتحاد ملک بھی ہے، بہر حال اگر یہ قیاس صحیح ہے تو حمورابی اور حضرت ابراہیم کا زمانہ ایک ہی زمانہ ہوگا۔"[۱۵]

اس لغوی اظہار خیال کے بعد حمورابی کی سیرت کا ایک جائزہ لیا جو اگرچہ ہمارے موضوع سے الگ ہے لیکن صرف ایک اقتباس سے حمورابی کی شخصیت پورے طور پر سامنے آجاتی ہے، وہ لکھتے ہیں: "حمورابی کے ایک اور کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید یہ دنیا کا سب سے پہلا مقنن ہو، بابل کے ایک منارہ پر اس کے قوانین کا خلاصہ درج ہے جو تورات کے احکام سے بہت مشابہ ہیں، یضل بہ کثیرا و یہدی بہ کثیرا، اہل ضلال کہتے ہیں کہ تورات کے احکام یہیں سے ماخوذ ہیں، ارباب ہدیٰ کہہ سکتے ہیں کہ یہ احکام ابراہیم کی شریعت کے ہیں جن کو حمورابی نے سنا اور قبول کیا، فاما الذین آمنوا فیعلمون انہ الحق من ربہم۔"[۱۶]

سوس: عرب اور عاد کی تحقیق میں ایک جگہ یہ بحث ہے کہ مسیحؑ سے دو ہزار برس پہلے مصر پر ایک اجنبی قوم نے قبضہ کر لیا تھا، اہل مصر اس قوم کا نام سوس (چرواہے) یا ہیک سوس (چرواہے بادشاہ) بتلاتے ہیں، یہ سوس لفظ اردو زبان میں عاد ثمود وغیرہ کی طرح معروف نہیں ہے لیکن سید صاحب نے اس لفظ کی جو لغوی تحقیق کی ہے اور جس پر لطف طریقہ سے اس کی تاریخ بیان کی ہے، وہ مطالعہ کے قابل ہے، اثنا ر بحث وہ مستشرقین کے اعتراضات کی جانب بھی گوشہ چشم سے اشارہ کرتے نظر آتے ہیں، اس لئے دل چاہتا ہے کہ اس لفظ سوس کے بارہ میں جو اگرچہ غیر مانوس ہے، سید صاحب کی لغوی تحقیق کو پیش کیا جائے، وہ لکھتے ہیں: "یہ چرواہے، بادشاہ کون تھے؟ عرب جو اکثر شتربانی سے جہاں بانی تک پہنچے ہیں اور اس وقت بھی ان کو یہی لقب دیا گیا۔ لیکن کیا کہا جائے کہ چرواہا

ہو نہ صرف عرب کا بلکہ تمام امم سامیہ کا قومی وملکی پیشہ ہے اور اس کی تحریری شہادت آج سے دو ہزار برس پیشتر کی ہمارے پاس موجود ہے تا آں کہ پیشوایان امم سامیہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔"[17]

مستشرق سر ولیم میور رسول اللہ کے بکریاں چرانے کو ذلت وتحقیر کا کام سمجھتے ہیں، سید صاحب نے سوس کی اس بحث میں اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سر ولیم میور کو یوسیفوس پڑھنا چاہیے اور اپنی مذہبی کتاب توراۃ میں دیکھنا چاہیے کہ ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور موسیٰ کا کیا پیشہ تھا؟"[18]

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، سوس کی تحقیق میں سید صاحب آگے لکھتے ہیں کہ "ہیک کو اگر ہم شیخ کا محرف نہ کہیں جو امیر بدو کا خاص لقب ہے تو اس کو خاص مصری لفظ تسلیم کرتے ہیں، لیکن سوس کا لفظ تو خالص عربی ہے، سوس کے اصل معنی نگرانی وانتظام کے ہیں، اسی مناسبت سے چرواہے کو بھی سوس ابتداءً کہتے ہوں گے، جس سے مشتق ہو کر گلہ بانی سے جہاں بانی کے لئے عربی میں یہ لفظ مستعمل ہوا، اسی ماخذ سے سیاست کا لفظ اب عام طور سے اس معنی میں بولتے ہیں، سیاست کا اصل مادہ لغت میں یہی سوس ہے، معنی اول یعنی گلہ بانی وچوپانی کا اثر صرف ایک لفظ میں ہمارے ہاں باقی ہے یعنی سائیس، خادم اسپ، عجب نہیں کہ عربی میں یہیں سے لفظ صوص گھوڑے کے لئے مستعمل ہوا ہو، ان مصری بادشاہوں میں آخری نام اسیس وہی نام ہے جس کو ہم عزیز کہتے ہیں اور اب تک امرائے مصر کا لقب جانتے ہیں، اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں حضرت یوسف کے قصہ میں عزیز ہی کا لفظ پاتے ہیں۔"[19]

عدن: عدن کا لفظ اردو میں معروف ہے کہ یہ مشہور شہر ہے، لیکن عدن کی حقیقت کیا ہے؟ سید صاحب کے الفاظ میں تھوڑی دیر غور کر لینا چاہیے، وہ لکھتے ہیں: "عہد قدیم میں عموماً سامی مذاق یہ رہا ہے کہ شہر کا نام بعینہ بانی شہر کے نام پر رکھتے تھے، عرب کے شہر رقیم، سبا، حضرموت، عمان، مدین وغیرہ اسی قسم کے نام ہیں، اس بنا پر اگر یمن کے قدیم شہر عدن کو جس کے قریب وہ تمام تر قدیم عمارات واقع ہیں، جن کو عرب عادیات کہتے ہیں اور تاریخ جس کے قریب عاد کی آبادی کا نشان بتاتی ہے، اگر ہم "عادیین" کا مخفف سمجھیں تو کیوں غلط ہوگا، عادیین کے جمعیت پر اعتراض نہ کرو کہ قبیلہ کے نام کے پہلے بنو (فرزندان) کا اضافہ کرنا شمال عرب کی زبان ہے، عموماً قدیم طریقہ یہی ہے کہ پدر قبیلہ کے نام کی جمعیت سے قبیلہ کا نام پیدا کر لیتے ہیں مثلاً لودیم، مصرایم، جراہیم وغیرہ، عربی میں جمع مکسر میں اب تک یہ قاعدہ درج ہے مثلاً منذر سے مناذرہ، غسان سے غساسنہ، ارقم سے اراقمہ۔"[20]

سید صاحب کی تحریر کی اس خوبی کو کیا کہیے ایک لفظ کے سلسلے میں ایک اقتباس سے دیگر بیش قیمت معلومات بھی قاری کو حاصل ہوتی جاتی ہے اور اسکو یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ عطر جو دماغ وذہن کی ایک دنیا کو معطر کر رہا ہے، کتنے پھولوں سے کس قدر محنت کے بعد کشید کیا گیا ہے۔

ثمود: عاد وثمود کے الفاظ اردو میں عام طور سے معروف ہیں، ثمود کی وجہ تسمیہ کہیں نہیں ملتی، یہ لفظ صرف

ایک قوم کے نام کی حیثیت سے معروف ہوا" لیکن سید صاحب کے تحقیقی ذوق نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اس لفظ کو بغیر کسی وجہ کے قبول کرلیا جائے، چنانچہ ان کو ڈائیڈورس ۸۰؁ ق م اور بطلیموس ۱۴۰؁ کے ہاں ثمود کا تلفظ تھموڈینی اور اور تھموڈیٹی ملا" مگر اس کی وجہ تسمیہ پر پھر بھی لاعلمی کا غبار چھایا رہا" بالآخر سید صاحب نے عربی و عبری زبانوں میں مطالعہ کے بعد اور ثمود کی تاریخی عظمت کے حوالے سے یہ نتیجہ نکالا کہ "ثمود کی لفظی تحقیق شاید عربی میں صحیح نہ مل سکے ثمد عربی میں آب قلیل کو کہتے ہیں" لیکن اس سے کوئی خاص مناسبت نہیں معلوم ہوتی" عبری میں ایک لفظ "تامید ہے جس کے معنی دائم اور خالد کے ہیں" عربی کی ث اور عبری کی ت ایک چیز ہے، عبری میں ث نہیں ہے اس لئے اکثر وہ الفاظ جو عربی میں ث سے ہیں" عبری میں ت سے ہیں" اس بنا پر ثمود کے معنی عام سامی زبانوں میں وہی ہوں گے جو عربی میں خالد کے معنی ہیں (یعنی زندۂ جاوید)"[۲۱]

سبا: سبا کا لفظ ملکہ بلقیس اور حضرت سلیمانؑ کے قصہ کی وجہ سے اُردو زبان کے لئے غیر معروف نہیں ہے یہ لفظ کیا ہے" پہلے کیا تھا" اور اس کا مادہ اشتقاق کیا ہے، سید صاحب نے ان سوالوں کا جائزہ لیا اور ایک عمدہ تحقیق کا نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا۔ وہ لکھتے ہیں: "توراۃ میں شبا ایک جد قبیلہ کا نام ہے" بروایت عرب اس جد قبیلہ کا نام عمر یا عبد شمس تھا اور لقب سبا تھا" محققین جدید بھی زیادہ تر اس کو لقب خیال کرتے ہیں" لغویین عرب کی رائے ہے کہ یہ سبی سے مشتق ہے جس کے معنی غلام بنانے کے ہیں؛ چونکہ عبد شمس بہت بڑا فاتح تھا اور اس نے بہت سے لوگوں کو گرفتار کرکے غلام بنایا اس لئے اس کا لقب سبا قرار پایا گیا، تحقیق جدید یہ ہے کہ سبی اور سبا اس معنی سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم تجارت ہے" کتبات میں عموماً سبا کا مادہ تجارتی سفر کے معنی میں مستعمل ہوا ہے عربی زبان میں یہ اب تک شراب کی تجارت اور خرید و فروخت اور اس کے لئے کے معنی میں مستعمل ہے" سبا چونکہ تاجر قوم تھی اس لئے اس لقب سے مشہور ہوئی"[۲۲]

سبا کے ذکر میں ملکہ بلقیس کا ذکر ناگزیر ہے" یہ نام عرب کے یہودیوں میں مشہور تھا اور ان ہی کے ذریعہ مسلمان مورخین اور مفسرین میں بھی مقبول ہوا" لیکن سید صاحب کو اس نام کی لفظی ساخت میں شبہ ہے وہ اس کو یونانی الاصل سمجھتے ہیں" لکھتے ہیں: "لفظی دلالت کے لحاظ سے یہ عربی نہیں بلکہ یونانی الاصل نام معلوم ہوتا ہے" بعض روایات تفسیر میں بلقیس کو پریزاد کہا گیا ہے یعنی اس کی ماں بلقمہ ایک پری تھی" لیکن یہ روایتیں بالکل لغو اور موضوع ہیں" بلقمہ کو ممکن ہے کہ یمن کی مشہور پری المقہ سے کوئی نسبت ہو"[۲۳]

تبع: قرآن مجید میں عاد و ثمود کے ساتھ ایک اور قوم تبع کا ذکر بھی آتا ہے" اُردو کے اعلیٰ ذوق رکھنے والے قارئین اس سے واقف ہیں" عرب کے زبان دانوں نے عام طور پر اس لفظ کے اصل مادہ یعنی تبع کے لغوی معنوں ہی کو مدنظر رکھا اور تاریخی روایتوں کے مطابق جب یمن میں ایک شخص رائش بادشاہ ہوا تو سب اس کی بادشاہی

پر متفق ہوگئے اور اس کی تبعیت و پیروی اختیار کرلی، اس بادشاہ کا لقب تبع ہوا۔ سید صاحب اس تشریح کو امکانی لحاظ سے تسلیم کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ تبع عربی لفظ ہو اور معناً متبوع ہو یعنی جس کی لوگ پیروی اور اطاعت کریں، لیکن سید صاحب تحقیق جدید کی روشنی میں اس کو حبشی زبان کا لفظ سمجھتے ہیں جس کے معنی قادر، جبار اور صاحب قوت کے ہیں اور یہ ٹھیک انہی معنوں میں ہے جس معنی میں یہ لفظ عربی اور اردو میں سلطان کے لئے آتا ہے، حبشی زبان کا لفظ ہونے کے علاوہ سید صاحب اس لفظ کے غیر عربی ہونے کی ایک اور وجہ بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "عربی زبان میں اس وزن پر کوئی لفظ واحد اور بمعنیٰ مفعول نہیں آیا رکّع و سُجّد وغیرہ الفاظ ہیں تو جمع ہیں، مبالغہ کا یہ وزن ہے تو وہ معنی مفعول نہیں پیدا کرتا، اور سب سے آخر میں اس کے غیر عربی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ عجمی ناموں کی طرح اس پر الف لام نہیں آتا۔ اگر یہ عربی صفت کا صیغہ ہوتا تو مانع الف و لام (ال) کیا ہے۔"[۲۴]

اس کے بعد سید صاحب اس غلط فہمی کو بھی دور کرتے ہیں کہ یہ لفظ صرف حبشی زبان کا لفظ ہے، سید صاحب کی نظر سے کتبات میں یہ لفظ گزرا اس لئے وہ اس کو اصلاً سبائی و حمیری سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں: "کتبات میں ملوک معین و سبا کے عہد میں یعنی کم از کم ہزار سال قبل مسیح میں لفظ تبع نظر آتا ہے، ایک بادشاہ معین کا نام تبع کرب بن تبع ایل ہے، ایک سبائی کتبہ میں تبع شرجیل ملکہ سبا منقوش دیکھا ہے، دوسرے کتبہ میں تبع کرب بلا لقب شاہی نظر سے گزرا ہے۔"[۲۵]

سید صاحب کے اس نظریہ کی توثیق، قرآن مجید کی آیات سے بھی ہوتی ہے، تبع کا ذکر دو موقعوں پر ہے اور دونوں بار قوت و زور اور جبروت و عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ: "ان آیات کے موقع استعمال سے واضح ہوتا ہے کہ تبع کے معنی متبوع سے زیادہ بلیغ و پراثر قادر و توانا کے ہیں۔"[۲۶]

اسی تبع کے ذکر میں عرب کے بعض مورخین مثلاً مسعودی کا خیال ہے کہ ان کے ایک بادشاہ شمر یرعش نے ترکستان کے ایک شہر کو برباد کر دیا تھا، اس لئے اس شہر کا نام سمرکند (سمرقند) ہوگیا، یعنی شمر نے اس کی بنیاد تک کھود ڈالی تھی، اور ایک تبع بادشاہ نے چین تک اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا اور تبت میں اپنی کچھ فوج چھوڑ دی، جہاں اب تک عرب آباد ہیں اور عربی لباس و وضع میں اشخاص پائے جاتے ہیں، لیکن سید صاحب اس استدلال کو مسعودی کے فضل و کمال سے فروتر سمجھتے ہیں اور پھر یہ لکھتے ہیں کہ "سمرکند (سمرقند) کے پہلے جزو کو شمر یرعش کے پہلے جزو سے اتحاد تھا اس لئے وہ سمرقند کا بانی یا مخرب قرار پایا، انہوں نے کند کو فارسی لفظ کندن سے مشتق سمجھا، حالانکہ قدیم ترکستانی زبان میں "گند" شہر کو کہتے ہیں، سمرگند، تاشگند، خوگند، یہ سب ترکستانی شہروں کے نام ہیں، ترکستانی کی زبان بزمانہ اسلام فارسی ہوگئی تھی، لیکن شمر یرعش کے زمانہ میں تو فارسی نہ تھی جو کند، فارسی کندن سے ماخوذ ہوتا، چین و تبت کا نگار خانہ بھی صرف لفظ کا تماشہ

ہے۔ عرب تبرت کو تُبت کہتے ہیں جو تبع کے بالکل قریب ہے۔"[۲۷]

ھاجرہ اور اسمٰعیل: ہاجرہ، حضرت ابراہیمؑ کی دوسری بیوی اور حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ ہیں عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت ہاجرہ، حضرت سارہ کی باندی تھیں۔ اسی خیال کی بنا پر بنی اسرائیل کا یہ زعم تھا کہ بنی اسمٰعیل ان کے برابر کے نہیں ہیں، سید صاحب نے حضرت ہاجرہ کے باندی ہونے کو تسلیم نہیں کیا اور اس کے لیے یہ ثابت کیا کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں مصر میں جو حکمراں قوت تھی وہ عرب ہی کی ایک سامی قوم تھی اور اس سے حضرت ابراہیمؑ کے نہایت قریبی نسبی تعلقات تھے، خیر یہ تو تاریخی بحث ہے، یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ سید صاحب نے ہاجرہ کی لفظی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ اصلاً عبرانی لفظ ہاغار ہے جس کے معنی بیگانہ اور اجنبی کے ہیں، چوں کہ حضرت ہاجرہ عبرانی ہیں اس لئے ان کا باندی ہونا درست نہیں ہے، بلکہ فرعون کا ہاجرہ کو حضرت ابراہیم کی خدمت میں دینا اس بات کی قوی شہادت ہے کہ اصلاً اس ازدواج سے نسبی تعلق کا استحکام مقصود تھا۔"[۲۸]

حضرت ہاجرہ سے حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے تو سید صاحب نے اس لفظ کی بھی تحقیق کی کہ یہ نام کیوں رکھا گیا، وہ لکھتے ہیں: "اسماعیل عبرانی میں شماع ایل ہے، شماع (سماع) سننا اور ایل (اللہ) لفظی معنی ہوئے "خدا کا سننا، خدا نے چونکہ حضرت ابراہیم کی دعا اور حضرت ہاجرہ کی فریاد سنی اس لئے بچے کا نام شماعیل پڑا، تکوین میں خدا فرماتا ہے: اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی۔"[۲۹]

قیدار: حضرت اسمٰعیل کے ایک بیٹے قیدار تھے جو شہرت اور اعزاز میں اپنے تمام بھائیوں سے ممتاز تھے ان کا نام تورات کے صفحات، اسیریا کے کتبات اور یونان کے جغرافیہ میں ہر جگہ موجود ہے، لیکن سب سے عظیم الشان عزت ان کو یہ حاصل ہے کہ ان ہی کی ایک شاخ عدنان کو رسول اللہ کے جدامجد ہونے کا شرف حاصل ہے، قیدار کو کیدار بھی کہا جاتا ہے، سید صاحب کے لغوی ذوق نے اس لفظ کے معنی اور وجہ معنی کی جستجو کی تو معلوم ہوا کہ "قیدار کے عبری میں معنی سیاہی اور غم کے ہیں، عربی میں بھی لفظ کدر و کدورت ہے، شاید حضرت اسماعیل نے یہ نام باپ سے جدائی اور صحرانوردی کے غم کی یادگار میں رکھا ہو۔"[۳۰]

قریش: حضرت اسماعیل کی گیارہویں پشت میں فہر نام کے ایک شخص خاندان قریش کے بانی ہیں قریش کسی خاص شخص کا نام نہیں ہے، یہ فہر کا لقب تھا، لیکن پھر وہ اس قدر مشہور ہوا کہ سارا خاندان، قبیلہ قریش کے نام سے معروف ہوا۔ قریش کے معنی کیا ہیں اور اس لقب کو کیوں اختیار کیا گیا اور لغت میں اس لفظ کا اصل مشتق کیا ہے، سید صاحب نے ان تمام سوالوں کے جواب دیئے اور اس سلسلہ میں بر سبیل تذکرہ مستشرقین کے ایک اعتراض کا مسکت جواب بھی دیا، وہ لکھتے ہیں: "فہر کا لقب قریش تھا، اس بنا پر اس کی نسل نے قریش

اپنا خاندانی علم قرار دیا۔ لفظ قریش کے عربی میں متعدد معنی ہیں۔ اس کا ایک ماخذ قریش و تقرش ہے جس کے معنی اکتساب و تحصیل کے ہیں۔ خیال ہے کہ چونکہ اس خاندان کا اصلی پیشہ تجارت تھا، اس لئے قریش کے نام سے موسوم ہے، قریش ایک دریائی درندہ جانور کا بھی نام ہے جو دریائی جانوروں کا شکار کرتا ہے، فہر نے اپنے استیلاء و قوت کے اظہار کے لیے یہ لقب بھی اختیار کیا، حضرت ابن عباس نے اسی دوسری کو اختیار کیا ہے۔[۲۱]

انصاف یہ کہتا ہے کہ یہ دونوں تاویلیں، مناسب اور قرین یقین ہیں اور ان دونوں سے کسی ذم کے پہلو کی جانب اشارہ نہیں ہوتا ہے، مگر مستشرقین کی نگاہ عیب جو کو دونوں تعبیروں میں آخری تعبیر زیادہ پسند آئی اور اس لئے نہیں کہ وہ حضرت ابن عباس کی پسندیدہ تعبیر ہے، بلکہ سید صاحب کی زبان میں: "اس لئے کہ ٹوٹم زم طوطمیت کے ثبوت کے لئے ایک سند ہاتھ آتی ہے حالانکہ اس کی تردید کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس خاندان میں قریش کے نام کی نہ پوجا ہوتی تھی اور نہ اس نام کا کوئی دیوتا ہی تھا۔"[۲۲]

ابولہب: قریش کے ذکر میں ابولہب کا نام آ ہی جاتا ہے، عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ چونکہ قرآن شریف میں اس شخص کے دائمی خسران و ہلاکت کا ذکر ہے اور نار ذات لہب شعلہ بار دوزخ میں اس کے واصل ہونے کا ذکر ہے۔ اس لئے اس کے نام کے معنی آگ والے ہیں، مگر سید صاحب لکھتے ہیں: "ابولہب کے معنی آگ والے کے ہیں، اس سے لوگوں نے یہ قیاس کیا ہے کہ مسلمانوں نے ضد سے اس کا نام آگ والا یعنی دوزخی رکھا تھا، لیکن اصل یہ ہے کہ عربی میں آگ والے سے مراد صاحبِ حسن و جمال ہے، چونکہ یہ خوبصورت تھا اس لئے قریش نے اس کو ابولہب کا خطاب دیا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ یہ خطاب جو اسلام سے پہلے مل چکا تھا، دوسرے معنی میں ایہاماً اسلام کے بعد اس کی تقدیر کا سرنوشت ہو گیا۔"[۲۳]

عربی مبین: سید صاحب نے اس عنوان کے تحت جو بحث کی ہے وہ تفہیم قرآنی میں بے مثال ہے اس کا صحیح لطف تو پوری بحث پڑھ کر ہی لیا جا سکتا ہے، ہم یہاں صرف عربی میں مبین کی لغوی تشریح میں سید صاحب کی تحریر کی چند سطریں پیش کریں گے۔ قرآن پاک میں قرآن کی زبان کو آٹھ مرتبہ عربی کہا گیا ہے جب کہ دو موقعوں پر لسان عربی کہا گیا ہے۔ مبین کا لغوی معنی ہیں ظاہر کرنے والا، واضح کرنے والا، کھولنے والا، اکثر مفسرین نے مذکورہ دونوں آیتوں میں مبین کے یہی لغوی معنی مراد لئے ہیں، یعنی قرآن ایسی زبان میں اتارا گیا جو نہایت فصیح ہے، جس سے مطلب کھل جاتے ہیں اور معانی واضح ہو جاتے ہیں، اور ان کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی ہے، لیکن سید صاحب کے لغت کے تحقیقی ذوق نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا اور انکو عربی مبین اور لسان مبین کے فرق کے بنیادی سبب کی تلاش رہی، اور آخر وہ جوہر مقصود کی یافت میں کامیاب ہوئے۔ ان کی اس عبارت کی خوبی کو ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں: "ارض القرآن جلد اول کے اثنائے تحریر میں

خیال آیا کہ مبین کے یہاں معنی لغوی نہیں ہیں بلکہ بطور علم کے ہیں۔ ظہور اسلام کے وقت بھی عربی زبان مختلف بولیوں اور لہجوں میں منقسم تھی۔ ان میں سے جو فصیح ترین اور شیریں ترین زبان تھی اس کا نام لسان عربی مبین تھا۔ مثلاً اردو زبان کا اطلاق لاہور، دہلی، لکھنؤ، بنارس، پٹنہ، کلکتہ، ڈھاکہ، حیدرآباد، بمبئی، اور مدراس کی تمام اُردو زبانوں پر ہوتا ہے، حالانکہ مختلف اسباب سے ان زبانوں میں ذخیرہ الفاظ، لب و لہجہ، تذکیر و تانیث اور بیسیوں قواعد کا اختلاف ہے۔ تاہم ان سب پر اُردو زبان کا ہی اطلاق ہوتا ہے، لیکن ان سے بہترین اور فصیح ترین زبان کو ہم اُردوئے معلیٰ کہتے ہیں جو قلعہ دہلی میں بولی جاتی تھی یا جواب ہمارے قلم اور شاعری کی زبان ہے۔ اسی طریقہ سے باوجود اختلاف کے عربی میں ایک خاص مستند اور ٹکسالی زبان تھی جس میں مختلف قبائل کے شعرا اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتے اور باہم قبائل ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے اور یہی لسان مبین تھی۔"[۲۴]

سید صاحب کے ذہن میں یہ خیال ایک مفروضہ کے طور پر آیا تھا لیکن جب اس موضوع پر مزید مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ بعض اور علماء کی رائیں بھی اسی خیال کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً محدث حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت بریدہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ لسان عربی مبین سے مراد لسان جرہم ہے اسی طرح یاقوت نے معجم میں ہشام کلبی کا ایک قول اسی طرح کا نقل کیا ہے، سید صاحب نے قریش کی زبان کی خوبی اور فصاحت کے اسباب دو صفحات میں بیان کئے ہیں۔ زبان کی فطرت اور وسعت و فصاحت کے باب میں یہ تحریر ایک شہ پارہ کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن یہ ہمارے موضوع سے الگ چیز ہے، اس لئے ہم اس کو یہاں نقل نہیں کرتے ہیں۔

بعل: سید صاحب نے ارض القرآن میں عرب کے بتوں اور صنم پرستوں سے متعلق بھی بحث کی ہے، عرب میں اصنام بے شمار تھے۔ ان کے بعض صنم تو دوسری سامی قوموں کے بھی خدا تھے۔ ان مشترک خداؤں میں ایک نام بعل کا ہے۔ تورات میں سب سے زیادہ اس بت کا ذکر ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بت سب سے زیادہ مقبول تھا۔ یہ حضرت الیاس کی قوم کا بھی بت تھا۔ بعلبک شام کا ایک قدیم شہر ہے جو اسی بعل دیوتا کی جانب منسوب ہے۔ روایتوں میں ہے کہ یہ دیوتا سونے کا تھا، چودہ ہاتھ لمبا تھا اور اس کے چار منھ تھے، سید صاحب نے اس صنم کی جستجو کی تو یہ پایا کہ "یہ بت ملک شام میں پوجا جاتا تھا۔ بابل کے کھنڈروں کے کتبات میں اس کا نام بیل ہے، لیکن دوسری سامی زبانوں میں یہ بعل ہے، اس کے معنی قوت اور تسلط کے ہیں۔ دوسرے معنی قوی، سلطان، اور مالک کے ہیں۔ مجازاً آقا کے معنی میں اور اس کے بعد شوہر کے معنی میں بھی مستعمل ہوا ہے چنانچہ دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ لفظ قرآن میں بکثرت آیا ہے، عرب کا مشہور دیوتا ہبل جو قریش کا خدائے

اعظم تھا، اسی بعل کی تحریف ہے۔ عبرانی میں ھ کلمہ تعریف ہے، بعل کو وہ ھبعل کہتے تھے عمرو بن لحی شام کے دیوتاؤں کو جب عرب لے کر چلا تو مکہ پہونچتے پہونچتے ھبعل کی صورت ھبل میں بدل گئی۔"[۲۵]

شمس: صنم پرستی اور ستارہ پرستی، مشرکین کی عبادت کی خاص شکلیں ہیں، شمس (سورج) کا شمار ان ستاروں یا سیاروں میں ہے جن کی عبادت گمراہ قوموں میں عام طور سے ہوتی رہی ہے، سید صاحب نے سورج پر روشنی ڈالی چنانچہ لکھتے ہیں: "بابل میں شمس کو شمش کہا جاتا تھا۔ مصر کا سب سے بڑا دیوتا آفتاب تھا۔ جس کو وہ اپنی زبان میں رع کہتے تھے۔ ان کے دارالحکومت کا نام مدینۃ الشمس تھا جس کو مصری اِن کہتے تھے 'یین' آفتاب دیوتا کا مندر تھا، بادشاہ 'آفتاب دیوتا کا بیٹا سمجھا جاتا تھا اس لئے اس کا لقب رعمیس ہوتا تھا یعنی ابن الشمس' یہی سبب ہے کہ سلاطین مصر کو دعوائے خداوندی تھا۔"[۲۶]

قوم سبا کی آفتاب پرستی تو اظہر من الشمس ہے، سید صاحب لکھتے ہیں: "قوم سبا کے مورث اعلیٰ کا نام عبد شمس تھا، جس کے معنی پرستار آفتاب کے ہیں، آفتاب کو یہ لوگ دیوی سمجھتے تھے یعنی عورت، اسی لئے عربی میں شمس بطور مونث کے استعمال ہوتا ہے اور چاند دیوتا مذکر تھا، چنانچہ قمر عربی میں مذکر ہے۔"[۲۷]

قیس: بتوں کا ذکر ہوا تو ایک نام قیس کا بھی آیا، اس نام کے بت کی تشریح سید صاحب کو نہیں ملی لیکن عبدالقیس اور امرؤالقیس کے الفاظ سے سید صاحب کو خیال ہوا کہ اس نام کا بھی بت ہوگا، چنانچہ حجر کے نبطی کتبوں میں دیوتاؤں کے جو نام ملے ہیں ان میں ایک نام قیش بھی تھا جو عربی میں آ کر قیس ہوا، اب سید صاحب کی تحریر ملاحظہ ہو: "چونکہ عرب اپنے نام دیوتاؤں کی نسبت سے رکھا کرتے تھے اس لیے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ عبدالقیس کا قبیلہ جو گو عدنانی تھا لیکن ایک مدت سے بحرین میں آباد تھا وہ قیس کے پرستاروں میں ہو، امرءالقیس کا نام عرب کے مختلف قبائل میں نظر آتا ہے، حیرہ کے عدنانی النسل سلاطین میں ایک امرءالقیس تھا، کندہ کے آخری شاہزادہ اور عرب کے نامور شاعر امرؤالقیس کا نام کون نہیں جانتا، مصر کے ایک ہمہ داں عیسائی مصنف کا بیان ہے کہ عربوں میں امرءالقیس کا نام رومیوں کے مرقس کا معرب ہے۔ لیکن ہم کو نہیں معلوم کہ سامان آرائش و تمدن کے علاوہ عرب میں ناموں کا بھی قحط تھا۔"[۲۸]

ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ: "اوس و خزرج میں امرءالقیس (قیس کا آدمی) کا نام متعدد دفعہ ملتا ہے کیا اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ قیس بھی ان کے معبودوں میں شامل تھا۔"[۲۹]

مجوسیت: بتوں کے ناموں کے علاوہ سید صاحب نے دیگر مذاہب کے بارے میں بھی گفتگو کی ہے، یہودیت اور عیسائیت میں لفظی اشتقاق کی تلاش کی ضرورت نہیں تھی، لیکن مجوسیت کے ذکر میں سید صاحب کے قلم سے جو جملے ادا ہوئے، ہم انھیں کو پیش کرتے ہیں، لکھتے ہیں: "مجوسیت ایران کا قدیم مذہب ہے"

جس کا بانی زرتشت بتایا جاتا ہے، زرتشتی خود اپنے کو مجوس نہیں کہتے ہیں، عربی میں مجوس کا لفظ یونان سے آیا ہے، یونانی ان کو میجوس کہتے ہیں، اصل فارسی لفظ مغ ہے۔[۴۰]

صابی: ارض القرآن کی دوسری جلد میں ہمارے نزدیک سب سے اہم اور انتہائی بیش قیمت بحث صابئیت پر ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ تین بار آیا ہے، لیکن نام کے علاوہ اور کوئی وضاحت نہیں ہے کہ اس مذہب کے اصول کیا تھے، یہ کہاں پروان چڑھا، اس کا بانی کون تھا اور کس کے نام سے یہ فرقہ قائم تھا؟ حالاں کہ سید صاحب کے بقول دین حنیف جس کی جانشینی کا مذہب اسلام مدعی ہے اس کی حقیقت کا انکشاف بہت کچھ صابئی مذہب کے فہم و تشریح پر منحصر ہے، سید صاحب نے اس عنوان پر بہت توجہ دی اور تقریباً ۱۶ صفحے اسی لفظ کی بحث کے لیے صرف کیے، اس بحث کی قدر و قیمت کا اندازہ تو اس کے مطالعہ سے ہوتا ہے، ہم یہاں صرف یہ پیش کرتے ہیں کہ سید صاحب نے صابئی کے لفظ کی لغوی تحقیق کس طرح کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"لفظ صابئی کی لغوی تشریح بھی کس قدر تفصیل طلب ہے، کہتے ہیں کہ صبا، عربی لفظ صبغ کا آرامی تلفظ ہے صبغ، عربی لفظ صبغ کے ہم معنی ہے جس سے عربی میں دوسرا لفظ اصطباغ بنا ہے، اس کے اصل معنی نہانے اور دھونے کے ہیں اور اصطلاحاً بپتسمہ کے معنی میں بولا جاتا ہے، چوں کہ یہ فرقہ مذہباً دن میں کئی مرتبہ غسل کرتا ہے اس لیے ان کا آرامی نام صابئی پڑا اور اسی سے عربی میں آیا، لیکن ہمارے سامنے ایک لغوی تشریح اس سے زیادہ سہل اور بامعنی موجود ہے، اصل یہ ہے کہ سامی زبانوں میں صبا کا لفظ ستاروں کے کئی مفہوم میں عام طور سے مستعمل ہے، عبرانی میں اس کے معنی جماعت ستارگان کے ہیں، عربی میں صبا کے معنی ستارے کے طلوع ہونے اور نکلنے کے ہیں، چنانچہ قاضی بیضاوی نے صابی کا اشتقاق اسی لفظ سے کیا ہے۔"[۴۱]

حنفیت: صابئیت کے بعد سید صاحب نے حنفیت کو اختیار کیا اور اس سلسلہ میں ایک عمدہ بحث سامنے آئی حنفیت کے بارہ میں مفسرین کی رایوں میں ایک قسم کا تزلزل تھا، سید صاحب نے اس کی تشخیص میں بتایا کہ مفسرین نے لفظ حنیف کی لغوی تحقیق میں قرآن مجید سے اعانت نہیں لی۔ حنیف، حنف سے مشتق ہے، اور اس کے معنی ہٹنے اور ٹیڑھے ہونے کے ہیں، حالانکہ اسلام مذہب حق ہے اس لیے اس کے معنی سیدھے ہونے کے ہونے چاہیئے، مستشرقین نے اس لفظی نزاع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہ سریانی میں اس کے معنی کافر کے اور عبرانی میں منافق کے ہیں، چنانچہ ان لوگوں نے طعنہ دیا کہ مقدس پیروان محمدؐ نے اس کی لفظی تحقیق کی پروا نہیں کی اور مشورہ دیا کہ قبیلہ بنو حنیفہ کے جھوٹے پیغمبر مسیلمہ کے نام کو اس لفظ کا ماخذ بنائیں، یعنی یہ کہ مسیلمہ سے مسلم اور حنیفہ سے حنیف کا لفظ لیا گیا ہے۔ سید صاحب نے مستشرقین کے اس طنز کو محسوس کیا اور لکھا ہے کہ "مایہ ناز فرنگ نہ صرف آغاز تاریخ اسلام سے ناآشنا بلکہ آئین زبان

عرب سے بھی آگاہ نہیں، اصل یہ ہے کہ نری عربی دانی اور بات ہے اور اسلامی واقفیت اور چیز ہے ۔"[۴۲]

اس کے بعد سید صاحب نے حنیف کی لغوی تحقیق کی کہ "حنیف، حَنَفٌ سے مشتق ہے، عربی میں اس کے معنی مڑنے اور جھکنے کے ہیں، اس لئے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف سے جھک کر اور مڑ کر دوسری طرف جائے، یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں مستعمل ہو سکتا ہے اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر بری بات اختیار کی تو حنیف کے وہ معنی ہو سکتے ہیں جس میں عبرانی و سریانی میں وہ مستعمل ہے یعنی کافر و منافق کے، اور اگر یہ سمجھا جائے کہ برے کام کو ترک کر کے اس نے کوئی اچھا کام پسند کیا ہے تو اس کا مفہوم وہ ہوگا جس میں اہل عرب اس کو بولتے ہیں یعنی دیندار، خدا پرست، اس بنا پر اس لفظ کے اچھے یا برے مفہوم کی تعیین، موقع استعمال اور حرف صلہ سے ہوگی، اصل میں اس کا ابتدائی استعمال للہ یا للدین کی تخصیص کے ساتھ ہوتا تھا یعنی الحنیف للہ خدا کی طرف جھکنے والا، الحنیف للدین سچے مذہب کی طرف جھکنے والا، کثرت استعمال اور زبان زدگی عام سے اس قید کی ضرورت نہیں رہی اور مطلق حنیف کے معنی بھی حنیف للہ یا حنیف للدین ہی کے سمجھے جانے لگے چنانچہ قرآن مجید میں اس لفظ کا دونوں طرح استعمال ہوا ہے، سورہ حج میں ہے حنفاللہ لیکن سورۂ بیّنہ میں بغیر صلہ کے آیا ہے مخلصین لہ الدین حنفاء، یہاں حنفاء کے معنی حنفاء للہ سمجھنے چاہئیں ۔"[۴۳]

اس کے بعد سید صاحب ایک اور مثال سے اپنی بات کو واضح کرتے ہیں کہ "ہر زبان میں کثرت سے اس قسم کی مثالیں ملیں گی بلکہ اصطلاحات عموماً اسی طرح بنتی ہیں، مثال کے لئے حنیف کے ہم معنی لفظ مسلم کو لیجیے، مسلم کے اصل معنی سونپنے والے کے ہیں، کوئی شخص اپنے دوست کو کسی دشمن کے حوالے کر دے تو عربی میں اس کو مسلم کہیں گے اور یہ مذموم معنی ہوں گے، اس کا ابتدائی استعمال مسلم للہ اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دینے والا، جب کہ قرآن مجید میں ہے بلیٰ من اسلم وجهه لله لیکن کثرت استعمال سے صرف مسلم رہ گیا اور معنی وہی مسلم للہ کے سمجھے جائیں گے ۔ اب کسی کو یہ اندیشہ بھی ہوگا کہ اس کا کوئی برا مفہوم بھی ہے ۔"[۴۴]

حوالے : ۱۔ خطوط محمد علی ص ۸۴، ۹۶ ۲۔ عربوں کی جہاز رانی ۳۔ معارف سلیمان نمبر ۴ تا ۴۴۔ ارض القرآن جلد اول ص ۵۵-۵۹، ۶۱، ۷۶، ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۴۳، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۸۴، ۱۸۵، ۲۲۳، ۲۵۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۹۲، ۲۹۳، جلد دوم ۳۰، ۴۲، ۹۰، ۹۷، ۱۰۹، ۱۴۴، ۱۵۵، ۲۲۹، ۱۵۹، ۱۶۲، ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۹۲، ۲۰۳، ۲۰۹-۲۱۱۔

شفیق احمد ندوی ★

عربی ثقافت کے فروغ میں علمی کردار

برصغیر میں عربی ثقافت کی نشر و اشاعت کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ یہاں عربی ثقافت کا تصور اسلامی ثقافت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ "علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد"[1] کے علمی کارنامے عربی ثقافت کے فروغ میں بھی نمایاں ہیں، کیونکہ سیرۃ النبیؐ، سیرت عائشہؓ، حیات مالکؒ اور ترجمانیٔ قرآن کریم جیسے خالص اسلامی موضوعات کے ساتھ ساتھ خالص عربی زبان و ادب، عربی تاریخ، عربی تمدن اور عرب جغرافیہ کے موضوعات میں بھی وہ ہمہ تن منہمک رہے، اور اس طرح بقول اقبال ان کا وجود علم و فضل کا ایسا دریا بنا کہ جس سے سیکڑوں نہریں نکلیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہو سکیں۔[2]

شمع سلیمانی کے پرستاروں سے مخفی نہیں کہ عرب، عربی زبان و ادب اور دیگر عربی علوم سے سید صاحب کو دلچسپی فطرۃً ودیعت ہوئی تھی، وہ ۱۹۰۱ء میں ابتدائی عربی زبان و ادب کی تعلیم کے لیے تقریباً ۱۶ سال کی عمر میں ندوہ آئے، اور "المؤید" اور "اللواء" جیسے عربی اخبارات کے مطالعہ میں غرق رہے۔[3] ۱۹۰۲ء میں نواب محسن الملک کی شان میں ایک عربی قصیدہ کہا تو محسن الملک نے ایک عربی اخبار منگایا اور اس کے ایک مضمون کی طرف اشارہ کیا، سید صاحب اسے بے اختیار پڑھنے لگے، اور پوچھے جانے پر مطالب بھی صحیح صحیح بتانے لگے۔ نواب محسن الملک اور دیگر حضرات بہت خوش ہوئے[4] اور سید صاحب کے اندر مطالعہ کا مزید شوق پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں انھوں نے ابوتمام کے دیوان الحماسہ کے بعض اشعار کا ترجمہ "معشوقۂ عرب کی یاد میں"[5] کے عنوان سے رسالہ مخزن لاہور کو بھیجا جو اس میں شائع ہوا۔

مارچ ۱۹۰۶ء میں ندوہ کا پہلا جلسۂ تقسیم اسناد تھا، رفاہِ عام ہال لکھنؤ میں مولانا شبلی نے اچھے طلبہ کی تقریریں بھی پروگرام میں شامل رکھیں، سید صاحب تقریر کے لیے اٹھے، تقریر شروع ہوئی تو ایک صاحب بولے، تقریر عربی زبان میں ہوتی تو بات تھی، مولانا عبدالحی صاحب نے پوچھا کہ آیا وہ عربی میں تقریر کر سکتے ہیں؟ یہ بات سنتے ہی سید صاحب عربی میں بھی اسی قوت گویائی سے بولتے رہے۔ مجمع یک گونہ خوشی اور تاثرات میں ڈوب گیا۔ اس کے بعد مولانا شبلی نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اس طالب علم کے بارے میں اگر

★ شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

کسی کو یہ بدگمانی ہو کہ یہ تقریر رٹی ہوئی تھی تو رفع بدگمانی کے لیے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت کوئی نیا موضوع دے سکتے ہیں' یہ انشاء اللہ اس پر بھی تقریر کر سکیں گے"، یہ سنتے ہی خواجہ غلام الثقلین نے جو اس وقت لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے ایک نیا موضوع فی الفور دیا اور سید صاحب پہلے کی طرح گرم گفتار ہوگئے، ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی، مشفق استاد (علامہ شبلی) نے جوش مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر نوخیز شاگرد کے سر پر باندھ دیا۔[۳]

کلکتہ ہائی کورٹ کے جج مولوی سید شرف الدین کو اطلاع ملی کہ ندوہ کے طلبہ عربی میں فی البدیہہ تقریر کرتے ہیں تو وہ بھی ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کو بیرسٹر شاہد حسین اور بیرسٹر سلطان احمد کے ساتھ ندوہ تشریف لائے۔ ندوہ نے ان کی خواہش کے احترام میں طلبہ کی بزم خطابت کا انعقاد کیا، جج موصوف نے "گورنمنٹ اور رعایا کے تعلقات" کے موضوع پر گفتگو سننا چاہی، سید صاحب نے نہایت برجستگی اور روانی کے ساتھ تقریر کی اور تمام حاضرین جلسہ دم بخود رہ گئے، بعد میں یہ واقعہ "الندوہ" میں شائع ہوا۔ مولوی شرف الدین کی خوشی کی انتہا نہ رہی، وہ سید صاحب کی عربی زبان دانی، وسعت خیال اور قدرت خطابت کے قائل ہوئے، ان کا یہ تاثر نومبر ۱۹۰۶ء کے "الندوہ" میں شائع بھی ہوا۔ سید صاحب کی ان کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے سید فخر الحسن ہاسپٹل اسسٹنٹ راجپوتانہ نے انھیں تعلیم عربی زبان کی تکمیل کے لئے مصر اور دیگر عرب ممالک میں ندوۃ العلماء کی طرف سے وظیفہ دیکر بھیجے جانے کا پرزور مشورہ دیا۔[۴] اسی بناء پر ستمبر ۱۹۰۸ء میں سید صاحب کو "الندوہ" کی ادارت کے ساتھ ساتھ دار العلوم ندوۃ العلماء میں عربی انشاء کا استاد مقرر کیا گیا۔

۱۹۱۲ء میں سید صاحب کی پہلی کتاب "دروس الادب" ۲ جلدوں میں شائع ہوئی، یہ کتاب عرصہ تک عربی مدرسوں کے نصاب میں داخل رہی۔[۵] ۶ر اپریل ۱۹۱۳ء میں مشہور مصری عالم سید رشید رضا ندوہ تشریف لائے، ان کی صدارت میں ایک جلسہ دار العلوم میں منعقد ہوا اور سید صاحب نے صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی کی رپورٹ پیش کی۔[۶] سید صاحب درحقیقت علامہ شبلی کے معاون عربی ہی تھے، سیرت پاک کی تالیف کے زمانہ میں کچھ عرصہ کے لئے وہ ندوہ کی مدرسی سے سبکدوش ہو کر سیرت پاک کے اسٹاف میں منتقل ہوئے اور ان کا کام عربی کتابوں سے سیرۃ النبیؐ کے مواد کی فراہمی رہی۔[۷]

مئی ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں جمعیۃ خلافت کا وفد سید صاحب کی قیادت میں سلطان عبد العزیز کی دعوت پر حجاز مقدس گیا۔ اس مہم میں سید صاحب کو بہت سے اہم موڑ اور نازک مواقع پر عربی میں کلیدی تقریر کرنے کا موقع ملا۔

سید صاحب اور شیخ تقی الدین الہلالی کی نظامت اور مولانا مسعود عالم ندوی کی ادارت میں ندوہ

کے مشہور عربی ماہنامہ "الضیاء" کا پہلا شمارہ مئی ۱۹۳۲ء میں سید صاحب کے مفصل افتتاحیہ بعنوان "طلوع الضیاء" کے ساتھ شائع ہوا۔[۸] اور پھر سید صاحب کو اس میں اپنی عربیت کے جوہر دکھانے کا موقع ملتا رہا۔

مولانا شوکت علی کی دعوت پر دہلی میں فلسطین کانفرنس نومبر ۱۹۳۶ء میں سید صاحب ہی کی صدارت میں منعقد ہوئی خطبہ صدارت جو اس موقع پر سید صاحب نے پیش فرمایا تمام عربی دنیا میں بے حد مقبول ہوا۔ مشہور عربی اخبارات نے اسے شائع کیا، مفتی دیار فلسطین امین الحسینی نے خصوصی طور پر بذریعہ تار سید العلماء کا شکریہ ادا کیا۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں ابن سینا کے ہزار سالہ یادگار میں شرکت کے لئے حکومت عراق نے سید صاحب کو دعوت نامہ بھیجا لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے سفر نہ ہو سکا۔ اسی سال مصر کے المجمع العلمی الادبی میں سید صاحب کو بحیثیت رکن منتخب کیا گیا۔[۹] سید العلماء کی عربیت اور عربی علوم و فنون میں ان کے کمال کا ثبوت اس سے بڑا اور کیا ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال عربی زبان و ادب اور عربی علوم و فنون کے سلسلے میں ان سے برابر استفادہ کرتے رہے، سید صاحب کے نام اقبال کے خطوط زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں، مثال کے طور پر اقبال کے تین خطوط کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے سید صاحب کے نام لاہور سے ۲۲ر اگست ۱۹۲۳ء، ۱۰ر مارچ ۱۹۲۸ء اور ۲۶ر ستمبر ۱۹۳۳ء کو لکھے تھے اور جن میں ابن عربی، امام رازی اور بعض عربی الفاظ کے مادے اور اشتقاق وغیرہ کے سلسلے میں استفسارات ہیں۔[۱۰]

"لغات جدیدہ" عربی زبان کے طلبہ کے لیے نئے عربی الفاظ کی ڈکشنری سید صاحب نے ترتیب دی جو ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی بعد کے طبعات میں مولانا مسعود عالم ندوی کے قلم سے رائج الوقت عربی تراکیب و تعبیرات پر بھی ایک مفصل بحث کتاب کے شروع میں شامل کر دی گئی۔ الفاظ کے انتخاب میں عالم عربی کے اپنے زمانے کے چلن کو بالخصوص پیش نظر رکھا گیا ہے، گو کہ اب نئے زمانے کے بدلتے ہوئے لغوی معیار کے پیش نظر اس کام میں کافی نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاہم زمانۂ گزشتہ کے حالات و وسائل کو دیکھتے ہوئے اولیت اور اولویت کے سہرے سید صاحب ہی کے سر رہیں گے۔

"تاریخ ارض القرآن" عرب کی جغرافیائی تحقیق پر مشتمل ہے" اس میں یونانی رومی اسرائیلی مصری عربی روایات کے متعلق محققانہ بحث ہے اور عرب کے قبل نزول قرآن اور بعد نزول قرآن کے صوبوں کا جغرافیہ درج ہے۔ کتاب میں ان مغربی تحقیقات کی معقول دلائل سے تردید ہے جن سے غلط اور متعصبانہ نتائج نکلتے ہیں۔ جلد دوم میں سلسلۂ ابراہیمی کے اس حصے کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے جس کا تعلق بالخصوص قرآن مجید سے ہے، اس ضمن میں سید صاحب نے تحقیق و تلاش اور وسعت معلومات کے وہ جواہر ریزے اس کتاب میں جمع فرما دیئے ہیں کہ برسوں کے مطالعے کے بعد بھی اس کے سوا کہیں اور سے

تشنہ کامان علم اپنی پیاس نہیں بجھا سکتے۔ آلِ ابراہیم کے سلسلے میں سید صاحب نے تمام اہم مسائل پر محققانہ بحث کی ہے جس میں بطور مثال عرب کی تجارت، قبل اسلام عرب کی زبانیں، قبل از اسلام عرب کے ادیان اور قرآن مجید، سلسلہ ابراہیمی کی کل قوموں کے تمدنی، مذہبی اور معاشرتی سوانح وحالات جنکا تعلق قرآن مجید سے ہے اس میں موجود ہیں۔

"عربوں کی جہاز رانی" سید صاحب کے ان چار خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مارچ ۱۹۳۰ء میں اسلامک ریسرچ ایسوی ایشن بمبئی کی فرمائش پر انجمن اسلام ہال میں دیئے۔ اس میں سب سے پہلے دیار عرب کا قدرتی جغرافیہ بتایا گیا ہے پھر عہدِ جاہلیت میں عربوں کی جہاز رانی کی تفصیل ہے، اس کے بعد بحریات کے عربی الفاظ، عربی اشعار میں بحریات، قرآن پاک میں بحریات اور عہد نبوت میں عربوں کے بحری سفر کا تذکرہ ہے۔ بعض دیگر ذیلی عنوانات عبارت ہیں نہر سوئز کے تخیل، عربوں کے مشہور بندرگاہ، ہندوستان پر بحری حملے، مشرقی تجارتی جہازوں کے راستے، ہندوستان اور دیگر مشہور ممالک کے بندرگاہ، عربوں کا سمندروں کے بارے میں علم، عرب جہاز رانوں کی علمی تحقیق، واسکوڈی گاما کا عرب رہنما، ستاروں، ہواؤں اور جغرافیہ کی کتابوں، قطب نما، اور دیگر فلکی آلات، جہاز سازی اور اس کے کارخانے، ڈوبے ہوئے جہازوں کو نکالنے کی تدابیر، بحر ہند وعرب کے راستے اور بندرگاہ اور عربوں کی بحری تصنیفات سے۔

"عرب وہند کے تعلقات" سید صاحب کی وہ معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں ان کی عربیت کے جوہر بتمام وکمال واشگاف ہوئے اور نکھر کر سامنے آئے۔ یہ درحقیقت ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں دیئے گئے پانچ لیکچرس کا مجموعہ ہے جو درج ذیل عنوانات کے تحت ۱۹۲۹ء میں ہوئے تھے۔

عرب ہند تعلقات کے آغاز اور ہندوستان کے عرب سیاح ، عرب وہند کے تجارتی تعلقات ، عرب وہند کے علمی تعلقات ، عرب وہند کے مذہبی تعلقات ، ہندیں، فتوحات سے پہلے کے مسلمان ۔

اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ قوم صرف چند ہزار سال پہلے ایشیائے وسطیٰ سے پنجاب میں وارد ہوئی اور پھر آگے بڑھ کر دوآبہ گنگ وجمن میں پھیلی۔ اس کے برخلاف عرب قوم کا تعلق ہندوستان سے صرف چند ہزار برس کا نہیں، بلکہ ابتدائے آفرینش سے ہے۔ یہ ملک ان کے پدری وطن کی طرح ہے کیونکہ آدم علیہ السلام اسی غیر منقسم ہندوستان جنت نشاں میں سراندیب (لنکا) میں اول اول اترے جن کے قدم کے نشانات بھی لوگ وہاں کے ایک پہاڑ پر موجود بتاتے ہیں۔ ابن جریر وغیرہ کے حوالے سے اس سرزمین کا نام دجنا بتایا جاتا ہے جو غالباً دکھنا یا دکھن یا بالفاظ دیگر جنوبی ہند رہا ہوگا۔ آزاد بلگرامی کی سبحۃ المرجان کے حوالے سے سید صاحب نے لکھا ہے کہ جب آدم علیہ السلام سب سے پہلے ہندوستان میں اترے اور یہاں

ان پر وحی آئی، تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہی وہ ملک ہے جہاں خدا کی پہلی وحی نازل ہوئی، اور چونکہ نور محمدیؐ حضرت آدم علیہ السلام کی پیشانی میں امانت تھی اس لئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کا ابتدائی ظہور اسی سرزمین میں ہوا، اسی لئے آپؐ نے فرمایا کہ "مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے۔" یہ روایتیں بقول سید صاحب فن حدیث کے لحاظ سے کتنی بھی ہوں تب بھی یہ اندازہ کم از کم ہو ہی سکتا ہے کہ عام طور سے جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا تعلق ہندوستان سے محمود غزنوی کی فتوحات کے سلسلے میں ہوا اور وہ اس کے بعد یہاں آکر آباد ہوئے کس قدر غلط ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ملک ان کا مفتوحہ ملک نہیں بلکہ ان کا اپنا موروثی وطن ہے۔ محمود سے سینکڑوں برس پہلے سے مسلمان یہاں آباد ہیں اور بہت پہلے سے جگہ جگہ ان کی نو آبادیاں قائم رہی ہیں۔

اسلام کے بعد عربوں اور مسلمانوں میں نسبی حیثیت سے آل رسولؐ کا احترام مسلم ہے، جن میں موجودہ خاندانوں کا بہت بڑا حصہ حضرت امام حسینؓ کے صاحب زادے حضرت امام زین العابدینؒ کی نسل سے ہے جبکہ امام زین العابدینؒ کی ماں عرب نہ تھیں، ایرانیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ایرانی تھیں، مگر ابن قتیبہ کی کتاب المعارف اور ابن خلکان کے تذکرۂ علیؓ بن حسینؓ بن زین العابدینؒ کے مطابق وہ سندھی تھیں، اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے ماننے میں کیا عذر ہو سکتا ہے کہ عرب و اسلام کے سب سے شریف و مقدس خاندان کے پیدا کرنے میں ہندوستان کا بھی حصہ ہے، اور یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ سادات آل زین العابدین علی ہمیشہ سے نیم ہندوستانی ہیں۔"

سید العلماء کے علمی ورثے پر اچٹتی سی اس نگاہ کے بعد بالآخر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عربی ثقافت کو ہندوستانی فضا میں محبوب بنانے کا کام جس فراست و حکمت کے ساتھ بالواسطہ انداز پر سید صاحب نے انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے، دوسرے لوگوں نے تو ان کے بعد اس کی خوشہ چینی ہی کی ہے، اور اس حیثیت سے برصغیر میں عربی ثقافت کے فروغ وارتقاء میں سید صاحب کا کردار بلند سے بلند تر اور مہتم بالشان ہے۔

حوالے : ۱ ۔ اقبال نامہ، حصہ اول ص ۱۶۶
۲ ۔ طاہر تونسوی، اقبال اور سید سلیمان ندوی ص ۹۷
۳ ۔ حیات شبلی ص ۴۵۷
۴ ۔ الندوہ دسمبر ۱۹۰۶ء
۵ ۔ حیات سلیمان ص ۴۳
۶ ۔ حیات شبلی ص ۴۴
۷ ۔ حیات سلیمان ص ۴۷
۸ ۔ شمس تبریز خان، تاریخ ندوۃ العلماء، دوم ص ۴۲۲
۹ ۔ حیات سلیمان ص ۵۹۷
۱۰ ۔ طاہر تونسوی، اقبال اور سید سلیمان ندوی ص ۹۷، ۸۶، ۱۰۳
۱۱ ۔ عرب و ہند کے تعلقات ص ۴

اختر سعید خاں*

شعری آہنگ

علامہ سید سلیمان ندوی کے شعری آہنگ سے پہلے پہل میری شناسائی جس سحر آفریں عبارت سے ہوئی تھی وہ ایک "نووارد شاعر" کا تعارف تھا۔ میں نے یہ تحریر عمر کے ہر دور اور زبان و ادب کے ہر موڑ پر پڑھی ہے لیکن اس کے طلسم سے آج تک آزاد نہیں ہو سکا ہوں۔ فرماتے ہیں: "جی چاہا شاعر صاحب سے کچھ سنا جائے اور ان کے دعوائے سخنوری کا امتحان لیا جائے، سب کی نظریں ایک خاص تبسم کے ساتھ شاعر کی طرف اٹھیں مگر اس نے ماحول سے بے پروا ہو کر ایک عجیب درد انگیز ترنم، مست لہجے اور سرشار انداز میں ایک غزل کا ترانہ چھیڑا، ایک دو شعر پڑھے تھے کہ سب کو سنبھل جانا پڑا۔ ذہن کی رو کو ظرافت سے متانت کی طرف پھیرنا پڑا۔ تبسم کی نگاہ میں تحیر پیدا ہوا، سامعین کے لبوں میں لرزش پیدا ہوئی، لرزش آواز میں اور آواز احسنت و مرحبا کی صدائے تحسین میں بدل گئی۔ نووارد نمائش اور داد طلبی کی ہر ادا سے بے نیاز دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود سراپا اثر بنکر جب سامنے آیا تو مصر سخن کے سب جادوگر بیک دفعہ چلا اٹھے آمنا برب ہارون و موسیٰ یہ کلیم سخن کون تھا؟ جگر مرادآبادی۔ شاعر ایک تھا مگر اس کے اثر نے ہر خاموش کو شاعر اور ہر شاعر کو خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے۔ وہ محبت کا متوالا ہے اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بتخانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو اور صنم خانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے:"

یہ نثر نہیں شعر ہے، اور شعر بھی غزل کا۔ غزل جو اردو زبان کی شناخت بھی ہے اور وقار بھی، یہ مہکتی ہوئی فکر اور لپکتا ہوا انداز نگارش ایک ایسے خلاق ذہن کا آئینہ ہے جو کارگاہ عالم میں قدرت کی طرف سے شاعر کا دل لیکر آتا ہے اور ابدیت کے اوراق پر نقوش دوام چھوڑ جاتا ہے۔

"نقوش سلیمانی" کا مصنف طبعاً شاعر تھا۔ اور اس کے چھوڑے ہوئے ہر نقش میں شعریت کی زیریں لہر رخشاں و رقصاں نظر آتی ہے۔ "سیرۃ النبیؐ" "سیرتِ عائشہؓ" اور "حیات مالکؒ" کے مصنف اور بقول علامہ اقبال "علومِ اسلامی کی جوئے شیر کے فرہادؒ" کے شاعر ہونے پر تعجب کا مقام نہیں۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتا تو تعجب ہوتا

---

* ایڈوکیٹ، نزد مسجد شکور خاں، بھوپال

یہ سچ ہے کہ اہلِ علم نے علوم دینیہ اور فلسفہ وحکمت کے مقابلے میں شعر کو کم رتبہ قرار دیا ہے، اور شاید اسی لئے علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی نے شاعری کو اپنے دسترخوانِ علم وفضل کی چٹنی سے زیادہ اہمیت نہیں دی، اور اسی لئے سید صاحب نے جس طرح اپنے دوسرے کمالاتِ علمی کو درجۂ استناد تک پہونچا دیا۔ شاعری کو پایۂ اعتبار تک پہنچانے کے قابل نہیں سمجھا۔ تاہم ایک بیدار دل اور درّاک ذہن جب کسی فن کی شاہراہ سے سرسری بھی گزرتا ہے تو اس کے قلم کا خرام گل کتر جاتا ہے۔

سید صاحب نے عنفوانِ شباب میں شاعری کی وادی میں قدم رکھا، جب بقول میر ؏

میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

لیکن وہ ندوۃ العلمار کے طالبعلم تھے جس کا ماحول علمی اور دینی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ دوسری طرف لکھنؤ کی مروجہ غزل تھی جو گویک قلم خارجِ آداب وقار وتمکین۔ ان کی تربیت ذہنی اور تہذیب نفس کی گہوارہ جنبانی ندوہ کے ہاتھوں میں تھی، لیکن ان کے کانوں میں امیرؔ اور ان کے متبعین کی آوازیں گونج رہی تھیں ؏ ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر، کے مصداق یہ زمانہ سید صاحب کے لیے بڑی کشمکش کا رہا ہوگا۔ یہ باور کرنا تو محال ہے کہ جب وہ یہ کہہ رہے تھے ؏

پہلے تو چھیڑتے تھے تصور میں بار بار   اب کیوں شبِ وصال میں شرمائے جاتے ہیں
یا
اڑا لیتے ہو دل تم عاشقوں کا باتوں باتوں میں   نیا انداز سیکھا ہے یہ تم نے دل اڑانے کا!

تو دورِ ایامِ جوانی، چنانکہ افتد و دانی، کا مرحلہ درپیش تھا۔ یا ہوائے شوق کا کوئی جھونکا ان کا گہوارہ ہلا جاتا تھا، لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ لکھنؤ کے عام مذاقِ شعری خصوصاً امیرؔ مینائی کے رنگِ تغزل نے سید صاحب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کے یہ اشعار:

بجلی کی طرح قبر پہ آئے چلے گئے ——— اب تک ہمارے دل کو وہ تڑپائے جاتے ہیں
دستِ نازک نے اٹھاتے ہیں وہ میت میری   بعد مرنے کے ٹھکانے لگی محنت میری

امیرؔ سے شیفتگی کی یادگار ہیں۔ ان اشعار میں تو سید صاحب نے توازن و اعتدال کو برقرار رکھا ہے لیکن لکھنوی مذاقِ شعری کی شوخی و رنگینی اور خارجی معاملاتِ حسن وعشق انہیں وہاں تک کھینچ لے گئے جہاں ان کے قلم سے اس قسم کے شعر نکل گئے ہیں ؏

کل شب مرے نہ آنے سے خفگی سہی مگر ——— ہے کیوں نگاہ ناز مگر شرمسار آج!
دستِ گستاخ کو اجازت دو   منہ سے کھل کر کہا نہیں جاتا
وہ رفتہ رفتہ اور بھی دیں گے اجازتیں ——— ان کے گلے میں ہاتھ حمائل تو ہو گئے

سوال یہ ہے کہ یہ بے جھجک واقعہ نگاری اور انجانے در و بام سے ٹکرا کر واپس آنے والی صدائیں سید صاحب کے تصرف میں کس طرح آئیں؟ اس کا جواب بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ شاعری کی دنیا میں ایک نو وارد کو کچھ دن اسی باغ کی سیر کرنی ہوتی ہے جس کے سبزے کی لہلہاہٹ پر خاص و عام لوٹ پوٹ ہوتے ہیں، اور انھیں آوازوں میں آواز ملانی ہوتی ہے جو اپنے عہد میں فردوس گوش ہوتی ہیں۔ خود اقبال جیسے عظیم مفکر نے جب شاعری کی ابتدا کی تو شاگردی داغؔ کی اختیار کی اور اسی رنگ میں شعر بھی کہے ع

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا   تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولے   خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

آج کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ اشعار اسی اقبالؔ کے ہیں جو طلوع اسلام، خضر راہ، مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، میلاد آدم، ساقی نامہ اور ابلیس کی مجلس شوریٰ جیسی لافانی نظموں کا خالق ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے اور زمانہ اپنے شاعروں اور ادیبوں کے قلم سے اپنی تاریخ آپ مرتب کرتا ہے، لکھنؤ کی تاریخ گہرے اور شوخ رنگوں سے مرتب ہوئی تھی، دلی جب اجڑ رہی تھی تو لکھنؤ آباد ہو رہا تھا، دلی میں جب یہ عالم تھا کہ ع

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں   تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

تو لکھنؤ سے آواز آ رہی تھی:

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو   ہر اک گھر خانۂ شادی ہے ہر اک کوچہ ہے عشرت کا

لکھنؤ میں ان دنوں ہن برس رہا تھا اور دولت کی فراوانی نے تعیش کی راہیں کھول دی تھیں۔ پورا معاشرہ عیش کوشی اور لذت اندوزی کو زندگی کا اصل مقصد سمجھے ہوئے تھا۔ شاعری پر اس کے جو اثرات پڑنے تھے وہ قدرتی طور پر پڑ کر رہے۔ ہر چند کہ میرؔ اور سوداؔ اس دور میں دلی سے ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ آ بسے تھے اور فن شعر میں اہل لکھنؤ ان کی عظمت کے قائل تھے، لیکن لکھنویت نے نہ میرؔ کے عرفانِ غم کو قبول کیا نہ سوداؔ کی دیدہ وری کو۔ معاشرے کی خوش فعلیوں اور رنگ رلیوں نے شاعری میں داخلیت کو خارجیت اور فطرت کو صنعت سے بدل دیا، اور زبان کو سادگی و برجستگی کے بجائے تکلف و تصنع کا لباس پہنا دیا، اور اب یہی شعر کا معیار قرار پایا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اودھ کی سلطنت اس کے حکمرانوں کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن اودھ کے شعرا کے ہاتھ سے لکھنوی رنگ تغزل کی زمام نہ چھوٹی۔ شاعری بادشاہوں کی سرپرستی سے نکلی تو تعلقہ داروں اور جاگیر داروں کے زیر سایہ آ گئی، اور پھر حسرت موہانی کے عہد تک اس نے اپنے معانی و بیان سے انحراف نہیں کیا، اپنی بگڑی ہوئی جمالیاتی شکل اور خارجی متعلقات حسن و عشق کے

بیان کے باوصف لکھنوی رنگ تغزل معاشرے میں اس درجہ رچ بس گیا تھا کہ وہ محفل رنداں ہی میں نہیں صلحاؤں کی مجلسوں میں بھی بار پاچکا تھا۔ جب کوئی اسلوب سخن اس درجہ پایہ اعتبار کو پہونچ جائے تو تازہ واردان بساط شعر کا خود کو معتبر ٹھہرانے کے لئے اسے اختیار کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ سید صاحب کے ابتدائی رنگ سخن کو ہم تقلیدی اور رسمی شاعری کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے اس نوع کے اشعار میں اس معاشرے کے خدوخال کو دیکھا جا سکتا ہے جو معاشرہ کبھی تھا اور جس نے ہماری تہذیبی اقدار کی تعمیر اور تخریب میں اہم رول ادا کیا ہے۔

سید صاحب نے ۱۹۰۲ء میں شاعری شروع کی تھی اور ۱۹۱۲ء تک وہ داغ اور میر کے اثرات سے آزاد نہ ہو سکے۔ لیکن دس سال کی ابتدائی مشق کے بعد انہوں نے اس رنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس عرصہ میں وہ علمی دنیا میں روشناس ہو چکے تھے۔ انہوں نے علم کو محض علم کے لئے حاصل نہیں کیا تھا اور نہ یہ ان کا عقیدہ تھا۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور انہوں نے اپنی روشن خیالی کے چراغ زندگی کے راستوں میں جلانا شروع کر دیئے تھے۔ ان کی شاعری اب بھی ضمنی حیثیت رکھتی تھی لیکن اسکی صورت بدل چکی تھی۔

علمائے فرنگی محل کے اثر و نفوذ اور دوسرے علمار کی مساعی سے علوم قدیم کے احیاء نے معاشرے کو بڑی حد تک متاثر کیا اور شاعری پر بھی اس کا خاطر خواہ اثر مرتب ہوا، شعر و ادب کی زبان میں تبدیلیاں آئیں، اور موضوعات میں تنوع پیدا ہوا، مذہبی تصورات جو تصوف کے ذریعہ ابتدا اردو شاعری میں داخل ہوئے تھے اور لکھنویت نے جنھیں خارج از شعر قرار دے دیا تھا، دوبارہ نظر آنے لگے۔ قومی حمیت اور ملی احساسات جن سے شعرا کا رشتہ ٹوٹا ہوا تھا، شعر میں اپنی جگہ بنانے لگے۔ حسن و عشق کے فطری جذبات نے خارجی لوازم کو خیرباد کہنا شروع کر دیا، تشبیہ و استعارہ، اشارت و کنایت سب میں وزن و وقار پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ رسم عاشقی کے آداب بدلنے لگے، تو سید صاحب نے طرز کہن پر اڑنے کے بجائے خود کو نئے اسلوب سخن میں ڈھال لیا۔ اب ان کی سیرگاہ امیر کا صنم خانۂ عشق نہ تھی، غالب کا شہر آرزو تھا جہاں یہ دشت امکاں تمنا کے ایک قدم سے زیادہ نہ تھا ؎

عجب طرح کا یہ اک پیچ گفتگو میں ہے — وگرنہ "میں" میں وہی بات ہے جو "تو" میں ہے
ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں — پتہ جو مل نہ سکا تیری جستجو میں ہے

ان اشعار کا آہنگ وہی ہے جو غالب کے فکر انگیز اشعار کا ہے، اور ان میں وہی بصیرت ہے جو غالب کی متاع ہے۔ پہلے شعر میں من و تو کے امتیاز کو گفتگو کا پیچ کہکر سید صاحب نے اس قدیم بحث کا رخ بڑے

اچھوتے اور شاعرانہ انداز میں موڑ دیا ہے۔ بحث اب 'من و تو' کی نہیں اس تیج کی ہے جو گفتگو میں پڑ گیا ہے۔ دوسرے شعر میں وہ غالبؔ کے قریب سے ہو کر گزر گئے ہیں۔ غالبؔ کا شعر ہے:

ہے کائنات کو حرکت ترے ذوق سے　　　پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

اسی غزل میں سید صاحب نے ایک شعر ایسا کہہ دیا ہے کہ اگر وہ کچھ اور نہ کہتے تو بھی یہ شعر انہیں ایک شاعر کی حیثیت سے زندہ رکھنے کے لئے کافی تھا۔ فرماتے ہیں ؎

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں　　　وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

اس کرۂ ارض پر جب سے انسان کے شعور نے آنکھ کھولی ہے اور حق و باطل کے فرق کو محسوس کیا ہے اور جب سے اس کے خون گلو نے حق کی حمایت سیکھی ہے، اسے صداقت کے قاتل مقتل میں کھینچ لے گئے ہیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ع بوئے گل ٹھہری ہے نہ بلبل کی زبان ٹھہری ہے، یہ تصادم آج بھی جاری ہے اور اس شعر کی معنویت و تاثیر قطرۂ خوں کو رگِ گلو میں موجزن رکھنے کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔

میر تقی میرؔ نے تہذیب عشق کا ایک بڑا ہی خوبصورت مرقع پیش کیا ہے ؎

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے　　　عشق بن یہ ادب نہیں آتا!

اس کے برعکس سید سلیمان کے اضطراب دل کا یہ عالم تھا کہ ؎

چین سے بیٹھنے دے گی نہ یہ ہم دونوں کو　　　تجھ کو یہ شوخی تری مجھکو یہ وحشت میری

لیکن ۱۹۲۷ء تک پہونچتے پہونچتے ان کے تمکین وضبط کی کیفیت یہ ہے ؎

تمہیں کو کس طرح میری محبت کا یقیں آئے　　　قسم تک تو تمہارے نام کی میں کھا نہیں سکتا
لب خاموش بھی بیگانہ ہے راز درونی سے　　　کوئی حرف اس تمنا کا لبوں تک آ نہیں سکتا
جو تنہائی بھی حاصل ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا　　　کہ صورت دل کی خلوت میں بھی میں دکھلا نہیں سکتا

یہ اشعار صرف تہذیب عشق کے پاسدار نہیں ہیں، فطری جذبات کا موثر اظہار ہیں، اور محبت کرنے والے دلوں کو دھڑکنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔

سید صاحب کی شاعری کی عمر جیسے جیسے بڑھتی گئی ان کے جذبات میں مفکرانہ ضبط اور خیالات میں رفعت پیدا ہوتی گئی ہے، ان کا پیرایۂ اظہار زیادہ صاف اور برجستہ ہو گیا ہے اور زبان و بندش میں زیادہ صفائی اور چستی نظر آتی ہے۔ ۱۹۳۶ء اور اس کے بعد کے چند اشعار دیکھئے:

عقل کہتی ہے کہ ناداں نہ ہو گمراہ نہ ہو　　　عشق کہتا ہے کہ کیا لطف اگر چاہ نہ ہو
ـــــــــــ
یہ دل وہ شیشۂ نازک ہے میرے سینے میں　　　نظر سے بھی جو گرے پاش پاش ہو جائے
ـــــــــــ

نگاہ شوق ذرا دیکھ بھال کر اُٹھے ـــــ چھپا ہے راز جو دل میں نہ فاش ہو جائے
الٹا مجھی سے ترکِ ملاقات کا گلہ ـــــ طرزِ ستم نئی ہے تغافل شعار آج!
یہ آبگینے مجھ کو نہایت عزیز ہیں اے خار دشت آبلہ کوئی نہ ٹوٹ جائے
نازک بہت ہے عشق و محبت کا آئینہ سایہ پڑے بھی غیر کا اس پر تو ٹوٹ جائے

یہ اشعار سید صاحب کے معاصر شعراء میں سے کسی بھی اچھے شاعر کے لئے سرمایہ ناز ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر آخری شعر جس کے مجازی اور حقیقی دونوں پہلو بڑے پاکیزہ اور لطیف انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔

سید سلیمان ایک خود آگاہ انسان تھے اور اقبالؔ کی طرح عظمت انسانی کے قائل، شاعری میں انسان کی بے مائگی شعراء کا پسندیدہ موضوع رہا ہے، خدائے سخن میرؔ اپنی بے چارگی کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں ؎

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے رات کو رو رو صبح کیا، اور دن کو جوں توں شام کیا

لیکن سید صاحب اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ آسمان و زمین کو انسان کیلئے مسخر کیا گیا ہے، وہ اپنی ہستی کو اتنا بے اصل نہیں سمجھتے، وہ انسان کو تخلیق کا حاصل جانتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

میرے انوار تجلی سے فضا پر نور ہے میں جو ہوں مسرور تو سارا جہاں مسرور ہے

۱۹۴۳ء کے بعد سید سلیمان کی شاعری مشاہدۂ حق کی گفتگو ہے، جب وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہو چکے تھے، بیعت سے پہلے ان کی دلی کیفیت کچھ ایسی تھی ؏

لب پہ ہے نام خدا دل میں ہے سودائے صنم ـــــ مجھ کو اللہ کرے، دیکھنا اللہ نہ ہو
آنکھ میں توبہ کے آنسو دل میں اس بت کی ہوس ہائے گنگا جل کو کیسے کوثر و زمزم کروں

اور ذہن میں کچھ اس قسم کے سوالات ابھر رہے تھے ؏

شکست رونق بتخانہ ہو نہیں سکتی خلیل خود ہی اگر بت تراش ہو جائے

اسی عالم میں وہ مرشد کے آستانے پر پہونچ کر پکار اٹھے ؏

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے

اور پھر اس ساز پر عشق مجازی کا کوئی ترانہ نہیں چھیڑا گیا اور آخری سانس تک مولانا سید سلیمان کی شاعری کے جام سے معرفت کی مے چھلکتی رہی۔ ان کا عارفانہ کلام صوفیانہ شاعری کو اپنے دائرے میں لئے ہوئے ہے، صوفیانہ شاعری جس میں شیخ کا تصور خانقاہ سے تعلق اور چشم ساقی کے لطیف اشارے اپنی پوری کیفیت اور گہری معنویت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ تصوف کو "برائے شعر گفتن خوب است" کہہ کر شاعری

کے ایک موضوع کی نشاندہی ضرور کی گئی ہے لیکن خود تصوف کے بارے میں اس سے کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔ ہماری صوفیانہ شاعری میں تصوف دو وسیلوں سے آیا ہے، ایک فلسفیانہ نکتہ سنجی ہے، دوسرا حال وقال۔ فلسفیانہ یا حکیمانہ تصوف کی فضا کا تعلق دماغ سے ہے اور حال وقال کا دل سے۔ حالاں کہ دماغ اور دل کی تقسیم خود شاعرانہ عمل ہے، لیکن اظہار مطالب کے لئے اس تقسیم کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے، حکیمانہ تصوف کے لئے صاحبِ حال ہونا ضروری نہیں ہے لیکن صاحب حال کے لیے بیدار دل کے ساتھ بیدار ذہن کی بھی ضرورت ہے، ورنہ قدم کے غلط پڑ جانے کا ڈر ہے۔

سید سلیمان کی شاعری میں تصوف بطور مسئلہ کے نہیں ہے۔ تصوف کی راہ سے قلب پر جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں ان کا بیان ہے، اس لئے ان کی صوفیانہ شاعری میں معنی آفرینی یا نکتہ سنجی کے بجائے کیفیات قلبی اور واردات باطنی کو دیکھنا چاہیئے اور بس۔ ان کے وہاں یہ کیفیات سیدھے سادھے فطری انداز میں نظر آتی ہیں، جو عشق و محبت کا خاصہ ہے۔ یوں بھی دل کا حال کہتے وقت فلسفہ و حکمت کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحب اپنی ساری متاع علم کے باوصف اس کے آگے کچھ نہیں کہہ پاتے ہیں ع

جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے   ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں

اتنا ہی نہیں وہ اپنے سرمایۂ ہوش خرد کو بھی برق ایمن کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں ع

مرے ہوش و خرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں   لگا دے برق ایمن آگ تو اس میرے حاصل کو

اور پھر وہ خود کو اس مقام پر پاتے ہیں جو ہر سالک کی منزل مقصود ہے ع

جہاں دیکھیں وہیں پائیں جہاں دیکھیں وہیں تو ہے   تجھے جو یاد کرتا ہے اسی کا ہمنشیں تو ہے

کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز   ہر رگ جاں ساز انّا اللہ ہے
ہو کوئی آواز میرے کان میں   ہر صدا آواز انّا اللہ ہے[2]

حوالے وحواشی:

۱۔ مقدمہ شعلۂ طور، دیوان جگر مرادآبادی

۲۔ سید سلیمان ندوی کا مجموعۂ کلام "ارمغان سلیمان" بر وقت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہ مقالہ لکھتے وقت صرف وہ اشعار پیش نظر رہے جو ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی کی قیمتی تصنیف "علامہ سید سلیمان ندوی: شخصیت اور ادبی خدمات" میں نقل ہوئے۔

منصور نعمانی ندوی★

شعر وسخن

مولانا سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) اپنے محبوب استاد علامہ شبلی نعمانیؒ کی طرح رنگارنگ طبیعت کے حامل تھے، انہوں نے اپنے استاد کے تتبع میں علم وفن کے متنوع میدانوں میں قدم رکھا اور جس کمال و معراج کو پہنچے وہ انہی کا حصہ تھا، وہ بیک وقت صاحب نظر عالم، ژرف نگاہ محقق، فقیہ، مورخ، صوفی، معلم، ماہر لسانیات، ادیب، خطیب، مفکر، سوانح نگار اور سیرت نگار رسول تھے، ان کی شخصیت کی یہ بوقلمونی ہی تھی کہ وہ جس محفل میں بھی بیٹھے صدر بزم ہو کر رہے، اور جس انجمن میں شرکت کی شمع انجمن کہلائے، مولانا شاعر بھی تھے ع گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ان پر بھی، لیکن ان کے صحیفۂ کمال سے ان کی شاعری کو الگ رکھا گیا ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ وہ روایتی شاعر نہ تھے، لیکن انھوں نے گلستانِ شعر و سخن میں خوب گل بوٹے کھلائے انہوں نے غزل، نظم، مراثی، قطعات، نعت غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور کسی استاد فن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے بغیر فطری ذہانت، ذوق سلیم اور وسعت مطالعہ کی رہنمائی میں اپنے جادو رقم قلم کے کارناموں کو کبھی کنز مخفی کی صورت نہ اختیار کرنے دی، اور شعر و ادب کے باب میں زیادہ نہ سہی مگر اضافہ ضرور کرتے رہے۔

سید سلیمان ندوی زبان و ادب کے مطالعہ میں قابلِ رشک استعداد کے مالک تھے، جبھی تو فنی حیثیت سے ان کا کلام پختگی کا آئینہ، صحت و عروض کا نمونہ اور ان کے ذوق ادب، رجحان طبع، مذاق جمال، ذاتی تاثرات و احساسات، ذوق عرفان، ندرتِ فکر، زور بیان اور چستیٔ بندش کا شاہد ہے، اس معیار سے ان کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو بھی ان کے اشعار کی معنوی سطح پست نظر نہیں آتی، ان کا کلام جذباتیت، رکاکت خیال، پستیٔ جذبات، رنگینی، مبالغہ آرائی اور ابتذال سے یکسر پاک ہے، اس کے بجائے سکون و وقار، گہرائی و گیرائی اور واقعہ پسندی ان کے مزاج شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

سید صاحب جدید رجحانات سے بے خبر اور نئے تقاضوں سے ناواقف نہ تھے، اسی سبب وہ لکیر کے فقیر نظر نہیں آتے، اس لیے اگر آپ ان کی غزلوں کا مطالعہ کریں تو وہ دوسرے شعرا کی صدائے بازگشت نظر نہیں آئیں گی بلکہ ان کے کلام میں معنویت، مقصدیت اور سوز و گداز کی آنچ کے ساتھ اسلوب کی نرمی

★ سابق رفیق، دار المصنفین اعظم گڑھ۔

و پاکیزگی، جذبات کی لطافت و گداختگی اور زندگی کا ولولہ بھی پایا جاتا ہے۔

ہندوستان کے سیاسی حالات اور علم و تحقیق میں غیر معمولی انہماک نے ان کے ورطۂ احساس میں ہلچل نہ مچائی ہوتی اور ان کا رُخ "شعر منثور" کی طرف نہ مڑا ہوتا تو وہ ایک باکمال، بلند پایہ شاعر ہوتے، ان کو اس کوچہ کی سیر کا موقع کم ملا، اسی باعث ان کا کلام بہت کم مقدار میں پایا جاتا ہے، بایں ہمہ ان کا جتنا کچھ شعری سرمایہ موجود ہے وہ وسعت فکر اور پختگی اسلوب کا آئینہ، قدرت کلام اور صحت فن کے لحاظ سے لکھنوی دبستان شاعری کے اوسط درجہ کے شعراء میں شامل ہونے کے لائق ہے مولانا عبدالماجد دریا بادی ان کے شعری کمال پر یوں روشنی ڈالتے ہیں: "سید صاحب کے فاضل اجل، عالم بے بدل ہونے کا ایک زمانہ قائل ہے، دنیا کو مسلم ہے کہ وہ فن تاریخ میں امام وقت تھے، اور سیرت نگاری میں اپنی نظیر آپ، لیکن آخر تک کم ہی لوگوں نے ان کے ادبی، شعری اور تنقیدی مرتبہ کو جانا، اور کمتر ہی لوگوں نے انھیں ادیب، انشا پرداز اور سخن سنج کی حیثیت سے جانا، علم و ادب کی تاریخ میں ایسی ناشناسی اور کم شناسی کی مثالیں نہ معدوم ہیں نہ غیر معلوم۔"[1]

سید صاحب کا بچپن جس زمانہ و ماحول میں گذرا، اس وقت فضا شعر و سخن کی عطر بیزیوں سے معطر تھی، مکاتب تک کی فضا اس سے مہکی ہوئی تھی، طلباء کو مکتبی ماحول میں ہی باہمی بیت بازی سے شعر و ادب کا چسکا لگ جاتا تھا۔ چنانچہ اوائل عمر ہی سے ان کو بیت بازی سے شغف ہو گیا، اس کے مقابلوں میں وہ برابر دلچسپی سے شرکت کرتے، اس سے ان کے ذوق شعری کو جلا ملی، سید ابوظفر ندوی اس ماحول کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں:

"سید صاحب کے مکتب میں دو پارٹیاں تھیں ایک پارٹی کے امیر موصوف اور ان کے مشیر حکیم نجم الہدیٰ ندوی اور دوسرے کے مولوی قاسم، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کو شاعری سے خاص لگاؤ پیدا ہوا، اور ہزاروں اشعار ان کو یاد ہو گئے۔"[2]

دیسنہ اور دربھنگہ کے مکاتب سے فراغت کے بعد سید صاحب کو آگے کی تعلیم کے لئے پھلواری شریف جانا پڑا تو وہاں خانقاہ پھلواری میں حضرت شاہ محی الدین کی عارفانہ صحبتوں اور شاعرانہ ذوق نے ان کے مذاقِ شعر کو مہمیز کیا۔ سید صاحبؒ نے اس پر خود ہی یوں روشنی ڈالی ہے: "یہاں خانقاہ میں ہر مہینہ نعتیہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و شاعری کا چرچا تھا اور ہے، میں نے بھی اس فضا میں سانس لی۔"[3]

بہار کی مختلف درس گاہوں سے حصول علم کے بعد مزید حصول تعلیم کی غرض سے سید صاحب ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ پہنچے، یہاں کے زمانہ قیام میں لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول اور ندوہ کی ادبی و علمی فضا اور علامہ شبلی نعمانی کے فیض صحبت نے بھی ان کے ذوق شعری کو چمکایا اور شعر گوئی میں ملکہ تمام

ہوگیا۔ شاہ معین الدین ندوی نے لکھا کہ: "اس فضا نے ان کی شاعری کا نشہ تیز کر دیا اور خود بھی شعر کہنے لگے۔"[۴]

سید ابو ظفر ندوی اس اجمال کی تفصیل یوں رقم کرتے ہیں: "اس زمانہ کے اساتذہ میں داغؔ، امیرؔ، جلالؔ، ریاضؔ، اور مضطرؔ وغیرہ قید حیات تھے، عشرتؔ لکھنوی کا نام بھی طلباء میں معروف تھا۔ "پیام یار" نامی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے ساتھ ہر ماہ نکلا کرتا تھا، مرثیہ کی مجلسیں اور مشاعرے بکثرت ہوتے، علامہ موصوف ان میں شرکت کرتے، آخر خود بھی شعر کہنے لگے اور بالآخر ایک باکمال شاعر بن گئے، ایک مرتبہ مشاعرہ کی خبر حضرت کو شام کو ملی، شعر کہنے کی کوشش کی اور صرف ایک شعر موزوں کر پائے تھے کہ احباب آگئے اور ان کے ساتھ چل پڑے، شمع ان کے سامنے بھی لائی گئی، انھوں نے معذرت کی کہ مجھے مشاعرہ کی مطلق خبر نہ تھی، ابھی احباب نے اطلاع دی فوراً اٹھا اور چلا آیا، البتہ ایک شعر ذہن میں آیا وہ عرض کرتا ہوں ؎

سر سے قدم تلک ہے ردائے حیا پڑی حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی[۵]

یہ شعر لکھنوی رنگ کا تھا خوب داد ملی۔

شروع میں سید صاحب امیرؔ مینائی سے بہت متاثر تھے، اور شاعری میں انہی کا تتبع کرتے تھے۔ ان کو امیرؔ کے سینکڑوں اشعار یاد تھے، عبد الماجد دریابادی اس کا ذکر کس ادیبانہ انداز سے کرتے ہیں: "سید صاحب سے ربط و رسم ایک مدت سے قائم تھی۔ ان کے علم و فضل کا سکہ کئی سال سے دل پر بیٹھا ہوا تھا، یہ کیا خبر تھی کہ "الندوہ" کی ڈوبتی کشتی سنبھالنے والا اور "الہلال" کو وقت کی ظلمتوں میں چمکانے والا۔ کلام امیرؔ کا حافظ نکلے گا۔ مرآۃ الغیب کا آئینہ دار، صنم خانۂ عشق کا پرستار، یہ پہلی بار کھلا کہ حضرت بایں زہد و تقوی اردو شعر و سخن کے رسیا بھی ہیں، اور اردو غزل و تشبیب کے متوالے۔"[۶]

یہی سبب ہے کہ سید سلیمان ندوی کے دورِ اول کے کلام میں امیرؔ مینائی کے کلام کی ندرت، قدرتِ فن، متوازن لہجہ، برمحل استعارات کی شستگی، زبان کی صحت، بیان کی سلاست و برجستگی اور حسن زبان کے خصائص بڑی نمایاں نظر آتے ہیں، بایں ہمہ سادگی و دل آویزی کے کرشمے روایتی محاسن کے ساتھ ایک دوسرے سے دست و گریباں ملیں گے، آپ کچھ اس انداز کے اشعار دیکھیں:

دستِ نازک سے اٹھاتے ہیں وہ میت میری بعد مرنے کے ٹھکانے لگی محنت میری
چین سے بیٹھنے دیگی نہیں ہم دونوں کو تجھ کو یہ شوخی تری مجھ کو یہ وحشت میری
چاہے تم آج نہ ہو میری وفا کے قائل پر تمھیں یاد کبھی آئے گی الفت میری
بجلی کی طرح قبر پہ آئے چلے گئے اب تک ہمارے دل کو وہ تڑپائے جاتے ہیں
پہلے تو چھیڑتے تھے تصور میں بار بار اب کیوں شبِ وصال وہ شرمائے جاتے ہیں

اُدھر گلچیں خفا ہے اور ادھر بیتاب ہے بجلی   خدا حافظ ہے اے بلبل ترے اب آشیانے کا
اڑا لیتے ہو دل تم عاشقوں کا باتوں باتوں میں   نیا انداز یہ سیکھا ہے تم نے دل اڑانے کا
کل شب مرے نہ آنے سے خفگی بجا سہی   ہے کیوں نگاہِ ناز مگر شرمسار آج!
ہماری پاکبازی کی سند پر مہر ہوتی ہے   مجھے جب بوسۂ لب سے کبھی وہ شاد کرتے ہیں
وہ رفتہ رفتہ اور بھی دیں گے اجازتیں   ان کے گلے میں ہاتھ حمائل تو ہو گئے
دستِ گستاخ کو اجازت دو   منہ سے کھل کر کہا نہیں جاتا

رفتہ رفتہ پھر کلام میں تبدیلیاں واقع ہوئیں اور جذبات میں لطافت اور خیالات میں گہرائی پیدا ہوئی، یہ ایک واقعہ ہے کہ سید صاحب کے کلام میں کوئی چونکا دینے والی بات یا کوئی پیغام مشکل ہی سے ملے گا، البتہ صحت زبان، فصاحت، محاورات کی بندش اور بے ساختگی ضرور ملے گی۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی کے تتبع میں متعدد نظمیں کہیں جو بالکل انہی کے رنگ میں ہیں، ان نظموں پر ارباب فکر و نظر نے خوب داد بھی دی، دراصل اس کی تحریک ڈاکٹر اقبال نے کی، انھوں نے ایک خط میں سید صاحب کو لکھا تھا: "مولانا شبلی مرحوم نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں، وہ نہایت مقبول بھی ہوئیں۔"[۷]

سید صاحب نے اپنے محبوب استاد کی وفات حسرت آیات پر جب نوحہ لکھا تو نواب عماد الملک نے انھیں تحریر کیا: "آپ کی نظمیں شبلی کی یاد تازہ کرتی ہیں۔"[۸] اس حادثہ فاجعہ پر سید صاحب نے رنج و غم میں ڈوب کر اپنے جذبات و احساسات کو شعری زبان میں "نالہائے درد" کے عنوان سے یوں رقم کیا ہے

اب ہمیشہ کیلئے وہ آہ! ہم سے چھٹ گیا   وائے ناکامی ہمارا قافلہ اب لٹ گیا
کیا فریب صبر کھائے غم نصیب دلفگار   جسکی دولت لٹ گئی کب اسکو دل پر اختیار
بہر تسکینِ دلِ بے صبر کچھ فرمائیے   میرے آقا پھر ذرا سحر بیان دکھلائیے
اس دلِ پرشور میں گر شور تھا تو اس سے تھا   میرے بازو میں اگر کچھ زور تھا تو اس سے تھا
اپنے بچوں کا کوئی سامان کرنا تھا ضرور   پھر خدا جانے کہ ملنا کب ہو اور جانا ہے دور

یہ ایک طویل مرثیہ ہے جو ۶۲ شعروں پر مشتمل ہے، طوالت کے خوف سے یہاں صرف چند اشعار نقل کئے گئے ہیں۔[۹] نوحۂ استاد "اکبر الہ آبادی" کی نظر سے گزرا تو انہوں نے ۲۵ فروری ۱۹۱۵ء کے ایک مکتوب میں سید سلیمان ندوی کو تحریر کیا: "آپ کے اشعار نے جن کے معنی بحرِ حقیقت میں ڈوبے ہیں مجھ کو آپ کا زیادہ مشتاق کر دیا۔"

اپریل ۱۹۱۷ء میں سید صاحب کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا، اس سے وہ بہت متاثر ہوئے، اس کا اظہار

انھوں نے رسالہ معارف میں اس طرح کیا: "آخر خدا کی مرضی پوری ہو کر رہی، دو ماہ شدید علالت کے بعد میری رفیقۂ حیات نے ۲۷ سال کی عمر میں عالم کو الوداع کہا، استاد مرحوم کی وفات کے بعد یہ دوسرا حادثہ ہے جس نے میرے سکونِ خاطر کو درہم کر دیا۔" اس درد بھری تحریر کے بعد ایک منظوم نامۂ درد بلند ہوا جس کو "مرگِ یار" کا عنوان دیا، اس کے چند اشعار یہ ہیں ع

ہمسفرِ وادیٔ ہستی میں وہ دلبر نہ ہوا!   شمع اس راہ میں اس کا رخِ انور نہ ہوا
تیر آئے جو فلک سے ہدف ان کا میں تھا   ظلم ہے کہیے نہ کبھی اس کو جو مجھ پر نہ ہوا
درد اٹھ اٹھ کے میرے دل میں ٹھہر جاتا ہے   کیوں رگِ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہ ہوا
تیرے جانے پہ گماں تھا کہ ہو محشر برپا   تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا[۱۳]

۱۲ رمئی ۱۹۱۷ء کے ایک مکتوب میں اس نظم کے متعلق حضرت اکبر الہ آبادی اپنے تاثرات یوں رقم کرتے ہیں: "آپ کے اشعار نے میرے داغِ دل ہرے کر دیئے، ہرے تو رہتے ہی ہیں، یہ کہیے لہولہان کر دیئے، جوشِ غم نے آپ سے ایسے مصرعے کہلا دیئے:

ع   شمع اس راہ میں اس کا رخِ انور نہ ہوا
ع   وہ گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا

ورنہ صرف علمی قابلیت اور قوتِ قافیہ پیمائی کافی نہیں۔"[۱۳]

سید صاحب نے ۱۹۱۶ء میں ایک مرصع غزل لکھی جو اعظم گڑھ کے ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی اس کا مطلع یہ تھا ع

عجیب طرح کا ایک پیچ گفتگو میں ہے   وگرنہ "میں" میں وہی بات ہے جو "تو" میں ہے

جب یہ غزل علامہ اقبال کی نظر سے گزری تو انہوں نے اس کی داد یوں دی: "آپ کی غزل لاجواب ہے بالخصوص یہ شعر مجھے بہت پسند آیا ع

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں   وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے"[۱۴]

اس غزل کا یہ شعر بھی دیکھئے، کس غضب کا ہے ع

دہن میں تیغ کے ہے اب بھی تشنگی باقی   عجیب لذتِ پنہاں مرے لہو میں ہے

ایک شعر اور سنتے چلیئے ع

نگاہِ لطف ادھر ہو کہ آ چلا ہے کیف   بچا نہ رکھ میرے ساقی جو کچھ سبو میں ہے[۱۵]

تحریک خلافت کے روحِ رواں مولانا محمد علی جوہر نے اپنے ایک عقیدت مند مولانا عبد الماجد دریابادی

کو جیل سے ایک غزل بھیجی اس کا ایک شعر یہ تھا ؏

ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا   ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا دیکھ!

اس بحر میں مولانا دریابادی ناظرؔ نے بھی ایک غزل کہہ ڈالی، اور اپنے عزیز رفیق سید سلیمان ندوی کی خدمت میں "معارف" میں اشاعت کے لئے روانہ کر دی، سید صاحب کو جب یہ دونوں غزلیں موصول ہوئیں تو ان کی طبیعت بھی خود موزوں ہو گئی چنانچہ وہ ارقام فرماتے ہیں: "شیفتہ کی ایک مشہور غزل ؏ اٹھ صبح ہوئی مرغِ چمن نغمہ سرا دیکھ، مسٹر محمد علی جوہرؔ نے اسی زمین میں ایک غزل لکھی، مسٹر ناظرؔ نے جوہرؔ کی غزل پر طبع آزمائی کی، یہ غزلیں جب نظر سے گذریں تو زمین کی شگفتگی نے دلِ مردہ میں بھی بہار پیدا کر دی اور کچھ صدائیں زبان و قلم سے موزوں ہو کر نکل گئیں۔" چنانچہ ان چاروں غزلوں کو "مناظرۂ شاعری" کے عنوان سے معارف کی زینت بنایا گیا، شیفتہ کی غزل، اس کے بعد حضرت جوہرؔ کی بعد ازاں مسٹر ناظرؔ کی اور آخر میں خود ان کی، اس غزل کے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ کریں ؏

تشہیر کا باعث نہ ہو دامانِ قبا دیکھ   لائے نہ کہیں رنگ یہ خونِ شہدا دیکھ
یہ عالمِ امکاں ہے تماشا گہہ قدرت   جو کچھ یہاں دکھلائے تجھے دستِ قضا دیکھ
انکار تھا تجھ کو مری تاثیرِ دُعا سے   اب میری طرف دیکھ تو تاثیرِ دعا دیکھ
نکلے گا وہ خورشیدِ جمال آج ادھر سے   اڑ جائیں مری خاک کے ذرے نہ صبا دیکھ
کھل جانے سے فرق اس کی محبت میں نہ آئے   اڑ جائے نہ اے غنچۂ دل بوئے وفا دیکھ"[۱۶]

سیّد صاحب کا تخلص مختلف فیہ رہا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کا تخلص "رمزی" لکھا ہے۔[۱۷] غلام محمد مرتب "ارمغانِ سلیمان" نے بھی علامہ کے رفقاء کے حوالے سے اسی کو ترجیح دی ہے، شاہ معین الدین ندوی نے اس کی تاویل یوں کی ہے: "وہ تفننِ طبع کے طور پر شاعری کرتے تھے اس لئے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا بلکہ جو غزلیں اور نظمیں شائع کیں وہ "رمزی" کے پردہ میں ہیں۔"[۱۸] ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "رمزی" ایک مفروضہ تخلص ہے، جس کا حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔"[۱۹] غالباً ان بیانات کو حوالۂ قرطاس کرنے سے قبل زیادہ تلاش سے کام نہیں لیا گیا، سید صاحب کی پہلی مطبوعہ غزل بانکی پور پٹنہ اگست ۱۹۰۳ء کے شمارہ میں ملتی ہے اس میں تخلص سیّد ہے ؏

قطرۂ خونِ جگر، ہجر میں ان کے سیّد   رنگ بنکر مری آنکھوں سے ٹپک جائے[۲۰]

اور ایک رباعی معارف مئی ۱۹۱۷ء میں ملتی ہے اس میں "سلیمان" تخلص اختیار کیا گیا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کبھی انہوں نے "سید" اور کبھی "سلیمان" تخلص اختیار کیا اور کبھی گمنام، بطور "رمزی" کے اختیار کیا، وہ رباعی بھی

سنتے چلیے ؏

انسان وہ ہے جو سب کو انساں سمجھے   سائل ہو کوئی، اسے بھی سلطاں سمجھے
احباب کے حسنِ ظن کا ممنون ہوں میں   جو مور "ضعیف" کو "سلیماں" سمجھے

سید صاحب نے غزل اور نظم میں دادِ سخن خوب دی ہے، اسی طرح انھوں نے نعتِ رسولؐ کی طرف بھی خاص توجہ مبذول کی، وہ سیرۃ النبی جیسی عظیم وضخیم کتاب ترتیب دے چکے تھے، اس لئے ذاتِ رسالت مآب سے عقیدت وتعلق بھی خوب ہونا چاہیئے تھا، واقعہ یہ ہے کہ اصناف شاعری میں سب سے مشکل صنف "نعت گوئی" ہے، نعت گو عشقِ نبوی میں سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ عظمت وادب نبوی کا محرم بھی ہو اور نسبت محمدیہؐ سے فیض یاب اور شان رسالت کا شناسا ہو، اس کے اشعار سے دیگر انبیاء کرام کی تنقیص نہ ہوتی ہو، نہ ہی وہ توحید کے منافی یا واہمہ شرک پیدا کرنے والے ہوں، ان نزاکتوں کا خیال اور اس کی رعایت ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں، اس پرخار کوچہ سے سیرت نگار رسولؐ صحیح وسالم نکلے، ان کی ہر نعت عظمتِ نبوی کی منہ بولتی تصویر ہے، ہر جگہ ادب شریعت جوشِ عقیدت پر غالب ہے، پھر ان نزاکتوں کے ساتھ عروض وقواعد کی کامل پابندی ہے، پرشکوہ، منتخب الفاظ بے ساختگی کے سانچے میں ڈھلتے چلے آتے ہیں، ترکیب میں ندرت وبرجستگی، روانی کے ساتھ لفظ ومعنیٰ کا حسین امتزاج دیکھنے کی چیز ہے، نعت کے کچھ اشعار ذیل میں ملاحظہ کیجیے، شانِ نبوت کا اظہار کس جوشِ بیاں سے کرتے ہیں ؏

عشقِ نبوی دردِ معاصی کی دوا ہے   ظلمت کدہ دہر میں وہ شمع ہدیٰ ہے
آمد تری اے ابرِ کرم رونقِ عالم   تیرے ہی لئے گلشنِ ہستی یہ بنا ہے
لے جائیگا رہرو کو وہ منزل سے بہت دور   جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

۱۹۴۹ء میں جب سید صاحب آخری سفرِ حج وزیارت کے لئے گئے تو مدینہ منورہ پہونچ کر روضۂ اطہر کے روبرو پہونچتے ہی چشمۂ حب رسول ابل پڑتا ہے، ادب نبوی کا پاس ولحاظ جو اس نعت میں ہے دیکھنے کی چیز ہے:

آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے   مکی، مدنی، ہاشمی، ومطلبی ہے
پاکیزہ تر از عرش وسما جنت وفردوس   آرام گہہ پاک رسولِ عربی ہے
اے زائرِ بیت نبوی یاد رہے یہ   بے قاعدہ یاں جنبشِ لب بے ادبی ہے
کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبیؐ کی   محبوبِ خدا ہے وہ جو محبوب نبی ہے
بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابرِ کرم آج   جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

یہاں ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ اس سفر میں عبدالمنان بیدل عظیم آبادی بھی ان کے ساتھ تھے، انھوں نے

سید صاحبؒ سے اس نعت کو اپنے پرچہ "معاصر" میں شائع کرنے کے لئے مانگا، اور یہ نعت "معاصر" دسمبر ۱۹۴۹ء میں انھوں نے اس نوٹ کے ساتھ شائع کر دی: "علامہ سید سلیمان ندوی کا اسم گرامی محتاج تعارف نہیں، سیرت نگار رسول، اسلامی مورّخ، دینی رہنما اور اُردو ادیب کی حیثیت سے ان کا نام برّاعظم ہند اور اس کے باہر بھی ادب کے ساتھ لیا جاتا ہے، لیکن علامہ ندوی کو ایک نکتہ سنج سخنور کی حیثیت سے دنیا میں متعارف کرانے کا فخر پہلی مرتبہ "معاصر" کو حاصل ہوا ہے۔" یہ ایک خلاف واقعہ بات ہے سید صاحب کی شہرت شاعر کی حیثیت سے بہت پہلے سے تھی، ان کی لاتعداد نظمیں، غزلیں اور قطعات و رباعیاں رسالۂ معارف اور دیگر رسائل و جرائد کی زینت بن چکی تھیں، مرتب "ارمغان سلیمان" غلام محمد نے سید صاحب کی پہلی غزل ۱۹۰۰ء کی درج کی ہے، اور ڈاکٹر نعیم نے بھی اس کو صحیح تسلیم کیا ہے، جبکہ پہلی غزل "بہار" بانکی پور اگست ۱۹۰۲ء کے شمارہ میں شائع ہوئی اور دوسری نومبر ۱۹۰۳ء کے شمارہ میں، بیدل صاحب نے ۱۹۴۹ء میں بڑے فخر کے ساتھ پہلی بار سید صاحب کو شاعر ہونے کی سعادت بخشی جبکہ اس سے ۴۶ سال قبل وہ اپنی شاعری کا آغاز کر چکے تھے، وہ دور تو دور آخر تھا جب انہوں نے کوچۂ شاعری کو خیرباد کہہ دیا تھا مگر مدینہ جاکر جذبات میں تموج ہوا اور ایک بہتر نعت معرضِ وجود میں آگئی۔

آستانۂ اشرفی سے وابستہ ہونے کے بعد سید صاحب کی زندگی میں ایک انقلاب آیا، ان کے جذبات شوق میں وفور ہوا اور زبان سے شعر و نغمہ کا چشمہ ابلنے لگا، سید صاحبؒ کا خود بیان ہے: "میری اس دور کی شاعری کا آغاز حضرت والا کے تعلق سے ہوا اور انجام بھی حضرت کی رحلت ہی پر ہو گیا، بعد میں مشکل سے دو چار غزلیں ہوئی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت کی موجودگی میں جذبات کا وفور رہتا تھا جو پھر باقی نہیں رہا۔"[20] شاہ معین الدین ندوی رقمطراز ہیں: "اس دور کا کلام تمام تر قلبی واردات کا ترجمان اور جادۂ عرفان کا چھلکتا ہوا جام ہے، اس میں طور کی تجلیاں اور وادئ ایمن کی شرر باریاں نظر آتی ہیں۔"[21] اس دور کا کلام درحقیقت ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے، ان جذبات کو انھوں نے شعر کے قالب میں پیش کر دیا ہے، غلام محمد صاحب کا خیال ہے کہ اس دور کا کلام بظاہر آسان اور سلیس ہے مگر معنوی اعتبار سے بہت عمیق اور دقیق ہے۔"[22]

کچھ اشعار اس "روحانی سفرنامہ" کے بھی ملاحظہ کر لیجئے ؏

جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں
سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں

فیض ہے یہ کس ولیِ وقت کا
اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

یاد ان کی دم بدم آتی نہیں
کیا مزاجِ یار برہم ہو گیا

دل ہے اے ناداں تجلی گاہ دوست ـــــ کیوں نگاہِ شوق سوئے بام ہے
چشم ساقی میں بھری کیا بادہ پُر جوش ہے ـــــ جس طرف اٹھ اٹھ گئی وہ مست ہے مدہوش ہے
زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی ـــــ گفتار ہے رندانہ رفتار ہے مستانہ
حیات نو مجھے اس کی نگاہِ ناز نے بخشی ـــــ بھرا ہے آب حیواں کا سہ زہر ہلاہل میں
میرے ہوش و خرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں ـــــ لگا دے برق ایمن آگ تو اس میرے حاصل کو

حوالے:

۱و۲۔ معارف سلیمان نمبر ص۲۳۰ و ص۴۹ ، ۳۔ معارف جولائی سنہ ۱۹۵۰ء ، ۴۔ ارمغان سلیمان، معارف جولائی سنہ ۱۹۷۱ء ۵۔ معارف سلیمان نمبر ص۵۳ ، ۶۔ نقوش سلیمانی، سلیمان نمبر ص۲۳۰ ، ۷۔ اقبال نامہ اول ص۹ ، ۸۔ مقدمہ ارمغان سلیمان ص۶ ، ۹۔ حیات شبلی ص۸۴۳۔۸۴۷ ، ۱۰۔ یادگار سلیمان ص۴۶ ، ۱۱۔ یادرفتگاں ص۳۱ ۱۲۔ حیات سلیمان ص۶۰۲۔۶۰۳ ، ۱۳۔ یادگار سلیمان ص۵۳ ، ۱۴۔ اقبال نامہ اول ص۷۷ ، ۱۵۔ ارمغان سلیمان ص۴۴ ، ۱۶۔ معارف جون سنہ ۱۹۷۱ء ، ۱۷۔ معارف سلیمان نمبر ص۱۳ ، ۱۸۔ ارمغان سلیمان، معارف جولائی سنہ ۱۹۷۱ء ، ۱۹۔ سید سلیمان ندوی: شخصیت اور ادبی خدمات ص۲۶۵ ، ۲۰۔ تذکرۂ سلیمان ص۱۳۲ ، ۲۱۔ معارف جولائی سنہ ۱۹۰۱ء ص۱۴ ، ۲۲۔ مقدمہ ارمغان سلیمان ص۹ ۔

اقبال احمد انصاری★

سید سلیمان ندوی اور

تفہیم اقبال

اقبال نامہ میں شائع شدہ سید سلیمان ندوی کے نام ستر خطوط[۱] کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال سید صاحب سے اسلامی علمی و فلسفیانہ مسائل کے علاوہ ادبی لسانی و شعری موضوعات پر بھی اکثر رجوع کرتے تھے اور ان کی رایوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ اقبال کے نام سید سلیمان ندوی کے خطوط محفوظ ہوتے تو ہمیں ان سے سید صاحب کی شعر فہمی اور اقبال شناسی کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی۔ خطوط تو دستیاب نہیں لیکن کلام اقبال پر تقاریظ، تبصرے، شذرات اور تعارفی نوٹ کی شکل میں ایک قابل لحاظ عصری تنقیدی سرمایہ ہے'' جس کا جائزہ لے کر کلام اقبال کی تفہیم میں اس کی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش زیر نظر مقالہ میں کی جائیگی، کلام اقبال کے بارے میں سید صاحب کی ان آرا کی ایک خصوصی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہ تقاریظ و تبصرے نظموں کی اشاعت کے فوراً بعد لکھے گئے۔

اقبال کی وفات پر سید صاحب نے معارف کے شذرات میں لکھا[۲] کہ اقبال'' ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا.... ایسا عارف، فلسفی، عاشق رسولؐ، شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو''۔

اسی نوٹ میں اقبال کے کلام کے بارے میں پیشین گوئی ان الفاظ میں کی: ''اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یاد رہیں گی وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر انشاء اللہ زندہ رہے گا، ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، تشریحیں کی جائیں گی، نظریے ان سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا، اس کی دلیلیں ڈھونڈھی جائیں گی، قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا روم اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا، اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں انشاء اللہ زندہ رہے گا اور اقبال زندۂ جاوید''۔

اس اقتباس سے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحب کو اقبال کی شاعری کے فلسفہ و نظریہ سے ہی شغف تھا، اور اسی کی بنا پر وہ اسے زندہ جاوید سمجھتے تھے۔ رموز بے خودی پر ریویو اور خضر راہ پر نوٹ، اور بال جبریل

★ شعبۂ انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

پر تقریظ کے مطالعہ سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ سید صاحب شعر کے لفظی و تخیلی ڈھانچے اور اس کے ذریعہ شعر کی سحرکاری کا بھرپور احساس رکھتے تھے، اور اقبال اور اس کے کلام کی جاودانی کی پیشین گوئی اسی مرکب احساس یعنی پیغام کی صحت مندی اور کلام کی سحرآفرینی کی پروردہ تھی۔

'رموز بے خودی' پر ریویو کے تمہیدی حصہ میں لکھتے ہیں[۳]: "ڈاکٹر اقبال کی پبلک شاعری کی عمر تقریباً ۱۶ برس ہے، اس عرصہ میں ان کی متعدد چھوٹی بڑی نظمیں شائع ہوئیں جن میں سے اکثر کی اہل معنی نے داد دی اور بعض پر اہل ظاہر نے گرفت کی۔"

ریویو کا اختتام اس طرح ہوتا ہے: "ایک بالغ نظر شخص اس مثنوی میں الفاظ کی صحت یا صحیح فارسی معنی میں ان کے استعمال کی صحت میں شک اور بعض فارسی محاروں کی گرفت کرسکتا ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ اقبال کے شاعرانہ خیالات میں اتنی تیز روانی ہے کہ یہ خس و خاشاک اس کی خوبی و لطافت میں مزاحم نہیں ہوسکتے... نکتہ چینی اور حرف گیری بہت ہوچکی، اب کچھ سوچنا اور سمجھنا بھی چاہیے۔"

اسی ریویو میں ایک جگہ کہتے ہیں: "زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو ان شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلہ میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے، لیکن حق یہ ہے کہ اس ایک لغزش مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ متین رفتاریں قربان ہیں، مصرعوں کے دروبست اور فصل و وصل میں قصور ممکن ہے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرعہ ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اتر جائے ..."

ان سطور کے لکھنے والے کے بارے میں انگریزی محاورہ کے مطابق میں یہ کہوں گا کہ اس کا قلب صحیح مقام پر ہے۔ اپنی کلاسیکی تربیت کی وجہ سے زبان و بیان کے قواعد و ضوابط کی پابندی کا احساس رکھنے والا شعر کی سحرآفرینی سے غافل نہیں بلکہ بالآخر فیصلہ یہی کرتا ہے کہ ضابطہ بندی خس و خاشاک اور اقبال کی شاعری ایک حیات پرور سیل ہے۔

اسی ریویو میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں: "یہ مثنوی بھی اقبال کی دوسری نظموں کی طرح تعقید لفظی اور معنوی سے بری نہیں تاہم بعض مقامات پر مسلسل اشعار اس قدر رواں اور سلیس البیانی کے ساتھ موثر ہیں کہ بار باران کے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔"

زبان ہی کے بارے میں مزید لکھتے ہیں: "ابتدا سے ڈاکٹر اقبال کی زبان اشکال پسند اور ترکیب آفریں واقع ہوئی ہے، کبھی کبھی سہل پسندی کے ثبوت کے لیے انھوں نے نہایت رواں اور آسان زبان میں نظمیں لکھیں لیکن پھر وہ ڈاکٹر اقبال کے اشعار نہ رہے بلکہ ان کی حیثیت ایک عام اردو شاعر کے خیالات موزوں کی رہ گئی۔"

اس سلسلہ میں اقبال سید صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں[4]: "بعض خیالات زمانۂ حال کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں، ان کے ادا کرنے کے لیے قدیم فارسی اسلوب بیان سے مدد نہیں ملتی۔ بعض تاثرات کے اظہار کے لیے الفاظ ہاتھ نہیں آتے، اسی واسطے مجبوراً ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے۔ جو ضرور ہے کہ اہلِ زبان کو ناگوار ہو کہ دل و دماغ اس سے مانوس نہیں ہیں۔"

'رموز بے خودی' پر ریویو کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس نے نہ صرف مثنوی بلکہ اقبال کی بیشتر شاعری کے تہذیبی، صوفیانہ و ادبی پس منظر کی نشاندہی صحیح خطوط پر کر کے کلام اقبال کے فہم کے لیے صحیح تناظر بخشا۔

مذہب، فلسفہ، تصوف، اور شاعری کے جداگانہ طریقہ کار و طرز بیان کو ممیز کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ: "سب سے پہلے حضرت موسیٰ کی چند صدیوں کے بعد اسرائیلی پیغمبروں میں مذہب اور شاعری کی مخلوط راہیں نظر آتی ہیں، حضرت داؤد کی مزامیر، حضرت سلیمان کی غزلوں اور اخیر زمانہ کے عبرانی پیغمبروں کے الہامی کلاموں میں اور سب سے زیادہ حضرت عیسیٰ کے مواعظ میں مذہب اور شاعری دوش بدوش مصروف کار فرمائی ہیں۔" آگے کہتے ہیں کہ بعد میں عجم کے صوفیوں نے ان چاروں کو ملا کر ایک کر دیا۔" ہمارے خیال میں حکیم سنائی پہلے شخص ہیں جو اس طریقۂ خاص کے موجد ہیں اور اس کے بعد مولانا روم کے عہد میں یہ فن عروج کمال تک پہنچ جاتا ہے۔"

طریقہ کار کے امتزاج کی سراغ رسانی کے بعد اسی عجمی تصوف کے اثرات کی مختصر مگر جامع تاریخ یوں بیان کرتے ہیں[5]: "چوتھی صدی سے لے کر دسویں صدی تک شعرائے باطن نے ہم کو جو کچھ سمجھایا، قرآن پاک اور حدیث قدسی کی جو کچھ تفسیریں انہوں نے کیں، ہمارے حاکمانہ غیظ و غضب، فاتحانہ جوش و خروش اور مجاہدانہ زور و قوت کو اعتدال پر لانے کے لیے وہ ضروری تھا۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہمارے مشتعل قویٰ سرد ہو گئے، ہمارے خون کی گرمی محکومانہ برودت سے بدل گئی ہے، ہمارے قویٰ میں مفتوحانہ ضعف آگیا ہے۔ اگر اسی پرانے نسخے کا استعمال جاری رہا تو برد اطراف کے بعد شاید وہ برد قلب کا باعث ہو جائے اور ہماری قومی زندگی کا ہمیشہ کے لیے خدا نخواستہ خاتمہ ہو جائے، اس لیے ضرورت تھی کہ ہمارے اہل دل شعراء مثنوی مولوی روم کا ایک دوسرا نسخہ ہمارے لیے تیار کریں۔ شعرائے حال میں ڈاکٹر اقبال کو اللہ تعالیٰ نے اسی ضرورت کے لیے چن لیا۔"

حضرات داؤد و سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے نغمات و مواعظ، پھر سنائی و رومی کی شاعری جو فلسفہ، مذہب، تصوف، اور شاعری کی مزج ہے ... اس سے بہتر کلام اقبال کے تہذیبی و ادبی روایت کی نشاندہی ممکن نہیں۔

۱۹۲۲ء میں سید صاحب نے اقبال کی نظم "خضر راہ" کی طباعت سے قبل اس کا تعارف معارف کے ذریعہ کرایا اور اس کے تین بند "زندگی"، "سلطنت" اور "دنیائے اسلام" شامل اشاعت کیے[6]۔ اس پر جو تعارفی نوٹ

لکھا وہ خود اپنی جگہ سید صاحب کی اقبال شناسی کی اچھی مثال ہونے کے علاوہ اقبال کی طرف سے اپنی نظم کی تشریح و توضیح اور فنی امور میں اقبال کی دقیقہ سنجی کی نشاندہی کا باعث ہوا ۔

نوٹ میں سید صاحب لکھتے ہیں: "ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم گو جوش بیان میں ان کی پچھلی نظموں سے کم ہے لیکن اسی مناسبت سے تعقید و فارسیت میں بھی کمی ہے ۔ ان کی شاعری کا اصلی جوہر فلسفہ و تخیل کی مصالحانہ آمیزش ہے اور ان کی یہ خصوصیت اس نظم میں نمایاں ہے ۔" بعد کے حصے میں نظم کی اثر آفرینی کا ذکر ہے اور اس ضرورت کا کہ "ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم ایسی ہے کہ اس کی تشریح لکھنی چاہیے ۔" پورے نوٹ کا انداز اور محولہ بالا الفاظ کہیں یہ تاثر نہیں دیتے کہ 'جوش بیان کی کمی'، سید صاحب کے خیال میں خضر راہ کا کوئی نقص ہے' انہوں نے تو یہ لکھا کہ جوش بیان کی کمی کی مناسبت سے تعقید و فارسیت میں بھی کمی ہے ۔ ان کے نزدیک نظم کی اصل خوبی یعنی فلسفہ و تخیل کی مصالحانہ آمیزش اس میں نمایاں ہے ۔

اقبال نے ۲۲ مئی ۱۹۲۲ء کے ایک خط میں سید صاحب کو لکھا: "خضر راہ کے متعلق جو نوٹ آپ نے لکھا ہے اس کا شکریہ قبول فرمائیے ۔ جوش بیان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے صحیح ہے، مگر یہ نقص اس نظم کے لیے ضروری تھا کم از کم میرے خیال میں) جناب خضر کی پختہ کاری، ان کا تجربہ اور واقعات و حوادث عالم پر ان کی نظر ان سب باتوں کے علاوہ ان کا انداز طبیعت جو سورۂ کہف سے معلوم ہوتا ہے اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو ....."

چند دن قبل ۱۶ مئی ۱۹۲۲ء کو گرامی کے نام ایک خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خان نیاز الدین خاں نے گرامی کی طرف نظم کے بارے میں یہ رائے منسوب کی تھی کہ انھیں یہ نظم ناپسند ہوئی اور ان کی نظر میں اس کے تمام اشعار بے لطف اور بعض غلط ہیں ۔ اقبال نے انھیں خضر کی شخصیت اور سورۂ کہف سے حوالہ دے کر اپنی نظم میں 'جوش بیان کی کمی' کی مدافعت انھیں الفاظ میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کی تھی[۸] ۔ بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ گرامی کی طرف سے منسوب رائیں خود نیاز الدین خاں کی تھیں، یہ انھیں سمجھنے میں غلطی ہوئی ۔ بہر حال سید صاحب کے نام ایک ہفتہ بعد لکھے گئے خط کا یہ پس منظر پیش نظر رہنا ضروری ہے ۔

جون ۱۹۲۳ء کے معارف میں سید صاحب نے 'پیام مشرق' پر ایک مختصر نوٹ لکھا ۔ اس کے پہلے 'خضر راہ' پر نوٹ کے خاتمہ پر بھی 'پیام مشرق' کی آمد آمد کی اطلاع اور اس کا مختصر تعارف کرا چکے تھے ۔ لکھتے ہیں: "پیام مشرق مختلف اوزان و بحور میں مواعظ و حکم اور حقائق و معارف کا ایک بحر ذخار ہے ۔ یقیناً یہ ڈاکٹر اقبال کے دماغ و قلم کا شہکار (ماسٹر پیس) ہے اور شاید اقبال بھی اس سے بہتر کبھی نہ کہہ سکیں گے، کبھی موقع سے اس کے متعلق ہم اپنے مفصل خیالات پیش کریں گے ۔" افسوس کہ یہ موقع سید صاحب کو نہیں ملا ۔

جون ۱۹۳۵ء کے معارف کے باب التقریظ والانتقاد میں سید صاحب نے ایک مضمون 'بال جبریل' پر لکھا جو ابھی حال میں شائع ہوئی تھی۔ سید صاحب اس مجموعۂ کلام میں ایک نئے اقبال کو دریافت کرتے ہیں، زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اور معنوی پختگی و رفعت کے اعتبار سے بھی۔ لکھتے ہیں: "بال جبریل کی نسبت سے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں شاعر نے بانگ درا سے بڑھ کر اپنی شاعرانہ صنعت، سلاست، روانی، بے تکلفی اور زبان کی صحت میں حیرت انگیز کامیابی کا ثبوت دیا ہے، اور عجب نہیں کہ 'بال جبریل' کو دیکھ کر لکھنؤ اور دہلی کے صنعت گر سخنور بھی پنجاب کے سخنداں کا لوہا مان لیں۔ زبان میں غزل کی سی شیرینی تو نہیں مگر قصائد کی سی جزالت اور متانت پوری طرح موجود ہیں۔"

مزید لکھتے ہیں: "معنوی حیثیت سے بال جبریل گو بانگ درا کی طرح جذبات سے معمور نہیں جس کے پڑھنے سے طبیعت میں جوش و خروش و ولولۂ آمادگی پیدا ہو لیکن حکمت و معرفت اور نکتہ رسی و حقیقت شناسی کے انمول موتیوں سے اس کے دامن بھرے ہیں، اس کے پڑھنے سے جوش و ولولہ نہیں جو جوانی کا خاصہ ہے بلکہ اپنی حالت پر غور و فکر کا احساس پیدا ہوتا ہے جو عمر کی سنجیدگی اور طبیعت کی پختگی کا اقتضا ہے، خیالات میں رفعت، اسرار الٰہیات کی ترجمانی میں حکیمانہ گہرائی، اجتماعیات میں حیات اسلامی کی روح کی صحیح معرفت، مسلمانوں کے سامنے ان کی معیاری زندگی کی اصلی تصویر کشی اور نوجوانان سعادتمند کو پند و نصیحت میں پیر دانا کی سی مشفقانہ حکمت آموزی ہے۔"

مجموعہ کے اجزا کا تعارف کراتے ہوئے پہلے حصہ کے بارے میں لکھتے ہیں: "پہلا حصہ ۱۶ نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان نظموں میں بندہ و خدا میں ناز و نیاز، گلہ و شکوہ، اور دعا و مناجات کے مختلف مناظر ہیں اور ہر نظم میں شاعر بندہ نے طرح طرح سے خداوند جل و علا کی شانِ غیوری کو حرکت میں لانے کی کوشش کی ہے، کہیں وہ روٹھا ہے، کہیں رویا ہے، کہیں سجدے میں گر پڑا ہے اور کبھی اٹھ کر تن گیا ہے اور اپنی بندگی اور عبودیت پر اترا رہا ہے اور پھر فوراً ہی اپنی عاجزی و درماندگی کی ساری بساط کو اس بارگاہ بے نیاز میں نذر لاتا ہے، اور اس ساری گفتگوئے رندانہ میں "فقیہ شہر" کے فتووں سے وہ علانیہ بے پروا ہے۔" بال جبریل کے ان ۱۶ نغمات کی جو نہ غزلیں ہیں نہ نظمیں بلکہ راقم نے جنھیں اپنے ایک مضمون میں DEVOTIONAL SONGS کا نام دیا ہے، ان سے بہتر ان کی روح کی ترجمانی ممکن نہیں۔

اس مضمون میں سید صاحب نے جو نظمیں شعری خوبیوں کی نشاندہی کے لئے پیش کی ہیں وہ انتخاب خود ناقد کی سخن فہمی اور اقبال شناسی کی غمازی کرتا ہے۔ 'روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے' پوری نظم نقل کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "اس نظم سے اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری نے

خیالات کے علاوہ سادگی اور سلاست میں کسی حد تک ترقی کی ہے۔"

اس کے علاوہ 'پیر و مرید'، 'مکالمہ جبریل و ابلیس'، 'ایک نوجوان کے نام'، 'دین و سیاست'، 'جاوید کے نام'، اور 'پروانہ و جگنو' کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانے کے بعد کہتے ہیں کہ اقبال کی اصلی تعلیم اور جذبات کی صحیح جلوہ نمائی حسب ذیل نظم میں ہے ؎

میرِ سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف   آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

۱۹۳۶ء میں 'ضربِ کلیم' شائع ہوئی تو سید صاحب نے معارف کے شذرات میں اس کا تعارف اس طرح کرایا؛ "ہمارے حکیم شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ایک نیا ادبی معجزہ 'ضربِ کلیم' کے نام سے ظاہر ہوا ہے۔ انہیں موصوف کی وہ تازہ اردو نظمیں ہیں جن میں اسلام کے نقطۂ نظر سے زمانۂ موجودہ کے خیالات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔" مزید لکھتے ہیں: "حضرت اقبال کی شاعری اب شاعری کی حدود سے نکل کر خالص حکمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکی ہے، اِنّ من الشعر لحکمۃ کے خلعت نبوی سے سرفراز ہو چکی ہے، اب ان کی شاعری میں جذبات کا سراب نہیں بلکہ علم و حکمت کا چشمۂ حیات ہے، اب وہ لطف و لذت نہیں بلکہ بصیرت و موعظت ہے، وہ مسلمانوں کو اب ان کے بزرگوں کا تاریخی پیغام سنانے کے لئے نہیں بلکہ ان قوموں کے عروج اور زوال کا فلسفہ سمجھانے کے لئے ہے، اب وہ میدانِ جنگ کا رجز یا مسافرانِ راہ کے لئے بانگ درا نہیں بلکہ غور و فکر کے غارِ حرا سے ناموسِ اکبر کی آواز اور جبریل امین کا پیام ہے۔"

'رموزِ بے خودی' کے ریویو سے ضربِ کلیم کے شذراتی نوٹ تک سید صاحب نے تقاریظ و شذرات کی تنگ دامانی کے باوجود جو کچھ لکھا ہے وہ قدیم مکتب تنقید کی اچھی مثال ہونے کے علاوہ بعض ایسے عناصر پر مشتمل ہے جو دائمی قدر و قیمت رکھتی ہے، اور جن سے جدید مکاتب تنقید بھی اغماض نہیں برت سکتے۔ اس تنقیدی سرمایہ کا ایک قابل قدر عنصر اقبال کی شاعری کے تہذیبی پس منظر اور ادبی روایت کا تعین ہے، جو سید صاحب نے بہت خوبی سے کیا۔ دوسرے یہ کہ اقبال نے شاعری کے جو مختلف و متنوع اسالیبِ زبان اور تکنیک اختیار کئے اور ان میں دور بہ دور جو تبدیلی رونما ہوتی رہی، اور ہر مجموعہ کلام کی جو انفرادیت ہے .... ان سب کو بجائے اپنی ایک پسندیدہ کسوٹی سے پرکھنے کے ہر ایک کو ہمدردانہ توجہ سے اس کی اپنی روح کے مطابق اور اسی کے معیار سے سمجھنے کی کوشش کی۔ ادب کے بعض کٹر مولوی ولایت کے سند یافتہ ہونے کے باوجود ایسا کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں، اس کے بجائے وہ اقبال کی شاعری کو کسی ایک مستعار فارمولے سے ناپتے تولتے نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس سید صاحب 'اسرار و رموز'، 'خضرِ راہ' اور 'بانگ درا' کی دوسری نظموں، 'پیام مشرق'، 'بال جبریل' اور 'ضرب کلیم'، سبھی کے جدا جدا حسن ظاہری و معنوی کے اداشناس اور ان

کی مقدس سحر آفرینی سے سرشار نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ اقبال جب ایک صاحبِ حال مست قلندر کی طرح فقیہِ شہر کی پروا کیے بغیر راہ انحراف پر نظر آتے ہیں، سید صاحب اس وقت بھی فقیہانہ گرفت کرنے کے بجائے اقبال کی مستیٔ حال کی ان اداؤں کو بھی داد دیتے ہیں۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ تقاریظ اور تبصرے مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت کے فوراً بعد لکھے گئے، جبکہ اقبال کی معیاری و غیر معیاری شاعری کا تعین جو وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ قارئین و ناقدین کے عرصہ کے غور و تامل کا نتیجہ ہوتا ہے، ابھی نہیں ہو سکا تھا۔

ادبی تنقید کے اس سرمایہ کے علاوہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی ایک مشترکہ تصنیف وہ مضمون ہے جو "ڈاکٹر اقبال کا علم کلام" کے نام سے پہلے یوم اقبال منعقدہ ۹ جنوری ۱۹۳۸ء میں پڑھا گیا اور بعد میں "مقالات یوم اقبال" مرتبہ الطاف حسین شوکت میں شامل کیا گیا۔[1] اس یوم اقبال میں سید صاحب خود شریک نہیں ہوئے۔ مقالہ کے عنوان اور مقالہ نگاروں خصوصاً سید سلیمان ندوی کے ناموں سے جو توقعات وابستہ ہوتی ہیں وہ مضمون سے قطعی پوری نہیں ہوتیں۔ تعجب ہے کہ ۱۹۳۸ء میں مقالہ لکھا گیا اور اقبال کے علم کلام کے تعلق سے ان کے 'فکر اسلامی کی تشکیل جدید' کے خطبات سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان خطبات کا کوئی وجود نہیں۔ راقم کو سید صاحب سے جو حسن ظن ہے اس کے پیش نظر قیاس یہ ہے کہ 'رموز بے خودی' کے ریویو کے زمانہ میں انھوں نے جو نوٹ بنائے ہوں گے انھیں کو مرتب کر کے دونوں کے نام سے پیش کیا گیا ہوگا۔ ایک روایت ہے کہ سید صاحب کو خطبات سے مایوسی ہوئی اور انہوں نے یہاں تک کہا کہ یہ خطبات نہ لکھے گئے ہوتے تو اچھا تھا۔

جو متکلمانہ و مذہبی مباحث اقبال کے خطوط کا موضوع بنے ہیں ان میں تصوف، مسئلہ زمان، اور امام یا امیر یا اجماع امت کے ذریعہ احکام شریعت میں تصرف کی نوعیت اور اس کے حدود و شرائط خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ زمان کے بارے میں اقبال زیادہ تر سید صاحب سے اسناد و حوالوں اور کتابوں کی تلخیص یا ان کی دستیابی کے بارے میں رجوع کرتے رہے، کہیں کہیں مسئلہ زماں کی اہمیت کی طرف فلاسفہ و صوفیا کے نظریات کو مرتب کر کے پیش کرنے کی اہمیت کی طرف سید صاحب کو توجہ دلاتے رہے اسی ضمن میں رویت باری اور نظریہ بروز بھی زیر بحث آئے۔

تصوف کے بارے میں دونوں کی آرا میں خاصا ارتکاز نظر آتا ہے۔ موخرالذکر مسئلہ یعنی امام کے احکام شرعیہ میں تصرف کے اختیارات پر خطوط کے سلسلہ کا آغاز ۱۸؍ اگست ۱۹۲۴ء سے ہوتا ہے اور ۱۹۳۶ء تک جاری رہتا ہے۔ اس ضمن میں شریعت احادیث، وحی متلو و غیر متلو، نبی کریم کی دوگانہ حیثیات نبوت و امامت

شاہ ولی اللہ کا نظریہ ارتفاقات ... وغیرہ مسائل بھی زیر گفتگو آتے ہیں۔ ان مسائل میں اقبال کے موقف اور اس پر سید سلیمان ندوی کے اثرات، اور ان اثرات کی صحت مندی کا محاکمہ زیر نظر مقالہ کے حدود سے باہر ہے۔ بہر حال اُردو و انگریزی کے ایک ممتاز اسکالر خواجہ منظور حسین کی رائے اس سلسلہ میں دلچسپی سے خالی نہیں۔ اپنی کتاب "اقبال اور بعض دیگر شعراء"[11] میں لکھتے ہیں: "سید سلیمان ندوی اس کوشش میں برابر لگے رہے کہ اقبال کی اجتہادی درائی کو کند اور براقی کو دھیما کریں، اس میں انہیں جس حد تک کامیابی ہوئی اس کا اندازہ ان ہی کے نام اقبال کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے: میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں قدیم ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ جدید بلکہ میرا ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے۔"[1]

کچھ اس طرح کی رائے شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب "موج کوثر" میں ظاہر کی ہے لکھتے ہیں:[12] "سید سلیمان ندوی کا بھی وہ (یعنی اقبال) بڑا معتقد تھا، اجتہاد پر اپنے خیالات شائع کرنے سے پہلے اس نے اپنا مضمون سید سلیمان اور مولوی عبدالماجد کے سامنے پیش کیا اور جیسا کہ 'اقبال نامہ' کا بغور مطالعہ کرنے سے خیال ہوتا ہے، حکیم امت کے کئی اجتہادی نظریے ان بزرگوں کی قدامت پسندی کی نذر ہو گئے۔"

اقبال کی قدامت پسندی اور ان کے اجتہادی نظریات کے نذر سلیمان ہونے پر غصہ یا افسوس کا تعلق تو ان بزرگوں کے اپنے نقطۂ نظر سے ہے، لیکن اس کے شواہد یقیناً اقبال نامہ کے خطوط میں ہیں کہ "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کا خطبہ متعلقہ قوانین اسلام و اجتہاد پر مولانا سید سلیمان ندوی کی آراء کا براہِ راست اثر ہے۔ لیکن یہ بات بھی اتنی ہی مبین ہے کہ دوسرے خطبات میں اقبال نے اپنے کلامی نظریات بے باکانہ اور بلا کسی رو رعایت کے اپنے آزادانہ مطالعہ و غور و فکر کے نتائج کے طور پر پیش کئے ہیں جن میں سے بعض صریحاً مسلمانوں کے مسلمہ عقائد و نظریات سے منحرف ہیں مثلاً پورے قصہ آدم و حوا کی تاویل و تعبیر نظریہ خودی کی روشنی میں یا حیات بعد موت کے بارے میں یہ نظریہ کہ بقاء دوام ہر نفس انسان کا مقدر نہیں بلکہ استحقاق ہے مستحکم خودیوں کا۔ ان خطبات میں ختم نبوت کے بارے میں ان کی کلامی توجیہ میں بھی ندرت ہے۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ اقبال کی فکر اسلامی کا مطالعہ سید سلیمان ندوی کے حوالے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اثرات و انحرافات دونوں پہلوؤں سے۔

حوالے: ۱۔ اقبال نامہ، مجموعہ مکاتیب اقبال، مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ ناشر شیخ محمد اشرف حصہ اول ص۵ تا ص۲۰، ۲۔ معارف اپریل ۱۹۲۸ء، ۳۔ معارف اپریل ۱۹۱۸ء، ۴۔ خط مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء۔ اقبال نامہ ص۱۴۵، ۵۔ معارف اپریل ۱۹۱۸ء، ۶۔ معارف، مئی ۱۹۲۲ء، ۷۔ اقبال نامہ ص۱۱۵۔ ۱۱۹، ۸۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی اقبال اکاڈمی کراچی ۱۹۶۹ء۔ ص۲۰۵ و ص۲۰۶، ۹۔ معارف، اکتوبر ۱۹۳۶ء، ۱۰۔ "مقالات یوم اقبال" قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۳۸ء ص۱ تا ۱۶، ڈاکٹر اقبال کا علم کلام، از سید سلیمان ندوی و عبدالسلام ندوی، ۱۱۔ اقبال اور بعض دیگر شعراء ص۲۶۳، ۱۲۔ موج کوثر، لاہور، ص۲۳۶

سید عارف عزیز★

ادب اسلامی میں حصّہ

بیسویں صدی کے عظیم مفکر، یگانہ روزگار محقق اور فاضل ادیب علامہ سید سلیمان ندویؒ کے علمی و ادبی کارناموں کا تجزیہ کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ ان کی تاریخی و ادبی تصانیف، ہمہ رنگ تالیفات، پرمغز مقالات یا سوانحی خاکوں میں جو عنصر خون کی طرح دوڑتا نظر آتا ہے وہ اسلامی فکر، اس کا پاک نظام اور اس کی اعلیٰ روایات ہیں، سید صاحب کی علمی و دینی خدمات کا دائرہ جتنا وسیع ہے ان کی غرض و غایت بھی اتنی ہی ایک ہے یعنی اسلامی احکام و تعلیمات کی صحیح اور دلنشیں تعبیر و ترجمانی اور اسلامی علوم و فنون نیز تاریخ اسلامی کی محققانہ مرقع نگاری۔ ان کی بیشتر ہی نہیں بلکہ جملہ تصانیف کا مرکزی نقطہ یہی ہے۔ چنانچہ ان کے زمانہ سے لیکر آج تک نہ جانے کتنی تصانیف و تالیفات منظرِ عام پر آئیں مگر کچھ عرصہ بعد وہ فراموش کردی گئیں، جبکہ "سیرۃ النبیؐ" کی سات جلدوں کی مقبولیت اور محبوبیت میں وقت کے ساتھ کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہی ہو رہا ہے اور ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیرت پاک پر اتنا مفید اور بیش بہا مواد کسی دوسری زبان میں موجود نہیں ہے اسلئے اس کے تراجم انگریزی، عربی، فارسی، ترکی اور پشتو وغیرہ میں ہوئے اور دیگر عصری زبانوں میں آج بھی ہو رہے ہیں۔

سیرۃ النبیؐ کے ساتھ ہی سید صاحب کی معرکۃ الآرا تصنیف "تاریخ ارض القرآن" کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی تالیف "سیرۃ النبیؐ" کے مقدمہ کے طور پر شروع ہوئی تھی، لیکن کثرت مواد کی وجہ سے وہ خود ایک مستقل کتاب بن گئی اور دو حصّوں میں شائع ہوئی۔ اس میں قرآن مجید میں مذکورہ مقامات، اقوام اور قبائل کی تاریخی، جغرافیائی اور اثری تحقیق قرآنی بیانات کی روشنی میں پیش کی گئی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ عربی زبان میں بھی اس کے ہم پلہ کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔

سید صاحب کی ناقابل فراموش کتابوں میں "سیرت عائشہ" کا نام بھی ہے، نیز "خطبات مدراس"، "حیات امام مالک"، "رحمت عالم" وغیرہ خالصتاً اسلامی ادب کے ذیل میں آتی ہیں جبکہ ان کی دیگر تصانیف کا بڑا حصہ بھی اسلامی ذہن و فکر کا آئینہ دار ہے، یہاں تک ان کی خالص ادبی تصنیف "خیام" بھی اس رنگ سے خالی نہیں،

★ معاون مدیر روزنامہ آفتاب جدید، بھوپال۔

بلکہ اس کا بنیادی عنصر ہی اس کی مسخ شدہ صورت کو مبینہ الزامات سے صاف کر کے صحیح شکل و صورت اور پس منظر میں پیش کرنا ہے جو اسلامی ادب کی ایک اہم خدمت شمار ہونے کے لائق ہے۔

اسی طرح سید صاحب کے خطبات، مقالات اور مکاتیب کے ہزاروں صفحات کا غالب حصہ اسلامی فکر سے مزین ہے، ان کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی علم و ادب سے تعلق رکھنے والا کوئی پہلو ایسا نہیں جو ان کی باریک بیں نظر سے رہ گیا ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب نے اسلامی علوم و فنون کے متعدد پوشیدہ گوشوں کو ان مضامین میں بے نقاب کیا ہے، اور اپنے قلم کی جولانی کا وہ مظاہرہ کیا ہے کیا اسلامی تاریخ کیا علم و فن اور کیا تہذیب و تمدن ہر ایک کا حق ادا کر دیا ہے۔

سید صاحب کا قلم ہمیشہ اسلام کے دفاع اور اسلامی شریعت کی حفاظت میں سینہ سپر رہا، آپ ایک طرف مستشرقین کے حملوں کا دلیرانہ جواب دیتے رہے، اور دوسری طرف ملکی حالات و مسائل پر گہری نظر جمائے رکھی، اور کوئی بھی مسئلہ جس کی زد دینی حیثیت سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر پڑتی ہو، اس سے بروقت قوم و ملک کو آگاہ کیا، اور ایسی تحریریں یادگار چھوڑیں جن سے آج بھی ہم رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ نابالغی کی شادی کی ممانعت کے لئے شاردا ایکٹ بنایا جانے لگا اور کچھ مسلمان بھی اس کی تائید میں سامنے آئے تو سید صاحب نے نابالغی کی شادی کو غیر مستحسن سمجھتے ہوئے بھی اس پر قانونی پابندی کو غیر ضروری خیال فرمایا، اور رہنما اصول کے طور پر یہ بات تحریر کی کہ کوئی غیر اسلامی حکومت مسلمانوں کے نکاح، طلاق وغیرہ کے مسائل میں اصلاحی قانون بنانے کی مجاز نہیں ہے۔ ناگزیر حالات میں فقہ حنفی کی رو سے یہ ضروری ہے کہ وہ مسلمان قاضی یا والی کے ذریعہ نافذ ہوں۔

اس سلسلہ میں سید صاحب نے اس جانب بھی توجہ دلائی کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد مسلمانوں کے پیش نظر جو معاملات ہیں ان میں ایک مطالبہ یہ بھی شامل کیا جائے کہ آئندہ حکومت میں مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کے تحفظ، ترقی، اصلاح اور استحکام کے لیے ایک جداگانہ نظام ہونا چاہیئے، اس طرح بقول جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن "کلچرل اٹونومی کی صدا پہلی بار سید صاحب ہی نے بلند کی"، اور یہ بھی تحریر کیا کہ: "اگر آسماں کو دیکھ کر موسم کے انقلاب کی پیشن گوئی کی جا سکتی ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ اگر اس قسم کی تدابیر نہیں کی گئیں تو مسلمانوں کی ممتاز ہستی اس ملک میں قائم نہیں رہ سکتی۔" آزاد ہندوستان کے موجودہ حالات سید صاحب کی مذکورہ پیش گوئی کے کس قدر مطابق ہیں، اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

سید صاحب کا قلم اسلام اور مسلمانوں کے دفاع میں زندگی بھر جہاد کرتا رہا جیسا کہ ان کی تمام تحریروں

اور خاص کر اسلام اور مسلمان دشمن طاقتوں کے جواب میں لکھے ہوئے مقالات سے ظاہر ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں ہم سید صاحب کو اردو لٹریچر میں اسلامی ادب کا اہم ادیب اور معتبر اہلِ قلم قرار دے سکتے ہیں، اسلام اور تہذیبِ اسلام سے ان کی فکری قربت کا ایک پہلو وہ تحقیق ہے جو سید صاحب نے اردو زبان کے آغاز کے بارے میں کی ہے اور جس کے تحت اردو کا تعلق "برج بھاشا" سے نہ جوڑ کر سندھی زبان اور اس کے توسط سے عربی سے جوڑ دیا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس بارے میں سید صاحب کے دلائل کی حیثیت کیا ہے؟ اردو زبان پر اس تحقیق سے سید صاحب کی اسلامی ادب کے سب سے بڑے مخزن یعنی عربی زبان سے تعلق اور مناسبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح سید صاحب کی تنقیدی اور سوانحی کتب کے مطالعہ سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زیرِ بحث موضوعات میں تنقید اور سوانح نگاری کے اسلامی اصولوں کو مدِّ نظر رکھا ہے جو نصیحت اور فضیحت کے فرق کو ملحوظ رکھنے کی دعوت دیتے ہیں اور غیبت اور بدگمانی کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں، مثلاً "حیاتِ شبلی" میں سید صاحب نے علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت، کردار اور علمی و ادبی مرتبہ کو ضرور اجاگر کیا لیکن ان کی ذات سے وابستہ بعض غیر ثقہ واقعات سے صرف نظر کیا جو بدگمانی، افترا یا کردار کشی کے ذیل میں آتے ہیں اور ایک دور میں غرض مند ادبی حلقوں کا مرغوب موضوع رہے ہیں۔ جبکہ سید صاحب کی سوانح "خیام" ہو یا "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے ان کے مضامین کا مجموعہ ہو سب میں زیرِ نظر شخصیات سے حسنِ ظن کا پہلو غالب رہتا ہے اور یہی اسلامی تنقید کا مقتضا ہے۔

سید صاحب کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی علوم و فنون پر تحقیقات کے لئے "دار المصنفین" جیسا ادارہ قائم کر کے اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کیا اور اس کو اپنی حیات میں اس درجہ بلند تک پہنچا دیا کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں وہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا، اس کے تحت شائع ہونے والی لاتعداد کتابیں ادب اسلامی کا قابل فخر بہترین ذخیرہ ہیں جن کے مطالعہ سے ایمانی حرارت، مذہبی حمیت اور ملی غیرت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

○

سیّد محمد ہاشم*

عِلمی و ادبی صحافت کے پیشرو

"اے محمد گر قیامت سر بروں آری زخاک   سر برآور دیں قیامت درمیان خلق بیں
خون خلق بے گناہے بر حریم مسجد است   زآستاں بگذشت و مارا خوں دل از آستیں
پیروان دین حق را خون بہ خاک آغشتہ شد   از پے خاکے کہ ہر مسلم بر د سا ید جبیں

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا...... وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

زمین پیاسی ہے، اس کو خون چاہیے، لیکن کس کا؟ مسلمان کا، طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے، ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی، سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا، ہندوستان کی سرزمین بھی پیاسی ہے، خون چاہتی ہے، کس کا؟ مسلمانوں کا، آخر کار سرزمین کانپور پر برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

٣ر اگست کی صبح، انقلابِ حکومت برطانیہ کی تاریخ ہے۔ بہادر سپاہی جس وقت غریب و ناتواں اور غیر مسلّح نوجوانوں پر گولیاں برسا رہے تھے، انھیں کیا خبر تھی کہ یہ لوگ ان نوجوان انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانی عدل و انصاف کو زخمی کر رہے ہیں، انھیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کرتا ہے جس پر حکومت برطانیہ کی عمارت قائم ہے......

وہ کیا عجیب منظر تھا جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست و پا برطانی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، با چشم نم، با دلِ پرغم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بے کسی کا نشان تھا، کئی معصوم بچوں کے ساتھ اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقتِ تعمیر کعبہ اسماعیلؑ و ابراہیمؑ کی زبان پر جاری تھی: ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

یہ پراثر مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائیلر (مجسٹریٹ کانپور) کی سپہ سالاری میں ایک مختصر سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہوتی ہے اور دس منٹ تک اپنی بندوقوں سے اڑا اڑا کر گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے، پردہ جب چاک ہوتا ہے، میدان میں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی لاشیں

---

* شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نظر آتی ہیں جن میں بعض معصوم جانیں بھی ہیں جو افسوس کہ دم توڑ چلیں۔

سر جیمس مسٹن اب کیا چاہتے ہیں؟ کیا دعوائے سابق کے یقین کے لیے کسی اور دلیل کے طالب ہیں؟ ... ہم بتاتے ہیں کہ ان آہنی زنجیروں میں بھی آگ ہے جو اسیرانِ مدافعت ملیّ کے ہاتھوں اور گردنوں میں ہیں، انھیں خبردار رہنا چاہیے کہ زنجیروں کی آہنی جسمانیت دوسری آہنی جسمانیت سے ٹکرا کر شعلہ نہ پیدا کر دے۔

ہندوستان لرزتا ہے، کوئی ہے جو اس کو تھامے؟ ہندوستان مضطرب ہے، کون ہے جو اس کو تسکین دے؟ ہندوستان وقف فریاد ہے، کون ہے جو اس کی فریاد رسی کو آمادہ ہو؟

مقتولین کانپور! تم پر نمازیں نہیں پڑھی گئیں کہ تم مغفور تھے، ہم گناہگار تمہاری مغفرت کی دعا کیا مانگتے؟ ... مجروحین کانپور! تم نے گولیاں کھائی ہیں، نیزوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے، تمہاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں، تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا ہے، تمہیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا جس کے بعد بنی امیہؔ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا...“[1]

یہ انقلاب آفریں اقتباسات مولانا سید سلیمان ندوی کے اس لیڈنگ آرٹیکل سے پیش کئے گئے ہیں جو کانپور کے واقعۂ مسجد سے متعلق ”مشہد اکبر“ کے عنوان سے الہلال میں شائع ہوا تھا۔ ۳ر اگست ۱۹۱۳ء کو کانپور میونسپلٹی نے سڑک چوڑی کرنے کی غرض سے راستہ میں واقع ایک مسجد کا کچھ حصّہ منہدم کر دیا تھا جس کے خلاف کانپور کے مسلمانوں نے اپنے ردّ عمل کا اظہار کیا اور دوبارہ دیوار تعمیر کرنے لگے، اس کے نتیجے میں ان پر گولی چلا دی گئی۔ سید صاحب نے ۱۳ر اگست کی اشاعت میں اپنے مخصوص اور پرجوش لب ولہجہ میں ماتم کیا عام حالات اور سازگار ملکی فضا کے باوجود مدیر کے فرائض جس قدر دشوار گذار اور ذمّہ داریاں جتنی آزمائش افزا ہوتی ہیں، وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں، لیکن یہاں حال یہ ہے کہ جس زمانہ میں انگریزوں کا خوف اور رعب ہندوستانیوں پر اس قدر مسلط تھا کہ کانگریس جیسی تنظیم کے سالانہ اجلاس میں انگریزی حکومت کی وفاداری کی قرارداد سب سے پہلے پاس کی جاتی تھی، ایسے حالات میں انگریزوں کے خلاف خامہ فرسائی کی جرأت آسان کام نہیں تھا لیکن سید صاحب نے انگریزوں کی بربریت اور ظلم کے خلاف اتنا سنگین، اشتعال انگیز اور ولولہ خیز بیان شائع کیا جس کے ایک ایک لفظ سے آج بھی انقلاب انگیزی آشکار ہے، اسی وجہ سے اسے ضبط کر لیا گیا تھا۔[2] لیکن الہلال کے قائم مقام مدیر اور ایک بیباک صحافی کی حیثیت سے اس واقعہ کی رونگٹے کھڑے کر دینے اور قوم کو جھنجھوڑ دینے والی تصویر کھینچنے میں سید صاحب نے کسی مصلحت، خوف، لکنت اور لچک سے کام نہیں لیا، اپنی کھری صحافت کا لوہا منوا لیا، اس طرح کا اداریہ لکھنے میں آج آزاد اور جمہوری

ہندوستان میں بھی اچھے اچھے صحافیوں کے پر جلتے ہیں، لیکن سید صاحب نے ظلم کے خلاف اپنی قلمی تلوار کا جتنا شدید وار کیا، عہدِ حاضر کی صحافت کے لئے سبق آموز ہے اور سید صاحب کی حیرت انگیز صحافتی کامیابی کا بیّن ثبوت۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی محقق ہے کہ الہلال کوئی مقامی سا اخبار نہیں تھا بلکہ اپنے عہد کا مقبول ترین اور انقلاب انگیز ہفت روزہ تھا، اس کو سید صاحب نے اپنی محنت سے چار چاند لگادیے تھے۔

یہ وہ الہلال تھا جو مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں ١٩١٢ء میں ایک دینی، سیاسی، اور معاشرتی پرچے کی حیثیت میں جاری ہوا تھا۔ جس کا اسلوب جلیل اور جس کا انداز فکر متین تھا، حکمت و فلسفہ اور مشرق و مغرب بالخصوص ممالک اسلامیہ کے احوال و اخبار سے معمور، سیاسی، سائنسی اور مذہبی معلومات سے بھرپور اور شعر و ادب کے حاشیے سے مزین۔ جس نے اپنے مقالات اور قرآنی تفسیر کے ذریعہ جرأت، حق گوئی اور راست گفتاری کے اسلامی شعار کو مسلمانوں کے رگوں میں پیوست کرنے کا عزم کیا تھا اور جس کی تاثیر نے پورے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا، اس دور کی گرم ترین سیاست یعنی ترکی، بلقان اور طرابلس کی جنگ الہلال کے انقلاب آفریں موضوعات تھے، اس کے علاوہ سیاسیات ہند و انگلستان اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کو بھی اس میں آئینہ کیا جاتا تھا، ان سب کے پس پشت مولانا آزاد کی ہمہ رنگ، پرپیچ، جاندار اور شرربار نثر جزو لازم کی حیثیت رکھتی تھی، ورنہ یوں تو اس وقت مسلمانوں کے کئی اہم اخبار جاری تھے جن میں "مسلم گزٹ" "ہمدرد" اور "زمیندار" خاص طور سے قابل ذکر ہیں، لیکن یہی وہ واحد اور مقبول ترین نیز خوبصورت ترین بڑے سائز کا اخبار تھا جس کی اشاعت بھی سب سے زیادہ یعنی گیارہ ہزار تھی، اور یہ بات پابندی سے نکلنے والے کسی اخبار کے لئے اس وقت سب سے بڑا اعزاز تھا۔ الہلال کی اس مقبولیت اور معیار کو برقرار رکھنے میں اس کی مجلس ادارت کا بھی نمایاں کردار رہا ہے اور ظاہر ہے یہ بات خود مولانا آزاد کے حسن انتخاب کی دلیل ہے چنانچہ مولانا عبداللہ عمادی، مولانا عبدالواجد ندوی اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ صاحب قلم اور صاحب اسلوب اہل علم نے مختلف وقتوں میں الہلال کو جلا بخشی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کا تعاون تمام ارکان پر ہر لحاظ سے سبقت رکھتا تھا جس کا پورا پورا احساس مولانا آزاد کو بھی تھا یہی وجہ ہے کہ مولانا کے مزاج کی غیر معمولی انانیت اور سیماب وشی سے تکدر خاطر کے نتیجے میں جب سید صاحب نے الہلال سے کنارہ کشی اختیار کر لی تو مولانا نے انھیں دوبارہ الہلال میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی اور پھر رفتہ رفتہ اس خواہش نے اصرار کی شکل اختیار کر لی، سید صاحب نہیں آئے اور واقعی اخبار بند ہو گیا، مولانا نے "البلاغ" نکالا، اس کے لیے سید صاحب کو بھی لکھا اور بڑی دلسوزی اور لجاجت سے انھیں لکھا کہ آپ اگر اسے مکمل لے لیجیے اور جس طرح چاہیے نکالیے، میں اپنا مضمون دیدیا کروں گا

اس کے سوا مجھے اخبار میں کوئی دخل نہ ہوگا۔

سخت اختلافات کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ اصرار سید صاحب کی صحافتی عظمت اور الہلال میں موصوف کے بے مثال کردار کی بھرپور عکاسی کرتا ہے، ورنہ اہلِ نظر واقف ہیں کہ مولانا کی انانیت اس قسم کے اصرار تو کجا خواہش کو بھی راہ نہ دیتی۔ دراصل ایک طرف سید صاحب کے اسلوب میں وہ قوت وصلابت کہ ابوالکلام کا غیاب ظاہر نہیں ہو پاتا تھا، اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی: "ابوالکلام کے طرزِ بیان کی تقلید آسان نہیں، بڑوں بڑوں نے جب اس روش پر چلنا چاہا تو راہ میں پھسل پھسل گئے ہیں، یہ کمال سید صاحب ہی کا تھا کہ شبلیت سے جب چاہا الگ ہوکر ابوالکلامیت اختیار کرلی، اور پھر اس رنگ کو بھی جب چھوڑنا چاہا تو اوراقِ دہر پر نقشِ سلیمانی کی مہر لگادی۔"[۴۳] تو دوسری طرف اسلامی فکر، زمانے کے مزاج اور عالمی مسائل کے ساتھ ساتھ تاریخ پر بھی دقیق نظر کے نتیجے میں حسبِ ضرورت ومعیار ان مسائل کا حل پیش کرنے پر زبردست قدرت اور سلیقہ بھی سید صاحب کا امتیازی وصف تھا، اس کے علاوہ تمام ہی مضامین میں سید صاحب کی حریتِ فکر، آزادیِ رائے اور اظہارِ حقائق کی واشگاف ترجمانی ملتی ہے اور موصوف کی صحافتی شخصیت کی اسی دلآویزی نے مولانا آزاد کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب کا کام محض مضمون لکھ دینا یا مطبع کی ذمہ داریوں میں تعاون دینا ہی نہیں تھا بلکہ اخبار کے بیشتر کام انہی سے متعلق تھے، چنانچہ مولانا دریابادی نے لکھا ہے کہ: "سید صاحب جب الہلال میں پہنچے تو نام کا تو یہ اب بھی ہلال ہی رہا لیکن اہلِ بصیرت دیکھ رہے تھے کہ ہلال بدرِ کامل بن گیا ہے۔۔۔ خود عربی کے قدیم وجدید ماخذوں کی مدد سے مسلمانوں کے لئے دینی تمدنی اور سیاسی وتاریخی ہر عنوان سے متعلق بہترین معلومات پیش کرنا، یہ کام تو سید صاحب کا تھا ہی، باقی خود ہندوستان کی سیاسیات حاضرہ پر مقالہ لکھنے میں سید صاحب اپنے چیف ایڈیٹر سے پیچھے نہ رہے۔"[۴۴]

سید صاحب کے خطوط سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ "افکار وحوادث" کا مستقل کالم وہی لکھتے تھے، اپنے ایک مضمون مطبوعہ ماہنامہ مستقبل کراچی (شمارہ اکتوبر ۱۹۴۹ء) کے حاشیے اور ظہیر احمد صدیقی کے نام اپنے ایک خط میں بھی سید صاحب نے الہلال میں شائع ہونے والے بعض مضامین کی صراحت کی ہے، اور اس صراحت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ الہلال میں ارکانِ ادارت کے مضامین پر مضمون نگار کا نام نہیں لکھا جاتا تھا، بعد میں جب ان مضامین کو کتابی شکل میں لایا گیا تو اخبار کے مستقل ایڈیٹر مولانا آزاد کے نام پر ہی ان مضامین کا بھی شمار کرلیا گیا اور توجہ دلانے پر سید صاحب کو صراحت کرنی پڑی، بہرحال دستیاب معلومات

کے پیشِ نظر الہلال میں سید صاحب کے مضامین کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: الحریۃ فی الاسلام (چھ قسطیں) تذکار نزول قرآن۔ مشہد اکبر (قسط اول)۔ تاریخ اسلام کا ایک غیر معروف صفحہ (چار قسطیں)، قصص بنی اسرائیل (تین قسطیں)۔ افکار و حوادث (مسلسل)۔ عربی زبان اور علمی اصطلاحات (دو قسطیں)، علوم القرآن (تین قسطیں) اور اساطیر الاولین۔ اس کے بعد البلاغ کے لیے بھی سید صاحب نے چند مضامین لکھے مثلاً آثار اسلام (دو قسطیں)۔ اسلام اور سوشلزم۔ اصلاح معاشرت اور اسلام (دو قسطیں)۔ مدارس اسلامیہ (دو قسطیں)

سید سلیمان ندوی کی یہ بالغ نظر صحافت دراصل علامہ شبلی کی مستقل تربیت کی مرہونِ احسان تھی۔ الہلال کی رکنیت سے قبل تقریباً آٹھ سال تک سید صاحب کو علامہ شبلی کی ہر ہر لمحہ معیت و رہنمائی حاصل رہی۔ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کے بعد سید صاحب نے علامہ سے ہی تعلیم حاصل کی، ادب میں جلا پیدا کی اور ذوق ادب کو نکھارا، مضمون نویسی کی مشق کی، تاریخ پر عبور حاصل کیا اور تاریخ ہند سے بہت سے غلط حوالوں کی نشاندہی کی، عربی کا بہت شائستہ ذوق و شعور پیدا کیا، الندوہ کے توسط سے رسائل کی صحافت میں ہنر و سلیقہ اور کمال حاصل کیا تب وہ اس لائق ہوئے کہ الہلال جیسے موقر اخبار کے لئے باعث فخر کہے جا سکیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اخباری صحافت کو موصوف نے صرف ایک محدود مدت تک اختیار کیا ورنہ ہمیشہ وہ رسائل کی ادارت سے ہی وابستہ رہے۔ اس لئے یہاں مختصراً ”الندوہ“ میں سید صاحب کی خدمات کا جائزہ لینا ہی مقصود ہے۔

”الندوہ“ ۱۹۰۵ء میں جاری ہوا جس کے ایڈیٹر مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی اور علامہ شبلی نعمانی تھے اور دراصل رسالہ کے تعلق سے تمام عملی کام مؤخر الذکر ہی کے ذمہ تھا۔ موصوف کی استعداد و صلاحیت کا لوہا خود سرسید بھی مانتے تھے، جس زمانہ میں وہ علی گڑھ میں تھے، ”علی گڑھ منتھلی“ کے اردو حصہ کو چار سال تک انھوں نے ترتیب دیا تھا، یہاں کے ماحول، مزاج، نئے رسائل کے تقاضوں اور اسلوب وغیرہ سے شبلی اچھی طرح واقف تھے، اس کے علاوہ ”اردوئے معلیٰ، علی گڑھ“ سے بھی وہ متاثر معلوم ہوتے ہیں، وہ علی گڑھ سے بدظن ہو گئے تھے لیکن یہاں کی ترقیوں کو بحیثیت ایک دانا و بینا عالم کے نظرانداز نہیں کر سکتے تھے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے یہاں علی گڑھ کی بازگشت سنائی دے جاتی ہے: ”ہاں یہ بتائیے تقطیع کیا ہو؟ کیا ”اردوئے معلیٰ“ کی برابر؟ لیکن خط اس سے جلی ہونا چاہیے ...“[۶] یہاں یہ بات محل نظر ہے کہ ”اردوئے معلیٰ“ اپنے دور کے مقبول ترین معیاری رسالوں میں شامل تھا۔ ظاہر ہے ہر ہر اعتبار سے نوک پلک درست کر کے اپنے وسیع مشاہدہ اور عمیق تجربے کے بعد علامہ شبلی نے ”الندوہ“ جاری کیا، اور اس کو بڑی تندہی سے نکالتے رہے۔ سید سلیمان ندوی کو اس کی نائب ادارت سپرد کی اور اسی وقت سے ان کی تربیت شروع

ہوگئی، ان کے مزاج کو جدید بنانے میں علامہ شبلی کی انہی کوششوں کا ہاتھ ہے۔ اسی دوران سید صاحب نے عربی رسالہ "المقتطف" اور "الہلال" مصر وغیرہ کا مطالعہ کرکے نئی اصطلاحوں اور عربی اسلوب پر قدرت حاصل کی۔

یوں تو سید صاحب مارچ ۱۹۰۶ء سے ہی "الندوہ" سے متعلق ہوگئے تھے لیکن تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۰۷ء میں باقاعدہ اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیئے گئے، اور درمیانی کچھ وقفوں کو چھوڑ کر یہ سلسلہ مئی ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ علامہ شبلی جو ان کے سرپرست اور نگراں تھے، جن کے یہاں ایک ایک لفظ کی احتیاط و حفاظت نگینہ کی طرح ہوتی تھی، بلا ضرورت چند الفاظ بھی در آئیں تو مکروہ، ذرا سی تکرار ہو جائے تو حشو و زوائد سے موسوم۔ ان ہی علامہ شبلی نے خصوصی توجہ سے سید صاحب کی دستگیری کی، وہ ہر ہر قدم پر رہنمائی کرتے اور روشنی عطا کرتے، یہاں تک کہ وہ خود ہدایت کرکے شذرات بھی لکھواتے تھے۔ یہ اعلیٰ معیاری مضامین کی ترتیب و تصنیف کے علاوہ شذرات کو ایک خاص نہج پر لکھنے کی مشق نے سید صاحب کو اس میدان میں بھی لائق و فائق بنا دیا تھا اور چند ماہ میں واقعی ایسا ہوگیا تھا کہ قارئین کو اصلی شذرات نگار کی یعنی علامہ شبلی کی غیر حاضری محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ "علمی خبریں" کے عنوان سے مختلف قسم کی معلوماتی، ایجاداتی اور سائنسی خبریں بھی سید صاحب دیتے تھے، اس کی وجہ سے رسالہ اتنا پرکشش ہوگیا تھا کہ آئندہ شمارہ کا انتظار بڑے اشتیاق و بے چینی سے کیا جاتا تھا۔ یہ امتیاز بھی بطور خاص سید صاحب کا حصہ ہے کہ انھوں نے اردو میں "تازہ مطبوعات" پر تبصرہ نگاری کی بنیاد ڈالی جس نے آج ایک مستقل، اعلیٰ اور مقبول ترین فن کی حیثیت حاصل کرلی ہے، چنانچہ "تاریخ العرب الادبی" پر سید صاحب کا پہلا تبصرہ فروری ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں شائع ہوا۔ اپریل ۱۹۰۸ء میں "تالیفات جدیدہ" کے عنوان سے شیخ عبدالقادر کے سفرنامہ "مقام خلافت"، پیرزادہ محمد حسین خاں بہادر کے ترجمہ "قصیدہ بردہ مع قصیدہ بانت سعاد" اور مولانا اسلم جیراجپوری کی "تاریخ القرآن" پر تبصرہ کیا اور پھر یہ ایک مستقل سلسلہ ہوگیا۔

ایک عرصہ تک سید صاحب اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے یہ رسالہ نکالتے رہے لیکن اگست ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک کے تمام شمارے موصوف نے خود مختاری کے ساتھ نکالے اور شذرات و مطبوعات جدیدہ کے ساتھ ساتھ "واقعات اور خبریں" کا سلسلہ شروع کیا جسے رسالہ کے ابتدائی دور کی "علمی خبریں" کی ترقی یافتہ شکل کہا جاسکتا ہے، اس عنوان کے تحت بین الاقوامی واقعات، نئی علمی تحقیقات، نئے علمی مسائل و مباحث و ملی سرگرمیوں پر بطور خاص اور بالالتزام گفتگو کی جاتی تھی۔ چونکہ رسالہ کسی شخص واحد کی تحریر

پر مشتمل نہیں ہوتا ہے بلکہ مدیر کے فرائض میں دوسرے بہت سے کام بھی شامل ہوتے ہیں مثلاً مقصدی مضامین لکھوانا، رسالہ کے معیار کے لحاظ سے مضامین میں قطع و برید، ان کی تہذیب و تزئین اور ترتیب و تنظیم پر محنت کرنا، زبان و اسلوب کی مطابقت کا لحاظ رکھنا، شذرات میں رسالہ کے مسلک اور دیگر اہم عصری مسائل و موضوعات پر جاذب توجہ ابتدائیہ قلم بند کرنا وغیرہ وغیرہ ۔ سید صاحب بہت عمدگی اور خوبی سے اس سے عہدہ برآ ہوتے رہے، یہ وہ دور تھا جب علماء کے درمیان سب سے زیادہ زیر بحث موضوع مدارس اسلامیہ کے لئے اصلاح نصاب تھا، سید صاحب کو اس سے خاصی دلچسپی تھی اس لئے وہ اس پر پوری طاقت و شدت مگر متانت و سنجیدگی سے لکھتے رہے اور موصوف کی ان کوششوں کو آگے چل کر سند اعتبار و افتخار بھی حاصل ہوئی۔ سید صاحب کی صلاحیت و استعداد سے علامہ شبلی اتنے متاثر و مطمئن تھے کہ ایک زمانے میں جب رسالہ مولانا عبدالسلام ندوی سے متعلق تھا اور حسب دلخواہ نہیں چل رہا تھا تو علامہ نے سید صاحب کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ "ہاں اب الندوہ یوں چلتا نظر نہیں آتا، پھر تم اپنے ہاتھ میں لے لو، جو شرطیں پیش کروگے، منظور کروں گا، مجھ کو الندوہ سے کوئی غرض نہیں، لیکن وہ درحقیقت ندوہ کا ایک اعلان ہے اس کو مٹانا نہیں چاہیے۔"[٨] علامہ کا یہ اعتماد دراصل سید صاحب کی ہمہ جہت ابھرتی ہوئی شخصیت کے پیش نظر قائم ہوا تھا۔

جب سید صاحب رسالہ سے وابستہ ہوئے تو انہماک کا یہ عالم تھا کہ مصر کے الہلال اور المقتطف رسائل کا پابندی سے مطالعہ جاری رہتا، یہ وہ رسائل تھے جن میں برطانوی اور فرانسیسی محققین و مفکرین کی تحقیقی کاوشیں بکثرت شائع ہوتی تھیں۔ سید صاحب ان سے رسالہ کی ترتیب میں خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے تھے، اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے مذہب و تاریخ کے گہرے مطالعہ پر بھی توجہ مرکوز کی، انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ "الندوہ" کے قارئین کی معتد بہ تعداد انگریزی داں اور روشن خیال طبقہ ہے، اس مزاج کا پورا پورا لحاظ رکھتے تھے، چنانچہ تاریخ و مذہب، سیاست و معاشرت اور عصری مسائل پر گہری نظر کے ساتھ ساتھ مطالعہ و مشاہدہ میں وسعت پیدا ہوگئی، استدلال پر عبور حاصل ہوگیا اور استنباط و استخراج نتائج پر ایک ملکہ حاصل ہوگیا۔ اس زمانے میں موصوف نے مختلف النوع علمی، مذہبی، تاریخی، سماجی اور سیرت و سوانح کے موضوعات پر بہت عمدہ اور محققانہ مقالے لکھے، دراصل اسلوب کا تعین شخصیت کی نمو و صلابت اور موضوع و تخاطب کے امتزاج سے ہوتا ہے اس لئے جب سید صاحب علوم القرآن، علم الحدیث، مکررات القرآن، فلسفۂ جدیدہ اور قرآن، فلسفۂ یونان پر مسلمانوں نے کیا اضافہ کیا، علوم جدیدہ، ابن رشد، فن نحو کی مروجہ کتابیں، مادہ کے اجزائے ترکیبی، اسلامی رصدخانے، مذہب اسلام اور علم و عقل، پردہ اور اسلام، فارسی

شاعری اور عرفی شیرازی، مسائل فقہیہ پر ضروریات زمانہ کا اثر، مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و ادب، اشتراکیت اور اسلام، قضا و قدر اور خاتونانِ اسلام کی شجاعت وغیرہ جیسے مختلف النوع علمی مضامین لکھ رہے تھے تو ظاہر ہے ان کا اسلوب عمومی ادارتی عبارتوں سے لازمی طور پر مختلف ہونا چاہئیے تھا۔ پھر اس پر نئے طبقہ کے مزاج کی مطابقت بھی ملحوظ نظر رہتی تھی، اس سے اسلوب و آہنگ کی عمدگی اور رسالہ کی مقبولیت میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوگیا تھا۔ یہی وہ عناصر تھے جنھوں نے علامہ شبلی کی مسلسل نگرانی میں ترقی کرتے کرتے خود علامہ کی حدود کو بھی پار کر دیا، اور اسی وجہ سے آگے چل کر معارف نکالنا اور چلانا سید صاحب کے لئے سہل کام اور دلچسپ مشغلہ بن سکا۔ یہ بھی ترشح ہے کہ اس الندوہ نے صحافت کے روایتی طرز و آہنگ میں علمی وقار، ادبی پاکیزگی و شائستگی، اسلوبی متانت و ندرت اور وسیع تر امکانات پیدا کیے اور صحافت کے معیار کو بلند کر کے اور اس میں انشاء پردازی کے جوہر داخل کر کے ادب کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا اور یہ حال ہوگیا کہ اس میں مضمون چھپنا گویا تحریر و تصنیف کے میدان میں درجہ استناد حاصل کرنا تھا، اسلوب بیان کی پاکیزگی و متانت اس کا نمایاں ترین وصف تھا۔

صحافت و ادارت میں انہماک، سنجیدگی اور خود اعتمادی کی مثالیں الندوہ کے زمانۂ ادارت میں بھی جگہ جگہ مل جاتی ہیں۔ مدیر کے لئے مضمون حاصل کرنا تو خاصا دشوار کام ہوتا ہے، بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ رسالہ کے لئے ایک بھی مضمون نہیں مل سکا، تو سید صاحب نے ہمت ہارنے اور رسالہ ناغہ کرنے پر علوئے حوصلہ کو ترجیح دی، اور ایک موضوع پر خود ہی جم کر بیٹھ گئے، اور وہ مضمون اتنا طویل ہوگیا کہ پورے رسالہ کو کفایت کر گیا، یہی نہیں بلکہ اس کا معیار بھی روایتی طور پر بلند اور پرکشش تھا، اس کا ثبوت مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک بیان سے بھی ملتا ہے جو اس زمانے میں لکھنؤ میں ہی تھے، اور اتفاق سے یہی ان کی ذہنی پیچیدگی کی کشمکش کا دورِ عروج تھا، اس لئے مضمون نگار کے بارے میں انکی رائے کو کافی وقعت دی جاسکتی ہے، چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ "بڑا انتظار مئی ۱۹۱۱ء کے الندوہ کا تھا، خبر مل چکی تھی کہ سید صاحب اس کے لئے ایک مقالہ بڑی محنت سے "اشتراکیت اور اسلام" کے عنوان سے سوشلزم کی تحقیق اور تردید میں تیار کر رہے ہیں، رسالہ بہت تاخیر سے نکلا، یہ انتظار بہت ہی کھلا لیکن جب مضمون پڑھا تو دل باغ باغ ہوگیا۔ الندوہ کی ضخامت کل ۴۲ صفحے ہوتی تھی، خود یہ مقالہ پورے ۴۲ صفحے کا تھا مجبوراً شذرات کے دو صفحے بڑھا کر ۴۴ صفحے کا نکالنا پڑا، ضخامت سے قطع نظر مضمون واقعی بڑی کاوش اور جامعیت کے ساتھ لکھا گیا تھا، اور آج بھی اس میں ترمیم و اضافہ کی گنجائش کم ہی نکلے گی۔ سوشلزم کا حملہ اس وقت بالکل نیا نیا اسلام پر شروع ہوا تھا، اور آج کے نوجوان اندازہ نہیں

کر سکتے کہ اس وقت سوشلزم کے حملے کے مقابلے میں اسلام کی نصرت و دفاع کتنی اہمیت کی چیز تھی، سید صاحب کی علمی دھاک جو آگے چل کر موافقین و مخالفین دونوں کے دلوں پر بیٹھی، اس کی ابتدائی منزلوں میں بڑا دخل اس مقالے کو ہے۔"[9]

مذکورہ بالا موضوعات کے علاوہ الندوہ نے ایک موضوع کو بطور خاص اختیار کیا تھا یعنی علامہ شبلی تو مخالفین اسلام کے لیے پہلے سے ہی تیغ برّاں بنے ہوئے تھے، سید صاحب بھی اس کے لئے سینہ سپر ہو کر مخالفین اسلام کی ریشہ دوانیوں کا ردّ اور محقق جواب دینے پر کمر بستہ ہو گئے، اس طرح موصوف نے علماء کی امیدوں کو پورا کرتے ہوئے جس غرض سے رسالہ جاری ہوا تھا اس میں بدرجہ احسن کامیابی حاصل کی۔ رسالہ کی لوح پر لکھا ہوتا تھا: "علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ" اور حیات شبلی میں ایک جگہ سید صاحب نے خود لکھا ہے: "پرچہ میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے۔"[10] اس کی تائید مولانا شاہ معین الدین احمد نے بھی اپنے ایک تبصرے میں کی ہے: "یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ پرانے عربی مدارس اور علمائے کرام کے خیالات میں الندوہ نے بڑا انقلاب اور صحیح علمی مذاق پیدا کیا۔"[12]

"الندوہ" دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ترجمان تھا۔ سید صاحب ۱۹۱۲ء کے نصف اوّل تک اس کی ذمہ داری سنبھالے رہے لیکن پھر ہمارے تعلیمی اداروں کی عمومی روایت کے مطابق ندوہ کی بھی سیاسی و انتظامی صورت حال بدل گئی، مولانا شبلی ندوہ کے معتمد تھے، ان کا مخالف گروہ زیادہ طاقتور بن کر ابھرا جس کے نتیجے میں مولانا شبلی اور سید صاحب کو ندوہ کے ساتھ ساتھ "الندوہ" سے بھی سبکدوش ہونا پڑا، اس کے بعد ان کے جانشین یعنی مولانا عبدالکریم صاحب اور مولوی اکرام اللہ صاحب ندوی کی ادارت میں یہ رسالہ جاری رہا، لیکن یہ حضرات اس تربیت و صلاحیت اور تجربے سے یکسر عاری تھے جو اس کے سابق مدیروں کا حصّہ تھا، اس لئے چار سال تک اس کو جاری رکھنے کی کوشش کے بعد بالآخر الندوہ کو بند کرنا پڑا۔ ادھر ۱۹۱۶ء میں ہی سید صاحب اعظم گڑھ سے رسالہ "معارف" جاری کر چکے تھے، جبکہ شبلی کا انتقال نومبر ۱۹۱۴ء میں ہو گیا تھا، معارف نے ہند و بیرون ہند میں اعلیٰ رسالہ کی حیثیت سے اعتبار و استناد حاصل کر لیا تھا، اور سید صاحب دنیائے اسلام کے ایک عظیم دانشور تسلیم کئے جا چکے تھے، چنانچہ ندوہ کے حالات نے ایک بار پھر کروٹ بدلی اور ۱۹۲۵ء میں سید صاحب معتمد کی حیثیت سے ندوہ میں واپس آئے اور اس خدمت کو عرصہ دراز تک انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء کا زمانہ آ گیا اور اجرائے معارف کے

وقت سے اس دور تک مسلمانوں کے علمی، فکری، تہذیبی، تمدنی اور مذہبی طرزِ فکر میں نمایاں فرق آچکا تھا۔ سید صاحب تمام اسلامی ممالک کا دورہ کر کے تمام حالات سے واقف ہی نہیں عالم اسلام کے صائب الرائے عالم مشہور ہو چکے تھے، وفد خلافت کے ساتھ لندن، سعودی عرب اور تعلیماتی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ افغانستان کا بیش قیمت سفر کر چکے تھے، اس لئے ان کی نظر میں وسعت اور بصیرت میں عمق و پہنائی آتی چلی گئی۔ اسلام اور مسلمانوں کے ہر ہر مسئلہ پر ماہرانہ رائے ان کا امتیاز و اختصاص بن چکا تھا، چنانچہ اسی عرصہ میں موصوف نے ندوہ میں علماء اجلّ کی ایک ٹیم بھی کاروان اسلام کو ایک خاص نہج سے آگے بڑھانے کے لئے تیار کر لی تھی بالخصوص مولانا مسعود عالم ندویؒ مولانا ابوالحسن ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا محمد عمران خاں ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی اور مولانا ابواللیث ندوی جیسے اجلّہ روزگار ملک و بیرون ملک میں اپنی عظمت کا لوہا منوا رہے تھے، ایسے حالات میں سید صاحب نے ۱۹۴۰ء میں "الندوہ" کو دوبارہ جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائی بنائے گئے، اور سید صاحب نے علامہ شبلی کی جگہ سنبھالی تھی یعنی اب وہ نگراں اور سرپرست تھے۔ یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اس بار الندوہ کس شان کے ساتھ نکلا ہوگا۔ وہ سید صاحب جو ۱۹۰۸ء میں ہی عالمی مسائل اور ملی معاملات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے، ۱۹۴۰ء میں ان کی یہ فکر اور اسلوب کہاں سے کہاں پہنچا ہوگا، زمانے کے تقاضے بھی بدل چکے تھے، سابقہ الندوہ کی لوح کی عبارت "علوم اسلام کا احیاء، تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیم و جدید کا موازنہ" تبدیل ہو کر "مسلمانوں کی تعلیمی و تعمیری خدمت" کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔ اس کے مقصد اور دائرہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے سید صاحب نے ایک بار شذرات میں لکھا کہ "ہر زمانے کی ضرورتیں دوسرے زمانے سے مختلف ہوتی ہیں اور مذاق علمی بھی بدلتا رہتا ہے، الندوہ کے پہلے دور میں جس قسم کے مضامین اس میں نکلتے رہے جدید دور میں وہ رنگ قائم نہ رہ سکے گا، اب حالات کا اقتضا اور ضرورتوں کا تقاضا کچھ اور ہی ہے۔ عربی تعلیم کی ضرورت عربی مدارس کی اہمیت، علوم اسلامیہ کی اشاعت، مسلمانوں کی اخلاقی و اقتصادی اصلاح، مسرفانہ غیر شرعی رسوم و رواج کا ابطال اور اسلامی مسائل کی صحیح تشریح اس رسالہ کی آئندہ زندگی کا مقصد ہے۔"[۱۲]

سید صاحب کا ایک امتیازی میدان عربی صحافت بھی ہے۔ وہ ۱۹۰۱ء میں ندوہ میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۶ء تک مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے زیر تربیت انھوں نے عربی ادب کا ایک رچا ہوا ذوق پیدا کر لیا لیکن اپنے استاد کی تقلید میں متاخرین شعرائے عرب کے دلدادہ ہو گئے تھے، ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی کے زیر اثر سید صاحب کے اندر کئی تبدیلیاں آئیں، اول یہ کہ متقدمین شعرائے عرب کی سادگی اور بے ساختگی دل

میں سماگئی اور متاخرین کا طلسم ٹوٹ گیا، دوسرے شبلی کے سفرنامے سے جدید عربی الفاظ علیحدہ کر کے اس موضوع پر کام کیا، سوم عربی کے جدید رسائل کا پابندی سے اور بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا، چوتھے عربی میں تقریر و تحریر کا ملکہ پیدا ہوا، چنانچہ ۱۹۰۶ء کے جلسۂ تقسیم اسناد کی مشہور عام تقریر اسی مہارت کا ثبوت ہے۔ "البیان" میں عربی میں مضمون لکھنا شروع کیے۔ "المنار" مصر میں بھی سید صاحب کے مضامین شائع ہوئے۔ ندوہ کی معتمدی کے زمانے میں مولانا مسعود عالم کی ادارت میں "الضیاء" بھی سید صاحب نے نکالا۔ اس طرح سید صاحب اردو کے ساتھ ساتھ عربی صحافت میں بھی کوکب تاباں کی حیثیت کے حامل ہیں۔

"معارف" کا مقصد الندوہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا اور بظاہر الندوہ کے بند ہونے کے چار سال بعد ہی معارف جاری ہو گیا تھا۔ لیکن اجرائے الندوہ کے وقت سے اجرائے معارف جولائی ۱۹۱۶ء تک صرف دس برس کے عرصہ میں علمی، دینی، سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور ادبی سطح پر کم از کم پچاس برس کا فاصلہ ہو چکا تھا علماء بیدار اور عوام باخبر ہو گئے تھے، الندوہ کا وار صحیح بیٹھا تھا۔ اس دوران سید صاحب بہت سے میدانوں کے نشیب و فراز اور لیل و نہار سے گذر کر اپنا تشخص منوا چکے تھے، چنانچہ الہلال کا پرجوش دور، پونا کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری اور دار المصنفین کی خدمت اور ان کے جلو میں ہزار رنگوں سے واقف سید صاحب نے معارف نکالا تو اہل ذوق نے اس کی مناسب قدر افزائی کی، الندوہ کے مقابلہ میں معارف میں سید صاحب آزاد، پختہ، بے باک اور معتمد ہو کر نمودار ہوئے، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی ایسی شخصیات نے پیمان رفاقت باندھا اور یوں نئے دور میں نئی ضرورتوں اور تقاضوں کے ساتھ معارف نے ایک اہم چیلنج پیش کیا۔ معارف کی شان نزول جسے ہم اس کا منشور بھی کہہ سکتے ہیں، الندوہ کی توسیعی شکل تھی مگر حد فاصل میں نمایاں فرق تھا: "معارف سے جن خدمات کی توقعات رکھنی چاہئیں اور اس کے مقاصد میں جو نوعیت پیش نظر ہو گی وہ حسب ذیل ہے۔ فلسفۂ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ پبلک میں لایا جائے، عقائد اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے، علوم قدیمہ کو جدید طرز پر از سر نو ترتیب دیا جائے، علوم اسلام کی تاریخ لکھی جائے اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا، علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بہ عہد کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے، اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں جن میں زیادہ تر ان کے مجتہدات اور ایجادات سے بحث ہو، عربی زبان کی نادر الفن اور کمیاب کتابوں پر ریویو کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زر و جواہر امانت رکھے ہیں اور سب سے آخر لیکن سب سے اول یہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق عقلی، ادبی، تاریخی، تمدنی، اور اخلاقی مباحث جو پیدا ہو گئے ہیں، ان پر محققانہ مضامین شائع

کئے جائیں۔ اگر صرف انہی مقاصد پر قناعت کرلی جائے تو بھی ہمارے نزدیک بڑا کام ہے، لیکن چوں کہ یہ مضامین عموماً روکھے پھیکے اور مذاق عام میں بے مزہ ہوں گے اس لئے ادبیات، مباحث حاضرہ، مطبوعات جدیدہ، انتقاد و تقریظ اور استفسارات علمیہ کے عنوانات سے ان کی تلخی و خشکی دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔"[۱۴]

معارف کے شمارہ اوّل سے ۱۹۵۰ء تک اور اس کے بعد کے مشتملات پر بھی نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان سبھی امور کو بدرجہ احسن برتا گیا اور زمانے کے ساتھ ساتھ ان میں ارتقا بھی پایا جاتا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ مدیر معارف کی وسعت علمی کے پہلو بہ پہلو ان کی وسعت مشاہدہ اور عالمی اسفار اور عملی سیاست میں شرکت نے بہت سے نئے حقائق و معارف ان کے سامنے پیش کر دیئے، منقولہ بالا اداریے میں اُردو اور فرقہ واریت کا کوئی خاص ذکر نہیں ہے لیکن معارف اُردو، اسلام اور مسلمانوں کے دفاع میں ہمیشہ سینہ سپر رہا، اداریے میں سیاست کا تذکرہ نہیں لیکن ۱۹۲۰ء سے معارف کے شذرات سیاست سے غیر معمولی طور پر گرانبار رہیں، اور مقالات میں خلافت پر دسیوں مضامین رسالہ کی زینت بنے، نظر بندان اسلام کے عنوان سے مذہبی نوعیت کے سیاسی مضامین لکھے، شاہ سعود کے حجاز پر حملہ کے بعد عرب پر اور پہلی جنگ عظیم کے نتائج کے سامنے آنے کے بعد مسئلہ فلسطین پر بہت سے مضامین معارف میں شامل ہوئے۔ خود سید صاحب نے مختلف مواقع پر جو خطبات دیئے، وہ معارف کے صفحات پر اپنے الگ اور نمایاں مقام کے حامل ہوتے تھے، وفیات ایک طرح کا مستقل عنوان بن گیا تھا اور جتنی اچھی وفیات سید صاحب نے لکھیں ان کے معاصرین میں اس باب میں بھی ان کا کوئی حریف نہیں، باب التقریظ والانتقاد اور مطبوعات جدیدہ کے مستقل عنوان کے تحت اپنے عہد میں تنقیدی تبصروں کے معیاری اور رہنما نمونے سید صاحب نے پیش کئے، اور یہ لکھنے میں تامل نہیں کہ مولوی عبدالحق کا رسالہ "اردو" جو معارف کے پانچ سال کے بعد عالم وجود میں آیا، اپنے اسلوب اور مقصد کے اختلاف کے باوجود اس نے بیشتر رہنمائی معارف ہی سے حاصل کی، معارف کے کالم "ادبیات" کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں مضمون نگاروں کی ہی تربیت نہیں ہوئی ہے بلکہ کتنے ہی شاعروں کو معارف نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔

دراصل اجرائے معارف کے تین سال بعد ہی سید صاحب نے رسالہ کی اہمیت و عظمت اور معیار و مقبولیت کا صحیح صحیح جائزہ لے لیا تھا، اور اپنی علمی و ادارتی بصیرت سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ضرورت کے لحاظ سے رسالہ میں مزید وسعت و گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے، اس لئے وہ ہر لحظہ اس کی بہتری کی فکر میں سرگرداں رہتے، عملی طور پر رسالہ کے دائرہ میں مندرجہ بالا وسعت دراصل ان کی اسی فکر کا مظہر ہے، یہی نہیں

بلکہ جون ۱۹۱۹ء کے شمارہ میں انھوں نے اس کا تذکرہ اور کچھ نئے اضافوں کا اعلان بھی کیا تھا: "مضامین کے لحاظ سے جدت خاص یہ ہوگی کہ شذرات میں ہر مہینہ کے اہم علمی حوادث کے متعلق تبصرہ ہوگا، مقالات کے تحت مشرقی و مغربی علوم و مسائل خصوصاً یورپ کی جدید تحقیقات و مسائل و علوم و نظریات پر محققانہ مضامین ہوں گے، سائنٹفک اور فلسفیانہ مضامین جو یورپ کے اہم ترین رسائل کے نچوڑ اور عطر ہوں گے اور مشاہیر اہلِ قلم کی کوششوں کے نتائج ہوں گے پیش کئے جائیں گے، ریویو اور تنقید کا حصہ خاص طور سے اہم ہوگا جس میں نہایت سنجیدگی، متانت اور وسعت نظر کے ساتھ ماہانہ اردو مطبوعات پر تبصرہ ہوگا۔ یورپ اور امریکا کے تمام علمی رسائل کا ماہوار خلاصہ درج کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مشرقی علوم کے متعلق بھی معارف اپنا فرض فراموش نہیں کرے گا، اکثر نمبروں میں سیر العلم یا دنیا کی علمی رفتار کے نام سے ہر مہینہ اکتشافات و ایجادات و نظریات علمی خبریں درج کی جائیں گی۔"

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مدیر کا کام محض شذرات اور مضامین لکھنا نہیں ہوتا بلکہ حسب منشا و حسب ضرورت ماہرین فن اہلِ قلم سے مضمون لکھوانا، ان کا انتخاب، ان میں حک و اصلاح کرنا وغیرہ بھی اس کے فرائض میں داخل ہے اور یہ جتنا صبر آزما اور جانکاہ عمل ہے، پہلے کے مقابلے میں اس کا اندازہ آج بلکہ اس سیمنار میں ہی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے، سید صاحب نے اس سلسلے میں بڑی پامردی کا مظاہرہ کیا، جب تک مولانا ابو الکلام آزاد کا قلم چلتا رہا ان سے مذہبی و فقہی مسائل پر، اور مولانا عبد الماجد دریابادی سے فلسفہ و نفسیات پر لکھواتے رہے، اس کے علاوہ سائنسی مضامین اردو کے سائنس داں اہل قلم سے لیتے رہے، اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا عبد الباری ندوی، ڈاکٹر میر ولی الدین حیدر آبادی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی وغیرہ کے نام بھی اہم مضمون نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔

معارف، عام رسائل کی طرح دوسرے اہل قلم حضرات کی معاونت سے نکلتا تھا، لیکن اس کے بیشتر شماروں میں اس کے مدیر کی کرم فرمائیاں کچھ زیادہ ہی نظر آتی ہیں، مختلف النوع مضامین و مقالات اور خطبات سے قطع نظر جیسے جیسے سید صاحب کا مطالعہ و مشاہدہ وسیع و عمیق ہوتا گیا، شذرات کے دامن میں وسعت آتی گئی، دنیا کا کوئی موضوع ایسا نہیں تھا جو معارف کے شذرات میں زیر گفتگو نہ آتا ہو، اگرچہ بنیادی حیثیت اسلام اور مسلمانوں کو حاصل تھی اس محور کے گرد ہی ساری دنیا گھومتی تھی اس لئے کہ مسلمان بھی تو کسی خاص گوشے مخصوص و محدود نہیں ہیں، اس طرح ملکی اور بین الاقوامی مسائل کا حسین امتزاج اس میں پایا جاتا تھا، مدیر معارف قابل رشک بات پر معارف کے ذریعہ اپنے قارئین کی حوصلہ افزائی

کرتے، قابلِ تقلید امور کی نشاندہی کرتے، غیروں سے کوئی اچھی بات ملتی تو اس کی مناسب انداز میں تعریف کرتے، اور معیاری چیزوں کو قبول کرنے میں پس و پیش نہ کرتے، اور ان کا ذکر بڑی عزت و احترام سے کرتے، لیکن اگر کسی نے مذہب اسلام اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کو ترچھی نگاہ سے دیکھا تو یہی مدیر اس کے ساتھ ایسی کے شایانِ شان سلوک بھی کرتا تھا جس سے دشمنوں کے حوصلے پست ہو جاتے اور مخالف دوبارہ حملے کی ہمت نہیں کرتا تھا، غرض دین کے راستہ سے اگر کسی نے بھی زہر افشانی کی کوشش کی تو ممکن نہیں کہ سید سلیمان ندوی اس کا دندان شکن جواب نہ دیں، سید صاحب کا یہ اختصاص عہدِ حاضر کے مفکرین اور رہنمایانِ ملت کے لیے ایک مثالی نمونہ ہے۔

اُردو زبان سے محبت کا جو ثبوت سید صاحب نے اس کے تنازعہ کے ابتدائی مرحلہ میں پیش کیا ہے ان کی ہمت و استقلال کی بھی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا، ۱۹۲۳ء سے اپنے آخری وقت ادارت بلکہ وقت حیات (یعنی پاکستان ہسٹری کانگریس کے اجلاس ڈھاکہ ۱۹۳۵ء کی صدارتی تقریر) تک سید صاحب ہر ہر موقع پر اُردو کے لیے ایک جانباز سپاہی کی طرح لڑتے رہے، معارف کے صفحات اس کے شاہد عادل ہیں۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ معارف کے ابتدائی دور میں سید صاحب کبھی ابو الکلام آزاد کے اسلوب سے متاثر رہے کبھی شبلوی رنگ اختیار کر جاتے تھے، لیکن جلد ہی انھیں اس کا احساس ہو گیا، اور پھر انھوں نے ایسے اسلوب کی بنیاد ڈالی جو ان ہی سے مخصوص ہو کر رہ گیا، اور وہ صاحب طرز نثر نگار بن کر ادب کے افق پر ضو فشانی کرنے لگے، چنانچہ ایک طرف وفیات میں محمد علی جوہرؔ، علامہ اقبالؔ، اور مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے تو ایمان کی بات یہ ہے کہ نگینے جڑ دیئے ہیں، مرصع سازی کا فن اسے ہی کہتے ہیں، دوسری طرف علم زبان جیسے خشک موضوع بالخصوص "بعض پرانے لفظوں کی تحقیق" اور "تمہید" کے عنوان سے اتنے دلکش و شیریں مباحث پیش کئے کہ وہ سید صاحب کے اور مقالات میں اپنی مثال آپ ہیں، "نقوش سلیمانی" کے دوسرے مقالات و خطبات جو پہلے معارف ہی کا حصہ تھے، ان میں جگہ جگہ اسلوب سلیمانی اپنی امتیازی شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ سید صاحب کے اسلوب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ منطقیت اور استدلال کے باب میں شبلی کی بہ نسبت سرسید سے زیادہ قریب ہیں، سرسید کا یہ وصف ان کا بیش قیمت جوہر رہا ہے۔ آخری چیز یہ کہ طنز اگرچہ سید صاحب سے بہت دور تک نبھ نہیں پاتا ہے لیکن جب کبھی وہ جوش اور غیظ و غضب کے ساتھ کوئی قطعۂ تحریر قلمبند کرتے ہیں تو اس کی تلخی کی قدمبوسی کے لئے بڑے بڑے طنز نگاروں کی تحریریں مشتاق و بیقرار ہو جاتی ہیں، اور اس کا نشانہ یا تو فرقہ واریت ہوتی ہے یا اردو منافرت کا جواب یا مستشرقین اور مخالفین اسلام کی تحریریں۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو:

"کیا مستشرقانہ ژرف نگاہی کی اس سے اور زیادہ بہتر کوئی دلیل چاہیئے؟ کیا یہ علمائے یورپ کے ناطرفدارانہ مطالعۂ مشرقیات کی سب سے اچھی مثال نہیں؟ اور آکسفورڈ کے عربی پروفیسر کے تبحر اور فضل اور بے تعصبی کی عمدہ نمائش نہیں؟"[۱۴]

غرض سید صاحب نے معارف کو ایک سادہ و شائستہ زبان اور متین اور سنجیدہ اور استدلالیت و تاثیر سے معمور اسلوب عطا کیا اور یہ سید صاحب ہی کا معارف ہے جس کے بارے میں اس کی دس سالہ کارکردگی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے خود مدیر محترم نے ہی لکھا تھا کہ "معارف جس وقت نکلا تھا تو زمانہ، الناظر، نقاد اور مخزن کے علاوہ کوئی قابل ذکر رسالہ موجود نہ تھا اور ان میں الناظر کے سوا بقیہ تمام رسائل کا سرمایہ تمام تر ادبیات تھا، سنجیدہ، ٹھوس، علمی اور محققانہ مضامین کی ملک میں نہ مانگ تھی نہ درآمد تھی۔ معارف اس غیر مطلوبہ سامان کو لے کر جب بازار میں آیا تو خلاف توقع قدر دانوں نے اس کو پسند کیا اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔"[۱۵] شاہ معین الدین احمد ندوی نے معارف کی ہمہ جہت علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ "معارف نے سیکڑوں علمی موضوعات اور مسائل پر اور اسلامیات کی مختلف شاخوں پر مضامین کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس سے علوم اسلامی کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کی جا سکتی ہے۔"[۱۶] اور بقول عبدالمجید سالک: "۱۹۱۶ء میں دارالمصنفین کا مشہور و معروف علمی پرچہ معارف جاری ہوا جو بلا مبالغہ دنیائے اسلام کا بہترین علمی و تحقیقی رسالہ ہے اور جس نے ہمارے تاریخ و تحقیق کے ذخیرہ کو مالا مال کیا۔"[۱۷] اور آخر میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی اس رائے کی تائید کرنی پڑتی ہے کہ: "آئندہ مؤرخ کا قلم جب ہندوستان کی علمی و دینی صحافت کی تاریخ لکھے گا تو اسے معارف کو چار و ناچار ایک بلند و ممتاز مرتبہ اور ایک سنگ میل کا امتیاز دینا ہوگا اور بتانا ہوگا کہ اس شمع نے کتنے اندھیرے گھروں میں اجالا پھیلایا اور پھر اس ایک چراغ سے کتنے چراغ اور جلائے گئے۔"[۱۸]

حوالے: ۱۔ الہلال، کلکتہ، ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء۔ ۲۔ مکاتیب شبلی دوم، مکتوب ۵۲ مع حاشیہ۔ ۳ و ۴۔ صدق جدید، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۵۳ء۔ ۵۔ ہماری زبان، دہلی، ۱۵ر جولائی ۱۹۶۰ء۔ ۶۔ مکتوب شبلی بنام شیروانی مورخہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۳ء بحوالہ نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر اول ص ۱۸۵۔ ۷۔ "چند روز تک میرے مضمون سے پرچہ خالی رہیگا، دیکھو ایسا نہ ہو کہ اپنی حیثیت سے گر جائے" اور "المنار میں اب کے مسلمانان روس کی تعلیمی و تجارتی حالت مفصل چھپی ہے، اس کو الندوہ میں لے لو۔" (مکاتیب شبلی دوم مکتوب ۱۹ و ۱۲)۔ ۸۔ مکاتیب شبلی دوم، مکتوب ۳۴۔ ۹۔ صدق جدید، لکھنؤ، ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۳ء۔ ۱۰۔ حیات شبلی ص ۴۴۰۔ ۱۱۔ حیات سلیمان ص ۱۳۰۔ ۱۲۔ الندوہ، لکھنؤ، جون ۱۹۰۴ء۔ ۱۳۔ معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۱۶ء۔ ۱۴۔ واقدی، معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۲۶ء۔ ۱۵۔ معارف، اعظم گڑھ، جون ۱۹۲۶ء۔ ۱۶۔ حیات سلیمان ص ۱۱۱۔ ۱۷۔ ماہ نو، کراچی، جنوری ۱۹۵۴ء، ص ۲۵۔ ۱۸۔ صدق جدید، لکھنؤ، جنوری ۱۹۵۴ء۔

سید ظل الرحمٰن ★

سیّد سلیمان اور طبِ یونانی

تہذیب و تمدن اسلامی کی تاریخ کا ایک درخشاں باب طب یونانی ہے۔ جو علوم مسلمانوں کی بیش قدر تحقیقات کا موضوع رہے ہیں اور جن کے مطالعہ میں مسلم ماہرین کی بہترین کوششیں صرف ہوئی ہیں ان میں طب پوری اہمیت کے ساتھ شامل ہے۔ فلسفہ، حیاتیات اور دوسرے سائنسی علوم سے براہ راست متعلق ہونے کے باوجود علماءِ دین کا اس سے خصوصی ربط و تعلق رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں نامور فضلاء اپنے وقت کے حاذق طبیب کے طور پر نظر آتے ہیں۔ فلاسفہ و حکماء کے علاوہ مفسرین، محدثین اور فقہائے امّت کی ایک بڑی تعداد کا تعلق اس پیشہ سے رہا ہے۔ علماءِ اسلام کے تراجم کی کتابیں طبّی تاریخ کا خاص ماخذ ہیں، ان تراجم کے ذریعہ طب کی عظیم الشان شخصیتوں کے تذکروں کی ترتیب میں مدد ملتی ہے۔

سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں: "دوسرے مشرقی فنون کی طرح ہماری طب بھی ہمارے مذہبی فرائض ہی کا ایک گوشہ ہے، اسی لئے ہمارے پرانے طبیب نیچر اور فطرت کے بے ارادہ، بے رحم اور غیر مستولی دیوتاؤں کے بجائے شافی مطلق، ہمہ رحم، یفعل مایشاء و یحکم ما یرید خدا کے پرستار تھے۔ ان کی کتابوں کا آغاز صدائے ابراہیمی "اذا مرضت فہو یشفین" اور آیت الٰہی "فیہ شفاء للناس" اور حدیث "لکل داء دواء" اور کلمہ منسوبہ بہ سرور کائنات "العلم علمان علم الابدان و علم الادیان" سے ہوتا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے فنون کی طرح یہ فن بھی دین ہی کے تحت تھا، اسی لئے ہمارے ہر طبیب کے ہر نسخہ کا طرہ پیشانی طغرائے "ہوالشافی" سے مزین ہوتا تھا، وہ ہر مریض کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے ساتھ شافی مطلق کے سامنے سرنگوں ہو جاتا تھا اور وہ ہر مشکل کے وقت اسی مشکل کشا کے روبرو دست بدعا ہوتا تھا، وہ مغرورانہ حتمی احکام لگانے کے بجائے ہمیشہ "انشاء اللہ تعالیٰ" کے دامن میں اپنے لئے پناہ ڈھونڈتا تھا، وہ اپنی تدبیروں اور دواؤں کی تاثیرات کو اپنی فکر، نظر و تدبیر یا دواؤں کے طبعی خواص کی طرف منسوب کرنے کے بجائے مدبر حقیقی اور موثر تحقیقی حکیم علی الاطلاق جل شانہٗ کی طرف منسوب کر کے اپنے کو بندہ بے اختیار ظاہر کرتا تھا۔"[1]

★ صدر شعبہ علم الادویہ، طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

دینی تعلیم کے بعد نہ صرف طب کی تعلیم کا عام دستور تھا بلکہ درسیات میں بھی طب کی کتابیں شامل تھیں۔ ہندوستان میں طب درس نظامیہ کا ایک حصہ قرار پائی، اسی لئے درس نظامیہ کے بیشتر فارغین جو طب کی تعلیم سے بہرہ ور ہوتے تھے اپنے وقت کے ممتاز طبیب ہوئے۔

سید سلیمان (نومبر ۱۸۸۴ء - ۲۲ر دسمبر ۱۹۵۳ء) درس نظامیہ کے فارغ نہیں تھے، ان کی تعلیم ندوۃ العلماء میں ہوئی تھی، جس کے مقاصد میں علوم و فنون کے علاوہ عملی صنائع کی تعلیم بھی تھی، لیکن اس کے نصاب میں طبی کتابیں کبھی شریک نہیں رہیں۔ اس لئے اگرچہ سید سلیمان نے طب کی باضابطہ کتابیں نہیں پڑھیں، لیکن اسلامی علوم اور بالخصوص اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے دوران وہ طب اور اطبار کے کارناموں سے واقف ہوئے، اور مسلمانوں کے ذریعہ جو طبی خدمات انجام پائیں ان سے انھیں پوری بصیرت کے ساتھ آگاہی حاصل ہوئی۔

کسی شخصیت کے مطالعہ میں اس کی تہذیبی اقدار، خاندانی روایات اور تعلیمی و معاشرتی پس منظر کی نہایت اہمیت ہے، سید سلیمان کے ذہنی افق اور خد و خال کے تعین میں ان کا خاندانی پس منظر نظر انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ پٹنہ طبیہ کالج کے جلسہ عطائے اسناد منعقدہ ۱۹۴۴ء کی دعوت کو سید صاحب نے استحقاق ذاتی کے بجائے "استحقاق موروثی" قرار دیتے ہوئے اس فن سے اپنی خاندانی وابستگی کا تذکرہ کیا ہے: "میرا تعلق صوبہ کے اس خاندان سے ہے، جس نے ایک صدی سے زیادہ اس فن کی خدمت کی ہے، میرے نانہال میں غالباً اخیر شاہی زمانہ سے یہ فن باقی ہے، اور میرے دادیہال میں ۱۲۲۵ھ سے جو میرے جد امجد کی تحصیل طب کا زمانہ ہے ۱۳۴۶ھ تک جو میرے بڑے بھائی مرحوم کی وفات کا زمانہ ہے سو برس تک اس فن کی خدمت ہوئی۔ میرے والد ماجد کے ماموں نے غدر سے پہلے دہلی و آگرہ کے اطباء سے تحصیل کی، اور نواب امیر علی خاں باڑھ کے توسط سے واجد علی شاہ کے ساتھ کچھ دن گزارے، اور پھر بہار میں بیٹھ کر آج سے سو برس پہلے مطب کیا، اور فقیرانہ صورت میں امراء و رؤسا میں قبولیت حاصل کی، میرے نانا مرحوم نے غالباً فیض آباد جا کر طب پڑھی، دادا مرحوم نے طب کی تعلیم اسی عظیم آباد پٹنہ میں قاضی القضاۃ قاضی محمد وحید الدین خاں کے یہاں رہ کر حکیم خواجہ عبید اللہ شاہجہاں آبادی اور حکیم اسلم مرحوم عظیم آبادی سے ۱۲۴۵ھ سے ۱۲۵۲ھ تک حاصل کی، اور پہلے بہار میں شاہ اظہر حسین صاحب کے مکان پر ۱۲۵۲ھ میں مطب کھولا، اور پھر شیخوپورہ جا کر ۱۲۵۸ھ میں نوابان حسین آباد اور رؤسائے شیخوپورہ کے اصرار سے مطب قائم کیا، جہاں انھوں نے ۱۳۰۲ھ تک جو ان کی وفات کی تاریخ ہے ان اطراف میں فن طب میں وہ ناموری حاصل کی کہ اب تک اس دیار میں ان کا نام روشن ہے۔ "کیا میواتی بقراط و ارسطاطالیس" ان کی تاریخ

وفات ہے، جو نواب محمد علی خاں صبا حسین آباد کی یادگار ہے۔

والد مرحوم نے طب کا آغاز اپنے والد ماجد سے ۱۲۶۷ھ میں کیا اور کامل ہو کر روسائے اسلام پور و نیہر کی قدردانی سے ۱۳۴۰ھ تک اس فن کی خدمت میں مصروف رہے، بڑے بھائی صاحب نے اسی پٹنہ میں حکیم نصیر الحق صاحب سے طب پڑھی اور مرتے دم تک یعنی ۱۳۴۶ھ اسی کام میں لگے رہے۔ میرے چچیرے چچا حکیم لیاقت حسین صاحب مرحوم حکیم ابراہیم صاحب جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے شاگرد تھے۔ میرے دادا کے نانا حکیم سید خادم حسین صاحب بھی نامور طبیب تھے، دادا صاحب لکھتے ہیں:

میر خادم حسین فائق بود　　جد امجد طبیب حاذق بود
عالم طب و ماہر ہر فن　　بے شک و شبہ آں طبیب زمن !

ان کے صاحبزادہ حکیم کاظم حسین بھی طبیب تھے، اور واجد علی شاہ کے مٹیا برج میں جاکر اکتساب فیض کیا تھا، میرے بڑے پھوپھا حکیم نور الحسن نے پٹنہ میں تحصیل کی اور استھاواں میں پچاس ساٹھ برس تک مطب گرم رکھا، اور ایسی حذاقت دکھائی کہ ان اطراف کے لوگ آج بھی شاہد ہیں۔ ان بزرگوں کے قلمی اور مطبوعہ متروکات اور سفینے اب تک موجود ہیں، اور ان کی حفاظت کی سعادت اس ناچیز کو حاصل ہے۔"[2]

سید صاحب کے دادا میر محمدی کی طب میں دو کتابیں "قرابادین محمدی" (تاریخی نام "مخزن الحکمۃ العلیا") اور "دستور العلاج" ہیں۔ جنھیں سید صاحب کے والد حکیم سید ابوالحسن کی تعلیم کے لئے لکھا گیا تھا۔

سید صاحب کے بڑے بھائی مولانا حکیم سید ابو حبیب (وفات ۱۹۲۶ء) سلسلہ مجددیہ کے بھوپال کے مشہور بزرگ شاہ ابو احمد (وفات ۱۹۲۳ء) کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اور سید سلیمان کا جہاں اپنے استاد مولانا شبلی کے واسطے سے بھوپال سے ربط قائم ہوا، جس کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے وہاں اس شہر سے ان کا پہلا خاندانی رشتہ اپنے برادر مکرم کے ذریعہ قائم ہوا تھا۔ انہی علمی و روحانی سلسلوں نے بعد میں سید صاحب کے بھوپال سے رشتہ کی بنیادیں استوار کیں۔

سید سلیمان اور طب کے تعلق سے یہ حسن اتفاق بہت عجیب ہے کہ انہوں نے ابتدائی اور آخری زمانہ میں جن مضامین پر قلم اٹھایا ہے ان میں طب یونانی بطور موضوع شامل ہے۔ ان کے ابتدائی مضامین میں ابوالقاسم زہراوی کی جراحیات پر شہرۂ آفاق تصنیف "کتاب التصریف" کا تعارف ہے جو ۱۹۰۸ء میں الندوہ میں طبع ہوا تھا، اور آخری مضامین میں ابن سینا پر وہ مضمون ہے جسے انہوں نے وفات سے چند ماہ پیشتر قیام پاکستان کے دنوں میں ۱۹۵۲ء میں حکومت عراق کی جانب سے ابن سینا کے جشن ہزار سالہ پر منعقدہ ایک عالمی اجتماع کے لیے لکھا تھا۔

پٹنہ کے صدارتی خطبہ کے علاوہ مارچ ۱۹۳۳ء میں جب سید صاحب علی گڑھ تشریف لائے تو طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خاص طور پر مدعو کئے گئے۔ طبیہ کالج میگزین اپریل ۱۹۳۳ء میں درج مختصر روئداد کے مطابق سید صاحب کے یونیورسٹی قیام کے دوران طبیہ کالج کے طلبہ نے نہ صرف ان سے استفادہ کیا بلکہ طبیہ کالج کے ندوی طلباء کی طرف سے انہوں نے چائے کی دعوت بھی قبول کی اور طبیہ ہوسٹل کو شرف بخشا اور موقع بموقع پند و نصائح سے طلباء کو سرفراز فرمایا۔ اس یادگار موقع پر ایک تصویر بھی لی گئی تھی۔ مزید یہ کہ سید صاحب طبیہ کالج بھی تشریف لے گئے، وہاں ان کے اعزاز میں جلسہ کا انعقاد ہوا، سید صاحب نے طب یونانی پر عالمانہ تقریر کی۔ انہوں نے علمی، اقتصادی، ملکی اور اسلامی حیثیات سے طب یونانی کی برتری اور ضرورت کو مدلل ثابت کیا۔ تقریر میں فنی نکات بھی زیر بحث آئے[۲] اس موقع پر موجود استاذی شفاء الملک حکیم عبداللطیف مرحوم نے راقم سے بیان کیا تھا کہ سید صاحب کی یہ تقریر طبی الفاظ و اصطلاحات اور فنی مسائل پر مبنی اس قدر دلپذیر تھی کہ کسی بڑے سے بڑے عالم طب ہی سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے اسلامی طب کی تاریخ بیان کرتے ہوئے طلباء کو دیسی طب کے حصول کی ترغیب دی اور اس کی ضرورت ان الفاظ میں واضح کی: "ہندوستان کی صحت عامہ کا دار و مدار ولایتی طب پر نہیں ہے جو طب کے ساتھ تجارت بھی ہے، بلکہ دیسی طب پر ہے جس کی دوائیں ملک میں پیدا ہوتی ہیں اس لئے طبیہ کالج کے طلباء کو ڈاکٹر بننے کے بجائے طبیب بننے کی کوشش کرنا چاہیے۔"[۴]

سید صاحب کے یہاں جن موضوعات کو مرکزی یا نمایاں حیثیت حاصل ہے ان میں طب اگرچہ شامل نہیں ہے لیکن اپنے تاریخی ذوق اور اسلامی علوم سے اپنے شغف کی وجہ سے انھوں نے جن طبی خیالات کا اظہار کیا ہے اور طب یونانی کے تعلق سے ان کے ہاں جو چیزیں ملتی ہیں وہ اسلامی علوم و معارف سے دلچسپی کے پس منظر میں نہایت اہم ہیں۔ ان کی تصانیف اور مضامین کے ذریعہ طبی معلومات پر مشتمل خاصا مواد جمع کیا جا سکتا ہے۔ "عرب و ہند کے تعلقات" اور تجارتی و علمی روابط میں انھوں نے طب اور ادویہ سے متعلق قیمتی تحقیقات پیش کی ہیں۔ عرب تجارتی قافلوں کے ذریعہ ہندوستان سے برآمد کی جانے والی اشیاء میں دوائیں شامل ہیں۔ سید صاحب نے اصل مآخذ کے ذریعہ ان پر قلم اٹھایا ہے۔ ہندوستان سے جو سامان تجارت عرب جاتا تھا اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "اس میں بعض جڑی بوٹیاں اور پھل داخل تھے، چنانچہ عربی میں ان چیزوں کے نام سنسکرت کے ہیں۔ مثلاً مشک (موشکا)، کافور (کپور)، صندل (چندن)، قرنفل (کنشک پھل)، فلفل (پپل)، زنجبیل (زنجابیرا)، نارجیل (ناریل)، موز (موشہ)، کاذی (کیوڑا) سنسکرت کے لفظ ہیں۔ عود ہندی، قسط ہندی، تمر ہندی اپنی نسبت خود ظاہر کرتے ہیں۔"[۵]

ابن ندیم اور ابن ابی اصیبعہ نے سنسکرت کی بہت سی طبی اور فلسفیانہ کتابوں کے نام گنائے ہیں جو عربی میں منتقل ہوئی تھیں۔

تاریخی موضوعات اور اسلاف کے کارناموں پر سید صاحب نے خاص طور پر لکھا ہے، "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی و علمی ترقی" کے عنوان سے طب کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں: "ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے طب میں چرک اور شسرت کی کتابیں مشہور تھیں، مسلمانوں کا علم طب ترقی پاکر عرب، یونان، ایران اور ہندوستان کے تجربات کا خلاصہ ہو چکا تھا اور خود انھوں نے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا تھا اس لیے یہ نیا علم طب ہندوستان کی قدیم طب پر امتیاز رکھتا تھا۔"[6]

ہندوستان کے علم طب میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جو ترقیاں رونما ہوئیں انھیں سید صاحب نے اس طرح گنایا ہے:

۱۔ طب وغیرہ علوم ہندوستان میں پہلے سے موجود تھے لیکن ان کی تعلیم اولاً تو مخصوص لوگوں کو ہوتی تھی، دوسرے یہ کہ ان علوم کے متعلق دنیا کی دوسری قوموں کی جو تحقیقات تھیں اس سے یہاں سرتاپا ناواقفیت تھی، مسلمان علماء نے ان کے نصاب تعلیم کو ان فروگزاشتوں سے پاک کیا۔

۲۔ حاکم قوم اپنے علوم و فنون کو محکوم قوم کے علوم و فنون سے بہت بالادست سمجھتی ہے اور اس سے استغنا برتتی ہے، لیکن مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ایسا نہیں کیا، ہندی علم طب کی بیسیوں کتابیں انھوں نے اپنی زبان میں منتقل کیں اور اپنا علم طب ہندوستان میں پھیلایا، خاص اہل ہند کے مزاج اور طبیعت کا خیال کرکے خود انہی کے علم طب کو فارسی میں منتقل کیا، اور شاہی حیثیت سے اس کو مستند قرار دیا، اطباء کے مجربات میں سینکڑوں دوائیں ہندوستان زا ہیں۔ اسی طریقہ سے ویدوں نے مسلمانوں کے سینکڑوں نسخے دوائیں اور اصول علاج اپنے ہاں لے لیے، اور اس طرح مل ملا کر ایک ایسا طرز علاج رائج کیا، جو ہندوستان کے حالات کے مطابق تھا۔

۳۔ پہلے ویدوں میں وہ دوائیں متداول تھیں جو ہندوستان میں پیدا ہوتی تھیں، طب اسلامی نے تمام دنیا کے ملکوں میں جو دوائیں اور جڑی بوٹیاں زیر تجربہ آچکی تھیں، ان کو ہندوستان میں رواج دیا، ان کے فوائد اور منافع لوگوں نے سیکھے، مفردات کے ذخیرہ کو بے حد بڑھا دیا۔

۴۔ دواؤں کی ترکیب میں عرق، معجون، قیروطی، سفوف وغیرہ مختلف طریقوں کو پھیلایا۔

۵۔ چیچک وغیرہ متعدد بیماریاں جن کو یہاں وہم پرستی سے دیوتاؤں، دیویوں اور بھوت پریت کا اثر سمجھا جاتا تھا، اور اس لیے ان کا طبی علاج نہیں کیا جاتا تھا، ان کو لائق علاج بتایا۔

سید صاحب نے لکھا ہے: "وہ طب جس کا ہیولیٰ دمشق میں تیار ہوا تھا اور جس میں زندگی کی روح بغداد میں ڈالی گئی، اور جس میں شباب کی قوت شیراز پہنچ کر آئی تھی اس نے دلی آ کر مرحلہ اربعین کی منزل طے کی اور اس کی جوانی اپنے پورے کمال و عروج کو پہنچی، اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستان کے بادشاہوں کی قدردانی نے اپنے انعامات سے اور ہندوستان کی سرزمین نے اپنے نباتات کی فراوانی اور دواؤں کی بہتات سے اس کے دواخانوں کو بھر دیا۔"۷

اسی مضمون میں سید صاحب نے جہاں ہندو مورخین، ہندو فارسی شعراء، ہندو فارسی ادباء، ہندو لغت نویس اور علوم عقلیہ کے ہندو علماء کا تذکرہ کیا ہے وہاں طب میں ہندوؤں کی خدمات کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ہندو طبیبوں میں انھوں نے سری بھٹ (سلطان زین العابدین کے طبیب) مہادیو، بھیم ناتھ، نارائن، شیوجی، پورن سنگھ، لالہ کھیم نرائن کھتری، منتھن لال، تلسی داس، سکھانند کا ذکر کیا ہے اور سکھ راج، منشی لچھمی نرائن گنجاری، رام پرشاد عظیم آبادی (مؤلف "میار الامراض" تالیف ۱۲۴۷ھ) رائے منوہر لال فلسفی (وفات ۱۲۴۸ھ مؤلف "مفردات طب") لالہ سوہن لال سندیلوی، بجو لال تمکین حیدرآبادی (مؤلف "مجربات طبی") پنڈت لالہ چندر (مؤلف "کحل الابصار") دیا ناتھ (اس نے ویدک سے "پاکا ہولی کا" کا فارسی ترجمہ کیا) منشی مہتاب نرائن (خواص ادویہ پر "ضروری الطب" کا مؤلف) کا نام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ ان ہندو طبیبوں کی فہرست ہے جنھوں نے فارسی زبان کو اپنے اظہار خیال کا آلہ بنایا، بیسیوں مصنفین اس کے علاوہ ہیں جنھوں نے اسلامی طب کو ہندی، مرہٹی، بنگالی اور تلنگی میں منتقل کیا۔ تلنگی کی بعض طبی کتابوں کے نام کتب خانہ آصفیہ کی فہرست میں موجود ہیں۔ یہ اسی وسعت کا اثر تھا کہ شہروں کو چھوڑ کر دیہات اور قصبوں تک ہندو بنیے طبی دواؤں کے بڑے بڑے عطار بن گئے، اور عرب و ایران و ترکستان کی دوائیں ان کی دوکانوں پر بکنے لگیں، اور زمانہ کی شدید مخالفتوں کے باوجود ان کے آثار اب تک باقی ہیں۔"۸

سید صاحب نے واضح کیا ہے کہ "ہندوستان میں دربار شاہی میں مسلمان اطباء کے ساتھ ہندو طبیبوں کا رہنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ ہندو علماء کے مختلف طبقوں میں سے جو طبقہ شاہان اسلام کی جانب پہلے رجوع ہوا وہ ہندو طبیب تھے، سب سے پہلا برہمن جس کو ترک شاہان دہلی کے یہاں اعتبار ہوا وہ بھی ویدی تھا جس کا نام گنگو برہمن تھا، اس کے نام سے جیسا کہ مورخین لکھتے ہیں بہمن شاہی سلاطین دکن پیدا ہوئے۔"۹ شفاء الملک حکیم عبد اللطیف فلسفی نے اپنے رسالہ "ہماری طب میں ہندوؤں کا ساجھا" میں سید صاحب کے اس مضمون سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا ہے اور وہ اس کا اہم ماخذ ہے۔۱۰

سید صاحب کے مضامین میں جہاں "الفہرست" ابن ندیم، "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" ابن ابی

اصیبعہ، طب نبوی، رسالہ فی الحصٰی فی الکلیہ والمثانہ، رسالہ جدری والحصبہ، رسالہ برء الساعۃ، کتاب الحاوی محمد بن ذکریا رازی، فردوس الحکمۃ علی بن ابن طبری، کامل الصناعۃ علی بن عباس مجوسی، عمدۃ الجراحین ابن القف، مختارات ابن ہبل، جامع ابن بیطار، تحفۃ المومنین، مجمع الجوامع، مخزن الادویہ، معدن الشفار سکندر شاہی، اختیارات قاسمی، ارمین میڈیسین ای جی براؤن، قانون ابن سینا کے انگریزی ترجمہ وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں، وہاں دار المصنفین میں ان کے زیر اہتمام جو بیرونی مطبوعات منگوائی گئی تھیں ان میں طبی مصنفین کی بعض اہم کتابیں بھی شامل تھیں جن سے اس وقت تک ہندوستان کے طبی اداروں کے کتب خانے خالی تھے۔

سید صاحب نے صرف تاریخی حیثیت سے طب اور اطباء پر نہیں لکھا ہے، اور نہ محض ماضی کی داستان دہرانے پر اکتفا کیا ہے، بلکہ طب کے حال اور مستقبل سے بھی بحث کی ہے، اور نظریات و فلسفہ کے علاوہ درپیش طبی مسائل پر بھی اظہار رائے کیا ہے۔ طب میں زیر استعمال دواؤں کے بارے میں انھوں نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے، وہ لکھتے ہیں: "ان کی زاد و بوم کی تحقیق یہ ظاہر کردے گی کہ اس طب کو دنیا بھر کی تجربہ گاہوں سے یکساں تعلق رہا ہے۔ عرب اگر اس کا مولد، شام اس کا منشا، عراق اس کا گہوارہ، مصر اس کا بازیگاہ اور اسپین اس کا مرغزار رہا تو دوسری طرف ترکستان اس کا سیرگاہ، ایران اس کی تجربہ گاہ اور ہندوستان کی سرزمین اس کا دار الشباب ہے۔ اس طرح اسپین سے لیکر ہندوستان تک تمام طبی تجربے اس اسلامی طب کے اجزا و عناصر ہیں۔ قسط ہندی، عود ہندی، ساذج ہندی، سنائے مکی، مصطگی رومی، آلوئے بخارا، اجوائن خراسانی، ثعلب مصری، نمک لاہوری، شقاقل مصری، ریوند چینی، دار چینی، صبر سقوطری، عشبہ مغربی، زہر مہرہ خطائی، زیرہ کرمانی، گل ارمنی، گل ملتانی، گل داغستانی، بورہ ارمنی، افسنتین رومی، عقیق یمنی، گلنار فارسی، تربد اکبرآبادی، اسگند ناگوری، صمغ عربی، شیرخشت ولایتی، انار قندھاری، یہ نام سرسری زبان پر آگئے ہیں، ہمارے اطباء اس قسم کے اور بیسیوں نام گنا سکتے ہیں، جس کا دائرہ اسپین سے لے کر چین تک کی سرزمین کو محیط ہوگا۔"[۱۱]

سید صاحب نے لکھا ہے: "زمانہ کے حالات بدل گئے ہیں، نئی طب سامنے ہے، حکومت کی قدردانی کے نہ ہونے سے گو اکثر قدیم مشرقی علوم و فنون موت کے گھاٹ اتر گئے ہیں، تاہم طب یونانی اب بھی اس کے مقابلہ میں کھڑی ہے اور قبول عام کے زور سے زندہ ہے۔ اطباء قدیم نے دوسری قوموں کے تجربوں سے فائدہ اٹھانے میں کبھی تعصب کو راہ نہیں دی ہے، اس بنا پر اس زمانہ میں جو نئے نئے تجربے اور نئے نئے نظریے اور جدید طرق تشخیص اور ادویہ سازی کے جو طریقے پیدا ہو گئے ہیں ان سے بھی

طب یونانی پوری طرح مستفید ہوگی۔ موجودہ طب جو اخلاط اربعہ کے نظریہ پر قائم ہے اپنی حد میں بالکل صحیح ہے لیکن محض یونانی قیاسات طبعی کی بنا پر دواؤں میں کیفیات اربعہ کے وجود پر زور دینا قیاس سے تجربہ کو رد کر دینا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ متاخرین نے اپنی تحقیقات میں تجربوں کے مقابلہ میں اس قیاسی چیز کی اہمیت کم کر دی ہے۔"

"اخلاط اربعہ کے توازن و عدم توازن سے مزاج کا اعتدال و انحراف ہوتا ہے اور صحت و مرض کا وجود ہوتا ہے۔ یہ تشریح تمام تر تجربی اور سراسر صداقت ہے، ڈاکٹری میں ہر چیز جراثیم کا مخزن ہے، اور علم الامراض علم جراثیم کا دوسرا نام ہوگیا ہے اس کی تحقیق روز بروز بڑھ رہی ہے، اس کو اس حد تک ماننے میں کیا ہرج ہے کہ غذا پانی اور سانس کی ہوا کے ساتھ جراثیم شامل ہوکر فساد کا باعث ہوتے ہیں۔"[۱۲]

دواؤں میں کیفیات اربعہ کے وجود کے بارے میں سید صاحب نے جس خیال کا اظہار کیا ہے اس سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن اخلاط اربعہ کی تشریح اور علم الامراض و علم جراثیم کے تعلق سے انھوں نے جو لکھا ہے وہ عمیق طبی مطالعہ پر مبنی ہے۔

سید صاحب نے قدیم طبی کتب کی فراہمی ان کی حفاظت اور اشاعت کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے آلات سے کام لینے پر بھی زور دیا ہے اور علم جراحی، کحالی اور علم قابلہ کی اہمیت واضح کی ہے، اصلی اور تازہ دواؤں کی فراہمی اور بہم رسانی کی طرف سے غفلت پر انھیں افسوس ہے، انہوں نے اسے طب کی کمزوری قرار دیتے ہوئے لکھا ہے: "اب تک یہ کام بنیوں اور خالص دوکان داروں کے سپرد ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عمدہ اور تازہ دواؤں سے ہم محروم رہتے ہیں، اس پوری مجرمانہ غفلت کے باوجود اگر ان مفردات سے فائدہ پہنچتا ہے تو اس طب کی یہ بھی کرامت ہے۔"[۱۳]

وہ علاج بالمفرد کی افادیت کے جہاں قائل ہیں وہاں موجودہ زمانہ میں مرکبات کی ضرورت اور اہمیت بھی انھیں تسلیم ہے، لکھتے ہیں: "مفردات سے علاج کا اسکول جو لکھنؤ میں رواج پذیر تھا، وہ اس لحاظ سے کہ ہر نسخہ ہر شخص کے موجودہ حالات کے مطابق ہوتا تھا بہت کامیاب تھا، مگر دردسری کے باعث اب سرعت سے اس کی جگہ مرکبات سے علاج کا طریقہ سہل الحصول ہونے کے سبب سے لے رہا ہے۔"[۱۴] انھوں نے مرکبات کی عمدگی اور صفائی کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

طبیہ کالجوں کے طلبا میں ایلوپیتھی سے مرعوبیت اور ڈاکٹر بننے کا رجحان سید صاحب سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ انھوں نے لکھا ہے: "تعلیمی نقص ترقی کے نام سے ان درسگاہوں میں پھیلایا جا رہا ہے اور وہ

ایلوپیتھی کے ناقص طریقوں کی ادھوری تقلید کا شوق ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری ان درسگاہوں کا طلیب "طبیب" سے زیادہ ڈاکٹر بننے کا شائق ہے۔"[۱۵]

طبی اخلاقیات (MEDICAL ETHICS) کے تعلق سے انہوں نے جن زریں خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس موضوع کے سلسلہ میں اہم جگہ پانے کے مستحق ہیں: "طبیب کی ایک شفقت بھری نگاہ مایوس مریض کے لئے آب حیات کا جام نوشیں بن جاتی ہے، حرص و طمع اور دولت دنیا کے لالچ سے ایک شریف طبیب کا دامن پاک ہونا چاہیئے، آپ کا تعلق کائنات کے اس راز سربستہ سے ہے جس کا نام موت و حیات ہے، آپ کے سامنے خدا جانے موت و حیات کے کیسے کیسے موثر اور حیرت انگیز واقعات آئیں گے، ان حادثوں سے ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کی قوت میں اضافہ کا کام لیں، خدمت خلق میں مصروف ہوئیے اور بلا تفریق مذہب و ملت غمزدوں کی غمخواری اور بیماروں کی تیمارداری اور دکھی لوگوں کے دکھ درد کو امکان بھر اخلاص اور ایمان داری اور محنت اور دیانت سے کم کرنے کی کوشش کیجیے۔"[۱۶]

حوالے:

۱ و ۲ - معارف، ج ۵۸، ع ۶، دسمبر ۱۹۴۶ء، ص ۴۱۸ و ص ۴۰۶ ۲ - طبیہ کالج میگزین، اپریل ۱۹۳۳ء، ص ۳

۴ - حیات سلیمان ص ۲۹۷ - ۲۹۸ ۵ تا ۷ - مقالات سلیمان، ج ۱، ص ۲۰۱، ص ۸۷ ۸ - معارف دسمبر ۱۹۴۶ء

ص ۴۱۲ - ۴۱۳ ۹ - مقالات سلیمان ۱۰ - ہماری طب میں ہندؤں کا ساجھا، مطبوعہ علی گڑھ،

۱۱ تا ۱۶ - معارف دسمبر ۱۹۴۶ء، ص ۴۰۸، ۴۱۴، ۴۱۶، ۴۱۸، ۴۱۹

محمد راشد ندوی★

سیرۃ النبیؐ اور چند جدید عربی کتب سیرت

علامہ شبلیؒ نے سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا پروگرام ۱۹۰۶ء میں بنایا تھا۔ آہستہ آہستہ اس پروگرام نے ان کے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا کردی کہ ان کو سیرت کی تالیف کے سوا کسی چیز کی فکر نہیں تھی۔ اپنی اس کیفیت کا ۱۹۰۶ء سے لیکر ۱۹۱۲ء تک کے خطوط میں بار بار ذکر کرتے ہیں، اور ایسا لگ رہا ہے کہ انھوں نے اپنے اس ذاتی مسئلہ کو ایک قومی اور ملی مسئلہ بنا دیا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جن حالات کے تحت ان کے دل میں سیرت کی تالیف کا تقاضا پیدا ہوا تھا وہ بھی عجیب وغریب ہیں۔ علی گڑھ کے دوران قیام انھوں نے مستشرقین کی کتابوں کے اثرات نوجوانوں پر دیکھے، دوسری طرف عرب کے قدیم مصادر میں سیرت کی کتابوں میں واقعات کی ترتیب وتنظیم کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا جس میں ہر زمانہ کے مصنف ومؤلف نے اپنی ذہنی صلاحیت اور ماحول کے مطابق کام کیا تھا۔ چنانچہ شبلی پر ایک ایسی دھن سوار تھی جس نے ان کے احباب اور شاگردوں کو بھی سرشار کردیا، چنانچہ اسی کیفیت اور جذبے کے ساتھ سیرت کے اس کام کو آگے بڑھایا۔ علامہ شبلی نے عوام سے لے کر ریاستوں کے فرمانرواؤں کو بھی اس کام میں شریک کرلیا تھا، اور ان کی اعانتوں کے ہمیشہ مشکور وممنون تھے، لیکن اُن کے ذہن میں یہ بات ہمیشہ تھی کہ کسی بھی تصنیفی کام میں دوسروں کا سہارا نہیں لینا چاہیے، بلکہ اپنی ذاتی محنت اور شوق، عزم وحوصلہ ہی کسی کام کو آخری منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ ان کی فکر کی غمازی ان کا وہ خط کرتا ہے جو انھوں نے ۲ نومبر ۱۹۱۲ء کو منشی امین صاحب کو بھیجا تھا لکھتے ہیں:

> ”میں جانتا ہوں کہ کام دو برس میں نہ ہوگا، یہ بھی احتمال ہے کہ سرکار بھوپال رقم بند کردیں، لیکن روپیہ کا نہیں میری جان کا معاملہ ہے۔ ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا، اور اگر مر نہ گیا اور آنکھ سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔“[۱]

★ صدر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

شبلی کی نظر میں تقریباً تمام کتب سیرت تھیں، ادھر مستشرقین نے حضورؐ کی شخصیت کو مجروح کرنے کی جو دانستہ کوششیں کی تھیں، ان سے بھی واقف تھے اور جن بنیادوں پر انھوں نے یہ کوششیں کی تھیں شبلی کے لیے مضحکہ خیز تھیں۔ اس لیے ان کو یقین تھا کہ جب حقائق اور صحیح واقعات کی روشنی میں کام شروع کریں گے تو ان کے تزویر و تدلیس کے شیش محل خود بخود پاش پاش ہو جائیں گے۔ کیونکہ بقول:

جو شاخ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس کتاب کی تالیف و تصنیف کا محور شبلی کی وہ دھن تھی جس نے ان کو بے قرار کر دیا، اس بے قراری میں قرآن مجید، حدیث نبوی اور سیرت طیبہ کے شب و روز کے مطالعہ نے مزید اضافہ کر دیا تھا، جن سے ان کے ذہن میں بالیدگی، قلم میں شوخی و رعنائی، واقعات کی ترتیب و تنظیم میں غیر معمولی احتیاط پیدا ہوگئی۔ میری حقیر رائے میں سیرت نگاری کی تاریخ میں یہ پہلی کوشش تھی جس میں فن سیرت، فکر و وجدان اور تحقیق و جستجو کا مرقع بن گیا۔

شبلی کے شاگرد رشید، سیرت نبوی کو عملی جامہ پہنانے والے سید سلیمان ندوی کی زبانی استاذ کے سوز و گداز کی کہانی سنیے، فرماتے ہیں:

"مولانا کی تقریریں ندوہ میں بار بار ہوئیں تھیں جن کا محل ورود ہمیشہ دماغ رہا، مگر اس دفعہ موصوف نے ندوہ کے اجلاس میں تین دفعہ تقریریں کیں، لیکن تینوں دفعہ ہر تقریر دل کی گہرائیوں سے اٹھتی تھی اور دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جاتی تھی۔ اس انقلاب کا راز ان دنوں سیرت نبوی اور احادیث شریف کا مطالعہ اور انہماک تھا جس نے دو سال میں علی گڑھ کے مولوی شبلی کو نیا مولوی شبلی بنا کر کھڑا کر دیا جو ہمہ تن دل اور مجسم محبت بن گئے تھے۔"[۲] دوسری جگہ ۱۹۱۲ء کے بعد جب سیرت النبی کا کام عملاً شروع ہو گیا بلکہ کچھ حصہ مکمل ہو گیا تھا اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اب مصنف نے احادیث و سیرت کا مطالعہ شروع کر دیا اور جیسے جیسے یہ مطالعہ بڑھتا گیا نظر میں وسعت دل میں تڑپ اور روح میں بالیدگی بڑھتی گئی۔ سیرت کے جو اوراق انھوں نے ۱۹۰۳ء میں لکھے تھے ان کو ۱۹۱۳ء والے اوراق سے ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب صرف دماغ سے اور دوسری صرف دل سے لکھی گئی ہے۔ نقش اوّل میں مورخ کے قلم کی گلکاری ہے اور نقش ثانی میں جو سراپا کھینچا گیا ہے اس میں اس مورخ کے ساتھ محدث کی قلم کاری بھی شامل ہے۔"[۳]

۱۹۱۲ء سے وفات تک علامہ شبلی نے سیرت کی تالیف کا کام جس انداز سے شروع کیا تھا وہ بھی اپنی نوعیت کا بالکل نرالا تھا۔ ان دنوں ایسا لگ رہا ہے کہ متحرک علمی اکادمی ایک جگہ سے دوسری جگہ موسم اور

حالات کے اعتبار سے رواں دواں ہے جس میں محقق بھی ہے اور مترجم بھی، مرتب بھی ہیں اور خوشنویس بھی، اور اس متحرک اکادمی کے افراد بدلتے رہتے ہیں، جس وقت بھی جیسے آدمی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے طلب کرلیا جاتا ہے، اور سیرت کا منظم خاکہ جو مرتب ہو چکا تھا اس کے مطابق کام شروع ہو گیا۔ اس میں کبھی سید سلیمان نظر آتے ہیں تو کبھی مولانا عبدالسّلام، کبھی حمیدالدین فراہی تو کبھی عبدالماجد دریابادی۔ اس تالیف و تصنیف کے ساتھ تعلیم و تربیت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ شبلی کو اپنے جسمانی ضعف کا اندازہ تھا اور جس اعتبار سے صحت روز بہ روز گر رہی تھی اس کام کو جلد از جلد انجام دینا چاہتے تھے، لیکن ایسا لگتا ہے صحیفۂ غیب میں اس عظیم کام کی تکمیل علامہ سید سلیمان ندوی کے حق میں لکھی ہوئی تھی۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اس دنیائے فانی میں شبلی کا آخری مرحلہ ہے۔ انتقال سے چند لمحات پہلے جاں نثار شاگرد ہاتف غیب کے اشارہ پر اپنے استاذ کے دیدار کے لیے دیوانہ وار پونہ سے اعظم گڑھ پہونچا اور یہ وہ لمحات ہیں جن میں شبلی موت و زیست کی کشمکش میں تھے، اچانک شاگرد وہاں پہونچا۔ اس کیفیت کی تصویر خود سلیمان ندوی کی زبانی سنیے :

"لیکن آہ! جب ۱۵ر نومبر کی شام کو میں پہونچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سرہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا، اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ، اب کیا رہا؟ پھر زبان سے دوبارہ فرمایا "اب کیا! اب کیا!!" لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلا دیا، تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی، تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا! "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کردو۔" میں نے بھرائی آواز میں کہا: "ضرور ضرور۔"

اس طرح ۱۵ر نومبر ۱۹۱۴ء کی تاریخ تھی کہ سیرۃ النبی کا قافلہ جو شبلی کی قیادت میں رواں دواں تھا اور ابھی آخری منزل بہت دور تھی کہ اچانک بے سہارا نظر آنے لگا، لیکن اس قافلہ کے ایک ساتھی کو جس پر شبلی کی نظرِ عنایت ہمیشہ رہی، شبلی نے اپنی روح کے پرواز ہونے سے چند لمحات پہلے اس قافلہ کا میر کارواں بنا کر اس کے ہاتھ میں عَلَم دیدیا۔ اور سیّد سلیمان نے جب یہ عَلَم اپنے ہاتھ میں لیا تو ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے اسی موقعہ کے لیے یہ مصرعہ کہا تھا "اِذَا مَاتَ مِنَّا سَیِّدٌ قَامَ سَیِّد"۔

سیرۃ النبی کا قافلہ جو ابھی اپنی منزل کے ابتدائی مرحلہ میں تھا۔ اس کے نقوش سیرۃ النبی جلد اوّل اور جلد ثانی کے کچھ ابواب یعنی اسلام سے قبل عربوں کے دینی، سیاسی، سماجی حالات سے لیکر غزوات تک پر مشتمل ہے، جس میں عاشقِ رسول کی دل سوزی، اور مورّخ کی گلکاری، اور پھر ایک ادیب اور شاعر کے قلم کی روانی و رعنائی ہر سطر سے مترشح ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بعد منزل جتنی طویل تھی اتنی ہی پیچیدہ، اور اس منزل کے میر کارواں کے لیے جہاں ذہانت و ذکاوت درکار تھی، وہیں اس کو صبر و تحمل کا پیکر بھی ہونا تھا۔ سیّد صاحب

نے جس وقت اپنے ہاتھ میں میر کارواں کا عَلَم لیا تو یقیناً اس وقت تھرتھرائے ہوں گے۔ لیکن انھوں نے جس عزم واستقامت، سلامت طبع، فکر و وجدان کا ثبوت دیا اس میں بھی غیب کی طرف سے ان کے کام کو جاری رکھنے کا انتظام تھا۔ سید صاحب کو شبلی کی تمناؤں کو بروئے کار لانے کی سعادت حاصل ہو رہی تھی۔

اذا ما رایۃ رُفعت لمجدٍ   تلقّتھا الیمامۃُ بالیمین

سید صاحب اس کے صحیح معنوں میں مصداق تھے، اور یہ منزل جس کو علامہ شبلی نے علم کلام سے تعبیر کیا تھا، اس میں سیرۃ النبی کا تصور سیرت اور علم کلام دونوں پر مشتمل تھا، کیونکہ سیرت میں اگر صرف رسولؐ کے ذاتی زندگی اور ان کے عہد کی فتوحات اور ان کے زمانے میں اسلامی شریعت کا نفاذ اور اس کے طریقۂ کار ہی کو مد نظر رکھا جائے تو وہ مسائل سامنے نہیں آئیں گے جو بعد میں اسلامی شریعت یا قرآن کے بدولت پیدا ہوئے مثلاً قرآن کا اعجاز، اسلام میں عبادات کا تصور، معاملات واخلاق، قضا وقدر، خلافت اسلامیہ اور نفس خلافت کا تصور، یہ وہ مسائل ہیں جنکے بارے میں نئے نئے سوالات پیدا ہوئے۔ یونانی فلسفہ اور دنیا کے دیگر مذاہب کے اثرات سے جو شکوک و شبہات پیدا ہوئے انکے ہر دور کے علماء و متکلمین نے اپنے اپنے انداز میں جواب دیئے ہیں۔ ان مسائل میں جتنی پیچیدگی ہے اتنی ہی نزاکت بھی۔ علامہ سید سلیمان کو اپنے استاذ کے عہد کا ایفا بھی کرنا تھا، چنانچہ جب ان مسائل کی طرف متوجہ ہوئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۱۵ر نومبر ۱۹۱۴ء کی تاریخ میں گنگا وجمنا کا ملاپ ہوتا ہے اور جب یہ دونوں ایک ہو کر بہتے ہیں تو ان کی روانی وجولانی کی دوسری کیفیت ہوتی ہے، سید صاحب پر شبلی کی وہ تمام کیفیات طاری ہو گئیں جن کی وجہ سے وہ بے چین و بے قرار تھے۔ پھر انھوں نے ان مسائل کا جس انہماک ولگن سے مطالعہ کیا وہ بھی اپنی نوعیت کا انوکھا باب ہے۔ سید صاحب کو کتب سیر ومغازی، حدیث وقرآن واصول حدیث اور علوم قرآن ودیگر آسمانی صحیفوں میں دین وشریعت کے حقائق، فقہ واصول فقہ، علم کلام اور تاریخ علم کلام، تاریخ وفلسفہ تاریخ پر گیرائی کے ساتھ گہرائی بھی درکار تھی۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۴ء سے لیکر ۱۹۲۹ء تک ان مسائل کو مختلف جلدوں میں اس انداز سے پیش کیا کہ استاذ کی روح کو سیرت کی چھٹی جلد کے اختتام پر حقیقی اطمینان وسکون نصیب ہوا ہوگا، کیونکہ ان کی تمنا بر آئی تھی۔ سید سلیمان نے ان ابواب کی ترتیب وتصنیف میں تحقیق وجستجو، مسائل پر بحث وتنقید اور حقائق تک پہنچنے کے جو اصول وضوابط اپنائے ہیں جدید فن تصنیف میں انکو اعلیٰ معیار قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے پیچیدہ مباحث کو سید صاحب نے جس علمی اور ادبی انداز سے سمیٹا ہے، یہ کام صرف وہی کر سکتے تھے۔ سید ابوالخیر کشفی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "سیرت النبیؐ اردو نثر کے تاج میں کوہ نور کی طرح چمک رہی ہے، یہ چمک نگاہوں کے لیے نہیں دل کی وادیوں کے لیے ہے۔"[۵]

سیرت النبیؐ کے اس سرسری جائزہ کے بعد ہم مقالہ کے دوسرے حصہ کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ وہ حصہ ہے جدید عربی زبان میں کتب سیرت:

جدید عربی زبان کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کی چوتھائی دہائی تک صرف پانچ ایسی کتابیں نظر آتی ہیں جن کو مجموعی طور سے ہم سیرت میں شامل کر سکتے ہیں۔ وہ کتابیں ہیں رسالۃ التوحید، الوحی المحمدی، علی ہامش السیرۃ، عبقریۃ محمدؐ، حیاۃ محمدؐ۔ پہلی کتاب کے مصنف شیخ محمد عبدہ ہیں اور دوسری کے سید رشید رضا جنھیں ہندوستان میں سید رضا مصری کہا جاتا ہے، حالانکہ وہ اصلاً مصری نہیں بلکہ لبنان کے رہنے والے ہیں۔ عبدہ و رشید رضا کا وہی رشتہ ہے جو شبلی اور سید سلیمان ندوی کا ہے۔ شیخ عبدہ نے اس کتاب کی شروعات ۱۸۹۲ء میں بیروت میں کی، جن دنوں وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ سلسلہ انھوں نے تقریروں کے ذریعہ شروع کیا تھا، اور بعد میں جب وہ اپنے وطن مصر آئے تو انھوں نے اس کو مرتب کر کے اس عنوان سے شایع کیا۔ اس کتاب کا تعلق سیرت النبیؐ کے ان حصّوں سے ہے جن کو سید سلیمان نے مرتب کیا ہے۔ شیخ محمد عبدہ جدید دور کے ان مفکروں میں ہیں جن کی بدولت عالم اسلام میں ایک بیداری آئی۔ جمال الدین الافغانی کی صحبت میں ان کا سیاسی، سماجی، مذہبی احساس پوری طرح بیدار ہو چکا تھا، پھر دنیا کے مختلف ملکوں میں رہنے اور ہر فکر و خیال کے لوگوں سے ملنے سے ان کے ذہن میں وسعت پیدا ہوئی، ادھر مصر میں حکومت کے مختلف شعبوں سے وابستگی سے عام لوگوں کے احساس و جذبات و روزمرّہ کے واقعات و حالات سے واقفیت کی بدولت انھیں عصری مسائل پر گہری نظر پیدا ہو گئی تھی، تعلیم و تدریس سے وابستگی نے انھیں جدید و قدیم ماخذ و مصادر کے مطالعہ پر مجبور کر دیا تھا، چنانچہ وہ اپنے دور میں سارے عالم اسلامی میں علم و مطالعہ میں یکتا تھے، العروۃ الوثقی اور دوسرے جرائد و مجلات سے وابستگی اور تعلق کی وجہ سے ان کے قلم میں روانی اور شگفتگی پیدا ہو گئی۔ رسالۃ التوحید اپنے عہد کی سب سے نادر اور کامیاب کوشش تھی، اس کے مضامین میں بڑا تنوع ہے، مسائل کو بھی جس انداز میں اٹھاتے ہیں اور نتائج تک جس تیزی سے پہنچتے ہیں ان میں ان کا منطقی اور کلامی انداز پوری طرح جلوہ گر رہتا ہے۔ چنانچہ مصر و شام کے علمی حلقوں میں اس کی دھوم مچی ہوئی تھی اور اسی کتاب کی بدولت انھیں مفکر اسلام کا خطاب بھی ملا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی مسائل سیرت النبیؐ کے مختلف اجزار کو اٹھایا ہے۔ جب ہم ان دونوں مفکروں اور عالموں کا موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ عبدہ اپنی ذہانت کے باوجود رسالۃ التوحید کو پچاس سال سے بھی آگے نہیں بڑھا سکے، اور کتاب کی اہمیت زمانہ کے لحاظ سے بہت تھی، لیکن پچاس سال کے بعد اس کی علمی حیثیت اور فن تالیف و تصنیف میں اس کی کوئی بڑی

اہمیت نہیں رہی۔ اس کے برعکس سیرۃ النبی کی جلدوں کے مختلف ابواب موضوعیت وغایت، ترتیب و تصنیف، زبان وبیان، فکر ووجدان کے اعتبار سے آج بھی اسی طرح زندہ اور پرکشش ہیں جتنا کہ نصف صدی پہلے تھے، اور اندازہ یہی ہے کہ عرب ملکوں کی علمی ترقی کے گذشتہ سو سال میں کوئی کتاب بھی اس معیار کو نہیں پہونچی، اور نہ مستقبل قریب میں اس کی توقع ہے۔

دوسری کتاب شیخ رشید کی الوحی المحمدی ہے، اس کتاب نے بھی دنیائے عرب میں تہلکہ مچا دیا تھا، اور مصنف کے مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کتاب کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے تھے، اور خود ہندوستان میں بھی اس کی بازگشت اور اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالرازق ملیح آبادی نے کیا تھا، یہ پوری کتاب جیسا کہ اس کے عنوان سے واضح ہے قرآن کے ان مسائل سے متعلق ہے جو مختلف عہدوں میں حالات زمانہ کی وجہ سے رونما ہوئے تھے، جیسے وحی کی حقیقت، غیب اور ایمان بالغیب، وحی کی مختلف صورتیں، اعجاز القرآن، اسلام اور قرآن کے بنیادی مقاصد، قرآن کی سیاسی وسماجی تصویر، جنگ وصلح قرآن کی روشنی میں۔ اگر پوری کتاب کا عمیق مطالعہ کیا جائے پھر سیرۃ النبی کی مختلف جلدوں کو غور سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے ان مسائل پر بھی عرض وبسط کے ساتھ گفتگو کی ہے لیکن اس میں علامہ رشید رضا سے ہر پہلو سے بہت آگے نظر آتے ہیں، سید صاحب کی متکلمانہ اور عالمانہ کتاب کا معیار جس طرح نظر آتا ہے اور معلومات کی وسعت کے ساتھ زبان وبیان کا جو انداز ہے، دونوں کتابوں میں کسی طرح موازنہ نہیں ہو سکتا۔ میری حقیر رائے میں عرب مفکروں نے اپنے علمی کارناموں کی بنیاد ساتویں یا آٹھویں صدی کے اسلامی علماء و مفکرین کو بنایا تھا، پھر اس دور میں مغربی مصنفین کی کتابیں بھی ان کے پیش نظر تھیں تین چار سو سال کے عرصہ میں انھیں عرب ملکوں میں کچھ ہاتھ نہیں آتا تھا، اس کے برعکس ہندوستان خاص طور سے شبلی اور سید صاحب عربوں کے مختلف ادوار کے علماء، متکلمین اور محققین پر عالمانہ اور محققانہ نظر کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ان علماء کی تصانیف پر گہری نظر رکھتے تھے جو اپنے اپنے دور و علاقہ میں یکتائے روزگار تھے۔ خاص طور سے مجدد الف ثانی، ہندوستانی صوفیاء کے ملفوظات ومکتوبات اور آخر میں شاہ ولی اللہ کے عظیم الشان علمی کارناموں خصوصاً ازالۃ الخفاء، حجۃ اللہ البالغہ، اسماعیل شہید کی العبقات۔ اس طرح ان کا مطالعہ ایک مربوط شکل میں تھا، دوسرے مغربی زبانوں کے اثرات سے ہندوستان کے علماء عرب علماء سے زیادہ باخبر تھے، اس لیے فن تصنیف وتحقیق میں ان کا معیار ان سے کہیں آگے تھا۔ چنانچہ ان دونوں کتابوں کا علمی وتحقیقی معیار سیرۃ النبی کے ابواب کے مقابلے میں بہت کم نظر آتا ہے، اگر ان کا عربی زبان میں سلیس اور علمی ترجمہ ہو جاتا تو علماء عرب خود سید صاحب کی کتاب کے معترف ہو جاتے اور عرب فراخدلی میں ضرب المثل ہیں۔

آپ کے سامنے حضرت الاستاذ علامہ سید ابوالحسن کی مثال ہے، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ان کی علمی اور ادبی قدردانی جتنی عربوں میں ہے ہندوستان میں نہیں اگرچہ مولانا کی تقریباً سبھی تصانیف اردو میں بھی منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

اس کے بعد ہم تین کتابوں پر بھی تبصرہ کریں گے جن کے لکھنے والے عہدِ جدید کے مانے ہوئے ادیب و فنکار ہیں۔ وہ طٰہٰ حسین۔ عباس محمود العقاد اور ڈاکٹر محمد حسین ہیکل ہیں۔ پہلی کتاب علی هامش السيرة، دوسری عبقرية محمد اور تیسری حياة محمد۔ پہلی کتاب علی هامش السيرة جس کے مصنف طٰہٰ حسین ہیں وہ اپنے تجدیدی و تنقیدی نظریات کیلئے دنیائے عرب میں مشہور ہیں۔ خاص طور سے انکی کتاب الشعر الجاهلي، في الادب الجاهلي کی بڑی شہرت ہوئی۔ ان دونوں کتابوں میں انہوں نے اپنے اور مستشرقین کے نظریات عربی زبان میں پیش کر کے شکوک و شبہات سے نوجوانوں کے ذہن کو مسموم کر دیا اور اس کے خلاف تمام دنیائے عرب کے علماء میں غیظ و غضب کی لہر دوڑ پڑی جس کی وجہ سے طٰہٰ حسین کو اپنے بہت سے نظریات پر نظرِ ثانی کرنی پڑی۔ علی هامش السيرة سے انہوں نے اس کا کفارہ ادا کرنا چاہا۔ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ انہوں بڑی ہوشیاری سے مقدمہ میں بھی لکھ دیا ہے کہ یہ کتاب نہ علمی ہے اور نہ تحقیقی، ان کے پیشِ نظر نہ تو علماء تھے اور نہ محققین، ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ عرب نوجوان سیرت کی کتابوں سے جو مختلف زمانہ میں لکھی گئی ہیں ان کو پڑھیں، اور ان میں جو علمی اور ادبی سرمایہ ہے اس سے واقف ہوں اور اپنے اسلاف کے علمی کارناموں سے باخبر ہوں۔

دوسری کتاب عباس محمود العقاد کی ہے۔ وہ عربی دنیا میں عظماء کے نفسیاتی تجزیہ کرنے میں ضرب المثل ہیں ان کا مطالعہ تاریخ و ثقافت پر جتنا گہرا ہے اتنا ہی وہ نتائج کے اخذ کرنے میں ماہر ہیں۔ زبان و بیان پر قدرت کا یہ عالم ہے کہ پھیلے ہوئے مسائل کو جس ایجاز و اختصار سے بیان کرنے میں وہ جتنے کامیاب ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی، انہوں نے سیرۃ النبی کے موضوع پر قلم اٹھایا۔ عقاد کی اس کتاب کا اصل محرک مستشرقین کی غلط بیانیاں ہیں جو انہوں نے حضور اکرم کی ذات کے سلسلہ میں کی ہیں۔ عباس محمود العقاد کی کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک عبقری اور عظیم انسان کے اعلیٰ معیار کو اپنے ذہن سے مرتب کرتے ہیں۔ پھر اس معیار کے مطابق اس کی زندگی کے مختلف خدوخال کو پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے نبی کریم کو دنیا کا عظیم ترین انسان قرار دے کر ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو دنیا کے سامنے روشناس کیا ہے۔ اس میں وہ اپنا دائرہ صرف نبی کریم کی ذات گرامی کو رکھتے ہیں اور ہر ایک پہلو پر عالمانہ اور محققانہ تجزیہ کر کے اس کے بعد ان کو اعلیٰ نمونہ قرار دیکر دنیا کو چیلنج کرتے ہیں۔ عقاد اپنی اس کوشش میں عرب دنیا میں بالکل ممتاز نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی جدید دور میں بڑی اہمیت

ہے لیکن سیرۃ النبیؐ کا وہ تصور جو شبلی نعمانی یا سید سلیمان ندوی پیش کرتے ہیں، عقاد نے ان پر بالکل گفتگو نہیں کی بلکہ دائرہ بہت ہی محدود رکھا۔

تیسری کتاب **حیاۃ محمد** ہے جس کے مصنف ڈاکٹر محمد حسین ہیکل ہیں۔ ہیکل جہاں عرب دنیا میں مانے ہوئے ادیب و فنکار ہیں وہیں انہیں علوم سیاسیات اور سماجیات کا ماہر قرار دیا جاتا ہے۔ فرانس میں انہوں نے اس موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا تھا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔

انہوں نے سیرت کے موضوع پر قلم اٹھایا، ان کی کتاب بڑی جامع اور مفصل ہے بلکہ سیرۃ النبیؐ کے پہلے حصہ سے بھی زیادہ ضخیم ہے۔ ہیکل سیاسیات و سماجیات میں مہارت کی بنا پر عہد نبوی کا اسی انداز میں جائزہ لیتے ہیں وہ جس شرح و بسط سے واقعات کا تجزیہ کرتے ہیں اس سے ان کی علمی اور ادبی مہارت کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔

اسلام کے ماقبل کے سیاسی و سماجی، ثقافتی و مذہبی حالات پر بحث کرتے ہوئے عہد نبوی کے تمام واقعات پر بھی، اسی انداز سے گفتگو کرتے ہیں اس طرح عہد نبوی کے تمام مسائل خواہ سیاسی ہوں یا سماجی، مالیاتی ہوں یا ثقافتی دنیا پر ان کے جو اثرات پڑے ہیں اس میں ان کا قلم رواں دواں نظر آتا ہے۔ مصطفیٰ المراغی جو شیخ الازہر تھے انہوں نے اپنے مقدمہ میں ان کی غیر معمولی تعریف کی ہے۔ لیکن انہوں نے ہلکا اشارہ کرتے ہوئے یہ بتایا کہ سیرۃ النبی کی صحیح تصویر حدیث نبوی اور قرآن مجید کی روشنی میں کی جاتی تو کتاب کی علمی حیثیت اور بڑھ جاتی اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو سیرۃ النبیؐ جو شبلی و سید سلیمان کے قلم سے وجود میں آئی اس کا مقام بڑھ جاتا ہے۔ دوسری کمی جو اس کتاب میں ہے وہ یہ ہے کہ وہ خالص علمی انداز میں لکھی گئی ہے اسکے برعکس شبلی و سید سلیمان نے سیرۃ النبیؐ میں جو وجدانی کیفیت پیدا کی ہے اس کی وجہ سے حضور اکرم کی زندگی متحرک اور بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس مختصر تعارف کے بعد پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شبلی نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی کئی سو برس تک توقع نہیں کی جا سکتی، ابھی تک ان کی یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ہے۔ آئندہ پچاس سال کے بعد آنے والے محققین و نقاد بعد کی آنے والی کتابوں پر اپنی رائے دیں گے۔

◆

حوالے :

۱تا۴ ۔ حیات شبلی ۔ص ۷۰۹ ، ۵۰۴ ، ۷۰۲ ـ ۷۰۳ ، ۷۲۲

۵ ۔ ابوالخیر کشفی ۔ سید صاحب ایک تاثراتی تحریر مضمون یادگاری مجلہ ص ۲۵ بحوالہ سید سلیمان ندوی : شخصیت اور ادبی خدمات از ڈاکٹر محمد نسیم صدیقی ندوی ص ۸۹

◆

ابوعلی اثری ★

سیرتِ عائشہ رضؓ

علامہ شبلی رحؒ کے خطوط کی روشنی میں

سید صاحب کی پہلی طالب علمانہ کوشش "ارض القرآن" کے بعد ان کی دوسری طالب علمانہ کاوش "سیرتِ عائشہ رضؓ" ہے جو ہمارے اس مقالہ کا سرعنوان ہے، اس کو بھی انھوں نے مولانا شبلی ہی کے ایماء سے لکھنا شروع کیا تھا اور جب تک وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ گئی اس کی تالیف میں ان کے مشورے شامل رہے، اور ان کو برابر ہدایتیں دیتے رہے، جیسا کہ آپ کو مولانا شبلی کے ان خطوط کے اقتباسات سے ابھی اندازہ ہوگا، جو وہ ان کو اس سلسلہ میں برابر لکھتے رہے۔ انھوں نے نہ صرف بعض ضروری مآخذ کی نشان دہی کی، بلکہ اپنی کوششوں سے ان کو بہم پہنچایا بھی۔ ایک مرتبہ سید صاحب نے اس کے مواد اور میٹر کے متعلق دریافت کیا تو لکھا، حضرت عائشہ رضؓ کے متعلق طبقات، اسد الغابہ وغیرہ تو تم کو خود معلوم ہیں، لیکن وہ بالکل ناکافی ہیں ..... مسانید اور کتب حدیث کے تفحص سے بھی کام نکلے گا، لیکن یہ زمانہ سید صاحب کی طالب علمی کا تھا، اور ندوہ کا کورس پورا کرنا ضروری تھا، اس لئے اس ہدایت کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ اس میں پھنسو گے تو پڑھائی کا حرج ہوگا اور پڑھائی بہر حال سب سے مقدم ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی کا حدیث میں ایک مختصر رسالہ ہے اس کا نام "عین الاصابہ فی استدراک عائشہ علی الصحابہ" ہے اس سے اس دور کے علماء عام طور سے واقف نہیں تھے، اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں اس کی ضرورت پیش آئی، تو مولانا شبلی نے ان کو لکھا، کہ حضرت عائشہ رضؓ کے استدراک والا رسالہ ملا، مستعار ہے، کوئی شخص موجود نہیں ہے کہ نقل کرے، تاہم فکر میں ہوں، بہر حال کوشش کے باوجود کوئی نقل کرنے والا نہیں ملا، تو مستعار لے کر اصل کتاب ہی بھیج دی، کہ اس کے بغیر کام رکنے نہ پائے۔

شیخ عبد القادر صاحب پونہ کو جن کی سفارش سے پونہ کالج میں سید صاحب کا فارسی کی پرفیسری پر تقرر ہوا تھا، مولانا لکھتے ہیں: سید سلیمان مدت سے سیرتِ عائشہ رضؓ کے لیے ذخیرہ فراہم کر رہے تھے، اس رسالہ کے لئے ان کا بڑا اصرار تھا، وہ میں نے حیدر آباد سے مستعار منگوا دیا ہے، میں نے ان کو لکھا بھی ہے کہ اب کیا انتظار ہے اور کیا

★ دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ

دیر ہے، اس کو مرتب کرنا شروع کردو۔"

ایک خط میں مزید ہدایت دیتے ہیں:

"حضرت عائشہؓ کے اجتہادات فقہی اور کلامی کو زور کے ساتھ لکھنا چاہیے، یعنی طرز استدلال اور بیان اور عبارت سب پرزور رہے، صحاح میں بہت سی روایتیں ان کی شان کے خلاف منقول ہیں، خصوصاً وہ تمام روایتیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتِ ازواج کے متعلق ہیں۔ ان کا کیا علاج سوچا ہے، میں تو سیرت میں ایک مستقل بحث کرنے والا ہوں، کہ اس قسم کی تمام روایتیں منافقین مدینہ کے دسائس ہیں، ان کا کیا علاج سوچا ہے، جو لوگ افک میں شریک تھے ان سے اور کیا عجب ہے"

حضرت عائشہؓ مکثرینِ روایت میں اگرچہ نہیں ہیں، لیکن پھر بھی ان سے ہر قسم کی روایتیں مروی ہیں

اسی سلسلہ میں پھر لکھتے ہیں:

"کہ حضرت عائشہؓ کی حدیثیں ترجی من تشاء کے متعلق کہاں تک صحیح ہیں، مطلب یہ ہے کہ تم اس کی تحقیق کرو اور نتیجے سے مجھ کو مطلع کرو۔"

اسی طرح قدم قدم پر ان کو مشورہ دیتے رہے، ان کی ہمت بڑھاتے رہے، ان کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے، تاکہ ان کی یہ طالب علمانہ کاوش پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے اور وہ پورے ملک میں ایک مصنف کی حیثیت سے روشناس ہو جائیں۔

سیرتِ عائشہؓ ابھی تکمیل کو پہنچی بھی نہیں تھی کہ سارے ملک میں اس کا شور ہو گیا تھا، اور ہر طرف سے اس کے تقاضے شروع ہو گئے تھے، جس کا آوازہ مولانا شبلی کے کانوں تک بھی پہنچتا رہتا تھا۔ اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

"آج بھوپال سے خط آیا، حضرت عائشہؓ کے سوانح کا بہت تقاضا ہے، یعنی جلدی تیار کردو، تم ایک مدت سے اس میں مصروف ہو، استدراک علی الصحابہ کا تم کو انتظار تھا، وہ میں نے تم کو بھجوا دیا، اب کیا انتظار ہے، اس کی ضخامت کیا ہوگی، مجتہدات مکتے لئے ہیں یا نہیں، بیگم صاحبہ بھوپال معقول معاوضہ دیں گی، وہ یہ بھی چاہتی ہیں کہ اور ازواج کی بھی سوانح عمریاں قلم بند کی جائیں ..... حضرت عائشہؓ کے متعلق جس میں خاص معلومات ہیں، میں تمہارا مسودہ دیکھتا تو رائے ظاہر کر سکتا۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"حضرت عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہرات کو ملا کر ایک مستقل کتاب لکھو، اور وہ بھی شامل سیرت ہو، اور مخصوص تمہارے نام سے ہو۔"

اسکی تکمیل تو اس وقت سید صاحب سے نہیں ہو سکی، لیکن دار المصنفین کے قیام کے بعد ان کے ایک لائق رفیق مولانا سعید انصاری فاضل الہیات کانپورے صحابیات پر جن میں ازواج مطہرات کے ساتھ بنات طاہرات بھی شامل ہیں سیر الصحابیات کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھوا کر شائع کی۔ ایک اور خط میں سیرۃ عائشہؓ ہی کے متعلق لکھتے ہیں:

> "مسند عائشہؓ میرے پاس ہے میں دے دوں گا، طبقات میں لغویات زیادہ ہیں، اس سے کیا فائدہ؟ بخاری و مسلم و ابو داؤد کافی ہیں۔ یعنی انہی کتب حدیث میں سیرت عائشہ کے متعلق سب کچھ مل جائے گا۔"

حضرت عائشہؓ کے مجتہدات قلم بند کرنے کے سلسلے میں ان کو لکھتے ہیں کہ

> "تم نے ان کے مجتہدات پر جو کچھ لکھا ہے اس کو دیکھوں تو بتاؤں کہ کس قدر اضافہ ہو سکتا ہے، فن درایت کی تو وہ خاص موجد ہیں، اس کو خوب پھیلا کر لکھ سکتے ہو، فقہیات اور اعتقادیات میں بھی ان کا بڑا حصہ ہے، تم اس کا ایک خاکہ دو چار صفحہ میں لکھ کر بھیجدو، تو میں رائے دونگا۔"

اسی زمانہ میں تاریخ الامت کے مشہور مصنف مولانا اسلم جیراج پوری بھی حضرت عائشہؓ کی سوانح عمری لکھ رہے تھے، اس کا شاید کوئی حصہ ان کی نظر سے گذرا تھا اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> "تم اس کو دیکھ لو، مطلب یہ ہے کہ یا تو اس سے بہت الگ رہے یا بہت آگے نکل جائے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اسلم جیراجپوری کی یہ کتاب ان کی اور گوناگوں علمی مشغولیتوں کی وجہ سے جن کا سلسلہ ان کے دم واپسیں تک جاری رہا، پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی، اور اس طرح سے اردو داں طبقہ ان کے قلم سے سیرت عائشہؓ پر ایک اور اچھی مستند اور بلند پایہ کتاب سے محروم رہ گیا۔ ان کی تصنیفات کی فہرست میں ان کے چھوٹے چھوٹے رسالے بھی شامل ہیں، لیکن یہ کتاب ہم کو اس میں نظر نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے کہ سید صاحبؒ کی سیرت عائشہؓ کی شہرت کے باعث اس کی تکمیل کا خیال ترک کر دیا ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے وطن و برادری کے اس ہونہار نوجوان اہل قلم اور مصنف کی علمی صلاحیتوں سے بھی وہ متاثر تھے، ان کا تقرر بحیثیت تاریخ اسلام کے ایک استاد کے ایم۔ او کالج میں انہی کی سفارش سے ہوا تھا، اور وہ برابر کالج کے میگزینوں میں تاریخ اسلام ہی کے کسی نہ کسی پہلو پر مضامین لکھا کرتے تھے اور مولانا کی نظر سے گزرتے رہے تھے۔

جب جب مولانا شبلی کو سیرتِ عائشہؓ کا خیال آتا تھا، خطوط کے ذریعہ برابر ان کو ہدایتیں دیتے رہتے تھے۔ ایک خط تو تمامتر اسی کے متعلق ہے، فرماتے ہیں:

„ ترمذی میں اکثر مسائل میں حضرت عائشہؓ کے اجتہادی مسائل کی تصریح ہے، ان کو الگ جمع کر لیا ہے یا نہیں، ایک فہرست تمہارے ہاتھ کی لکھی ہوئی میرے پاس ہے جس میں حضرت عائشہؓ سے متعلق معلومات ہیں اُن پر جو اعتراضات ہیں ان کے تفصیلی جوابات پیشِ نظر ہیں یا نہیں۔ تمہارا سرمایہ اجمالاً پیشِ نظر آجائے تو اس پر اضافہ کے متعلق اپنی رائے لکھوں، یوں کیا بتاؤں کہ کیا لکھو۔" (خط نمبر ۳)

مولانا شبلی سیرت عائشہؓ کی تالیف کے سلسلہ میں سید صاحب کو ہدایات دینے کے ساتھ اپنے احباب کو بھی برابر اس کی بشارت دیتے رہتے تھے۔

سید صاحب دفتر سیرۃ نبویؐ میں کام کرنے کے لئے بمبئی گئے، تو اُن کی مشغولیتوں کے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں:

„ سیرۃ کی ماخذ اصلی صرف تین کتابیں ہیں، ابن ہشام، ابن سعد، طبری، ان کے تمام رواۃ کا استقصار کر کے ان کا اسماء الرجال، تہذیب وغیرہ سے مرتب کرا رہا ہوں کہ روایتوں کے انتقاد میں آسانی ہو، سید سلیمان یہ کام کر رہے ہیں اور وہ یہیں ہیں۔"

منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ ریاست بھوپال کو لکھتے ہیں:

„ سیرۃ عائشہؓ سید سلیمان مدت سے اس کا ذخیرہ فراہم کر رہے تھے، حضرت عائشہؓ نے صحابہ کی روایتوں پر جو تنقیدات کی تھیں ان کو علامہ سیوطیؒ نے یکجا کر دیا تھا، سید سلیمان کو اس کی تلاش تھی، میں نے کئی مہینے ہوئے حیدرآباد سے منگا دی، ادھر وہ عرب جاہلیت کی تاریخ لکھنے میں مصروف ہو گئے تھے ... بہرحال سیرت عائشہؓ تو وہ لکھ دیں گے، بقیہ ازواج مطہرات کو میں نے سیرت میں لے لیا ہے، لیکن بہت پھیلا کر نہیں، یہ حصہ اپنی زیرِ ہدایت میں نے عبدالسلام سے تیار کرایا ہے گو ابھی نظرثانی نہیں کی۔" (یہ حصہ بعد میں مولانا کی نظرثانی کے بعد سیرت جلد دوم میں آگیا ہے)۔

سید صاحب کی یہ کتاب موضوع کے اعتبار سے سیرت ہی کا ایک حصہ ہے، جس میں رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پس پردہ زندگی، جو چہار دیواری کے اندر تمام ازواج مطہرات کے ساتھ گزری ہے، اس کی تفصیل نہایت والہانہ اور سرشارانہ انداز میں بیان کی گئی ہے، وہ بھی زیادہ تر صحاح، مسانید، اور حدیث کی دوسری کتابوں کی مدد سے جن کے مطالعہ کی طبقات کے مقابلہ میں مولانا شبلی ان کو برابر ہدایت دیتے رہتے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواج مطہراتؓ بیک وقت ۹ یا ۱۱ تھیں، ان میں ایک حضرت ماریہ قبطیہؓ بھی تھیں۔ جن کو مقوقس شاہ مصر نے آپؐ کے پاس بھیجا تھا۔ یہ ازواج مطہرات سے الگ دوسری جگہ رہتی تھیں، ان کے بطن سے ایک صاحبزادے بھی تھے، جن کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا، ان میں سب سے زیادہ تعلق خاطر مختلف اسباب کی بنا پر آپؐ کو حضرت عائشہؓ ہی سے

تھا" اور اپنی گھریلو زندگی کا بڑا حصہ آپؐ انہی کے حجرۂ مبارک میں گزارتے تھے۔ ازواجِ مطہرات میں حضرت سودہؓ بنت زمعہ سب سے زیادہ سن رسیدہ تھیں، اور جن سے آپؐ نے حضرت فاطمہؓ وغیرہ کی دیکھ بھال اور پرورش کی غرض سے عقد فرمایا تھا، انھوں نے آخری دور میں سن کی زیادتی کی وجہ سے اور حضرت عائشہؓ کی طرف حضورؐ کا زیادہ میلان دیکھ کر اپنی باری کا دن بھی حضرت عائشہؓ کو دے دیا تھا، جو اُن کا بہت بڑا ایثار تھا، اس لحاظ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے جزئی سے جزئی حالات کے معلوم کرنے اور دیکھنے کا موقع اور ازواج کے مقابلہ میں حضرت عائشہؓ کو زیادہ ملا، اور اس سے انھوں نے خوب خوب فائدہ اُٹھایا۔ پھر وہ فطرۃً بہت ذہین، ذکی، خوش فہم، قوی الحافظ اور دقیق النظر تھیں۔ وہ حضورؐ کی ایک ایک ادا، ایک ایک بات، ایک جزئیہ اپنے حافظے کے خزانے میں جمع کرتی چلی گئیں، اور حضورؐ کے وصال کے بعد وہ سب امت کو پہنچا دیا۔ یہ ان کا امت پر اتنا بڑا احسان ہے جس سے وہ کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں ازواجِ مطہرات میں ان کا کوئی حریف تھا تو امِ سلمہؓ تھیں۔ ان سے بھی آپؐ کے متعلق بہت سی روایتیں مروی ہیں۔ یہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح بہت ذہین اور سمجھ دار تھیں۔

تمام ازواجِ مطہرات میں حضرت عائشہؓ ہی باکرہ تھیں۔ کل چھ برس کی عمر میں حضورؐ سے جب کہ آپ کی عمر شریف پچاس برس کے قریب تھی، عقد ہوا۔ ۹ برس کی عمر میں رخصتی ہوئی، اور عین عالمِ شباب میں ۱۸ برس کی عمر میں بیوہ ہو گئیں، ۹ سال تک مسلسل شب و روز ان کو آپ کی رفاقت اور شریکِ زندگی ہونے کا شرف حاصل رہا۔ انھوں نے ازواج میں سب سے زیادہ عمر پائی۔ اور حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں انتقال فرمایا۔ اس لئے تمام صحابہؓ کو ان سے دین و دنیا کے تمام مسائل میں متمتع ہونے کا خوب موقع ملا۔ اس لحاظ سے انہی کی مستقل سوانح عمری لکھے جانے کی ضرورت تھی۔ جس کو سید صاحب نے مولانا شبلی جیسے وقت کے سیر و مغازی کے امام اور تاریخِ اسلام کے مورخ کے زیرِ نگرانی پورا کر دیا۔

ارض القرآن کے دونوں حصوں کے بعد سیرت عائشہؓ ان کی تیسری کتاب تھی جو منصۂ شہود پر آئی، اور وقت کے تمام ائمہ رجال و مسانید نے اس کا خیر مقدم کیا، اور سید صاحب کی تلاش و جستجو اور تحقیق و تدقیق کی داد دی۔ اس کتاب کی خود ان کی نظر میں بھی بڑی اہمیت تھی، فرماتے ہیں:

آج جب کہ مسلمانوں میں وہم پرستی، قبر پرستی، جاہلانہ مراسم، غم و شادی کے موقعوں پر مسرفانہ مصارف اور جاہلیت کے اور بہت سے آثار اس لئے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کے سامنے مسلمان عورت کی زندگی کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ آج ہم ان کے سامنے اس خاتونِ محترم کی زندگی کا نمونہ اس کتاب کے ذریعہ پیش کرتے ہیں، جو نبوتِ عظمیٰ کی ۹ سال مسلسل شریک و رفیق زندگی تھی، اور جو خواتین خیر القرون کے حرم میں کم و بیش ۴۰ برس تک

شمع ہدایت رہی۔

ایک مسلمان عورت کے لئے سیرت عائشہؓ میں اس کی زندگی کے تمام تغیرات، انقلابات، مصائب، شادی، رخصتی، سسرال، شوہر، سوکن، لاولدی، بیوگی، غربت، خانہ داری، رشک و حسد، غرض زندگی کے ہر موڑ ہر موقع، ہر حالت کے لئے قابلِ تقلید واقعات موجود ہیں، اس لئے سیرت عائشہؓ اس کے لئے ایک آئینہ خانہ ہے، جس میں ایک مسلمان عورت کی زندگی کی حقیقی تصویر نظر آسکتی ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سیرۃ مبارکہ نہ صرف اس لئے قابلِ مطالعہ ہے کہ وہ ایک حجلہ نشین حرم نبوتؐ کی پاک زندگی کے واقعات و حالات کا مجموعہ ہے، بلکہ اس لحاظ سے اس کا مطالعہ ضروری ہے کہ دنیائے انسانیت کے پیغمبر اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک و مقدس کا وہ نصف حصہ ہے، جو جلوت کے ہنگاموں، صحابہ کی مجالس غزوات کی شرکت، وفود عرب سے ملاقات اور نظامِ سلطنت و حکومت سے الگ، مسجد نبویؐ کی عبادات سے جدا گھر کی چہار دیواری کے اندر تمام ازواج مطہرات کے ساتھ گزرا ہے۔ جس کا کامل ترین بلکہ اکمل ترین نمونہ حضرت عائشہؓ کی زندگی تھی۔ جس کے بغیر آپؐ کی سیرت مکمل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے سیرتِ عائشہؓ درحقیقت سیرۃ نبویؐ کا ایک حصہ ہے۔ جس میں آپؐ کی اندرونِ خانہ زندگی کے تمام جلوے نظر آتے ہیں۔

یوں تو حضورؐ کی ازواج کی تعداد جیسا کہ آپ کو ابھی معلوم ہوا، ۹ اور ایک روایت کے مطابق ۱۱ تھی، ان کو ملا کر ۱۳ عورتوں سے آپؐ کا عقد ہوا تھا، جن میں سے ایک کو حرم میں آنے سے پہلے آپؐ نے طلاق دے دی تھی، جس کا بعد میں حضرت عکرمہؓ سے عقد ہو گیا تھا، اور دوسری نے اپنی محرومیٔ قسمت سے خود ہی طلاق لے لی تھی۔

ازواج میں دو کا انتقال آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں ہو گیا تھا۔ ایک حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جن کے بطن سے آپؐ کی چار صاحبزادیاں تھیں، اور جن سے حضورؐ کو بے انتہا الفت تھی، یہاں تک کہ جب تک وہ زندہ رہیں عرب کے رواج کے مطابق کوئی دوسرا عقد نہیں کیا۔ دوسری حضرت زینبؓ ام المساکین کا جو بہت ہی کشادہ دست تھیں، غرباء و مساکین و یتامیٰ کی بڑی خدمت کرتی تھیں۔ ان کے اسی جذبۂ جود و سخا کی بنا پر ان کا لقب ام المساکین ہو گیا تھا۔ لیکن ان کو ازواج میں سب سے کم شرفِ صحبت و رفاقت حاصل ہوا۔ ازواج میں حضورؐ کے مزاج میں جو بہت درخور رکھتی تھیں، اور جن سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور فروغ و ترقی میں بڑی مدد ملی، وہ صرف دو تھیں۔ ایک حضرت خدیجہؓ جن کا انتقال ہجرت نبویؐ سے کئی سال پہلے ہو گیا تھا، اور مکہ ہی میں مدفون ہوئیں۔ دوسری حضرت عائشہؓ بنت ابی بکرؓ، جو حضرت خدیجہؓ کے انتقال اور ہجرت نبویؐ کے کئی سال کے بعد مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں، اور نہ صرف وفات نبوی تک زندہ رہیں بلکہ اس کے بعد بھی تقریباً نصف صدی تک زندہ رہیں، اور خلافتِ راشدہ کے بعد حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں انتقال فرمایا۔ جب تک زندہ رہیں حضورؐ

کی اندرونِ خانہ زندگی کے حالات، واقعات، معمولات، عادات، مشاغل، مصروفیات سے جو مردوں سے مستور تھیں، امت کو باخبر کرتی رہیں۔ حج کے موقع پر توان کا فیض اور عام ہوجاتا تھا، اور لوگ مسائل و فتاویٰ آآ کر پوچھتے تھے اور آپ جواب دیتی تھیں۔ اس لحاظ سے وہ اسلام اور احادیث نبوی ص کی بہت بڑی مبلغ تھیں، اور امت کو ان کی ذات سے بہت فائدہ پہنچا، جس پر سید صاحب رح نے اس کتاب میں بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

تیمم کا حکم بارگاہِ خداوندی سے تنہا حضرت عائشہ رض ہی کے ایک واقعہ سے نازل ہوا، ایک سفر میں حضرت عائشہ رض حضور ص کے ساتھ تھیں، وہی ہار جو واقعۂ افک میں ایک مرتبہ گر گیا تھا ٹوٹ کر پھر ان کے گلے سے گر گیا، انھوں نے فوراً حضور ص کو اس سے مطلع کیا، صبح قریب تھی، آپ ص نے فوراً پڑاؤ ڈال دیا، اور ایک آدمی اس کے ڈھونڈنے کے لئے دوڑایا۔ اتفاق یہ کہ جہاں آپ ص نے فوج کے ساتھ منزل کی تھی وہاں پانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ نماز کا وقت آیا تو لوگ گھبرائے ہوئے ابوبکر رض کے پاس پہنچے، کہ آپ کی صاحبزادی نے لوگوں کو کس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے، نماز کا وقت ہوگیا ہے اور وضو کے لئے کہیں پانی نہیں مل رہا ہے، وہ سیدھے حضرت عائشہ رض کے پاس پہنچے، دیکھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے زانو پر سر رکھ کر استراحت فرما رہے ہیں۔ انھوں نے غصہ میں کہا، کہ تم ہر روز ایک نئی مصیبت لاتی ہو، اور تمام لوگوں کو پریشان کرتی ہو، ان کے پہلو میں کئی کونچے دیئے۔ لیکن وہ آپ کی تکلیف کے خیال سے ہل نہ سکیں، آپ صبح کو بیدار ہوئے، تو واقعہ کی تفصیل معلوم کر کے حکم خداوندی کے منتظر ہو گئے۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد تیمم کا حکم نازل ہوا۔ جس کو سن کر مجاہدین کا گروہ جو اس صورت حال سے مضطرب تھا، مسرت سے لبریز ہو گیا، اور حضرت عائشہ رض کو دعائیں دینے لگا۔ حضرت اسید بن حضیر رض ایک بلند مرتبہ صحابی تھے، فرطِ خوشی سے پکار اٹھے، اے آلِ ابوبکر رض تم اسلام میں کتنی برکتوں، آسائشوں اور سہولتوں کے باعث ہو، صدیق اکبر رض جو اپنے پارۂ جگر کی تنبیہ و تادیب کے لئے بے قرار تھے۔ اس آیت تیمم کے نزول سے فرطِ مسرت سے اچھل پڑے اور حضرت عائشہ رض سے فرمایا کہ جانِ پدر! مجھے معلوم نہ تھا، کہ تو اس قدر مبارک ہے، تیرے ذریعہ خدا نے مسلمانو کو کتنی آسانی بخشی۔

یہ بھی اتفاق ہی تھا، کہ جو ہار گر گیا تھا، اسی منزل میں جب قافلہ کی روانگی کے لئے اونٹ کو اٹھایا گیا، تو اسی کے نیچے مل گیا۔

یوں تو تمام ازواج مطہرات کو جن کی تعداد بیک وقت ۹ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت تھی۔ لیکن حضرت عائشہ رض کو غیر معمولی شغف و عشق تھا، اس محبت میں وہ اپنی فطرتِ نسوانی کی بنا پر کسی کی بھی شرکت گوارا نہیں کرتی تھیں اور دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور وسوسے پیدا ہو جاتے تھے۔ کبھی راتوں کو بیدار ہوتیں اور آپ ص کو اپنے پہلو میں نہ پاتیں تو بے قرار ہو جاتیں، ایک دفعہ شب کو آنکھ کھلی، تو آپ کو نہ پایا، ادھر ادھر تاریکی میں ٹٹولنے

لگیں، تو آپؐ کا قدم ملا، دیکھا کہ سربسجود مناجات الٰہی میں مصروف ہیں۔

ایک دفعہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا، تو حضرت عائشہؓ کو شک ہوا کہ آپؐ کسی اور زوجہ محترمہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں، اُٹھ کر اِدھر اُدھر پھر ٹٹولنے لگیں، تو آپؐ کو تسبیح و تہلیل میں مصروف پایا، بہت نادم ہوئیں اور کہا کہ میں کس خیال میں تھی اور آپؐ کس عالم میں ہیں۔

اسی طرح ایک شب کا واقعہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی آنکھ کھلی تو آپؐ کو نہ پایا۔ ادھر ادھر ڈھونڈا، لیکن کہیں بھی آپؐ کا جلوہ نظر نہ آیا تو آپؐ کو تلاش کرتی ہوئی جنت البقیع پہنچ گئیں، دیکھا کہ آپؐ دعا و استغفار میں مشغول ہیں۔ اُلٹے پاؤں واپس آئیں، اور صبح کو آنحضرتؐ سے یہ واقعہ بیان کیا، فرمایا، ہاں ہاں، کوئی کالی کالی چیز نظر آئی تھی اچھا وہ تم ہی تھیں۔

ایک سفر میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں آپؐ کے ہمراہ تھیں۔ رات کو آپؐ حضرت عائشہؓ کے محمل میں تشریف لے آتے اور لطف و محبت کی باتیں کیا کرتے۔ ایک دن حضرت حفصہؓ نے کہا، آؤ آج ہم دونوں اپنا اپنا اونٹ بدل لیں، آپؐ حسب معمول تشریف لائے تو حضرت حفصہؓ نظر آئیں اور ادھر حضرت عائشہؓ اپنے محمل میں آپؐ کی آمد کی منتظر تھیں، آپؐ جلوہ فرما نہیں ہوئے تو سخت ملال اور غم ہوا، قافلہ نے پڑاؤ کیا، تو محمل سے اُتر پڑیں اور اپنے دونوں پاؤں گھاس میں رکھ دیئے، اور کہا کہ میں ان کو تو کچھ نہیں کہہ سکتی، اے خدا، کوئی بچھو یا سانپ بھیج کہ وہ مجھ کو ڈس لے۔

آپؐ نے جس زمانہ میں ازواج مطہرات سے ایک مہینہ کے لئے ایلا کر لیا تھا تو حضرت عائشہؓ مہینہ گزرنے کے انتظار میں ایک ایک دن گنتی تھیں، مہینہ ختم ہوا تو سب سے پہلے آپؐ حضرت عائشہؓ ہی کے حجرے میں تشریف لائے۔

واقعہ تخییر میں اگرچہ تمام ازواج مطہرات نے بیک وقت خانۂ نبوت کی فقیرانہ زندگی اور مہبط وحی و رسالت کی تمام عمر رفاقت کو ترجیح دی، لیکن اس کی ابتدا حضرت عائشہؓ ہی نے کی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرا یہ جواب اور ازواج کو نہ بتائیے گا، مگر سب نے یکساں فیصلہ کیا اور کسی نے آپؐ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

ان تمام واقعات سے حضرت عائشہؓ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غیر معمولی محبت، عشق، اور شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔

معارف کے سلیمان نمبر میں مولانا شاہ معین الدین ندوی نے سید صاحب کی تمام تصنیفات پر ایک مضمون میں بہت تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ سیرت عائشہؓ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

" حضرت عائشہؓ بڑی ذکی، ذہین اور علم کی شائق تھیں۔ ان کے شعور کی آنکھیں جلوہ گاہ نبوت میں کھلیں،

جہاں ہر وقت فیضانِ نبوت کا چشمہ اُبلتا رہتا تھا، وہ اس سے خوب سیراب ہوگئیں، تعلیم کے جو مواقع بھی ملے، ان سے انھوں نے پورا فائدہ اُٹھایا۔ ان کے ذاتی ذوق و شوق نے ان کو اس زمانۂ سعادت کی بہت بڑی عالمہ بنادیا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، فتاویٰ وغیرہ تمام دینی علوم میں ان کو دست گاہ حاصل تھی، اس کا اندازہ ان کی روایات اور فقہی مسائل اور فتاویٰ سے ہوتا ہے۔ ان علوم میں بڑے بڑے صحابہؓ، محدثین اور ائمہ ان سے استفادہ کرتے تھے۔ حج کے زمانہ میں تو جب کہ ساری دنیائے اسلام سمٹ کر آجاتی ہے، ان کا حلقۂ درس اور وسیع ہوجاتا تھا، ان کے پاس دُور دراز سے فتاوے آتے تھے، اگر ان کے فتاوے جمع کیے جائیں تو کئی ضخیم جلدوں میں آئیں گے۔ دینی علوم کے علاوہ انساب، شعر و ادب اور تاریخ میں بھی مہارت رکھتی تھیں، اور لوگ ان سے استفادہ کرتے تھے۔"

بقول علامہ شبلیؒ کے جیسا کہ ابھی آپ نے سُنا کہ وہ فنِ درایت کی تو موجد تھیں اور اس میں تمام صحابہؓ میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔

سید صاحب نے اپنی اس کتاب میں ان تمام دینی علوم کے ساتھ غیر دینی علوم کی بھی الگ الگ سرخیاں قائم کرکے ان پر گفتگو کی ہے، اور ان تمام علوم میں ان کے کارنامے دکھلائے ہیں، اور علمی کمالات، دینی خدمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات کے نشر و اشاعت کے لحاظ سے ان کو نہ صرف ازواجِ مطہرات تمام صحابیات بلکہ تمام صحابہ میں افضل قرار دیا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ عائشہؓ کو تمام عورتوں پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح ثرید کو کھانوں کے دوسرے اقسام پر۔ ثرید عربوں کی بہت اعلیٰ ترین غذا تھی۔

سید صاحب اگر کوئی اور کام نہ کرتے تو تنہا یہی کتاب ان کو اُردو کے بڑے مصنفین کی صف میں جگہ دینے کے لیے کافی تھی، انھوں نے اس کے بعد بھی متعدد محققانہ اور بلند پایہ کتابیں لکھیں، سیرت کی چار ضخیم جلدوں کے علاوہ خیام، خطبات مدراس، عربوں کی جہازرانی، عرب و ہند کے تعلقات وغیرہ وغیرہ۔ جنھوں نے ان کو اُردو کا بہت بڑا مصنف بنادیا۔ اور ان کی شہرت ہندوستان اور ایشیا سے گزر کر یورپ اور امریکہ تک پہنچ گئی، اور ہندوستان اور یورپ کے بڑے بڑے محققین نے ان کی کتابوں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ سیرت عائشہؓ اپنے موضوع پر حرفِ آخر ہے، جس پر آج تک کسی کو مستقل کتاب لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی، اس کا متعدد مشرقی و مغربی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔

اللّٰھم صل علی محمد و آلہ الاطہار واصحابہ الکرام وازواجہ المطہرات۔

○

ریاض الرحمٰن خاں شروانی★

سیرتِ عائشہؓ

ایک تنقیدی جائزہ

مولینا سیّد سلیمان ندوی صاحبِ فکر و نظر عالم و ادیب تھے۔ ان کے علمی و ادبی کارنامے گوناگوں ہیں۔ انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کی "سیرت النبیؐ" کی تکمیل اس شان سے کی کہ استاد اور شاگرد کی تحریر میں امتیاز کرنا دشوار ہوگیا۔ انھوں نے سوانح پر "سیرتِ عائشہؓ" کے علاوہ "حیاتِ مالکؒ" اور "حیاتِ شبلیؒ" جیسی وقیع کتابیں لکھیں۔ ان کے "خطباتِ مدراس" ہمارے سیرتِ پاک کے لٹریچر میں نہایت اہم اضافہ ہیں۔ "خیام" میں انھوں نے اپنے تنقیدی شعور کا گراں مایہ مظاہرہ کیا۔ ان کی خالص علمی تصانیف میں "ارض القرآن" "عرب و ہند کے تعلقات" اور "عربوں کی جہازرانی" تحقیق و جستجو کا ایسا نمونہ ہیں جیسا نمونہ اِن موضوعات پر ابھی تک کوئی اور پیش نہیں کرسکا ہے۔ ان تمام اعترافات کے باوجود، جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے، اس کا دل جیسا "سیرتِ عائشہؓ" نے اپنی طرف کھینچا سیّد صاحب کی کوئی اور تصنیف نہیں کھینچ سکی۔ اس کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ امّ المومنین عائشہ صدیقہؓ نبی کریمؐ کی محبوب اور محرم زوجہ اور حضرت صدیق اکبرؓ کی صاحبزادی تھیں بلکہ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ یہ ایسا موضوع تھا جس پر سیّد صاحب سے پہلے شاید ہی کسی مصنّف نے کما حقّہٗ توجہ دی ہو۔ پھر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ذریعے نبی کریمؐ کی حیاتِ طیّبہ کے جو گوشے دنیا کی نظروں کے سامنے آئے وہ کسی اور کے ذریعے نہ آئے تھے اور نہ آسکتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کی زندگی میں چند ایسے واقعات بھی پیش آئے تھے جو مابہ النّزاع بنے تھے اور جن کا ذکر کرتے ہوئے کسی اہلِ قلم کا عدل و توازن برقرار رکھنا بہت دشوار امر تھا۔ سیّد صاحب نے ایک سوانح نگار کی حیثیت سے یہ کارنامہ جس قابلیت، فراست اور نورِ ایمانی کے ساتھ انجام دیا ہے اُردو بلکہ کسی بھی زبان کے سوانحی ادب میں اس کی مثالیں شاذ ہی نظر آئیں گی۔ اُن کے استاد علامہ شبلی نعمانی کے تصنیفی کارناموں میں جو مقام "الفاروق" کو حاصل ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہی مقام "سیرتِ عائشہؓ" کو سیّد صاحب کے تصنیفی کارناموں میں حاصل ہے۔

اس راہ میں جو دو چار سخت مقامات آتے ہیں ان سے وہ اس طرح گزرے ہیں کہ ایک طرف انھوں نے عدل و توازن

★ صدر شعبۂ عربی، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

کے تقاضے پورے کیے ہیں اور دوسری طرف جس عظیم شخصیت پر قلم اُٹھایا ہے اس کے مقام کی بلندی کو پوری طرح پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ کام اتنا مشکل تھا کہ اس سے کوئی سید صاحب جیسا بالغ النظر ہی کامراں گزر سکتا تھا۔

سید صاحب نے "سیرتِ عائشہؓ" میں حضرت عائشہؓ کی زندگی کے وہ تینوں پہلو دکھائے ہیں جو کسی عورت پر گزر سکتے ہیں، یعنی لڑکپن، شادی شدہ دور اور بیوگی۔ حضرت عائشہؓ کی شادی بہت کم عمری میں ہوگئی تھی۔ اس بارے میں مختلف روایتیں ملتی ہیں کہ شادی کے وقت ان کی عمر کیا تھی۔ لیکن یہ بہر حال یقینی امر ہے کہ ان کی عمر بہت کم تھی اور ان کی اور نبی کریمؐ کی عمر میں تفاوت بہت زیادہ تھا۔ ہمارے اکثر مورخین نے اس بارے میں معذرتی انداز اختیار کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر زیادہ سے زیادہ بتائی جائے لیکن سید صاحب نے یہ ضروری نہیں سمجھا ہے اور مستند روایتوں سے ثابت کیا ہے کہ نکاح کے وقت ان کی عمر چھ سال اور رخصت کے وقت نو سال تھی۔ اسلام نے شادی کے لئے لڑکی کی عمر کا تعین نہیں کیا ہے، اور نہ بیوی اور شوہر کی عمر کا تفاوت پیشِ نظر رکھا ہے۔ تاہم معاشرہ لڑکی کی کم سنی کی شادی اور زوجین کے درمیان ایک حد سے زیادہ عمر کا تفاوت اچھی نظر سے نہیں دیکھتا ہے۔ سید صاحب نے اس سلسلے میں ایک لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "اِس کم سنی کی شادی کا اصل منشاء نبوت اور خلافت کے درمیان تعلقات کی مضبوطی تھا۔" گویا اس طرح یہ رشتۂ ازدواج حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کی طرف بھی ایک واضح اشارہ تھا۔ نبی کریمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے مابین جو برادرانہ تعلقات تھے ان کی بنا پر خود حضرت ابوبکرؓ کو ابتداء میں اس رشتے میں تامل تھا لیکن اس رشتے کا ایک منشاء یہ بھی تھا کہ اس طرح کے جاہلانہ تصورات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے یہ واضح کر دیا جائے کہ جہاں تک مناکحت کا تعلق ہے سوائے خونی رشتے کے کوئی اور رشتہ اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتا ہے۔ نبی کریمؐ کی شادی حضرت عائشہؓ سے جس سادگی کے ساتھ ہوئی اس نے مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ اور ایک مثال قائم کر دی۔ اب اگر مسلمان اس پر عمل پیرا نہ ہوں تو یہ ان کا اپنا قصور ہے۔ سید صاحب نے حضرت عائشہؓ کے مہر کے مسئلے پر بھی تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ مہر کی رقم ۵۰۰ درہم تھی۔ گویا اس بارے میں افراط اور تفریط دونوں سے پہلو تہی کی گئی تھی۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان بالعموم اپنی لڑکیوں کا مہر زیادہ سے زیادہ مقرر کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ مہر کی رقم جتنی زیادہ ہوگی رشتۂ ازدواج اتنا ہی پختہ ہوگا۔ یہ محض خام خیالی ہے کیونکہ اول تو مہر کا طلاق سے کوئی تعلق نہیں ہے، مہر بہر صورت ادا کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ دوسرے ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ اگر زوجین کے باہمی تعلقات خوش گوار نہ رہیں تو بیشتر صورتوں میں عورتیں مہر سے دستبردار ہو کر گلو خلاصی کرا لیتی ہیں۔ اور پھر نبی کریمؐ اور حضرت عائشہؓ سے زیادہ خوش گوار تعلقات دنیا میں کن میاں بیوی کے رہے ہوں گے!

اگرچہ حضرت عائشہ رضؓ کی شادی کم عمری میں ہو گئی تھی لیکن ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہیں رہی۔ انھیں قدرت نے والد ابو بکر صدیق رضؓ جیسے عطا فرمائے تھے اور شوہر نبی کریمؐ جیسے مرحمت فرمائے۔ پھر کمی رہ بھی کیوں کر سکتی تھی۔ سید صاحب نے حضرت عائشہ رضؓ کی زندگی کے اس پہلو پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور اس کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ روایت حدیث کے سلسلے میں حضرت عائشہ رضؓ کا جو اہم رول رہا ہے اس کے لئے ابتدائی تعلیم و تربیت ناگزیر تھی۔ شادی شدہ عورت کی زندگی میں شاید سوکن کا مسئلہ سب سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کو بیک وقت آٹھ سوکنوں سے واسطہ پڑا۔ ان میں ہر طرح کی خواتین شامل تھیں۔ حضرت حفصہ رضؓ تھیں جو حضرت عائشہ رضؓ ہی کی مانند نبی کریمؐ کے ایک دوسرے رفیقِ خاص حضرت عمر فاروق رضؓ کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت جویریہ رضؓ اور حضرت صفیہ رضؓ جیسی رئیس زادیاں تھیں۔ ایسی بھی تھیں جو حضرت عائشہ رضؓ سے عمر میں بہت بڑی تھیں اور ایسی بھی تھیں جن سے عمر میں زیادہ تفاوت نہیں تھا۔ بعض خونی رشتے کے اعتبار سے نبی کریمؐ سے زیادہ قریب تھیں اور بعض دوسرے مذاہب سے نکل کر اسلام کے دائرے میں داخل ہوئی تھیں۔ سید صاحب نے دیگر امہات المومنین رضؓ کے ساتھ حضرت عائشہ رضؓ کے ربط و تعلق کو جس طرح بیان فرمایا ہے اس میں دیانت داری کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مناقشات کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن یہ ثابت فرمایا ہے کہ مجموعی طور پر ان کے تعلقات دیگر امہات المومنین رضؓ کے ساتھ نہایت خوش گوار رہے اور اس بارے میں استناد صحاح ستہ سے کیا ہے۔ مشتبہ اور غلط روایات کا بطلان کرنے میں انھوں نے روایت اور درایت کا انتہائی حسین امتزاج پیش فرمایا ہے۔

یہ ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ نبی کریمؐ کی پہلی حرم محترم تھیں اور ان سے آپؐ کو نبوت کی ابتدائی دَور کے صبر آزما مرحلے میں کس قدر مدد ملی تھی۔ ان کی زندگی میں (حالانکہ وہ عمر میں آپؐ سے ۱۵ سال بڑی تھیں) آپؐ نے دوسری شادی نہیں فرمائی تھی اور ان کی یاد آپ کے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکی تھی۔ اگرچہ حضرت عائشہ رضؓ کا اور ان کا کبھی ساتھ نہیں رہا لیکن یہ بھی عام انسانی تجربہ ہے کہ اگر شوہر اپنی دوسری بیوی سے اپنی پہلی مرحوم بیوی کا ذکر اشتیاق و محبت کے ساتھ کرتا ہے تو یہ بات اس پر گراں گزرتی ہے۔ نبی کریمؐ حضرت خدیجہ رضؓ کا ذکر حضرت عائشہ رضؓ سے اکثر مہر و اُلفت کے ساتھ فرماتے تھے اور حضرت عائشہ رضؓ آپؐ سے نہ صرف بطیبِ خاطر برداشت فرماتی تھیں بلکہ ان کے فضل و شرف کا اعتراف بھی کرتی تھیں اگرچہ بتقاضائے بشریت ان پر رشک ضرور کرتی تھیں۔ سوکنوں کے علاوہ سوتیلی اولاد کا مسئلہ بھی بہت ٹیڑھا ہوتا ہے۔ حضرت خدیجہ رضؓ کے بطن سے نبی کریمؐ کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ جب حضرت عائشہ رضؓ نبی کریمؐ سے منسوب ہوئیں اس وقت حضرت فاطمہ زہرا رضؓ کے علاوہ اور سب صاحبزادیوں کی شادی ہو چکی تھی اور ان میں سے ایک (حضرت رقیہ رضؓ) کی وفات بھی ہو چکی تھی۔ حضرت زینب رضؓ اور حضرت ام کلثوم رضؓ

کی وفات سات آٹھ برس کے دوران ہوگئی اور ان دونوں سے حضرت عائشہؓ کا واسطہ کم ہی رہا۔ حضرت فاطمہؓ نبی کریمؐ کو جس قدر عزیز تھیں اس سے ہم سب واقف ہیں۔ اگرچہ ان کی شادی حضرت علی مرتضیٰؓ سے حضرت عائشہؓ کی رخصتی کے ایک سال کے اندر ہی ہوگئی تاہم ان سے حضرت عائشہؓ کا مسلسل ربط و تعلق رہا۔ ان کی شادی کا اہتمام بھی حضرت عائشہؓ ہی نے کیا تھا۔ احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں سید صاحب کی روایت ہے کہ ماں بیٹی کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے اور اس کی انھوں نے کئی مثالیں بھی بیان کی ہیں۔ ایک مرتبہ ضرور ایسا ہوا کہ بعض امہات المومنینؓ نے حضرت فاطمہؓ کو حضرت عائشہؓ کے مقابلہ میں اپنا سفیر بنا کر آپؐ کے پاس بھیجا۔ اس پر آپؐ نے انھیں تنبیہ فرمائی اور وہ شرمندہ ہو کر واپس تشریف لے گئیں۔ اس بارے میں بعض ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے دونوں ماں بیٹی کے تعلقات کی ناخوش گواری کا احساس ہوتا ہے لیکن سید صاحب نے مستند حوالوں سے انھیں مشتبہ اور ناقابلِ یقین قرار دیا ہے۔

نبی کریمؐ کو حضرت عائشہؓ کی خاطر جتنی عزیز تھی اور آپ ان کی کم سنی کا جتنا لحاظ فرماتے تھے اس کی متعدد مثالیں "سیرتِ عائشہؓ" میں بیان کی گئی ہیں اور ان سے نبی کریمؐ کی رافت و رحمت خوش مزاجی اور حسنِ سلوک پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ گویا سیرتِ پاک کے بعض ایسے گوشے نظر کے سامنے ہویدا ہوتے ہیں جو بصورتِ دیگر مخفی ہی رہتے۔ اس کے ساتھ ہی ایسا بھی ہوا کہ بعض مواقع پر آپؐ نے بعض معاملات میں حضرت عائشہؓ کی مناسب انداز میں تادیب فرمائی۔ سیرتِ پاک کی ایک اہم خصوصیت عدل و توازن ہے جس کا اظہار حیاتِ طیبہ کے ہر مرحلے پر ہوتا رہا اور یہ خصوصیت نبی کریمؐ کو دوسرے انبیائے کرامؑ سے ممتاز کرتی ہے۔ خانگی زندگی میں بھی عدل و توازن ہمیشہ اس وجودِ مقدسؐ کے پیشِ نظر رہا۔ پھر حضرت عائشہؓ نے نبی کریمؐ کے ساتھ فقر و فاقہ اور محنت و مشقت کی جو زندگی گزاری اور آپؐ کے ساتھ محبت و شیفتگی بدستور قائم رکھی اس سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے اور سید صاحب کے قلم نے ان کی زندگی کے اس رُخ کی نقاب کشائی جس انداز میں فرمائی ہے اس میں متانت اور شگفتگی کا بیک وقت امتزاج "سیرتِ عائشہؓ" کا درجہ ہمارے سوانحی ادب میں بہت اونچا کر دیتا ہے۔

واقعۂ افک شر پسندوں اور منافقین کی ایسی چال تھی جس سے نبی کریمؐ کا شیشۂ دل بھی گرد آلود ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ حضرت عائشہؓ کی زندگی کا یہ ایسا سانحہ تھا جس سے بڑا سانحہ کسی عفت مآب خاتون کی زندگی میں پیش آ ہی نہیں سکتا۔ سید صاحب نے "سیرتِ عائشہؓ" میں ایک طرف اِس واقعے کی مکمل تفاصیل مہیا فرمائی ہیں اور اس کے پیچھے جو عوامل کارفرما تھے ان کی نشان دہی کی ہے اور دوسری طرف اس واقعے کے مختلف مراحل پر واقعے سے متعلق جملہ کرداروں کی نفسیاتی کیفیت بڑی مہارت سے آشکار فرمائی ہے۔ حضرت عائشہؓ اس ابتلا سے نزولِ وحی کے بعد ہی سرفراز نکل سکیں اور نبی کریمؐ خود حضرت عائشہؓ اور ان کے والد ماجد حضرت ابوبکرؓ کی تشویش اور

بے چینی رفع ہوئی۔ اس واقعے کے مضمرات اتنے شدید تھے کہ حضرت حسانؓ بن ثابت جیسے نعت گو اور فدائی اسلام صحابی بھی ہجو گوئی کے مرتکب ہو بیٹھے۔ جب نبی کریمؐ نے اس بارے میں حضرت علیؓ سے مشورہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ "دنیا میں عورتوں کی کمی نہیں"۔ بنو امیہ نے اپنی حکومت کے زمانے میں حضرت علیؓ پر جو الزامات عائد کئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اس موقع پر انھوں نے نبی کریمؐ کو حضرت عائشہؓ کو چھوڑ دینے کا مشورہ دیا تھا لیکن سید صاحب نے امام زہریؒ کی تردید کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ اس سے خود ان کی رائے بھی حضرت علیؓ کی برائت کے حق میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس ناخوش گوار واقعے کا ایک خوش گوار نتیجہ تیمم کے حکم کی صورت میں نکلا۔

تحریم، ایلا اور تخییر کے واقعات سید صاحب نے نہایت تحقیق کے ساتھ اور پورے شرح و بسط سے بیان فرمائے ہیں۔ واقعۂ تحریم کے بیان میں سید صاحب کی قرآن فہمی اور عربی زبان اور اس کے قواعد پر کامل مہارت کا اظہار بہت حسن و خوبی سے ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ازواج مطہراتؓ کی باہمی چشمک کی پردہ داری نہیں فرمائی ہے کہ یہ مورخانہ دیانت کے خلاف ہوتا لیکن ساتھ ہی ادب کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ دراصل نبی کریمؐ اور اصحاب و آلِ نبیؐ کے حالات قلم بند کرتے ہوئے یہ توازن برقرار رکھنا بہت دشوار کام ہے اور اس فریضے سے چند مورخ ہی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکے ہیں ورنہ زیادہ تر لوگ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔

نبی کریمؐ نے مرض الموت میں حضرت عائشہؓ کے حجرے میں قیام فرمانا پسند فرمایا۔ اس سے آپؐ کے حضرت عائشہؓ کے ساتھ تعلق خاطر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ جب آپؐ نے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملنے کو دنیوی زندگی پر ترجیح دی اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔ اس کم سنی میں بیوگی کا صدمہ جتنا شدید اور صبر آزما ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے اور پھر رفاقت بھی اس ذاتِ گرامی کی چھوٹ رہی تھی جس سے گرامی تر کوئی دوسری ذات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ سے حضرت عثمانؓ تک کی خلافت کا زمانہ حضرت عائشہؓ نے بیوگی کی حالت میں جس وقار اور عزت نفس کے ساتھ گزارا وہ ایک مثال اور ایک نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی تدفین نبی کریمؐ کے پہلو میں ہوئی۔ اس دوران حضرت عائشہؓ وہاں بلاجھجک حاضر ہوتی رہتی تھیں کہ دونوں ان کے محرم تھے اور جو جگہ باقی بچی تھی وہ انھوں نے اپنے لئے محفوظ رکھی تھی کہ شوہر اور باپ کے جوار میں تدفین کا حق ان سے زیادہ کسی کو نہیں پہنچتا تھا لیکن جب حضرت عمرؓ نے اپنے آخری وقت میں اپنے دونوں رفقائے گرامی کے پہلو میں دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی تو حضرت عائشہؓ نے نہایت فیاضی سے اُن کی یہ خواہش پوری فرمائی۔ اس سے بڑھ کر کسی اور ایثار کا تصور ممکن نہیں۔

حضرت عثمانؓ کا آخری دورِ خلافت تاریخِ اسلام کا ایسا دور ہے جب شر و فتن کا آغاز ہوا۔ حضرت عثمانؓ

کے فضائل و مناقب کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انھوں نے تبلیغ اسلام کی خاطر اور اس کی راہ میں جو زر و مال صرف کیا اس کی شاید کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ پھر نبی کریمؐ کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے ان کے عقد میں رہیں اور اس مناسبت سے وہ ذوالنورین کہلائے۔ ان کے کاندھوں پر جب خلافت کا بار آیا اس وقت اُن کی عمر شیخینؓ کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی اور شیخینؓ نے خلافت و سیادت کا جو معیار قائم کیا تھا اس کی پیروی آسان نہیں تھی۔ خلافت کے دعوے دار بھی متعدد پیدا ہو گئے تھے۔ ان حالات میں حضرت عثمانؓ نے کاروبارِ خلافت چلانے میں اپنے اہلِ خاندان پر زیادہ اعتماد کیا اور یہ بات دوسرے قبائل خصوصاً قبیلۂ قریش، کے افراد کو ناگوار گزری۔ حضرت عثمانؓ کے اہلِ خاندان میں سے بعض لوگوں نے اپنے عہدہ و منصب کا مناسب استعمال بھی نہیں کیا اور اس سے دوسرے لوگوں کی ناگواری میں اضافہ ہوا۔ یہی اسباب شورش و بغاوت کا باعث بنے۔ اس مسئلے پر بہت سے علما و مورخین نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے اور حضرت عثمانؓ کی جو تصویر اپنی تحریروں میں پیش کی ہے وہ ان کے مرتبے سے فروتر ہے۔ ایک معلم کی حیثیت سے میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہمارے وہ نوجوان جو ان علما و مورخین کی تحریروں سے متاثر ہیں۔ حضرت عثمانؓ کا ذکر کرتے ہوئے ان کا ادب ملحوظِ نظر نہیں رکھتے ہیں۔ اپنے مزاج کے مطابق سید صاحب نے اس موقع پر بھی ایک ادب شناس مورخ کا فریضہ بیک وقت دیانت و شرافت کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اس دوران حضرت عائشہؓ برابر کوشش کرتی رہیں کہ لوگوں، خصوصاً نوجوانوں کے جذبات مشتعل نہ ہونے پائیں اور صورتِ حال ایسا رُخ اختیار نہ کرے جو کسی بڑے فتنے کا سبب بنے۔ ایک امر نے صورتِ حال کو حضرت عائشہؓ کے لئے بالخصوص تشویش ناک بنا دیا تھا۔ محمد بن ابی بکرؓ جو حضرت ابوبکرؓ کے چھوٹے صاحبزادے تھے لیکن ان کی اور حضرت عائشہؓ کی ماں الگ الگ تھیں، اور ان کی ماں حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آگئی تھیں، اور ان کی تربیت حضرت علیؓ ہی کے زیرِ سایہ ہوئی تھی۔ حضرت عثمانؓ سے بالوجوہ راضی نہیں تھے۔ رشتوں کی اس نزاکت کے سبب محمد بن ابی بکرؓ کا کسی شورش میں شریک ہونا دُور رس نتائج کا باعث بن سکتا تھا۔ حضرت عائشہؓ اسے بخوبی سمجھتی تھیں، اور اس لئے محمد بن ابی بکرؓ کو شورش میں شریک ہونے سے باز رکھنے کے لئے مسلسل کوشاں رہیں۔ حضرت عائشہؓ کی یہ روایت سید صاحب نے نقل کی ہے کہ نبی کریمؐ نے حضرت عثمانؓ کو وصیت فرمائی تھی کہ "اگر اللہ تعالیٰ تم کو خلافت کا جامہ پہنائے تو اپنی خوشی سے نہ اُتارنا"۔ اس لئے وہ جانتی تھیں کہ حالات خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں حضرت عثمانؓ خلافت سے دست بردار نہیں ہوں گے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت تاریخ اسلام کا ایسا سانحہ ہے جس کی طرف میری ناچیز رائے میں اتنی توجہ نہیں دی گئی ہے جتنی توجہ کا وہ مستحق ہے۔ بعد کے بہت سے حادثات کا رشتہ اسی حادثے سے جوڑا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ محمد بن ابی بکرؓ بھی اس حادثۂ فاجعہ میں ملوث ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ یہاں حضرت عثمانؓ کی بلندی کردار کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے

کہ انھوں نے شہید ہونا قبول فرمالیا لیکن مسلمانوں کا خون بہانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ تعجب ہے کہ سید صاحب کی حقیقت پسند اور ژرف بین نظر مسئلے کے اِس پہلو کی طرف نہیں گئی ہے۔ البتہ انھوں نے حضرت عائشہؓ پر سے یہ الزام کہ ان کا اس حادثۂ فاجعہ سے کوئی دُور کا بھی تعلق تھا قلم کی پوری طاقت سے رفع فرمایا ہے۔

جنگِ جمل اسلامی تاریخ کا ایسا افسوس ناک واقعہ ہے جس میں صحابۂ کرامؓ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہونے پر مجبور ہوئے۔ اس سلسلے میں حضرت عائشہؓ کا جو رول رہا اس کی وضاحت سید صاحب نے اس طرح فرمائی ہے کہ تحقیق و جستجو کا حق ادا کر دیا ہے اور ساتھ ہی مورّخانہ دیانت از اوّل تا آخر قائم رکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا اصلی مقصد اصلاحِ حال تھا اور اس کام میں ان کے ساتھ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ شریک تھے۔ اس ضمن میں اسلام میں عورتوں کے حقوق و فرائض کا ذکر بھی آگیا ہے اور سید صاحب نے بعض مثالیں دے کر ان کی بہت اچھی تشریح فرمائی ہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے عام مسلمان قدرتی طور پر مشتعل تھے اور باغیوں کو سزا دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی اس کے حق میں تھے لیکن بعض دوسرے عناصر کے برعکس ان کا مقصد حضرت علیؓ سے نبرد آزما ہونا یا ان کی مشکلات میں اضافہ کرنا ہرگز نہ تھا۔ تاہم حالات نے ایسی کروٹ لی کہ بصرہ کے قریب میدانِ جنگ گرم ہو کر رہا۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ شہید ہوئے اور جنگ میں حضرت علیؓ اور ان کے حامیوں کا پلڑا بھاری رہا۔ بعض شر پسند حضرت عائشہؓ کی شہادت کے بھی درپے تھے لیکن اُن کے ناپاک ارادے کامیاب نہیں ہو سکے۔ جنگ کے خاتمے پر حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ پورے اعزاز و اکرام کا سلوک کیا۔ سید صاحب کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اصلاحِ حال کا جو طریقہ اختیار کیا تھا اسے وہ اپنی اجتہادی غلطی تسلیم فرماتی تھیں اور اس پر متاسف تھیں۔ انھوں نے مستند دلائل کے ساتھ حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کے باہمی ملالِ خاطر کی بھی تردید فرمائی ہے۔ اسی طرح امام حسنؓ کی حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تدفین کے مسئلے پر جو اختلافِ رائے ہوا اور بعض جانب دار مورّخین نے اس واقعے میں حضرت عائشہؓ کو ملوّث کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے سید صاحب نے اس واقعے سے حضرت عائشہؓ کی لاتعلّقی بالاستدلال ثابت فرمائی ہے۔

سید صاحب نے حضرت عائشہؓ کے اخلاق و عادات کا تذکرہ نہایت تفصیل اور خوش اسلوبی سے کیا ہے اور اس سے جو تصویر پردۂ ذہن پر اُبھرتی ہے وہ کمالاتِ انسانی کی مظہر ہے۔ ان کے مناقب میں اس سے بڑھ کر اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان کی عفّت و عصمت پر قرآن نے شہادت دی، ان کے بستر پر وحی نازل ہوئی اور نبی کریمؐ ان کے زانو پر سر رکھے ہوئے واصل بالحق ہوئے۔ بقول مولینا سید سلیمان ندوی "علمی حیثیت سے حضرت عائشہؓ کو نہ صرف عام عورتوں پر، نہ صرف امہات المومنینؓ پر، نہ صرف خاص خاص صحابیوں پر بلکہ چند بزرگوں کو چھوڑ کر تمام صحابہؓ پر

فوقیت عام حاصل تھی"۔ انھوں نے صحیح ترمذی کے حوالے سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "ہم صحابیوں کو کوئی ایسی مشکل بات کبھی پیش نہیں آئی کہ جس کو ہم نے عائشہؓ سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ معلومات ہم کو نہ ملی ہوں"۔ اسی طرح بعض اکابر تابعین کے متعدد اقوال سید صاحب نے بیان کئے ہیں، جو حضرت عائشہؓ کے علم و فضل پر شاہد عادل ہیں۔ قرآن فہمی اور قرآن کی مختلف آیات کی تعبیر و تشریح میں شاید ہی کوئی دوسرا حضرت عائشہؓ کا ہمسر رہا ہو اور ہو بھی کیونکر سکتا تھا جب انھیں براہ راست نبی کریمؐ سے استفادے کا طویل موقع ملا تھا اور قرآن کا خاصہ بڑا حصہ ان کی موجودگی میں نازل ہوا تھا۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، جیسا کہ سید صاحب نے لکھا ہے "علم الحدیث کا موضوع درحقیقت ذاتِ نبویؐ ہے اس لئے اس فن کی واقفیت کے ذریعے سب سے زیادہ اس کو حاصل تھے جس کو سب سے زیادہ آپؐ کا تقرب حاصل تھا۔ حضرت عائشہؓ کو قدرتاً اس قسم کے مواقع زیادہ مل سکتے تھے"۔ اس پر مستزاد" ان کی فطری ذہانت اور قوتِ حفظ"۔ نتیجتاً سات کثیر الروایۃ صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن کثرتِ روایت سے قطع نظر، درایت و نکتہ رسی میں ان کا مقام بلند تر ہے اور فقہی اجتہاد اور استنباطِ مسائل میں ان بزرگوں میں سے ان کے ساتھ صرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا نام اور لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بعض احکام نبویؐ کی انھوں نے جس طرح علتِ غائی بیان فرمائی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ وہ کسی ایسی روایت کو قبول نہیں فرماتی تھیں جو کلامِ الٰہی کی مخالف ہو۔ اس کی سید صاحب نے بہت سی مثالیں دی ہیں۔ فقہ و فتاویٰ میں وہ قرآن، حدیث اور قیاسِ عقلی کو اسی ترتیب سے بنیاد بناتی تھیں۔ انھوں نے بہت سے احکامِ فقہی میں اپنے معاصرین سے اختلاف کیا اور سید صاحب کا کہنا ہے کہ "حق ان ہی کی جانب رہا"۔ علمِ کلام اور عقائد سے متعلق مسائل میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی اور اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان مسائل میں بھی ان ہی کا مسلک قرینِ عقل و فہم محسوس ہوتا ہے۔ اس بحث کے ضمن میں نبی کریمؐ کو معراج جسمانی ہوئی تھی یا روحانی، عام طور سے حضرت عائشہؓ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ روحانی معراج کی قائل تھیں لیکن سید صاحب نے زرقانی اور ابن شریح کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ اس بارے میں جو روایت حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کی جاتی ہے وہ حجت کے قابل ہی نہیں، البتہ خود سید صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ، "قرآن مجید نے اس کو رویا کہا ہے" اور "قرآن مجید نے دوسری جگہ اس کو رویتِ قلب کہا ہے"۔ پھر صحاح کی یہ تصریح نقل کی ہے کہ "آپؐ اس وقت بین النائم والیقظان یعنی کچھ سوتے کچھ جاگتے تھے"۔ آخر میں تحریر فرمایا ہے کہ "ایک روایت میں معراج کے تمام مشاہدات و واقعات کے ذکر کے بعد آخری لفظ ہے فَاسْتَیْقَظْتُ، پھر میں جاگ پڑا"۔

اسلام کے صدرِ اوّل کی تین برگزیدہ ترین خواتین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، حضرت عائشہؓ صدیقہؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ کی اولیت و افضلیت کے بارے میں مختلف آرا ملتی ہیں اور مختلف حضرات نے اپنے اپنے ذوق و رجحان کے مطابق اس بارے میں رائے قائم کی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ سید صاحب نے علامہ

ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیم کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے وہ حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے۔ ان کا ارشاد ہے "اگر نسبی شرافت کا اعتبار ہے تو حضرت فاطمہ زہرا رض سب سے افضل ہیں، اگر ایمان کی سابقیت، اسلام کی ابتدائی مشکلات کے مقابلے اور اس زمانے میں حضرت رسالت مآب ص کی اعانت و تسکینِ خاطر کی حیثیت سے دیکھئے تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض کی بزرگی سب پر مقدم ہے، لیکن اگر علمی کمالات، دینی خدمات اور آنحضرت ص کی تعلیمات و ارشادات کی نشر و اشاعت کی فضیلت کا پہلو سامنے ہے تو ان میں صدیقۂ کبریٰ رض کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔"

بلاشبہ "سیرتِ عائشہ رض" حضرت عائشہ رض کی زندگی اور کمالات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اور ایک سوانح نگار سے اس سلسلے میں جو بھی توقع کی جا سکتی ہے وہ توقع اس کتاب سے پوری ہوتی ہے۔ اصولِ تنقیدِ ادب کے علماء نے تاریخ کو علم و ادب کی درمیانی شکل قرار دیا ہے یا بہ الفاظِ دیگر کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ بیک وقت علم اور ادب دونوں کے دائرے میں داخل ہے۔ علم کی بنیاد حقایق پر ہوتی ہے اور ادب کی جذبات پر۔ تاریخ کا بنیادی کام حقایق کی بازیافت اور اشاعت ہے لیکن اگر وہ جذبے سے عاری ہو تو محض واقعات کی کھتونی بن کر رہ جاتی ہے یا تاریخ کے خام مواد کا کام دے سکتی ہے۔ جو چیز تاریخ کو صحیح معنی میں تاریخ بناتی ہے وہ حقایق کے ساتھ جذبے کی آمیزش ہے۔ اگر اس معیار کو پیشِ نظر رکھ کر ہم اُردو کے سوانحی ادب کا جائزہ لیں تو کم کتابیں ہی "سیرتِ عائشہ رض" کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ پھر سید صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جذبے کو کہیں بے لگام نہیں ہونے دیا ہے اور سنجیدگی اور متانت کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔

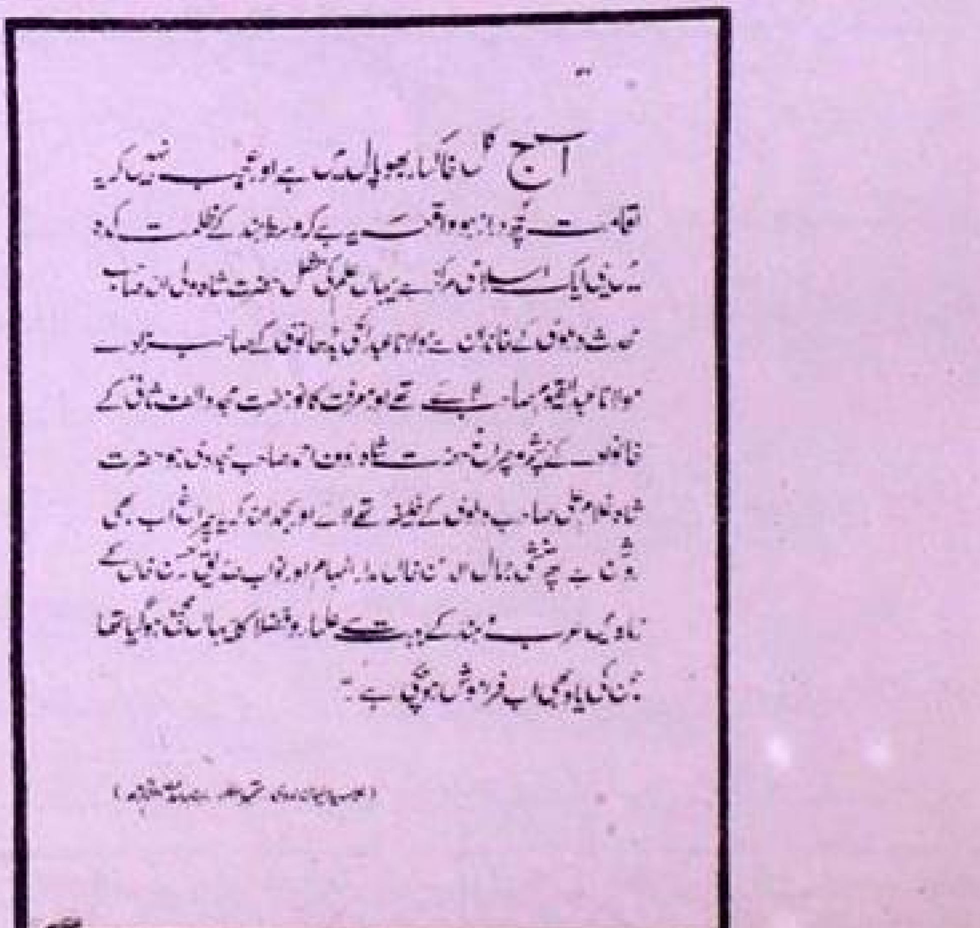

سید احمد عروج قادری★

خُطباتِ مدراس

علامہ، ڈاکٹر سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالٰے نے جو جامعیت عطا فرمائی تھی وہ کم لوگوں کو ملتی ہے۔ تفسیرِ قرآن کے ماہر، دریائے حدیث کے شناور، دربارِ فقہ و قضاء کے صدر نشین، تاریخ و سیرت و سوانح کے جمپین، عربی، فارسی اور اُردو کے اُستاد، شاعر و ادیب، زبان داں اور خطیب، وقت کی سیاست کے رمز شناس، ملّتِ اسلامیہ کے غم گُسار، تقویٰ، طہارت، علم، مروّت اور شرافت کے پیکر، علم و عمل کے مردِ میدان، کیا نہ تھے سید سلیمان ندویؒ۔

جس طرح انھوں نے اپنے استاد علامہ شبلی کی سوانح "حیاتِ شبلی" لکھی تھی، ٹھیک اسی طرح ان کے شاگرد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم و مغفور نے "حیاتِ سلیمان" لکھ دی ہے۔ اس پر کوئی اضافہ آسان نہیں ہے البتہ علامہ کے علمی کارناموں پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ صرف ریاست بہار کے لعل شب چراغ نہ تھے بلکہ پورے ملک کے گوہر نایاب تھے۔ میرے نزدیک "خطباتِ مدراس" بھی ان کا ایک ایسا علمی کارنامہ ہے، جسے بلا مبالغہ کوزے میں دریا کہا جا سکتا ہے۔ میں اس کتاب سے اس وقت واقف ہوا جب مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے درجۂ فاضل میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس وقت سے سات آٹھ سال تک یہ کتاب میرا اوڑھنا بچھونا بنی رہی ہے، اس کی متعدد عبارتیں میں نے زبانی یاد کر لی تھیں اور جب میں کسی سیرتِ نبویؐ کے جلسے میں اپنی تقریر کے درمیان انھیں دہراتا تھا تو تقریر میں جان آجاتی تھی۔ جب مجھے اِس سہ روزہ مذاکرے میں شرکت کا دعوت نامہ ملا اور تعارف و تبصرہ کی کتابوں میں "خطبات مدراس" کا نام بھی نظر سے گزرا تو یہ مختصر کتاب میری نگاہوں کے سامنے اُبھر آئی ہوئی اور میں نے ارادہ کر لیا کہ اسی پر اپنے تاثرات مرتب کروں گا۔

اس وقت مجھے اس کتاب کا وہ نسخہ مل سکا جو تاج پبلشرز دہلی نے شائع کیا تھا، اور یہ اس کتاب کا تیسرا اڈیشن ہے۔ اس اڈیشن کے دیباچے میں ۱۴ نومبر ۱۹۳۶ء کو علامہ نے لکھا تھا:

> "خدا کا شکر ہے کہ ان خطبات کو جو سرسری طور پر لکھے گئے تھے، حد سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور مسلمانوں کے ہر طبقہ میں وہ یکساں ذوق و شوق کے ہاتھوں سے لئے گئے اور عقیدت کی آنکھوں سے پڑھے گئے، مدرسوں

★ مدیر ماہنامہ زندگی، رام پور — افسوس کہ ۱۲ مئی ۱۹۸۶ء کو وفات پائی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے

> میں، اسکولوں میں، مجلسوں میں ہر جگہ وہ پڑھے جاتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ یہ جو کچھ ہے خداوند تعا کا فضل و کرم ہے۔"

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خطبات مرتب کرتے وقت اللہ تعالےٰ نے علامہ کے دل و دماغ میں ایک خاص روشنی اور ان کے قلم میں ایک خاص تاثیر عطا کر دی تھی کہ سرسری طور پر لکھے ہوئے یہ خطبات، تحقیقی طور پر لکھے گئے بہت سے خطبات سے بازی لے گئے ہیں۔ دیباچہ اول میں ہے :۔

> " آئندہ صفحات میں سیرت نبوی ؐ کے مختلف پہلوؤں پر چند خطبات (لکچر) ہیں، جو جنوبی ہند کی اسلامی تعلیمی انجمن کی فرمائش سے اکتوبر و نومبر ۱۹۲۵ء میں دیئے گئے تھے۔ مدراس میں کچھ برسوں سے ایک امریکن عیسائی کی فیاضی سے مدراس یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے کوئی نہ کوئی ممتاز عیسائی فاضل حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات و سوانح اور مسیحی مذہب سے متعلق چند خطبات دیتا ہے۔ یہ خطبے سال بسال ہوتے ہیں اور نہایت دل چسپی سے سُنے جاتے ہیں۔"

یہ دیکھ کر مدراس کے ذی علم اور مال دار مسلمانوں کو یہ خیال آیا کہ مدراس کے انگریزی مدارس کے طلبہ کے سامنے اسلام اور پیغمبر اسلام پر وقت کی زبان اور عصری ذوق کے مطابق خطبے دلائے جائیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلا انتخاب علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہوا اور آپ نے دو ماہ میں آٹھ خطبات ارشاد فرمائے۔ چونکہ مدراس کے طلبہ میں مسیحی مذہب کو پھیلانے کی کوشش ہو رہی تھی اس لئے علامہ نے اپنے خطبات میں یہ ثابت کیا کہ انسان کی نجات مسیحیت میں نہیں، اسلام میں ہے۔ ان خطبات میں انبیاء کرام، بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تقابلی مطالعے کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے اس لئے کچھ لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا ہوگا چنانچہ غلط فہمی دور کرنے کے لئے علامہ کو یہ لکھنا پڑا تھا:

> " اس کتاب کے بعض بعض خطبوں میں سیرۃ محمدی ؐ کا دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرتوں سے مقابلہ و موازنہ ہے گو وہ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کے اصول سے صحیح بھی ہوں، تاہم ان موقعوں پر یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ وہ غیر مذہب والوں کے مقابلے میں الزامی طور پر ہیں اور وہ انبیاء کی ان سیرتوں کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے جو اس کے ماننے والے مانتے اور ان کی طرف منسوب آسمانی صحیفوں میں مذکور ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ ہر نبی اسلام کی نگاہ میں کامل، بے عیب اور معصوم تھا اور ان میں سے ہر ایک کی سیرتیں حسب استعداد و اختلاف زمانہ باہم گو کسی قدر مختلف ہوں، تاہم وہ اعتراض سے بری اور ہر خوردہ گیری سے بالاتر ہیں۔"

ان آٹھ خطبات کے عنوانات یہ ہیں :

۱۔ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے۔

۲۔ عالم گیر اور دائمی نمونۂ عمل صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت ہے۔
۳۔ سیرتِ نبوی ؐ کا تاریخی پہلو
۴۔ سیرتِ نبوی ؐ کی کاملیت۔
۵۔ سیرتِ نبوی ؐ کی جامعیت۔
۶۔ سیرتِ نبوی ؐ کی عملیت۔
۷۔ اسلام کے پیغمبر کا پیغام
۸۔ ایمان و عمل

یہ آٹھ تقریریں دراصل آٹھ کتابیں ہیں، خطباتِ مدراس میرے نزدیک صنعتِ ایجاز کا ایک نادر نمونہ ہیں۔ اگر انھیں صنعتِ اطناب میں منتقل کیا جائے تو ہر خطبہ ایک کتاب بن سکتا ہے۔

ان تمام خطبوں کو پڑھنے کے بعد ان میں صاف طور پر ایک منطقی ربط محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ خطبات علامہ نے سرسری طور پر مرتب کیے تھے۔ لیکن سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد مرتب کیے تھے۔ ورنہ ان کے درمیان منطقی ربط موجود نہ ہوتا۔ منطقی ربط کے معنی یہ ہیں کہ غور و فکر کرنے والے قاری کے سامنے جب ایک عنوان پر معلومات و خیالات آجاتے ہیں تو آپ سے آپ دوسرے عنوان کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ پہلا عنوان یہ ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے۔ اس خطبے میں علامہ نے دلیلوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ انسانوں میں جتنے طبقات پائے جاتے ہیں ان میں سے انبیاء کرام کے سوا کوئی دوسرا طبقہ ایسا نہیں ہے جس کی سیرت' انسانیت کی تکمیل کر سکتی ہو۔ اس کے بعد قاری کے ذہن میں خود بخود یہ سوال اُبھرتا ہے کہ انبیاء کی تعداد تو بہت ہے' انسان' ان میں سے کس نبی کو اپنا آئیڈیل بنائے؟ اس سوال کا فوری جواب خطبہ ۲ میں مل جاتا ہے۔ یہی معنی ہیں منطقی ربط کے۔

عالم گیر اور دائمی نمونۂ عمل صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے۔ یہ ایک دعویٰ ہے اس کے ثبوت میں بعد کے چار خطبات پیش کیے گئے ہیں یعنی سیرت نبوی ؐ کا تاریخی پہلو، اُس کی کاملیت، اُس کی جامعیت، اُس کی عملیت۔

استدلال کا انداز یہ ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف اسی سیرت سے ہو سکتی ہے جس میں چار شرائط پائی جاتی ہوں۔ وہ تاریخی طور پر ثابت ہو[۱]۔ کامل ہو[۲]، جامع ہو[۳]، صاحبِ[۴] سیرت نے خود عمل کر کے دکھایا ہو۔ ان چار شرائط کی معقولیت سے کون صاحبِ عقل انکار کر سکتا ہے۔ علامہ نے پہلے تاریخیت، کاملیت، جامعیت اور عملیت کا تفصیل سے مفہوم واضح کیا ہے۔ پھر اس کے بعد ان میں سے ہر ایک پر ایک مستقل خطبہ مرتب کیا ہے۔ انھوں نے غیر مسلم دانش وروں کے بھی کافی حوالے دیئے ہیں۔ انھوں نے ناقابلِ تردید دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ان چاروں شرائط پر صرف سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پوری اُترتی ہے۔ ان خطبات کو پڑھنے کے بعد ایک انصاف پسند ذہن کہتا ہے کہ اچھا، مان لیا کہ صرف خاتم الانبیاء والمرسلین ؐ کی سیرت سے انسانیت کی تکمیل ہو سکتی ہے لیکن پیغمبر اسلام کا پیغام کیا تھا؟ اس سوال کا جواب خطبہ ۷ میں ملتا ہے۔ سب سے آخر میں "ایمان و عمل" کا عنوان آتا ہے جس میں سید صاحب نے دینی تعلیمات کا عطر

کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

بلاشبہ "سیرت النبیؐ" کی جلدیں اپنا ایک مستقل مقام رکھتی ہیں اور وہ علومِ شریعت کا ایک خزانہ ہیں لیکن "خطباتِ مدراس" ایک دوسری ہی چیز ہے۔ تقریباً دو سو صفحات کی مختصر کتاب میں دل نشین دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ محمدؐ عربی کا دامن تھامے بغیر نہ انسانیت کی تکمیل ہو سکتی اور نہ اسے سکون مل سکتا ہے، صرف پیغمبرِ اسلامؐ کا پیغام ہی فلاحِ دارین کا مژدہ سناتا ہے اور صرف اسی پر عمل دنیا اور آخرت میں کامیابی کا واحد وسیلہ ہے۔ عرصۂ دراز گزرا شاید انھیں خطبات کو پڑھ کر میں نے یہ شعر کہا تھا

جب بھی دنیا کی قیادت کا سوال آتا ہے
دل میں فوراً ہی محمدؐ کا خیال آتا ہے

ان خطبات میں کیا ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے ہر خطبے سے کچھ عبارتیں پیش کر دی جائیں تو بہتر ہے تاکہ یہ مختصر تعارف و تبصرہ مکمل ہو جائے۔

پہلے خطبے کا موضوع اوپر گزر چکا ہے۔ اس میں ایک جگہ علامہ نے لکھا ہے:

> ■ بہرحال تاریخ کی دنیا میں ہزاروں لاکھوں اشخاص نمایاں ہیں، جنھوں نے آنے والوں کے لئے اپنی زندگیاں نمونے کے طور پر پیش کی ہیں، ایک طرف شاہانِ عالم کے باشان و شوکت دربار ہیں، ایک طرف سپہ سالاروں کے جنگی پرے ہیں، ایک طرف حکماء اور فلاسفروں کا متین گروہ ہے، ایک طرف فاتحینِ عالم کی پُرجلال صفیں ہیں، ایک طرف شعراء کی بزمِ رنگین ہے، ایک طرف دولت مندوں اور خزانوں کے مالکوں کی نرم گدیاں اور کھنکھناتی تجوریاں ہیں، ان میں سے ہر ایک کی زندگی آدم کے بیٹوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔
>
> کارتھیج کا ہنیبال، مقدونیہ کا سکندر، روم کا سیزر، یورپ کا نپولین، ہر ایک کی زندگی ایک کشش رکھتی ہے، سقراط، افلاطون، جالینوس اور یونان کے دوسرے مشہور فلسفیوں سے لے کر اسپنسر تک تمام حکماء اور فلاسفروں کی زندگی میں ایک خاص رنگ نمایاں ہے۔ نمرود، فرعون اور ابوجہل، ابولہب کی دوسری شخصیتیں ہیں، قارون کی ایک الگ زندگی ہے، غرض دنیا کے اسٹیج پر ہزاروں قسم کی زندگیوں کے نمونے ہیں جو بنی آدم کی عملی زندگی کے لئے سامنے ہیں لیکن بتاؤ کہ ان مختلف افرادِ انسانی میں کس کی زندگی نوعِ انسانی کی سعادت، فلاح و ہدایت کی ضامن اور کفیل اور اس کے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہے؟
>
> ان لوگوں میں بڑے بڑے فاتح اور سپہ سالار ہیں، جنھوں نے اپنی تلوار کی نوک سے دنیا کے طبقے الٹ دیئے ہیں لیکن کیا انسانیت کی فلاح و ہدایت کے لئے انھوں نے کوئی نمونہ چھوڑا، کیا ان کی تلوار میدانِ جنگ سے آگے بڑھ کر انسانی اوہام و خیالاتِ فاسدہ کی بیڑیوں کو بھی کاٹ سکی؟ انسانوں کے باہمی برادرانہ تعلقات کی گتھی بھی سلجھا سکی، انسانی معاشرت کا کوئی خاکہ پیش کر سکی۔ ہماری روحانی مایوسیوں اور ناامیدیوں کا کوئی علاج بتا سکی؟ ہمارے اخلاق اور

اعمال کا کوئی نقشہ بنا سکی۔" (خطباتِ مدراس، ص۱۵-۱۶)

"حکما اور فلاسفر جنھوں نے بارہا اپنی عقلِ رسا سے نظامِ عالم کے نقشے بدل دیئے ہیں، جنھوں نے عجائباتِ عالم کی طلسم کشائی کے حیرت انگیز نظریئے پیش کئے ہیں، وہ بھی انسانیت کے نظامِ ہدایت کا کوئی عملی نقشہ پیش نہ کر سکے اور نہ فرائضِ انسانی کی طلسم کشائی میں عملی امداد دے سکے، کہ ان کی دقیق نکتہ سنجیوں اور بلند خیالیوں کے پیچھے بھی حسنِ عمل کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ ارسطو نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی، ہر یونیورسٹی میں اس کے ایتھکس پر بہترین لکچر دیئے جاتے ہیں اور اخلاقی مسائل میں اس کی نکتہ آفرینیوں کی داد دی جاتی ہے، لیکن سچ بتاؤ، اس کو پڑھ کر یا سُن کر نوعِ انسانی کے کتنے افراد راہِ راست پر آگئے۔ آج دنیا کی ہر یونیورسٹی میں ایتھکس کے بڑے لائق پروفیسر اور اساتذہ موجود ہیں مگر ان کے علمِ اخلاق کے فلسفیانہ رموز و اسرار کا دائرۂ اثر ان درس گاہوں کی چہار دیواری سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا، نہ بڑھ سکتا ہے اس لئے کہ جب ان کمروں سے نکل کر وہ میدان میں آتے ہیں تو ان کی عملی زندگی عام افرادِ انسانی سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی اور انسان کانوں سے نہیں آنکھوں سے بنتا ہے۔" (ایضاً ص۱۷-۱۸)

ان عبارتوں کو میں نے زبانی یاد کر لیا تھا اور آج پھر جب میں نے انھیں پڑھا تو دل و دماغ پر وہ اثر پڑا جو تازہ گلاب سونگھ کر پڑتا ہے۔ "انسان کانوں سے نہیں، آنکھوں سے بنتا ہے" سیّد صاحب کا یہ بلیغ ترین جملہ میرے ذہن پر نقش کالحجر کی طرح جم گیا ہے اور نہ جانے میں نے اپنی کتنی تقریروں میں اسے دہرایا ہے۔ دوسرے خطبے میں ایک جگہ علامہ نے لکھا ہے:

"غور فرمایئے، نیکیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک سلبی ایک ایجابی۔ مثلاً آپ پہاڑ کی ایک کھوہ میں جا کر عمر بھر کے لئے بیٹھ گئے تو صرف یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بدیوں اور برائیوں سے آپ نے پرہیز کیا۔ یعنی آپ نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو آپ کے لئے قابلِ اعتراض ہو مگر یہ تو سلبی تعریف ہوئی۔ ایجابی پہلو آپ کا کیا ہے؟ کیا آپ نے غریبوں کی مدد کی، محتاجوں کو کھانا کھلایا، کمزوروں کی حمایت کی، ظالموں کے مقابلے میں حق گوئی سے کام لیا، گرتوں کو سنبھالا، گمراہوں کو راستہ دکھایا، غرض عفو، کرم، سخا، مہمان نوازی، حق گوئی، رحم، حق کی نصرت کے لئے جوش، جد و جہد، مجاہدہ، ادائے فرض، ذمہ داریوں کی بجا آوری، غرض تمام وہ اخلاق جن کا تعلق عمل سے ہے وہ صرف سلبِ فعل اور عدمِ عمل سے نیکیاں نہیں بن جائیں گے۔ نیکیاں صرف سلبی ہی پہلو نہیں رکھتیں، زیادہ تر ایجابی اور عملی پہلو پر ان کا مدار ہوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس سیرت کا عملی حصہ سامنے نہ ہو اس کو "آئیڈیل لائف" اور قابلِ تقلید زندگی کا خطاب نہیں دیا جا سکتا کہ انسان اس کی کس چیز کی نقل کرے گا اور کس عمل سے سبق حاصل کرے گا۔" (ایضاً ص۳۹-۴۰)

مستشرقین اور پادریوں نے یہ بات پھیلائی کہ احادیث کی تدوین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے (۹۰) برس بعد ہوئی ہے، اس سے اُن کی غرض یہ تھی کہ احادیثِ نبویؐ کی صحت اور اس کے وثوق کو مشکوک قرار دیا جائے، وہ اپنے

اس بُرے مقصد میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ اُن کے مسلمان شاگردوں نے بھی یہی راگ الاپنا شروع کر دیا اس کی تردید میں علاّمہ نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ تسلی بخش ہے، ایک اور غلط بات جو پھیلائی جاتی ہے اُس کی تصحیح کے لئے انھوں نے لکھا ہے :۔

> " غلط فہمی کا بڑا سبب یہ ہے کہ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ احادیث وسیر کی تدوین وتحریر کا کام تابعین نے شروع کیا اور تابعین ان کو کہتے ہیں جنہوں نے صحابہؓ کو دیکھا اور ان سے فیض پایا اور صحابہ کا زمانہ سو برس تک تقریباً رہا تو گویا تابعین کا عہد سو برس بعد شروع ہوا اور اس طرح گویا تدوین وتحریر کے سلسلہ کا آغاز سو برس کے بعد ہوا حالانکہ یہ تمام تر غلط ہے۔ تابعین ان کو کہتے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل نہیں کیا اور صحابہؓ کی زیارت کی اور ان سے مستفید ہوئے عام اس سے کہ وہ آنحضرتؐ کے زمانے میں ہوں مگر زیارت کا موقع نہ ملا یا عہد نبویؐ کے آخر میں پیدا ہوئے اس لئے آپؐ سے مشرف نہ ہوئے یا آپؐ کی وفات (ربیع الاول ۱۱ھ) کے بعد پیدا ہوئے، وہ سب تابعین میں داخل ہیں۔ اس طرح دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ تابعین کا عہد خود آپؐ کی زندگی میں ہی اور کم از کم یہ کہ سنہ ۱۱ھ سے شروع ہوگیا اس لئے سنہ ۱۱ھ سے جو کام شروع ہوا اس کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ تابعین نے اس کام کا آغاز کیا۔ تابعین کا کارنامہ ہونے کے لئے ایک ایک صحابیؓ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کی ضرورت نہیں اور نہ سو برس بعد کا زمانہ گزرنے کی حاجت ہے وہ تو تابعیت کا آخری عہد ہے، اس کے بعد تابعیت کے شرف کا خاتمہ ہوتا ہے کیونکہ صحابہؓ کے وجود کا خاتمہ ہوگیا جن کے دیدار کے شرف سے لوگ تابعی بنتے تھے۔
> الغرض اس تفصیل سے ثابت ہوگا کہ یہ کہنا کس درجہ دھوکا ہے کہ مسلمانوں میں اخبار وسیر کی ترتیب کا کام سو برس کے بعد شروع ہوا۔" (ایضاً ص ۶۴، ۶۵)

یہ بات علاّمہ سید سلیمان ندوی جیسا وسیع النظر عالم ومورّخ ہی کہہ سکتا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے تدوین احادیث وسیر اور ترتیبِ احکام وسنن کے تین ادوار کی نشاندہی کی ہے :۔

> " مسلمانوں میں اخبار وسیر اور احکام وسنن کی ترتیب وتدوین کے درحقیقت تین دَور ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر شخص نے صرف اپنے ذاتی معلومات کو یکجا کیا، دوسرا دَور یہ آیا کہ ہر شہر کے معلومات ایک جگہ فراہم کئے گئے، تیسرا دَور وہ آیا جب تمام دنیائے اسلام کے معلومات اکٹھا کئے گئے اور ان کو موجودہ کتابوں کی صورت میں جمع کیا گیا۔ پہلا دور غالباً سنہ ۱۰۰ھ تک قائم رہا۔ دوسرا دَور سنہ ۱۵۰ھ تک رہا اور تیسرا دَور سنہ ۱۵۰ھ سے تیسری صدی کے کچھ دنوں بعد تک قائم رہا۔ پہلا دَور صحابہؓ اور اکابر تابعین کا تھا، دوسرا دَور تبع تابعین کا تھا اور تیسرا دور امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ کا تھا۔ پہلے دَور کا تمام سرمایہ دوسرے دَور کی تمام کتابوں میں ہے اور دوسرے دَور کی کتابوں کا تمام مواد تیسرے دَور کتابوں میں کھپا دیا گیا، اور دوسرے اور تیسرے دور کی کتابوں کا سرمایہ آج ہزاروں

اوراق میں ہمارے پاس موجود ہے اور وہ دنیا کی تاریخ کا سب سے گراں بہا، معتبر تر، مستند تر ذخیرہ ہے جس سے زیادہ مستند اور معتبر دنیا کی تاریخ کے خزانے میں کوئی اور ذخیرہ نہیں۔" (ایضاً ص ۶۵ - ۶۶)

یہ کتنی قیمتی معلومات ہیں جو سید صاحب نے مہیا کی ہیں۔ اگر اس کتاب میں صرف یہی عبارت ہوتی تو اس کے گراں بہا ہونے پر شاہد عدل ہوتی ——— "کاملیت" پر جو خطبہ ہے اس کی ایک عبارت یہ ہے:

"ایک نکتہ کی طرف آپ کی توجہ کو اور ملتفت کرنا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ابتداءً ایمان لائے وہ دریا کے کنارے کے ماہی گیر نہ تھے، وہ مصر کی محکوم اور غلام قوم کے افراد نہ تھے بلکہ ایک ایسی آزاد قوم کے افراد تھے جو اپنی عقل و دانش کے لحاظ سے ممتاز تھی اور جس نے ابتدائے آفرینش سے آج تک کبھی کسی کی اطاعت نہیں کی تھی، وہ لوگ تھے جن کے تجارتی کاروبار ایران، شام، مصر اور ایشائے کوچک تک پھیلے ہوئے تھے، ان میں وہ لوگ تھے جن کی دقیقہ سنجی، نکتہ رسی اور عقل و ذہانت کے ثبوت، مسائل اور احکام کی صورت میں آج بھی موجود ہیں، ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے بڑی بڑی فوجوں کا فاتحانہ مقابلہ کیا اور دنیا کے مشہور سپہ سالاروں میں داخل ہیں، ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے ملک پر فرمانروائیاں کیں اور حکومت کے نظم کی بہترین قابلیت کا اظہار کیا۔ کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی یہ تصور کر سکتا ہے کہ ایسے پُر زور، قوی بازو اور دانایانِ روزگار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حال چھپا رہ سکتا تھا اور وہ دھوکا کھا سکتے تھے بلکہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ کی ایک ایک جنبش کی نقل کی ہے اور جو آپ کے نقشِ قدم پر چلنا اپنی سعادت سمجھتے تھے، یہ آپ کی کاملیت کی ناقابلِ تردید دلیل ہے۔"

(ایضاً ص ۸۶، ۸۷)

"جامعیت" کے خطبے میں لکھتے ہیں:

"غرض ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفۂ انسانی اور ہر حالتِ انسانی کی مختلف زندگیوں اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے۔ اگر تم دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو، اگر تم غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر تم بادشاہ ہو تو سلطانِ عرب کا حال پڑھو، اگر تم رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو، اگر تم فاتح ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار پر نظر کرو، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ احد سے عبرت حاصل کرو، اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کے درس گاہ کے معلمِ قدس کو دیکھو، اگر تم شاگرد ہو تو روح امین کے سامنے بیٹھنے والے کو دیکھو، اگر تم واعظ ہو اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تم تنہائی اور بے کسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار نبی کا اسوہ تمہارے سامنے ہے، اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور اپنے مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر تم اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کے نظم و نسق کو درست کرنا

> چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم و نسق کو دیکھو، اگر تم یتیم ہو تو عبداللہ اور آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو، اگر تم جوان ہو تو مکہ کے چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر تم سفری کاروبار میں ہو تو بصریٰ کے کاروان سالار کی مثالیں ڈھونڈو، اگر تم عدالت کے قاضی اور پنچائتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نورِ آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجرِ اسود کو کعبہ کے ایک کونہ میں کھڑا کر رہا ہے، مدینہ کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظرِ انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب برابر تھے، اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہ رضؓ اور عائشہ رضؓ کے مقدس شوہر کی حیاتِ پاک کا مطالعہ کرو، اگر تم اولاد والے ہو تو فاطمہ رضؓ کے باپ اور حسن رضؓ اور حسین رضؓ کے نانا کا حال پوچھو، غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو، تمہاری زندگی کے لئے نمونہ، تمہاری سیرت کی درستی و اصلاح کے لئے سامان، تمہارے ظلمت خانے کے لئے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمد رسول اللہؐ کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔" (ایضاً ص۹۷-۹۸)

علامہ کی یہ عبارت بھی میں نے زبانی یاد کی تھی۔ صرف اسی عبارت کی تشریح کی جائے تو وہ کتنے صفحات میں آئے گی؟ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہر خطبہ، ایک مرصع غزل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے فی الواقع اس میں سے کچھ لینے اور کچھ چھوڑنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس تعارف و تبصرہ کے لئے میں نے اپنے ذہن میں جو خاکہ بنایا تھا وہ اس سے طویل ہو چکا ہے اس لئے اقتباسات کے لئے قلم کو روکنا پڑ رہا ہے۔

"عملی پہلو یا عملیت" اس خطبے کی ابتدا میں لکھا گیا ہے:

> "صاحبو! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کس چیز میں اور کیونکر کرنی چاہئے اس کے لئے آج ہم کو سیرت نبوی علیٰ صاحبہا السلام کا عملی پہلو دکھانا ہے، یہ انبیاء کرام اور بانیانِ مذاہب کی موجودہ سیرتوں کا وہ باب ہے جو تمام تر خالی اور سادہ ہے لیکن محمد رسول اللہ کی سیرت کا یہی باب سب سے بڑا اور ضخیم ہے اور تنہا یہی ایک معیار اس فیصلہ کے لئے کافی ہے کہ نبیوں کا سردار اور رسولوں کا خاتم کون ہو سکتا ہے؟" (ایضاً ص۱۱)

ساتویں خطبے میں جو پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام سے متعلق ہے، علامہ لکھتے ہیں:

> "ہر مذہب کے دو جز ہیں ایک کا تعلق دل سے ہے اور دوسرے کا ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء سے یا انسان کے مال و دولت سے، پہلے کو ایمان اور دوسرے کو عمل کہتے ہیں۔ عمل کے تین حصے ہیں ایک خدا سے متعلق جس کو عبادات کہتے ہیں دوسرا انسان کے باہمی کاروبار سے متعلق جس کو معاملات کہتے ہیں اور جن کا بڑا حصہ قانون ہے۔ تیسرا انسان کے باہمی تعلقات اور روابط کی بجاآوری ہے جس کو اخلاق کہتے ہیں۔ غرض اعتقادات، عبادات، معاملات اور اخلاق، مذہب کے یہی چار جز ہیں۔ مذہب کے یہ چاروں اجزاء، پیغام محمدیؐ ہی کے ذریعہ سے تکمیل کو پہنچے۔" (ایضاً ص۱۵۰-۱۵۱)

آخری خطبے کی آخری عبارت یہ ہے:

"نوجوانو! مجھے صفائی کے ساتھ یہ کہنے دو کہ خاموشی، سکون، خلوت نشینی اور منفردانہ زندگی، اسلام نہیں ہے، اسلام جدوجہد، سعی و عمل اور سرگرمی ہے وہ موت نہیں حیات ہے۔ اس کا فرمان لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (نجم) انسان کے لئے وہی ہے جو کوشش کرے اور كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (مدثر) ہر جان اپنے کام کے ہاتھوں گرو ہے۔

وہ سرتاپا جہاد اور مجاہدہ ہے لیکن خلوت میں بیٹھ کر نہیں بلکہ میدان میں نکل کر، محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تمہارے سامنے ہے۔ خلفائے راشدینؓ کی زندگی تمہارے سامنے ہے، عام صحابہؓ کی زندگی تمہارے سامنے ہے، وہی تمہارے لئے نمونہ ہے اور اسی میں تمہاری نجات ہے اور وہی تمہارا ذریعۂ فلاح ہے اور وہی ترقی اور سعادت کی راہ ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام بودھ کے پیغام کی طرح ترکِ خواہش نہیں ہے بلکہ تصحیح خواہش ہے پیغام محمدیؐ حضرت مسیحؑ کے پیغام کی طرح دولت اور قوت کی تحقیر اور ممانعت نہیں ہے بلکہ ان کے حصول اور صرف کے طریقوں کی درستی اور اس کے صحیح استعمال اور مصرف کا تعین ہے۔ دوستو! ایمان اور اس کے مطابق عمل صالح یہی اسلام ہے۔ اسلام عمل ہے ترکِ عمل نہیں، ادائے واجبات ہے عدمِ واجبات نہیں۔ ادائے فرض ہے ترکِ فرض نہیں، اسی کی تشریح تمہارے پیغمبر کی زندگی اور سیرت میں ملے گی، صحابہؓ کی زندگی اور سیرت میں ملے گی، جس کا نقشہ یہ ہے مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔ (الفتح ۲۶)

رومیوں کا سپہ سالار مسلمانوں کے کیمپ میں جاسوس بھیجتا ہے، وہ سب جاکر رومی سپہ سالار کو بتاتے ہیں کہ مسلمان کیسے سپاہی ہیں "هُمْ بِاللَّيْلِ رُهْبَانٌ وَبِالنَّهَارِ فُرْسَانٌ" وہ راتوں کے عابد ہیں اور دن کے شہسوار۔ دوستو، یہی اسلام کی زندگی ہے۔"

علامہ کی یہ عبارت آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ علامہ نے اپنے خطبات کو جس عبارت پر ختم کیا ہے میں بھی اس مختصر تعارف و تبصرہ کو اسی پر ختم کرتا ہوں۔

"حضرات! آج سلسلۂ تقریر کا آخری دن تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں آٹھ تقریروں میں سیرتِ محمدیؐ اور پیغامِ محمدیؐ کے متعلق سب کچھ کہہ سکوں گا مگر آٹھ تقریروں کے بعد بھی موضوع تفصیل کا تشنہ ہے۔ سب کچھ کہا مگر کچھ بھی نہ کہا۔

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اوّل وصفِ تو ماندہ ایم"

کبیر احمد جائسی (علیگ)★

"خیام" پر ایک نظر

عمرِ خیام کا شمار ایران کے ان ناموروں میں ہوتا ہے جن کی شخصیت اور کارناموں پر وقت کے گرد و غبار کی ایک دبیز تہ چڑھی ہوئی ہے۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے انسانی طبائع کی خوش عقیدگی اس گرد و غبار میں مزید اضافے کرتی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خیام ایک شاعر بھی ہے اور فلسفی بھی، منجم بھی ہے اور ایک آزادہ رو جویائے رازِ ہستی بھی۔ اس کے منجم ہونے کا ثبوت تو اس کے ایک "شاگرد" نظامی عروضی سمرقندی کی تصنیف چہار مقالہ (سنہ تالیف تخمیناً ۵۵۰ھ) کی دو حکایتوں سے مل جاتا ہے۔ شاعر ہونے کا ثبوت "التنبیہ علی بعض اسرار المودعۃ فی القرآن العظیم" سے فراہم ہوتا ہے جو امام فخر رازی کی تصنیف ہے اور خیام کے انتقال کے تقریباً نوے سال بعد لکھی گئی ہے۔ میزان الحکمۃ (سنہ تصنیف ۵۱۵ھ) اور زمخشری کی تصنیف (۵۱۲ھ) الزاجر اس کے فلسفی ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہیں اسی طرح عماد کاتب اصفہانی کی "خریدۃ القصر" (سنہ تصنیف ۵۷۲ھ) کے ذریعے ہم کو خیام کی زندگی کے بارے میں بعض باتوں کا علم ہوتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے مورخین اور تذکرہ نگاروں نے خیام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ یا تو درج بالا کتابوں سے ماخوذ ہے یا ان کی "خوش عقیدگی" کا مظہر، جس کی کوئی تاریخی سند ہماری دسترس میں نہیں ہے۔

اردو زبان میں سب سے پہلے علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے اپنی تصنیف شعرالعجم میں خیام کا ایک مفصل تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری پر بھی ایک ناقدانہ نظر ڈالی ہے، شعرالعجم کی تصنیف کے بعد بہت سے ایسے مآخذ سامنے آگئے ہیں جو علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے عہدِ حیات میں ناپید تھے اسی لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ نو دریافت شدہ مآخذ کی روشنی میں علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی تحریر پر نظرِ ثانی کی جائے تاکہ قلتِ مواد کی بنا پر خیام کے بارے میں جو باتیں شعرالعجم میں درج نہیں ہو سکی ہیں ان کا اضافہ کر دیا جائے۔ غالباً سید صاحب کے پیشِ نظر یہی بات تھی مگر جب وہ اس موضوع پر لکھنے بیٹھے تو ان کو اتنا مواد مل گیا کہ اس کی مدد سے انہوں نے پانچ سو صفحات کی

★ شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کی ایک ضخیم کتاب تحریر فرما کر خیام کے نام کو روشن کیا۔

سید صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب میں کئی مسلمات کو توڑا ہے مثلاً انھوں نے دلائل قطعیہ کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ خیام، حسن صباح اور نظام الملک طوسی کی داستانِ معاصرت جعلی ہے۔ بعض حضرات نے وصایائے نظام الملک کو بھی جعلی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے سید صاحب نے اس کے جعلی نہ ہونے پر جو بحث کی ہے اور جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس سے ابھی تک کوئی محقق اختلاف نہیں کر سکا ہے۔ اس کے علاوہ نوروز نامہ کو چھوڑ کر سید صاحب نے جن متون کا انتساب خیام سے کیا ہے اس سے بھی کوئی محقق اختلاف نہیں کر سکا ہے۔ نوروز نامہ کے سلسلہ میں اب بھی یہ شبہ ہے کہ شاید یہ خیام کی تصنیف نہ ہو، سید صاحب نے اس کو خیام کی تصنیف ماننے کے سلسلے میں جو دلائل پیش کئے ہیں ان پر پوری طرح تکیہ کرنا مشکل ہے لیکن انھوں نے نوروز نامہ کا متن جس محنت اور دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔

ہم خیام کی تمام حیثیتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اس کی شاعرانہ حیثیت پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں اور اس بات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں کہ سید صاحب مرحوم نے شاعر خیام کی جو تصویر کشی کی ہے اس کو کس حد تک استناد کا درجہ حاصل ہے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم سید صاحب کے اس کارنامے کا ذکر کرنا چاہیں گے کہ انھوں نے خیام کے ایک معاصر عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر کی کتاب قابوس نامے خیام کی ایک رباعی کا حوالہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ قابوس نامہ کے مخطوطے ہمارے سامنے نہیں ہیں اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ رباعی الحاقی ہے یا نہیں پھر بھی وہ اپنی دیدہ ریزی کے لئے ہمارے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے پہلی کتاب جس میں خیام کی ایک فارسی رباعی ملتی ہے امام فخر رازی کی التنبیہ علی بعض اسرار المودعۃ فی القرآن العظیم ہے جو عمر خیام کے انتقال کے تقریباً نوے سال بعد لکھی گئی تھی۔ وہ رباعی یوں ہے:

دارندہ چو ترکیب چنین خوب آراست   از بہر چہ او فگندش اندر کم و کاست
گر خوب نیامد این بنا عیب کراست   ور خوب آمد خرابی از بہر چراست

اس کے بعد شیخ نجم الدین دایہ کی تصنیف مرصاد العباد (سنہ تصنیف ۶۲۰ھ) میں ہم کو خیام کی دو رباعیاں ملتی ہیں، ایک تو وہی جو امام فخر رازی کی کتاب میں نقل ہوئی ہے اور دوسری یہ ہے:

دوری کہ دران آمدن و رفتن ماست   آنرا نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس می نزند دمی درین معنی راست   کاین آمدن از کجا و رفتن بکجاست

پھر ۲۸ برسوں تک خاموشی رہتی ہے اور خیّام کا ذکر کسی بھی کتاب میں فارسی شاعر کی حیثیت نہیں دکھائی دیتا نہ ہی اس کی رباعی کا کوئی نمونہ کہیں نقل کیا جاتا ہے۔ ۲۸ برسوں کے بعد عطا ملک جوینی اپنی مشہور تاریخ، تاریخ جہان کشا (سنہ تصنیف ۶۵۸ھ) میں خیام کی ایک فارسی رباعی نقل کرتا ہے جو یہ ہے:

اجزای پیالہ کہ درہم پیوست　　بشکستن آن روا نمی دارد مست
چندین سر و پای نازنین از بر و دست　　در مہر کہ پیوست و بکین کہ شکست

ساتویں صدی ہجری ختم ہو جاتی ہے اور خیام کی رباعیوں کا کوئی اور نمونہ کسی دوسری کتاب میں ہماری نظروں سے نہیں گذرتا۔ سنہ ۷۳۰ھ میں یعنی بہتر تہتر برسوں کے بعد حمداللہ مستوفی کی تاریخ گزیدہ لکھی جاتی ہے جس میں خیام کی ایک ایسی رباعی ملتی ہے جو اوپر درج کردہ کتابوں میں نہیں ملتی وہ رباعی یوں ہے:

ہر ذرہ کہ بر روی زمینی بودہ است　　خورشید رخی زہرہ جبینی بودہ است
گرد از رخ نازنین بآزرم فشان　　کانہم رخ خوب نازنینی بودہ است

تاریخ گزیدہ کے دس سال بعد یعنی ۷۴۱ھ میں محمد بن بدر جاجرمی اپنی کتاب مونس الاحرار فی دقایق الاشعار مرتب کرتا ہے اس کتاب میں خیام کی رباعیوں کی تعداد ایک دم سے بڑھ کر تیرہ ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ایک رباعی جس کا پہلا مصرع یہ ہے "دوری کہ در آن آمدن و رفتن ماست" مرصاد العباد سے لی گئی ہے اور بقیہ بارہ نئی ہیں جو یہ ہیں:

چون ابر بہ نوروز رخ لالہ بشست　　برخیز و بجام بادہ کن عہد درست
کاین سبزہ کہ امروز تماشاگہ تست　　فردا ہمہ از خاک تو برخواہد رست

این بحر وجود آمدہ بیرون ز نہفت　　کس نیست کہ این گوہر تحقیق بسفت
ہر کس سخنی از سر سودا گفتند!　　زان روی کہ ہست کس نمی داند گفت

بر چشم تو عالم ارچہ می آرایند　　مگرای بدان کہ عاقلان نگرایند
بسیار چو تو روند و بسیار آیند　　بربای نصیب خویش کت بربایند

چون روزی و عمر بیش و کم نتوان کرد　　دل را بہ چنین غصہ دژم نتوان کرد
کار من و تو چنانکہ رای من و تست　　از موم بدست خویش ہم نتوان کرد

یک قطرہ آب بود و با دریا شد　　یک ذرہ خاک و با زمین یکجا شد
آمد شدن تو اندرین عالم چیست　　آمد مگسی پدید و ناپیدا شد

وقت سحرست خیز ای مایۂ ناز
نرمک نرمک بادہ دہ و چنگ نواز
کاینہا کہ بجایند نہ پایند دراز
وانہا کہ شدند کسی نمی آید باز

ای پیر خردمند پگہ تر برخیز
وان کودک خاک بیز را بنگر تیز
پندش دہ و گو کہ نرم نرمک می بیز
مغز سر کیقباد و چشم پرویز

جاوید نیم چو اندرین دہر مقیم
پس بی می و معشوق خطائیست عظیم
تا کی ز قدیم و محدث امید و بیم!
چو من رفتم ز جہان چہ محدث چہ قدیم

ایام زمانہ از کسی دارد ننگ
کو در غم ایام نشیند دل تنگ
می نوش در آبگینہ با نالۂ چنگ
زان پیش کہ آبگینہ آید بر سنگ

می خور کہ فلک بہر ہلاک من و تو
قصدی دارد بجانِ پاکِ من و تو
در سبزہ نشین و می روشن می خور
کاین سبزہ بسی دمد ز خاک من و تو

بر سنگ زدم دوش سبوی کاشی
سرمست بدم کہ کردم این اوباشی
با من بزبان حال میگفت سبوی
من چو تو بدم تو نیز چون من باشی

ای آنکہ نتیجہ چہار و ہفتی !!
وز ہفت و چہار دایم اندر تفتی
می خور کہ ہزار بار بیشت گفتم
باز آمدنت نیست چو رفتی رفتی

اس سلسلۂ سخن کو مزید طول وطویل کیا جاسکتا ہے مگر اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اپنی بات کو یہیں پر ختم کرتے ہوئے اپنے قارئین کی توجہ صرف ایک نکتہ کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے جو یہ ہے کہ اگر خیام کا سالِ وفات سنہ ۵۲۶ھ مان لیا جائے۔ تو اس زمانے سے لے کر سنہ ۷۳۷ھ تک یعنی دو صدیوں سے زیادہ کی مدت گذر جانے پر بھی خیام کی فارسی رباعیات کی تعداد سولہ سے متجاوز نہیں ہوتی۔ اگر خیام اپنے زمانے کا اتنا بڑا اور اتنا ہی مشہور شاعر تھا، جیسا کہ آج سمجھا جاتا ہے تو یہ بات ہماری فہم سے بالاتر ہے کہ اس کے اشعار اس کے معاصرین نے کیوں نقل نہیں کئے اور وہ ایک شاعر کی حیثیت سے اس زمانے میں کیوں اتنا مشہور نہیں ہوا کہ تذکرہ نگار اس کے اشعار کے وافر نہ سہی کچھ نمونے نقل کر دیتے؟ آٹھویں صدی ہجری سے خیام کی فارسی رباعیوں کا جو جنگل اگنا شروع ہوا وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھنا ہوتا چلا گیا اور آج خیام کے نام سے اتنی رباعیاں منسوب ہو چکی ہیں جتنی شاید اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ رہی ہوں۔ سید صاحب مرحوم نے اپنی عالمانہ کتاب میں اس بات کو سلجھانے کی کوشش نہیں کی ہے کہ خیام کی رباعیوں کا یہ جنگل کہاں سے آیا اور اس گھنے جنگل میں سے

گوہرِ مقصود کو کس طرح حاصل کیا جائے۔

سنہ ۱۳۳۹ھ ش (۱۹۶۰ - ۶۱ء) میں خوش عقیدگی کے ہاتھوں ایران میں ایک اور "لطیفہ" رونما ہو چکا ہے۔ وہاں کے بعض محققوں نے رباعیات عمر خیام کا ایک مخطوط، مکتوبہ سنہ ۶۰۴ھ باڈلیان لائبریری، لندن کے ذخیرۂ کتب میں سے کھود نکالا جس میں خیام کی دو سو باون رباعیاں درج ہیں۔ اس نسخہ کی دریافت سے علمی دنیا میں ایک بھونچال سا آگیا۔ ایران کے بعض ذمہ دار بالغ نظر محققین نے، جن میں مرحوم مجتبیٰ مینوی کا نام سرِفہرست ہے، جب اس مخطوط کا ناقدانہ جائزہ لیا تو اس کے کاغذ، روشنائی اور املائی خصوصیات کا تحلیل و تجزیہ کرنے کے بعد واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ یہ کسی جعل سازی کی کارستانی ہے یہ مخطوط کسی طرح بھی ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نہیں ہو سکتا۔ اس اعلان کے بعد خیام کی دو سو باون رباعیاں ہمارے ہاتھ آتے آتے رہ گئیں۔

ہم کو سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ سید صاحب مرحوم نے اپنی عالمانہ کتاب کے ساتھ دسویں صدی ہجری کے اوائل کا مکتوبہ رباعیات خیام کا نسخہ کیوں شائع کیا؟ بظاہر اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ سید صاحب مرحوم کے نزدیک اس نسخہ کا متن ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا تھا اسی لئے انھوں نے نہ صرف اس متن کو شائع کیا بلکہ اس کی روشنی میں عمر خیام کی شاعری کے خصائص متعین کئے بالخصوص عمر خیام کی شراب کے بارے میں سید صاحب مرحوم نے جو کچھ لکھا ہے وہ انہی رباعیات کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس وہ کون سا پیمانہ ہے جس کے ذریعہ ہم یہ طے کر سکیں کہ سید صاحب نے جس متن پر بھروسا کیا ہے وہ واقعی خیام ہی کی رباعیات کا متن ہے؟ جب تک یہ طے نہیں ہو جاتا کہ یہ رباعیاں واقعی خیام کی رباعیاں ہیں اس وقت تک سید صاحب نے خیام کی شاعری پر جو کچھ لکھا ہے مشکوک ہی رہے گا بالخصوص انھوں نے خیام کی شراب پر جو دادِ تحقیق دی ہے اس کا شمار خوش عقیدگی ہی کے زمرے میں کیا جائے گا۔

سید صاحب کی جلالت علمی، کاوش و تحقیق، تلاش و جستجو اور دقتِ نظر اپنی جگہ مسلّم مگر ان کی بشریت مسلّم تر۔ ہم کو "خیام" کا مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ سید صاحب کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ مغرب نے خیام کی جو تصویر بنائی ہے اور جس طرح اس کو غرقِ شرابِ ناب دکھلایا ہے اس کو انھیں اپنے زورِ قلم سے غلط ثابت کرنا ہے۔ سید صاحب نے اپنے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن محنت کی اور خیام کا مقدمہ اس جلالت علمی سے علم و ادب کی عدالت میں پیش کیا کہ خیام کو براءت حاصل ہو گئی یہ سید صاحب کا کارنامہ ہے خیام مغرب کی عاید کردہ فردِ جرم سے صاف بری ہو گیا مگر یہ سوال اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے

کہ سید صاحب نے خیام کی جو تصویر پیش کی ہے کیا خیام واقعی ایسا ہی تھا؟ ہم فارسی ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے سید صاحب کی چونکا دینے والی تحقیقات کی داد تو ضرور دیں گے مگر ان کے پیش کردہ نتائج سے ادب کے ساتھ اختلاف کرنے کی جرأت کریں گے اور عرض کریں گے کہ جب تک خیام کا واقعی، حقیقی اور اصلی کلام ہماری دسترس میں نہیں آجاتا اس کی شاعری کے بارے میں ہر خیال خوش عقیدگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

○

مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ استاذ الکل ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا۔ عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔ الحمد للہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا۔

خورشید نعمانی ردولوی★

نقوشِ سُلیمانی

تحقیق کی روشنی میں

مولانا سید سلیمان ندویؒ نابغۂ عصر اور یگانۂ روزگار تھے، ایسی جامع کمالات ہستی صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ علامہ شبلیؒ کی فیضِ تربیت سے نمود و کمال حاصل کرنے والوں میں ان کا نام سرِفہرست ہے۔ وہ ایک دیدہ ور محقق، گراں پایہ ادیب، صاحبِ طرز انشا پرداز اور دینیات کے ایک متبحر عالم تھے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی بلند علمی وقار و متانت کے ساتھ دین و ادب کی خدمت میں گزار دی، ان کی ہمہ گیری اور جامعیت کا اندازہ ان کی معیاری تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے جو کہ انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ، جغرافیہ، ادب، تحقیق، تنقید، شعر اور سفرنامہ جیسے مختلف النوع موضوعات پر لکھیں۔ انھوں نے ہر موضوع پر اعلیٰ، سنجیدہ تحقیقی شان کے ساتھ قلم اٹھایا ہے اور ان کی ہر تصنیف اس مخصوص موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے ان کی تصانیف صرف معلومات کا خزانہ ہی نہیں خیال انگیز بھی ہیں اور موجودہ صدی کے مسلمانوں میں ذہنی و فکری انقلاب کی نقیب بھی۔

اس مضمون میں ان کی اہم علمی و ادبی تصنیف "نقوشِ سلیمانی" کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

نقوشِ سلیمانی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ادبی و تنقیدی مقالات، خطبات و مقدمات کا مجموعہ ہے۔ ان تمام کا موضوع اردو زبان و ادب ہے۔ ان مقالات و خطبات میں ادب و انشا کی چاشنی بھی ملے گی اور تحقیق و تدقیق کی کارفرمائی بھی۔ سید صاحب نے اپنی اس تالیف کی اہمیت کے مندرجہ ذیل وجوہ بیان کئے ہیں اور اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرنا چاہئے۔

(۱) یہ پہلی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے اردو کی مولد کی تعین و تشخیص کے باب میں سندھ اور ملتان کی نشاندہی کی گئی ہے، شروع شروع میں تو بعض لوگوں نے کم سمجھی سے اس نظریہ پر طعن و طنز بھی کئے لیکن بعد میں اس کی اہمیت کا احساس ہوا۔

★ مہارشی دیانند کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس، بمبئی ۱۲

۲) دوسری اہمیت اس کتاب کی یہ ہے کہ ان خطبوں اور مضامین سے آغاز سے آج تک اُردو کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس کا آغاز اور اس کے عہد بعہد کی ترقی اور اس کے مطبوعات و منشورات کی رفتارِ اشاعت معلوم ہو سکتی ہے۔

۳) تیسری اہمیت یہ ہے کہ اس کتاب میں اُردو کی ضرورت، بقاء اور اہمیت کے تمام دلائل، واقعات اور اسباب پوری تشریح سے جمع ہو گئے ہیں، اس طرح مخالفین کے شکوک و شبہات اور اعتراضات کو تمام و کمال رفع کر دیا گیا ہے۔

۴) چوتھی اہمیت یہ ہے کہ ان مضامین میں اُردو، ہندی، ہندوستانی مباحث کے تمام واقعات اور جس طرح غیر منقسم ہندوستان میں متحدہ زبان کے نظریہ کے متعلق تبدیلیاں آتی رہیں ان کی پوری روداد جمع کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ پچھلے پچاس برس کے عرصہ میں ملک کی زبان کا مسئلہ کس کس مرحلے سے گزرا اور مجھوتہ کی کیا کیا کوششیں کی گئیں اور ان کا انجام کیا ہوا۔

سید صاحب نے اپنے پہلے خطبہ منعقدہ پونا میں ۱۹۱۵ء میں اُردو کی پیدائش کا سبب اس دلچسپ انداز سے بیان کیا ہے:

> "مسلمانوں کا ہندوستان پر حملہ پہلی صدی کا واقعہ ہے اور یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس حملے کی ابتدار مسلمانوں کے فاتحانہ جذبات کا نتیجہ نہ تھا جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے بلکہ ایرانیوں کی اعانت کے لئے ہندوستان کی آمادگی ہے اور اس کا نتیجہ مسلمانوں کا حفظ ماتقدم کے طور پر سندھ پر قبضہ ہے، تقریباً اس کے چار سو برس کے بعد ترک و ایرانی فتوحات کا سیلاب درۂ خیبر سے گزر کر ہمالیہ کے پانچ دریاؤں میں آکر مل گیا، یہ اُردو زبان کی تاریخ کا پہلا دن ہے۔"[1]

دوسرا خطبہ "ہندوستان میں ہندوستانی" ہے۔ سید صاحب کا اصرار تھا کہ اُردو کا نام "ہندوستانی" چلانا اور پھیلانا چاہئے، یہی اس کا نام فی الاصل ہے اور یہی اس کی اشاعت اور مقبولیت میں بھی بہت معین ہوگا۔ شروع شروع میں اس تحریک کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ مشورہ عین اُردو دوستی پر مبنی ہے۔ سید صاحب کی یہ تجویز تھی کہ:

> "ہم اس زبان کا نام اُردو جو صرف ڈیڑھ سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا ہے یک قلم چھوڑ دیں، اس کا نام ہندوستانی رکھیں اور اس کو شہرت دے کر عام کریں۔ دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم سے موسوم یا منسوب کیا جاتا ہے اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسا اجنبی نام جس سے قومی و ملکی جذبے

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی صہ ۴۰

کو کوئی تحریک نہ پہنچے احتراز کے قابل ہے اور اس کے بجائے اس کا ہندوستانی نام، ہندوستان اور وہ بھی ہندو اور مسلمانوں کے مشترک وطن کے نام کے تصور کے حامل ہونے کے سبب سے پوری طرح اپنے اندر ہمدردانہ جذبات کی رُوح رکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایسی زبان کا نام ہے جس کو پورے ملک سے تعلق ہے اور وہ پورے ملک کی متحدہ زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے۔ ہم اس نام کے ذریعے ملک کے سامنے وہ تخیل پیش کریں گے جو ہندو مسلم کے مشترک وطن کے تصور کی ترجمانی کرے گا اور مغلوں کے لشکری استیلا کی تاریخ سے جو لفظ اُردو میں چھپا ہے، ہم کو نجات دے گا۔" ۲

انھوں نے اس کے علاوہ نئی عربی و فارسی اصطلاحات سے پرہیز، ہندوستانی جمع اور عطف و اضافت کو رواج اور ہندی کے بیشتر الفاظ جو ہماری زبان میں کھپ چکے ہیں ان کے استعمال پر بھی زور دیا ہے۔

سید صاحب نے اس خطبے میں ان لوگوں کو جو سمجھوتے کی ہر پیش کش کو ٹھکرا کر سنسکرتی ہندی کو راشٹر بھاشا یعنی ملک کی زبان بنانے پر مصر تھے ان خطرات سے آگاہ کیا جو بعد میں دو قومی نظریئے کا سبب بنے اور جو بالآخر ملک کی تقسیم کا باعث ہوئے۔ اگر سید صاحب کی اس تجویز پر کان دھرا جاتا تو یہ تکلیف دہ صورتحال پیش نہ آتی۔

سید صاحب جو کہ بحرِ تحقیق کے شناور ہیں اور ان کا اصل جوہر ایسے ہی مضامین میں کھلتا ہے اپنے مضمون "بعض پُرانے لفظوں کی نئی تحقیق" کی ابتدا، اس طرح کرتے ہیں۔

> "ہم اپنی زبان کے اس قیمتی سرمایہ کا آغاز سکّوں سے کرنا چاہتے ہیں تاکہ لفظی دولت مضمون کی معنوی دولت کے لئے فالِ نیک بن سکے۔"

دام، "ہماری زبان کا ایک پامال لفظ دام ہے ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہیں اور دوسرے معنی معمولی سکّہ کے ہیں جس کی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان میں چھدام کی ہے۔ جو چھ اور دام دو لفظوں سے بنا ہے، اس لفظ کی تاریخ کے لئے آج سے دو ہزار برس پہلے ہم کو لوٹ جانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشورکشا اور سوداگر پورے ایشیا پر چھا گئے تھے۔ مصر و شام و عراق سے ایران اور ہندوستان تک کے ڈانڈے مل گئے تھے ان ملکوں میں یونانی حکیم اور یونانی سکّے چلتے تھے اور ان کے یونانی نام زبانوں پر تھے۔

یونانیوں کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکّہ کا نام درخم (DRACHMA) تھا اس نے عربی میں درہم اور فارسی میں بیچ میں ایک حرف گرا کے درم کی صورت اختیار کی اور ہندوستانی میں ایک حرف اور گرا کر اس کی جگہ ایک لمبی آواز بڑھا کر دام ہو گیا۔ یہ لفظ جس طرح سکّہ کو بتاتا تھا، سکّہ کے وزن کو بھی بتاتا تھا۔ چنانچہ عربی طب میں دواؤں کا وزن درہم اور فارسی طب میں درم سے بتایا جاتا ہے۔ اس لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو ڈرام ہو گیا جو اب ہمارے

---

۲ ایضاً ص ۴،

انگریزی طبی کالجوں، دواخانوں اور شفاخانوں میں ایک بیگانہ کی حیثیت سے وارد ہے اور شاید اب کوئی پہچانے بھی نہیں کہ دام اور ڈرام دونوں کی ایک ہی شخصیت ہے صرف آب و ہوا، لہجہ اور شکل و صورت کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔

اکبر کے زمانے میں دام چاندی کے سب سے چھوٹے سکے کے بجائے تانبے کے سکے کا نام تھا (صفحہ ۲ نولکشوری)۔ اس کو پہلے پیسہ کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں، یہ روپیہ کا چالیسواں حصہ تھا۔ پھر ایک دام کے پچیس حصے کر کے ہر حصے کو جیتل کہتے تھے اب اس کو گنڈہ کہتے ہیں، اکبر کے زمانہ میں بھی اس کا نام ملتا ہے۔

اس تقسیم سے ایک محاورہ پورب کی زبان میں اور چلا ہے، ہر گاؤں یا ہر زمیندار کی ملکیت سولہ آنہ فرض کی جاتی ہے اور یہ آنے پھر پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہیں۔ ایک دام کا آدھا ادھیلہ اور ۱/۴ پاؤلہ اور ۱/۸ دمڑی کہلاتا ہے اور یہ اخیر لفظ کی تصغیر یا تحقیر ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ جو دام قیمت کے معنی میں ہم لوگ بولتے ہیں وہ اس سکہ کی یادگار ہے جس سے پہلے چیزوں کی قیمت کا اندازہ اور لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔

آئینِ اکبری کے مطابق ایک من تانبے میں ایک ہزار چوالیس دام (پیسے) تیار ہوتے تھے۔ تغلقوں کے زمانے میں درم، سنگ خرید و فروخت کی تول میں باٹ کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ (فیروز شاہی، ضیا برنی ص۳۱۹)“۳

یہ اقتباس کافی طویل ہو گیا لیکن اس کو مختصر کرنا مضمون کی تحقیق کا خون کرنا تھا، سید صاحب کا ذہن رسا کتنی دور کی کوڑیاں لایا ہے اور ایک کے ڈانڈے دوسرے سے کس طرح ملائے ہیں۔ یہ مثال تو مشتے نمونہ از خروارے پیش کی گئی، اسی مضمون میں سید صاحب نے کیرانت، اشرفی، بیمہ، ڈاک، قری، فیرنی، رقم، ہندسہ، ریاضیات، سیاست ان لفظوں کے اشتقاق اور تحقیق تسمیہ پر پورا مقالہ ختم کیا ہے۔

اس مضمون کے دوسرے حصے میں صاحبِ مضمون نے ناشتہ پر بحث کرتے ہوئے نہار کا ذکر کس انداز میں کیا ہے:

> ”اس معنی میں ایک اور لفظ نہار آپ بولتے ہیں، ”نہار منھ“ یہ بھی فارسی ہے مگر دیکھئے کہ یہ فارسی ہندوستانی سے ایسی مل گئی ہے گویا ہندوستانی ہی ہے اس کی اصلیت ”ناہار“ ہے۔ ”نا“ نفی کے لئے ہے۔ ہار کے معنی غذا کے ہیں۔ ناہار یعنی نہیں کھایا ہوا (برہان قاطع) اب اسی ناہاری یعنی نہاری تیار ہوئی جو صبح کو نہار منہ کھائی جائے، اور لکھنؤ اور دلی میں یہ خاص چیز ہوگئی جو بازاروں میں پکی پکائی بہت چٹپٹی ملتی ہے۔
>
> ناہار سے آہار یاد آیا۔ آہار آٹے کی اس لئی کو کہتے ہیں جو کاغذ اور کپڑے پر اس لئے چڑھائی جاتی ہے کہ وہ مضبوط ہو جائے۔ آپ سن چکے کہ آہار غذا کو کہتے ہیں جو بدن کی تقویت کا باعث ہوتی ہے اس لئے اس

---

۵۳ ایضاً صہ ۲۹۲ - ۲۹۰

لیبیؔ کو بھی کہنے لگے جو کا غذا اور کپڑے کی قوت کو بڑھا دیتی ہے۔ (برہان قاطع)۔"

آپ نے دیکھا کہ ناہار فارسی و ہندی کا ملغوبہ ہو کر آپ کے سامنے خالص ہندوستانی شکل میں آیا۔ اس کے علاوہ سید صاحب نے سُلفہ، قاب، رکاب، قلیہ قورمہ، شوربا، قالین، راز بمعنی راج، مستری، نستعلیق، احدی، قلعی اور تماشا پر بحث کی ہے۔

تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوا کرتی۔ سید صاحب نے شوربا اور مستری پر جن خیالات کا اظہار کیا، لسانیات کے ماہر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے جب بعض حصوں پر نقد کیا تو سید صاحب نے یہی نہیں کہ فراخدلی کے ساتھ اسے معارف میں شائع کر دیا۔ (استدراک ص ۴۷، ۴ کے بعد الف) نقوشِ سلیمانی مطبوعہ ۱۹۳۹ء) بلکہ شوربا کی حد تک تو کھلے طور سے اور مستری کے لئے بھی ایک حد تک اپنی تحقیق سے رجوع کر لیا۔

اسی مجموعہ کا مقالہ "تہنید" اپنے موضوع اور جامعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے، ہر چند کہ سید صاحبؒ ایک عالمِ دین اور مولوی تھے اور ان سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اُردو پر عربی کی حاکمیت سے خوش ہوں گے۔ لیکن اس کے برعکس انھوں نے عربی کی تعریب اور فارسیوں کی تفریس کی طرح اہلِ ہند کو پورا حق "تہنید" کا دلایا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "جب اہلِ ہند یہی کریں یعنی وہ کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر تراش خراش کر کے اپنی زبان میں ملا لیں تو اس کو "تہنید" کہیں گے، یہ اصول زبانوں کے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے مفید ہے۔ یہ اصول قریب قریب دنیا کی سبھی زبانوں میں چلتا ہے، اور اس کے مانے بغیر ممکن نہیں کہ زبان ترقی پا سکے۔"[۴]

اپنی اس رائے کی وضاحت وہ کسی قدر دل نشین، صاف اور سیدھے طریقے سے کرتے ہیں:

> ایک قوم کا آدمی جب کسی دوسری قوم کا کوئی لفظ بولتا ہے تو اس کی زبان کی فطرت مجبور کرتی ہے کہ ارادے اور احساس کے بغیر اس کی شکل بدل دے، ہندوستان کے باہر کا آدمی خواہ کچھ کرے مگر وہ ہندی حرفوں کو کبھی نہ بول سکے گا، وہ اس کو کچھ نہ کچھ بدل دے گا۔ وہ ہمارے لہجے ہمارے لفظوں کو نکالے گا مگر اس میں کچھ ہیر پھیر کرے گا۔"[۵]

> "یہی حال ہندیوں کا ہے، عربی کے خاص حروف وہ ادا نہیں کر سکتے۔ ع اور الف میں، ث، ص اور س میں، ت اور ط میں، وہ فرق نہیں کر سکتے، اس لئے دوسری زبان کا جو لفظ ہمارے سامنے آئے گا وہ جب تک اپنی بیگانگی چھوڑ کر بالکل گھریلو نہ بن جائے گا وہ ہمارے دیس میں رہ ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زبان میں عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے جو ہزاروں الفاظ آ گئے ہیں وہ

---

[۴] ایضاً ص ۳۱۵-۳۱۴

[۵] ایضاً ص ۳۳۰، ۳۲۹

ہماری زبان کی شکل وصورت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں[۵۳]

اسی بحث کے بعد سید صاحب نے چند ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں مختلف زبانوں کے الفاظ کی "تہنید" بتائی گئی ہے:

> "معمار کے معنی میں راج کی اصل عربی اور فارسی میں راز ہے۔ مگر ہمارا ہندوستانی لفظ راج ہی ہوگا۔ عربی کا صحیح لفظ تمنّی ہے مگر فارسی والوں نے اس کو لیا تو تمنّا کر دیا اور ہم نے بھی اس کو قبول کر لیا۔ عربی تماشی کو ایرانیوں نے تماشا کیا اور ہم کو بھی تماشا پسند آیا، لالٹین کی اصل لینٹرن ہے مگر ہم کو لالٹین کی ہی روشنی پسند ہے، بٹن انگریزی کا ہو تو ہو مگر ہمارا تو بوتام ہے جو بٹن کی بگڑی شکل ہے۔"[۵۴]

اسی طرح سے فارسی کے بہت سے الفاظ اور ترکیبیں ہیں جن کو ہم نے ہندوستانی معنوں کے لئے ہندوستانی لفظ بنا دیا ہے۔ ہندی اور سنسکرت کے لاتعداد لفظوں کو ہندوستانی نے ذرا ہیر پھیر سے اپنے رنگ میں رنگ کر ان میں زمانہ کے تغیر کا نیا رنگ چڑھا دیا ہے۔

سید صاحب آخر میں لکھتے ہیں:

> "ہر خود مختار زبان کو اس کا حق ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے لفظوں کو اپنی رعایا بنانے کے لئے ان کے ساتھ یہ سلوک کرے، یہ ہر خود مختار زبان کا حق ہے اور کسی کی قدرت میں نہیں کہ وہ اس سے اس کے حق کو چھین سکے۔"

ان مقالات کے علاوہ سید صاحب نے اکبر کے ظریفانہ کلام، اُردو انسائیکلو پیڈیا، ہوم لنگویج، انڈیا آفس لائبریری پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اُردو کا خزانہ، انجمن اردوئے معلّیٰ کے چند سوالوں کا جواب، ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی، بہار کے نوجوان اور ادب کی خدمت، سفرِ گجرات کی چند یادگاریں، جواہر الاسرار میں کبیر کی بات چیت قابلِ قدر مضامین ہیں۔ جن پر تفصیل سے یہاں لکھنے کی گنجائش نہیں۔

اس کتاب کے تیسرے حصے یعنی مقدمات میں نثر و نظم کی نو ادبی و شعری کتابوں پر مقدمے ہیں۔ پہلا مقدمہ "مکاتیبِ شبلی" پر، دوسرا "مکاتیب مہدی" پر، تیسرا مقدمہ "گلستانِ امجد" پر، چوتھا مقدمہ کلامِ شادؔ پر، پانچواں مقدمہ ایک صوفی بزرگ شاہ رکن الدین کے "اُردو کلمیات" پر، چھٹا مقدمہ "شعلۂ طور" پر، ساتواں مقدمہ مشہور کشمیری شاعر صہبائیؔ کے کلام "چمنستان" پر، آٹھواں مقدمہ "مسدسِ حالی" پر اور نواں مقدمہ محمود اسرائیلی کے مجموعۂ کلام "خیابان" پر ہے۔

ان مقدمات سے سید صاحب کی تنقیدی بصیرت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن طولِ کلام مانع ہے۔

---

[۵۳] ایضاً ص ۴۳۱

[۵۴] ایضاً ص ۴۴۹

ان مقدمات پر مولوی عبدالماجد دریاآبادی لکھتے ہیں۔

> ” تنقید و تبصرے کی بہار دیکھنی ہو تو مقدمات کی سیر کرنی چاہئے جو کتابیں گمنام، غیر معروف دھندلی تھیں وہ جیسے مس سلیمانی سے چمک اٹھی ہیں، اور جو پہلے ہی سے روشن و معروف تھیں ان میں اور چار چاند لگ گئے ہیں“[شہ]

زبان و ادب کے مبصر و محقق کی حیثیت سے سید سلیمان ندویؒ کا درجہ انتہائی بلند ہے، ان کی کاوشوں نے بلند معیار علمی تحقیق سے اردو کو مالامال کر دیا۔ نقوشِ سلیمانی اُن کی اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ جس میں ان کی تحقیقی بصیرت اور تنقیدی صلاحیت کی بھرپور جلوہ گری ہے۔

○

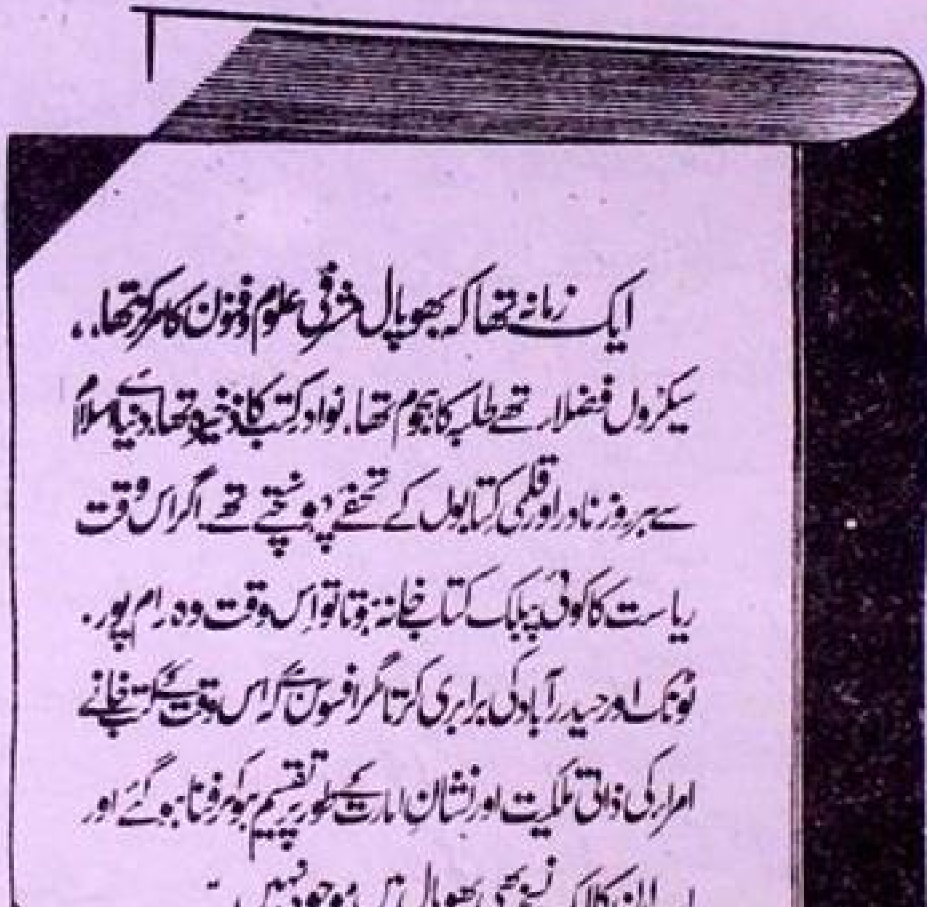

ایک زمانہ تھا کہ بھوپال خزینۂ علوم وفنون کا مرکز تھا،
سیکڑوں فضلاء تھے طلبہ کا ہجوم تھا، نوادر کتب کا ذخیرہ تھا، دنیائے اسلام
سے ہر روز نادر اور قلمی کتابوں کے تحفے پہنچتے تھے اگر اس وقت
ریاست کا کوئی پبلک کتب خانہ ہوتا تو اس وقت وہ رامپور،
ٹونک اور حیدرآباد کی برابری کرتا مگر افسوس کہ اس وقت کے کتب خانے
امراء کی ذاتی ملکیت اور نشانِ امارت کے طور پر تقسیم ہو کر فنا ہو گئے اور
اب ان کا ایک نسخہ بھی بھوپال میں موجود نہیں۔

(علامہ سید سلیمان ندوی)

[شہ] نقوشِ سلیمانی، از مولانا عبدالماجد دریاآبادی۔ معارف سلیمان نمبر مئی ۱۹۵۵ء ص ۲۳۲

مشیر الحق★

مقدماتِ سلیمانی

مُشک اگر سچ مچ کا مشک ہے تو اسے اپنے تعارف کے لئے کسی عطّار کا ممنون ہونے کی حاجت نہیں۔ یہی بات ایک اچھی تصنیف کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے کہ اگر خود اس کتاب میں جان ہے تو پھر اسے کسی مقدمے، یا دیباچے یا پیش لفظ یا تعارف کی ضرورت نہیں، کہ وہ ان کے بغیر بھی اپنا لوہا منوا کر رہے گی۔ اس حقیقت کے باوجود اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کتابیں بالعموم مقدموں اور دیباچوں سے مزین ہوتی ہیں۔ اب یہ بات اتنی عام ہو چکی ہے کہ کم ہی کتابیں بغیر مقدمہ کے ہوتی ہیں۔ مقدمہ کبھی خود مصنّف لکھتا ہے ورنہ زیادہ تر مقدمے دوسروں کے قلم سے ہوتے ہیں، بعض مصنّفین تو مقدمہ نگاری ہی کی حیثیت سے شہرت پا جاتے ہیں اور ان کا مقدمہ کتاب کی خوبی کی ضمانت بن جاتا ہے خواہ مقدمہ کو پڑھ لینے کے بعد کتاب میں پڑھنے کے لئے کچھ بھی نہ رہ جائے۔

مقدمے کئی قسم کے ہوتے ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جنھیں مصنّف ازراہِ انکسار مقدمہ کا نام دے دیتا ہے، شاید اس لئے کہ اسے کوئی مناسب عنوان وقت کے وقت نہیں سوجھتا، ورنہ وہ مقدمے خود اپنی جگہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے مقدمہ ابن خلدون یا حالی کا مقدمۂ شعر و شاعری، کہ انھیں ہم "مقدمہ" اس لئے کہتے ہیں کہ مصنّف کا دل نہ ٹوٹے۔ ورنہ انھیں کسی کتاب کا مقدمہ کہنا خود ان پر ظلم کرنا ہے۔ ایسے مقدمے کسی کتاب کے مقدمے نہیں ہوتے بلکہ اس فن کے مقدمے ہوتے ہیں جن کے تعلق سے وہ کتاب وجود میں آتی ہے۔

مقدمے کی چلتی ہوئی چند دوسری قسمیں وہ ہیں جن کا تعلق نہ تو کتاب سے ہوتا ہے اور نہ کتاب کے موضوع سے۔ یہ دراصل مصنّف کے تعارف نامہ کی حیثیت رکھتے ہیں، چونکہ مصنّف کا خود اپنے قلم سے "در مدحِ خود" کچھ کہنا معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے ادھر کچھ دنوں سے خاص طور پر کتابوں کے ناشرین بظاہر اپنی طرف سے سرورق کے اندرونی حصّوں یعنی "بلرب" پر کتاب اور مصنّف کے بارے میں "صیغہ واحد غائب" میں وہ سب باتیں چھاپنے لگے ہیں جنھیں صیغہ واحد متکلم میں لکھتے ہوئے مصنّف کا قلم رکتا ہے۔ اردو کتابوں

★ صدر شعبۂ اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

میں چونکہ ابھی "بلرب" پر بالواسطہ قصیدہ خوانی کا رواج عام نہیں ہوا ہے اس لئے یہ خدمت مقدمہ سے لے لی جاتی ہے۔ ایسے مقدمات کا اجر دراصل کتاب کے ناشر کو پہنچتا ہے کہ بڑے مقدمہ نگار کے سہارے جو کچھ انھوں نے شائع کیا ہے اس کا بھرم رہ جاتا ہے۔

بعض مقدمے ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق نہ تو کتاب سے ہوتا ہے اور نہ مصنف سے، بلکہ انھیں مقدمہ نگار اپنے علم و دانش کے اظہار کا ایک ذریعہ بنا لیتا ہے، اب یہ دوسری بات ہے کہ کتاب ختم کرنے کے بعد آپ یہ سوچتے ہی رہ جائیں کہ چند صفحات کے مقدمے کی خاطر، جسے کسی رسالہ میں بآسانی پڑھا جا سکتا تھا، اچھی خاصی ضخیم کتاب خریدنے کی کیا ضرورت تھی، لیکن مجبوری یہ ہے کہ ایسے بلی نما مقدموں کو حاصل کرنے لئے اونٹ کی قیمت ادا کرنی ضروری ہے۔

بہرحال "مقدمے" قسم قسم کے ہوتے ہیں، لیکن "مقدمہ ابن خلدون" ایسے مقدمے چند ہی ہوتے ہیں، اور سید صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے "مقدمے" جیسا کہ ابھی آپ دیکھیں گے، اسی صف میں آتے ہیں، مگر ایک نمایاں فرق کے ساتھ۔

مقدمہ، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اپنی وسعت اور جامعیت کے باوجود ایک علیحدہ تصنیف کی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ دراصل موضوع کا نقیب ہوتا ہے، اور اس لئے لکھا جاتا ہے کہ اسے پڑھ کر قاری یہ جان لے کہ آگے اُسے کیا پڑھنا ہے اور اصل کتاب میں مصنف جن مسائل کو زیرِ بحث لانے والا ہے ان کا مالہ وما علیہ کیا ہوگا اور اپنے مفروضات کو ثابت کرنے کے لئے وہ کس قسم کے دلائل کا سہارا لے گا اور تحقیق و تفتیش کے کن کن گوشوں کو اپنے قاری کے سامنے واشگاف کرے گا۔ جن لوگوں نے ابن خلدون کا مقدمہ اور اس کی تاریخ دونوں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں تاریخ کے مطالعہ کے لئے جو معیارات مقرر کئے ہیں ان کی پیروی خود اس نے اپنی تاریخ میں نہیں کی ہے۔ اگر ہم ابن خلدون کی تاریخ پڑھنے کے بعد اس کا مقدمہ پڑھیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ اس مقدمہ کی حیثیت ایک "سجدۂ سہو" سے زیادہ نہیں اور اگر مقدمہ پڑھنے کے بعد تاریخ کا مطالعہ کریں تو صرف اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ "من چہ می سرایم و طنبورۂ من چہ می سراید"۔

اس کے برعکس سید صاحب کے مقدمے اس عیب سے پاک ہیں۔ اس مختصر سی مہلت میں ہم تفصیلات میں تو نہیں جا سکتے، بات اشاروں ہی اشاروں میں ہوگی کہ عاقلوں کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے۔

سید صاحب جب علامہ شبلیؒ کی زیرِ نگرانی "سیرت النبیؐ" کے لئے مواد اکٹھا کر رہے تھے تو کتاب کے ابتدائی خاکہ کے مطابق "عرب قبل اسلام" پر بھی کچھ لکھنا ضروری تھا۔ دوسرے مصنفین کی طرح سید صاحب یہ بھی کر سکتے تھے کہ رائج معلومات کی بنیاد پر اپنے زورِ قلم سے یہ ثابت کر کے آگے بڑھ جاتے کہ دنیا خصوصاً عرب پر

گھنگور اندھیرا چھایا ہوا تھا، جب اسلام کی کرن چمکی، لیکن سید صاحب ایک محقق تھے اور قرآن کی روشنی میں سیرت النبیؐ کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس صدی کے ابتدائی برسوں میں یورپین مستشرقین عرب قبل اسلام کے جغرافیائی مطالعہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کر چکے تھے اور سید صاحب کے بقول "مسلمان مصنفین کے بالمقابل) اہل یورپ یونانی و رومانی سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کے تحریری بیانات اور عرب کے آثار قدیمہ اور نقوش و کتبات پیش کرتے ہیں جو تنہا زبانی روایات سے، ظاہر ہے کہیں صحیح تر ماخذ ہیں اس بنا پر انھوں نے عرب قبل قرآن کی تاریخ کے متعلق بالکل نیا عالم پیدا کر دیا ہے جو ان کی نظر سے قرآن مجید کے بیان اور عرب کی زبانی روایات نے عرب کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے مختلف ہوتا ہے، اس لئے ان کو اس میدان میں اعتراضات کا بڑا جولان گاہ نظر آتا ہے۔" [1]

یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید عام معنوں میں جغرافیہ یا تاریخ یا سائنس کی کتاب نہیں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تفہیم و تبشیر کی خاطر قرآن نے اپنے مخاطبین کے سامنے ان علوم کے احوال کو تذکیر اً پیش کیا ہے اور جب ہم قرآن کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں تو نتیجۃً ہم ان واقعات کو بھی تصدیق شدہ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ سید صاحب کے بقول "قرآن مجید میں اگرچہ بیسیوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں لیکن ان کی صحیح تاریخ سے نہ صرف عوام بلکہ علماء تک ناواقف ہیں اور نہایت عجیب بات ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود مسلمانوں کو ان حالات سے ناواقفیت رہی، اور دوسری طرف غیروں کو انھیں افسانہ (LEGEND) کہنے کی جرأت ہوئی...... عہد قدیم میں مخالفین کے اعتراضات کا نشانہ اعتقادیات تھے لیکن اس عصر جدید میں جب ہمارے مخالفین عقائد اسلام کی مضبوطی کا امتحان کر چکے ہیں۔ انھوں نے یہاں سے ہٹ کر تاریخ و تمدن کے میدان میں مورچے قائم کئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ جس طرح ایرانی و یہودی مورخین کے مقابلہ میں ابو حنیفہ دینوری (المتوفی ۲۸۱ھ) ابن قتیبہ (المتوفی ۲۷۶ھ) اور ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) نے اسلام اور قرآن کی تاریخ کی تحقیق و تطبیق میں کوشش کی اسی طرح اس زمانہ میں جدید یورپین تاریخ کی اسلام اور قرآن سے تطبیق دی جائے اور یورپین تاریخی تحقیقات و اکتشافات کی غلطیوں کا پردہ چاک کیا جائے اور خود ان ہی کے کارخانوں کے بنے ہوئے ہتھیاروں سے ان کے حملوں کا جواب دیا جائے۔" [2]

ان ہی تنقیدی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سید صاحب نے سیرۃ النبیؐ کے مقدمہ کے لئے عرب قبل اسلام کا مطالعہ شروع کیا لیکن موضوع اتنا طویل اور عمیق تھا کہ اس کی سمائی کسی کتاب کے مقدمہ میں

---

(۱) تاریخ ارض القرآن جلد اول ص ۳ (اعظم گڑھ، طبع چہارم، ۱۹۵۵ء) (۲) ایضاً ص ۵، ۶

نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی خطرہ کے پیشِ نظر علامہ شبلیؒ نے اپنے خط مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۳ء میں ہدایت دی کہ

> ”تم عرب بائدہ یا عرب کی ان مہذب سلطنتوں کے پیچھے نہ پڑو جو یمن، شام وغیرہ میں قائم تھیں، ان کے متعلق چند صفحات میں اجمالی بحث کافی ہوگی، تمام کوشش نجد و حجاز و یثرب کے متعلق معلومات کے جمع کرنے میں صرف کرنی چاہیے، تم انھیں مقامات کے متعلق معلومات بہم پہنچاؤ۔ آبادی کعبہ اور حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے واقعات میں جس قدر تفصیلات مل سکیں وہ تلاش کرو۔“ [۳]

سید صاحب نے استاد کے حکم کی پیروی اس قدر ضرور کی کہ سیرت النبی کی حد تک جو کچھ ضروری تھا اسے سیرت میں شامل کر دیا لیکن کام سے ہاتھ نہیں اٹھایا، تحقیق میں لگے رہے یہاں تک کہ تین سال کی مدت میں ”مقدمہ“ ایک مستقل کتاب بن گیا جسے انھوں نے ’تاریخ ارض القرآن‘ کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ یہ مقدمہ، یا کتاب قرآن مجید کی تاریخی جغرافیائی تفسیر ہے۔ قرآن مجید میں جن مقامات و اقوام و قبائل کا ذکر آیا ہے ارض القرآن میں اس کی جغرافیائی اور اثری تحقیق ہے۔ جس سے کلام مجید کے بیانات اور تاریخی و جغرافیائی تحقیقات میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔

مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات اور ان کی لغزشوں کی نشاندہی ’تاریخ ارض القرآن‘ کا اصل مقصد نہیں ہے۔ یہ باتیں تو اس میں ضمناً آگئی ہیں، اس کا اگر ہم سیرۃ النبیؐ کے مقدمہ کی حیثیت سے مطالعہ کریں تو واضح ہوگا کہ سید صاحب اصلاً اس کتاب کے ذریعہ ان اصولوں کا تعارف کرانا چاہتے تھے جو قرآن میں مذکور جغرافیائی اور تاریخی حقائق کا مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ سید صاحب کے بقول ارض القرآن کا مطالعہ کرنے کے لئے چار ماخذوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے:

۱۔ ادبیاتِ اسلامیہ، یعنی تفسیری روایات، مسلمانوں کے ذریعہ بیان کردہ اسرائیلی روایات، صدر اوّل کے مسلمان اہل قلم کا چھوڑا ہوا تاریخی ورثہ، علم الانساب وغیرہ۔

۲۔ ادبیاتِ اسرائیلیہ، یعنی عہد نامۂ قدیم و جدید کا علم۔

۳۔ ادبیاتِ یونانیہ و رومانیہ (گریک اینڈ رومن لٹریچر)۔

۴۔ اکتشافاتِ اثریہ (آرکیالوجیکل ڈسکوریز)۔

’ارض القرآن‘ کے دونوں حصوں کا مطالعہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ سید صاحب نے ان چاروں ماخذوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس طرح ایک چھوٹا سا مقدمہ پھیلتے پھیلتے ایک مستقل کتاب کی شکل اختیار کر گیا، جس کے پہلے حصہ میں مصنف نے ارض القرآن کے جغرافیہ، اور اقوام عرب کے سیاسی تاریخی نسبی اور قومی حالات

---

(۳) حیات سلیمان مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم۔ اعظم گڑھ ۱۹۷۳ ص ۵۳

سے بھرپور بحث کر کے یہ ثابت کر دیا کہ عرب اقوام نے اسلام سے پہلے بھی دنیا میں قابلِ یادگار کارنامے انجام دیئے تھے اور ان کے تمدن نے یمن و شام اور عراق تک میں اپنے اثرات چھوڑے تھے۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں انھوں نے مذکورہ بالا ماخذ کی بنیاد پر اقوامِ عرب کی زبانوں، ان کے مذاہب، تجارتی مشاغل اور تہذیبی و تمدنی ترقیوں کا ذکر کیا ہے۔

سید صاحب نے خود اپنی کتابوں پر جو مقدمے لکھے ہیں ان میں ایک دوسرا اہم مقدمہ "حیاتِ شبلی" کا ہے۔ جسے سید صاحب نے دو عنوانات " دیباچہ" اور مقدمہ" کے تحت بڑے سائز کے ۱۱۰ صفحات میں قلم بند فرمایا ہے۔ ۵۲ صفحات کے دیباچہ میں سید صاحب نے حقیقۃً اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے "حیاتِ شبلی" کیوں مرتب کی۔ اس کا جواب ایک تو یہ تھا کہ شاگرد استاد کا مقروض ہوتا ہے اس لیے سید صاحب نے حیاتِ شبلی لکھ کر قرض اور فرض سے اپنے کندھوں کو ہلکا کیا، لیکن دوسرے لوگوں کے لیے حیاتِ شبلی میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ وہ تقریباً ایک ہزار صفحات کا مطالعہ کریں۔ سید صاحب نے حیاتِ شبلی کی ابتدا جن الفاظ سے کی ہے وہ دراصل اسی ناپرسیدہ سوال کا جواب ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ " پیشِ نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراقِ سوانح ہیں جس نے بتیس برس (۱۸۸۲ء ــــ ۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پُرشور رکھا۔" اصل کتاب کے تقریباً ۹۰۰ صفحات میں سید صاحب نے علامہ شبلی کی جو تصویر کشی کی ہے دیباچہ کے ۵۰، ۵۲ صفحات میں انھیں باتوں کو مختصراً بیان کر دیا ہے تاکہ جو لوگ شبلی سے ناواقف ہوں، دیباچہ ان کی ناواقفیت کو دُور کر دے۔ یہ دیباچہ درحقیقت اصل کتاب کے SYNOPSIS کی حیثیت رکھتا ہے، جسے پڑھنے کے بعد قاری یہ جان لیتا ہے کہ آئندہ صفحات میں اسے کیا چیز ملنے والی ہے۔ دیباچہ کے بعد مقدمہ میں سید صاحب نے دراصل نہ صرف " دیارِ پورب" کی علمی تاریخ سے اپنے قارئین کو روشناس کرایا ہے بلکہ اس حقیقت کو تاریخی تناظر میں ثابت کیا ہے کہ

> " اسلام ایک ابرِ کرم تھا اور سطحِ خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا، لیکن فیض بقدرِ استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی۔" [4]

یہ مقدمہ خود اپنی جگہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے اور بعد میں اہلِ علم نے اس موضوع پر اپنی تحقیقات کو تفصیل سے شائع کیا ہے، بس فرق صرف تفصیل اور اجمال کا ہے ورنہ دیارِ پورب کی علمی تاریخ لکھنے کے لیے جو ضروری ماخذ ہو سکتے ہیں ان کی نشاندہی سید صاحب نے اپنے اس مقدمے میں کر دی ہے۔

---

(۴) " مقدمہ" حیاتِ شبلی ص ا، (اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء)۔

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ "حیاتِ شبلی" کا مقدمہ سید صاحب نے صرف اپنے علم کے اظہار کے لئے لکھا تھا، چونکہ اس مقدمہ کا بظاہر اصل کتاب سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا، اس لئے نظرِ ظاہر بین یہ بات کہہ سکتی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کتاب اور مقدمہ میں گہرا معنوی ربط ہے۔ صاحبِ سوانح کا تعلق اسی سرزمین پورب سے تھا جہاں صدیوں سے "اسلام کا ابرِ کرم" برستا چلا آ رہا تھا، اس ابرِ کرم کی تشریح تو مقدمہ ہے اور شبلی نے اپنی استعداد کے مطابق اس ابرِ کرم سے جتنا فیض اُٹھایا اس کا بیان "حیاتِ شبلی" ہے۔

سید صاحب نے اپنی کتابوں کے علاوہ دوسروں کی کتابوں پر بھی مقدمے لکھے ہیں۔ مولانا علی میاں نے اپنی زندگی کے اس دور میں جسے لوگ بالعموم کھانے کھیلنے میں گزار دیتے ہیں "سیرتِ سید احمد شہید" مرتب کی تھی۔ ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو علی میاں صاحبِ قلم کی حیثیت سے کچھ زیادہ معروف نہیں تھے ایسے وقت میں کتاب کے ایڈیشن پر سید صاحب نے چند صفحات کا ایک تعارفی مقدمہ "مسافرِ اسلام ہندوستان کے غربت کدے میں" کے عنوان سے لکھا تھا جو اس کے چھٹے اڈیشن کی بھی زینت ہے۔

میں نے اس مضمون کے شروع میں "مقدموں" کی جو مختلف قسمیں گنوائی تھیں ان میں ایک قسم وہ تھی جس میں مقدمہ نگار کتاب یا موضوع کو پسِ پشت ڈال کر مصنف پر مقدمہ لکھتا ہے اور ایک طرح سے اس کے "تعارفی ایجنٹ" کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ پہلے اڈیشن میں اگر سید صاحب نے یہی رویہ اپنایا ہوتا تو وہ زمانہ کے چلن کے خلاف نہ ہوتا، کہ علی میاں اس وقت تک کچھ بہت زیادہ معروف نہ تھے لیکن اگر سید صاحب نے ایسا کیا ہوتا تو پھر چھٹے اڈیشن میں اس مقدمے کو شائع کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ رہ جاتی، کیونکہ آج علی میاں کو کسی تعارف کرانے والے کی ضرورت نہیں ہے کہ اب تو ان کی وساطت سے دوسروں کی پہچان ہوتی ہے۔

بہرحال سید صاحب نے علی میاں پر مقدمہ نہیں لکھا بلکہ ان کی تصنیف "سیرت سید احمد شہید" پر مقدمہ لکھا جو دراصل اس حدیثِ نبویؐ کی تشریح ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "اسلام کا آغاز مسافرانہ بے کسی میں ہوا، اور پھر وہ مسافرانہ بے کسی میں ہوگا تو مسافرت کے بے کسوں کو مبارکباد ہو"۔ کل ۸ صفحے کا مقدمہ، لیکن جس طرح ان آٹھ صفحات میں سید صاحب نے اشاروں ہی اشاروں میں سفر کی راہوں کے پیچ و خم اور اونچ نیچ کی نقشہ کشی کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان آٹھ صفحات میں تاریخ بھی ہے اور ادب بھی، زبان کی چاشنی بھی ہے اور قلم کی ثقاہت بھی۔ اکبر کے دینِ الٰہی اور اس کے عمومی اثرات پر لوگوں نے صفحوں کے صفحے لکھے ہیں لیکن سید صاحب نے اسے چند سطروں میں پیش کر دیا ہے، ملاحظہ ہو:

> "اس بیچ میل تحریک کا جو اثر ہوا، اس کی تصویر اگر کوئی دیکھنا چاہے تو "دبستانِ مذاہب" کا مطالعہ کرے۔ کتنے زنار داروں کے ہاتھوں میں تسبیح اور کتنے تسبیح خوانوں کے گلوں میں زنار نظر آئیں گے۔

بادشاہی آستانے پر کتنے امیروں کے سر سجدے میں پڑے، اور شہنشاہ کے دربار میں کتنے دستار بند کھڑے دکھائی دیں گے اور مسجدوں کے منبر سے یہ صدا سُنائی دے گی ——— تعالیٰ شانہٗ ، اللہ اکبر۔

یہ ہو ہی رہا تھا کہ سرہند کی سمت سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی "راستہ صاف کرو کر راستے کا چلنے والا آتا ہے" ایک فاروقی مجدّد فاروقی شان سے ظاہر ہوا، یہ احمد سرہندی تھے۔ جہانگیر کے طوق و سلاسل نے بڑھ کر ان کے قدم لئے اور وہ شاہی قیدی کی حیثیت میں اسیرِ زنداں ہوئے، اس یوسفِ زندانی نے بھی یوسفِ کنعاں کی طرح "أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" کا نعرہ لگایا۔ اس نعرے نے سوتوں کو جگا دیا، مسافرِ اسلام کی درا کی دھیمی دھیمی آواز پھر سُنائی دینے لگی" [۵]

کارہائے مجدّد سے گزر کر، خدماتِ خاندانی ولی اللّٰہی کا تذکرہ کرتے ہوئے جب سید صاحب موضوعِ کتاب "سید احمد شہید" کا تعارف کراتے ہیں تو سید شہید کی پیدائش کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"تیرہویں صدی کا آغاز تھا کہ اس خاندان میں چودھویں کا چاند طلوع ہوا۔" [۶]

علی میاں ہی کی ایک دوسری کتاب "مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت" کے دوسرے اڈیشن پر مئی ۱۹۴۷ء میں سید صاحب نے ایک تفصیلی مقدمہ "پیغام بر قوم اور اس کے اصولِ دعوت" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں عنوان کی رعایت سے سید صاحب نے "مسلمان قوم" کی ایک جامع تعریف پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ پیغامِ خداوندی کو کس طرح دنیا میں پھیلا سکتے ہیں۔ امتِ مسلمہ چونکہ جانشینِ نبیؐ ہے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ تبلیغ کے انھیں طریقوں کو اپنائے جنہیں حضور اکرمؐ اور آپؐ کے صحابہ و تابعین نے اپنایا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک امتِ مسلمہ نے تعلیم اور تزکیہ، میں ثنویت کو نہیں در آنے دیا تھا اس وقت تک "ظاہری اور باطنی کام پوری طرح توأم رہے۔ جو استاد تھے وہ شیخ تھے اور جو شیخ تھے وہی استاد تھے۔ وہ جو مسندِ درس کو جلوہ دیتے تھے وہ خلوت کے شب زندہ دار اور اپنے ہم نشینوں کے تزکیہ و تصفیہ کے بھی ذمّہ دار تھے۔ ان طبقوں میں استاد اور شیخ کی تفریق نظر نہیں آتی۔" [۷]

لیکن جلد ہی وہ دَور آگیا جس میں "مسندِ ظاہر کے درس گو، باطن کے کورے اور باطن کے روشن دل ظاہر سے عاری ہونے لگے، اور عہد بعہد ظاہر و باطن کی یہ خلیج بڑھتی ہی چلی گئی، تا آنکہ علوم ظاہر کے لئے مدارس کی چہار دیواری اور تعلیم و تزکیہ باطن کے لئے خانقاہوں اور رباطوں کی تعمیر عمل میں آئی اور وہ مسجد نبویؐ جس میں یہ دونوں جلوے یکجا تھے اس کی تجلیات مدرسوں اور خانقاہوں کے دو حصوں میں تقسیم ہوگئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس

---

(۵) سیرت سید احمد شہید، حصّہ اوّل، طبع ششم، لکھنؤ ۱۹۷۷ء ص ۳۰، ۳۱ (۶) ایضاً ص ۳۲

(۷) مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، مقدمہ ص ۴ (دہلی، بلا تاریخ)

سے علمائے دین کی جگہ علمائے دنیا نکلنے لگے اور باطن کے مدعی علم شریعت کے اسرار و کمالات سے جاہل ہو کر رہ گئے۔" ۸

سید صاحب عالم بھی تھے اور صوفی بھی۔ لیکن یہ ان کی زندگی کے دو الگ الگ خانے نہیں تھے۔ ان کی ذات نام تھی شریعت اور طریقت دونوں کے قوام کا، لیکن اس کے باوجود، جیسا کہ آپ نے دیکھا، وہ ان علماء اور اہلِ تصوف پر تنقید کرنے سے اپنے کو نہ روک سکے جنھوں نے اسلام کو شریعت اور طریقت نامی دو دھاروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے ہمیں حیرت نہیں ہوتی، جب اس مقدمے میں سید صاحب اپنے زمانے کی معروف تحریکوں پر تنقید کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تنقید میں نہ تو کسی تحریک کا "نام" لیا ہے اور نہ بانیٔ تحریک کا۔ لیکن جس انداز میں ان کا تعارف کرایا ہے اس کے بعد نام لینے کی ضرورت رہ بھی نہیں جاتی۔

اس صدی کے ابتدائی دہوں میں تبلیغ اسلام کے نام پر بہت کچھ کیا گیا لیکن وہ کوششیں شعلۂ مستعجل ثابت ہوئیں۔ سید صاحب کے بقول "بہت سی تبلیغی انجمنیں بنیں، ہزاروں روپے کے چندے ہوئے۔ مبلغین نوکر رکھ کر جگہ جگہ پھیلائے گئے۔ مناظرین اسلام نے بحث و مناظرہ کے میدان گرم کیے، کئی سال بڑے دھوم دھام سے یہ کام ہوتا رہا۔ آخر آہستہ آہستہ جوش و خروش کم ہوتا گیا۔ ایک ایک انجمن ٹوٹ گئی، چندوں کی کمی سے مبلغین برطرف ہونے لگے، مناظرین کے بلاوے بھی گھٹنے لگے اور بالآخر سمندر میں سکون پیدا ہو گیا۔" ۹

ایسا کیوں ہوا اور اس ناکامی کے وجوہ کیا تھے۔ سید صاحب کے تجربے کے مطابق "یہ سارا تماشا کام کرنے والوں کی دلی لگن کا نتیجہ نہ تھا اور نہ مبلغین و مناظرین و داعیان کے دلوں میں دین کی دھن تھی بلکہ جو کچھ تھا وہ داد و ستد کا مبادلہ اور نفعِ عاجل کی حرص و طمع تھی اور دینی دعوت اور باطنی ارشاد و تبلیغ، بازار کی قیمت سے خریدی نہیں جاتی۔" ۱۰

سید صاحب کے مقدموں میں سے میں نے صرف چار کا یہاں ذکر کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس مختصر سی مہلت میں تمام مقدموں کا تعارف کرانا ممکن نہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دیگ کی اچھائی یا برائی کو طے کرنے کے لیے چند چاولوں کو دیکھ لینا ہی کافی ہوتا ہے۔

---

(۸) ایضاً ص ۴ (۹) ایضاً ص ۸ (۱۰) ایضاً

عبداللطیف اعظمی★

خطوطِ سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اپنے وقت کے یگانۂ روزگار تھے۔ ان میں اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی کی طرح اتنی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں، جو بالعموم کسی ایک شخص میں بہ مشکل ملیں گی۔ وہ عالم دین اور معلّم اسرار و حقائق اور علوم و معارف تو تھے ہی، ساتھ ہی ساتھ وہ پائے کے مورخ اور سیرت نگار بھی تھے، ایک ممتاز ادیب اور انشاپرداز بھی تھے اور چاہے وقتی طور پر محض دل بہلانے ہی کے لئے شعر کہتے تھے مگر ان کی شاعری کے جو نمونے سامنے آئے ہیں، ان کو دیکھ کر اور پرکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اگر وہ اس وادی میں سنجیدگی کے ساتھ قدم رکھتے ہیں تو ایک بلند پایہ اور نغز گو شاعر بھی ہوتے۔ وہ ایک دل نواز مقرر بھی تھے، مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح شعلہ بیان اور سحر طراز نہ سہی، مگر اپنی دھیمی آواز اور پُرسکون لہجے میں جو کچھ کہتے، ان کی پُر وقار شخصیت کی طرح دلوں میں گھر کر جاتی۔ ان کی باتوں اور خیالات میں گہرائی اور عالمانہ شان ہوتی، ان میں گھن گرج تو سُنائی نہ دیتی اور نہ ہی ان میں طوفانی لہروں کا تموّج ہوتا مگر پُرسکون دریا کی لہروں کی طرح روانی ہوتی جو اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی اور نظروں کو لبھاتی ہوئی بظاہر گزر جاتی مگر درحقیقت دلوں کو موہ لیتی۔ جیسا ان کا دل نواز چہرہ تھا، ویسی ہی اُن کی دلکش سیرت اور بے داغ کردار تھا۔ وہ ایک کُھلی کتاب تھے۔ مخصوص احباب اور عقیدت مندوں کی نجی صحبت ہو یا مختلف اور متضاد عناصر اور افراد کا اجتماع، علم و مذہب کا آستانہ ہو یا سیاسی پلیٹ فارم ہر جگہ وہ یکساں ہی نظر آتے۔ وہ وہی کہتے جو ان کے دل میں ہوتا، چاہے کسی کو پسند آئے یا نہ آئے۔ تلخ ہو یا شیریں محض کسی مصلحت یا کسی دباؤ میں زہر ہلاہل کو قند کہنے کے عادی نہ تھے۔ ان کا صرف ایک چہرہ تھا، ویسا ہی تابناک اور روشن جو سب کے سامنے اور سب کی نظروں میں تھا۔ جیسا ابتدائے زندگی میں تھا، ویسا ہی اختتام زندگی میں بھی۔ غرض خلوص و محبت اور صدق و صفا کے پیکر تھے۔ ندوی برادری میں عظیم ترین اور محبوب ترین اور اپنے دور کے عظیم ترین مشاہیر کے ہمسر اور ہم رتبہ تھے۔ مرحوم کے عقیدت مند، زندگی بھر کے ساتھی اور رفیق، دارالمصنفین کے جانشین اور ان کے سوانح نگار مولانا شاہ معین الدین ندوی مرحوم نے ان کی ہمہ گیر شخصیت اور جامع خصوصیات کا بہترین تجزیہ

★ سابق معاون مدیر ماہنامہ "جامعہ"، نئی دہلی

کیا ہے۔ اگرچہ یہ اقتباس طویل ہے، مگر ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اس لئے یہاں مکمل طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

> "سید صاحب کی ایک بڑی خصوصیت قدیم و جدید کی جامعیت اور ہر طبقے میں ان کی مقبولیت تھی۔ وہ اگرچہ قدیم تعلیم کے نمائندے تھے، ان کی تعلیم و تربیت تمام تر پرانے ماحول میں ہوئی تھی، لیکن ان کے قلب میں بڑی وسعت تھی۔ وہ جدید خیالات و رجحانات اور ان کے طور طریقوں سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ ان سے بھڑکتے نہ تھے بلکہ ان کو صحیح راستے پر لگانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ قدیم و جدید کا سنگم تھے اور اپنے کو ان دونوں سے ایسا مانوس کر لیا تھا کہ کہیں اجنبی نہ معلوم ہوتے تھے۔ ان کو دونوں کا اعتماد حاصل تھا اور دونوں اپنے اپنے حلقے میں ان کے علم و اصابت رائے سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اسی طریقے سے وہ احناف اور اہلِ حدیث میں یکساں مقبول تھے۔ ان کا مسلک ایسا صلح کُل تھا کہ ہر جماعت ان کو اپنا آدمی سمجھتی تھی، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ انھوں نے قدیم و جدید کے فرق و امتیاز اور احناف و اہلِ حدیث وغیرہ کے اختلافات مٹا کر ان میں اتحاد و ہم آہنگی کا علمی نمونہ پیش کیا جو ندوہ کا بڑا مقصد تھا۔"[1]

کسی علمی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے یا تو اس کی ذاتی تحریریں سب سے زیادہ ممد و معاون ہوتی ہیں یا اس کی سیرت و شخصیت اور اخلاق و کردار پر سب سے زیادہ اور سب سے بہترین روشنی اس کے نجی خطوط سے حاصل ہوتی ہے اور کسی اختلافی و نزاعی مسئلے میں معتبر ترین اور فیصلہ کن ثبوت نجی خطوط ہوتے ہیں۔ بہ شرطیکہ ٹھوس واقعات اور مصدقہ حقائق ان کے خلاف نہ ہوں۔ دارالمصنفین نے، جو مرحوم کی علمی و مذہبی اور ادبی و تاریخی خدمات کی زندہ یادگار ہے، مرحوم کی ایک مبسوط اور مکمل سوانح حیات تو شائع کر دی ہے۔ مگر نہ جانے کیوں ان کے نجی خطوط کی اشاعت کی طرف وہ توجہ نہیں کی، جس کے وہ مستحق تھے اور ہیں۔ جس طرح خود سید صاحب نے اپنی اولین فرصت میں اپنے استاد مولانا شبلی مرحوم کے خطوط مرتب کر کے شائع کر دیئے تھے۔ ضرورت تھی کہ اسی طرح سید صاحب کے رفقا بھی اپنے بزرگ رفیق اور دارالمصنفین کے اولین معمار و سربراہ کے اہم خطوط کو کتابی صورت میں شائع فرما دیتے۔ کچھ منتخب خطوط "معارف" میں ضرور شائع ہوئے ہیں، مگر وہ کسی صورت میں بھی کافی نہیں ہیں۔ بہرحال اس وقت تک مرحوم کے خطوط کے جو مجموعے شائع ہوئے اور اس مضمون کی تحریر کے وقت میرے پیشِ نظر رہے ہیں، ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :۔

۱۔ **بریدِ فرنگ** : یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے، جنھیں سید صاحب نے ۱۹۲۰ء میں یورپ سے ہندوستان کے بزرگوں اور دوستوں و عزیزوں کو لکھا تھا اور جن میں اُس وقت کے یورپ اور دنیائے اسلام کے سیاسی و

---

[1] مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔ حیاتِ سلیمان، صفحات: ۶۸۶ - ۶۸۷

اجتماعی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ مطبوعہ: کراچی۔ ۱۹۵۲ء۔ پیش لفظ کا عنوان ہے ”ان خطوط کا پس منظر: بیس برس پہلے کی دنیا۔ کل خطوط کی تعداد: ۷۲۔ پہلا خط: بمبئی سے مورخہ ۲۰/جون ۱۹۲۰ء۔ آخری خط: لندن سے پروفیسر براؤن اور پروفیسر مارگولی رتھ کے نام عربی میں، اس پر تاریخ اور مہینہ نہیں ہے، صرف ۱۹۳۰ء درج ہے۔ اس سے پہلے کے خط نمبر ۷۱، پر ۲۸/ستمبر ۱۹۲۰ء کی تاریخ ہے۔

۲۔ **مکاتیب سید سلیمان ندوی** بنام مولانا سید مسعود عالم ندوی۔ مطبوعہ: لاہور۔ مئی ۱۹۵۴ء۔ تعداد خطوط: ۱۴۵۔ جو ۲۸/فروری ۱۹۲۸ء سے ۸/اگست ۱۹۵۳ء تک کی مدت پر پھیلے ہوئے ہیں۔

۳۔ ۴۔ **مکتوبات سلیمانی** بنام مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔ دو حصے۔ مطبوعہ: لکھنؤ۔ پہلا حصہ: ۱۹۶۳ء اور دوسرا حصہ: ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ پہلے حصہ کے خطوط کی تعداد: ۲۳۰ اور دوسرے حصے کی: ۱۷۱۔ کل تعداد ۴۰۱ پہلا خط: مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء۔ آخری خط پر تاریخ درج نہیں مگر مکتوب الیہ نے لکھا ہے کہ: ”شروع نومبر ۱۹۵۳ء کا ہے، گویا سید صاحب کی وفات سے چند ہفتہ قبل لکھا گیا۔“[۲]

ان چاروں مجموعوں کے خطوط کی کل تعداد ۶۱۸ ہے۔ ان کے علاوہ غیر مدوّن خطوط کی تفصیل حسب ذیل ہے جو مختلف رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں: نقوش۔ مکاتیب نمبر (نومبر ۱۹۵۷ء) ۶۱ نقوش۔ خطوط نمبر (اپریل و مئی ۱۹۶۸ء) ۱۸۔ معارف (متفرق شمارے) ۴۲، متفرق رسائل ۶ عدد۔ کُل تعداد: ۱۲۷۔ مجموعی تعداد: ۷۴۶، خطوط۔

ان خطوط کے علاوہ سیکڑوں خطوط ایسے ہوں گے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اس سیمنار کے داعی مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری ان لوگوں میں سے ہیں، جن کا حضرت مولانا سے گہرا اور دیرینہ تعلق رہا ہے۔ تنہا انھیں کے پاس کئی سو خط ہوں گے۔ اسی طرح مجھے معلوم ہے کہ جماعت اسلامی کے موجودہ امیر، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کے نام بھی سید صاحب کے کافی خطوط ہیں۔ دارالمصنّفین کے ممتاز رفقاء میں سے موجودہ ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے نام ظاہر ہے بہت سے خطوط ہوں گے۔ اگر یہ تمام خطوط بغیر کسی انتخاب اور کتر بیونت کے چھپ جائیں گے تو ان کی روشنی میں حضرت مولانا کی سیرت و شخصیت اور ان کی علمی و مذہبی خدمات کا جامع و مکمل نمونہ سامنے آجائے گا۔ لیکن اب تک مرحوم کے جس قدر خطوط منظر عام پر آئے ہیں، ان کی بنیاد پر مرحوم کی جو تصویر اُبھر کر سامنے آئی ہے، اس سے اُن کی علمی و ادبی سرگرمیوں، ان کے سیاسی و تعلیمی خیالات، ان کے مذہبی و تہذیبی تصورات اور ممتاز معاصرین سے ان کے تعلقات پر بہت اچھی اور خاصی مکمل روشنی پڑتی ہے ”برید فرنگ“ کی نوعیت ذرا دوسرے قسم کی ہے اور اگر تمام نہیں تو اس کے بیشتر خطوط اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد سب سے پہلے وہ خطوط شائع ہوئے ہیں جو

---

[۲] مولانا عبدالماجد دریا آبادی: مکتوبات سلیمانی، حصہ دوم، صفحہ ۲۰۸

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے نام ہیں جو تقریباً ربع صدی پر محیط ہیں اور فاضل مکتوب الیہ کے بقول "اس ربع صدی میں بڑے بڑے انقلاب آئے، زمانے کے حوادث نے افکار و خیالات کی دنیا ہی بدل دی۔ اختلافِ مسلک و فکر کی نزاکتوں سے بھی دُوچار ہونا پڑا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کے نظم و انصرام کے باب میں بھی کبھی کبھی راہیں مختلف ہوتی نظر آئیں"[۵۳] اس لئے اِن خطوط سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے گھٹتے بڑھتے تعلقات پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ کہیں کہیں محترم و معزز استاد نے اپنے عزیز شاگرد اور ہم وطن یعنی مولانا مسعود عالم مرحوم کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ کبھی سرزنش کی ضرورت پڑی تو اس سے بھی کام لیا ہے۔ کہیں کہیں ان کے بعض خیالات سے بڑی خوبصورتی سے اختلاف کیا ہے اور ایسے مواقع بھی آئے ہیں جب ان کے مخصوص مزاج اور طبیعت کا کھُل کر اظہار ہوا ہے۔ چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:۔

مئی ۱۹۳۲ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے عربی کا ایک ماہنامہ "الضیاء" جاری ہوا۔ جس کے ایڈیٹران خطوط کے مکتوب الیہ مولانا مسعود عالم تھے۔ ظاہر ہے ہندوستان سے ایک عربی رسالہ جاری کیا جائے تو اس کے اخراجات کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ ابھی رسالہ بہت بڑے خسارے سے دوچار تھا کہ نوجوان اور ناتجربہ کار مدیر نے اپنی مدد کے لئے پانچ روپیہ ماہانہ الاؤنس پر ایک ہونہار طالب علم کی خدمات حاصل کرلیں۔ نیز اسی زمانے میں ایک عربی ہفتہ وار اخبار "العرب" میں ہندوستانی سیاست پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کردیا۔ یہ دونوں باتیں سید صاحب کو پسند نہیں آئیں۔ اپنی ذاتی مثال کے ذریعہ کس خوبی کے ساتھ نصیحت فرماتے ہیں "آپ نے پانچ روپے کا اضافہ کیا مگر یہ ساٹھ روپے کہاں سے لائیں گے؟ یہ سُن لیجیے کہ میں نے سالہا سال تک "الندوہ" کو اس طرح چلایا ہے کہ چپراسی کے کام سے لیکر ایڈیٹری تک کا کام تنہا انجام دیا ہے اور آپ ایک ہی سال میں معاون کی تلاش کرنے لگے۔ بہرحال آپ جو کہ چکے اس کا علاج یہی ہے کہ خریداری کے لئے مزید کوشش کیجئے۔۔۔۔۔ ابھی سے مصر و شام میں حصول نام کی سعی میں اپنے پرچے کے کاموں میں تساہل آپ کی اس غرض کو بھی نقصان پہنچائے گا۔ دنیا میں صرف پالٹیکس ہی کوئی چیز نہیں ہے۔ ابھی تک آپنے خود "الشعر الجاہلی" کے علاوہ "الضیاء" میں کوئی اور مضمون لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ابھی راستہ منزل کا دُور ہے، ابھی سے کمر کھولنے کی تیاری ہلاکت ہے۔۔۔۔ لَیْسَ لِلاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعیٰ"[۵۴]

مولانا مسعود عالم صاحب سید صاحب کے وفادار اور عقیدت مند شاگرد تھے۔ مگر اسی کے ساتھ ان کی طبیعت میں بغاوت اور سرکشی کے جراثیم بھی کافی تھے۔ ندوہ کی ایک مخصوص صورت حال میں مسعود عالم کی روش اور طریق کار سے سید صاحب نے شدید اختلاف کیا لیکن دیکھیے، کس شفقت و محبت سے سمجھاتے ہیں: "کام چلنے کی تدبیر صرف ایک ہے۔ قوتِ عمل تمام شرکائے عمل میں نہیں ہوتی، جس ایک میں ہو، اس کا ساتھ دے کر بقیہ شرکاء اس

---

[۵۳] مولانا سید مسعود عالم ندوی: مکاتیب سید سلیمان ندوی۔ صفحہ ۹

[۵۴] سید سلیمان ندوی: مکاتیب سید سلیمان ندوی: صفحات: ۴۷ ـ ۴۸

کے ساتھ چلیں۔ جہاں کام ہوگا اسی اصول پر ہوگا۔ فتنوں اور ہنگاموں سے نہ ہوگا۔ یہ عمومی بات ہے۔ اب خاص آپ سے متعلق کچھ کہتا ہوں۔[۵۵] اس کے بعد سید صاحب نے آٹھ نصیحتیں کی ہیں، ان سب کو یہاں پیش کرنا طوالت کا باعث ہوگا، اس لئے ان میں سے پہلی مکمل طور پر اور تیسری جزوی طور پر یہاں پیش کی جاتی ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں: "میرا ایک مشہور فقرہ ہے، شاید آپ سے بھی کہا ہو کہ محمود بننا مشکل نہیں، ایاز بننا مشکل ہے۔ اپنی طبیعت کے خلاف اور نفس پر جبر کر کے کسی ایک کے تابع ہو کر چلنا مشکل ہے، مگر سلامتی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ یہی ہے ۔ وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے۔ (۳) ... اگر آپ کو میرے کہنے پر چلنا ہے تو آپ سارے جہان کا "رنج" اپنے "جگر" سے نکال دیجئے، اور اصلاحِ عالم کی فکر میں نہ پڑیئے۔ آپ اپنی اصلاح کر لیجئے اور اپنے دائرے کا کام کیجئے...[۵۶]

مولانا مسعود عالم صاحب مذہبی مسلک کے لحاظ سے اہلِ حدیث اور سیاسی عقائد کے لحاظ سے جماعتِ اسلامی کے حامی و مددگار تھے اور بعد میں اپنی پوری زندگی اسی کے لئے وقف کر دی اور اسی خاطر پاکستان ہجرت کی۔ ان دونوں معاملات میں وہ کافی کٹر اور متشدد تھے اور ان کے مخدوم اور استاد مولانا سید صاحب اس کے بالکل مختلف اور برعکس تھے۔ اس لئے وقتاً فوقتاً اپنے خطوط میں شاگرد رشید کو سمجھانے اور ان کی انتہا پسندی میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش فرماتے رہتے۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں سید صاحب تحریر فرماتے ہیں: "وہابیت میں غلو اور تشدد نہ چاہیئے، تصلّب اور تعصب حکمِ دین میں چاہیئے نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں، خواہ وہ حنفیت ہو یا وہابیت۔ بل ملّۃ ابراھیم حنیفاً وما کان من المشرکین۔"[۵۷] ایک اور خط میں جماعتِ اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ضمناً مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ذکر آگیا ہے، اپنے طریقِ کار اور مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "عزیز مکرم! میں نے بار بار آپ صاحبوں کو یقین دلایا ہے کہ میں جماعتِ اسلامی کا مخالف نہیں۔ انگریزی خواں اور نوجوان تعلیم یافتہ جس راہِ حق سے بھٹک رہے ہیں ان کو بہرحال صحیح راستے کی طرف لانے کا کام اختلاف کے قابل نہیں۔ زمانے کا رُخ جس طرح بدل رہا ہے اور خیالات و افکار و نظریات کی آندھی جس زور سے چل رہی ہے، اس کے لئے جماعتِ اسلامی اور رفیق جو کچھ کر رہے ہیں اور اسلامی نظم و نظام اور اس کے معاشی و سیاسی و اجتماعی و عمرانی نظامات کو مرتب کر کے منتشر و پراگندہ خیال مسلمان نوجوانوں کو ایک نقطے پر مجتمع کر کے ان کو دین کی خدمت میں لگانے کا جو مبارک عمل آپ لوگوں کے سامنے ہے، وہ یقیناً تبریک کے لائق ہے اور اسی لئے میں نے جماعتِ اسلامی کے متعلق کبھی کوئی مخالفانہ بات نہیں کی۔ مجھے جو کچھ اختلاف رہا کیا (لیکن مخالفت نہیں) وہ صرف چند

---

[۵۵] ایضاً صفحہ ۶۵

[۵۶] مولانا عبدالماجد دریا آبادی: مکتوباتِ سلیمانی۔ حصۂ دوم صفحہ ۲۲۸

[۵۷] مولانا سید سلیمان ندوی: مکاتیبِ سید سلیمان ندوی صفحات: ۱۱۴ - ۱۱۵

وساوس اور خطرات کی بنا پر جس کا اظہار بھی کرتا رہا اور آپ صاحبوں سے بھی کہتا رہا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔[۵۸] اس سلسلہ میں مرحوم نے تین باتیں کہی ہیں، جن میں سے پہلی بات سب سے اہم اور قابل توجہ ہے، اس لئے اسے مکمل طور پر یہاں نقل کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے: "ادعائی لوگوں سے میں چوکنا رہتا ہوں۔ ابوالکلام کے ساتھ بھی میرا یہی معاملہ رہا۔ مرزا قادیانی کے باب میں علماء سے شروع ہی سے یہی غلطی سالہا سال ہوتی رہی، جس کا خمیازہ آج تک بھگتا جا رہا ہے۔ خیر، مدعیانہ طرزِ کلام ایک طرف دوسری طرف مجدد و مہدی کا مضمون جو "الفرقان" میں لکھا گیا اور خاص طور سے اس کا خاتمہ بے حد ہوشیار کرنے والی چیز تھی اور ہے۔"[۵۹]

سید مسعود عالم ندوی مرحوم کو جو خطوط لکھے گئے ہیں، ان سے کہیں زیادہ اہم وہ خطوط ہیں، جو مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کو لکھے گئے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے اول الذکر سید صاحب کے خوردوں میں سے ہیں اور ثانی الذکر سید صاحب کے ساتھیوں اور دوستوں میں سے اور دارالمصنفین کے مشیروں اور مددگاروں میں سے، ان سے جتنی بے تکلفی کے ساتھ مختلف مسائل پر گفتگو کی جا سکتی ہے، اتنی مسعود عالم صاحب سے نہیں، اس کے علاوہ اول الذکر کے خطوط کی مدت ۲۸ فروری ۱۹۲۸ء سے ۸ اگست ۱۹۵۲ء تک یعنی ۲۵ سال پر مشتمل ہے اور ثانی الذکر کے خطوط کا زمانہ ۱۹۱۲ء سے شروع ہوتا ہے اور نومبر ۱۹۵۳ء پر ختم ہوتا ہے، گویا ان خطوط کا زمانہ تقریباً ۴۱ برسوں پر محیط ہے۔ مزید برآں اول الذکر کے مطبوعہ خطوط کی کل تعداد صرف ۱۴۵ ہے، اور ثانی الذکر کے مطبوعہ خطوط کی تعداد ۳۰۱ یعنی دونے سے بھی زیادہ، اس لئے قدرتی بات ہے کہ مولانا ماجد صاحب کے خطوط کی قدر و قیمت نہ صرف مسعود عالم کے مقابلے میں بلکہ اب تک سید صاحب کے جس قدر خطوط شائع ہوئے ہیں، ان کے مطابق تمام مکتوب الیہم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ان خطوط میں بعض معاصر شخصیتوں مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد پر کھل کر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ بہت سے علمی و ادبی مسائل پر رائے دی گئی ہے، دارالمصنفین کے استحکام اور مقاصد پر مشورے کئے گئے ہیں۔ شاعری، فن تعمیر، عقاید اسلامی اور دیگر علوم و فنون کی ترقی میں مسلمانوں کا جو حصہ رہا ہے، ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مکتوب نگار کی نظر کتنی وسیع اور مشاہدہ کتنا گہرا ہے۔ زبان کی خوبی اور اسلوب کی دلکشی کے لحاظ سے ان خطوط کو اس دور کی مکتوب نگاری میں بلاشبہ ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

سید صاحب کی زندگی کے آخری دور کے خطوط کے مطالعے سے جو صورت حال اُبھر کر سامنے آتی ہے، وہ بہت ہی افسوسناک اور رنج دہ ہے۔ جس کو مرحوم کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ تسلیم کرے گا کہ انھیں اپنی عزت نفس کا بہت خیال تھا اور اس معاملے میں کافی حساس اور نازک مزاج بھی تھے، انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ جس ماحول میں بسر کیا تھا وہ ان کی طبیعت اور مزاج کا ایک جز ہو گیا تھا اور جن لوگوں کے ساتھ بسر کیا تھا وہ ان

---

[۵۸] ایضاً صفحہ ۱۲۵

[۵۹] ایضاً

کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے اور ان کی ذات سے مخلصانہ عقیدت رکھتے تھے، مگر شومیِ قسمت سے آخری زمانے میں کچھ ایسی افسوس ناک صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ دار المصنفین میں، جسے اپنے خون پسینے سے تعمیر کیا تھا، شب و روز کی محنت سے ترقی کر کے بامِ عروج پر پہنچایا تھا اور ملک گیر ہی نہیں عالم گیر شہرت اور عزت عطا کی تھی، اب ان کے لئے مزید کام کرنا مشکل ہو گیا۔ بیسویں صدی کی ہندوستانی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی مثال مل سکے کہ کسی سربراہ ادارے کو جو اس کا معمارِ اوّل بھی اور اس کی تمام ترقیاں اور شہرت اسی کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہو ایسی صورتِ حال پیش آئی ہو جیسی سید صاحب کو پیش آئی۔ اگر سید صاحب چاہتے تو اس صورتِ حال کو چیلنج کر سکتے تھے مگر ان کی شرافت نے اسے گوارا نہیں کیا اور غالباً رخصت لے کر ایک مسلم ریاست میں منتقل ہو گئے جس سے ان کے تعلقات بھی تھے، اور جو علم پرور اور علم نواز بھی تھی۔ جن حالات میں یہ فیصلہ کرنا پڑا تھا، بشری کمزوریوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان حالات کو منظرِ عام پر لایا جائے، جن کی وجہ سے یہ تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہوئی، مگر سید صاحب کی شرافت اور نیکی ملاحظہ ہو کہ خطوں میں بھی ان حالات کا اشاروں اشاروں میں ذکر کیا ہے، اور جن بزرگ کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا تھا ان کا ذکر بھی اچھے لفظوں میں ہوا ہے اور اہم ترین بات یہ کہ دار المصنفین سے تعلق اور محبت کا یہ حال ہے کہ اس کی فکر سے کوئی لمحہ خالی نہیں۔ اپنے وفا شعار اور عقیدت مند رفقاء کو دار المصنفین کی شہرت کو برقرار رکھنے اور اس کے ماہانہ ترجمان ”معارف“ کے معیار کو باقی رکھنے کے لئے اپنے خطوط میں مشورے دیتے رہے، ان خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ معمولی معمولی جزئیات پر بھی ان کی نظر ہوتی، مثلاً کتابت کے معیار اور اس کی غلطیوں کی طرف بھی متوجہ کرتے رہتے۔ ملک کی آزادی کے بعد، جس کے حصول میں خود ان کا بھی حصہ تھا، ایک ایسا انقلاب آیا، جس کا اندازہ شاید ہی کسی کو رہا ہو، تقسیم ملک کی وجہ سے ایسا طوفان آیا کہ بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھڑ کر اسی طوفان کی نظر ہو گئے۔ اسی تباہی و بربادی میں سید صاحب کا وہ شاندار منصوبہ بھی چکنا چور ہو گیا جو مستقبل کے لئے انھوں نے بنایا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے اوائل میں بڑے رنج و غم اور حسرت و یاس کے ساتھ اپنے عزیز ترین شاگرد مولوی مسعود عالم صاحب کو لکھتے ہیں: ”میرا کیا پوچھتے ہو، ادھر پندرہ برس سے یہ اسکیم تھی کہ آخر عمر دیسنہ میں بسر ہو گی، اسی کے لئے کھیت خریدے، بنگلہ بنوایا، باغ لگایا، مگر افسوس ہے کہ انقلاب نے سب حالت منقلب کر دی۔ کھیت فروخت کر دینے پڑے، دیسنہ کے کھیتوں پر اور باغ پر گھر ہی کے پروردہ کہاروں نے دعویٰ کر دیا ہے، دیسنہ کے ۱۲۰ خود کاشت کھیتوں پر جھوٹے دعوے کیے گئے ہیں۔ دو سادھوؤں اور (ایک) تیلی نے جس کا ایک بسوہ کبھی نہ تھا، اس نے بھائی داؤد مرحوم کے کھیتوں اور باغ پر دعویٰ کیا ہے۔ اس وقت بیس ہزار دیکر موجودہ پیداوار کو نیلام میں ہم لوگوں نے خریدا ہے ..... میں نے بالفعل اخبارات اور ریڈیو سب چھوڑ دیا ہے کہ دل کی طمانیت کا فقدان قلتِ خواب کا باعث بن جاتا ہے .....“[10]

۱۰۔ ایضاً صفحات ۲۰۶، ۲۰۷

اگرچہ ۱۰ر اپریل ۱۹۴۸ء کو ایک ندوی، سید وحید احمد قیصر کو بھوپال سے لکھ چکے تھے! ”..... ہندوستان کی صورت حال نے بیحد مضطرب کر رکھا ہے۔ دیسنہ چھوڑنا چاہتا ہے اور تو کوئی دوسرا مرکز ابھی طے نہیں، گو میں ترکِ وطن سے متفق نہیں، مگر نہیں جانتا کہ کیا پیش آئے گا،“ مگر بالآخر وہی ہوا جو وہ نہیں چاہتے تھے یا خود ان کے الفاظ میں جس سے وہ متفق نہیں تھے، یعنی ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ ان کے وفا شعار رفیقوں اور عقیدت مندوں نے ممکن ہے سوچا ہو کہ ان کی آخری آرام گاہ اسی ادارے میں، جو انھیں سب سے زیادہ عزیز تھا، ان کے استادِ محترم مولانا شبلی مرحوم کی قبر کے پائیں، قرار پائے گی، مگر اپنے مالوف وطن اور محبوب ادارے سے ہزاروں میل دور ایک ایسی سرزمین میں جگہ ملی جو بالکل نہیں تو بڑی حد تک ان کے لئے اجنبی تھی۔ مگر مشیتِ الٰہی میں کس کو چارہ ہے! خدا ان کی رُوح کو سکون مرحمت فرمائے اور اپنی رحمتوں سے نوازے۔ آمین۔

○

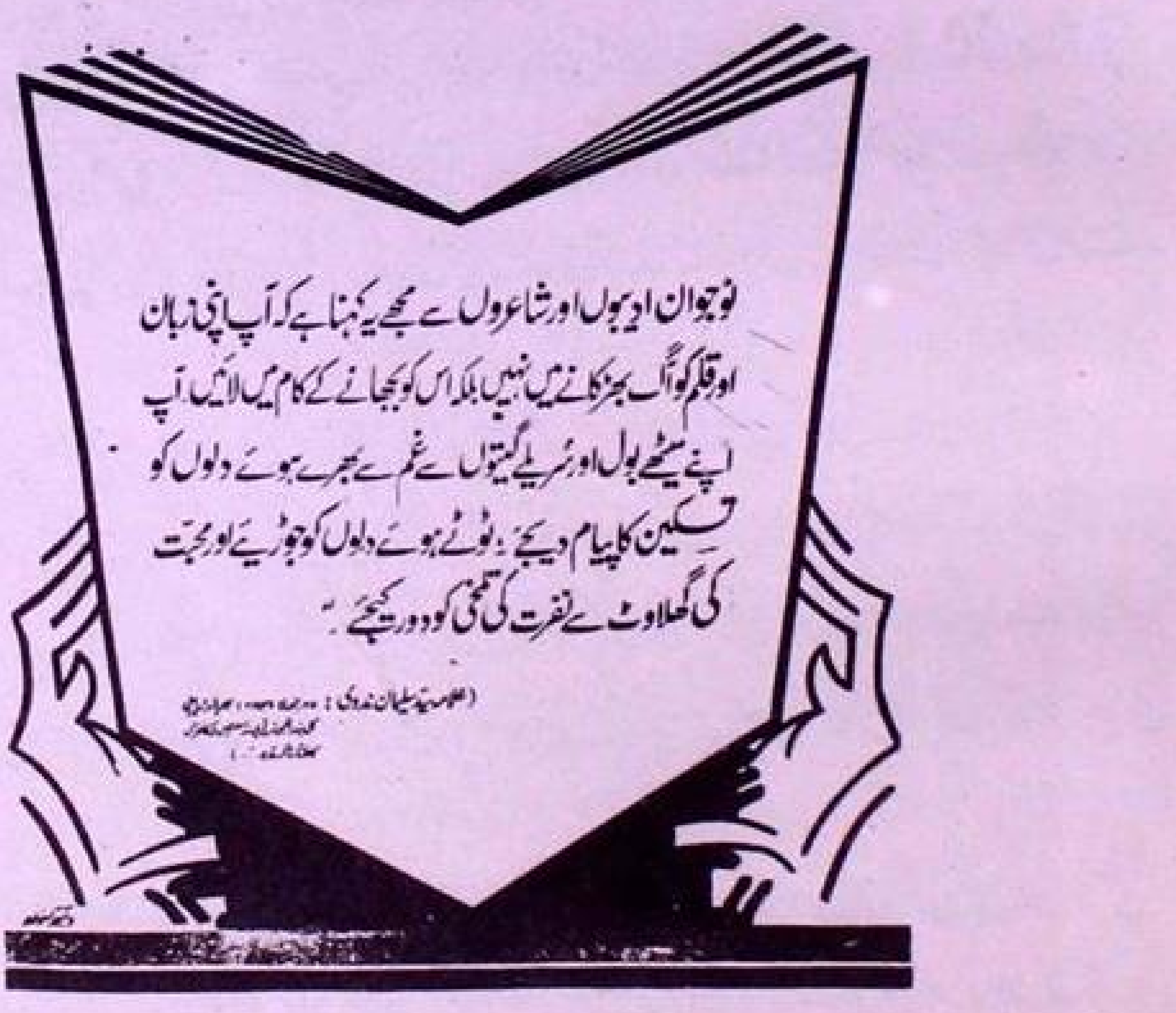

”نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ اپنی زبان اور قلم کو آگ بھڑکانے میں نہیں بلکہ اس کو بجھانے کے کام میں لائیں۔ آپ اپنے میٹھے بول اور سُریلے گیتوں سے غم سے بھرے ہوئے دلوں کو تسکین کا پیام دیجئے۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑیئے اور محبت کی گھلاوٹ سے نفرت کی تلخی کو دور کیجئے۔“

(علامہ سید سلیمان ندوی: [illegible]

لہ مولانا سید سلیمان ندوی: نقوش۔ خطوط نمبر، بابت اپریل، مئی ۱۹۶۸ء

محمد فضل الرحمٰن ندوی★

مکاتیب سلیمانی

علمی و ادبی نکات

۱ علامہ سید سلیمان ندوی کے خطوط اور مراسلات جو وقتاً فوقتاً دوستوں، ہم نشینوں، شناساؤں، معاصروں، اور شاگردوں کو لکھے گئے ہیں، ان کی جولانی طبع، فکر کی گہرائی، سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی مسائل کی سوجھ بوجھ اور فکر و تدبر کے زاویہ ہائے رنگارنگ کو پیش کرتے ہیں۔ ان تمام پر مستزاد ان کا وہ رنگ جو علمی و ادبی گہرائیوں کا امیں ہے، اہل نظر استفادہ کی خاطر سینوں سے لگاتے ہیں۔ چونکہ فطرت میں تحقیق و تدقیق کا مادہ بھرا ہوا تھا اس لئے ان کے نجی خطوط میں بھی یہ رنگ بڑے آب و تاب کے ساتھ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ مورخ، محقق، لغوی، محدث، مفسر، کلامی، جغرافیہ داں، ناقد، ادیب، نثار، شاعر، سیاسی رہنما، معاشی معاشرتی مفکر اور مزید برآں متقی مسلمان صوفی بزرگ تھے۔ اس لئے ان تمام صفات کی جھلک ان کے خطوط میں بدرجہ اتم ملتی ہے۔ مگر ان سب صفات میں علمی و ادبی رنگ نمایاں حیثیت کا مالک ہے۔ اس لئے ہماری توجہ اس طرف مبذول ہوئی۔

سید صاحب کے شائع شدہ خطوط کے تین مجموعے "برید فرنگ" (کراچی ۱۹۵۱ء)، "مکاتیب سلیمان" بنام مسعود عالم ندوی (لاہور ۱۹۵۴ء) اور "مکتوبات سلیمانی" بنام مولانا عبد الماجد دریابادی (لکھنؤ ۱۹۶۳ء و ۱۹۶۴ء) ہمارے پیش نظر ہیں۔ "معارف" (اعظم گڑھ) اور "نقوش" (لاہور) میں بھی کچھ خطوط شائع ہوئے اور سنا گیا ہے کہ کچھ اور مجموعے ادھر پاکستان میں شائع ہو کر شائقین کے ہاتھوں تک پہنچے ہیں جو فی الحال ہماری دسترس سے پرے ہیں۔

سید صاحب کے جملہ علمی و ادبی کارناموں میں نمود و نمائش کے لئے کوئی جگہ نہیں نکل سکتی تھی۔ ان کا مطمح نظر اپنے لئے اور دوسرے متعلقین کے لئے بھی ہمیشہ علم کی بازیافت رہی ہے۔ چنانچہ یہ خطوط بھی آپ بولتے ہیں کہ

★ شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

صاحب رسائل نے علمی کھوج میں بہت دور دور تک سیر کی ہے اور دریائے معانی میں غوطے لگا کر در شہوار کا پتہ لگایا ہے۔ ایسی منزلوں کے نشان سید صاحب کے خطوط میں بہت ملتے ہیں، کچھ آپ بھی مشاہدہ کریں۔

ٹھوس علمی کام: مسعود عالم ندوی مرحوم افق علم وفضل کے ایک ابھرتے ہوئے روشن ستارے تھے اور اپنی کم عمری ہی میں اعلیٰ عربی دانی کا سکّہ جمادیا تھا۔ انھوں نے ہفتہ وار "العرب" (فلسطین) میں ہندوستانی سیاسیات سے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ سید صاحب کو یہ روش پسند نہ آئی، طلب علم وفضل کے ابتدائی دور میں چھپنے چھپانے کے کام سے طبع رواں کو روک لگ جاتی ہے اور بسا اوقات خود پسند طبیعت دھوکے میں پڑ جاتی ہے۔ اس لئے اس عزیز شاگرد کی ابھرتی صلاحیتوں کو کسی خطرے میں پڑنے سے پہلے سید صاحب آگاہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ذہن نشین کرا رہے ہیں کہ اس سے تمہاری علمی نمو رک جائے گی اور وہ تربیت جو اس علمی رسالہ کے اجراء سے مقصود ہے، حاصل نہ ہو سکے گی۔ مکتوب ۲۴ میں لکھتے ہیں: "ابھی سے مصر و شام میں حصولِ نام کی سعی میں اپنے پرچہ کے کاموں سے تساہل! آپ کی طبع رواں کو بھی نقصان پہنچے گا۔ دنیا میں صرف پالیٹکس ہی کوئی چیز نہیں، ابھی تک آپ نے خود "الشعر الجاهلی" کے علاوہ "الضیاء" میں کوئی مضمون لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ابھی راستہ منزل کا دور ہے۔ ابھی سے کمر کھولنے کی تیاری ہلاکت ہے۔"

خط ۲۵ میں سید صاحب کا تیور بدلا ہوا ہے۔ اپنے عام دستور کے خلاف طرز تخاطب بدل دیتے ہیں۔ دعائیہ تخاطب کی جگہ صرف "مولوی مسعود عالم صاحب" کے ذریعہ خطاب ہے، اس میں قدرے اجنبیت کا اظہار ہے جس سے حساس طبیعت کو جگانا مقصود ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ مسعود صاحب نے مولوی احمد علی لاہوری کے پاس جا کر قرآن کے کم مدتی درس میں شرکت کا اظہار کیا تھا اور یہ خواہش علی میاں کی زبانی اس درس کی تعریف سنکر ہوئی تھی۔ اس سے سید صاحب کو مسعود صاحب کی کج فکری کا شبہ ہوا اور اس کی اصلاح کے لئے بڑے بلیغ انداز میں قرآن کی جزرسی اور نکتہ رسی کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے گہرے مطالعہ کا شوق دلاتے ہیں تاکہ اصل روح ذہن وفکر میں پیوست ہو، لکھتے ہیں: "آپ لاہور مولوی احمد علی کے پاس جا سکتے ہیں۔ مگر میں قیاس کرتا ہوں کہ ان کا قرآن سیاسی ہے۔ آپ مولوی علی صاحب سے دریافت کر لیجئے۔ اگر جاتے تو اچھا ہوتا، علاوہ درس کے، لوگوں سے آپ کی ملاقات کا دائرہ وسیع ہوتا۔"

اس قسم کے پرخلوص مشورے اور جنچے تلے انداز میں صائب رای مولانا دریابادی کے سامنے بھی پیش کئے گئے بلکہ تکرار اور اصرار کے ساتھ۔ فرق صرف مرتبت اور طبائع کا ہے۔ اول اول دریابادی صاحب کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہ تھا مگر ان کے سیماب طبع میں جو ذہانت اور علمی جستجو کا عنصر تھا اس کے پیش نظر سید صاحب ہمیشہ اس کے خواہاں رہے کہ یہ ضائع نہ جائے۔ ان کو اس طرح کے مشورے دیئے کہ ان کے حساس طبع کو ٹھیس نہ لگے پھر

صحیح رہنمائی بھی ہو جائے۔ بات اس انداز میں کہیے کہ نہ سبک سار ہو اور نہ گراں بار۔ ایسے وقت انکسار طبعی کے ساتھ ساتھ یقین محکم کا پہلو بھی نمایاں ہوتا۔ سید صاحب یورپ کے سفر پر ہیں۔ مغرب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کی گربہ چشمی واضح ہو چکی ہے۔ ان کی عیارانہ اور شاطرانہ چالوں کا ذاتی مشاہدہ اور معائنہ بھی ہوا ہے۔ پھر ان کی صدائے امن کے برگِ خشیش سے نشہ کیسے چڑھتا! دریابادی صاحب ایک مدت سے مغرب کے دیئے ہوئے آوازہ کو رٹ رہے تھے۔ سید صاحب یورپ جانے سے پہلے بھی اس دھوکے سے ان کو نکالنا چاہتے تھے اور اب بھی باصرار آنکھیں کھولنے کے لئے جھنجھوڑ رہے ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں یوں مخاطب کرتے ہیں: السلام علی مبلغ السلام۔ پھر اس کے ذیل میں لکھتے ہیں: "آپ نے اپنے عنایت نامہ میں اپنے مذہب کی جو تفصیل لکھی ہے مجھے اس سے قطعاً اختلاف نہیں، دنیا میں امن و سلامتی کے دور کا خواہاں مسلمانوں سے بڑھ کر کون ہوگا۔ کمزور قوموں کے لئے تو یہ آواز نوید حیات ہے۔ لیکن میرا کہنا ہے کہ اس آب حیات کی حاجت ستمگر، جفا پیشہ، اپنی قوت و طاقت پر مغرور اور امن و سلامتی کو اپنی تلواروں سے وابستہ سمجھنے والی قوموں کو ہے۔ آپ غریب ہندوستان کی اسپرٹ کو اس امن و سلامتی کے وعظ سے کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟ ہاں یہ ہوگا کہ اس میں زندگی کی جو کچھ بھی روح ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے۔"

یہ خط کاسینو ویشی (فرانس) سے یکم اگست ۱۹۳۰ء کو لکھا گیا تھا جو مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھے گئے خطوط میں ایک طویل خط ہے۔ اس میں مختلف نجی معاملات کے ساتھ ساتھ یہ بتانے کی کوشش ہے کہ آپ جو کچھ "پیام امن" کے عنوان سے پیش کر رہے ہیں اس میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے کوئی گہرائی نہیں بلکہ منافقت ہے اور کمزور قوموں کو بیدار نہیں کرتی بلکہ گمراہ کر کے خوابیدہ کر دیتی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب نے "السلام علی مبلغ السلام" پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ پڑھئے: "میں اس وقت گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد (اہنسا) کا بے طرح قائل تھا اور الحاد کے گرداب سے نکل کر اسلام میں از سر نو داخل ہو کر اسی "گاندھیائی اسلام" کی تبلیغ کر رہا تھا "پیام امن" اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ "ستیہ گرہ اور اسلام" کے عنوان سے ایک انگریزی مقالہ "ماہنامہ ماڈرن ریویو" کلکتہ (غالباً اکتوبر ۱۹۳۰ء) میں لکھا تھا اس میں قابیل کے مقابلہ میں ہابیل کے طرز عمل کو بطور مثال و نمونے کے پیش کیا تھا۔ اور قرآن مجید میں جہاں جہاں "صبر" کے فضائل آتے ہیں، ان سے ستیہ گرہ کی تائید میں استدلال کیا تھا"۔

گہرے مطالعہ اور مسائل کے فہم و ادراک کی گہری صلاحیت پیدا کرنے کی دعوت سید صاحب کئی مرتبہ پہلے بھی دریابادی صاحب کو دے چکے تھے۔ (TO THE NATION) کے ترجمہ کے وقت جو "پیام امن" کے نام سے شائع ہوا تھا اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس میں پال رچرڈ کے ترجمۂ کتاب کے ساتھ ساتھ جو

عالمی امن کا علمبردار اپنے کو کہتا تھا، دریابادی صاحب نے ترجمہ کے شروع اور آخر میں بہت سی قرآنی آیات کو نقل کر کے یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ اسلام بھی عدم تشدد کا قائل ہے۔ چنانچہ سید صاحب نے عینِ اخلاص کے تقاضے سے اس مسلک کی تبلیغ سے روکا ہے اور اس کتاب اور اس خیال کی کم مائیگی کی طرف باصرار اشارے کیے ہیں۔ سید صاحب لندن سے ۱۶ر جون ۱۹۲۰ء کو لکھتے ہیں: "پیام امن" کی نسبت میری رائے وہی ہے جو پہلے تھی، کہ آپ للہ اس میں مذہب کو ہاتھ نہ لگائیں، خواہ وہ مسئلہ جہاد ہو، صحیفۂ الہلال کی طرح آیتوں سے مؤید ہی کیوں نہ ہو۔"

سید صاحب کا ذوقِ تحقیق اور اسلامی فکر مجبور کرتی ہے کہ وہ دریابادی صاحب کو خوش آہنگ الفاظ کے پھندوں میں پھنسنے اور زورِ قلم کے صرف کرنے سے روکے۔ چنانچہ پیرس سے ۲۰ر مئی ۱۹۲۰ء کو دیگر مسائل کے ساتھ "پیام امن" کے گورکھ دھندوں کی قلعی بھی کھولتے ہیں اور چبھتے طنز و تعریض کے انداز میں خطاب کر کے ہوشیار بھی کرتے ہیں۔ یہ لمبا چوڑا خطاب یوں ہے: "محکوم قوم میں پیام امن کی تبلیغ کرنے والے کو سلام"۔ پھر اپنے سفر کی روئداد بیان کر کے لکھتے ہیں: "آپ کا "پیام امن" ہم سپاہیوں کے دلوں کو سرد نہیں کر سکتا۔ میں نے جیسا آپ سے زبانی عرض کیا تھا، پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ کا فلسفہ محکوم قوم کو نہیں حاکم قوم کو درکار ہے گا۔ جو خود ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا۔ میں آپ کے اس خیال سے قطعاً اختلاف کرتا ہوں کہ پیام امن کے دیباچہ میں آپ مذہباً قرآن و حدیث سے اپنے فلسفہ کے اثبات کی کوشش کریں"۔ صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے نمبروار متنبہ کیا ہے پھر تیسرے نمبر پر اس خط میں لکھتے ہیں: "تیسرے میرے خیال میں یہ تحقیق واقعہ کے مطابق بھی نہ ہو گی۔ میں نے یہ کب کہا تھا کہ "دشمن کے مکر و فریب پر لعنت کرتا ہوں"۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ "وہ باطل کے لیے جن ہتھیاروں سے لڑتے ہیں حیف ہے ہم حق کے لیے ان کا استعمال نہ کریں"۔ جو قرآن آپ کے زیر مطالعہ ہے اس میں ڈھونڈھے گا تو یہ آیت بھی ملے گی۔ جزاءُ سیئۃٍ سیئۃٌ مثلھا اور یہ بھی پڑھے گا اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا۔ تلخیص الصحاح کی کتاب الفتن جہاں آپ پڑھتے ہیں، کتاب الجہاد بھی پڑھیے۔ ہم غریب مسلمانوں کو آپ امن کی تعلیم کیوں دیتے ہیں، یہ ان کو دیکھیے جن کی طمع شہنشاہی تمام دنیا میں امن شکن ہو رہی ہے۔"

سید صاحب نے یورپ سے جو خطوط دریابادی مرحوم کو لکھے، اکثر میں "امن" سے متعلق اشارے ملتے ہیں۔

دل شکنی نہیں کی، مگر سرسری مطالعہ سے گزر کر گہرے مطالعہ کی دعوت ضرور دی، بالخصوص قرآن و حدیث سے نتائج کے اخذ کرتے وقت موضوع سے متعلق مختلف آیات اور احادیث کو پیش نظر رکھنے کی تلقین کی ہے کہ اس کے بغیر اخذِ نتائج کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے۔ محتاط پیرایۂ بیان اختیار کر کے سید صاحب نے اپنے ایراد و تلقین کی

دلکشی بڑھادی ہے۔ کبھی "قاصدِ امن کو سلام" لکھا ہے تو کبھی "السلام علی مبلغ السلام" یا "محکوم قوم میں پیام امن کی تبلیغ کرنے والے کو "سلام!" یہ طرزِ تخاطب دل کش ہونے کے ساتھ چونکا دینے والے بھی ہیں اور اپنی اثر انگیزی کو دوچند کر دیتے ہیں۔

علمی گہری نظر: سید صاحب کے پاس مختلف خطوط علمی مسائل کی دریافت کے لئے آیا کرتے تھے، جن کے جوابات میں اختصار کے ساتھ ساتھ علمی گہری نظر کی نمود ہے۔ اس طرح کے مضامین کو بقید عنوان ضروری تشریحوں کے ساتھ مرتب کر دیا جائے تو ایک بڑی علمی خدمت ہوگی۔

مسعود عالم ندوی کو بعض حدیثیں اپنے مضامین کے لحاظ سے کھٹکیں اس لئے ان کو تحقیق و جستجو کی نگاہ سے دیکھا کہ واقعہ کہاں تک درست ہے۔ چنانچہ سید صاحب کی خدمت میں اپنا شبہ پیش کیا اور وضاحت چاہی۔ سید صاحب کا جواب ہے: "جی ہاں یہ دو نجاشی تھے، دیکھو صحیح مسلم جلد دوم: باب کتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم إلی الملوک، پھر بھی یہ واقعہ قابل تحقیق ہے۔"

صحیح مسلم صحاح ستہ کی اہم کتابوں میں سے ہے مگر سید صاحب مطمئن نہیں اور اپنے شاگرد رشید کو مزید تحقیق کا شوق دلا رہے ہیں۔ اسی خط ع۲۸ کے اختتام پر بعض عبارتوں کی وضاحت مسعود صاحب نے سید صاحب سے چاہی اس کا جواب تحقیقی ٹھوس انداز میں دیتے ہیں۔ ایسے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کا مطالعہ کتنا گہرا تھا اور مضامین کس قدر مستحضر، لکھتے ہیں۔ "لقد تأملتُ الطرق الکلامیة الخ یہ عبارت ابن تیمیہ نے اپنی تصانیف میں کئی جگہ نقل کی ہے، مثلاً: کتاب العقل والنقل لابن تیمیه (المسمّٰی بیان موافقة صریح المعقول لصحیح المنقول) برهامش منهاج السنة لہ ۲۵ جلد اول ص۹۰۔ یہ امام رازی کا قول ہے اور ان کی کتاب: اقسام اللذات سے مقتبس ہے علامہ موصوف نے رازی کی عبارت کو اپنے رسائل اور کتاب الرد للمنطقیین میں بھی نقل کیا ہے۔"

تحقیق کا یہ رنگ سید صاحب کی زندگی کا بڑا گہرا رنگ ہے جو شروع سے اخیر تک ان کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے سید صاحب کو لکھا کہ مولانا حمیدالدین صاحب کی کتاب اسباق النحو پر مولانا علی حیدر نظم طباطبائی کا تبصرہ آیا ہے جس میں لفظ اسباق پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ لفظ اسباق عربی نہیں بلکہ عجمی یا ہندی جمع ہے، بلکہ "سبق" بھی اس معنیٰ میں عربی نہیں، صحیح درس یا دروس ہونا چاہیئے۔ طباطبائی کا دوسرا اعتراض اس کتاب کے فقرہ: فَرَسٌ نفیسٌ پر تھا کہ یہ کوئی عربی محاورہ نہیں خالص ہندی ہے۔

سید صاحب مجال خط کے تنگ ہونے کے باوجود جس اختصار سے نکتہ آفرینی کرتے اور اپنی تحقیق کو پیش کرتے ہیں وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ اس سے زیادہ صاحب قاموس اور لسان العرب والے بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ انھوں نے شواہد و دلائل کی روشنی میں اپنی بات رکھی ہے جن کا جوہر سید صاحب پیش کرتے ہیں۔ مگر سید صاحب تحقیق کے مغربی انداز میں بات اس طرح رکھتے ہیں کہ تاریخی لحاظ سے اس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جواب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا دریابادی نے لغت سے مراجعت کی تھی اور نظم طباطبائی کے قریب ہمنوا تھے۔ سید صاحب نے مکتوب ۵۵ میں یہ جواب دیا ہے: "اسباق کا لفظ آپ لغت میں ڈھونڈتے ہیں، عربوں میں تعلیم کہاں تھی جو اسباق کا مفہوم اور اس کے لئے لفظ ان کے وہاں ہوتا۔ یہ عجمی استعمال ہے اور عربی کتابوں میں بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ شرحِ وقایہ کے مقدمہ میں بھی ہے۔ فرشؔ نفیسؔ والا اعتراض بھی مہمل ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ (سبق) اس معنیٰ میں عربی زبان میں مستعمل نہیں جس معنیٰ میں عربی مدارس میں عام طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ اُردو میں ایک متعین کیا ہوا کتاب کا حصّہ جو طالب علم ایک خاص وقت میں استاد سے پڑھے اور یاد کرے اس کو سبق کہتے ہیں۔ محاورہ میں وہ کام جو عبرت اور تنبیہ کا باعث ہو سبق دینے اور لینے کے نام سے زبان زد ہو گیا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔ صاحب لسان العرب اس کی یوں تشریح کرتے ہیں کہ سبقٌ دوڑ میں آگے بڑھنا یا کسی بھی کام میں آگے نکل جانے کا مفہوم رکھتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے لهٗ فی کل امرٍ سُبقةٌ۔ جمع اسباق اور سوابق آتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: أنَا سابِقُ العربِ یعنی الی الإسلام وصہیبٌ سابق الرُّوم یعنی میں اسلام کے معاملہ میں عربوں میں آگے ہوں اور صہیب رومیوں میں جو گھوڑا گھوڑدوڑ میں آگے نکل جائے وہ سابق اور سبوق کہلاتا ہے جیسا کہ فرزدق نے کہا ہے:

من المحرزینِ المجدَ یوم رهانهٖ ۔۔۔ سبوقٌ إلی الغایاتِ غیرِ مُسبَّقِ

فقہی اصطلاحات سے بحث کرتے ہوئے لفظ مسابقت پر بھی گفتگو کی ہے جس کی فقہا تین قسمیں قرار دیتے ہیں۔ قرآن کی مختلف آیات سے استدلال کر کے ان کے معنیٰ مراد کو سامنے رکھا ہے۔ إنَّا ذَهبنَا نستبِقُ (سورۂ یوسف ۱۷) واستبَقَا البابَ یعنی تسابقا الیه (سورۂ یوسف ۲۵) جہاں باہمی عمل کا معاملہ ہے۔ اسی طرح قرآن میں دوسری جگہ ہے: واستبِقوا الخیرات ای بادروا الیها (البقرہ ۱۴۸) اس سے نیک کاموں میں آگے بڑھنے کی وضاحت ہوتی ہے۔ الازہری کے قول سے جیسا کہ صاحب لسان نے نقل کیا ہے تین مختلف معنی نکلتے ہیں۔ تیسرا معنیٰ یہ ہے جو قرآن کی اس آیت سے مستناد ہے: وَلَو نشاءُ لطمَسنا علی اعیُنِهِم فاستبقوا الصراطَ فانّٰی یبصرون۔ معناه فجازوا الصراط (سورہ یٰسین ۶۶)۔

سید صاحب نے جو نکتہ پیش کیا ہے وہ قیاس مع الفارق نہیں بلکہ تشریحات بالا پر مبنی ہے اور جو ان کا

اضافہ ہے وہ ان کا تبحر علمی اور طرزِ تحقیق کی گیرائی ہے۔ ان تمام مفہوموں میں تطابق دے کر مافی الضمیر کو ادا کرنے کا نادر طریقہ اپنایا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ "عربوں میں تعلیم کہاں تھی جو اسباق کا مفہوم اور اس کے لئے لفظ ان کے وہاں ہوتا" یعنی جہاں میدان مسابقت ہے اس میں انھوں نے پیش قدمی کی مگر ہم درس ساتھیوں میں مسابقت کا مفہوم کہاں سے آسکتا تھا جبکہ تعلیم کا رواج ہی نہ تھا۔ اس لئے عجمیوں نے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر درس میں آگے بڑھنے کا مفہوم نکالا ہے کہ ایک طالب علم دوسرے طالب علم کے مقابلہ میں استاذ سے استفادہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک متعین حد میں جو کوشش ہوتی ہے وہ اس کے لئے "سبق" ہوا۔ یہ خالص مغربی طرزِ استدلال مشرقی رنگ میں ہے اور یہ بات اس انداز میں "لغات جدیدہ" کا مصنف ہی کہہ سکتا تھا۔ ایسے بہت سے الفاظ عجمیوں نے اصل مفہوم کو پیش نظر رکھ کر عربی شکل کے بنائے ہیں، ان میں لفظ "تنقید" بھی ہے جو صورتاً عربی زبان کے ادبا میں رواج پذیر نہیں۔ اب تو عربوں نے بھی نئی ثقافت کے اثرات سے لغاتِ عرب کو نئے معنیٰ پہنائے ہیں جس کی مثالیں چند نہیں بہت ہیں۔

ایک بات اور بھی اہم ہے جو نفسیاتی ہے۔ اس خط کے مخاطب مرحوم دریابادی ہیں اور بعض اشاروں اشاروں میں یہ بتانا مقصود ہے کہ لفظ عربی ہے مگر ضرورت کے تحت اس کے مفہوم کو باقی رکھتے ہوئے معنیٰ مراد ے استعمال کا میدان وسیع کیا گیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ فقہا نے بھی اس لفظ کے معنیٰ میں وسعت دیکر قدیم جاہلی مفہوم میں توسع پیدا کیا ہے۔ پھر عجمیوں نے آگے بڑھ کر مفہوم میں مزید اضافہ کیا (چنانچہ شرح وقایہ کے مقدمہ میں بھی ہے) یہ کہہ سید صاحب ایک ذہین بلند پرواز سمجھ کی تشفی کا باعث ہوئے اور دبی زبان میں یہ اقرار بھی کیا ہے کہ لفظ "درس" کا استعمال اصلاً عربی مزاج کے مطابق ہے۔

اسی طرح "فرشِ نفیس" والا اعتراض بھی مہمل ہے" کہ کر سید صاحب اصل حقیقت کی طرف بڑا بلیغ اشارہ کرتے ہیں اور اس بات کی تردید کر دی جو عام طور پر اردو داں نفاست کے ساتھ نزاکت کا مفہوم بھی باہم آمیز کر دیتے ہیں۔ صاحب لسان نے لکھا ہے: "(شیءٌ نفیسٌ) یُتَنَافَسُ فیہ ویُرغَبُ۔ نفیس وہ ہے جس کے حاصل کرنے کی خواہش ہو اور وہ شے دل کو بھائے، اور نَفُسَ الشیءُ بالضم نفاسۃً فھو نفیسٌ ونافسٌ رَفُعَ وصار مرغوباً فیہ۔ باب کَرُمَ سے عام طور پر فعیل کا ہی اسم فاعل آتا ہے لیکن عربوں کے وہاں نافس بروزن فاعل بھی مستعمل ہے جس کے معنی ذی شان اور بلند ہونے کے ساتھ دل پسند ہونا بھی شامل ہے۔ نفیس کی جمع نفائس آتی ہے اور بولتے ہیں انفس الشیئ صار نفیساً۔ کسی چیز کا اچھا اور دل پسند ہونا۔ محاورے میں ہے ھٰذا انفس مالی یعنی میرمال میں یہ بہتر مال ہے۔

الفاظ ومعنیٰ کی کنہیات پر سید صاحب کی بڑی گہری نظر تھی۔ ایسے نکتے ان کے خطوط میں بے شمار ہیں۔ اس

مکتوب کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ چار وقت کے ممتاز ذی علم افراد سے متعلق ہے۔ یعنی مولانا حمید الدین فراہی مصنف کتاب، مولانا حیدر نظم طباطبائی معترض، مولانا عبدالماجد سائل اور مولانا سید سلیمان ندوی مجیب۔ یہ سب اپنے علم و فضل کے ساتھ وقت کے مشہور علماء میں ہیں اور مؤخر الذکر تو اردو کے رمز شناس ادیب بھی جو صحت الفاظ کی تحقیق و جستجو کے رسیا تھے۔

ذیل میں ایک اور مثال پیش ہے، یہ ہے دریابادی صاحب کو ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کا لکھا ہوا خط جو کئی علمی نکتے سامنے لاتا ہے۔ اس وقت سید صاحب ۲۸ر سال کے نوجوان تھے اور طالبِ علمی کی عام منزلوں سے گذر کر قلم دان علم و فضل کی وزارت پر فائز تھے اور "الہلال" کلکتہ کے دفتر میں نیابت کے فرائض مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے اصرار پر مئی ۱۹۱۳ء سے انجام دے رہے تھے۔ ان دنوں دریابادی مرحوم کی کتاب "فلسفۂ جذبات" کا ایک باب "حظ و کرب" کے عنوان سے مولانا ابوالکلام کی فرمائش پر "الہلال" میں شائع ہوا تھا۔ مولانا نے اس پر نوٹ لکھ کر کہ PLEASURE کا ترجمہ لذت ہے اور PAIN کا ترجمہ الم ہے نہ کہ کرب، شاملِ اشاعت کر دیا۔ دریابادی صاحب نے اس کا جواب لکھا اور الہلال میں ایک طویل اور تلخ سلسلۂ بحث شروع ہو گیا۔ دریابادی صاحب نے سید صاحب سے دریافت فرمایا کہ ان کی ذاتی تحقیق اور رائے اس سلسلہ میں کیا ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

"یقیناً قدیم اور محفوظ زبانِ عرب میں حظ بمعنی مسرت اور شادمانی نہیں آیا ہے۔ لیکن تطور و تقلب سے زبان بھی خالی نہیں جیسا کہ علم الالسنہ میں محقق ہے۔ حظ کے اصلی معنیٰ بہرہ اور حصّہ کے ہیں۔ اس کے بعد بہ معنی قسمت مستعمل ہوا جیسا کہ اس کے مرادف الفاظ مثلاً "نصیب" اور "قسمت" وغیرہ مستعمل ہیں کہ ان کے اصلی معنیٰ درحقیقت حصّہ کے ہیں۔

اور آج کل عام طور سے سوء الحظ اور حسن الحظ بولتے ہیں۔

فارسی میں بھی حظ بہ معنیٰ قسمت و تقدیر آیا اور یہیں سے مخصوصاً حسنِ قسمت و تقدیر میں مستعمل ہو کر خوشی و مسرت کے معنیٰ میں آگیا اور اس پر صائب کا وہ مصرع دال ہے جس پر الہلال کا عمل ہے، یعنی! .... حظوظ نفس کے یا بد"

یہ طویل اقتباس یوں دینا پڑا کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ سید صاحب الفاظ کے سفر معنی و مراد کے پیچ و خم سے کیسی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ اور اس کے نشیب و فراز کو دوسروں کے سامنے وضاحت سے رکھ بھی سکتے تھے۔ مولانا شبلی ابھی بحیات تھے۔ مگر تحقیق کا رنگ حالیہ علم الالسنہ کے مطابق ہے اور شبلی کے طرزِ اصابت رائے کے ساتھ جو مشرقی طرز کا ہوتا تھا، مغربی محققین کے زینہ بزینہ آگے بڑھنے کے اصول کو اپنا کر مغربی رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ رنگ جو سید صاحب نے شروع میں اختیار کیا تھا دم واپسیں تک شوخ تر ہوتا گیا۔ چنانچہ ان کی ذات نے جہاں بھی داد تحقیق دی ہے علم و فضل کا رنگ اور بھی شوخ ہو گیا ہے۔

اس خط میں وضعِ اصطلاح اور معنیٰ مراد کی گفتگو بھی چھیڑی گئی ہے۔ مولانا عبدالماجد کو علم نفسیات کے موضوع سے متعلق کچھ باتیں پوچھنی پڑیں۔ آپ غور فرمائیے اس وقت تازہ بتازہ کچھ مغربی علوم اردو میں منتقل ہو رہے تھے اس لئے اصطلاحات کو متعین کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ سید صاحب لکھتے ہیں: "نام کو در حقیقت دو صفت کی ہی نہیں، تین صفت کی ضرورت ہے نفسی[1] (یعنی متعلق بنفس) نفسی[2] (یعنی متعلق علم النفس) اور نفسی[3] (یعنی عالم علم النفس) انگریزی میں جہاں تک مجھے علم ہے اول اور دوم کے لئے ایک لفظ ہے یعنی NATURE اور NATURAL دونوں کے لئے بلا امتیاز، اور تیسرے کے لئے NATURALIST۔ بس عربی میں بھی (مراد اردو میں عربی لفظ کے استعمال سے ہے) اول و دوم کے لئے بلا امتیاز ایک ہی لفظ رکھئے۔ امتیاز اس طرح پیدا ہوگا کہ علوم و فنون میں جب "نفسی" کا لفظ آئے گا تو دوسرے معنیٰ سمجھے جائیں گے اور عام گفتگو اور ادب و لغت میں اول، جیسا کہ خود انگریزی میں ہے۔ اور تیسرے معنیٰ کے لئے نفسیاتی اور طبیعاتی رکھئے کہ "عالم علم النفس" یا "نفسیات داں" بڑا لفظ ہے، آپ کے عربی داں دوست کی تحقیق صحیح ہے۔ لیکن آج کل پیشہ کے لئے، جیسا کہ میں نے کہا ہے، نفسیاتی کو عالم علم النفس کے معنیٰ میں لیتا ہوں۔ یعنی دوسری صدی سے گھڑی ساز کو ساعاتی لکھتے ہیں جو ساعۃ بمعنی وقت کی جمع اور پھر منسوب ہے۔"

یہ دوسری بات ہے کہ علم نفسیات کے عالم کو نفسیاتی لکھنے اور کہنے کا رواج نہ ہو سکا۔ مگر سید صاحب کا یہ علمی نکتہ اہم ہے اور صرف منطقی قیاس نہیں بلکہ ایک علمی قیاس اور استحسان ہے جو محدثین اور فقہائے اسلام کی ذہانتوں اور دیانتوں کے طفیل اسلامی علم و ادب کو حاصل ہوا پھر اس کے طفیل دنیا روشناس ہوئی۔ اس کی دلیل سید صاحب نے واضح طور سے دی کہ ساعت بمعنی گھڑی اور ایک اوزار اور اس کی مرمت کرنے والا یا بنانے والا ساعاتی کہلایا۔ اسی طرح نفس سے متعلق حرکات و سکنات اور رموز کا ماہر اور اس کا طبی طور پر علاج کرنے والا بھی نفسیاتی کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سید صاحب نے نزاکتِ زبان اور علم و لغت دونوں کو اپنے مشورے میں سامنے رکھا ہے۔ مگر رواج خود زبان کا ایک پارکھ ہے اس لئے جو رواج پا جائے اگر صریح اور فاحش غلطیوں پر مبنی نہ ہو تو اس کے اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

سید صاحب اپنی گہری نظر کے باوجود دوسرے کے مشوروں کو اگر صحتِ ذوقِ سلیم پر مبنی ہوں تو فراخ دلی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ ظفر حسن خاں بی۔ اے مرحوم نے جو بعد کو خان بہادر ہوئے اور انسپکٹر آف اسکول رہے پھر شیعہ کالج، لکھنؤ کے پرنسپل بنے، عربی قاعدہ کے لحاظ سے "یات" لگا کر فنون میں جمع اور کثرت کے اظہار کی تجویز رکھی تھی خط کے اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اس وقت "علم نبات" "علم حیات" اور "علم طبیعی" وغیرہ فنون کے لئے کہنا اور لکھنا زیادہ مناسب سمجھتے تھے مگر ظفر صاحب کی تجویز

پر ان کے ہم نوا ہو گئے۔ سید صاحب مکتوب ۲ میں لکھتے ہیں: "اصول اول یعنی "یات" اور "علم" کے الحاق و اضافے میں متفق ہوں اور یہی جواب میں نے مسٹر ظفر کو دیا ہے۔ آئندہ اس کی اصلاح کر لوں گا۔" یہ تھی سید صاحب کی خواہش اور کوشش کہ فرد اور جماعت دونوں اپنی جگہ پر تنہا اور مل کر علم و فضل کی رفعت اور شان بڑھانے کی کوشش کریں۔ ان کا یہ نظریہ زندگی کے دیگر میدانِ کار میں بھی وسیع المشرب ہے۔

علمی مدافعت: استاذ الاساتذہ مولانا شبلی کی جو نمایاں خصوصیت علمی مدافعت کی تھی ایک ممتاز خوبی کے طور پر سید صاحب کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ اس کی تراوشیں مدۃ العمر آپ کے قلم سے جاری رہیں۔ عقلِ سلیم اور مثبت دلائل کی روشنی میں اسلام کی علمی مدافعت کا جب بھی موقع ہاتھ آیا اس سے یہ غافل نہ ہوئے اور سپاہیانہ انداز میں سینہ سپر ہو کر سامنے آئے۔ ۱۹۱۵ء کا زمانہ ہے دریابادی مرحوم ڈرامہ نویسی کے دور سے گذر رہے ہیں۔ شیکسپیر کے دلدادہ اور شیدا ہیں۔ انھیں ایام آغا حشر کاشمیری اپنی تھیٹریکل کمپنی لے کر لکھنؤ وارد ہوئے۔ دریابادی صاحب نے بھی ایک ڈرامہ جھٹ تیار کر لیا اور ان سے پینگیں بڑھا کر فروغِ فن کے لئے شریک و سہیم ہو گئے۔ سید صاحب سے اس فن کی عربی اصطلاحات میں استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ سید صاحب نے ۸ مئی ۱۹۱۵ء کے خط میں جواب لکھ بھیجا تھا: "الفاظ مسئول کے لئے مصر میں "تمثیل" ہی کا لفظ ہے۔ "فن تمثیل" THEATRE ACTING کے لئے نہایت کثرت سے مستعمل ہے۔ اسی طرح ایکٹر کے لئے "مُمَثِّل"، اسٹیج کو مَرْسَح اور مَنَصَّۃ کہتے ہیں۔ لفظ منصّۃ قدیم ادب میں بھی مستعمل ہے، مثلاً مَنَصَّۃ قدرت، مَنَصَّۃ ظہور۔ اس لفظ کے حقیقی معنیٰ وہ بلند چبوترہ جس پر عروس رونما ہوتی ہے۔

ٹریجڈی اور کامیڈی بہت اچھا ہے، بولئے مگر آج کل کی عربی میں "روایۃ حظیۃ" اور "روایۃ حزینۃ" شاید دیکھا ہے۔"

اس کے بعد جو خط یکم جون ۱۹۱۵ء کو لکھا گیا تھا وہ دریابادی صاحب کے اس خط کے جواب میں ہے جس میں فن ڈرامہ کے متعلق کچھ کہا گیا تھا۔ اس کو سید صاحب نقل کرتے ہیں: "یورپ سے صدا اٹھی ہے کہ مسلمانوں نے فن ڈراما کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ سارے عربی لٹریچر میں صرف ایک ڈرامہ کا پتہ چلتا ہے جو صلاح الدین کے وقت میں تصنیف ہوا تھا۔ درحقیقت مسلمانوں کے عقیدۂ تقدیر نے ان میں نہ سنس آف ٹریجڈی پیدا ہونے دیا اور نہ سنس آف کامیڈی، اس لئے اکثر فنون لطیفہ کی طرح وہ اس فن سے بھی نابلد رہے۔"

سید صاحب نے اس جہل مرکب مزعومات کا بڑا علمی، تاریخی اور نکتہ آفریں جواب، پوشیدہ زہر کا تریاق بڑے موقع اور اختصار کے ساتھ رکھا ہے۔ اول تو اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس فن سے

دلچسپی نہیں لی جو ایک تاریخی حقیقت ہے مگر کیوں نہ لی اس کے وجوہات بھی بیان کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کیوں یورپ ان کے ہوا خواہ اور ہمنوا ایسی بات کرتے ہیں اور کہتے ہوئے علم و اخلاق کی تمام حدیں بے تکلف پھلانگ جاتے ہیں۔ دریابادی صاحب کو مخاطب کرکے ارشاد ہے:

"غور فرمائیے کہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے کتنی توبہ تو اور مسلسل دروغ بیانیاں کی گئی ہیں۔ تقدیر کا اعتقاد صرف اسلام کے لیے مخصوص کرنا تاریخ مذاہب سے جہل کا ثبوت ہے اور نہ صرف تاریخ مذاہب سے بلکہ فلسفۂ قدیم سے بھی۔ جہاں کہیں بھی علۃ العلل یا خدا کا وجود ہے یہ مسئلہ موجود ہے۔ یہودیت، عیسائیت، ہندوئیت کہاں تقدیر کا اعتقاد نہیں، پھر کیا اس اعتقاد سے "حظ والم" کا احساس مٹ گیا۔ کیا انسان کے فطری جذبات مسرت وغم ناپید ہوگئے؟ کیا مسلمان خوشی اور رنج سے محروم ہیں؟"

سید صاحب نے "حظ والم" سے دریابادی مرحوم کے مضمون کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا اس پر گفتگو کرتے وقت سید صاحب نے لغوی اور ادبی نکتہ آفرینیوں کے ڈھیر لگا دیے تھے اب نفس مضمون پر اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ غیر ذمہ دار لوگوں کی بڑی سخت گرفت کی ہے جو علم و فضل کا دعویٰ تو رکھتے ہیں مگر تاریخ علم سے ناواقف ہیں کہتے ہیں: "پھر یہ کہنا کس قدر مضحکہ انگیز ہے کہ "اس لئے اکثر فنون لطیفہ کی طرح وہ اس فن سے بھی نابلد رہے" عجب استدلال کا یہ عجیب تر نتیجہ ہے۔ فنونِ لطیفہ کے فروع میں، موسیقی، شاعری، مصوری، تعمیر وغیرہ ہیں۔ کیا ان میں سے کسی کو مسئلہ تقدیر کے اعتقاد سے کوئی ادنیٰ مناسبت ہے؟ کیا اس اعتقاد کا یہ نتیجہ ہوگا کہ معترفِ تقدیر، شاعر، مصور، اور معمار نہ ہو سکے؟ العجب!"

سید صاحب کی گرفت بڑی سخت ہے، موسیقی، شاعری، مصوری یہ تمام کے تمام فنون لطیفہ میں داخل ہیں۔ مسلمانوں نے شاعری میں بڑا رتبہ حاصل کیا ہے۔ فنِ تعمیر میں ایک سے ایک بڑھ کر یادگاریں چھوڑی ہیں جنھیں دیدہ حیرت سے دنیا دیکھتی ہے۔ موسیقی میں بھی مسلمانوں نے اختراعات کیے مگر ایک حد میں رہ کر، یہی حال مصوری کا ہے کہ انھوں نے اسلامی روح کو سامنے رکھ کر کمال فن دکھایا۔ ہاں مسلمانوں نے مجسمہ سازی سے ضرور احتراز کیا جس کو سید صاحب نے تاریخی حقیقت کے طور پر ان الفاظ میں پیش کیا ہے: "بے شبہ مسلمان مجسمہ سازی کو مذہبًا جائز نہیں سمجھتے، اس لیے اس کی طرف توجہ نہ کی تاہم ان کے بنائے ہوئے بعض حیوانی مجسمے موجود ہیں۔" اس کے بعد سید صاحب نفس ڈرامہ پر اظہارِ خیال کرتے ہیں اور ڈرامہ نویسی کو بطور فن نہ اختیار کرنے کے وجوہات پر روشنی ڈالتے ہیں: "ڈراما ایک ملعبہ ہے جو مختلف قسم کے معائب اور قبائح کا مجموعہ ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی تو کوئی عیب نہیں۔ سینکڑوں معیوب فنون ہیں بحیثیت فن جن سے وہ نابلد ہیں۔"

پھر سید صاحب نے اس "جانکاہی" کا ذکر فرمایا ہے جو ڈرامہ نویسی کے سلسلہ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں انجام کار کو پہنچی۔ اس کو تاریخی حیثیت سے قبول نہیں کرتے اور ان کا خیال ہے کہ سلطان کو معتوب کرنے کے لئے یہ بات وضع کی گئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے بتلایا ہے کہ مغربی دانشوروں کے لئے صلاح الدین کا زمانہ عجائب زار ہے۔ اس لئے اس کی طرف ہر قسم کی نسبت جائز سمجھتے ہیں۔ وہ ڈرامہ نویسی کی نسبت کو بھی اپنے اسی واہمہ کی بنا پر قبول کر لیتے ہیں۔ بقول سید صاحب "یہ ملعبہ" اس لئے تسلیم نہیں کہ انسانی فطرت سے میل نہیں کھاتا۔ ان کے ذہن میں یہ ضرور تھا کہ ڈرامہ کے افراد اپنی حیثیت اصلی کو مسخ کر کے پردہ سیمیں پر نمودار ہوتے ہیں اور اس کھیل میں انسان کی اصل سعادتمند فطرت مسخ ہو جاتی ہے۔ جس میں مرد زن اور زن مرد کی شکل میں بھی نمودار ہوتے ہیں۔ اس سے بحیثیت مجموعی انسانیت کی توہین ہوتی ہے۔ یا کمسن لڑکوں کا عورتوں کا کردار ادا کرنا یا عورت کا مرد کا کردار دکھانا اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے مسخ شدہ ہے۔ یہ بنیادی بات اگر ذہن نشین ہو جائے کہ ہر جنس کا الگ وظیفۂ زندگی ہے جس کو وہ کمال خوبی کے ساتھ انجام دے تو اس سے بڑھ کر انسانی معاشرہ کی صالحیت کے لئے کوئی دوسری شی موزوں نہ ہو۔ اس لئے سید صاحب کا یہ نکتہ کہ "ملعبہ" ہے اپنے اندر بڑے مضرات رکھتا ہے حتیٰ کہ کج بحثی کے دروازے بھی بند کر دیتا ہے۔ ان باتوں کی وضاحت سید صاحب نے مختصراً یوں کی ہے: "میرا مقصود یہ ہے کہ ایک صحیح دعویٰ کے لئے غلط دلائل و نتائج کا احتیاج کیا ہے"۔

خط اس مقام پر آ کر ختم ہو گیا ہے، مگر سید صاحب کو بعد میں خیال گذرا کہ مخاطب کی شوخ طبعی کو شاید گراں بار ہوا ہو، اس لئے ۴ جولائی ۱۹۱۵ء کو ایک دوسرا خط لکھتے ہیں جس میں آپ رقمطراز ہیں: "ممکن ہے کہ ڈرامہ کا ابتدائی خیال تقدیر سے پیدا ہوا ہو، بہرحال تقدیر کوئی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں"۔ اور یہ بھی اضافہ کیا کہ ڈرامہ نویسی مجموعہ قبائح نہیں لیکن ڈرامہ کاری کی کیا تعریف کی جائے گی جبکہ اس ڈرامہ کاری نے یورپ اور ہندوستان میں بھی جو اثرات ڈالے ہیں وہ ہر شخص جانتا ہے۔ پھر جو بات سید صاحب کی ذات کو بلند کرتی ہے اور ان کے علمی و فکری نکات کو مؤثر بناتی ہے وہ ان کا طرز انکسار ہے کہ آپ لکھتے ہیں: "گذشتہ خط میں اگر اعتدال سے زیادہ کوئی لفظ قلم سے نکل گیا ہو تو عفو طلب ہوں۔ یورپ کے مسلسل اکاذیب اور استلزامات سے وہ برہمی تھے"۔

علمی تربیت: سید صاحب نے علمی تربیت کا بڑا اچھا سلیقہ پایا تھا۔ چنانچہ ان کے مکاتیب میں بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ اشاروں میں مخاطب کو علمی تحقیق کا ایسا ذوق دیتے ہیں جو آئندہ اس کے لئے سرمایۂ افتخار بن جاتا ہے۔ مولانا عبدالماجد گو دوستوں اور ہمنشینوں میں تھے لیکن ڈراما سے متعلق سوال پر ان کی مغرب زدگی کو جھنجھوڑنا مقصود تھا اس لئے ڈراما اور ڈراما نویسی پر

ایک محققانہ تقریر مناسب حال کردی۔ پھر دوسرے خط میں یہ لکھ دیا کہ آپ کی شخصیت سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ مغربی دانشوروں اور صاحبانِ قلم کے غلط دلائل اور نتائج کو سامنے لانا مقصود تھا۔ مگر سید صاحب جب کسی کی تربیت کرنا چاہتے ہیں تو اسی انداز میں گفتگو کرتے ہیں جس سے اس کے اندر تحقیق اور صحیح نتائج کے اخذ کرنے کا شوق پیدا ہو۔ مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم تو نوخیز، ذہین اور گہرے مطالعہ کے آدمی تھے بعض علمی کام ان کے سپرد کرکے ان کے اندر تحقیق کی بنا استوار کرنا چاہتے تھے۔ مکتوب ۱۶ میں ایک عبارت کی نقل طلب کی گئی ہے مگر خط کشیدہ فقرہ کی تحقیق کے ساتھ سلیقہ تحقیق بھی سکھانا مقصود ہے، لکھتے ہیں: "کتب خانہ میں "کتاب الاوائل"... ابو ہلال عسکری کی تاریخ میں ایک کتاب ہے۔ اس میں تاریخ شعر و سخن میں یہ عبارت جہاں ہو یا اس کے ہم معنیٰ وہ نقل کرکے بھیجیے: "اول من نظم الشعر الفارسی ابو العباس بن منوذ المروزی" مخطوط لفظ کو صحیح نقل کیجیے گا۔"

ذیل کا خط ۱۰ اگست ۱۹۳۲ء کا ہے جبکہ "الضیاء" عربی ماہوار رسالہ مسعود عالم ندوی کی ادارت میں نکل رہا تھا۔ سید صاحب بھی ہندوستانی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے چکے تھے اور انگریزوں کی پرفریب سیاست کے بڑے مخالف تھے بلکہ اس کے خلاف عملی جد و جہد میں ترک موالات کے وقت اور خلافت تحریک کی گرماگرمی کے زمانہ میں سرگرم کار رہے تھے۔ مگر عربی رسالہ "الضیاء" دار العروبہ سے نہیں نکل رہا تھا بلکہ ایک عجمی ملک ہندوستان میں عربی علم و ادب کی ضیاپاشی کر رہا تھا، سید صاحب کو یہ خیال گذرا کہ یہ عربی رسالہ اگر اپنے ابتدائی مراحل میں سیاسیات میں الجھ جائے گا تو اس کا وقار مجروح ہوگا اور جس کی ادارت میں یہ نکل رہا ہے اس کو بھی ٹھوس علمی کام کرنے کی تربیت نہیں مل سکے گی۔ لہٰذا اس خط میں تربیت کا علمی نکتہ نمایاں ہے۔ سید صاحب ان الفاظ میں جتا رہے ہیں: "سیاسیات میں میرے خیالات آپ لوگوں سے الگ نہیں، لیکن اگر رسالہ کو چلانا ہے تو اس کو شجر ممنوعہ قرار دینا پڑے گا۔ الخیر کلہ لیس فی السیاسۃ، انما ھو نوعٌ من الخیر فترکہ لیس ترک الخیر کلہ۔" سید صاحب کی یہی محتاط اور میانہ روی ان کو ہر میدانِ عمل میں ممتاز اور کامیاب کرتی رہی۔ چونکہ مسعود عالم ندویؒ حصول آزادی کے نوجوان ذی استعداد مبلغ تھے اس لئے سید صاحب نے ان کے قلم کو عنانِ حکمت و توازن لگانا چاہا۔ اسی خط میں آگے لکھتے ہیں: "علوم و فنون، ادبیات، دینیات، اصلاحِ معاشرت و اجتماع و اخلاق کم وسیع میدان نہیں"۔ یہاں اگر ایک لطیف نکتہ، جو محکوم کی زبردستی کا نتیجہ ہے، فرماتے ہیں: "البتہ غلط سیاست کی تبلیغ و اشاعت سے احتراز لازم ہے۔"

سیاسی مسائل میں علمی نکتہ: مکتوب ۸۹ مختصر ہونے کے باوجود سید صاحب مسعود صاحب

کوئی علمی نکتوں کی طرف دھیان دلاتے ہیں جو آج بھی اپنی افادیت کے لحاظ سے اہم ہیں اور ایک علمی دستاویز کی صورت میں آئندہ بھی یہ خط قابل استفادہ ہوگا۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے ملوکیت کی حمایت میں شاید کچھ لکھ دیا تھا، اس پر مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم نے اپنے خاص انداز میں توجہ دلائی تھی۔ اس میں بتایا تھا کہ ملوکیت اور خلافت میں بڑا بُعد ہے اس لئے ملوکیت کو اسلام میں مستحسن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ مسعود صاحب کے پیش نظر ملوکیت کے مفاسد اور عوام کے حق میں اس کے مضر اثرات پیش نظر رہے ہوں گے اور جس طرح ایک خود سر بادشاہ عوام کی ملکیت میں تصرف کرتا ہے جس کا اسے کوئی حق معاشرہ کی طرف سے نہیں ملا، ان کی تنقید کا ہدف بنا ہوگا۔ ایسے مواقع پر مولانا مسعود عالم بڑے تیز قلم اور تلخ حقیقت نگار ناقد بن جاتے تھے۔ سید صاحب نے اپنی طبعی نکتہ آفرینی کا جس طرح اظہار کیا ہے وہ قابل اتباع اور سبق آموز ہے۔ صرف ایک لفظ "صالحہ" کو بڑھا کر اس سلسلہ کی تمام تلخیوں کو شیر و شکر بنا دیتے ہیں۔ اس خط کے پائیں میں لکھتے ہیں: "ملوکیت صالحہ" مولانا مناظر کا مقصد ہے۔ آپ "ملوکیت فاسدہ" سمجھتے ہیں .... لامشاھۃ فی الاصطلاح معارف کے لئے رد آمریت پر کچھ لکھئے۔"

سید صاحب کی یہ خوبی تھی کہ لوہا گرم ہونے پر ضرب لگاتے تھے۔ چنانچہ مشورے اور ہدایت بھی برمحل دیتے ہیں جو تربیت کا بہترین طریقہ ہے۔ مسعود عالم ندوی نے "اشتراکیت اور اسلام" کی تصنیف کا کام اسی مشورے کے تحت کیا تھا۔ اس طرح کے مشورے اور راہنمائی کے نشان عبدالماجد دریابادی کو لکھے گئے خطوط میں بھی جا بجا ملتے ہیں۔ سید صاحب کے مشوروں نے ان کے مطالعہ کے میدان کو وسیع تر کیا اور زندگی کا رُخ پھیر کر ایک خاص طرف کر دیا۔

ادبی نکتے: سید صاحب کے مکتوبات میں ادبی چاشنی ہمیشہ ملے گی مگر فضول کی عبارت آرائی اور لفظی گورکھ دھندوں میں ان کا قلم کبھی بھی ملوث نہیں ہوا۔ تقریباً نصف صدی تک دریابادی صاحب سے مراسلت اور تعلقات میں ہمواری رہی۔ جوانی کے ایام میں بھی ادبی صنعتوں کو کام میں لانے کے علاوہ ان میں اور کچھ نہیں پائیں گے۔ ان کو آپ فارسی ادب کے اثرات سے موسوم کر سکتے ہیں مگر انھیں ادبی لطافتوں سے محروم نہیں پائیں گے۔ کہیں کہیں تو حرف مطلب کو ادا کرنا اس طرز کے علاوہ ممکن نہ ہوگا اور لفظ و فقرہ کی تبدیلی سے معانی اور رعنائی دونوں میں فرق آپ بیک وقت محسوس کریں گے۔ ان میں تلمیحات، انتقادات، بلاغت کے رموز جیسے مراعاۃ النظیر، بوقلمونی، تجنیس، کلامی ادبی توجیہات جا بجا ملتی ہیں، خصوصاً جب یہ جدید علمی نظریات کے لباس میں پیش کی جاتی ہیں تو بڑی دلکش اور دیدہ زیب ہو جاتی ہیں۔

ذکر ہے مولانا شبلی مرحوم کی وفات کا اور افسوس ہے کہ ایک سال گذر گیا اور کچھ نہ ہو سکا۔ اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ۲۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو جو خط دریابادی مرحوم کو لکھا ہے اس میں مراعاۃ النظیر سے لطیف انداز میں کام لیتے ہیں۔ یہ مختصر جملے معہود ذہنی کو سامنے رکھ کر زبان قلم سے نکلے ہیں۔ منشی رحمۃ اللہ رعدؔ مالک نامی پریس، کانپور کے سپرد سیرت کی طباعت تھی مگر ان کا بھی طریقہ تجارتی تھا کہ امروز فردا میں ٹال رہے تھے، سید صاحب کا اشتیاق ان پر مستزاد۔ مولانا شبلی مرحوم کی یادگار کو تازہ اور زندہ رکھنے کی آرزو، روز افزوں خواہشیں، رعایت لفظی اور مراعاۃ النظیر کے طرز کو اختیار کرنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ لکھتے ہیں: "سیرت رعدؔ کو دی گئی کہ بجلی بن کر کام کریں لیکن وہ پتھر ثابت ہوئے۔ عذرات غیر متناہیہ ہر مہینہ ایک کارڈ پر پہنچ جاتے ہیں۔" اس طرح تلمیح کے ذریعہ سید صاحب اپنے خطوط کو بڑا دلکش بنا دیتے ہیں۔

۱۷ نومبر ۱۹۱۵ء کو دریابادی صاحب کو خط لکھا۔ سید صاحب نے اب پونا سے قطع تعلق کر لیا ہے اور شبلی منزل میں بیرتوڑ کر بیٹھ رہے ہیں۔ یہ دار المصنفین کے ابتدائی ایام ہیں اور فکر دامن گیر ہے کہ کس طرح علماء فضلاء کی ایک جماعت اس جگہ جمع ہو جائے جو خواب کو حقیقت میں بدل دے۔ آپ لکھتے ہیں: "والا نامہ جو پونا کے پتے سے آپ نے لکھا تھا، وہ پونا، بہار، دسنہ، اعظم گڑھ سے گھومتا ہوا مجھے ملا۔ ہاں – PERSECUTION کے لئے اضطہاد آجکل بولتے ہیں۔ اس کے لغوی معنی دباؤ کے ہیں، اردو میں کوئی ایک لفظ تو ملنا محال ہے۔ ترکیبی لفظ سے ادا کرنا شاید ضروری ہوگا۔ لفظ دینی یا مذہبی کو آمیز کیجیے۔" دریابادی صاحب ان دنوں انجمن ترقی اردو کے لئے لیکی کی کتاب (تاریخ اخلاق یورپ) کا ترجمہ کر رہے تھے۔ اس میں یہ لفظ بار بار آرہا تھا۔ اسی کے متعلق دریابادی صاحب کا استفسار تھا اور سید صاحب نے لغوی لحاظ سے اضطہاد کا لفظ بتایا۔

اسی خط کے اخیر میں ایک لطیف طنز بھی ہے۔ البلاغ کلکتہ سے نکل رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اپنی چند در چند مشغولیتوں کی وجہ سے کسی ٹھوس علمی کام کے لئے وقت نہیں نکال رہے تھے۔ سید صاحب ان کی ذہانت اور طباعی کے دبی زبان سے قائل تو ضرور ہیں مگر یہ بھی ہے کہ منزل تو اسی وقت طے ہوگی جب مسافر راستہ چلے اس لئے توقع کے مطابق ان کی تحریروں کو معیاری نہیں پاتے تھے۔ پھر ذہین نچلا کب بیٹھنا چاہتا ہے اس لئے مولانا آزاد نہ دوسروں سے استفادہ کرتے اور نہ کسی کو خاطر میں لاتے۔ سید صاحب تلمیحاً لکھتے ہیں: "البلاغ دیکھا ہوگا، اب تو پہلے سے بھی رنگ زیادہ شوخ ہو گیا ہے۔ علامہ مرحوم کے بعد مشرقی علوم میں اب وہ کس کا ذکر کرتے ہیں۔" آزاد مرحوم نے "الہلال" کے بعد "البلاغ" کلکتہ سے نکالا مگر سیاسی مشغولیتوں کی بنا پر کچھ اور کرنے سے قاصر رہے، اس لئے اس کا رنگ محض صحافتی ہو گیا اور مسلمانوں کے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخی اور ثقافتی زندگیوں سے متعلق جو مضامین لکھے گئے ان میں علمی معیار کو الفاظ کے مقابلے میں کمتر جگہ مل رہی تھی۔ علامہ

شبلی کے یہ بھی شاگرد ندوہ کے قیام کے زمانہ میں رہ چکے تھے اس لئے ان کی زندگی میں بے تکان مشرقی علوم پر لکھنے میں کچھ جھجک تھی وہ ان کی وفات کے بعد دور ہو گئی۔ علامہ مرحوم سے مراد وہی علامہ شبلی ہیں۔

ایک اور لطیف تلمیح ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا دریابادی اپنے جدید فکر کی پریشاں حالی کی وجہ سے کسی مقام پر ٹھہر نہ سکے اور تغیر و تبدل کی راہ پر گامزن تھے اس لئے سید صاحب ان کے تسلسل خیال پر اعتماد نہیں رکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ کسی جدید خیال کے پیدا ہونے سے وہ تسلسل ٹوٹ جائے گا اور پہلا خیال چھوٹ جائے گا۔ چنانچہ ایک بڑے حکیمانہ اور بلیغ انداز میں انھیں ترغیب دے رہے ہیں کہ قرآن مجید کی نفسیات کے بجائے اس کے الٰہیات کی طرف توجہ دیں اور لکھیں۔ دریابادی صاحب نے "نفسیات القرآن" پر لکھنے کا پہلے تذکرہ کیا تھا۔ لیکن کسی خط میں پھر اپنے پرانے خیال کا اعادہ کیا تو سید صاحب لکھتے ہیں: "آپ نفسیات القرآن لکھیے۔ "معارف" نکلا تو وہ "الٰہیات القرآن" کا متحمل ہوگا۔ DICLARATION دے چکا ہوں - CHRISTIAN WORLD نے جس فلسفۂ اجتماع کو ناگواری سے دیکھا، آپ سمجھتے ہیں ISLAMIC WORLD اس کو کس نظر سے دیکھتا ہے اس سے آپ کو اسلام کی فراخ دلی کا امتحان ہوگا۔"

مولانا دریابادی نے "فلسفۂ اجتماع" کا ملخص انگریزی ایڈیشن "لندن" میں - PSYCHOLOGY OF LEADERSHIP کے نام سے چھپوایا تھا اس پر CHRISTIAN WORLD ایک مسیحی ہفتہ وار نے معترضانہ ریویو لکھا تھا اس کی طرف اشارہ ہے۔ آگے مزید لکھتے ہوئے دریابادی کے بعض شبہات کو دور کرنا چاہتے ہیں اور چند سطروں میں الٰہیات کے مسئلہ قضا و قدر کو اس طرح سمیٹ لیتے ہیں، اور ایسی نکتہ آفرینی کرتے ہیں کہ مشکل سے دنیا کے عظیم مصنفین و مفکرین کی صفوں میں چند ان جیسے نکل سکیں۔ اس خط میں "نفسیات القرآن" اور "الٰہیات القرآن" کے تجنیس بیان کے علاوہ جو علمی اور ادبی ہونے کے ساتھ معقولی اور کلامی نکتے بھی پیش کرنے میں سید صاحب منفرد ہیں۔ خط کا دوسرا ٹکڑا یہ ہے: "الٰہیات القرآن" میں آپ کو جو اشتباہ پیش آیا وہ وہی مسئلہ قدر و قضار کا مغالطۂ عامۃ الورود ہے۔ بہر حال جس ادھیڑبن میں آپ نے ایک شب بسر کی دنیا ویسی لاکھوں شب بسر کر چکی ہے۔ خدا کے دو نظریے فرق اسلام میں مشترک ہیں، فرقۂ تنزیہیہ جس کے سرگروہ معتزلہ اور شیعہ، فرقۂ اطلاقیہ جس کے رئیس الطائفہ اشاعرہ اور عام اہل سنت ہیں۔ اول فرقہ خدا کی تنزیہ عن الشر اور تقدیس عن جمیع احتمالات و لوازم عیوب کے قائل ہیں اور اس تنزیہ و تقدیس میں خدا کے مقید الاختیار لازم آنے کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ فرقۂ ثانیہ خدا کے اطلاق قدرت و وسعت اختیار کے اس قدر معترف ہیں کہ مشتبہ اور مبہم طور سے کسی شر و عیب کے ساتھ (جو انسانی محاورات و علم کے لحاظ سے شر و عیب ہو) ملوث ہو جانے کی کوئی تمیز نہیں کرتے، اس سے فلسفۂ ارسطو سے کوئی تعلق نہیں۔"

دیکھا آپ نے معتزلہ اور اشاعرہ کی فکروں اور کلامی اختلافات سے جو نزاع کھڑی ہو گئی ہے اس کو کس آسانی سے حل کیا ہے۔ پھر اپنا محاکمہ بھی پیش کر دیا کہ حق ان کلامی تشریحات میں نہیں بلکہ صفات باری میں اعتقادی اعتدال کے قیام و عمل میں ہے۔ پھر اس خیال کی بھی تردید کر دی جو عام طور پر مستشرقین دانستہ یا نادانستہ ڈھنگ سے منظر عام پر لاتے ہیں کہ مسلمانوں کا فلسفہ اور کلام یونانیوں سے مستنیر ہی نہیں بلکہ ان کی تقلید میں ہے۔

سید صاحب کا اپنے دوستوں اور متوسلین کے ساتھ ہمیشہ تعلقات کا انداز مخلصانہ اور مشفقانہ رہا۔ ان تمام میں علمی اور ادبی رنگ کارفرما ضرور رہا اور زبانِ قلم اس کا اظہار بھی کرتی رہی۔ اس سلسلہ کے چند نکات اور ملاحظہ ہوں جو ۳ر دسمبر ۱۹۱۵ء کے خط میں دریابادی کے سامنے پیش کئے گئے۔ سید صاحب ملا محض کبھی بھی نہیں رہے اور مغربی ادب پر بھی ان کی نظر خاصی رہتی تھی۔ گیٹے کا ڈراما محمد شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد گیٹے کی لائف میں اس کے ابواب کا خلاصہ پڑھا تھا۔ جب دریابادی نے "نفسیات القرآن" لکھنے کے شوق کا اظہار کیا تو ان کے مزاج اور رجحان طبع کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکیمانہ اور مؤثر انداز میں اس ادبی بیہودگی پر روک لگانا چاہا۔ مزید برآں ڈراما نویسی کی طرف ان کی رغبت دیکھ کر ان کی طبعی اپج کا گلا گھونٹنا مناسب نہ تھا اس لئے ان کے رخ کو پھیر دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے ایک جملہ اس کے متعلق بھی لکھ دیا جو بعد میں ثابت ہوا کہ بڑا مؤثر تھا۔ خط میں ہے: "نفسیات القرآن" بشوق لکھئے لیکن داد دینے کے لئے، نہ عیب جوئی کے لئے۔ قرآن میں نفسیات کا جو گر ہے وہ شاید وہی ہو جس کو آپ تحریک نفس انسانی بذریعہ خطابیات و دعوت متلذذات کہیں گے۔ بہر حال اگر آپ اسلام کی حمایت کا اس سے کام لیں گے تو خدارا جلد لکھئے اور اگر کچھ اور نیت ہے تو اس امت مرحومہ پر للہ رحم فرمائیے۔ یوسفؑ کا قصہ آپ قرآن سے لے کر کیوں لکھیں، توراۃ سے لکھئے کہ دو اور قومیں بھی آپ کی ممنون ہوں۔"

سید صاحب کا یہ اندازِ بیان اپنے طنز و تعریض میں بھی بڑی جاذبیت رکھتا ہے۔ اس کی قدر ان کے متوسلین اور متعلقین اور دوست آشنا سب کرتے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس ادیبانہ اور حکیمانہ طرز گفتگو نے دریابادی مرحوم کا ذہنی اور فکری راہوں کے ہموار کرنے اور قلم کی زبان کو روکے اور تھامے رکھنے میں مدد نہ دی۔ الحاد کی دنیا سے نکالنے میں سید صاحب کے اس تربیتی سلیقہ کو بڑا دخل ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصے کو بطور ڈراما لکھنے کا خیال غالباً عبدالماجد صاحب کو گیٹے کی وجہ سے ہوا تھا مگر اس پرخار وادی میں قدم رکھنا دیگر آلائشوں اور خطرات کو بھی دعوت دینا تھا۔ پھر قرآن نے تو انھیں حقائق کو پیش کیا ہے جن سے انسان کی ذات، اس کا اجتماع، اس کی معیشت، معاشرت اصلاح کی راہ پر لگ جائے۔ وہاں تو لذت آفرینی کا کوئی تصور ہی نہیں۔ توراۃ میں وہ الہامی قصے جن کو نیرنگی زمانہ نے اپنے دست خورد برد سے مصفیٰ نہیں رہنے دیا تھا

یہود و نصاریٰ کے لئے جاذب نظر۔ دل کش اور لذت آفریں رہے۔ سید صاحب کی نکتہ آفریں زبان قلم نے تاریخی حقیقتوں کو بیان کرنے کے ساتھ مسلمان کی بنیاد پرستی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور یہ بھی ہے کہ یوسف زلیخا کی کہانی ادب کی چاشنی تو رکھتی ہے" اس پر مدار رکھنے والا ڈرامہ کیا کم ناوک فگن ہوگا اس لئے آپ توراۃ سے لکھیں کہ دو آتشہ ہو جائے۔

رسالہ "نقوش" لاہور مکاتیب نمبر جلد اول میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے نقد و تبصرہ کرتے ہوئے سید صاحب کے خطوط کا امتیازی وصف "فرحت افزائی اور نکتہ آفرینی" بتایا ہے۔ اہل نظر اس سے اتفاق کریں گے مگر اس کی ترتیب معکوس ہو گئی ہے۔ سید صاحب کی طبیعت کا خمیر اول درجہ میں تحقیقی اور علمی تھا اس لئے اس کے قدرتی طور پر نامہ نگاری میں نکتہ آفرینی کی شکل میں اجاگر ہونا ہی تھا اور علم و فضل کے گل بوٹے سے اس کی زینت ہوئی تھی۔ سنجیدگی اور متانت دراصل ہمیشہ "طبیعت" نہیں بلکہ اکثر نتیجۂ "طبیعت" ہوتی ہے اور اگر طبعی بھی ہو تو حسن مستزاد۔ فرحت افزائی جس کو کہا جا رہا ہے، وہ اصلاً صفت "دل آویزی" ہے اس لئے اس کا پھل فرحت افزا ہوتا ہے۔ یہ دونوں وہ نقوش ہیں جن کی جلوہ نمائی نے سید صاحب کے مکاتیب میں مختلف طرز کے پیرہن حسن کو اختیار کیا ہے۔ اس کے جلو میں خوشنما اور دل آویز ایسے گل بوٹے بستان حکمت میں جلوہ افروز ہوئے کہ حیرت تو نہیں ہوتی مگر اس کی اتباع میں پریشانی اور جاں فشانی ضرور ہوگی۔ یہ کمال جو سید صاحب کے قلم حسن افزا نے دکھائے وہ نہ تو صرف کسبی ہے اور نہ محض وہبی۔ محنت و مشقت اور لطافت و نزاکتِ طبع نے ایک متوازن کیف و کم کی صورت میں ترتیب دیا ہے اس لئے دلکش حسن کے ساتھ حسنِ امتزاج بھی رکھتا ہے۔

○

محمد رابع ندوی★

عربی زبان میں خدمات

علامہ سید سلیمان ندوی ان نادرہ روزگار ہستیوں میں ہیں جنکی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ علمی اور ثقافتی حلقے ان کی امتیازی خصوصیات اور علمی وعملی فضل وکمال سے اس وقت واقف ہوئے جب انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درسیات کی تکمیل کرلی جہاں انھوں نے اپنے جوہر شناس استاد و مربّی علامہ شبلی نعمانی کی صحبت کیمیا اثر سے علمی اور عملی فیض حاصل کیا۔ علامہ شبلی نے دارالعلوم میں اپنے متعدد شاگردوں کی تربیت اور شخصیت وکردار سازی کا کام بڑے حسن وخوبی سے انجام دیا اور اس سلسلہ میں انھیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اُن کے نامور شاگردوں میں سید صاحب کی ذات گرامی سرفہرست ہے۔

لوگ ان کے فضل وکمال اور علمی تفوق سے سب سے پہلے اس وقت واقف ہوئے جب انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عظیم الشان سالانہ اجلاس میں ایک موقر تعلیم یافتہ مجمع کے سامنے عربی میں برجستہ تقریر کی۔ دراصل یہ تقریر اجلاس کے ایک ذمہ دار رکن کی فرمائش پر کی گئی جنھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ سید صاحب حاضرین کو عربی زبان میں خطاب کریں۔ اس وقت عربی زبان میں برجستہ تقریر کرنا کم از کم ہندوستان جیسے ملک کے لیے عجیب وغریب چیز تھی، اس لیے کہ ایک تو عربی زبان کا ماحول نہیں تھا دوسرے یہ کہ اس وقت ہندوستان میں عربی کتابیں بھی شاذ و نادر ہی ملتی تھیں، لہٰذا اس زبان میں علمی اور ادبی ملکہ پیدا کرنا بہت مشکل کام تھا۔ لیکن سید صاحب جو اس وقت بالکل نوعمر تھے اس فرمائش پر فوراً اٹھے اور عربی میں ایسی برجستہ اور برمحل تقریر کی کہ ہر طرف سے صدائے آفریں وتحسین بلند ہونے لگی، ان کے استاذ گرامی علامہ شبلی اپنے شاگرد کی اس حیرت انگیز کامیابی پر اتنے مسرور ہوئے کہ اپنا عمامہ اتار کر ان کے سر پر رکھ دیا، گویا یہ شاگرد کے فضل وکمال کے اعتراف کا ایک رمز تھا۔ سید صاحب مسلسل دینی علمی فکر اور ادبی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے اور وسیع مطالعہ اور تحقیق کے بعد ایسے مضامین لکھتے رہے جو اس وقت کی فکری اور علمی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ ان کی اس کاوش کے نتیجہ میں ایسی بیش قیمت کتابیں وجود میں آئیں جو اپنی جامعیت اور انفرادیت کی بدولت علمی وادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوئیں، مثال کے طور پر "حیات مالک"، "سیرت عائشہ" "سیرۃ النبی کی پانچ جلدیں، فارسی

★ صدر شعبہ عربی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

کے عظیم شاعر خیام کی شخصیت پر ان کی محققانہ اور فاضلانہ کتاب "الخیام"، قرآنی جغرافیہ پر "ارض القرآن"، "عرب و ہند کے تعلقات"، "عربوں کے جہاز رانی"، وغیرہ، ان میں سے ہر کتاب بحث و تحقیق کے اعلیٰ معیار اور وسیع علم اور عمیق فکر کی غماز ہے۔

سید صاحب نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں علوم و معارف کی تحصیل کی، جس نے قدیم صالح اور جدید نافع میں ہم آہنگی پیدا کرنے علم قدیم اور علم جدید کی خلیج کو ہموار کرنے اور مؤثر علمی و ادبی اسلوب اپنانے کی دعوت دی اور اس کی ضرورت و افادیت پر زور دیا۔ ایسی جامعیت اور وسعت سے ان کی شخصیت کا خمیر تیار ہوا اور اسی کے اثرات ان کی علمی ادبی اور فکری کارناموں میں نمایاں ہوئے۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ ایسے عالم دین تھے جسے اپنی قدیم روایات سے گہرا لگاؤ ہے، اور دوسری طرف ایسے بالغ نظر ادیب اور محقق تھے جو زمانہ کے حالات اور رفتار کا پورا شعور رکھتا ہو۔ انہیں قدیم علوم میں گہرائی اور بصیرت کے ساتھ جدید علوم سے واقفیت اور جدید طرز پر کسی چیز کو پیش کرنے کا سلیقہ حاصل تھا، ان کی نگاہ میں علمی متانت اور وقار تھا اور ان کا اسلوب مؤثر اور بلیغ تھا۔ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے خواب کی حسین تعبیر اور اس کے ایک ہونہار فرزند تھے۔

علامہ ندوی نے اپنے زمانہ کی متعدد زبانوں میں مہارت حاصل کی، اور خاص طور سے اردو جو ان کے ملک کی علمی و ادبی زبان ہے، اور عربی جو تمام دینی اور اسلامی علوم کی اصل زبان ہے دونوں میں وہ خوش اسلوبی سے اپنا مافی الضمیر ادا کر سکتے تھے، یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جس میں وہ اپنے ہم عصر علماء کی اکثریت سے ضرور فائق تھے جن کا حال یہ تھا کہ عربی میں اپنا مافی الضمیر ادا نہیں کر سکتی تھی، اس لیے وہ اردو ہی کو وسیلہ اظہار بناتی تھی، اور وہ بھی قدیم روایتی اسلوب میں۔

سید صاحب نے عام طور سے اردو ہی کو اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا میدان بنایا، اور اس میں کامیاب مہارت اور امتیاز پیدا کیا، اس لیے کہ ان کی سرگرمیوں کا تعلق عموماً ہندوستان سے رہا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے عربی سے بالکل صرف نظر کر لیا ہو، بلکہ عربی میں بھی متعدد کام انھوں نے بڑے سلیقہ اور خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔

سید صاحب کی عربی تحریریں فصاحت و بلاغت، حسن و جمال، متانت و سنجیدگی اور پختگی کا اچھا نمونہ ہیں۔ عربی کے میدان میں بھی وہ ایک پختہ کار اور کہنہ مشق اہل قلم کی حیثیت سے نمایاں ہوئے، جب کہ ہندوستان میں اس وقت کے نامور اہل دانش و فکر بہت پیچھے نظر آتے ہیں، ہم اس مقالہ میں سید صاحب کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں میں سے اسی خاص پہلو پر گفتگو کریں گے یعنی "عربی زبان سے ان کا تعلق اور اس میں ان کے کارنامے"۔

جب ہم اس خاص پہلو سے ان کے کام کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ متعدد میدانوں میں پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ انھوں نے عربی رسالوں کے لیے مضامین لکھے، خاص طور سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عربی مجلّہ "الضیا" میں جس کے وہ سرپرست اور نگراں تھے ان کے علمی فکری اور ادبی مضامین شائع ہوئے، "الضیا" کے متعدد اداریے بھی ان کے قلم سے ہیں۔ صحافتی میدان کے علاوہ انھوں نے مختلف عربی کتابوں پر مقدمے لکھے جو وقیع علمی مضامین سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اسی طرح انھوں نے عربی زبان کی تعلیم کے لیے کتابیں تصنیف کیں،[۱] اور عربی میں اشعار بھی کہے۔

عربی میں ان کا اسلوب ادبی سلاست وروانی، علمی متانت وسنجیدگی اور تبحر علمی کا آئینہ دار ہے۔ ان کے اسلوب میں متنوع خصوصیات جمع ہوگئی ہیں، وہ موضوع کی مناسبت سے واضح الفاظ اور موثر اسلوب اختیار کرتے تھے۔ اہل ادب فصاحت وبلاغت کے لیے جس چیز کو سب سے زیادہ اہم بتاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ کلام متکلم کی مراد اور موقع محل کے مطابق ہو تاکہ قاری کے ذہن میں آسانی سے اتر جائے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے بہت سے اہلِ قلم عاری ہیں۔

اس سلسلے میں قابل غور چیز یہ ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد سے لیکر عہد جدید کے آغاز تک عربی ادب وانشاء پر تکلف وتصنع، عبارت آرائی اور دقت پسندی کا رجحان غالب رہا، جس سے عہد انحطاط کے کم ہی ادباء اور اہل قلم محفوظ رہے۔ وہ لوگ جو اس عام روش سے ممتاز رہے ان میں ابن خلدون کا نام بہت نمایاں ہے جن کی تاریخ اور مقدمہ نے کافی شہرت ومقبولیت حاصل کی، انھوں نے اپنی تحریر میں لفظی اور معنوی دونوں خوبیوں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستانی علماء میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی نے یہ طرز اختیار کیا۔ ان کے علاوہ جن لوگوں نے یہ اسلوب اپنایا تھا ان کی تعداد بہت کم ہے۔

ہندوستان میں عربی زبان کو وسیلہ اظہار بنانا مشکل کام تھا۔ اس لئے کہ عربی اس ملک میں تقریر وتحریر کی زبان نہیں تھی، عربی میں وہی شخص آسانی سے اپنی بات کہہ سکتا ہے جسے زبان وبیان پر کافی قدرت حاصل ہو، خواہ اس لیے کہ عربی اس کی مادری زبان ہو یا اس نے عربی تحریر کے مختلف اسالیب اور مشہور اہل قلم کی نگارشات عالیہ کا مطالعہ کیا ہو۔ سید صاحب خوش قسمتی سے ان لوگوں میں تھے جنھیں مطالعہ کا کافی موقع ملا، انھوں نے سب سے پہلے ندوۃ العلماء کے بانیوں کے منصوبہ کے مطابق عربی کو ہندوستان میں نظام تعلیم کا بنیادی ستون سمجھ کر اختیار کیا، چنانچہ وہ عربی زبان کی تدریس اور اس کی نشر واشاعت پر کافی زور دیتے تھے، اور اسے اسلامی وحدت کی اساس سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایسی کتابیں لکھیں جن میں عربی زبان کو سہل بنا کر پیش کیا اور عربی انشاء کے جدید اسالیب کی وضاحت کی۔ اس سلسلہ میں ان کی کتاب "دروس الادب" کا سیٹ اور عربی

کے رائج الفاظ کی ڈکشنری "لغات جدیدہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سید صاحب نے عربی زبان سے اہل علم کی بے اعتنائی پر اظہار تاسف کیا ہے کہ وہ خود بھی اس زبان پر قدرت اور مہارت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور طلبہ کے اندر بھی اس زبان کے حصول کا ذوق اور شعور پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں جو "الضیاء" میں شائع ہوا لکھتے ہیں:

"ہمارے ملک میں تقریباً اسی ملین مسلمان ہیں جن میں تقریباً ایک ملین ایسے ہیں جو اگرچہ عربی زبان میں گفتگو نہیں کر سکتے لیکن وہ قرآن کی زبان سے واقف ہیں اور اسے سمجھتے ہیں۔ یہاں چھوٹے بڑے عربی مدارس کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے جن میں عربی پڑھنے والے طلبہ ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہیں۔ ہمارے لئے یہ بات انتہائی قابل افسوس اور تکلیف دہ ہے کہ اس جم غفیر میں اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ عربی میں ایک جملہ بولنے پر قادر نہیں، اور کسی موضوع پر چند سہل، موثر، دل کش اور مربوط جملے لکھنے سے قاصر ہے، کجا کہ وہ عربی میں برجستہ تقریر کرے۔ لکھنے والوں کا حال یہ ہے کہ ان کی تگ و دو کا میدان فقہ کے کچھ جزئی مسائل اور منطق کے پامال ثقیل اور بے جان مباحث ہیں جن کے اندر علمی تشنگی اور ذوق تحقیق کی تسکین کی کوئی صلاحیت نہیں۔ سب سے پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اس خامی کے ازالہ اور اس خلا کو پر کرنے کا خیال پیدا ہوا، تو اس نے قدیم و جدید دونوں قسم کی عربی کی تعلیم پر توجہ مرکوز کر دی، اس طرح کہ وہ تحریر و تقریر کا وسیلہ بن سکے، چنانچہ اس نے اپنے نصاب درس میں باکمال اور قادر الکلام متقدمین ادباء کی کتابیں داخل کیں، جو واقعی ادب کا سرچشمہ اور عربی زبان کا بیش بہا ذخیرہ ہیں مثلاً ابن قتیبہ دینوری، عبدالقادر جرجانی، قدامہ بن جعفر بغدادی، ابوہلال عسکری اور جاحظ کی کتابیں۔ اسی طرح چوتھی صدی ہجری کے بعد جو شعراء وجود میں آئے ان کے دواوین کے بجائے شعرائے متقدمین کے دواوین کا انتخاب کیا۔ پھر ابتدائی درجات کے لیے بعض کتابیں تیار کیں۔ عربی زبان میں دوسری زبانوں کے جو الفاظ داخل ہو گئے ہیں ان کے مفہوم کی تعیین و تشریح کے لیے ایک جدید طرز کی ڈکشنری تیار کی، جس کے بغیر عربی اخبار و رسائل کا سمجھنا دشوار تھا، اور جدید زبان کی تدریس کے لیے باقاعدہ ایک مدرس کا تقرر کیا۔"

علامہ سید سلیمان ندوی نے عربی زبان کی بقا و تحفظ اور اس کے ارتقا کے لیے کافی جدوجہد کی، اور لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کی کہ اس زبان میں تعبیر کی پوری قدرت اور ملکہ حاصل کر کے اس بات کا ثبوت دیں کہ یہی وہ واحد زبان ہے جو مسلمانوں کی شیرازہ بندی کر سکتی ہے، اور ان کے اندر اتحاد و یگانگت پیدا کر سکتی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے یورپ کی مثال دی جس نے اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے لسانی وحدت سے فائدہ اٹھایا ہے، پھر علمی، اجتماعی اور تمدنی زندگی میں اسلام کے امتیازات و خصوصیات کا تذکرہ کیا

ہے، چنانچہ "الضیاء" کے ایک اداریہ میں جو ان کے طاقتور سلیس اور بلیغ عربی طرز تحریر کی نظیر ہے لکھتے ہیں :

"اسلام کی خصوصیات اس کے متبعین کے خصائل و امتیازات سے الگ بے شمار ہیں، مثال کے طور پر وہ ایک ایسا دین ہے جو تمام اقوام و ملل کی وحدت انسانی اخوت اور بنی نوع انسانی کی خیر خواہی اور ہدایت کا ضامن ہے، اس نے اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے جن وسائل سے کام لیا ان میں سب سے اہم وسیلہ یہ ہے کہ اس نے قرآن پر ایمان رکھنے اور اس کی بالادستی تسلیم کرنے والوں کو رنگ و نسل، زبان اور قومیت کے اختلاف کے باوجود ایک خاص زبان عطا کی، اور وہ ہے آسمانی کتاب کی زبان جس میں وہ ایک دوسرے کے احساسات و جذبات اور افکار و خیالات کو سمجھتے ہیں اور باہم تعلق و محبت کو فروغ دیتے ہیں، چنانچہ بدلتے ہوئے احوال و ظروف میں بھی یہ صدیوں سے امت مسلمہ کی قومی زبان رہی ہے۔

موجودہ دور میں دور اندیش مسیحی علماء اس بات کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ اپنی قوم کو انسانی وحدت اور اخوت کی دعوت دیں۔ اس کے لیے انہوں نے ایک نئی زبان ایجاد کی جس میں وہ اپنی قوم کو آسانی سے خطاب کر سکتے ہیں اور اسے اتحاد و اتفاق کی دعوت دے سکتے ہیں۔ لیکن اہل فکر و دانش جو ہمیشہ عواقب پر نگاہ رکھتے ہیں کہتے ہیں کہ کوئی زبان اسی وقت زندہ رہ سکتی ہے جب کہ اس کے پیچھے مذہبی و سیاسی افکار و نظریات کار فرما ہوں جن کے بقاء و تحفظ کے لیے اس قوم کے افراد پوری جد و جہد کرتے ہوں۔ اسلام نے روز اوّل ہی سے اس نقطہ پر خاص توجہ دی۔ اس نے اپنے متبعین کو جو اس وسیع سرزمین کے مختلف حصوں پر پھیلے ہوئے ہیں ایک ایسی زبان عطا کی جو ان کی شیرازہ بندی کرتی ہے اور انہیں وحدت کی ایک لڑی میں پرو دیتی ہے، وہ ہے اس کے برگزیدہ نبیؐ اس کے پسندیدہ دین اور اس کی منتخب کتاب کی زبان، یہ مسلمانوں کے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی زبان ہے، وہ اس زبان کے محافظ اور اس کے چشمہ صافی کے پاسبان اور اس کی حریم قدس کے نگہبان ہیں، اس کی زندگی ان کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے، وہ جہاں جائیں گے ان کے ساتھ یہ زبان بھی جائے گی، اور جس جگہ قیام کریں گے وہاں وہ بھی رہے گی، یہ اپنے دامن میں اسلام کی چودہ صدیوں کے خزانے سمیٹے ہوئے ہے جس میں دین و شریعت، حدیث و تفسیر، تاریخ و سیرت، شعر و ادب، متانت و سنجیدگی، اور لہو و لعب سب کچھ ہے۔ وہ متقدمین کے منتشر اور متنوع علوم و معارف، متاخرین کے علمی کارنامے ان کی بحث و تحقیق کے نتائج، ان کی علمی مجلسوں کے فیضان اور ذہنی و قلبی کاوش کا نچوڑ، ان کے لطائف و نوادر اور صفحہ قرطاس پر بکھرے جواہر کا حسین گلدستہ ہے، ان کی زبان وہ بیش قیمت خزانہ ہے جو کبھی فنا نہیں ہوگا، اور وہ ان کے لیے ایسا لباس فاخرہ ہے جو کبھی پرانا نہیں ہوگا۔"

آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ علامہ کے کلام میں کتنی متانت فصاحت و بلاغت معنویت جدت اور تازگی ہے۔

عبارت تکلف وتصنع سے پاک ہے۔ جملوں کی ساخت اور الفاظ کی نشست میں بڑا حسن ورعنائی اور دلکشی ہے، بسا اوقات وہ موقع ومحل کی مناسبت سے ایسے منتخب فقرے استعمال کرتے ہیں جو کافی دلچسپ اور معنی خیز ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ ہندوستان کے متعدد عربی رسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے جہاں "الریاض" اور "البیان" کا اجرا اور پھر ان کی اشاعت کے موقوف ہو جانے کا حال لکھتے ہیں، وہیں ایک جملہ لکھتے ہیں "ثم جاءت علی فترة من رسل الکلام الجامعة لأبی الکلام" یہاں "الجامعة" کے لفظ سے مولانا ابوالکلام آزاد کے عربی رسالہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اسی نام سے ایک طویل عرصہ کے بعد جس میں عربی رسائل بند رہے نکلنا شروع ہوا، اس کے بعد "الضیاء" کا تذکرہ کرتے ہیں جو ندوة العلماء سے شائع ہو رہا تھا۔

سید صاحب عربی مضامین میں کسی ایک موضوع کے پابند نہیں تھے بلکہ وہ مختلف موضوعات پر لکھتے تھے، کبھی وہ علمی مقالے اور مضامین لکھتے، کبھی کتابوں پر مقدمے سپرد قلم کرتے۔ انھوں نے بعض اہم شخصیات کا تعارف کراتے ہوئے ان کی امتیازی خصوصیات بڑی ژرف نگاہی، وضاحت اور جامعیت کے ساتھ نمایاں کی ہیں، اس کی ایک اچھی مثال مولانا حمیدالدین فراہی کی کتاب "الامعان فی اقسام القرآن" کا مقدمہ ہے جو مولانا فراہی کی وفات کے بعد لکھا گیا۔ اس میں سید صاحب اپنی بات اس طرح شروع کرتے ہیں:

"دنیا دار العجائب ہے، یہاں ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن سے آپ بچنا چاہتے ہیں اور جو آپ کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے۔

مصنف کی زندگی ہی میں یہ کتاب طباعت کے لیے بھیج دی گئی تھی لیکن ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اچانک وہ ہمیں سوگوار چھوڑ کر اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم ذہانت وذکاوت، تبحر علمی، حسن اخلاق اصابت رائے، دنیا سے بے رغبتی اور رضائے الٰہی کی طلب میں بے مثال تھے۔

مولانا حمیدالدین فراہی مرحوم کی ولادت ۱۲۸۰ھ میں اعظم گڑھ یوپی کے ایک گاؤں فریہا میں ہوئی، وہ مورخ اسلام علامہ شبلیؒ کے ماموں زاد بھائی تھے، سن رشد کو پہونچ کر انھوں نے پڑھنا لکھنا شروع کیا، سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کیا، پھر ہندوستان کے معزز خاندانوں کے رواج کے مطابق فارسی پڑھی اور اس میں اتنی مہارت حاصل کی کہ مشکل بحر میں ایک فارسی قصیدہ نظم کیا جس میں فارسی کے مشہور شاعر خاقانی کا تتبع کیا ہے، ان کا یہ قصیدہ شعر وشاعری کے حلقہ میں پسند کیا گیا۔

اس کے بعد انہوں نے عربی پڑھنا شروع کی جس میں ان کو علامہ شبلی کی رہنمائی اور توجہ حاصل رہی، جو ان سے عمر میں چھ سال بڑے تھے۔ علامہ شبلی سے انہوں نے علوم عربیہ میں صرف ونحو، لغت وادب، منطق وفلسفہ سب کچھ حاصل کیا۔ پھر وہ لکھنؤ آئے جو اس وقت علوم اسلامیہ کا مرکز تھا، یہاں وہ مشہور فقیہ ومحدث علامہ ابوالحسنات عبدالحیؒ

لکھنوی کے حلقۂ درس سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد لاہور گئے جہاں عربی کے باکمال شاعر و ادیب امام وقت شارح حماسہ لاہور اورینٹل کالج میں عربی زبان کے استاذ مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے عربی ادب کی تحصیل کی"

بظاہر یہ سہل و سلیس اسلوب جو ایک علمی شخصیت کے حالات اور کمالات کے اظہار کے لیے اختیار کیا گیا ہے، فنی خوبیوں سے عاری معلوم ہوتا ہے، مگر دراصل یہی سہولت و سلاست اور برجستگی اس کے حسن و جمال اور تاثر کا بنیادی عنصر ہے، اس لئے کہ اس کے ذریعہ متعلقہ شخصیت کی خصوصیات اور اس کے اخلاق و عادات کا بڑی خوش اسلوبی اور جامعیت سے جائزہ لیا گیا ہے، اور کہیں کوئی حقیقت مجاز و کنایہ اور مبالغہ کے پردہ میں اوجھل نہیں ہوئی ہے۔ مزید برآں اپنے ممدوح کی ذات سے وابستہ دیگر شخصیات، ماحول اور دیگر متعلقہ مسائل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، مثال کے طور پر ان کے حالات کے ضمن میں ہمیں لکھنؤ کی علمی مرکزیت اور اہمیت اور مولانا عبدالحی لکھنوی کا حدیث و فقہ میں مقام معلوم ہوا، اسی طرح ہم عربی کے مشہور ادیب و ماہر فن استاد شارح حماسہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے متعارف ہوئے، ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت ہندوستان کے شریف گھرانوں میں بچے کو سب سے پہلے قرآن پاک کی تعلیم دی جاتی تھی پھر فارسی اور دیگر علوم پڑھائے جاتے تھے۔ سوانح نگاری کے لیے یہ اسلوب کافی کارآمد اور موثر ہے، لیکن متاخرین کی کتابوں میں یہ اسلوب کم نظر آتا ہے۔ البتہ اس موضوع پر مولانا عبدالحی حسنی کی کتاب "نزہۃ الخواطر" جو آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اس اسلوب کا بہترین نمونہ ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا عبدالحی صاحب سے استفادہ بھی کیا ہے، چنانچہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ "حریری کے مقامات انھوں نے مولانا سے پڑھے ہیں"۔ اس لیے دونوں بزرگوں کے اسلوب میں جو ایک طرح کی یکسانیت پائی جاتی ہے وہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

"الرد علی المنطقیین" پر سید صاحب کا مقدمہ بھی عربی میں ان کا ایک بہترین علمی مضمون ہے۔ یہ مضمون سید صاحب نے پاکستان جانے سے پہلے بھوپال کے زمانہ قیام میں جب وہ قاضی القضاۃ تھے لکھا تھا، اس وقت ان کی عمر بھی کافی ہو چکی تھی، اس لئے پہلے کی عربی تحریروں کے مقابلہ میں اس میں طاقت و اثر کے ساتھ سلاست و روانی بھی زیادہ ہے۔

سید صاحب کو صرف عربی نثر ہی نہیں بلکہ عربی شاعری سے بھی دلچسپی تھی، انہوں نے مختلف موضوعات پر شعر کہے ہیں، ان کی شاعری لطافت شعور، حسن تخیل کے ساتھ مکارم اخلاق اور علوم و معارف کا گنجینہ ہے، اس میں طاقت و اثر، حسن و رعنائی اور سادگی و پرکاری کا حسین امتزاج ہے، حالانکہ اتنے سہل اور فطری انداز میں شعر کہنا ایک ایسے شخص کے لیے جس کی نشو و نما عربی ماحول میں نہ ہوئی ہو اور نہ اسے اہل زبان کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا ہو، انتہائی مشکل کام ہے جس میں شاذ و نادر ہی کسی کو کامیابی حاصل ہوتی ہے، لیکن بسا اوقات

ممتاز و باکمال اہل قلم کی نگارشات عالیہ اور ان کے ادبی شہ پاروں کا مطالعہ اس کا بدل بن جاتا ہے ، اور در اصل اسی سے سید صاحب کے ادبی ذوق اور سلیقہ کی تشکیل ہوئی ہے۔

سید صاحب کی شاعری کے متعدد نمونے ہمیں "الضیاء" میں ملتے ہیں، جو "الدرر الغرر" (انمول موتی) کے عنوان سے سلسلہ وار شائع ہوئے جن میں متعدد رباعیاں ہیں جنھیں عربی میں "دو بیت" کہتے ہیں، اور معرفت و حکمت کے موضوع پر چند نظمیں ہیں، بعض نظموں میں کسی منظر یا واقعہ کی تصویر کشی کی گئی ہے، یہی وہ سرمایہ ہے جس سے عربی زبان میں ان کے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے شاعری کو اپنی زندگی کا اصل مشغلہ نہیں بنایا، بلکہ خاص خاص موقعوں پر جب طبیعت کا تقاضا ہوتا تھا تو کچھ قیمتی اشعار موزوں ہو جاتے تھے، انھوں نے ایک مدت تک اپنے اشعار شائع نہیں کئے، لیکن جب ان کے احباب اور شاگرد ان کی اس صلاحیت سے واقف ہوئے اور انہوں نے ان کی اشاعت کے لیے اصرار کیا، تو سید صاحب نے ان کے اصرار اور فرمائش پر "الضیاء" میں انھیں شائع کیا، مندرجہ ذیل نظم بھی "الضیاء" میں شائع ہوئی تھی، جس میں غروب آفتاب کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں:

۱۔ آسمان کے مغربی کنارے میں پھیلی شفق شراب کہن کی طرح معلوم ہو رہی ہے۔ جو شام کے وقت مے خوار کے سامنے انڈیل دی گئی ہو۔

۲۔ وہ ایسی شراب ہے جو ہمالیہ کی چوٹی پر بادل کے تیز رو اور شفاف پانی سے مل کر دو آتشہ ہو گئی ہے۔

۳۔ قدرت خود اپنے ہاتھ سے بادہ نوشوں کو اس شراب کے جام پیش کر رہی ہے، وہ شخص بڑا ہی بدنصیب ہے جو اس مئے گلگوں کی لذت سے نا آشنا رہا۔

۴۔ جب آسمان کی طرف نگاہیں اٹھتی ہیں تو دل نگاہوں کے جام سے یہ شراب پی کر مست ہو جاتے ہیں۔

۵۔ پرند شام کو جب غول کے غول اپنے گھونسلوں کی طرف چہکتے ہوئے جاتے ہیں اس وقت یہ شراب نوش کرتے ہیں۔

۶۔ سرسبز و شاداب باغ میں ایسی روح پرور ہوا چل رہی ہے جو انسان کی طبیعت میں سرور و نشاط کی کیفیت پیدا کر رہی ہے۔

۷۔ افق میں مئے گلگوں سے بھرا ہوا سبو ہے جس میں جام شراب تیر رہا ہے، شفق میں سورج نہیں۔

۸۔ بلکہ وہ سرخ چلمن ہے جس میں نقش و نگار بنے ہوئے ہیں، اور سورج رخ محبوب ہے جو نقاب میں پوشیدہ ہے۔

۹۔ درحقیقت سورج معدنیات ڈھالنے کا سانچہ ہے جس میں سونا پگھل کر ادھر ادھر بہہ گیا ہے۔

۱۰۔ دراصل سورج نے ہماری زندگی کے ایک دن کو قتل کر دیا تو گویا اسکی گردن سے خون بہہ کر پھیل گیا،

۱۱۔ اور یہ سرخ شفق اس کے خون سے نمودار ہوئی اور رات جس پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے اس کی قبر بنی۔

اس قصیدہ میں جو جدت و تازگی اور لطافت ہے اسے آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شاعر نے غروب آفتاب کا منظر دکھانے کیلئے کیسے مختلف پیکر تراشے ہیں جن میں فطرت کا حسن و جمال بھی ہے، احساس کی لطافت بھی ہے اور مشاہدہ کی گہرائی بھی۔

آسمان کے مغربی کنارے پر پھیلی ہوئی شفق کو اس لطیف اور خوشگوار شراب سے تشبیہ دی ہے جو کوہ ہمالہ کی بلندی پر ہے جہاں شفق نے اپنا دامن پھیلا رکھا ہے، اور چونکہ شفق کی شراب صرف نگاہوں کے جام سے پی جا سکتی ہے، اس لیے وہ نگاہوں کے لیے جام کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ ایک دوسرے شعر میں شفق کو سرخ رنگ کی چلمن سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں محبوب کا رخ زیبا پوشیدہ ہے اور محبوب یہاں سورج ہے۔ چوں کہ غروب آفتاب کے بعد شفق ظاہر ہوتی ہے اس لیے اس سے وہ یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ گویا سورج نے انسان کی زندگی کے ایک دن کا خون بہا دیا ہے جو اس کی گردن سے بہہ کر افق میں پھیل گیا ہے جس سے شفق نمودار ہوئی، اس کے بعد سورج قبر کی آغوش میں چلا گیا۔ اس کی قبر کیا ہے؟ وہ رات ہے جس کی تاریکی شفق کے بعد سایہ فگن ہوتی ہے۔

یہ اشعار جو منظر نگاری، تصویر کشی، جدت طرازی اور تشبیہ و استعارہ کی ندرت و رعنائی کا اعلیٰ نمونہ ہیں، سید صاحب کے اعلیٰ شعری ذوق اور لطافت شعور کی ترجمانی کرتے ہیں، وہ بجا طور پر تھوڑی دیر کے لئے سہی، ان باکمال اور قادر الکلام شعرا کی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں جو حسن فطرت کے ترجمان ہیں۔

حکمت اور نصیحت کے موضوع پر بھی ان کے اشعار ملتے ہیں۔ ایک قصیدہ میں وہ اس دنیوی مسرت کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

۱۔ فرض کیجئے کہ میں بادشاہ ہوں ہارون ہوں یا ساسان ہوں،
۲۔ کسریٰ اور خاقان جیسے اپنے زمانہ کے عظیم بادشاہ و سلاطین میرے تابع فرمان ہیں،
۳۔ کالے اور گورے سب میرے محکوم اور اشارہ پر چلنے والے ہیں،
۴۔ زمانہ میرے لیے سازگار ہے، اور مجھے دولت و حکومت حاصل ہے،
۵۔ ایک عظیم الشان اور فلک بوس محل ہے جس میں خوشنما پارک ہے،
۶۔ زریں اینٹوں سے اس کی دیواریں چنی گئی ہیں۔ اس کے بعد کہتے ہیں:
۷۔ اس میں زرق برق قالین اور قیمتی فرش بچھے ہیں،
۸۔ اور سونے کی بنی ہوئی مسہریاں ہیں جن کی کوئی نظیر نہیں ہے،

۹۔ رات میں جو غزالہ میری ہمنشیں ہوتی ہے وہ عام غزالاؤں سے ممتاز ہے۔

۱۰۔ اس کی نگاہوں میں جادو کا سا اثر ہے اور اس کے شانوں پر مار زلف لہرا رہا ہے،

۱۱۔ وہ خوبرو ہے جسکی گفتگو میں بڑی حلاوت اور گداز ہے، گویا اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ "آسمانی صحیفہ" کی آیات ہیں،

۱۲۔ اس کا رنگ بالکل صاف وشفاف ہے، اس کی سیاہ زلفیں ایک درخت کی دو شاخوں کی طرح لٹک رہی ہیں۔

آگے فرماتے ہیں:

۱۳۔ جب صبح نمودار ہوئی اور کوّوں نے ندائے فراق دی،

۱۴۔ اور گردش زمانہ کا اثر پڑا اور ہمارے حالات یکسر بدل گئے،

۱۵۔ حوادث اچانک آئے اور پرشکوہ عمارت منہدم ہوگئی،

۱۶۔ وہ عیش وعشرت کے اسباب لہو ولعب کے سامان اور شان وشکوہ کہاں چلے گئے؟

۱۷۔ حوادث زمانہ نے ہمارے حالات ابتر کر دیئے، اب دوست احباب سب منتشر ہو گئے،

۱۸۔ مصائب دہر نے انھیں اس طرح فنا کر دیا کہ گویا وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

۱۹۔ مجھے حیرت ہوئی اور دل نے کہا کہ دنیا کی عارضی مسرت نے مجھے فریب میں مبتلا کر دیا۔

۲۰۔ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں یا یہ سب کچھ بیداری کی حالت میں ہو رہا ہے؟

۲۱۔ میں نے ہاتف غیب کو یہ صدا دیتے ہوئے سنا کہ اے وہ شخص جو حیران وسرگرداں ہے!

۲۲۔ دنیا کی مسرت اور خوشی انسان کے وہم وگمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ان لطیف، سہل اور سلیس اشعار میں شاعر اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے کہ انسان کو جب مسرت حاصل ہوتی ہے تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اسے زندگی کی حقیقی راحت وسکون اور عیش وعشرت حاصل ہوگئی، پھر وہ اسی دنیا کو جنت تصور کرنے لگتا ہے، جس میں حور وقصور ہیں، آرام کرنے کے لئے نرم وگداز گدے اور قیمتی اور بے نظیر سامان تعیش ہیں لیکن اچانک حالات بدل جاتے ہیں اور مسرت اور خوش حالی کی جگہ حرماں نصیبی اور تنگ دستی لے لیتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کیا جو کچھ دیکھا وہ خواب تھا یا حقیقت؟ اتنے میں غیب سے آواز آتی ہے کہ دنیوی عیش وعشرت فنا ہو جانے والی شے ہے، اس کو بقا اور دوام نہیں ہے۔

سید صاحب نے رباعیات کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس صنف میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت اور جدت کا رنگ قائم کیا ہے، اس شعری قالب میں انہوں نے معرفت وحکمت کے رموز داخل کر کے اسے تزکیہ اخلاق اور تہذیب نفس کا آلہ بنا دیا ہے، اور اس طرح اس صنف کی افادیت اور اس کے ادبی سرمایہ

یں کافی اضافہ کیا۔ اس خاص صنفِ سخن میں جو طرز انھوں نے اختیار کیا ہے اسے بیان کرتے ہوئے "الضیاء" کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"بیس" سال سے پہلے کی بات ہے کہ ہمیں بعض فارسی شعراء کے تتبع میں اخلاق و حکمت کے معانی نظم کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس سلسلہ میں ابو سعید بن ابوالخیر، عبد اللہ انصاری، عمر بن ابراہیم الخیامی نیشاپوری، سحابی نجفی وغیرہ کے نمونے ہمارے سامنے تھے، ان شعراء نے جس وزن میں شاعری کی ہے اسے دوبیت اور رباعی کے نام سے موسوم کیا ہے، پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے زمانہ میں سلجوقی دور کے عربی شعراء نے ان کی تقلید کی ہے، فرق یہ ہے کہ انھوں نے عربی میں وزن تو وہی برقرار رکھا جو فارسی میں پہلے سے رائج تھا، لیکن اس کو لہو و لعب اور خمریات کے لیے خاص کر دیا۔ گویا انھوں نے شر کا پہلو لیا اور دوسرا پہلو جو خیر کا تھا اسے چھوڑ دیا۔

چونکہ انھوں نے جو وزن اختیار کیا تھا وہ بحرِ ہزج سے تعلق رکھتا ہے جس میں زحافات بہت ہوتے ہیں۔ اور "مفعول، مفاعلن، فعولن، فعلن" کا قالب ہمارے نزدیک عربی ذوق سے میل نہیں کھاتا ہے، اس لئے ہم نے اس کے بجائے "مستفعلن، فاعلن ، مستفعلن، فاعلن" کی بحر اختیار کی اور اس میں سنجیدہ مضامین و خیالات نظم کئے، غزل گوئی سے قطعاً احتراز کیا، رباعی میں ہمارا یہی طرز ہے"۔

ذیل میں سید صاحب کی رباعیات کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ لوگوں کے درمیان فضل و کمال کا اندازہ مراتب سے نہیں ہوتا اگرچہ کچھ لوگ مال و دولت اور حسب نسب کے لحاظ سے بلند ہوں،

جب تک کہ مصائب انھیں ابتلاء و آزمائش اور الجھنوں میں مبتلا نہ کریں، اس لئے کہ آگ تر اور خشک لکڑی میں کوئی تمیز نہیں کرتی ہے (سب کو جلا دیتی ہے)۔

۲۔ لوگ خوابِ غفلت میں پڑے سو رہے ہیں، ان کی زندگی محض ایک خیال ہے اور انہوں نے خواب میں جو کچھ دیکھا ہے وہ بھی صرف تخیل کا عکس ہے۔

زمانہ کی حقیقت "نہیں" کے سوا کچھ نہیں، چنانچہ نہ تو بہار ہے، نہ سردی ہے اور نہ گرمی ہے۔

۳۔ ابھی کل سے پہلے نابالغ لڑکا تھا، اور کل نوجوانی کی سرحد میں داخل ہوا اور مسیں بھیگنے لگیں۔

آج میرے بال سفید ہو گئے اور حوادثِ دہر نے مجھ پر حملہ کیا، کاش مجھے معلوم ہوتا کہ کل میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

۴۔ انسان کو کسی ناپائیدار اور عارضی خوشی سے فریب خوردہ و رنج و الم سے اندوہ گیں

نہیں ہونا چاہیے،

اس لئے کہ جب اس نے اپنے رزق مقسوم سے فائدہ اٹھایا تو اس کے لیے شہد کی مٹھاس اور ایلوا کی کڑواہٹ دونوں یکساں ہیں۔

۵۔ زندگی ایک مرتب کتاب ہے اور تمہاری زندگی کا ہر دن اس کا ایک صفحہ ہے۔

موت کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ہوا کا ایک جھونکا اس کے صفحات منتشر کر دیتا ہے، پھر وہ ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں۔

۶۔ ان لوگوں پر افسوس ہے جنھوں نے زمین میں دفینے جمع کر رکھے ہیں، کیا وہ اس خیال میں ہیں کہ جب وہ زمین کی آغوش میں دبے ہوئے مصائب و آلام کو ٹالنے سے عاجز آجائیں گے، تو اپنے خزانے دے کر ان سے نجات حاصل کرلیں گے؟ انھیں (اپنا انجام) کل معلوم ہو جائے گا جب وہ زمین (یعنی اپنی قبروں) سے اٹھیں گے۔

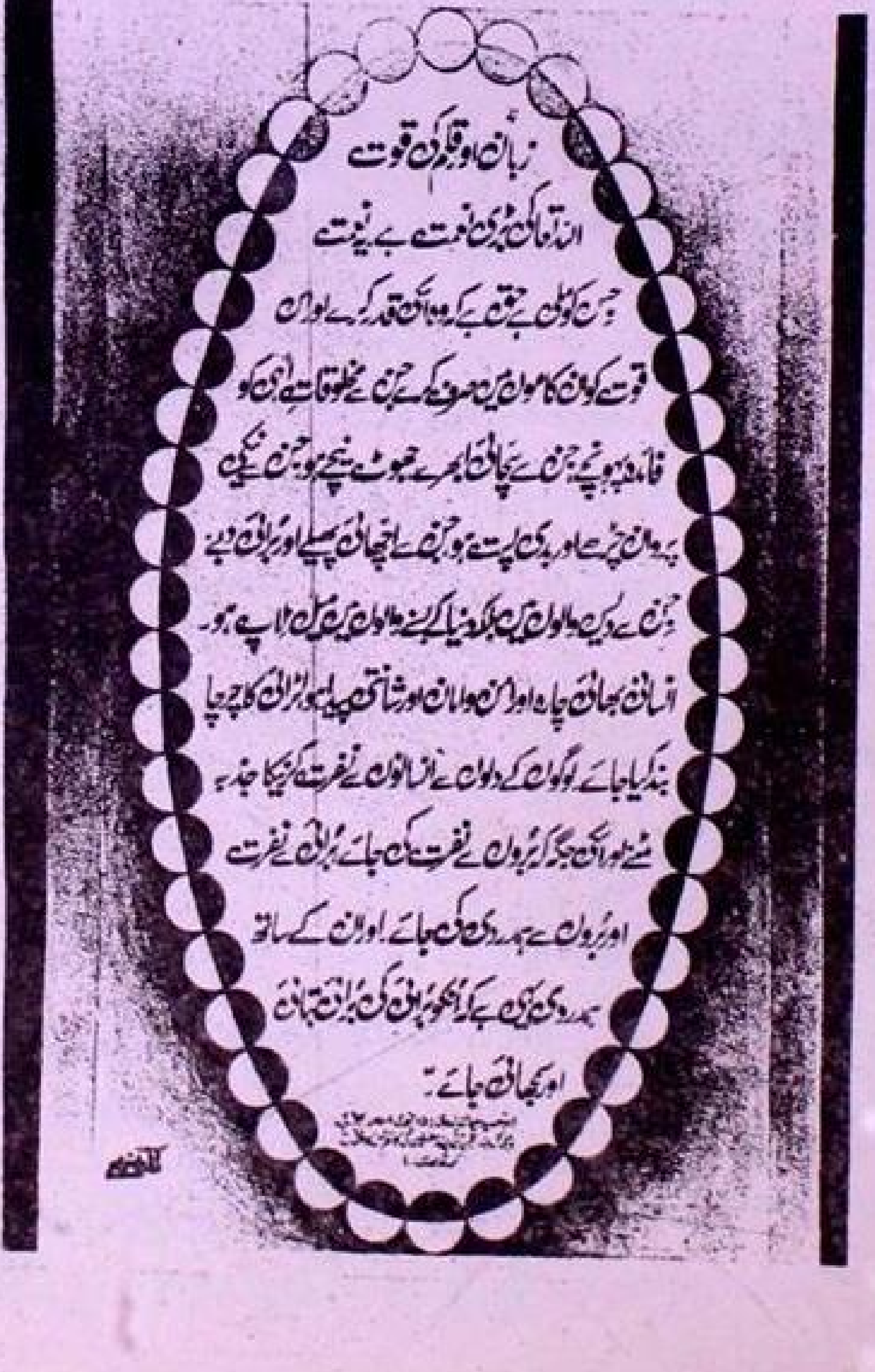

زبان اور قلم کی قوت
اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے یہ قوت
جس کو ملی ہے حق ہے کہ وہ اس کی قدر کرے اور اس
قوت کو ان کاموں میں صرف کرے جن سے مخلوقات ہے ان کو
فائدہ پہونچے، جن سے سچائی ابھرے جھوٹ نیچے ہو، جن سے نیکی
پروان چڑھے اور بدی پست ہو جن سے اچھائی پھیلے اور برائی دبے
جن سے دین والوں کی ہمت بڑھے دنیا کے رہنے والوں میں میل ملاپ ہو۔
انسانی بھائی چارہ اور امن و امان اور شانتی پیدا ہو، برائی کا چرچا
بند کیا جائے، لوگوں کے دلوں سے انسانوں سے نفرت کرنیکا جذبہ
مٹے اور اس کی جگہ برائیوں سے نفرت کی جائے، برائی سے نفرت
اور بروں سے ہمدردی کی جائے۔ اور ان کے ساتھ
ہمدردی یہی ہے کہ انکو برائی کی برائی بتائی جائے
اور بچائی جائے۔

مسعود الرحمن خان ندوی ★

اوّلیں عربی تحریریں

بحوالہ "البیان"

استاذ الاساتذہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام نامی کا غلغلہ اول اول "عربی دانی" کی شہرت سے ہوا، یہ ان کے زمانہ کی صرف "عربی فہمی" نہ تھی، نہ آج کی عصری جامعات کی "منفی عربی" تھی، یہ قرآن مجیدؐ فی لوحٍ محفوظ کی وہ زندہ و تابندہ، رواں دواں، متحرک فصیح "عربی مبین" تھی جو آخری پیغام سماوی کے وسیع و عمیق معانی و دقائق و رموز کے اظہار سے عاجز نہ ہوئی، جو دیکھتے دیکھتے اسلام کے مفتوحہ علاقوں میں سے اکثر کی قومی ملی، علمی ادبی زبان بن گئی، جو مختلف قدیم تہذیبوں کے ورثہ کو اسلامی علوم وفنون کے کشادہ دامن میں چودہ صدیوں تک رولتی پروتی سموتی اور پروان چڑھاتی رہی، جو عصر حاضر میں بھی عالمی سرمایۂ علم وادب کو اپنے گلے لگانے اور جذب کرنے میں اپنے سے سابق اور اپنی ہم عمر زبانوں کے مقابلہ میں یکتا و منفرد ہے اور جس کی بارآور حیات جاودانی کی ضمانت کسی قوم و ملک و تہذیب کی دھوپ چھاؤں کی رہین منت نہیں، بلکہ قرآن شریف کی حفاظت دائمی کے وعدۂ ایزدی "إنا نحن نزلنا الذکر، وإنا له لحافظون" کے تابع ہے۔

سید صاحبؒ اسی زندہ زبان کے ماہر تھے یعنی ان کو اس کے بولنے سمجھنے اور پڑھنے لکھنے پر مکمل قدرت حاصل تھی، اور برصغیر میں اگر یہ روایت آج بھی کہیں زندہ ہے تو ان ہی کا عطیہ ہے، اگرچہ یہ شمع ان کے اساتذہ کی جلائی ہوئی تھی، لیکن حقیقتاً ان ہی سے روشن ہوئی، اور پھر ان کے رشید تلامذہ نے اس کو بجھنے نہ دیا، بلکہ لو کچھ اور تیز ہی کر دی۔

سید صاحب کی سوانح سے واقف سب ہی لوگ ان کی دیسنہ، پھلواری شریف اور لکھنؤ میں ابتدائی عربی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک سے بخوبی واقف ہیں، ندوہ کی سازگار فضا اور روح پرور عربی ماحول میں پہنچتے ہی عربی اخبارات و رسائل کے مطالعہ کا شوق، ۱۹۰۲ء میں نواب محسن الملک کا عربی قصیدہ سے استقبال اور جدید عربی کے امتحان میں کامیابی، مختلف مواقع پر برجستہ عربی تقریر میں کمال کا اظہار، ۱۹۰۷ء کے اولین جلسۂ تقسیم اسناد میں "ابن جوہر قابل" کی اپنے استاد گرامی علامہ شبلی نعمانی کے عمامۂ فضلیت کے

★ مرکز مطالعات ایشیائے غربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

"طرہ افتخار" سے سرفرازی، لکھنؤ کے مشہور اخبار "اودھ پنچ" کے لیے عربی اخبارات و رسائل سے اردو میں ترجمہ، عربی زبان میں شعر و شاعری، لکھنؤ کے "البیان" اور قاہرہ کے "المنار" میں عربی مضامین کی اشاعت وغیرہ دیگر عربی دانی کے کمالات بھی کوئی نامعلوم حقائق نہیں ہیں!

زمانۂ تعلیم کے بعد بھی عربی زبان ان کا اوڑھنا بچھونا بنی رہی، مزید مطالعہ و مزاولت سے ان کے یہ کمالات نہ صرف بامِ عروج تک پہونچ گئے، بلکہ دوسری خصوصیات کے ساتھ اس امتیازی فضیلت کی وجہ سے ان کو اپنے زمانہ میں ایک انفرادیت حیثیت حاصل رہی، اور درحقیقت اس امتیازی صفت ہی کی وجہ سے وہ صرف اسلامی علوم و فنون ہی کی نہیں بلکہ اردو زبان و ادب کی اتنے وسیع پیمانے اور علمی ادبی سطح پر معیاری یادگار خدمات انجام دے سکے جس کی مثال ان کے معاصرین میں ناپید ہے، حالاں کہ وہ عہد مسلمانوں کے سیاسی زوال کے باوجود علمی فکری ادبی اعتبار سے برصغیر کی تاریخ کا ایک زریں ترین دور تھا۔

ان کی عربی دانی ہمیشہ مسلم رہی، لیکن انھوں نے اس زبان کو اپنی علمی تحقیقات اور ادبی تخلیقات کے اظہار کا ثانوی ذریعہ بھی نہ بنایا، حالاں کہ انھوں نے اس کی محققانہ معرفت و بصیرت اور محرمانہ اداشناسی ہی کے ذریعہ اردو زبان میں اپنی تمامتر علمی و ادبی خدمات کی تکمیل میں بے نظیر فائدہ اٹھایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے اس وقت کے پراگندہ ملکی ماحول میں بین الاقوامی شہرت کے بجائے ان کے استاد گرامی کے بنائے ہوئے خاکہ کے مطابق ملکی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کی مخلصانہ خدمت زیادہ اہم تھی، نئی تعلیم کے زیر اثر نئی نسل کے ڈگمگاتے قدموں کو سنبھالنا اور انگریز حکومت کے زیرِ سایہ عیسائی مبلغین کے سوچے سمجھے منصوبوں کے مطابق اسلامی تعلیمات، اسلامی تاریخ و تہذیب عام طور پر اور ہندوستان میں خاص کر ہندوستانی مسلم تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششوں کو علمی و تاریخی حقائق کی روشنی میں بے نقاب کرنا، اور نئی تعلیم یافتہ مسلم نسل کو دینی، فکری و تہذیبی ارتداد سے بچانا اور ان کو علمی و دینی، تاریخی و ادبی صالح غذا فراہم کرنا سب پر مقدم تھا، یہ خود اتنا وسیع کام تھا کہ اس کے لیے دار المصنفین اعظم گڑھ کی وسعت اور اس کے معیار کی ایک نہیں متعدد اکیڈمیوں کی بیک وقت ضرورت تھی، لیکن وہ تنِ تنہا تھے جو اس مورچہ پر سب کچھ تج کر مومنانہ عزم و استقلال، صبر و قناعت کے ساتھ ڈٹ گئے، اور اردو زبان میں اپنے پیچھے اتنا بڑا سرمایہ چھوڑ گئے جو حق و صداقت کے کسی بھی جویا کے لیے تشفی بخش، اور اسلامی تاریخ و تہذیب کی عظمت پر فخر کے جذبات ابھارنے کے لیے کافی ہے۔

عربی زبان میں ان کی تحریریں ان کی اردو نگارشات عالیہ کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں، یہ تحریریں یا تو "البیان"، لکھنؤ میں شائع شدہ بہت ابتدائی زمانہ کی ہیں، اور شاید اسی وجہ سے ناقابل التفات سمجھ کر قصداً

بھلا دی گئی ہیں یا پھر "الضیاء" میں طبع شدہ بعد کی کچھ تحریریں ہیں اور اکثر ان کی اردو تحریروں کے عربی ترجمے ہیں جو ان کے بعض رشید شاگردوں نے کئے ہیں[2]۔ ان کے علاوہ چند خطوط[3] ہیں اور بعض کتابوں پر ان کے مقدمات کا نام لیا جاتا ہے جیسے امام ابن تیمیہؒ کی الرد علی المنطقیین اور معلم عبدالحمید فراہیؒ کی کتاب إمعان فی اقسام القرآن[4]، لیکن اخیر الذکر کتاب کے آخر میں سات صفحات کی جو تحریر ہماری نظر سے گزری ہے، وہ کتاب کے مقدمہ کے بجائے صاحب کتاب کا سوانحی تذکرہ ہے۔ اس لئے ناشر نے اس کو ترجمۃ صاحب هذه الرسالة المعلم عبد الحمید فراهی بقلم صدیقه العلامة الجلیل السید سلیمان الندوی رئیس جمعیة دار المصنفین ومنشئ مجلة (معارف) کے نئے سرورق کے ساتھ کتابچے آخر میں علیحدہ سے شائع کیا ہے مزید براں ان کے عربی اشعار "البیان" اور "الضیاء" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے"۔ اور ڈاکٹر حامد علی خاں کا بیان ہے کہ انہوں نے ان کے عربی دیوان کا مخطوط ندوہ میں دیکھا ہے جس میں رباعیات کے علاوہ تقریباً چار سو اشعار ہیں اور "ان کا عربی کلام العهد العتیق والجدید: قصائد، مواعظ وعبر، قصائد فخریہ، مدائح، مراثی، شکاوی ومعاذر، بصائر وحکم، رباعیات کے عنوانوں کے ماتحت دیوان میں درج ہے"[5]۔ استاد مرحوم علامہ شبلی سے متعلق کچھ عربی اشعار بھی ملتے ہیں[6]۔

موجودہ مقالہ میں ان کی صرف "قدیم ترین عربی تحریروں کا تعارف" پیش نظر ہے جو "البیان" میں شائع ہوئیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں سید صاحب کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ تھا کہ ۲ ذوالحجہ ۱۳۱۹ھ ۲۱ مارچ ۱۹۰۲ء کو لکھنؤ سے ایک ماہوار صحافتی، علمی، سیاسی، اخباری، تاریخی، ادبی رسالہ "البیان" نکلنا شروع ہوا، یہ رسالہ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا، پہلے عربی اور بعد میں اردو کا حصہ ہوتا تھا، اور بعض اہم مقالات اور عربی رسائل واخبارات کے اقتباسات کا اردو ترجمہ بھی آمنے سامنے کالم میں دیا جاتا تھا، "تاکہ عربی سے کم واقف یا ناواقف لوگوں کو تعلیمی فائدہ بھی حاصل ہو۔ اس رسالہ کے مدیر (منشئ) اس وقت کے مشہور صحافی وادیب عبداللہ العمادی[7] (وفات ۲۸ اگست ۱۹۴۶ء) نگراں ومنتظم مدراس کے ایک جید عالم عبدالعلی آسی[8] (وفات رجب ۱۳۲۷ھ، جولائی ۱۹۰۹ء) اور مالک و منیجر ان کے صاحبزادہ عبدالولی تھے۔

عربی زبان وادب کی تحصیل میں سید صاحب کا شغف، جدید عربی زبان کے مطالعہ کا شوق اور تعلیمی زمانہ ختم ہونے تک جیتی جاگتی، رواں دواں فصیح عربی زبان لکھنے پڑھنے بولنے پر عبور وقدرت محتاج بیان نہیں، اور اس صلاحیت کے استعمال کے مواقع کی تلاش بھی قرین قیاس ہے، پھر خواہ پیاسا کنویں کے پاس گیا ہو یا کنواں پیاسے کے پاس آیا ہو، بہر حال ایک زریں میدان ان کو پہلے پہل اسی رسالہ "البیان" نے فراہم کیا۔ یہ تعلق بھی کوئی ایسا گیا گذرا نہ تھا کہ اس کی طرف ان کے کسی سوانح نگار کی نظر نہ اٹھتی۔ جیسا کہ بدقسمتی سے ہوا، ان کی سب سے مبسوط سوانح میں اس کا تذکرہ اتنا سرسری ہے کہ پھر دوسرے سوانح نگاروں

نے اس کو قابل التفات ہی نہ سمجھا، عربی مضمون نگاری کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> "اور اب انھوں نے عربی میں مضمون نگاری شروع کر دی، اور ان کے مضامین لکھنؤ کے عربی رسالہ البیان میں نکلنے لگے، ایک دو مضمون علامہ رشید رضا مصری کے رسالہ المنار میں بھی نکلے۔"[۹]

بلکہ یہ ایسا مستقل و مسلسل تعلق تھا کہ جو شعبۂ اسلامیات علی گڑھ اور دار المصنفین اعظم گڑھ میں موجود "البیان" کی قدیم نامکمل فائلوں[۱] کی روشنی میں کم از کم دو سال تو یقیناً متواتر جاری رہا، اور ابتدا سے ربط کے چند ماہ بعد ان کو اس کی اعزازی ادارت کا شرف بھی حاصل ہوا، یہ اعزاز علامہ سید سلیمان ندوی کے لیے خود قابلِ فخر ہو یا نہ ہو، لیکن دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک نئے فارغ التحصیل طالب علم کی سوانح میں ذکر کے قابل ضرور ہے۔ ہمارے نزدیک تو اس کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جس طرح سنہ ۱۹۰۶ء تا سنہ ۱۹۱۰ء مختلف اوقات میں اردو صحافت کی تربیت کا یہ لا تجربہ اپنے مربی و محسن علامہ شبلیؒ کی رہنمائی و نگرانی میں انھوں نے تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد اردو ماہنامہ "الندوہ" کے معاون مدیر کی حیثیت سے حاصل کیا، جو سنہ ۱۹۱۶ء میں اُردو کی علمی ادبی صحافت کا نمائندہ "معارف" جیسا سنگ میل ماہوار رسالہ کے اجراء میں ان کے کام آیا، اسی طرح اور اسی زمانہ کے آس پاس جب عبد اللہ العمادی اور عبد العلی آسی جیسے فضلاء وقت کی ہمرکابی میں عربی ماہنامہ "البیان" کی اعزازی ادارت کا موقع ذو القعدۃ سنہ ۱۳۲۶ھ (دسمبر سنہ ۱۹۰۸ء) میں ملا تو استاد گرامی جو اس وقت حیات تھے اور ندوہ میں موجود تھے، ان سے بھی عربی صحافت کی ابتدائی رہبری و رہنمائی عملی ہو گی، اور پھر یہی تربیت محرم سنہ ۱۳۵۱ھ / جولائی سنہ ۱۹۳۲ء میں "الضیاء" جیسے نامور عربی رسالہ کے اجراء میں ان کی معاون ثابت ہوئی، جس کے وہ سرپرست و نگراں تھے، اور ان کے لائق شاگرد اس کی ادارت کے ذمہ دار۔ "مکاتیب سلیمان" بنام مسعود عالم ندوی پڑھیے" تو اس کے علمی مواد، زبان و بیان، ترتیب، کتابت، تصحیح، طباعت، مالیات وغیرہ سے متعلق ہر چھوٹی بڑی بات کی فکر و نگہداشت اور مفصل رہنمائی سے گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ اعظم گڑھ میں بیٹھے ہوئے درحقیقت اس کی ادارت ہی کے فرائض انجام دے رہے ہیں، یقیناً اس میں اُردو صحافت کے ان کے طویل تجربہ کے علاوہ عربی صحافت کی اولیں تربیت کو بھی بڑا دخل رہا ہو گا۔

بہر حال "البیان" سے سید صاحبؒ کا صحافتی علمی ادبی تعلق دار العلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے تقریباً متعاقب، جمادی الآخرۃ سنہ ۱۳۲۵ھ / جولائی سنہ ۱۹۰۷ء کے شمارہ سے شروع ہوتا ہے، اور دستیاب شماروں کی روشنی میں کم از کم تین سال شعبان سنہ ۱۳۲۹ھ / اگست سنہ ۱۹۱۰ء کے شمارہ تک بلا انقطاع قائم رہتا ہے۔ سب سے پہلے سنہ ۱۳۲۵ھ کے شمارہ جمادی الآخرۃ میں باون شعر کی ایک نظم أنین الاسلام فی الهند (ہندوستان میں مسلمانوں

کا نالۂ درد) شائع ہوئی ہے۔[۱۲] اسی سال ذوالقعدہ و ذوالحجہ کے مشترکہ شمارے میں علامہ شبلی کے حادثۂ پاؤں سے صحت یابی پر چودہ شعر کی ایک مبارکباد شائع ہوئی۔[۱۳] ۱۳۲۶ھ کے جمادی الآخرہ کے شمارہ میں ایک سو ایک عربی اشعار پر مشتمل ان کا ایک قصیدہ یا مسلمی الھند (مسلمانانِ ہند سے خطاب) شائع ہوا۔ دوسرے ماہ رجب میں ان کا مقالہ المجلس النیابی العثمانی (ترکی پارلیمنٹ) اشاعت پذیر ہوا۔ تیسرے ماہ شعبان کے شمارہ میں افتتاحیہ کی جگہ دو صفحات میں شذرات کا اضافہ ہوا، جن میں سید صاحب کے نام کا رمز "س"[۱۴] موجود ہے، اور سید صاحب کا ایک مقالہ اور باب الشعر کے نئے عنوان کے تحت سید صاحب کے اشعار شائع ہوئے۔[۱۵] اور اسی شمارہ کے ادارتی شذرات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

> "البیان کے جدید اسٹاف سے اس کی قوی امید ہے کہ البیان نہایت خوبی کے ساتھ اپنے وقت پر شائع ہوا کرے گا۔ چند مضامین کے نئے عنوانات اس میں بڑھائے جائیں گے، ہر سال ایک اردو اور ایک عربی کتاب ضمیمہ کے طور پر اس کے ساتھ شائع ہوا کرے گی۔"[۱۶]

لیکن "جدید اسٹاف" کے ناموں کی وضاحت نہیں کی گئی ہے اگرچہ تبدیلی نمایاں ہے، جیسا کہ شذرات کے اضافہ کا ہم نے ابھی ذکر کیا، جب کہ اس سے پہلے کئی شماروں میں عربی مقالات مع اردو ترجمہ ہی سے عربی حصہ کا افتتاح ہوتا تھا۔ رمضان کے شمارہ میں شذرات کسی کے نام کے بغیر شائع ہوئے ہیں، اور سید صاحب کا ایک مقالہ طبع ہوا ہے۔[۱۷] شوال کا شمارہ دستیاب نہیں، پھر ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دونوں شماروں میں سرورق پر اس کے مدیر (منشی) عبداللہ العمادی کے پہلو بہ پہلو ایک ہی سطر میں السید سلیمان جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے۔[۱۸] اور شذرات کے آخر میں اکثر و بیشتر ان کا پورا نام یا اس کا رمز "س" ملتا رہتا ہے۔[۱۹] ۱۳۲۷ھ کے محرم کا شمارہ موجود نہیں، صفر کے شمارہ سے آخر سال تک کے دستیاب شماروں میں سرورق پر یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ عبداللہ العمادی کے نام کے بعد دوسری سطر میں ان کا نام اور عہدہ المحرر بالمجلة: السید سلیمان افندی شائع ہونے لگا۔[۲۰] اثنائے سال ربیع الثانی تا جمادی الآخرۃ کے مشترکہ شمارہ میں زیادہ صریح وضاحت ملتی ہے اگرچہ وہ گذشتہ تفصیلات کی روشنی میں اپنے وقت سے کافی مؤخر معلوم ہوتی ہے:

> "دوسرا اطمینان اس سے بھی ہوا کہ مولوی سید سلیمان صاحب، ماڈرن عربک پروفیسر دار العلوم جن کی اردو اور عربی انشا پردازی تمام ہندوستان میں مسلم ہو چکی ہے، انہوں نے صرف اس شغف اور ذوق کی بنا پر جو ان کو عربی علم ادب سے ہے البیان کی آنریری ایڈیٹری منظور کی ہے، اور ان کا ارادہ ہے کہ مستقل طور سے نہایت جانفشانی کے ساتھ رسالہ وقت

پر عمدہ شائع کیا جائے۔[۲۱]

۱۳۳۰ھ کے اکثر شمارے ہم کو مل نہ سکے، تین دستیاب شماروں میں سے صفر کے شمارہ کے سرورق پر ان کا نام عبداللہ العمادی کے عہدہ کے ذیل میں دوسری سطر میں والسید سلیمان افندی معلم العربیۃ فی کلیۃ ندوۃ العلماء نظر آتا ہے[۲۲]۔ اس سال کے ربیع الاول کے شمارہ کا سرورق غائب ہے، دیگر کئی شمارے دستیاب نہیں، شعبان (اگست ۱۹۱۲ء) کے شمارہ کے سرورق پر عبداللہ العمادی کا نام موجود نہیں اور ان کے نام کی جگہ السید سلیمان آفندی والسید علی زینبی درج ہے[۲۳] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمادی صاحب کی جگہ سید صاحب اس رسالہ کے مدیر اعلیٰ اور زینبی صاحب ان کے معاون ہوئے، پھر یہ نظم کب تک قائم رہا؟ اور سید صاحب کا رابطہ اس رسالہ سے کب موقوف ہوا؟ ان سوالوں کا جواب آئندہ شماروں کی دستیابی پر موقوف ہے، بہت ممکن ہے کہ "الہلال" (کلکتہ) سے ۱۹۱۳ء میں تعلق قائم ہونے تک مذکورہ ربط چلتا رہا ہو۔

یہ تصویر کا ایک رخ ہے، دوسرا رخ جو زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ مذکورہ مدت کے دستیاب شماروں میں چند کے علاوہ[۲۴] کوئی ایسا شمارہ نہیں ہے جس میں سید صاحب کے نام یا ان کے نام کے رمز کے ساتھ ان کی کوئی تحریر نہ شائع ہوئی ہو، اس سے "البیان" کے ساتھ ان کا وہ قوی اور مسلسل ربط معلوم ہوتا ہے جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا، دس سال کے وقفہ کے بعد بیسویں جلد کے تین دستیاب شماروں میں سے رجب شعبان ۱۳۳۹ھ کے مشترک شمارہ میں خلافت وفد کے رکن کی حیثیت سے قیام انگلینڈ کے زمانہ کا ایک طویل عربی خط بنام مستشرق براؤن بھی ملتا ہے[۲۵]۔ ظاہر ہے اس طویل مدت کے بعد اس رسالہ کی مجلس ادارت وانتظامیہ سب بالکل بدل چکی ہے، لیکن اس خط کی موجودگی سے یہ قیاس کرنا بے محل نہ ہوگا کہ سید صاحب کی عربی تحریروں کے علاوہ ان کی سوانحی معلومات اور ملی سرگرمیوں کے لئے بھی "البیان" کی ایک اہم معاصر مصدر کی حیثیت ہے جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

بہرحال یہاں ہمارے پیش نظر تو صرف ان کی ان تحریروں کا تعارف ہے جن پر ان کا نام یا ان کے نام کا رمز ثبت ہے، دیگر تحریروں پر ان کے نام کی نسبت کا لیبل لگانا ہمارے دائرے سے خارج ہے، نیز یہ بھی ذہن میں رہے کہ ان کی یہ نگارشات زمانۂ تعلیمی کے فوراً بعد کی ہیں، ان میں زبان وبیان کی خامیوں کی تلاش اور ان پر حرف گیری بھی ہمارا مقصد نہیں ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ایک نئے نئے فارغ التحصیل طالب علم نے ایک ایسے زمانے میں جبکہ عربی لکھنے کا رواج بھی عام نہ ہوا تھا کتنے مختلف ومتنوع قسم کے میدانوں میں طبع آزمائی کی اور عربی زبان میں انشا پردازی کے جوہر دکھائے، ان کی ان تحریروں میں شذرات، مقالات اور شعر وشاعری کے معتد بہ ذخیرہ کے علاوہ دو تعارفی کلمات

ایک خط اور ایک تقریر بھی ملتی ہے، ان میں زبان کی سلاست و روانی، بیان کی حلاوت و چاشنی اور فکر کی جولانی کے مظاہر بھی بار بار سامنے آتے ہیں، پون صدی پہلے کی ان تحریروں میں عین ممکن ہے کہ رائج الوقت قدیم الفاظ و تعبیرات سے سابقہ پڑے جن کو عربی داں زمانہ ہوا بھلا چکے ہیں، اسی طرح مذکورہ تحریروں میں عبد الحمید فراہیؒ کے سوانحی خاکہ کے مقابلہ میں اسلوب کی پختگی میں اگر کوئی کسر نظر آئے تو یہ بھی قرین قیاس ہے کہ وہ سوانحی خاکہ پیش نظر تحریروں کے تقریباً بائیس ۲۲ سے چوبیس ۲۴ سال بعد ۲۷ر شعبان ۱۳۴۹ھ کو لکھا گیا ہے، روایتی قدیم شاعری پر تنقید[۲۶] کے باوجود سید صاحب بالکلیہ تقلید سے پرہیز نہیں کرسکے ہیں، لیکن انھوں نے اپنی شاعری میں عام طور پر اصلاحی اخلاقی تربیتی عنصر کامیابی سے شامل کردیا ہے، اس کے بعد ان کی مذکورہ تحریروں کا مختصر تعارف درج کیا جاتا ہے:

شذرات : سیاسی و اجتماعی، علمی و ادبی اور تعلیمی و تربیتی اہمیت کی خبروں پر یہ ہلکے پھلکے صحافتی نوٹس اصلاحی رنگ کے تاثرات کے آئینہ دار ہیں، اور اب ایک طویل مدت گذر جانے کے بعد ان کی حیثیت ایک تاریخی ریکارڈ کی ہوگئی ہے جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، یہ شذرات افتتاحیہ یا اداریہ کی جگہ پر ہر شمارہ کے ابتدائی دو صفحات میں شائع ہوتے رہے ہیں، اور ہم قیاس کرسکتے ہیں کہ اردو میں "معارف" کے مشہور قیمتی شذرات کی بنیاد یہیں "البیان" میں پڑی ہوگی، اور ان کی تحریر کی اولیں تربیت سید صاحب کو یہیں سے ملی ہوگی۔

نام کے رمز کے ساتھ سب سے پہلے شذرات ۱۳۲۶ھ کے شعبان کے شمارہ میں ملتے ہیں، جن میں سب سے پہلے ندوۃ العلماء کے عنوان سے اور اس کی علمی ادبی خدمات کے مختصر تعارف کے بعد ریاست بھاولپور کے ساتویں نواب امیر محمد صادق عباسی کی جدہ ماجدہ کے دار العلوم کی نئی عالیشان عمارت کی تعمیر کے لیے پچاس ہزار روپے کے کریمانہ عطیہ کا شکریہ ادا کیا ہے، پھر مدرسۃ الالٰہیات کے عنوان سے آریہ سماجی شدھی تحریک کے مسلمانانِ ہند پر اثرات اور ایک ایسے مدرسہ کی ضرورت جس میں ایسے علماء تیار کیے جائیں جو مختلف مذاہب کے علماء سے مناظرہ کرسکیں کا ذکر کرتے ہوئے ۱۳ر دسمبر ۱۹۰۸ء کو کانپور میں مذکورہ مدرسہ کے قیام اس کے مقاصد و نصاب تعلیم اور اسکے افتتاحی جلسہ کی روداد لکھی ہے، جس میں سید صاحب خود بھی شریک تھے اور تقریر بھی کی تھی[۲۷]، اس کے بعد ذوالقعدہ کے شمارہ میں ان کے مکمل نام کے ساتھ شذرات ہیں جس میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ بتاریخ ۲۸-۳۰ر نومبر ۱۹۰۸ء کی روداد و تجاویز اور اس موقع پر دار العلوم کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد نصب کرنے کی تقریب کی مفصل کارروائی مذکور ہے[۲۸]۔ اسی سال ذوالحجہ کے شمارہ میں تین اہم ملکی دینی، سیاسی و تعلیمی اجلاس شذرات کا موضوع بنے ہیں جو

دسمبر ۱۹۰۸ء میں منعقد ہوئے: مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس امرتسر اور اس کے تحت مسلم خواتین کی مصنوعات کی نمائش، مسلم لیگ کا اجلاس امرتسر جس میں مسلمان ججوں کی تقرری پر حکومت کے شکریہ کی تجویز اور حکومت سے مسلمان اور غیر مسلمان میں آبادی کے تناسب سے مساوات کے قانون کے لحاظ کرنے کا مطالبہ اور کانگریس کا اجلاس مدراس اور اس کے خطبۂ صدارت کے اہم نکات کا خلاصہ تعریف کے ساتھ دیا گیا ہے جو سیاسی و اقتصادی و اصلاحی فوائد پر مشتمل تھا۔ اور خاص طور سے اس میں آزادی، انگریزوں کو ملک بدر کرنے اور تجارتی مقاطعہ کا ذکر تھا۔[۲۹]

۱۳۲۷ھ میں صفر کے شمارہ میں شذرات مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی پر افسوس کے اظہار اور مستقبل میں تعلیمی ترقی کی امید پر مشتمل ہیں، خاص کر مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی ضرورت واضح کی ہے اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی بے حسی پر افسوس کا اظہار کیا ہے، پھر ۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۸ء کے اعداد و شمار کی روشنی میں ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم میں عام تنزل پر آنسو بہائے ہیں، اس کے بعد ایک ہندو دینی مدرسہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ہردوار میں ہندو متمول مخیرین کی اس مدرسے کیلئے بیش قیمت امداد کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کی ملی غیرت کو للکارا ہے، اور آخر میں عالم اسلام کی سال جاری میں تعلیمی میدان میں مساعی کا ذکر کرتے ہوئے ریاست حیدرآباد کی قائم کردہ ایک دینی جامعہ کی نیک دعاؤں کے ساتھ خبر دی ہے۔[۳۰]

ربیع الاول کے شذرات اس زمانے کی مجلس قانون ساز کے انتخابات میں انگریزوں کی مکاری سے مسلمانوں کی محرومی کے رد عمل میں ہیں، سید صاحب نے اس اداریہ میں غم و غصہ کے باوجود مسلمانوں کو ٹکراؤ کی سیاست سے دور رہنے کی تلقین کی ہے، اور ہوشیار کیا ہے کہ یہ ان کی غیر مشروط غلامانہ وفاداری کا نتیجہ ہے، اس لئے ان کو چاپلوسی کے قدیم رویہ پر نظر ثانی کر کے عزت نفس کے ساتھ حکومت سے معاملہ کرنا چاہیئے۔[۳۱] ربیع الثانی تا جمادی الآخرۃ کے مشترکہ شمارہ کے شذرات کئی موضوعات سے متعلق ہیں: پہلا موضوع افغانستان میں انگریزوں کے خلاف ملّا پائندہ کی مسلح تحریک ہے، سید صاحب امیر حبیب اللہ خاں کے ثنا خواں ہیں، لیکن ان کے اس تحریک کے ساتھ عدم تعاون اور انگریزوں کی اس پر خوشی کا ذکر کرتے وقت اپنی عادت کے خلاف ایک دم جذبات سے عاری ہو جاتے ہیں، اور کسی منفی یا مثبت اظہار رائے کے بجائے یہ حسرت بھرے الفاظ تحریر کرتے ہیں: (ملّا پائندہ نے) امیر سے بھی مدد مانگی، اور ان سے مکمل لام بندی اور تیاری کا مطالبہ کیا جس کو اس نے رد کر دیا، اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا، اس طریق کار پر انگریز امیر کی تعریف کر رہے ہیں۔ دوسرا موضوع محمڈن کالج علی گڑھ میں نواب وقار الملک سکریٹری اور مسٹر آرچ بولڈ پرنسپل کے اختلاف کے نتیجہ میں آخر الذکر کی برطرفی ہے جس پر سید

صاحب خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے عطا کردہ آزادی کے استعمال میں ارکان کالج نے یہ پہلا قدم اٹھایا ہے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کی سرخی کے تحت بیرسٹر خواجہ سید علی امام اور خواجہ عبدالعزیز کے سفر انگلینڈ کی اطلاع ہے جو وہاں سید امیر علی اور پرنس آغا خاں سے مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی رکنیت کے مسئلہ پر مشورہ کرنے کے لئے گئے تھے، آخری خبر لارڈ کشنر کے سفر چین کی ہے جس کو وہاں سے آسٹریلیا کی فوج کی قیادت سنبھالنے کے لئے آسٹریلیا جانا تھا، اس خبر کے آخر میں غالباً حالات کے دباؤ کے تحت سید صاحب کے مزاج کے برخلاف یہ فقرہ ملتا ہے کہ ہندوستان کے لئے فخر کی بات ہے کہ اپنے قائد سے محبت کرے، اور اس کی طرف پیار سے کی طرح دیکھے[۳۲]۔ آخری شذرات رجب تا شوال کے مشترکہ شمارے میں بھی مختلف موضوعات پر ہیں: سب سے پہلے امیر افغانستان کے انگریزوں سے خرابیٔ تعلقات کے سبب روس کی طرف رجحان کی خبر پر سوءِ انجام کے خدشہ سے فکر و پریشانی کے اظہار کا ہے۔ اس کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے دارالعلوم ندوۃ العلماء کو سالانہ ساڑھے تین ہزار کے عطیہ پر شکر گزاری کا ہے۔ پھر لارڈ منٹو پر شہر احمد آباد میں حملہ کی صرف خبر ہے۔ ایک اور خبر میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے رنگون میں اجلاس، اور مسلم لیگ کے دہلی میں اجلاس کی خبر کے ساتھ دہلی میں ندوۃ العلماء کے آئندہ اجلاس کی غیر مصدقہ اطلاع ہے۔ اگلی خبر میں انگریزی حکومت کی اصلاحات کے ذیل میں صوبہ وار قومی مجالس کے قیام اور ان کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں کے نمائندوں کے انتخاب کے موقع پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اکثر اہل ثروت ان مجالس کی رکنیت کے لئے کوشاں ہیں۔ اس کے بعد کی دو خبریں افغانستان میں ڈاک ٹکٹ کے اجراء اور ہندوستانی حاجیوں کی حجاز مقدس کے لئے روانگی سے متعلق ہیں۔ آخری شذرہ میں ریاست حیدرآباد کی علماء و فضلاء زمانہ کی جلاوطنی کے طریق کار پر سخت نکیر ہے اور اس کو ایشیا کی تمام ریاستوں کا مزاج بتایا ہے کہ وہ امت کے ہونہار افراد پر اعتبار نہیں کرتیں، اور ان کو جلد از جلد کچل دیتی ہیں[۳۳]۔

تعارفی کلمات: دستیاب شماروں میں اس قسم کے صرف تین مختصر تعارفی کلمات سید صاحب کے نام یا ان کے نام کے رمز کی صراحت کے ساتھ ملتے ہیں: شمارہ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ میں ایک جرمن مستشرق م۔ بارٹن کے مطبوعہ مقالہ سماحۃ الاسلام (اسلام کی رواداری) کا عنوان نصیحۃ تلمیذ لاستاذہ (شاگرد کی اپنے استاد کو نصیحت) بدلنے کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ اساتذۂ یورپ کے شاگرد مسلمان علماء کو غیرت آئے اور اپنی اصلاح سے ان کو گھن نہ آئے کیوں کہ بارٹن نے اعتراف کیا ہے کہ اے مسلمانو! تم ہمارے استاد تھے، اور ہم تمہارے شاگرد جو تم سے سبقت لے گئے، تو اب تم

ہم سے بڑھنے کی کوشش کرو۔[۳۴] پھر صفر سنہ ۱۳۲۸ھ کے شمارہ میں اپنی ایک برجستہ تقریر سے پہلے یہ وضاحت کی ہے کہ میں نے سر آغا خاں اور مسلمانوں کے ایک مجمع کے روبرو ۲ر فروری سنہ ۱۹۱۰ء کو دارالعلوم کی نئی عمارت میں عربی میں یہ برجستہ تقریر کی تھی۔[۳۵] اگلے شمارہ میں ایک عالم محمد حسین لکھنوی کا ایک مکتوب لندن قدرے مفصل تعریفی کلمات کے ساتھ شائع کیا ہے جس میں ان عالم نے اہل مغرب کے علمی رجحان کے بارے میں اپنے تاثرات لکھے تھے۔[۳۶]

تقریر:۔ علماء الاسلام واحتیاجھم الی العلوم الحدیثۃ (علماء کو جدید فلسفہ کا سیکھنا کیوں ضروری ہے؟)[۳۷] یہ وہی برجستہ تقریر ہے جس کا ذکر ابھی گذرا ہے۔

خط:۔ یہ وہی مکتوب سلیمانی بنام مستشرق براؤن ہے جس کا ذکر سید صاحب کی "البیان" سے وابستگی کی مفصل بحث کے آخر میں گذر چکا ہے۔[۳۸]

مقالات: "البیان" کے دستیاب شماروں میں سید صاحب کے آٹھ عربی مقالات بھی ملتے ہیں، ان میں بیشتر مقالات شذرات کے افتتاحی صفحات کے مع‍ًا بعد اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئے ہیں اور تین چار صفحات سے لیکر دس تک صفحات پر مشتمل ہیں، ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

۱۔ **المجلس النیابی العثمانی** (ترکی پارلیمنٹ): یہ چار صفحات کا مقالہ ہے جو ترکی میں پارلیمنٹ اور دستوری حکومت کے قیام کی خبر سے متاثر ہو کر خوشی اور مسرت اور تبریک و تہنیت کے جذبات کے ساتھ لکھا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ترک قوم کو اس خطرہ سے ہوشیار رہنے کی بھی تلقین کی ہے جو فوج کے دباؤ کے تحت نظام حکومت کی تبدیلی سے پیش آتا ہے، کیونکہ فوجی سردار آئینی حکومت کو شخصی مطلق العنان حکومت سے تبدیل کرنے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔[۳۹] سید صاحب کی یہ بروقت تنبیہ کتنی صحیح ثابت ہوئی۔

۲۔ **علم الکلام والتوحید واُصحاب الحدیث** (علم کلام اور محدثین): یہ ایک طویل مقالہ کی پہلی قسط ہے جو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، دستیاب شماروں میں دوسری قسط نہ ملی۔ موجودہ قسط اوّل میں پہلے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمانوں میں علم کلام فلسفہ کے بعد پیدا ہوا، کیونکہ عقائد کی بحث تو صحابہؓ کے زمانہ سے شروع ہو چکی تھی اور برابر جاری رہی اور مختلف فرقوں کے ظہور کا سبب بنی، جبکہ خالص فلسفہ کی کتابیں عباسی خلیفہ منصور (تخت نشینی سنہ ۱۳۶ھ) کے زمانہ تک ناپید تھیں، اور ان کو عام رواج مامون (تخت نشینی سنہ ۱۹۳ھ) کے عہد میں ملا۔ پھر علم کلام کی دو قسمیں کی ہیں: نقلی علم کلام محدثین کے ہاتھوں فلسفہ سے پہلے پیدا ہوا، اور عقلی علم کلام کی تدوین فلسفہ کے ظہور کے بعد ہارون الرشید

(تخت نشینی ۱۷۰ھ) سے شروع ہوئی۔ فریقین کے طرزِ فکر اور بنیادی اختلافات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یونانی علوم کے زیر اثر قرآن میں اجمالاً مذکور عقائد سے متعلق ہر مسئلہ کے نفیاً یا اثباتاً جواب کی تلاش اور ان کو جزوِ ایمان بنانے سے اسلام کو کوئی بحث نہیں ہے۔ اس کو تو صرف اخلاق، تمدن، اعمال صالحہ کی تعلیم اور ان عادات و عبادات سے غرض ہے جن کی تعلیم اس نے خود انسان کے فائدے کے لئے دی ہے۔[۴۰]

۳۔ **خطب النساء المسلمات فی الحروب** (خواتین اسلام کی میدان جنگ میں تقریریں): اس مقالہ سے پہلے اُردو میں خواتین اسلام کی میدانِ جنگ میں بہادری کی داستان سنا چکے تھے۔[۴۱] نو صفحات کے موجودہ مقالہ میں اس کے حوالے سے ان کی ولولہ انگیز تقریروں کو جمع کیا ہے۔ یہ سب تقریریں ان خواتین کی ہیں جو جنگ قادسیہ اور صفین و جمل کے معرکوں میں شریک تھیں جیسے اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ، الزرقاء بنت عدی، عکرشہ بنت الأطرش، اُم الخیر بنت حریش، مشہور عرب شاعرہ خنساء بنت عمر اور عبداللہ بن الزبیر کی والدہ اسماء۔[۴۲]

۴۔ **إعجاز القرآن** (اعجاز قرآن): یہ ڈھائی صفحہ کا ایک مختصر سا مقالہ ہے جس میں معجزۂ قرآن کے اعجاز پر لکھنے والے مختلف علماء کا مجمل سا تذکرہ کرتے ہوئے جاحظ کی تاریخی اور فلسفیانہ بحث کا پسندیدگی کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور اسی کے اقتباس پر مقالہ کا اختتام کیا ہے جس کو سیوطی کی الاتقان فی علوم القرآن کے حوالہ سے لیا گیا ہے۔[۴۳]

۵۔ **المسیحیۃ والاسلام** (عیسائیت اور اسلام): گذشتہ مقالہ سے پیوستہ یہ ایک صفحہ کا مختصر سا شذرہ ہے جس میں عیسائیوں کے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہ اسلام علم و تمدن کا دشمن ہے، خود عیسائیت پر یہی الزام لگایا ہے اور اس کے علماء کو دعوت مبارزت دی ہے۔[۴۴]

۶۔ **الشعر العربی** (عربی شاعری) دس صفحات کے اس مقالہ کی ابتدا حکمت و دانائی پر مبنی شاعری کی فضیلت اور سخیف و بے مقصد شاعری کی مذمت سے کرتے ہیں جس کا عربی شاعری پر غلبہ ہے، جبکہ پہلی قسم نادر و نایاب ہے، قدیم شعراء کی شاعری سے بدمذاقی کے نمونے مثال کے طور پر دینے کے بعد یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ تیرہ صدی گذرنے کے بعد بھی عربی شاعری قصیدہ گوئی کی قید میں گرفتار ہے جس نے اس کے افق کو محدود کر دیا ہے، اور اس میں فارسی شاعری کی اصناف سخن غزل، مثنوی، مثلث رباعی، مخمس، مسدس وغیرہ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ عربی شاعری میں عام روش سے ہٹ کر اگر کوئی صنف سخن پائی جاتی ہے تو وہ بھی اندلس، ایران اور ہندوستان کی دین ہے جیسے موشحات، عروض البلد،

مردف، مستزاد، دوبیت وغیرہ۔ بدوی شعراء فطرت کے دیئے ہوئے خیالات پر طبع آزمائی اور گھسے پٹے معانی کی تکرار پر تنقید کرتے ہوئے حکمت وموعظت، فلسفہ واخلاق اور احساسات وجذبات و شعور کی ترجمان شاعری کی وکالت کرتے ہیں، اور آخر میں نمونے کے طور پر اپنی سادہ مگر پرمغز نو رباعیات فصیح وبلیغ عربی زبان میں پیش کرتے ہیں[۴۵] جن کا ترجمہ آئندہ آئے گا۔

۷۔ **المدنیۃ الاسلامیۃ والمدنیۃ الحدیثۃ** (اسلامی تمدن اور جدید تمدن): گذشتہ مقالہ سے پیوستہ ڈھائی صفحہ کا ایک مختصر شذرہ ہے جس میں اسلامی تہذیب کی چھاؤں میں انسانی زندگی کے سکون واطمینان کا مقابلہ مغربی تہذیب کے گہوارہ امریکا کے ایک شہر نیویارک میں خودکشی کے بکثرت واقعات کی روشنی میں کیا گیا ہے[۴۶]۔

۸۔ **المولد النبوی والمحتفل الاول بہ** (مجلس میلاد اور اس کا پہلا بانی): ان کے دستیاب مقالات میں یہ آخری مقالہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہے جو ماہ ربیع الاول ۱۳۲۶ھ کے موقع پر لکھا گیا۔ حیرت ہے کہ اس بدعت کے بانی ملک معظم مظفر الدین (۵۴۹ - ۶۳۰) کا قدر دانی کے جذبہ کے ساتھ ذکر کیا ہے جنھوں نے چھٹی صدی ہجری میں "اس مہینہ کو ولادت نبوی کی یادگار اور مجلس میلاد کا زمانہ بنایا"۔ پھر ان کے حالات زندگی ابن خلکان کی کتاب **وفیات الأعیان** سے خلاصۃً پیش کئے ہیں، اور میلاد کی پہلی کتاب **التنویر فی مولد السراج المنیر** اور اس کے مؤلف ابو الخطاب عمر بن حسن بن دحیہ اندلسی (۵۴۴ - ۶۳۳ھ) کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے[۴۷]۔

شاعری: سید صاحبؒ کی تعلیمی زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو عربی زبان میں شعر گوئی سے ابتدا ہی سے مناسبت تھی، ۲ نبر ۱۹۰۲ء میں نواب محسن الملک (۱۸۳۷ - ۱۹۰۷ء) کی ندوہ آمد کے موقع پر عربی قصیدہ سے ان کے استقبال کا واقعہ معروف ہے[۴۸]۔ "البیان" سے ابتدائی ربط بھی ان کے اشعار کی اشاعت سے قائم ہوا، جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، عربی قدیم شاعری پر ان کی تنقیدی نظر بہت گہری تھی جیسا کہ "البیان" ہی میں شائع شدہ مذکورہ مقالہ **الشعر العربی** (عربی شاعری) سے واضح ہے، جس میں انھوں نے عربی شاعری کے محدود افق، چند اصناف سخن میں حبس دوام، بار بار دہرائے ہوئے بدویانہ خیالات اور گھسے پٹے معانی کی پابہ زنجیری پر سخت تنقید کی تھی، اور اس میں نئے نئے اصنافِ سخن کے لئے راہ ہموار کرنے اور اس کے دامن کو فلسفہ، حکمت، اخلاق وموعظت کے معانی کے لئے کشادہ کرنے اور احساسات وجذبات سے بھرپور شاعری کی پرزور وکالت کی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تنقید کی روشنی میں اگر ان کی دستیاب شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اس

میں تنوع، رنگا رنگی، حرارت وگرمی، مقصدیت وپیغام ملے گا۔ ان کی تمام رباعیاں اور اکثر قصائد ونظمیں، حکمت ودانائی اور اخلاق وموعظت کی حامل ہیں، اسلاف کے قابل فخر کارناموں سے سبق لینے کا ولولہ انگیز تذکرہ ان کی نظم أنين الاسلام فی الهند اور طویل ترین قصیدہ نما نظم یا مسلمی الهند سے ظاہر ہے، احسان مندی اور تشکر کے جذبات میں ڈوبا ہوا نذرانۂ عقیدت ان کے استاد گرامی کی حادثۂ پاؤں سے صحتیابی کی مبارکبا وتهنئة لصحة الاستاذ شبلی النعمانی ہے، دنیا کی بے ثباتی کی حقیقت ان کی نظم المسرة ما هی؟ سے واضح ہے، مناظر فطرت کی حسین تصویر کشی ان کی نظم الشمس فی الشفق عند مغیبها میں ہے، اور اگر احساسات وشعور کی گہرائی اور جذبات کی تپش دیکھنا ہو تو دلوں کو تڑپا دینے والی یادِ وطن کی آئینہ دار نظم حب الوطن کو گنگنایئے اور دنیا وما فیہا سے بے خبر ہو جائیے۔ لیکن ایک سو ایک اشعار پر مشتمل ان کی قصیدہ نما نظم کا ابتدائی نصف سے زیادہ حصّہ خود قدیم شعراء کی نری تقلید کی زد میں آتا ہے، اگرچہ اس روایتی بدویانہ خیالاتِ فطرت کی حامل تمہید کی کچھ تلافی بعد کے باقی حصہ سے ہو جاتی ہے، جس میں عظمت رفتہ کی یاد کے ساتھ درس عبرت بھی ہے، اور دین ودنیا اور علم وتقویٰ کے حاصل کرنے کی جدوجہد کا پیغام بھی۔

اب ذیل میں ہم سید صاحب کے ان دستیاب عربی اشعار کی اُردو میں ترجمانی کریں گے جو "البیان" میں اشاعت پذیر ہوئے۔ جن اشعار کا اردو ترجمہ پہلے شائع ہو چکا ہے ان کے صرف حوالہ پر اکتفا کیا جائیگا۔ اشعار کے ترجمہ یا ترجمانی سے یقیناً شاعر کی شاعرانہ بلند پروازی، اس کے اسلوب کی امتیازی شان، مخصوص تعبیرات کا اچھوتا پن اور زبان وبیان کی حلاوت وچاشنی کا حق ادا نہیں ہوتا ہے، لیکن کچھ نہ کچھ خیالات کی وضاحت، معانی کی بلاغت اور پیغام کی افادیت کا اندازہ ہو جاتا ہے، ان سے اصل حظ حاصل کرنے کے لئے تو ان کو عربی ہی میں پڑھا جانا چاہیئے۔

۱۔ أنين الاسلام فی الهند (ہندوستان میں اسلام کی نوائے درد): اب تک ہمارے نزدیک "البیان" میں شائع شدہ سید صاحب کی یہ سب سے قدیم تحریر ہے جو جمادی الآخرۃ ۱۳۲۵ھ، (جولائی ۱۹۰۷ء) کے شمارہ میں طبع ہوئی، یہ کل باون ۵۲ اشعار کی نظم ہے جس میں عہد شباب کے عشق ومحبت کے خوشگوار ایام کی صدائے بازگشت ہے، جنونِ عشق سے خمار آلودہ آنکھیں ہوش میں آتی ہیں تو شاعر کی نگاہیں قوم کی حالتِ زار پر پڑتی ہیں، ہجر وفراق کی درد بھری کہانی کو رونے والا دل کوچۂ جاناں کو چھوڑ چھاڑ کر قوم کی چوکھٹ کو سنبھالتا ہے اور اس کی ذلت وپستی پر گریہ کناں ہوتا ہے، ہوُرخانہ بصیرت کی روشنی میں ابناء قوم کو شاندار ماضی کے قابلِ فخر کارنامے یاد دلاتا ہے، رسوائی کی انتہائی

حدود پر قناعت سے بیزاری پیدا کرتا ہے، خوابِ غفلت سے جگاتا ہے، قومی و ملّی غیرت کو للکارتا ہے، اسلام کی دہائی دیتا ہے، نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ جدوجہد سے بھرپور زندگی کے لئے پھر ایک بار آمادہ کرتا ہے، اب شاعر کو خود اس کی زبان میں سنئے:

"لیلیٰ کی محبت، وادیٔ نجد کی یاد اور شدّتِ عشق میں اس کے دیار کے ٹیلوں کو چومنے کی عادت عرصہ ہوا کہ میں چھوڑ چکا۔ اے خیالِ یار! اس سے جاکر کہہ دے کہ اب میں اس کے جان لیوا عشق و محبت سے قرار پا چکا۔ اب نہ میرے دل میں اس کے عارض و رخسار کی کوئی چنگاری باقی ہے اور نہ میں اس کی زلفِ گرہ گیر کا متوالا ہوں، نہ اس ہرنی کی سرمگیں آنکھیں میری جان کے درپے ہیں اور نہ میں اس کے ابھرے ہوئے سینے کا دیوانہ ہوں۔ اے میرے دونوں ساتھیو! اپنے شیشوں کی ساری شراب لنڈھا کر انہیں اشک و نالۂ درد و بے خوابی سے بھر دو۔ اے میری شبِ غم! تاریکی کے نقاب الٹ دے اور خمار آلود آنکھوں میں شہابِ ثاقب کے دیے روشن کر دے۔ عشقِ لیلیٰ سے میری دستبرداری زہد و تقویٰ کی بنا پر نہیں، نہ میں اپنے محبوب کے لئے بدعہد و جفاکار ہوں۔ نہ میری عقل ماری گئی ہے اور نہ میں بیوقوف ہوں اور نہ میں یہ سب کچھ اس کی بے رخی کے غصہ میں بک رہا ہوں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عہدِ جوانی گذر گیا اور گردشِ ایام نے عیش و آرام کی زندگی کو سختی اور درشتی سے بدل دیا۔ دنیا کی چکی کچھ اس طرح گھومی کہ ابناءِ اسلام کی بستی ہندوستان کی سلطنت اس کی حاشیہ نشین بن کر رہ گئی۔ اس کے گلشن ویران ہو گئے اور اس کی بستیاں بوم و غراب اور چوپایوں کا مسکن بن گئیں۔ کاش کہ ہم مٹی ہوتے تو اس ذلت و رسوائی اور عار کے سیاہ داغ کو نہ جھیلتے۔ ہماری شان و شوکت کے محلات کے تخت و تاج زمین بوس ہو چکے اور دینی علوم کے قلعوں کے ستون ڈھا گئے۔ ہماری عزت و عظمت کی بنیادیں ہل گئیں اور سطوت و جلال کے بلند و بالا پہاڑ لرزہ براندام ہو گئے۔ مراکش و بغداد و ہند میں خوابیدہ اسلاف کی روحو! تم نے تو اپنے اخلاف کو عظمت کے بامِ عروج پر مسند نشین چھوڑا تھا، لیکن تمہارے بعد وہ (ناخلف) بندروں سے زیادہ ذلیل ہو گئے۔ تم نے ان کو تاج و تخت کا وارث بنا کر چھوڑا تھا لیکن تمہارے بعد دشمن ان کو اپنے حکم سے غلاموں کی طرح نچاتے ہیں۔ اور اب اللہ کے دین کے جھنڈے سرنگوں ہیں جبکہ کفر کی صلیبیں سربلند ہیں۔ کل کے صاحبِ ثروت دولتمند آج خالی ہاتھ ہیں اور سردی کی تکلیف سے بچنے کے لئے ان کو کوئی چیز بھی نصیب نہیں۔ ناز و نعم کے اثرات سے جن چہروں پر کبھی حسن کی تب و تاب تھی وہی چہرے آج مخلوقات میں اپنے بدنما داغوں سے نمایاں ہیں۔ جن باغات کے بالائی حصوں میں کل عود و صندل و گلاب اگائے جاتے تھے وہاں آج خودرو کانٹے دار گھاس پھوس اوگ رہے ہیں۔ نافرمانی اور جہالت کے پھیلے

ہوئے سایوں میں علم و تقویٰ کا سورج گہنا گیا ہے۔ ان کی مسجدیں کفار کے محلوں میں تبدیل ہو گئی ہیں جہاں زاہد کی سجدہ گاہ پر کتا شب گذاری کرتا ہے۔ ان کے مدارس فرسودگی کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں اور علم و رشد و ہدایت کا فریضہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کے جیالے جوان عیسائیوں کے سامنے خوف و احتیاط کے مارے بزدل ہو گئے ہیں جیسے کہ گھاٹ پر پہنچ کر ہرنی سہمی سہمی سی رہتی ہے۔ یہ انہی جانبازوں کی اولاد ہیں کہ جب وہ گھمسان کے رن میں کود پڑتے تھے تو شیروں پر حملہ آور ہو جاتے تھے۔ ان کو نحوست کی تاریکیوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے اور ان کی سرزمین سے خوش بختی کے تارے روٹھ چلے ہیں۔ ان کے دین کا گوہر آبدار سمندر میں گر کر گم ہو چکا ہے جو کہ بیتی صدیوں میں ان کے ہار کا شہ نگیں تھا۔ ان کا سرچشمۂ حیات تکدرات کی آندھیوں سے گدلا ہو چکا ہے جبکہ پہلے اس کا پانی میٹھا اور سہل الحصول تھا۔ اور گردش زمانہ نے ہر نااہل کو سربلند کر دیا تو وہ امام بن بیٹھے جو گمراہ کرتے ہیں اور ہدایت نہیں دیتے۔ جب وہ ممبر پر سے لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں تو ان سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو نقصان دہ ہوتی ہیں نفع بخش نہیں۔ جب وہ کج بحثی پر آتے ہیں تو اپنی بات کی تائید چاہتے ہیں خواہ حق کو مخالفانہ زبان سے توڑنا مروڑنا ہی کیوں نہ پڑے ان کی قوم کے تمام رہنما اٹھ گئے کیونکہ کسی مولود کو بھی موت سے چارہ نہیں۔ طرح طرح سے ان کو ذلیل کیا جاتا ہے اور وہ قتل و جلاوطنی، قید و بند اور لعنت و ملامت کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے زندہ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اردگرد علم کے حلقے آباد تھے اور اب ان کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہیں۔ ان کے قلمدان ان پر آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں اور ان کے لئے سینہ فگار ہیں۔ ان کی مساجد کی محرابیں گریبان چاک ہیں اور علم کے گرتے ہوئے ستونوں پر نوحہ کناں۔ کیا ہم سہالی کے جلیل القدر عالم قطب الدین یا ان کے بیٹے نظام الدین پر روئیں، کیا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی یا سندھ کے عالم شیخ محمد حیات کا مرثیہ لکھیں؟ کیا ہم ملا بحر العلوم پر آنسو بہائیں جو چاردانگ عالم میں مشہور تھے؟ کیا ہم شاہ عبدالعزیز کے لئے سینہ کوبی کریں؟ یا ثناء اللہ امرتسری اور شیخ سرہند مجدد الف ثانی کی جدائی کا ماتم کریں؟ مجھ سے دہلی اور اس کی خاک میں پوشیدہ حکومت و سلطنت اور علم و زہد کے آفتاب و ماہتاب کے بارے میں پوچھو، اور آگرہ کے قصور و محلات اور تاج محل جیسی عالیشان بے نظیر یادگار کے بارے میں سوال کرو۔

غم کے بوجھ سے جی کو ہلکا کرو اور بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھو کہ غم کی آگ آنسوؤں سے سرد نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر ان زمینی آثار کو گردش زمانہ نے مٹا دیا ہے تو کتابوں میں محفوظ ان کے ابدی نشانات تو نہیں مٹے ہیں۔

زمانہ کی ہر چیز کے تمام و کمال پر اس کی انتہا ہے۔ اور اے ساتھی! کیا مصائب زمانہ کی کوئی حد ہے، وہ تو گویا ایک کتاب کے اوراق ہیں جن کو زمانے کے ہاتھ بلا ارادہ الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ لہذا زمین پر رہنے والے کسی انسان کے لئے فقر و غنا اور تلخی و شیرینی سے نجات نہیں۔ جو شخص اپنے زمانہ کے خوش گوار ایام عیش و آرام، دولت کی فراوانی، لاؤ لشکر، طاقت و قوت، دانشمندی، عقل و خرد، ساتھیوں کی کی جماعت، ہتھیاروں کے ذخیرہ اور تیز گام گھوڑوں کی بڑی تعداد سے فریب میں مبتلا ہو جائے (تو یہ اس کی کوتاہ نظری ہے)۔ ورنہ اہلِ بصیرت کو اس کی حقیقت کا بخوبی علم ہے اور ان کی چشم بینا قحط، بغض و حسد اور زمانہ کی دغابازی کو اچھی طرح دیکھتی ہے۔ جن سے ہم کو واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ دراصل ہماری ہی غفلت اور خوابِ بے ہنگام کا نتیجہ ہے، لہذا اے فرزندانِ قوم جلد از جلد اٹھ کھڑے ہو کیونکہ خوش بختی جد و جہد سے وابستہ ہے۔ کوئی مسافر پیر اٹھائے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، اور نہ کوئی انسان محنت کے بغیر عظمت و شرف کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔"[۴۹]

۲۔ **تهنئة لصحة حضرة الأستاذ شبلي النعماني** (علامہ شبلی نعمانی کی صحت پر مبارکباد): ۷؍مئی ۱۹۰۷ء کو غلطی سے بھری ہوئی بندوق سر ہو جانے کی وجہ سے علامہ شبلیؒ کا قدم مبارک اس کی زد میں آکر چور چور ہو گیا تھا لہذا نصف پنڈلی تک جدا کرنا پڑی، علامہ کے مخلص معاصرین، متوسلین اور شاگردوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ صحتیابی پر بہت سے لوگوں نے اردو فارسی میں شعری نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ سید صاحب نے عربی میں مبارکباد پیش کی جو "البیان" ذوالقعدہ و ذوالحجہ ۱۳۲۵ھ (دسمبر ۱۹۰۷ء، جنوری ۱۹۰۸ء) کے مشترکہ شمارہ میں شائع ہوئی[۵۰] لیکن غالباً سید صاحب اس اشاعت کو بھول گئے اور حیات شبلی میں بیان کیا کہ انھوں نے اس کے چند اشعار الندوہ (دسمبر ۱۹۰۹ء) کے ایک مضمون "علمائے سلف اور کتب بینی" میں چھاپ دیئے کہ وہ نظر اشرف سے گذر جائیں۔ کیونکہ حیات شبلی میں بھی یہ اشعار مع اردو ترجمہ کے موجود ہیں[۵۱] اس لئے یہاں ان کے ترجمہ کی ضرورت نہیں۔

۳۔ **یا مسلمي الهند** (مسلمانانِ ہند سے خطاب): "البیان" میں سید صاحب کے مطبوعہ اشعار میں یہ سب سے طویل قصیدہ نما نظم ہے، اس کے اشعار کی تعداد ایک سو ایک ہے، اس کے ابتدائی نصف سے کچھ زیادہ حصہ میں قدیم شعراء کی روایتی تمہید و تشبیب میں اپنی زبان دانی کے جوہر دکھائے ہیں، یہاں ہم اس کے نصف آخر کے اصلی پیغام والے حصہ کی مختصر ترجمانی کرتے ہیں:

مسلمانوں کو ماضی کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتے ہوئے ہوشیار کرتے ہیں کہ "تم مدہوش ہو، اور زمانہ ببانگِ دہل پکار رہا ہے کہ لہو و لعب اور بدمستی سے باز آجاؤ۔" علماء قوم کو ان کا منصب ہدایت

یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ "صحیح رائے سے ان کی راہ روشن کرو کہ اگر تم ہی ان کی رہنمائی نہ کرسکے تو پھر ان کا کوئی رہبر نہیں"۔ "تابندہ ماضی کے قابل فخر نشانہائے راہ کے پر مسرت ایام کی لذیذ یاد اور انقلاب زمانہ کے بعد ابنائے قوم کی بدحالی پر حسرت کے آنسو بہاتے ہوئے ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ "کیا تم کو اس زمانہ سے اب بھی کسی بھلائی کی امید ہے۔ اس سے تو جب بھی کسی چیز کی اصلاح کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے اس کو اور بگاڑ دیا"۔ دیگر بلند حوصلہ اقوام جو اپنے آپ کو علم کے زیور سے آراستہ نہ کرسکیں ان کے ساتھ بے وفا زمانہ کی جفاکاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علاج تجویز کرتے ہیں کہ "عظمت و بلندی، علم و تقویٰ نوجوانوں کے لئے بہترین اور غیر فانی توشہ ہے، تم نے تو رسول اللہؐ سے ان کے دین کی نصرت کا وعدہ کر رکھا ہے، خدارا اس عہد و پیمان کو نہ توڑو، عقائد کی کجی درست کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو جو کہ ہر توحید پرست کو اسلام سے منحرف کر چکی ہے، ضائع شدہ سرمایۂ عظمت و فخر کو دوبارہ حاصل کرو جس کو حاسدین کے قلم تہس نہس کر چکے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جو تم کو اپنی سیاست گری میں اس طرح گھسیٹتے ہیں جیسے کہ چھوٹی بچیاں اونٹ کو نکیل پکڑ کر گھسیٹتی پھرتی ہیں، وہ ہماری تواضع زہر ہلاہل سے کرتے ہیں، تو ہمیں کون بچائے گا اس مہلک زہر سے جو امرت کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے، وہ اپنے عمل سے ہم کو بدترین عذاب دیتے ہیں اور ان کا ہر وعدۂ وفا بے وفائی میں بدل جاتا ہے، گویا کہ ہم تمام دشمنوں کے غلام ہیں اس لئے ان میں سے ہر ایک ظلم و زیادتی کرتا ہے، انجام کار سے منہ نہ موڑو کہ جو نتیجہ پر نظر رکھتا ہے وہ قابل تعریف ہے، میری پکار پر لبیک کہو، کہ یہ گمراہ کن آواز نہیں ہے، اور نہ گم کردہ راہ مقتدی بن سکتا ہے، علم و تقویٰ کی مسند جلد از جلد سجاؤ کہ مصائب زمانہ کی نگاہ تمہاری گھات میں ہے، ترقی و بلندی کے حصول کے لئے جہاں تک ممکن ہو کوشش کرو کہ اس میدان میں سعی کی کوئی انتہا نہیں، اے میرے ساتھی! ہمارے نبیؐ کے دین کا کیا حال ہو گیا ہے کہ میں ہر مسجد کو سجدہ گذار سے خالی دیکھتا ہوں، ملحد و بے دین کے ہاتھوں تم دین کی عمارت منہدم ہوتے دیکھتے ہو اور تمہارے سینے کھولتے نہیں ہیں، ہوش میں آؤ کہ تمہاری مدہوشی دراز ہو چکی، اور راحت و آرام، لڑکپن اور ناز و ادا کا زمانہ گذر چکا، کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ دل انجام کار سے ڈریں، مستقبل کے لئے کوشاں ہوں اور کل کے لئے کچھ کمائی کرلیں؟ نیچ پن، فضول خرچی، خود پسندی اور خواہشات کو خیرباد کہو کہ یہ چیزیں امت احمد کو زیب نہیں دیتیں"۔"

۴۔ **المسرۃ ما ھی؟** (شادمانی کیا ہے؟)[۵۳]

۵۔ **الشمس فی الشفق عند مغیبھا** (شفق کی چلمن میں سورج بوقت غروب[۵۴])؛ اس کتاب کے

ایک سابق مقالہ میں ان دونوں نظموں کا ترجمہ گذر چکا ہے۔

۶۔ **حب الوطن**: یہ بیس اشعار کی ایک نظم ہے جو وطن کی یاد میں دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے، اس میں شعور کی صداقت اور احساسات و جذبات کی حرارت پر مبنی محبت کے مارے ایک غمزدہ پردیسی کی دل کو چھو لینے والی داستانِ غم و الم قلمبند کی گئی ہے، جس میں وطن و اہلِ وطن کی یاد کی تڑپ، فراق و جدائی کے شکوہ کی تپش، اور ملاقات کے ہیجان خیز شوق و اشتیاق کی عکاسی اتنے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ گویا پڑھنے والا شاعر کے دلِ مہجور میں جھانکنے لگتا ہے، کہتے ہیں: "وطن اور اہلِ وطن تک رسائی کیسے ہو کہ میرے اور ان کے درمیان سنگلاخ دیواریں حائل ہیں؟ ایک طویل زمانہ کے بعد جبکہ وہ مایوس ہو چکے ہیں کیا میری ان تک واپسی کی کوئی راہ ہے؟ ملاقات کیسے ہو کہ سرزمین محبت دور ہے؟ کاش کہ میں ایک پرندہ ہوتا جس کے دو پر ہوتے! جب وطن کی یاد آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا ایک رسّی دل سے بندھی ہوئی ہے جو مجھ کو میرے اہلِ وطن کی طرف کھینچ رہی ہے۔ جب میں سوتا ہوں تو ایک خیال جو ہمسفروں کی یاد کو جگائے رہتا ہے، مجھے بے خواب رکھتا ہے۔ اے الفتِ صیاد! مجھے اس گرفتاریٔ بلا سے رہائی دلا کہ پردیس میں میرا جسم بندھا ہوا ہے۔ وہ ویرانہ جہاں دوستوں کی رفاقت میسر ہو میرے لئے آباد باغ و چمن سے کہیں بہتر ہے۔ دیارِ غربت میں جہاں کوئی مونس و غم گسار نہیں ہے میری پکار پر کون دستگیری کو آئے گا؟ جس کا کوئی ہمدم و دمساز نہ ہو اس کے لئے کس کا دل پسیجے گا جبکہ پردیس میں مصائب و آلام کی یورش ہو؟ اور بیمار پڑنے پر کون میری تیمارداری کرے گا اور بندِ غم سے کون مجھے نجات دلائے گا؟ اور اگر کسی عارضہ میں مجھے موت آ گئی تو بوسیدہ جسم کو کون کفن پہنائے گا؟ اور قبر میں لٹاتے وقت کون مٹی دے گا اور کون ماتم کرتے ہوئے اپنا گریبان چاک کرے گا؟ اے ناقہ صحراء کے حدی خواں! کیا تیرا رُخ دیارِ حبیب کی طرف ہے؟ یعنی دلینہ جو شروع سے میرا وطن مالوف ہے، جب استھاواں سے گذرتے ہوئے تو وہاں پہنچے تو ایک دور افتادہ کا سلام شوق پہونچانا، اور اگر یہ پوچھا جائے کہ تو اس سے کب ملا تھا یا اس مصیبت زدہ بے کس و لاچار کو کس حالت میں پایا تھا؟ تو میرے اہلِ وطن کو یہ پیغام پہنچانا کہ کیا جدائی و فرقت اس رسی کو کاٹ سکتی ہے جو ایسی کمزور بھی نہیں ہے؟ زمانہ نے تو ہمدم و دمساز بھی نہ چھوڑے کہ جن سے سرزمین فراق میں میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں۔ آخر شب کبوتریاں خوشی سے نغمہ سرا ہوتی ہیں جبکہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بندھی ہوتی ہے، کیا وطن واپسی کے بعد وہاں کے گل و گلزار اور راحت و خوشی مجھے واپس ملنے والی ہے؟" [۵۶]

رباعیاں: اخلاق و آداب، حکمت و موعظت کی ترجمان دس رباعیاں "البیان" کے دستیاب

شماروں میں ملی ہیں، جن میں سے چار کا ترجمہ ایک سابق مقالہ میں گذر چکا ہے[۵۷]، باقی چھ کا ترجمہ درج ذیل ہے:

۱۔ کسی چغلخور کی صحبت ہرگز اختیار نہ کرو کہ اس بدعادت کا مشاہدہ ہی اس کی بدخوئی کی دلیل ہے اور اس بدعادت کے عدم علم کا عذر بھی نہ کرو کہ اس شخص کا آئینۂ زندگی ہی تم کو اس کی نامعلوم باتوں سے مطلع کر دیتا ہے[۵۸]۔

۲۔ اے بغض و حسد کے بندو! تم سب مٹی سے پیدا ہوئے ہو لہذا تم میں سے کوئی کسی کے مقابلہ میں عزت کے بل پر گھمنڈ نہ کرے، کیونکہ مٹی خواہ آسمان سے کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو جائے اس کو ایک نہ ایک دن زمین پر آنا ہے۔

۳۔ کب تک کوئی نفس جس کے لئے انجام قبر سے مفر نہیں غفلت میں پڑا رہے گا؟ درحقیقت قبر ایک جائے امانت ہے اور نفس انسانی ایک در بے بہا، اور تمام نایاب و نفیس چیزیں اپنے شایان شان خزانوں ہی میں محفوظ کی جاتی ہیں۔

۴۔ اے لوگو! جب تک تم اس سرزمین پر ہو مقدرات کی شکست و ریخت سے نجات نہیں پا سکتے کیونکہ تمہارے لئے قضا و قدر کا فیصلہ کرنے والے خداوند رحمٰن نے جو کچھ فراخی و تنگی مقدر کر دی ہے وہ تو پوری ہو کر رہے گی۔

۵۔ آسمان و زمین کی مخلوقات خالقِ محسن کی ذات یکتا میں تعدد کو ماننے سے بے نیاز ہیں، کیا تم نہیں دیکھتے کہ دنیا کو اس کی پہنائیوں کے باوجود تارے نہیں ایک سورج ہی منور کرتا ہے۔

۶۔ اس انسان کے بارے میں کیا پوچھتے ہو جس کو دوام حاصل نہیں، نیز آرزوؤں و تمناؤں کی آگ جس کے دل میں ہمیشہ بھڑکتی رہتی ہے، حالانکہ وہ خوب واقف ہے کہ یہی زمانہ اس کو ہلاک کرے گا" اور اپنی آرزوؤں و تمنا کو پانے میں وہ کبھی کامیاب نہ ہوگا[۵۹]۔

اس مختصر تعارف سے یہ بات کسی حد تک واضح ہو گئی ہوگی کہ سید صاحبؒ کی ابتدائی عربی تحریریں بھی نہ صرف فکر کی وحدت و یکسانیت سے لبریز، موضوعات کے تنوع و رنگا رنگی سے معمور زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت کی آئینہ دار ہیں۔ بلکہ ان کی آئندہ علمی ادبی زندگی کے بعض نشانہائے راہ کے ابتدائی نقوش کی بھی عکاس ہیں۔

○

حوالے وحواشی: ۱۔ حیات شبلی میں سید صاحبؒ کے قلم سے علامہ شبلی کے زیر سایہ اپنی تعلیمی زندگی اور دیگر علمی سرگرمیوں کی طرف اشارے ملتے ہیں، صفحات ۳۹۰ ـ ۳۹۱، ۴۰۰، ۴۰۸ ـ ۴۱۰، ۴۲۰ ـ ۴۲۵، ۴۳۲ ـ ۴۳۳،

۴۴۱ - ۴۴۲، ۴۴۵، ۴۵۱، ۴۵۷ - ۴۵۸، ۴۷۰ - ۴۷۱، ۴۹۴، ۴۹۵ - ۵۰۲، ۵۰۳ - ۵۰۵، ۵۲۴،
۵۶۵، ۵۸۱، نیز "حیات سلیمان" کے متعلقہ ابواب کے علاوہ "علامہ سید سلیمان ندوی: شخصیت اور ادبی خدمات"
از ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی اور "یادگار سلیمان" از پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے سوانحی حصے بھی ابتدائی تعلیم
معلومات پر مشتمل ہیں۔ ۲۔ "الضیاء" کا پہلا افتتاحیہ (ج ۱، ع ۱ محرم ۱۳۵۱ھ / مئی ۱۹۳۲ء
ص ۳-۹) اور چھ قسطوں پر مشتمل ایک مقالہ "علم الجغرافیہ عند العرب" (ج ۱، ع ۶ تا ۱۰، جمادی الاول تا شوال ۱۳۵۱ھ
ستمبر ۱۹۳۲ء تا فروری ۱۹۳۳ء) اور ایک فتویٰ کا جواب (ج ۱، ع ۱۰ شوال ۱۳۵۱ھ / فروری ۱۹۳۳ء) سید صاحب
کے نام سے شائع ہوئے۔ الضیاء میں ان کے باقی تمام مقالات ان کے شاگردوں کے عربی ترجمے ہیں۔ دیکھئے:
کیف انتشر الاسلام فی الهند، تعریب محمد ناظم الندوی، ج ۱، ع ۲-۴ رسول الوحدة، تعریب محمد
ناظم الندوی، ج ۲، ع ۱ و ع ۳-۴ علم الحدیث فی الهند، تعریب شیر محمد الندوی الاصلاحی
ج ۲، ع ۴-۸ الملاحة عند العرب، تعریب مسعود عالم الندوی، ج ۳، ع ۴-۶ و ع ۸-۱۰
العرب وامریکا، تعریب مسعود عالم الندوی، ج ۳، ع ۱ (ع ۲ دستیاب نہیں) التوکل، تعریب
محمد یٰسین الندوی، ج ۳، ع ۷۔

۳۔ "مکاتیب سلیمان" بنام مسعود عالم ندوی (مکتبہ چراغ راہ، لاہور، مئی ۱۹۵۴ء) کے ابتدائی پانچ خطوط عربی زبان
میں ہیں (ص ۱۶-۲۴)۔ ایک عربی خط بنام مستشرق براؤن اور مارگولیتھ کا ذکر موجودہ مقالہ میں ہے اور ہم کو پانچ عربی خطوط
بنام علامہ عبدالعزیز میمنی (۱۲ جنوری ۱۹۲۶ء تا ۱۹ فروری ۱۹۲۶ء) جناب پروفیسر مختار الدین احمد (سابق
صدر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کے پاس ملے، یہ خطوط ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ششماہی
عربی رسالہ مجلة المجمع العلمی الهندی علی گڑھ کے میمنی نمبر (ج ۱، ع ۱-۲، ۱۹۷۶ء) میں شائع ہونے
والے ہیں۔ یہ مراسلت بنیادی طور پر علامہ میمنی کی کتاب ابو العلاء وما الیہ کی دار المصنفین سے اشاعت
کے بارے میں ہے۔ ۴۔ المطبعة السلفیة ومکتبتها، القاهرة، ۱۳۴۹ھ

۵۔ ڈاکٹر حامد علی خان، "ہندوستان میں عربی شاعری" غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی رسالہ، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۹۶۳ء، ص ۳۰۱ ۶۔ حیات شبلی ص ۴۷۰-۴۷۲ ۷۔ عبداللہ العمادی کے بارے میں سید
صاحب کا ایک مختصر تعارفی نوٹ "حیات شبلی" میں بھی موجود ہے (ص ۴۴۳) لیکن "حیات سلیمان" میں ان کو مولوی
عبداللہ مصری لکھا گیا ہے ص ۲۶ ۸۔ عبدالعلی آسی مدراسی کی وفات پر تعزیتی شذرہ "البیان" سے
سید صاحب کے ربط کے دوران بلا کسی نام کے شائع ہوا ہے۔ البیان ج ۵، ع ۴-۶، ربیع الثانی - جمادی الآخرة
۱۳۲۶ھ، ص ۱۸-۱۹ ۹۔ حیات سلیمان ص ۲۶، خود سید صاحب کے قلم سے بھی ایک مضمون اور ایک برجستہ

تقریر کی "البیان" میں اشاعت کا سرسری ذکر ملتا ہے (مکاتیب سلیمان بنام مسعود عالم ندوی ص۴۰ اور حیات شبلی ص۴۹۴-۴۹۵) ۱۰۔ خلاف توقع ندوہ میں "البیان" کے شمارے نہ ملے، مزید شماروں کی تلاش جاری ہے

۱۱۔ مکاتیب سلیمان، مراسلت متعلقہ الضیاء ع۱۱ تا ع۴۲، ۱۲۔ البیان ج۶، ع۶ ص۱۷۵-۱۷۷، باب الشعر میں اردو ترجمہ نہیں دیا جاتا تھا

۱۳۔ البیان ج۶، ع۱۱-۱۲، ص۳۱۲

۱۴۔ البیان ج۷، ع۳، ص۹-۱۲

۱۵۔ البیان ج۷، ع۴، ص۱۱-۱۴ عربی مقالات کا اردو ترجمہ شائع ہوتا رہا ہے۔

۱۶۔ البیان ج۷، ع۵، ص۱-۲ و ص۳-۱۰ و ص۲۱-۲۲ و ص۲۸

۱۷۔ البیان ج۷، ع۶، ص۱-۲ و ص۳-۱۱

۱۸۔ البیان ج۷، ع۸ و ع۹، سرورق

۱۹۔ البیان کے دستیاب شماروں میں شذرات کے آخر میں سید صاحب کے نام کی اشاعت کے بعد سے صرف ج۷، ع۶ اور ج۹، ع۲ و ع۳ کے شذرات بغیر کسی نام کے شائع ہوئے ہیں

۲۰۔ البیان ج۸، ع۲، ع۳، ع۴-۶، ع۷-۱۰، سرورق

۲۱۔ ایضاً ج۸، ع۴-۶، ص۷۴-۷۵

۲۲۔ ایضاً ج۹، ع۲، سرورق

۲۳۔ ایضاً ج۹، ع۸، سرورق

۲۴۔ ایضاً ج۶، ع۷، ع۸، ع۹-۱۰، ج۷، ع۱، ع۲ و ج۹، ع۸،

۲۵۔ ایضاً ج۲، ع۴-۵، ص۱۵-۱۹، اسی طرح کا ایک خط مارگولیتھ کو بھی لکھا تھا، دونوں کے جوابات کی نقل بھی اسی شمارہ میں شائع ہوئی (ص۱۹-۲۰) "حیات سلیمان" (ص۱۸۷) میں بھی اس مراسلت کا تذکرہ ہے۔ "برید فرنگ" کے آخر میں بھی یہ خط موجود ہے۔ دیکھئے خط نمبر ۳،

۲۶۔ دیکھئے سید صاحب کا مقالہ الشعر العربی (عربی شاعری) البیان، ج۸، ع۲، ص۳-۱۲

۲۷۔ ایضاً ج۷، ع۵، ص۱-۲ "حیات شبلی" میں بھی اس عطیہ کا تذکرہ ہے، ص۴۷۹۔

۲۸۔ ایضاً ج۷، ع۸، ص۱-۲، "حیات شبلی" میں اس اجلاس اور رسم سنگ بنیاد کی زیادہ مفصل روداد ہے ص۴۸۱-۴۸۷

۲۹۔ ایضاً ج۷، ع۹، ص۱-۲

۳۰ تا ۳۳۔ ایضاً ج۸، ع۲ و ع۳ و ع۴-۶ و ع۷-۱۰، ص۱-۲

۳۴۔ ایضاً ج۸، ع۳، ص۱۸

۳۵۔ ایضاً ج۹، ع۲، ص۲۱-۴۸، "حیات شبلی" میں بھی اس جلسۂ استقبالیہ، سید صاحب کی برجستہ عربی تقریر اور اس کی "البیان" میں اشاعت کا ذکر ہے۔ ص۴۹۴-۴۹۵

۳۶۔ ایضاً ج۹، ع۳-۴، ص۳

۳۷۔ حاشیہ بالا ع۳۵، اس تقریر کا اردو عنوان حیات شبلی (ص۴۹۴-ص۴۹۵) سے اخذ کیا گیا ہے

۳۸۔ حاشیہ بالا ع۲۵

۳۹۔ البیان، ج۷، ع۴، ص۱۱-۱۴

۴۰۔ ایضاً، ج۷، ع۵، ص۳-۱۰

۴۱۔ "مسلمان عورتوں کی بہادری" از سید صاحب، مطبوعہ الندوہ ج۵، ع۱، فروری ۱۹۰۸ء، دوسری قسط "خواتین اسلام کی بہادری" الندوہ ج۵، ع۱۲، جنوری ۱۹۰۹ء بحوالہ "یادگار سلیمان" از عبد القوی دسنوی ص۱۳۸-۱۳۹

۴۲۔ البیان ج۱، ع۶، ص۲-۱۱ ۴۳۔ ایضاً ج۱، ع۹، ص۳-۵ ۴۴۔ ایضاً ج۱، ع۹، ص۵-۶
۴۵۔ ایضاً ج۸، ع۲، ص۳-۱۲ ۴۶۔ ایضاً ج۸، ع۲، ص۱۳-۱۵ ۴۷۔ ایضاً ج۸، ع۳، ص۳-۱۰
۴۸۔ حیات شبلی ص۲۲۳، حیات سلیمان ص۱۸-۱۹ ۴۹۔ البیان ج۲، ع۶، ص۱۷۵-۱۷۷ ۵۰۔ ایضاً ج۶، ع۱۱-۱۲، ص۳۱۲
۵۱۔ حیات شبلی ص۲۷۰-۲۷۴ ۵۲۔ البیان ج۱، ع۲، ص۹-۱۲ ۵۳۔ ایضاً ج۱، ع۵، ص۲۱-۲۲
۵۴۔ ایضاً ج۱، ع۹، ص۱۵-۱۶ ۵۵۔ "عربی زبان میں خدمات" از مولانا محمد رابع صاحب ندوی مشمولہ کتاب ہذا
۵۶۔ البیان ج۳، ع۷-۱۰، ص۲۸ ۵۷۔ حوالہ بالا ۵۵ ۵۸۔ البیان ج۱، ع۹، ص۱۶ ۵۹۔ ایضاً ج۳، ع۲، ص۱۲

○

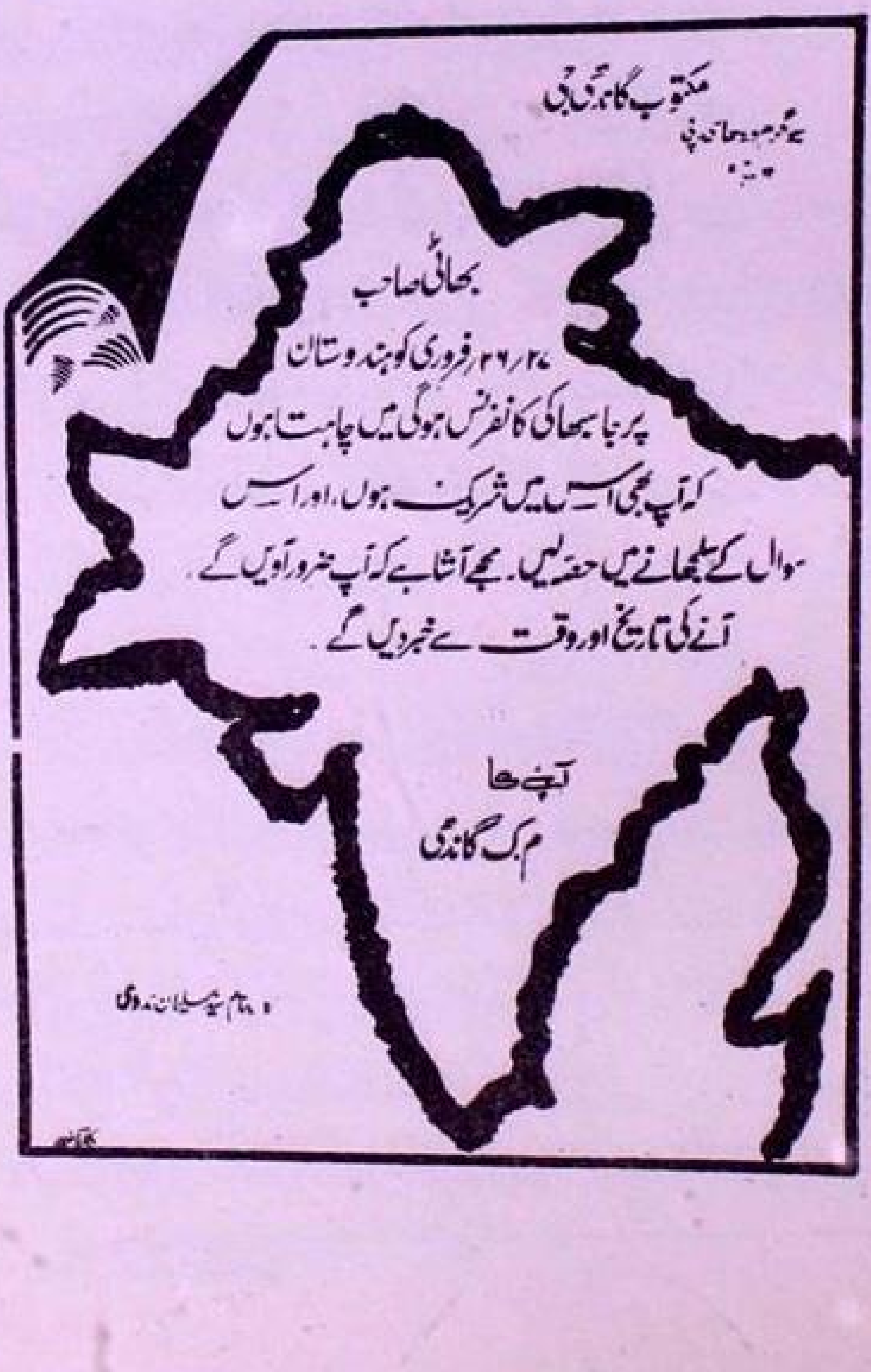

مکتوب گاندھی جی

بھائی صاحب

۲۷/۲۶ فروری کو ہندوستان
پرچا سبھا کی کانفرنس ہوگی میں چاہتا ہوں
کہ آپ بھی اس میں شریک ہوں، اور اس
سوال کے سلجھانے میں حصہ لیں۔ مجھے آشا ہے کہ آپ ضرور آویں گے۔
آنے کی تاریخ اور وقت سے خبر دیں گے۔

آپ کا
م۔ک۔ گاندھی

٭ بنام سید سلیمان ندوی

حمید اللہ ندوی★

علامہ سید سلیمان ندوی اور
ملی سیاست

> " میں پالیٹکس سے گھبراتا نہیں اور نہ سیاست کے خطرات سے خوف زدہ ہوں، لیکن قوم مجھ سے ایک ہی کام لے سکتی ہے، یا علم کی خدمت، یا سیاست، خدمتِ علم سکون و اطمینان کی طالب ہے اور سیاست ہنگامہ آرائی اور شور و غل کی مقتضی۔ جب تک دار المصنفین اور تکمیلِ سیرت کی زنجیر اپنے پاؤں سے نہ کاٹوں اس دنگل میں کود نہیں سکتا۔ ایک وقت میں دو کام نہیں ہو سکتے" بایں ہمہ آپ دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی اپنے گوشۂ عافیت سے نکل کر اس دنگل میں بھی کود جاتا ہوں"
>
> (حیاتِ شبلی ص ۲۱۹)

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کا یہ اظہار رائے آپ کی سیاسی سرگرمیوں کے حدود کو متعین کر دیتا ہے، نیز اپنے وقت کی سیاسی ہنگامہ آرائیوں کی نوعیت اور اس کے مضمرات کی طرف بھی اشارہ ہے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ سید صاحب اس سیاسی دنگل کو اپنے لئے شجرِ ممنوعہ نہیں تصور فرماتے تھے۔ گویا سید صاحب مرحوم اصلاً علمی گوشۂ عافیت کے آدمی تھے، مگر کبھی کبھی اپنے گوشۂ عافیت سے نکل کر سیاسی دنگل میں بھی کودنے کے قائل تھے۔ یعنی آپ جز وقتی سیاسی زندگی کے حامل تھے۔ جیسا کہ عملاً آپ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔

سید صاحب کی سرگرم زندگی رواں صدی کی نصف اوّل پر مشتمل ہے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے، جب تلک الایام نداولہا بین الناس کا آفاقی و دائمی اصول عالمی طور پر قدرت کی طرف سے زیرِ نفاذ تھا۔ تاریخ اپنی کوکھ سے ان تبدیلیوں کو جنم دے رہی تھی جو صدیوں کے لئے ہوا کرتی ہیں۔ قوت کے معیار بدل رہے تھے، نسلی برتری اور عالمی منڈیوں پر چھا جانے کی ہوس، دنیا کو دو تباہ کن جنگوں میں ڈھکیل چکی تھی، اسلامی خلافت جو کہ اپنی گرفت عرصہ ہوا کھو چکی تھی، ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی، جاہلی عصبیت کے احیاء اور جنگی حکمتِ عملی کی ناکامی نے خلافت کے رہے سہے ڈھانچے کو ہی منتشر کرنے کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ ادھر

★ استاد دار العلوم تاج المساجد بھوپال

ہندوستان میں جنگ کے حالات نے آزادی کو آسان بنا دیا تھا اور نئے حالات میں ملّت اسلامیہ کی آنے والی نسلوں کی تقدیر نویسی کے لئے قضا و قدر کا قلم مصروفِ کار تھا۔

ان ہنگامہ خیز عالمی تبدیلیوں کے ماحول میں سیّد صاحب مرحوم کی کبھی کبھی والی سیاسی دلچسپی ظاہر ہے کہ ملّی سیاست کا ایک چھوٹا سا جزء ہے، مگر وہ ہمارے لئے اس لئے اہم ہے تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ ہمارے بزرگوں نے ملّت کے حق میں حالات کو کس طرح موڑنا چاہا تھا۔ کس حد تک وہ کامیاب رہے، اور کس حد تک ناکام۔ بگڑے ہوئے حالات کا وہ کیا تجزیہ کرتے تھے، بگاڑ کے تاریخی اسباب کے ازالہ پر کس حد تک وہ قادر تھے، اور کیا چیزیں ان کے لئے غیر اختیاری تھیں، تب ہی ہم یہ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے کہ ماضی کے کس ورثہ کو قبول کر کے اگلی نسلوں تک ہمیں منتقل کرنا ہے اور کن کمزوریوں کو ہمیں منتقل ہونے سے روکنا ہے۔ غیر ضروری آزادروی ہمیں کہیں ماضی کے قیمتی ورثہ سے محروم نہ کر دے اور اعتدال سے ہٹی ہوئی محبت بشری کمزوریوں کو بھی تقدیس کا جامہ پہنا کر بار بار خسارہ اٹھاتے رہنے کا انتظام نہ کر دے۔

سیّد صاحبؒ مرحوم کی زندگی پر سرد وصف کا کام کافی حد تک ہو چکا ہے۔ البتہ استنباط و استنتاج کی گنجائش باقی ہے۔ سیّد صاحب کی سیاسی زندگی کے مختلف میدان ایک معلوم بات ہے۔ خلافت، کانگریس جمعیۃ اور بقول مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مرحوم اخیر زندگی میں مسلم لیگ۔ سیّد صاحبؒ کی زندگی میں قومی سیاست کا دھارا بھی بہہ رہا تھا اور ملّی سیاست کا بھی دونوں ہی نے مرحوم کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اب یہ تجزیہ نگاروں کا کام ہے کہ قومی و ملّی سیاست میں خطِ امتیاز کھینچیں، خلافت بلا شبہ ایک ملّی ادارہ تھا اور اس کے بقاء و تحفظ کی کوشش بھی ملّی سیاست ہی کہلائے گی، اس بات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہ وہ خلافت کس حد تک قومی اثرات سے متاثر تھی، البتہ آزادی وطن کی تحریکیں کانگریس اور جمعیت کا مسئلہ پیچیدہ ہے۔ اوّل الذکر جماعت خالص قومی و وطنی مقاصد کی حامل تھی تو ثانی الذکر وطنی و ملّی دونوں مقاصد کی دعویدار، اگرچہ مسلم لیگ خالص مذہب و ملّت کے نام پر طوفان کی طرح اُبھری، مگر اس کی تہہ میں مذہب کو جو حیثیت تھی اس کے پیشِ نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ مسلم قومیت کے نام سے قومیت کے اُن تمام عناصر کو قبول کیا جا چکا تھا، جن کی ملّت یا امّت کے تصوّر میں کسی طرح گنجائش نہیں تھی۔

دین و ملّت کے سیاسی استحکام کے لئے مسلح کوششوں کا آغاز حکمراں طبقہ سے ہٹ کر اولاً سید احمد شہیدؒ نے کیا، وہاں ہم کسی قسم کا کوئی قومی عنصر نہیں پاتے، وہاں اگر اختلافِ رائے ہو سکتا ہے تو صرف اس بات میں کہ حالات کا صحیح تجزیہ کیا گیا تھا کہ نہیں۔ جنگی قوت کا نیا معیار جو فیصلہ کن طور پر تاریخ کو بدلنے والا تھا اسے سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ نہیں، نیز جنگ کی یہ حکمتِ عملی کہ مسلح قوت کے معیار اور اسٹریٹجی میں پیچھے رہ جانے کے بعد

جنگ کو اس وقت تک ٹالا جائے جب تک کے ملّی سطح پر دونوں اعتبار سے دشمن سے لوہا لینے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے۔ اس حکمت کو پیشِ نظر رکھا گیا کہ نہیں ؟ ریشمی رومال کی تحریک اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی۔ مگر اس کی ناکامی پر بھی مورّخ حالات اور قضا و قدر کو ذمّہ دار ٹھہرا کر اس طرح لکھتا ہے :

> "ابھی ہندوستان کے مقدر میں ۳۲ برس کی غلامی مزید لکھی ہوئی تھی اس لئے ایک مار آستیں نے شیخ الہند اور ان کے رفقار کار کو ڈس لیا" (تاریخ جمعیت ص۵)

اس موقع پر ہمیں یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ اگر سید احمد شہیدؒ کی تحریک خالص ملّت کے سیاسی استحکام کے لئے تھی تو ثانی الذکر تحریک ایسے حالات میں تھی جب کہ ملّی و غیر ملّی اقوام کی مشترکہ حکمرانی سے زیادہ اور کوئی خواب نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اسی لئے جب سیاسی تحریکات کو غیر مسلح رُخ دیا گیا تب بھی ایک حل آخری حل کے طور پر قبول کیا گیا اور ملّی مقاصد کا حصول صرف آزادی کے حصول پر منحصر قرار دیا گیا۔ یہاں سے دو فریق پیدا ہوتے ہیں، ایک نے برادرانِ وطن کے ساتھ مشترکہ طور پر ملّت کے سیاسی استحکام کا خواب دیکھا، دوسرے نے کسی پر اعتماد نہ کرتے ہوئے آزاد مسلم اسٹیٹ کی بنیاد ڈالی، بنیادی طور پر سید صاحب مرحوم اول الذکر فریق سے تعلق رکھتے ہیں، اول الذکر طبقہ سے تعلق رکھنے والی جماعت جمعیۃ العلماء کے سالانہ اجلاس امروہہ میں سید صاحبؒ نے فرمایا:

> "انقلاب کی تحریک جب شروع ہو جاتی ہے تو تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ وہ بے نتیجہ ختم نہیں ہوتی، بیشک اس کو مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نیست و نابود معلوم ہونے لگتی ہے، لیکن اس کی خاک میں چھپی ہوئی چنگاریاں بھڑکتی ہیں، اور شعلے بن کر مختلف طاقتوں کو نذرِ آتش کر دیتی ہیں۔ اب کیا مسلمان یہ پسند کریں گے کہ مخالف انقلاب طاقتوں کا ضمیمہ بن کر وہ بھی نذرِ آتش ہو جائیں یا ساحل پر کھڑے ہوئے طوفان کا تماشہ دیکھتے رہیں، اور جب طوفان ختم ہو تو وہ اپنی سیاسی طاقت بھی ختم کر چکے ہوں اور ان کا شمار بھی انہی پسماندہ قوموں میں ہو جن کے لئے ہندوستان میں نفرت و حقارت کی پالیسی ہمیشہ کے لئے طے ہو چکی ہے۔" (تاریخ جمعیت ص۳)

اس انقلاب کا ساتھ دینے کے لئے مرحوم علیحدگی پسندی کو کامیاب راستہ نہیں سمجھتے تھے، اس سلسلہ میں مرحوم کا حسب ذیل بیان کافی واضح ہے :

> "نادانی سے ہم لازم کو ملزوم اور ملزوم کو لازم سمجھتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے کسی طرح حقوق حاصل کرنے چاہیئں پھر اس کے ساتھ سلطنت و حکومت کے اوصاف پیدا ہو جائیں گے، یہ خیال قطعاً غلط ہے، پہلے اوصاف پیدا کرو پھر ان کے نتیجوں کی امید رکھو، اگر ان اوصاف کے بغیر ہم کو کوئی چیز رعایت سے مل بھی جائے تو ہمارے پاس کبھی نہیں رہ سکتی، لیکن ایک سوال اس سے بھی زیادہ دقیق ہے۔ فرض کیجئے کہ دنیا کے

> کسی گوشہ میں مسلمانوں کی ایک سلطنت کا اضافہ ہو گیا تو کیا اس سے اسلام کا پیام زندہ ہو جائے گا، اس سے مسلمان پھر مسلمان ہو جائیں گے زیادہ سے زیادہ جو خوش کن خواب نظر آ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ایک اور طویل و عریض عراق یا شام یا مصر مل جائے گا تو کیا اس سے اسلام کی بے کسی اور غربت میں کچھ کمی بھی ہو سکتی ہے؟
>
> (حیاتِ شبلی ص ۵۴۹)

اس طرح ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ جو اصحاب یہ لکھتے ہیں کہ مرحوم مسلم لیگی ہو گئے تھے، یہ بات ان کے عمومی ذہن اور زندگی کی سرگرمیوں سے میل نہیں کھاتی، حقیقت یہ ہے ملّی زوال کو ختم کرنے کے لئے کوششوں کے دو میدان ہوتے ہیں، ایک میدان وہ ہے جو ہر ممکنہ موجود وسائل کے ساتھ فوری مسائل پر قابو پانے کے لئے ہوتا ہے۔ دوسرا میدان اسی کے ساتھ ان کوششوں کا ہوتا ہے جو عالمی سطح پر ملّت کے اندر وہ اسباب دوبارہ پیدا کر دیں جن کے نتیجہ میں عروج حاصل ہوا تھا۔ اور جن کا زوال امّت کے زوال کا سبب بنا۔ اول الذکر میدان میں ردِ عمل کے قسم کے کام ہوتے ہیں۔ اور ثانی الذکر میدان میں مثبت اور طویل المدت کام ہوتے ہیں، تاتاریوں کے حملہ کے بعد زبردست جھٹکا لگنے کے نتیجہ میں وقتی اور دفاعی کوششوں کو جاری رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ ملّت دعوتِ اسلام کے مثبت اور طویل المدّت کام میں اس طرح لگی کہ بالآخر میدانِ جنگ میں ہاری ہوئی بازی دعوت کے میدان میں جیت لی گئی۔ مگر یہی واقعہ جب مغربی سامراج کی شکل میں پیش آیا تو تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہرا سکی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ پچھلی صدیوں میں ہم اسی میدان کو اصل میدانِ کار سمجھتے رہے جس کی حیثیت صرف منفی ردِ عمل کی ہوتی ہے اور ہم ملّی سطح پر مثبت سرگرمیوں کے میدان کو مطلوبہ حد تک وجود میں نہیں لا سکے۔ سید صاحبؒ کی سیاسی زندگی میں ایسا رجوع ملتا ہے جس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ مرحوم کو مذکورہ بات کا احساس ہو چکا تھا۔ خلافت تحریک کے سلسلہ میں سید صاحب کے سفر اور ان کی سرگرمیوں کو دہرانے کا موقع نہیں ہے۔ مگر اس حقیقت سے کیسے نظر پھیر لیں کہ اخیر میں آپ کی رائے یہی کہ غیر آزاد باشندے اس عالی مقصد کے لئے عرض و معروض کے علاوہ اور کوئی اہم رول ادا نہیں کر سکتے۔ آپ نے یہ کتنی تلخ حقیقت مان لی تھی کہ اب جو کچھ کرنا ہے مصطفٰی کمال کو کرنا ہے۔ بات بھی کچھ ایسی ہی ہے کہ گھرے ابّا اور صدیوں سے چلی آ رہی ہماری مرکزیت کی بساط اُلٹ رہی تھیں اور ہم غلام ملک میں حالتِ محکومیت میں رہ کر اخلاقی دُہائیاں دے کر اسے بچانے کے لئے ملّت کی ساری انرجی صرف کر رہے تھے۔ پھر کیسے کوئی مثبت میدانِ عمل وجود میں آتا جو تاریخ ساز رول ادا کر سکے، کہاں سے آتے اس کے لئے افراد اور ذہنی قوتیں۔ سید صاحبؒ نے فیصلہ کن انداز میں سیاسی استحکام کے لئے کچھ بنیادی شرائط بتلائیں ہیں۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

> "ہندوستان کے مسلمان اپنی سیاسی خودمختاری کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ نفس سیاسی خودمختاری کی دنیا میں قیمت کیا ہے؟ سیاسی خودمختاری اس وقت تک دل خوش کن خواب سے زیادہ نہیں جب تک اس کی اساس ایمانی، جسمانی، اقتصادی اور تعلیمی طاقتوں کے چار ستونوں پر قائم نہ ہو۔"
>
> (حیاتِ شبلی صہ ۵۴۹)

اس میں اتنا اضافہ اور کیا جاسکتا ہے کہ اس بات کو صرف ایک خودمختار مملکت کے لئے کوششوں کے ماحول ہی میں نہ دیکھا جائے بلکہ یہ اصول عمومی طور پر اٹل اور صحیح ہے۔ ملت کہیں حاکم ہو یا محکوم دونوں صورتوں میں سیاسی پوزیشن کا استحکام حقیقتاً نام ہے ایمانی، جسمانی، اقتصادی اور تعلیمی میدانوں میں استحکام کا۔ مگر ہم کھوئی ہوئی عظمت کے حصول میں عجلت پسندی کی وجہ سے اس مقام سے سفر کا آغاز ہی نہیں کر سکے جہاں سے حقیقتاً آغاز کرنا تھا، جزئی یا انفرادی کوششوں سے انکار نہیں، مگر ملی سطح پر مربوط صورت میں استقلال کے ساتھ بہرحال کام ہونا باقی ہے، اور تاریخ کو اس کا انتظار ہے۔ وہی دن ہمارے لئے ہر قسم کے استحکام کی طرف ملت کے سفر کا پہلا دن ہوگا۔ ہم بات کا آغاز عظمتِ رفتہ کی تلاش سے کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ عظمت ایک ایسے پیڑ کا پھل ہے جس کے بیج کا نام ہے ایمان اور دعوت۔ دعوتِ توحید اور ایمان کے بیج سے وہ شاخیں نکلتی ہیں جن کا ذکر سید صاحب نے جسمانی، اقتصادی اور تعلیمی طاقت کے لفظوں سے کیا ہے۔ شاید ہم ایک ایسے پھل کی آرزو میں زندگی گزار رہے ہیں جو بغیر بیج اور بغیر شاخوں کے پیدا ہو جائے۔

* * *

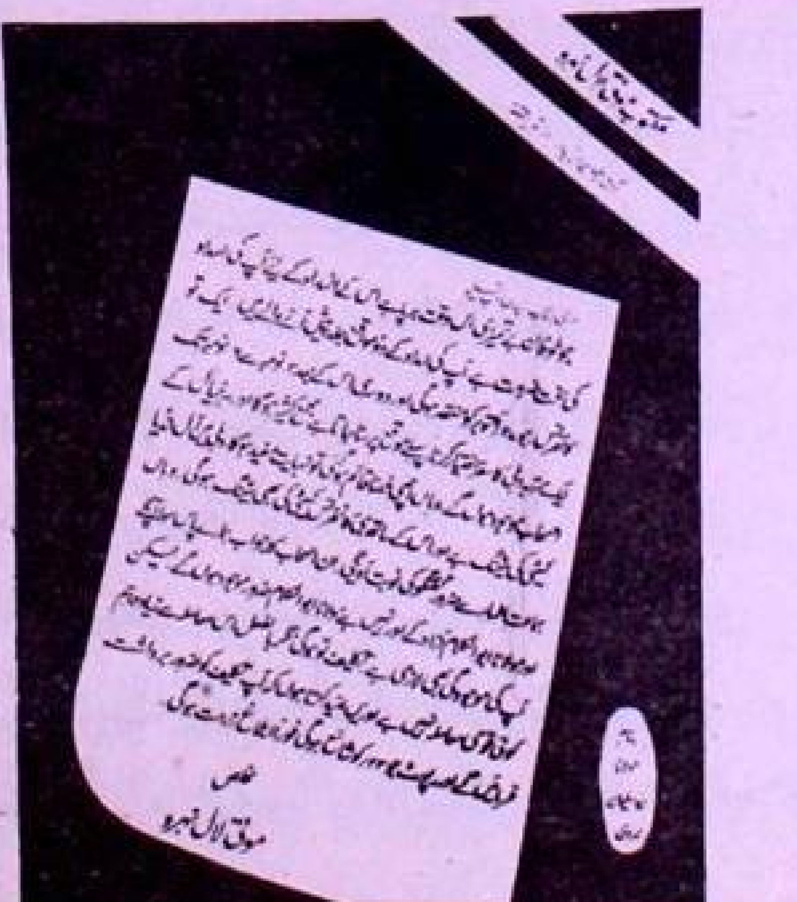

سید یوسف کمال بخاری★

تحریک خلافت

ہندوستان کی جنگ آزادی میں تحریک خلافت کا نمایاں کردار رہا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تحریک خلافت کی وجہ سے مسلمان تو پیش پیش تھے ہی ہندو بھی اس تحریک میں حصہ لینے سے پیچھے نہیں رہے اور ہندوؤں کو محاذ جنگ آزادی میں لانے والے مسلمان ہی تھے جس کی وجہ سے جنگ آزادی میں بھرپور زور آگیا۔ سب سے پہلے گاندھی جی نے تحریک خلافت کی حمایت کی اور ان کی وجہ سے دیگر ہندو رہنما اس تحریک کے حامی ہوتے چلے گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہندو مسلم اتحاد کا جو نمونہ اس زمانہ یعنی ۱۹۱۶ء سے لیکر ۱۹۲۵ء تک نظر آیا وہ پھر دیکھنے میں کبھی نہ آیا۔ گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ترک موالات کا نعرہ بلند کیا اور اس کی حمایت میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد، مولانا سلیمان ندوی وغیرہم اٹھ کھڑے ہوئے جس طرح تحریک خلافت کا ساتھ ہندوؤں نے دیا اسی طرح مسلمانوں نے ترک موالات کا ساتھ دیا، اور پورا ہندوستان اتحاد و یگانگت کے ڈورے میں منسلک تھا۔ گو بعد میں تحریک خلافت تو ختم ہو گئی کیونکہ مصطفٰے کمال نے ۱۹۲۴ء میں خلیفہ عبدالحمید کو معزول کر دیا اور خود ترکی کے صدر ہو گئے۔ لیکن ہندوستان کی تحریک آزادی آگے بڑھتی گئی حتیٰ کہ ہندوستان آزاد ہو گیا۔ پس ہندوستان کی آزادی تحریک خلافت کی مرہون منت ہے۔ اس تحریک خلافت کے ایک عظیم الشان ستون مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے۔

خلافت مرکزیہ اسلامیہ کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ اسلام کا۔ ۱۹۲۰ء میں بنگال کی صوبائی خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مبسوط خطبۂ صدارت میں مسئلہ خلافت کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا: "اسلام کا قانون شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہئے۔ خلیفہ سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان سربراہ اور صاحبِ حکومت و مملکت ہے جو مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجرا و نفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں سے مقابلہ کے لئے پوری طرح طاقتور ہو۔ صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطینِ عثمانیہ کو حاصل ہے۔ اور اس وقت از روئے

★ ریٹائرڈ ڈائرکٹر نیشنل آرکائوز بھوپال

شرع تمام مسلمانانِ عالم کے خلیفہ وامام وہی ہیں۔ پس ان کی اطاعت واعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے جو ان کی اطاعت سے باہر ہوا، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور اسلام کی جگہ جاہلیت مول لی، جس نے ان کے مقابلے میں لڑائی کی یا ان کے دشمنوں کا ساتھ دیا اس نے خدا اور اس کے رسول سے لڑائی کی۔ اسلام کا شرعی حکم ہے کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلم حکومت کے اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہونا چاہے یا اسکو خلیفۂ اسلام کی حکومت سے نکال کر اپنے زیر اثر لانا چاہے تو یہ صرف ایک اسلامی ملک کے نکل جانے کا مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ اسلام کی مرکزی سرزمین پر کفر کا اثر چھا جائے گا پس اس حالت میں مسلمانانِ عالم کا اولین فرض ہوگا کہ اس قبضہ کو وطن سے ہٹانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی تمام قوتیں اس کام کے لئے وقف کر دیں۔

اسلام کے مقامات مقدسہ میں بیت المقدس اسی طرح محترم ہے جس طرح حرمین شریفین۔ اس کے لئے لاکھوں مسلمان اپنی جان کی قربانیاں دے چکے ہیں اور یوروپ کے آٹھ صلیبی جہادوں میں مقابلہ کر چکے ہیں پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس مقام کو دوبارہ غیر مسلموں کے ہاتھوں میں نہ جانے دیں علی الخصوص مسیحی حکومتوں کے قبضہ واقتدار سے روکیں اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو ان کے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلم آبادی کا فرض نہ ہوگا بلکہ بیک وقت و بیک دفعہ تمام مسلمانانِ عالم کا فرض ہوگا۔"[1]

یہ تھی مسئلہ خلافت کی نوعیت کی تشریح جو مولانا آزاد نے کی۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں کوئی بھی مسلمان عالم اور بالخصوص حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علامۃ الدہر کس طرح خاموش رہ سکتے تھے چنانچہ آپ نے نہ صرف یہ کہ اس میں حصہ لیا بلکہ دامے درمے، قدمے سخنے اس تحریک کی دہکتی ہوئی آگ میں بے خوف وخطر کود پڑے۔ پوری دنیائے اسلام میں زبردست آگ لگی ہوئی تھی۔ برطانوی حکومت کے خلاف جہاں جہاں اسلامی ملکوں پر اس کا قبضہ تھا یا ان ملکوں کی حمایت میں مسئلہ خلافت پر جلسے ہو رہے تھے ہندوستان بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ مولانا موصوف کو جگہ جگہ صدارتیں کرنا پڑتی تھیں، تقریریں کرنا پڑتی تھیں اسلامی ممالک و دیگر ممالک اس گتھی کو سلجھانے کے لئے سفر کرنا پڑتے تھے۔ وفود کی رہنمائی کرنا پڑتی تھی۔ جزیرۃ العرب کے سربراہوں سے گفت وشنید کرنا پڑتی تھی۔ ان کا دل تڑپ رہا تھا، ذہن مضطرب تھا کہ کسی صورت سے خلافت عثمانیہ یعنی ترکی کے خلیفہ عبدالمجید معزول نہ کئے جائیں اور کسی بھی طرح اسلام کا مرکز ٹوٹنے نہ پائے، جزیرۃ العرب میں حجاز کے مقابر و مآثر یعنی وہ آثار و عمارات جو رسول اللہؐ اور دیگر صحابہ کرام سے منسوب ہیں منہدم نہ ہونے پائیں اور حجاز پر انگریزوں یا کسی بھی غیر اسلامی حکومت کا قبضہ نہ ہونے پائے اس دوڑ میں مولانا اپنے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے کہیں عبدالعزیز ابن سعود سلطان نجد سے بات چیت کے لئے دوڑتے

ہوئے حجاز جاتے تھے کہیں خلیفہ عبدالحمید سے ملاقات کرتے تھے۔ ان کی اس تڑپ اور جذبہ کا جائزہ ہم ذیل میں لیتے ہیں۔

خلافت اور ہندوستان یعنی آغاز اسلام سے لے کر آج تک خلافتِ راشدہ امویہ، عباسیہ، عثمانیہ میں خلفائے اسلام اور سلاطین ہند کے باہمی تعلقات کی تفصیل پر ایک تاریخی مضمون جو معارف اعظم گڑھ کے مختلف نمبروں میں چھپا تھا[2]۔ اور مجلس خلافت رنگون کی خواہش و فرمائش پر علیحدہ رسالہ کی صورت میں ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء شائع ہوا تھا اس میں مولانا نے مسئلہ خلافت کی تفصیلی وضاحت کی ہے، رقمطراز ہیں:[3] "آج کل مسئلہ خلافت نے ہندوستان میں جو اضطراب و ہیجان پیدا کر رکھا ہے کوتاہ بیں سمجھتے ہیں کہ یہ صرف موجودہ زمانہ کی آزادی طلبی اور جنبش سیاسی کی ایک لہر ہے مجھے یہ دکھانا مقصود ہے کہ خلافت اسلامیہ سے ہندوستان کا تعلق کس قدر پرانا اور گہرا ہے اور ہمیشہ سے اس کو آستانۂ خلافت سے کس درجہ عقیدتمندی و ارادت رہی ہے اور سلاطین ہند خلفائے اسلام کو کس عظمت دینی اور وقعتِ مذہبی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

عرب و ہند کا تجارتی تعلق تاریخ کی عمر سے بھی زیادہ قدیم ہے، اسلام جب عرب کی سرزمین میں رونما ہوا تو اس کے آس پاس کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان بھی غیر متاثر نہیں رہا۔ "تحفۃ المجاہدین" کی روایت کے مطابق سواحل ہند تک اسلام کی مصالحانہ دعوت خود آنحضرت صلعم کی زندگی میں پہنچ چکی تھی۔ ملیبار کے راجہ نے مذہب اسلام کی تحقیق کے لئے عرب میں جو وفد بھیجا تھا وہ خلافت اولی یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے عہد خلافت میں مدینہ پہونچا تھا اور وہاں سے پرتو اسلام سے منور ہو کر ملیبار واپس آگیا تھا۔ یہ روایت اگر صحیح ہو تو ہندوستان اور خلافت کے باہمی تعلق کا یہ پہلا دن تھا۔

سندھ کا علاقہ ایران کے زیر اثر ہونے کے باعث ایران کے فتح ہونے کے بعد خود بخود مسلمانوں کے زیر اثر آگیا۔ اس کے سواحل مسلمان تاجروں اور مسافروں کے رہگذر اور سیستان و بلوچستان کے علاقے مسلمان فوجوں کے معسکر تھے، بہر حال حضرت عثمان کے عہدِ خلافت سے ہندوستان اور خلافت اسلامیہ کے درمیان ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہو گیا جو آج تک بدستور باقی ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ جب خلافت اسلامیہ کے مالک ہوئے تو مسلمانان سندھ نے بھی دوسرے ملک کے مسلمانوں کی طرح ان کو خلیفہ تسلیم کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز اموی جب مسند آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے یہاں کے روساء کے نام دعوت اسلام کے خطوط لکھے۔ چنانچہ ان کی ذاتی نیکی، زہد و اتقاء اور عدل و انصاف کو دیکھ کر بہت سے راجہ مسلمان ہو گئے اور عربوں کے جیسے اپنے نام انھوں نے رکھنے شروع کئے۔"[4] آغاز خلافت راشدہ سے

لے کر خلفائے بنی امیہ کے اخیر تک دربار خلافت کی طرف سے جو لوگ وقتاً فوقتاً نائب ہو کر یہاں آتے رہے ان کے ناموں کی فہرست میں بیس نام مولانا نے دیئے ہیں۔

اس کے بعد بنی عباس کا دور شروع ہوا اور ان کے عہد کی تفصیل اور ہندوستان کے مسلم سلاطین سے خلافت کا تعلق بہت تفصیل سے دکھایا ہے۔ اور ان تمام نائبین کے نام گنوائے ہیں جو ہندوستان بھیجے جاتے رہے۔ جمعوں کے خطبوں میں خلفائے وقت کا نام ہمیشہ شامل کیا جاتا رہا۔ بعد کو مسلمانوں میں یہاں دو فرقے ہو گئے ایک اہل سنت اور دوسرا باطنیہ شیعہ۔ اہل سنت کا مرکز بدستور خلافت عباسیہ تھی لیکن باطنی شیعہ مصر کے فاطمی سلاطین کو اپنا خلیفہ جانتے تھے۔

پھر ہندوستان میں جو خاندان حکمراں ہوئے، ان میں غزنوی، غوری خاندان آئے محمود غزنوی نے سب سے پہلے سلطان کا لقب اختیار کیا اور یہ لقب بھی خلیفہ کی طرف سے ملا تھا۔ پھر بعد کے تمام بادشاہوں نے سلطان کا لقب قائم رکھا اور خلیفۂ وقت سے حکومت کرنے کی اجازت منگواتے رہے اور خلیفہ کے مطیع و فرمانبردار رہے بلکہ اس پر فخر کرتے تھے" اپنے سکوں تک پر خلیفہ کا نام ڈالتے تھے۔ خلافت اور ہندوستان کا تعلق سب سے زیادہ محمد شاہ تغلق کے زمانۂ حکومت میں نظر آتا ہے۔ سلطان جس طرح اپنے تمام کارناموں میں بے مثال اور عدیم النظیر نظر آتا ہے، اسی طرح مسئلہ خلافت میں بھی اس کا اعتقاد اور طرز عمل تمام سلاطین اسلام میں بے مثال ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مستعصم باللہ کے عہد میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی خلافتِ عباسیہ کا پیراہن تار تار ہو گیا تھا" اس کے بعد مصر میں دوبارہ خلافت عباسیہ نے از سر نو ایک دوسری زندگی حاصل کی۔ محمد تغلق کو خیال گذرا کہ خلیفہ عباسی کی اجازت کے بغیر سلطنت و حکومت جائز نہیں چنانچہ اس نے وہاں سے اجازت منگوائی اور ایک وقت سکوں سے اپنا نام مٹا کر خلیفہ کا نام اور لقب کندہ کرایا۔

غرضیکہ تمام سلاطین ہند اور مغلیہ دور کے بادشاہ خلیفہ سے عقیدت رکھتے تھے اور عزت و احترام کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اپنے مذکورہ مضمون بعنوان "خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام" میں رقمطراز ہیں:

"مسئلہ خلافت پر میرے تاریخی مضامین پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہوگا کہ خلافت اسلامیہ اور دنیائے اسلام کے باہمی تعلقات کا نظام اساسی کیا تھا۔ اعتقاداً اور ذہناً تو ہمیشہ اور عملاً اکثر یہ سمجھا جاتا تھا کہ تمام دنیائے اسلام کا رئیس اور امام اور حاکم اعلیٰ ایک شخصیت ہے جس کا نام امام اکبر یا خلیفہ تھا۔ تمام دوسرے اسلامی ممالک جو گو براہ راست اس کی حکومت میں نہ تھے تاہم وہ اس کے مذہبی حیطۂ اقتدار سے باہر نہیں سمجھے جاتے تھے ان ملکوں کے مسلمان بادشاہ امام وقت اور خلیفۂ عصر کے نائب اور قائم مقام مانے جاتے تھے۔ اس طریقہ پر گویا ایک عظیم الشان اسلامی جمہوریت متحدہ کا دنیا میں وجود تھا۔ اسلام کے تمام مذہبی مقامات، بیت المقدس،

حرمین، و دیگر مقدس یادگاروں کا وہ حامی و محافظ اور دنیا میں اسلام کی عزت و حرمت کا امین اور نقیب اور غیر اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کا پشت پناہ اور ملجا ہوتا تھا۔

خلافتِ عباسیہ میں جب تک دم رہا حتی المقدور، وہ اس فرض سے غافل نہیں رہی لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تاریخ میں ایسے مواقع بھی آئے کہ خلافت کا مرکز کبھی کمزور ہاتھوں میں چلا گیا اور کبھی مسلمان سلاطین نے اپنی چیرہ دستی اور غرور و نخوت سے نیابت کا حق ادا نہیں کیا۔ بغداد کی عباسی خلافت بہرحال ایک سیاسی قوت تھی مگر مصر اگر اس کا اقتدار صرف بہت حد تک مذہبی اور رسمی رہ گیا۔ تاہم مصر کے مملوک سلاطین عباسی خلفاء کے نائب اور تنفیذی (EXECUTIVE) طاقت تھے۔ جب تک مضبوط رہے ان کے کارنامے مصر سے باہر دوسرے اسلامی ملکوں میں خلافت ہی کے کارنامے سمجھے جاتے تھے، چنانچہ ہندوستان، ایران، روم، ترکستان وغیرہ میں ان کا اسی حیثیت سے اعزاز و احترام تھا، اور ان ہی خلفاء کے نام کے خطبے ان ملکوں میں پڑھے جاتے تھے، اور اس طرح اسلام کی جمہوریت عظمیٰ کا ایک ڈھانچہ قائم تھا۔"[5]

عباسیوں کے بعد خلافت عثمانیہ قائم ہوئی مولانا سلیمان ندوی کے الفاظ میں: "یہ امر محتاج دلیل نہیں کہ گذشتہ چار صد برس تک مسلمان اور ترک دونوں مترادف الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اس زمانہ میں ترکوں کا "پیغمبر" تھا۔ رمضان مبارک کا مہینہ اب بھی یوروپ کی جنتریوں میں ترکی مہینہ ہے۔ ان پورے چار قرنوں میں اسلام کا وکیل، نمایندہ، ترجمان جو کچھ کہو اس کی حیثیت صرف ترکی کو حاصل رہی ہے۔ ترکی سے جنگ اسلام سے جنگ اور ترکی سے صلح اسلام سے صلح سمجھی گئی۔ نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ دوسری قوموں نے بھی ہمیشہ یہی سمجھا۔ تمام کرہ ارض میں ناموس اسلام کی نگہداشت مظلوم مسلمانوں کی دادخواہی اور فریادرسی، شعائر اسلام کا قیام، مملکت اسلام کی سرحدوں و اماکن مقدسہ کی خدمت گزاری کے تمام فرائض سلاطین عثمانیہ نے اور صرف سلاطین عثمانیہ نے انجام دیئے ہیں۔ اور یہی خلافت و امارت کے فرائض ہیں، ان کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں، پھر ان ہی لوگوں نے تمام دنیائے اسلام میں یکہ و تنہا اس فرض کو انجام دیا، وہ امیر المومنین اور امام المسلمین نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟ یہ سچ ہے کہ ان میں کوئی عمر فاروق یا عمر بن عبد العزیز نہیں تھا، لیکن ہم میں صحابہ اور تبع تابعین کون تھے؟"[6]

مندرجہ بالا اقتباس سے مولانا سلیمان کے خیالات و عقائد آئینہ کی طرح صیقل ہو کر سامنے آجاتے ہیں، وہ خلافتِ عثمانیہ کو دنیائے اسلام کا مرکز اور محافظ اماکن و مآثر مقدسہ جانتے تھے اور خلافت کو برقرار رکھنا اپنا ایمان سمجھتے تھے۔

مولانا کی تائید میں ہمیں سر تھیوڈر ماریسن (سابق پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڑھ) کی تحریر ملتی ہے۔ وہ اہل علم انگریزوں میں سے تھے، انھوں نے اکابر اسلام کی صحبت بھی اٹھائی تھی، وہ ہندوستان کے عظیم الشان دور میں مصلحین اسلام کی انجمن کے ایک اعزازی رکن بھی تھے۔ انھوں نے مسئلہ خلافت عثمانیہ پر ہمعصر ٹائمز میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا: ”اہل یوروپ کو سب سے پہلی بات یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مسلمانانِ عالم کو ترکی کے ساتھ دلی محبت ہے اور سلطان ترکی کے دنیاوی اقتدار کے خاتمہ کا خیال ہی انھیں برہم کر دیتا ہے، اس موقع پر ہمارا یہ کہنا ان سے بالکل عبث ہے کہ انھیں سلطان کو خلیفہ تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ چاہیئے یا نہیں چاہیئے بہر حال واقعہ یہ ہے کہ وہ تسلیم کرتے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ خلافت عباسیوں کے ہاتھ سے نکل کر آل عثمان تک کیونکر پہنچی ہے لیکن اس راز کے محرم ہونے کے بعد بھی وہ اپنے خیال میں بالکل پختہ و غیر متزلزل ہیں۔ بے شبہ ہم ان پر تاسف کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے یہ عقائد کیوں ہیں مگر اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہیں یہی عقائد۔“

اس اقتباس بالا سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اہلِ انگلستان بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکے کہ ترکی اور خلافت عثمانیہ مسلمانوں کے نزدیک مرکز اسلام اور محافظ مقامات مقدسہ ہیں اور اسے قائم رکھنے کے لئے مسلمانانِ عالم بے چین تھے۔

پھر کچھ مسلمانوں کو اس پر اعتراض تھا کہ دوسرے اسلامی ممالک تو اس تحریک خلافت میں حصہ نہیں لیتے اور نہ ان کے اندر وہ تڑپ ہے جو اہلِ ہند میں ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا موصوف ہی کی ایک تقریر کا اقتباس نقل کرتا ہوں جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ خام خیالی ہے ورنہ پوری دنیائے اسلام میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔

مولانا سلیمان کے سفر یورپ سے واپسی پر شاہجہاں پور میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی، اس جلسہ کی صدارت کا شرف مولانا کو ہی ہوا، اقتباس حسب ذیل ہے: ”برادرانِ ملت! شکر گذار ہوں کہ اس مجلس میں آج رئیسانہ فرائض ادا کرنے کے لئے آپ نے میرا انتخاب فرمایا اور دنیائے اسلام اور مسئلہ خلافت کی نسبت میری پراگندہ معلومات کو سننے کے لئے اصرار بلکہ بے قراری ظاہر کی اس لئے میرا فرض ہے کہ سفر یورپ سے جو نقد تجربہ اور علم اس باب میں ہاتھ آیا ہے وہ آپ کے سامنے پیش کروں، حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ خلافت کی نسبت ہر پہلو سے گفتگو ہو چکی ہے مگر یہ ایک پہلو جسقدر زیادہ ہے اسی قدر اب تک یہ اچھوتا اور نا بیان ہے، بعض لوگ جو ملک میں ہماری تحریک کے مخالف ہیں وہ اپنے دعویٰ کی پر زور دلیل سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر مسئلہ خلافت اسلام کا مذہبی مسئلہ ہے تو دوسرے ملکوں کے مسلمان اس معاملہ میں کیوں خاموشی برت رہے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وفد خلافت نے (جس کے مولانا بھی ایک رکن تھے) جو فرائض انجام دیئے ہیں میں اس کا ایک بڑا کارنامہ

یہ سمجھتا ہوں کہ اس نے دنیا کے مسلمانوں میں برادری کا رشتہ جوڑ دیا ہے اور خلافت کی آواز کو اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا ہے۔ جنگ عظیم کے غیر متوقع نتائج کے بعد سچ یہ ہے کہ دنیائے اسلام یورپ کی عفریتیت سے مرعوب سی ہو گئی تھی۔ وفد خلافت کی تقریروں، ملاقاتوں، اعلانوں اور جرأتوں نے ان کی مرعوبیت کو دور کر دیا۔ ان کی مایوسیوں کو امیدوں سے بدل دیا اور ان کے کانوں تک اسلامی ہندوستان کی شجاعانہ آواز پہنچا کر بلند ہمتی کا ترانۂ جنگ پھونک دیا۔

برادران گرامی! آپ میں سے بھی بعض حضرات نے شاید مطلع کے گرد و غبار اور افق کی تاریکی سے ڈر کر یہ یاوسی کا عقیدہ پیدا کر لیا ہے کہ اسلام کے خورشید میں اب نئی روشنی نہیں پیدا ہو گی لاتقنطوا من رحمۃ اللہ کی خوش آیند بشارت پر یقین رکھنے والو! باور کرو کہ تم بھول میں پڑے ہو تمہارے سامنے سحر کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اسلام اس جنگ سے کمزور ہو کر نہیں طاقتور ہو کر نکلا ہے۔ متعدد نئی اسلامی ریاستیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایران، افغانستان نے نیا جنم لیا ہے، ترکی اپنے حدود میں ایک نئی تعمیر کی بنیاد ڈال رہا ہے۔ عرب اپنے خواب سے چونک گیا۔ ترکستان یعنی اسلامی فاتحوں کا گہوارہ خرس روس کے پنجہ سے اب آزاد ہے بحر اٹلانٹک سے لیکر رود نیل تک آزادی و خود مختاری اور ترقی و استقلال کی ایک لہر دوڑی ہے اور مصائب کے بوجھ نے ہمارے ان اتحادی اجزاء کو جو پراگندہ اور منتشر تھے کوٹ کوٹ کر ہمیں باہم پیوست کر دیا ہے اس طرح اتحاد اسلامی کی نئی روح تمام ملکوں میں پھیل گئی ہے اور ہمیں نظر آ رہا ہے کہ بوڑھے کمزور اسلام کی جگہ ایک نوجوان طاقتور اسلام جنم لے رہا ہے۔

مسئلہ خلافت گو ہمارے درمیان ایک مصیبتِ عظمیٰ اور بلائے ناگہانی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مگر بھولنا نہ چاہیے کہ اس مصیبت نے ہمیں چونکا دیا ہے دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ اس گونج سے معمور ہے اور اب ہر اسلامی ملک اپنے فرض کو ادا کرنے کے لئے سرفروشانہ آگے بڑھ رہا ہے۔"[۸۴]

اس کے بعد مولانا موصوف نے تمام اسلامی ممالک میں تحریک خلافت کے سلسلے میں جو تحریکیں جاری تھیں اور جو تنظیمیں وہاں قائم ہوئیں ان کا تجزیہ کیا اور ان کی کارروائیوں پر روشنی ڈالی۔ ان میں بالخصوص جزیرۂ عرب، مصر، عراق، شام، فلسطین، شمالی افریقہ، طرابلس الغرب، مراکش، اریٹیریا، مشرقی و جنوبی افریقہ روس، کریمیا، بلقان، البانیہ، چین، ایشیائے وسطیٰ، افغانستان، جزائر ہند قابل ذکر ہیں۔

مولانا نے اپنی تقریر ان الفاظ کے ساتھ ختم کی: "دنیائے اسلام کے ایک ایک گوشہ کے ان حالات کو جان لینے کے بعد ان واقعات کے نتائج آئینہ کی طرح آپ کے سامنے روشن ہو گئے ہوں گے، آپ پر واضح ہو گیا ہو گا کہ ان موجودہ مصائب نے دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں آگ سی لگا دی ہے۔ عالم اسلامی

کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں خلافت اسلامیہ کے مصائب و آلام نے دلوں میں جوشِ عمل، غیرت، سعی اور حمیت احساس پیدا نہیں کر دی ہے۔ دنیائے اسلام کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ آج لرزش اور زلزلہ میں ہے اور اپنے ماضی پر نادم اور مستقبل کے لئے متفکر ہے۔"[۹]

متذکرہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح و صاف ہو گئی ہے کہ تحریک خلافت صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا جائزہ لینے کے لئے مولانا تمام ممالک میں گئے اور ذاتی مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر لوگوں کو یہ بات بتائی۔

علاوہ ازیں خلافت کمیٹی نے چار وفد جزیرۃ العرب بھیجے۔ سنٹرل خلافت کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۰ اپریل ۱۹۲۴ء میں خود عام مسلمانانِ ہندوستان کے اطمینان قلب اور صحیح حالات کے دریافت کی غرض سے اور سلطان ابن سعود کے موتمر کی شرکت کے دعوت نامہ کے جواب میں فیصلہ کیا کہ ایک مناسب وفد حجاز مقدس جائے، حجاج کی راحت کے وسیلوں کی نسبت تحقیقات کرے اور اول موتمر عالم اسلامی جس کیلئے جمیعت خلافت بہت زمانہ سے کوشاں تھی اور جس کے لئے وہ ممالک اسلامیہ کے مخلص لوگوں اور انجمنوں سے خط و کتابت کر رہی تھی میں شریک ہو کر حجاز مقدس کی بہتری، حجاج کے آرام اور آسایش اور مقامات مقدسہ و حرمین شریفین کی حفاظت اور خدمت کے لئے تمام دنیائے اسلام کے مندوبین کے مشورہ سے ضروری اصلاح اور عملی تجاویز تیار کرے تاکہ اس مقدس کام کا جلد سے جلد اجرا ہو اور جو معمولی آسان اور ضروری کام صدیوں میں حجاز کے منتظمین اور امراء کی غفلت سے نہ ہو سکا وہ انجام پائے اور مسلمانوں کو وہاں کی بد انتظامی اور خرابی دیکھ کر آج چودھویں صدی میں شرمانا نہ پڑے۔ چنانچہ پہلا وفد چار خادمانِ خلافت پر مشتمل تھا۔ اس وفد کے صدر مولانا سید سلیمان ندوی منتخب ہوئے اور شعیب قریشی صاحب سکریٹری۔

وفد کو مولانا موصوف کی سرکردگی میں مندرجہ ذیل ہدایات دیکر روانہ کیا گیا:

(۱) مسلمانانِ ہند چاہتے ہیں کہ حجاز میں شرع اسلامی کے اصولوں پر جمہوری حکومت قائم کی جائے جس میں حجاز کی اندرونی آزادی کو پورے طور پر قائم رکھتے ہوئے تمام وہ وسائل جو حجاز کی اسلامی مرکزی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں مسلمانانِ عالم کی مرضی و مشورے سے طے ہونے چاہئیں۔ (۲) مندرجہ بالا جمہوریت کی تشکیل کے لئے ایک ایسی اسلامی موتمر کا انعقاد کیا جائے جس میں تمام اسلامی ممالک اور اسلامی حکومتوں کے نمائندے شامل ہوں۔ (۳) حجاز کی جمہوریت کے ساتھ اور حجاز کے مرکزی معاملات کے متعلق شریف حسین اور اس کے خاندان کا کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے۔ (۴) تمام عرب ریاستوں میں شرع اسلامی کے مطابق کامل

اتحاد ہونا چاہیئے تاکہ ان میں باہمی فساد اور خونریزی کا کوئی امکان باقی نہ رہے اور وصیت نبوی کے مطابق غیر مسلم اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔ (۵) اگر حالات مساعد ہوں تو مجوزہ موتمر اسلامی مکہ شریف میں ہونی چاہیئے۔ (۶) جزیرۃ العرب کی تمام ریاستوں کو قابل ترین قائم مقاموں کے فراہم کرنے کا انتظام سلطان نجد اور امام یحییٰ اپنے ذمہ لیں۔ (۷) مجوزہ موتمر کے انعقاد کی تاریخیں جس قدر جلد ممکن ہو مقرر کی جائیں اور سلطان نجد کی طرف سے یا سلطان موصوف اور امام یحییٰ اور اہل حجاز کی طرف سے عالم اسلامی کو دعوت دی جائے۔ (۸) یہ تاریخیں آیندہ حج کے زمانہ سے پہلے ذیقعدہ کے مہینہ میں ہونی چاہئیں۔ (۹)۔ جب تک موتمر اسلامی مندرجہ بالا حکومت حجاز کے متعلق کوئی مستقل اور آخری فیصلہ نہ کرے اس وقت تک ابن سعود کی سیادت و نگرانی میں نائبین کام کریں۔

چنانچہ مذکورہ بالا ہدایات کے مطابق مولانا سلیمان نے مختلف مواقع پر امیر علی پر مسلک خلافت کو اچھی طرح واضح کیا جو ایک وفد نے ایک خط کی شکل میں ۱۲ر جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ رئیس الوزرا امیر علی کے نام بھیجا تھا۔

دوسرا وفد حجاز پھر روانہ کیا گیا جس کے صدر مولوی محمد شفیع داودی مقرر کئے گئے اور ارکین میں مولوی قمر احمد صاحب، مولوی عفان صاحب، شیخ عبدالمجید صاحب، شیخ امین الدین صاحب اور حافظ عثمان صاحب تھے۔

حجاز میں جمہوریت کے قیام اور موتمر کے انعقاد سے مسائل زیادہ اہمیت اختیار کرتے جاتے تھے۔ ان تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے خلافت کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ایک تیسرا وفد پھر بھیجا جائے جس کا صدر دوبارہ مولانا سلیمان ندوی کو بنایا گیا۔ یہ وفد ۱۹۲۵ء میں گیا لیکن بدقسمتی سے سید صاحب صدر وفد اس کے ہمراہ نہ جا سکے۔

پھر ۱۸ر اپریل ۱۹۲۶ء کو بمقام دہلی موتمر کے دعوت نامہ کو خلافت کمیٹی نے قبول کیا اور ۲۰ر اپریل کو کمیٹی نے ایک نئے چوتھے وفد کا انتخاب کیا تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے نمایندہ کی حیثیت سے موتمر میں شریک ہو سکے۔ اس وفد کا صدر مولانا سلیمان کو نامزد کیا گیا۔ دوسرے ارکین میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی چنے گئے اور شعیب قریشی صاحب سکریٹری کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔

یہ طے پایا کہ موتمر حجاز کے دعوت نامہ میں جن امور کا ذکر ہے اس پر بحث و مباحثہ اور تبادلۂ خیالات کیا جائے اور آئندہ تشکیل حکومت حجاز کے لئے انعقاد موتمر کی بابت سلطان عبدالعزیز ابن سعود سے گفتگو کی جائے اور تشکیل حکومت حجاز کا مسئلہ اس موتمر میں پیش ہو تو اس میں شرکت سے انکار کیا جائے مگر سلطان ابن سعود

سے نجی طور پر گفتگو کرلی جائے اور ہمارا نقطۂ نگاہ ان کے روبرو پیش کر کے ان کو ہم خیال بنانے کی کوشش کی جائے۔ پہلی ہدایت پر مولانا سلیمان ندوی اور ان کے اراکین نے بہت تفصیل سے بحث و مباحثہ کیا اور تجاویز رکھیں:

(۱) حتی المقدور بہت جلد مآثر منہدمہ کو بنا دیا جائے۔ (۲) جو قبریں گرائی نہیں گئی ہیں ان کی حفاظت و صیانت کی جائے۔ (۳) جو قبریں منہدم ہو چکی ہیں ان کی تعمیر اور ان کی ہیئت ایک کمیٹی پر جو سنی، شیعہ علماء سے مرکب ہو چھوڑ دی جائے۔ (۴) حرم میں امامت چاروں مذاہب کے امام باری باری سے کریں۔ (۵) غیر مسلموں کو عرب میں اقتصادی امتیازات نہ دیئے جائیں۔ (۶) حجاز میں ریلوے لائن تعمیر کی جائے اس تجویز کے محرک مولانا شوکت علی، اور مولانا سلیمان ندوی موید تھے۔ ان کے علاوہ چند ایک تجویزیں اور رکھی گئیں۔

سلطان ابن سعود سے خلافت کمیٹی کی ہدایت کے مطابق چار ملاقاتیں کی گئیں جن میں مولانا سلیمان برابر شریک رہے مولانا نے دوسری ملاقات میں سلطان سے بالتفصیل گفتگو کی، یہ ملاقات تنہائی میں ہوئی بادشاہ کے ساتھ کوئی اور نہ تھا۔ قبوں، مآثر اور مزارات کے انہدام پر بحث ہوئی اور زبردست علمی گفتگو کی اور کہا کہ مذہبی حیثیت سے مقابر و مآثر دونوں کی الگ الگ حیثیتیں ہیں۔ مقابر کی تعمیر و بنا کے متعلق احادیث و فقہ میں تصریح و الفاظ ممانعت موجود ہیں گو ایک فریق ان کی کچھ تاویل کرتا ہے اور وہ ایسا نہیں سمجھتا تاہم اس کی ایک شرعی حیثیت ہے اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ علمائے اسلام کے سامنے کھلے طریقہ سے اس مسئلہ کو پیش کر کے ان کے متعلق فتویٰ طلب کیا جائے جو یقیناً کثرت تعداد کے لحاظ سے حق کے خلاف نہ ہوگا لیکن مآثر یعنی وہ مقامات مقدسہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے کوئی خاص نسبت ہے ان کی حفاظت یا ان کی تعمیر و بنا کی ممانعت سے احادیث نبوی کا دفتر تمام تر خالی ہے۔ اس پر بحث ہو سکتی ہے تو صرف اس کی صحت اسناد یا عدم صحت سے، البتہ ان مآثر میں اگر جاہل مسلمان ایسے اعمال کریں جو شرع کے خلاف ہوں تو مثل دوسری چیزوں کے یہ حکومت کا فرض ہے ایسے نگراں یا پولیس کے سپاہی مقرر کرے جو زائرین کو ان اعمال سے باز رکھیں، سلطان نے اس کے جواب میں کہا کہ میں مذہبی عالم نہیں ہوں اس لئے اس کا جواب نہیں دے سکتا آپ اس بارے میں ہمارے علماء سے گفتگو کیجیے اور اس کے لیے علماء کی ایک مجلس ترتیب دینے کا خیال ہے۔

تیسری ملاقات میں مولانا سلیمان شریک نہیں تھے۔ اس کے بعد آخری ملاقات ہوئی لیکن اس میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں تھی۔

اس کے بعد ۱۸؍ مئی ۱۹۲۶ء کو ہندوستانی وفد کو اطلاع دی گئی کہ کل بعد نماز ظہر علماء کا ایک جلسہ ہوگا کہ بعض مذہبی مسائل میں باہم گفتگو کی جائے۔ اس جلسہ کا آغاز سلطان کی تقریر سے ہوا۔ مولانا سلیمان ندوی نے کھڑے ہو کر رواداری کے متعلق پر زور تقریر کی۔ اور کہا کہ ہم لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ اہل نجد یہاں معمولی معمولی باتوں پر مثلاً سگریٹ اور حقہ پینے پر لوگوں کو مارتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر تشدد کرتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح سنا ہے کہ رمضان میں تراویح دو تین روز تک ۲۰ رکعت پڑھی گئی اور اس کے بعد ۸ رکعت پڑھنے پر مجبور کیا گیا۔ سلطان نے کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے خود کئی روز تک ۲۰ رکعت تراویح پڑھیں، مگر بعد کو مکہ کے دوکاندار میرے پاس آئے اور کہا کہ ہم لوگ کاروباری آدمی ہیں، بیس رکعت پڑھنے میں وقت زیادہ لگتا ہے اس لئے ہمیں ۸ رکعت پڑھنے کی اجازت دیجئے۔ اس پر ہم نے عمل کیا۔

دوسرے روز بھی بعد نماز ظہر جلسہ ہوا۔ سید صاحب نے مسئلہ مقابر و مآثر پر ایک پر زور تقریر کی اور آیات واحادیث اور تاریخ کے حوالوں سے اپنے مدعا کو ثابت کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم یہاں مجلس خلافت کی طرف سے تین باتیں لے کر آئے ہیں:

اوّل یہ کہ کتاب و سنت پر عمل کے ساتھ ساتھ ان امور میں وسعت دینی چاہیئے جن میں خود صحابہ و تابعین میں اختلاف تھا۔ مقرر نے ان کی متعدد مثالیں احادیث اور عمل صحابہ سے پیش کیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کتاب و سنت کے نتائج کا سب سے پہلا منظر خود حکومت کو ہونا چاہیئے کہ طرز اوّل کے مطابق خلیفہ کا انتخاب شرعی ہو اور وراثت سے پاک ہو۔ تیسری چیز مقابر و مآثر کا مسئلہ ہے اس مسئلہ میں یہ بات جان لینی چاہیئے کہ یہ دو چیزیں ہیں، مقابر و مآثر ان دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ مسئلہ مقابر کی نسبت پر سب کا اتفاق ہے کہ احادیثِ صحیحہ میں بنا علی القبور اور تجصیص علی القبور کی ممانعت ہے گو ایک مختصر فریق کے نزدیک اس کے معنی کچھ اور ہوں اُس بنا پر اگر سلطان تمام دنیائے اسلام کے علماء کے فیصلے کا انتظار کرتے تو یقیناً ان کو ناامیدی نہ ہوتی اور اس طرح ذمہ داری بجائے ان کی ذات کے یا اہل نجد کے تمام دنیائے اسلام پر بٹ جاتی۔ مآثر کا سلسلہ اس سے الگ ہے۔ مآثر سے مراد وہ مقامات ہیں جن کو انبیاء یا صحابہ کے ساتھ کوئی نسبت ہے۔ قرآن و حدیث اور آثار سلف میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ان مآثر پر عمارتوں کے بنانے یا مساجد بنا دینے سے منع کرتی ہو۔ بلکہ قرآن پاک، احادیث و سیر و آثار میں ایسے مآثر کا ذکر ہے۔ اس بنا پر ان مآثر کی عمارتوں کو منہدم کرا دینا شدت اور غلو کے سوا کوئی شرعی توجیہ نہیں رکھتا۔ ہم کو معلوم ہے کہ جاہل مسلمان وہاں بعض غیر شرعی اعمال کرتے ہیں، ان اعمال کو روکنا چاہیئے تھا یا یہ عمارتیں یا بعض عمارتیں جو غیر شرعی طور پر یا غیر مستند مواقع پر بنائی گئی تھیں ان کی تصحیح کی جاتی۔ مثلاً مولد نبویؐ کی

موجودہ شکل یقیناً صحیح نہ تھی، مگر زمانہ سلف میں اس کی شکل مسجد کی تھی جس میں نماز پڑھی جاتی تھی مگر موجودہ شکل حقیقی مولد کے کمرہ کی بنائی گئی تھی جو صحیح و مستند نہ تھی۔ اس کی تصحیح کر دینی چاہیے تھی اور غلاف، کٹھرہ، سنگ مرمر کی سل وغیرہ ہٹائی جا سکتی تھی مگر نفس عمارت کو توڑ ڈالنا شدت اور غلو کی انتہا ہے۔ مقام ابراہیم، صفا و مروہ، چاہ زمزم وغیرہ تمام آثار و مآثر ابراہیمی ہیں، کیا ان کو بھی منہدم کر دیا جائے گا غرضیکہ یہ ایک مفصل تقریر تھی اور اس تقریر کا کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس طرح حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے سلطان اور اکابرین عرب پر اپنے دلائل سے یہ واضح کر دیا کہ ان کی حرکتیں خلاف اسلام و شریعت ہیں اور دنیا کے مسلمانوں میں اس پر بڑا ہیجان ہے۔ اس طرح مولانا نے تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا اور جو ان سے بن پڑا وہ سب کچھ کیا اور بہت بے باک ہو کر حق بات کہنے میں نہ برطانوی حکومت سے ڈرے اور نہ سلطان نجد عبدالعزیز ابن سعود کے سامنے کہنے سے چوکے۔

وفد کے دوسرے اراکین جو عربی نہیں جانتے تھے یا بولنے کی ان کی اتنی مہارت نہیں تھی کہ وہ اپنا مافی الضمیر روانی سے بیان کرتے مولانا ان کی ترجمانی کرتے یا عربی سے اردو میں اور اردو سے عربی میں ترجمہ کر دیتے۔ بہرحال جب تک تحریک خلافت زندہ رہی مولانا موصوف اس سے وابستہ رہے اور خلافت و اسلام کی خدمت کرتے رہے۔

○

حوالے :۔

۱۔ تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی ص ۱۵ ، ۲۔ خلافت اسلامیہ اور دنیائے اسلام، معارف، اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۲۱ء تا اپریل ۱۹۲۲ء (مرتب)
۳۔ بلاذری، فتح سندھ
۴۔ خلافت اور ہندوستان از سید سلیمان ندوی، مرتبہ مسعود علی ندوی، ۱۳۴۰ھ، ص ۱-۲
۵ تا ۷۔ خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام از سید سلیمان ندوی، مرتبہ عبدالقدیر ص ۱-۲
۸ و ۹۔ دنیائے اسلام اور مسئلہ خلافت از سید سلیمان ندوی، مرتبہ مسعود علی ندوی ص ۱-۲

○

محمد صلاح الدین عمری*

تصوّر خلافت

اسلام محض زہد و عبادت کا مذہب نہیں ہے بلکہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو زندگی کے ہر پہلو کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک سیاست اور مذہب دو الگ الگ چیزیں نہیں، بلکہ قرآن نے اس کے لئے "دین" کا لفظ استعمال کر کے ایک جامع تصور دیدیا ہے کہ دین اسلام زندگی کی سیاست، معاشرت، معیشت اور اخلاقیات غرض ہر پہلو سے بحث کرتا ہے۔ اس کے نظام سیاست کی بنیاد دو چیزوں پر مبنی ہے۔ (۱) اقتدار اعلیٰ یا حقیقی حاکمیت صرف خدا کو حاصل ہے (۲) انسان جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ کی مخلوق ہے، اسی طرح اس کی حیثیت اس کے نائب یا خلیفہ ہونے کی بھی ہے۔ ان بنیادی حقیقتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام نے سیاست کا جو مفہوم دیا ہے اس کے خدوخال یہ ہیں کہ: اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے لئے ہے، اس میں کوئی فرد یا طبقہ شرکت کا حق نہیں رکھتا، اور نہ اس کو قانون سازی کا کوئی حق حاصل ہے۔ اس حقیقت کو علامہ سید سلیمان ندوی اس طرح بیان فرماتے ہیں: "مقصود یہ ہے کہ احکام شریعت اور قانون شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کا حکم حکم ہے اور اس کا قانون قانون ہے۔"[1]

اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں اور اس کی حاکمیت میں کسی کو شریک گرداننے والوں کو طاغوت کے بندے کہا گیا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دیکر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ مانا جائے وہ طاغوت ہے۔"[2]

البتہ نبی چونکہ خدا کا نمائندہ اور اس کے احکام کا شارح ہوتا ہے، اس لئے اس کی حیثیت تحتی قانون ساز کی ہوتی ہے، اور اس کے احکام بھی انسانوں کے لئے اسی طرح واجب الاطاعت ہیں جس طرح حقیقی قانون ساز اللہ کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ اولی الامر رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں، لہذا ان کی اطاعت بھی اس وقت تک لازم ہے جب تک کہ وہ کسی خلاف شریعت بات کا حکم نہ دیں۔

اللہ و رسول کے دیئے احکام کی اتباع اور ان کے وضع کردہ قوانین کے نفاذ کے لئے ایک اجتماعی حکومتی

---

* ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ادارہ کا قیام لازمی ہے۔ اس حکومتی ادارہ کو "خلافت" یا "امامت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خلافت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں کہ: "استخلاف کے معنی عربی زبان میں خلیفہ بنانے اور حکمراں بنانے کے ہیں یعنی اس ایک لفظ کے لغوی معنی کے اندر مادی و روحانی، دنیاوی و دینی دونوں قسم کی سرداری و سیادت کے معنی داخل ہیں۔"[2] علامہ اپنے قول کی تائید میں چند مستند مفسرین طبری، بغوی، بیضاوی اور ابن کثیر کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: "خلیفہ دینی و دنیاوی، مادی و روحانی دونوں قوتوں کا بیک وقت رئیس و سردار ہے۔ کوئی روحانی خلیفہ و امام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مادی و دنیاوی طاقت کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا ہو۔"[3] ظاہر ہے قوانین الٰہی کا نفاذ اسی وقت ممکن ہے جب ایک اسلامی حکومتی ادارہ کا قیام عمل میں آچکا ہو اور اسلامی حکومتی ادارہ کا قیام بھی اسلامی معاشرہ کی تشکیل ہو جانے پر منحصر ہے۔

خلافت الٰہی کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں کہ: "اس خلافت کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا وہ دین جس کو خدا نے انکے لئے پسند کیا، یعنی اسلام اس کو دنیا میں قوت و استحکام بخشا جائے کہ ظالموں اور ستمگروں کی زبردستی کے حملوں سے وہ دین اور اس کے ماننے والے ہمیشہ محفوظ رہیں۔"[5]

اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں کہ: "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری نہیں سنائی بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی۔"[6] علامہ کے نزدیک اللہ تعالےٰ کے انعامات میں سے ایک بڑا انعام حکومت اور سلطنت نیز دنیا کی سیادت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی سیادت کا درجہ ہے۔"[7] اسلام ایک جامع اور مکمل دستور زندگی ہے اور اسی کی جامعیت ہی کے تحت ایک یہ پہلو بھی ہے کہ وہ دین اور سلطنت کا ایک معتدل مجموعہ ہے۔ علامہ کے نزدیک اسلام "ایک ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے، یا ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے۔"[8]

اقامت دین امت کا فریضہ ہے جو اس صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے جب کہ امت کو سیادت و ولایت حاصل ہو۔ لہذا حکومت اسلامیہ کے قیام کی کوشش بھی امت کا فریضہ قرار پاتی ہے۔ علامہ لکھتے ہیں کہ حکومت و ریاست بھی امور دین کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں کیونکہ یہاں دین کے معنی احکام الٰہی ہیں یا قوانین الٰہی ہیں۔ یہ احکام الٰہی اور قوانین الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں۔ اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و نسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جزو ہے۔[9]

لیکن بد قسمتی سے بعض دیگر مذاہب کی تقلید میں اسلام میں بھی قیام سلطنت یا اس میں دلچسپی لینے

والوں کو دین سے الگ اور غیر مذہبی تصور کیا جانے لگا، یعنی اسلام میں بھی خانقاہیت کا غلط تصور در آیا، جس نے محض عبادت و ریاضت اور جہادِ نفس کو ہی قربِ الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا، اقامت دین سے بے اعتنائی بڑھتی گئی، بالآخر اسلام کے ایک اہم پہلو جہاد کو جہادِ اصغر اور جہاد نفس کو جہادِ اکبر کہا جانے لگا۔ علامہ سید سلیمان ندوی اس نکتہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیاء کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلایا کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل دینا دنیا کا کام ہے جس سے اہل علم اور اہل اتقا کو کنارہ کش رہنا چاہیئے۔ لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت، احکام، اس کی تبلیغ، تنفید اور اجراء کے لئے ہے اور یہ عین دین ہے۔ اسلام میں قتال و جہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے، اور جس پر اخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ نے فرمائے ہیں، اور جس سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مقدس اور حضرات خلفائے راشدین رضؓ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں، اس سے مقصود اصلی احکام، اس کی تبلیغ، تنفید اور اجراء ہی تھا۔ جہاد سے فرار غضب الٰہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدانِ جہاد کے صبر و ثبات صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے۔"[1] پھر علامہ سلطنت، ملکیت اور ملک الملوک کی تشریح کرتے ہوئے ان کے مجموئی مفہوم کو اسلامی قانون کی روح کے منافی قرار دیتے ہیں، اور بتاتے ہیں کہ اسلام کے طرزِ حکومت کو خلافت کا نام دینا مناسب ترین ہوگا، کیونکہ یہ حکومت دراصل اللہ کی نیابت ہے، اور اسلامی امیر اس کا خلیفہ یا نائب کی حیثیت رکھتا ہے۔[1]

سیرۃ النبی کی ساتویں جلد میں علامہ کے ایک مقالہ بعنوان "قوت عاملہ یا قوت آمرہ" میں نظام خلافت کی فطری ضرورت پر مدلل بحث کی گئی ہے کہ ہر منظم جماعت کی تنظیم کو برقرار رکھنے اور اس کے تحفظ کے لئے کسی قانون کو نافذ کرنے کیلئے ایک قوت عاملہ یا قوت آمرہ کی ضرورت فطرتِ انسانی کا تقاضہ ہے۔[2]

اسلامی نظام حکومت کو کس انداز کا طرزِ حکومت کہا جاسکتا ہے، اس مسئلے پر بھی سیاسی مدبرین اور مفکرین کے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ کوئی تو اس کو اوتاری حکومت قرار دیتا ہے اور کوئی شخصی حکومت بتاتا ہے، کسی نے اس کو دستوری حکومت بتایا اور کسی نے جمہوری۔ حتیٰ کہ اس کو اشتراکی طرزِ حکومت کہنے میں بھی باک نہیں محسوس کیا گیا۔ بعض انتہا پسند مفکرین اس کو ارسٹوکریٹک طرزِ حکومت کہنے کے موڈ میں بھی رہتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی اس گتھی کو سلجھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا، نہ وہ اوتاری ہے نہ شخصی ہے، نہ جمہوری اور نہ زعیمی ہے، بلکہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں ان سب

کی خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں لیکن وہ ان کے قبائح و مثالب سے خالی ہے۔"[۱۳] علامہ اسلامی خلافت کی روح جو اس کو تمام طرز ہائے حکومت سے ممتاز کرتی ہے، کی جانب نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی ہے اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے۔ اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعیین، ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں۔ اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور اس کے ارکان و عمال کا تقوی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس، اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جزو کسی کی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے، اور اس کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے۔"[۱۴]

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام حکومت نہ تو ARISTOCRATIC ہے اور نہ DEMOCRATIC نہ COMMUNISTIC اور نہ ہی خالص THEOCRATIC کیوں کہ تھیوکریٹک نظام حکومت میں مخصوص نظام الٰہی ہوتا ہے، جس میں امام یا حاکم صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ حکومت کے تمام اختیارات امام یا مذہبی پیشوا کو حاصل ہوتے ہیں اور ان کے خود ساختہ قوانین کی حیثیت گویا قوانین الٰہی کی ہوتی ہے لیکن اسلام کے نظام حکومت میں امام خدا اور عوام دونوں کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے، لہٰذا اسے تھیوڈیموکریٹک یا "جمہوریت الٰہیہ" کہا جا سکتا ہے۔

خلافت اسلامیہ عیش و عشرت اور تاج و تخت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ وہ ایک عظیم ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے میں ذرا سی بھی کوتاہی آخرت کی بازپرس کا موجب ہو سکتی ہے۔ علامہ لکھتے ہیں کہ: "سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یادِ الٰہی میں مصروف رہیں، جب بھی وہ اللہ تعالٰے کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے۔"[۱۵]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو قیصر و کسریٰ وغیرہ کی عظیم سلطنتوں پر غلبہ حاصل کرنے اور ان کو جہانبانی کے فرائض سونپے جانے کی جو بشارت دی تھی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ: "لیکن ان خوشخبریوں اور پیشین گوئیوں کے ہجوم میں یہ بات نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ حکومت، یہ بادشاہی، یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں۔ یہ اس لئے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری کے بہت سے موانع کو دور کرنے میں معین ہیں۔ اور اسلام کے حدود اور قانون عدل و انصاف کے اجراء کے ذریعے ہیں۔ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں خواہ وہ مسلمانوں کی ہو۔"[۱۶]

اسلامی حکومت یا خلافت کے آئین و قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کی زجر و توبیخ، قیام عدل اور ظلم و عدوان کو ختم کرنے کے سلسلہ میں سورہ حدید کی آیۃ لقد أرسلنا رسلنا بالبینٰت، و انزلنا معھم الکتاب والمیزان، لیقوم الناس بالقسط، وأنزلنا الحدید فیہ بأس شدید و منافع للناس (اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا، اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے کئی فائدے ہیں) کی تشریح کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں کہ: "اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لئے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک کتاب، یعنی احکام الٰہی کا مجموعہ، دوسری چیز وہ فطری صحیح اور عادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار کے دل میں دھری ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے، اور تیسری چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دونوں کے ماننے پر ان کی گردنیں جھکا دیتی ہے۔ یعنی جو احکام الٰہی کے ماننے سے منکر ہیں، اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں، ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت و ریاست ہے۔ اور اس کے دوسرے ہاتھ میں قانون الٰہی کی کتاب بھی ہونی چاہیئے جس کے ماننے پر وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کر دے۔" سورہ نور کی آیت نمبر ۷: وَعَدَ اللہ الذین اٰمنوا و عملوا الصالحٰت لیستخلفنھم فی الأرض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضٰی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم أمنًا یعبدوننی و لا یشرکون بی شیئًا۔ (تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دیگا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔ اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، مستحکم و پائیدار کرے گا۔ اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "اس آیت میں خلافت کے عطا، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو، اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الٰہی کی تعلیم اور رد شرک کی دعوت اس لئے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو...... تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا، اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے۔ اس کی مسجد اس کا دیوان، اس کا منبر اس کا تخت ہے۔ اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی، اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی، ان کا یہ خیال

سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے"۔ ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں۔ لیکن آپؐ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرادیا۔"[18] کیونکہ آپؐ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی بادشاہی نہ تھی بلکہ روئے زمین پر خدائے واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا۔ اس لئے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا۔ اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں۔ ایک ہی شاہنشاہ علی الاطلاق ہے جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اس کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ وہی آسمان پر حکمرانی کرتا ہے اور وہی زمین پر فرماں روا ہے۔"[19]

اسلام کا تصور سیاست کتنا اعلیٰ اور پاکیزہ ہے، علامہ کے الفاظ میں: "قیام سلطنت اور آئین سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا۔ اس شعبۂ حیات کو اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک و بلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا۔ احادیث میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ: السلطان ظلّ اللہ فی الأرض، یأوی إلیہ کل مظلوم من عباد اللہ"[20] (یعنی صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے، جس کے دامن میں بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے)۔

حاشیہ میں علامہ نے (السلطان) کا ترجمہ طاقت و قوت اور POWER کیا ہے۔ آگے چلکر علامہ لکھتے ہیں کہ: "جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں، ان کو اپنے اس حسن عمل کا ثواب اس طرح ملے گا جس طرح دوسری عبادات کا۔ گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے"[21]... پھر لکھتے ہیں کہ ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ: "سلطنت بھی عبادت ہوگئی، اور ہر قسم کی بددیانتی، خیانت، سازش، تعدی و ظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہوگیا۔"[22]

سورۂ انفال کی آیت یاأیها الذین اٰمنوا إذا لقیتم الذین کفروا زحفًا فلا تولّوهم الأدبار، ومن یولّهم یومئذٍ دبره، إلّا متحرّفًا لقتالٍ أو متحیّزًا إلی فئةٍ، فقد بآء بغضبٍ من اللہِ، ومأواه جهنّم وبئس المصیر (اے اہلِ ایمان جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا، اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا کہ لڑائی کے لئے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے، ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہوگیا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے) کی تشریح علامہ سید سلیمان ندوی ان الفاظ میں کرتے ہیں: "یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ جہاد و قتال فی سبیل اللہ،

انصاف، اقامت دین، تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو۔ جس کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صیغوں سے متعلق ہے۔ عام عبادات اور اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بناء پر کہ اقامت دین کی راہ میں خون شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمالنامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے۔ حضرات صحابہ ہر وقت جہاد و قتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے۔"[۲۳]

دراصل اسلامی نظام حکومت کی کارفرمائی ایک ایسے مثالی معاشرہ کے وجود پر موقوف ہے جس کو مسلم معاشرہ کہا جا سکے۔ جس کے قیام کا مقصد بہت وسیع ہے۔ اس کے بنیادی نکات کا تعین قرآن کی وہ آیات کرتی ہیں جن میں حکومت کا کام معاشرہ میں نظام قسط قائم کرنا بتایا گیا ہے اور جس کے لئے ایک حکومتی ادارہ کا قیام لازمی ہے۔ نظام قسط بنیادی طور پر اقامت نماز، ادائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مشتمل ہے اور یہی دراصل اقامت دین کا جامع تصور ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے تصور خلافت کی وضاحت کے بعد، ملک کی مقتدر علمی شخصیتوں اور مفکروں سے میرا ایک طالبعلمانہ سوال ہے کہ کیا دین کی تشریح و تفہیم کے سلسلہ میں دنیا کی عصری اسلامی تحریکات جو اسلوب طرز تحریر اور طریق دعوت اپناتی ہیں وہ علامہ کی مایہ ناز علمی و تحقیقی تحریروں ہی کا پرتو تو نہیں؟

حوالے: ۱ تا ۵۔ مقالات سلیمان ص۳۸۱، ۲۷۶-۷۷، ۲۹۳-۲۹۴، ۳۹۸

۶ تا ۲۳۔ سیرۃ النبی ج۷، ص۱۸، ۲۳، ۱۲۶-۲۷، ۱۴۱-۴۳، ۱۴۸، ۱۸۶، ۱۹۰، ۱۹۳، ۱۲۸-۲۹، ۵۵-۵۶، ۱۲-۱۳، ۴۸-۴۹، ۱۰۱، ۱۴۴

○

محسن عثمانی ندوی★

تصوّر امارت شرعیہ

علامہ سید سلیمان ندوی کا نام اُردو زبان میں علم و تحقیق، ادب و انشاء اور تاریخ و تصنیف کی علامت بن چکا ہے۔ وہ اسلامی علوم و فنون کا بحر ذخار تھے۔ جس موضوع کو اپنے قلم کی جولان گاہ بناتے، جدید و قدیم معلومات اور تحقیقات کا ایک پورا لشکر موجود ہوتا۔

بھوپال کی سرزمین کو یہ حق تھا کہ اسلامی علوم و فنون پر دستگاہ رکھنے والے اس عالم اور اسکالر کی یاد میں اس اجتماع کی میزبانی کرے۔ کہ یہی سرزمین مدتوں علم کی سرپرستی کرتی رہی ہے۔ لکھنؤ سے لیکر اعظم گڑھ تک اسلامی علوم کی تعلیم اور تاریخ و سیرت کی کتابوں کی تصنیف کا جو کام بھی انجام پایا ہے، اس کی بنیاد میں ریاست بھوپال کی کوشش، قدردانی اور تعاون کا اہم حصہ رہا ہے۔ جہاں تک خالص علمی اور تحقیقی کاموں کا تعلق ہے بیسویں صدی کے آغاز میں اس چھوٹی سی ریاست کے جذبۂ علم پروری سے جو کام انجام پایا وہ بعد کے دور میں عرب ملکوں کے سیال سونے سے انجام نہ پاسکا۔ اسباب کا تجزیہ اس مقالہ کا موضوع نہیں لیکن اسے اہل علم و نظر کے فکر کا موضوع ہونا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بنیادی وجہ یکسوئی اور ذہنی ارتکاز کی کمی اور قناعت کے جذبے کا فقدان ہے۔ کسی کو پہلے حطام دنیا کے اکتساب سے فرصت ملے تو علم و تحقیق کی راہ اختیار کرے۔

سنہ ۱۹۸۵ء کے ہندوستان میں علامہ سید سلیمان ندویؒ پر یہ سیمینار اس خطۂ ارض پر منعقد ہو رہا ہے جہاں وہ ایک عرصے تک قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ کی حیثیت سے رہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ اس سال مسلمانوں کا کون سب سے اہم مسئلہ مسلمان قائدین اور علماء کے زیر بحث آیا یا زیر تقریر اور زیر تحریر رہا تو بلا اختلاف اس کا جواب ہوگا مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ۔ ہندوستان کے سب سے بڑے دار القضاء (سپریم کورٹ) کے حالیہ فیصلہ پر مسلمانوں میں جو اضطراب کا عالم ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ اس مسئلہ پر غور و فکر کے دوران سوانح سلیمانی اور نگارشات سلیمانی کے پڑھنے والے ہر شخص کی نظریں قدرتی طور پر وہاں وہاں رکیں گی جہاں جہاں سید صاحب کا قلم خوش خرام ان موضوعات سے ہو کر گذرا ہے۔

سید صاحب کی مختلف تحریروں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عائلی اور معاشرتی

★ سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

قوانین کے تحفظ کے لئے اور مسلمانوں کی وحدت اور شیرازہ بندی کے لئے اور ان کے استحکام اور قوت کے لئے کل ہند سطح پر امارت شرعیہ کے قیام کو ضروری اور ناگزیر سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے ہر حال میں اجتماعی نظام کی فرضیت اور دین و سیاست کے باہمی تعلق کو جاننے کے لئے اور اس موضوع پر سید صاحب کے خیالات سے واقف ہونے کیلئے سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم اور ان کے بعض خطبات کا مطالعہ ضروری ہے۔ سید صاحب نے خلافت کانفرنس اور جمیعۃ العلماء ہند کے بعض خطبات صدارت میں ان موضوعات پر روشنی ڈالی ہے اور سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم کے چند اہم عنوانات یہ ہیں: ۱۔ اسلام میں حکومت کی اہمیت اور حیثیت، ۲۔ عہدِ نبویؐ میں نظام حکومت ۳۔ سلطنت اور دین کا تعلق، ۴۔ قوت عاملہ یا قوتِ آمرہ ۵۔ حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

معاملات و سیاسیات کے موضوع پر سید صاحب ایک مکمل کتاب لکھنا چاہتے تھے مگر وہ اس سلسلے میں صرف کچھ مضامین لکھ سکے اور اس کو مکمل نہ کر سکے۔ تاہم سیرۃ النبیؐ کی اس جلد اور ان کی اس موضوع پر دوسری تحریروں سے ان کے خیالات اور اندازِ نظر سے مکمل واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

سید صاحب ہندوستان میں کل ہند امارت شرعیہ کے قیام کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور جمعیتوں میں منقسم نہ ہوں۔ ان کے لئے شرعی اعتبار سے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسے گروہ کی حیثیت سے زندگی گذاریں جس کا ایک منتخب امیر ہو۔ سید صاحب اور بہت سے علماء راسخین کے نزدیک اس امارت شرعیہ کو کل ہند سطح پر بالفعل وجود میں لانا مسلمانوں کی پہلی دینی ذمہ داری ہے۔

انھیں ایک مرکزی تنظیم کے تحت تمام اسلامی فرائض کو ادا کرنا چاہیئے۔ احکام اسلامی میں اس تنظیم اور اجتماعیت کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ تین مسلمان بھی اگر کسی "فلاۃ" میں ہوں تو ان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی جماعت بنالیں اور اپنا ایک امیر مقرر کرلیں۔ (مسند احمد بروایت عبداللہ بن عمر)

حضرت معاذ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے کہا کہ جس طرح بھیڑیا بکری کو پکڑ لیتا ہے اسی طرح شیطان انسان کا بھیڑیا ہے تم الگ الگ ٹولیوں میں متفرق ہونے سے بچو اور جماعت کو اور سب کے ساتھ مل کر رہنے کو لازم سمجھو۔

اجتماعیت اور مسلمانوں کی ایک امارت اسلام میں لازمی طور پر مطلوب ہے۔ اس وقت مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں موجود ہیں یہ علیحدہ علیحدہ جماعتیں حکم امارت کا مصداق نہیں بن سکتیں ورنہ امت میں فرقہ بندی اور انتشار کو مطلوب قرار دینا ہوگا۔ بلکہ اس سے مراد وہ امارت و اجتماعیت ہے جو سارے مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ اس سے کمتر درجہ کی چیز امارت کے قائم مقام نہیں ہو سکتی ہندوستان کے موجودہ حالات کا تقاضا ہے اور مسلمانوں کے پرسنل لا کے تحفظ کے لئے بھی ضروری

ہے اور یہ شریعت کا حکم بھی ہے کہ مسلمان ایک تنظیمی وحدت میں منسلک ہوں تاکہ تمام دینی اور ملی کام اجتماعی مصالح کے تحت انجام پائیں اور دار القضا و دار الا فتاء اور دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام منظم طریقے سے انجام پا سکے۔

نومبر ۱۹۱۷ء کے معارف میں سید صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: "طلاق و نکاح و فسخ و تفریق کے ہزاروں معاملات جو دن رات پیش آتے ہیں، تمام ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ان کا کوئی انتظام نہیں۔ اس کے لئے گورنمنٹ کی سول عدالتوں کو تکلیف کرنی پڑتی ہے جس میں ایک طرف تو عدالتوں کی اصول اسلامی سے ناواقفیت کی بنیاد پر نہایت شدید غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، دوسری طرف مسلمانوں کو ان کے مذہبی کام میں غیر مسلم عدالتوں کی مداخلت سے آزردگی اور ناگواری پیدا ہوتی ہے، اور اکثر و بیشتر علماء کے نزدیک ان معاملات میں غیر مسلم عدالتوں کا فیصلہ قبول کرنا ناجائز ہے"۔

سید صاحب نے ۱۹۱۷ء میں جو کچھ لکھا وہ ۱۹۸۵ء کے لئے بھی اہم اور تازہ اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مناسب حال ہے۔

سید صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: "اس سال کے اخبارات کے فائل زوجۂ معلّقہ کے متعلق گرم اور تیز مضامین سے مملوء ہیں۔ ابھی میرے پاس "جالون" سے ایک خط آیا ہے جس میں ایک شریف خاتون کی سرگذشت لکھی ہے جو ایک ظالم شوہر کے پنجے میں گرفتار ہے۔ مولانا اشرف علی صاحب نے لکھا کہ کسی اسلامی ریاست میں جا کر قاضی کے سامنے تفریق کرا ڈالو لیکن جب بھوپال کے قاضی کو لکھا گیا تو انھوں نے بہت درست جواب دیا کہ چونکہ فریقین میں سے کوئی ریاست بھوپال کا باشندہ نہیں اس لئے مجھ کو مداخلت کا حق نہیں"۔

"مسجدوں کے مقدمات پڑھئے، مقلّد، حنفی، شافعی، قادیانی وغیرہ کے مقدمات کس کے سامنے پیش ہوتے ہیں، مسٹر جیمس کے سامنے۔ آمین بالجہر اور بالسر کا کون فیصلہ کرتا ہے، مسٹر گھوش۔ نکاح و طلاق کے صحت و عدم صحت کا کون فرمان جاری کرتا ہے۔ ہرنام سنگھ۔ قرآن، کتب احادیث اور فتاوئے فقہ کا کہاں ڈھیر لگتا ہے، لوٹ کی جگہ پر، فیا دمعۃً علی الاسلام و یا دمعۃً علی المسلمین"۔

"اوقاف کی حالت پر غور کرو تمام ہندوستان میں مسلمانوں کے کروڑوں روپئے کے اوقاف ہیں، وہ انتظاماً جس طرح برے ہاتھوں میں ہیں ان کا رونا ہر روز اسلامی اخبارات میں ہوتا ہے۔ جس کار خیر کے لئے وہ وقف ہیں اس میں ان کا کس قدر حصہ صرف ہوتا ہے، وہ ذاتی جائداد کی طرح متولیوں کے موروثی قبضے میں ہیں اور روز بروز برباد ہوتے جا رہے ہیں"۔

سید صاحبؒ نے ان مشکلات کے حل کے لئے اور شرعی حکم کو بالفعل وجود میں لانے کے لئے امارت شرعیہ کے قیام کو ضروری قرار دیا ہے، اس اجتماعی تنظیم کے لئے کہیں "وہ شرعی امارت" کا لفظ اور کہیں "مستقل اور آزاد مذہبی نظام" کا لفظ اور کہیں اس کے لئے "صیغۂ مذہبی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

سید صاحبؒ نے اس کے لئے نصوص سے دلیلیں بھی دی ہیں اور یہ بھی لکھا کہ ہندوستان کے گذشتہ عہد میں یہ صیغہ موجود تھا، اور اس کے وجود کا شروع سے تسلسل رہا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ تمام بلاد اسلامیہ میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں اور جن میں سے اکثر یورپین طاقتوں کے ماتحت ہیں اور امریکہ کے ماتحت بھی کچھ حصہ ہے وہاں یہ صیغہ خود سرکاری انتظام و اعانت میں موجود ہے، اور پھر یہ کہ ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں بھی اس قسم کے انتظامات جاری ہیں، اور حکومت برطانیہ کے عہد آغاز میں بھی اس قسم کے انتظامات اس ملک میں رائج تھے۔ چنانچہ غدر تک کے فیصلوں پر "خادم شریعت قاضی" کی مہریں کاغذات سرکاری پر ملیں گی لیکن رفتہ رفتہ یہ عہدے مٹتے رہے اور آخر معدوم محض ہو گئے۔

سید صاحبؒ پھر لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے علاوہ اور دیگر اسلامی ممالک جو مسلمانوں سے نکل کر فرانس، اٹلی، آسٹریا، امریکا، روس، ریاست ہائے بلقان، ہالینڈ کے زیر اقتدار آ گئے۔ وہاں مسلمانوں کے مذہبی امور "شیخ الاسلام" کے ہاتھ میں ہیں، بعض یورپین سلطنتوں نے خود اپنے زیر حکم "شیخ الاسلام" مسلمانوں کے لئے مقرر کر رکھا ہے، جو ان کی مسلمان رعایا پر مذہبی نگراں ہے۔ چنانچہ روس، الجیریا، تونس، طرابلس، بلگیریہ، فلپائن وغیرہ میں اسی طریقے پر مسلمانوں کے لئے خاص انتظام ہیں۔

امارت کی اہمیت اور شرعی ضرورت پر سید صاحب نے مختلف تحریروں میں اظہار خیال کیا ہے:

۱۹۲۶ء کے خطبے میں فرماتے ہیں کہ "ہندوستان میں اب اور اب سے زیادہ مسلمانوں کو اپنی بقا کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک امارت شرعی کے ماتحت اپنے کو منظم کر لیں... کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندوستان میں ایک مسلم اہل اور صاحب لیاقت قائد کے ہاتھ پر بیعت نہ کر سکیں ... اس قائد کے ماتحت ایک منتخب مجلس شوریٰ ہو، اس کے ماتحت تعلیم و تبلیغ، تالیف و اشاعت اور مالیات کے مختلف شعبے ہوں، اور اسی اصول پر صوبوں کی امارتیں ہوں، اور ان کے ماتحت اضلاع کی، و علی ھذا القیاس اس کے ماتحت نکاح و طلاق و وراثت وغیرہ کے محکمے ہوں، دار الافتاء ہو جہاں سے جدید ضروریات کے متعلق فتوے صادر ہوں اور سارے ملک میں اس مسئلے پر جو بے ترتیبی ہے وہ دور ہو... اسلام کے عقیدے میں نظم و جماعت کے بغیر ہم صحیح اسلامی زندگی پر قائم نہیں رہ سکتے۔"

سید صاحب کی تحریر کا یہ اقتباس بھی قابل غور ہے: "یہ کہنا کہ امامت کیلئے نفوذ و اقتدار ضروری چیز ہے

صحیح ہے۔ لیکن یہ کامل امامت کی شرط ہے۔ مسئلے کی صورت تو یہ ہے کہ اگر مسلمان کسی امرِ واجب کے ادا کرنے کی کما حقہٗ (طاقت نہیں رکھتے) اور اس کو پورے شرائط کے ساتھ ادا کرنے پر قادر نہیں تو آیا وہ واجب اس سے ساقط ہو جائے گا یا حسبِ استطاعت جہاں تک اس کی وسعت و قدرت میں ہو اس کو ادا کرنا ضروری ہے، نماز کے لئے قیام و قعود اور قرآن پڑھنا تو ضروری ہے لیکن اگر کوئی بیمار ہو یا اپاہج ہو یا گونگا اس پر قدرت نہ رکھے تو کیا اس سے نماز ساقط ہو جائے گی یا نماز واجب رہے گی، اور اس کو ادا کرنا اس کی طاقت و وسعت کے مطابق فرض ہوگا۔ لا یکلف اللّٰہ نفساً الا وسعھا:

اس موضوع پر لکھتے ہوئے اور امارت و اجتماعیت کا وجوب ثابت کرتے ہوئے سید صاحب کا تاریخی ذوق بار بار انھیں تاریخ کے کوچے میں لے جاتا ہے، انھوں نے ثابت کیا ہے کہ تاتاریوں کی یلغار کے بعد بھی اسلامی تنظیمی وحدت کا سررشتہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا، وہ سلیمان تاجر کے سفرنامے کے حوالے سے چین میں اور چوتھی صدی ہجری کے جہازراں بزرگ بن شہریار کے سفرنامہ عجائب الہند کے حوالہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی مرکزی تنظیم کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ پھر انھوں نے پولینڈ میں اور روس میں مسلمانوں کی مرکزی تنظیم کا ذکر کیا ہے، پھر مسلمانوں کی وحدت اور ان کے مختلف مشاکل کا حل بتاتے ہوئے امارت شرعیہ کی ضرورت و تنظیم پر روشنی ڈالی ہے۔

میری یہ مختصر تحریر نہ گرمیٔ محفل کے لئے ہے اور نہ زیبِ داستاں کے لئے۔ شاہ بانو کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ اور نام نہاد نیشنل پریس کی طرف سے اس کی زوردار حمایت کے دوران اس ملک میں مسلماتوں کی ملک گیر تحریک امارت شرعیہ کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ مسلمانوں کی ایسی تنظیم جس کے سایہ میں مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں اپنے دائرے میں کام کرتی رہیں۔ اختلافات صرف علمی سطح پر طے ہوں۔ "رحماء بینھم" پر عمل ہو۔ اور مسلمانوں کے مقدمات مسلمانوں کے دار القضا میں فیصل ہوں۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کی حیثیت ایک آرزو اور ایک خواب کی ہے۔ علماء کی اس محفل میں اس تحریر کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میں یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ کل ہند امارت شرعیہ کا قیام مسلمانوں کی دینی اور شرعی ضرورت ہے، یہ ایک ایسا کام ہے جو ان کی ضرورت بھی ہے اور ان پر فرض بھی اور علامہ سید سلیمان ندوی جن پر یہ سیمنار منعقد ہو رہا ہے اس نقطۂ نظر کے پورے طور پر حامی اور مؤید بلکہ داعی تھے۔

○

نثار احمد فاروقی★

سید سلیمان ندوی
ایک تحریک

علامہ سید سلیمان ندوی اس برصغیر میں گذشتہ صدی کے سب سے زیادہ ممتاز عالم تھے۔ انھوں نے صرف اسلامیات ہی کو نہیں بلکہ اسلامی ثقافت کو اپنے فکر و مطالعہ کا موضوع بنایا اور ان سے متعلق علوم کی ہر شاخ کا نہ صرف گہرا مطالعہ کیا بلکہ جو کچھ انھوں نے لکھا اس سے ان کے مصادر کی اہمیت بھی روشن تر ہو گئی۔ انھوں نے عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب کے علاوہ تاریخ عام، تاریخ اسلام و مسلمین، عربی تہذیب و تمدن اور اسلامی فلکیات و بحریات کا بھی کوئی گوشہ ناپیمودہ نہیں چھوڑا۔ علوم دینیہ میں وہ قرآن و سیرت کے موضوعات پر ایسے جلیل القدر کام کر گئے، جن کی ہمسری کرنا آج بھی مشکل ہے اور کل تو محالات میں سے ہو سکتا ہے کیونکہ مسلمانان ہند کی نئی نسلوں میں علوم عربیہ و فارسیہ کی وہ روایت کمزور ہوتی جا رہی ہے جس کے سہارے ان کوچوں کی سیر ہوا کرتی ہے۔ تصنیفی دنیا میں علامہ ندوی کے کتنے ہی کارنامے بے مثال اور لازوال ہیں۔ فارسی شاعر عمر خیام پر ان کی تحقیق، عربوں کی جہازرانی اور عرب و ہند کے تعلقات کا تاریخی جائزہ، امام مالک اور حضرت عائشہ رضؓ ام المومنین اور علامہ شبلی نعمانی کی سوانح عمریاں، ارض القرآن میں قرآنی جغرافیہ کا مفصل جائزہ، علمی موضوعات پر تحقیقی مقالات، تبصرے، تنقید و تقریظ، سفر نامے، کتب خانوں کے جائزے، مکتوبات، وفیات، معارف کے شذرات، اور نہ جانے کیا کیا۔ مگر ان کا سب سے روشن کارنامہ "سیرۃ النبیؐ" کی تکمیل کو سمجھا جاتا ہے جسے انھوں نے اپنے استاد محترم علامہ شبلی مرحوم کے تیار کئے ہوئے خاکے سے کچھ بہتر ہی کر دکھایا۔ "سیرۃ النبیؐ" ایک مفصل و مطول کتاب ہے اور اس کا رشتہ انھوں نے اسلامی نظریۂ حیات و کائنات سے جوڑ کر سیرت نگاروں کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ اب یہ صرف واقعات کی جمعبندی اور صرف تاریخی حوادث اور وقائع کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اسے اسلامی شریعت اور فکر و فلسفے کے ساتھ اس طرح ممزوج کر دیا ہے کہ ہم خود اسلامی فکر کو ایک بڑے آفاقی پس منظر میں اور نہایت وسیع سیاق و سباق میں دیکھ

★ صدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

سکتے ہیں۔ مختصر اور نہایت موقر ہونے کے اعتبار سے ان کے "خطبات مدراس" کا بھی جواب نہیں ہے۔ اس کتاب کا نام ایک حجاب بن گیا ہے اور یہ صرف جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ ان خطبات کا موضوع سیرت طیبہ ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ سیرۃ طیبہ کے موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب اُردو میں تو کیا دوسری ان مشرقی زبانوں میں بھی نہیں ملتی جن زبانوں میں اسلامیات کا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ مولانا محمد ناظم ندوی نے اس کتاب کو عربی کا جامہ پہنایا ہے اور یہ عالم عربی میں بھی مقبول ہوئی ہے۔ "سیرۃ النبیؐ" کے بعض اجزاء کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی سخت ضرورت ہے کہ "سیرۃ النبیؐ" اور "خطبات مدراس" عربی، فارسی، ترکی زبانوں کے علاوہ ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں میں بھی منتقل کی جائیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے نصف صدی تک بے تکان لکھا اور کتنے ہی موضوعات ایسے ہیں جن پر انھوں نے اردو کو قابل فخر و لائق اعتبار سرمایہ دیا ہے۔ وہ محض خشک عالم یا ایسے محقق نہیں تھے جو بے مغز و روح الفاظ کے کھوج میں اپنی عمریں گنوا دیتے ہیں۔ انھوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن کے بارہ میں اردو زبان تہی دامن تھی مگر جن موضوعات کا دامن ہمارے روز و شب سے بندھا ہوا تھا اور جن کی اہمیت سمجھے بغیر ہم اپنے ثقافتی ورثہ کی نہ قدر و قیمت جان سکتے ہیں نہ اس کا تحفظ کر سکتے ہیں نہ اپنے ماضی کی شاندار روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھ سکتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی علمی زندگی کے لئے یہ راستہ کیوں اختیار کیا اور اس کے محرکات و دواعی کیا تھے اس کو سمجھنے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے اور یہ گذشتہ صدی کے سیاسی و معاشرتی سیاق ہی میں ممکن ہے۔ مولانا شبلی نے سرسید کا عہد پایا تھا، سرسید نے تو مغلیہ حکومت کا خاتمہ اور برطانوی سامراج کے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ شبلیؔ اسی سال ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے جب ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت پر زبونی اور زوال کی آخری مہر لگی تھی۔ ایک طرف صدیوں کی گسترده بساطِ تہذیب و تمدن الٹ رہی تھی تو دوسری جانب سے مغربی تمدن کا سیلِ بے امان امڈتا چلا آرہا تھا جس کی زد میں ہماری اخلاقی اقدار خس و خاشاک کی طرح بہنے لگی تھیں۔ رسمی علوم کے معیار و مناہج بدل رہے تھے اور اسی باعث مسلمانوں میں جہالت کے عام ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ شبلی نے جب ہوش سنبھالا تو مشرق و مغرب اور قدیم و جدید کی کشمکش ابھر کر خوب واضح ہو چکی تھی کہ اب اسے بچشم سر دیکھنا ممکن تھا۔ ان حالات میں ہندوستان کی امتِ مسلمہ پراگندگی و افسردگی کا شکار تھی اور اس کے تخلیقی سوتے خشک ہونے لگے تھے۔ غالبؔ نے جب کہا تھا کہ ؏

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

تو خواہ انھوں نے محض مضمون آفرینی و قافیہ پیمائی کے لئے کہا ہو مگر یہ ہندوستانی مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کی تصویر کشی تھی جہاں مغربی استعمار اپنے ناپاک چنگل کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا جا رہا تھا اور مسلمان اپنے علمی و ثقافتی ورثہ سے دور اور مجبور ہو کر شک و شبہ کی کشمکش کے اسیر ہو گئے تھے۔

دوسری طرف ہندوستان ہی میں دوسرے برادرانِ وطن خوابِ گراں سے اٹھ رہے تھے اور نئی بیداری کروٹ لے رہی تھی جس کے اثرات مقامی اصلاحی تحریکوں میں نمایاں طور سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ علمی میدان میں عالم اسلام ایک عہدِ ظلمت سے گزر رہا تھا اور اسکے پاس سوائے شروح و حواشی لکھنے کے کوئی اور تخلیقی بات کہنے کو نہیں رہ گئی تھی۔ دوسری طرف استعماری نظام کے سیاسی مقاصد کو تقویت پہنچانے کے لئے مستشرقین کی پوری پلٹن تیار ہو کر میدان میں اتر چکی تھی جس نے مشرق کا عموماً اور مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کا خصوصاً گہرا اور اختصاصی مطالعہ کر کے فساد و افتراق کے بیج بونا شروع کر دیئے تھے۔ ان مستشرقین کی پشت پر مادی وسائل کی فراوانی اور معاشرتی تحفظ کا احساس بھی تھا اس لئے انہوں نے اہل مشرق کو علمی میدان کی مسابقت میں صرف پیچھے ہی نہیں چھوڑا بلکہ ایک اجتماعی سطح کے احساس کمتری و فرومایگی میں بھی مبتلا کر دیا تھا، گویا وہ علم جسے "ضالۃ المومن" کہا جاتا تھا اب ان کی میراث تھی۔ بقول داغؔ ؎

جاگیر جنوں کی قیس کے بعد
اب داغؔ کے نام ہو گئی ہے

نظام تعلیم بدل گیا، وہ علم جس سے قلب و دماغ پر جلا ہوتی تھی، شخصیت کے مخفی سوتے پھوٹتے تھے، فراستِ ایمانی پیدا ہوتی تھی اور جو ہمیں اپنی حقیقت سے آشنا کرانے والا علم تھا اس کا اب کہیں نشانِ پا بھی مشکل سے نظر آتا تھا، اس علم نے مدارس پر قبضہ کر لیا تھا جو تن پروری، تن آسانی اور سبک بینی کے کام کا ہوتا ہے اور اصلاح کے نام پر فساد پھیلاتا ہے، خوبصورت اصطلاحوں کے پردہ میں افتراق، انتشار، نفرت اور استحصال کی تبلیغ کرتا ہے، جو مظاہر کائنات کو صرف بیرونی سطح سے دیکھتا ہے اور حقیقت اشیاء سے آنکھیں بند کرنا سکھاتا ہے۔

ان حالات میں سرسید اور شبلی جیسے دردمندوں نے اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر وہ کام کئے جن سے ایک زوال آمادہ امت کو جینے کا حوصلہ مل گیا۔ انھیں کاموں سے آج شبلیؔ اور سرسید کی شناخت ہو رہی ہے اور انھیں شاندار کاموں نے ملت کی تہذیبی و ثقافتی انفرادیت و امتیاز کو زندہ رکھا ہے۔ شبلیؔ مرحوم قلم کی قوت سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ چند باشعور اور غیرت مند اہل قلم جو اخلاص کی دولت سے بھی بہرہ ور ہوں پورے معاشرہ کی کایا پلٹ سکتے ہیں اور شاندار تہذیبی روایات کا تحفظ بھی انھیں سے ممکن ہوتا ہے۔ شبلی چاہتے تھے کہ ہمارے درمیان روشن دماغ کشادہ قلب اور وسیع النظر مصنّف پیدا

ہوں جو تنقید کا ذوق اور تحقیق کا میلان بھی رکھتے ہوں اور اپنے قدیم علمی سرمایہ سے اچھی طرح باخبر ہوں، وہ جدید کے اچھے پہلوؤں سے استفادہ کرنے کے ساتھ ہی قدیم ثقافتی ورثہ کے تحفظ کا احساس بھی دلائیں کیونکہ اس قوم کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا جس کا رشتہ اپنے ماضی سے منقطع ہو جائے اور جس کے قدم اپنی روایات کی زمین پر جمے نہ ہوں۔ مسلمان ایسی ملت نہیں ہیں جو اپنی تہذیب و معاشرت سے کٹ کر اور دوسروں کی ثقافت سے وفاداری کا رشتہ جوڑ کر بھی زندہ رہ سکیں، اس لئے کہ مسلمانوں کی زندگی **ایک ایسے** نظام شریعت سے بندھی ہوئی ہے جس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو انھیں مطلوب ہے اور **وہ کچھ بھی ہے** جس سے دوسرے فکری نظام عاری ہیں۔ اسی جذبے نے "ندوۃ العلماء" کی تشکیل کرائی تھی اور یہی وہ تقاضائے وقت تھا جس نے "دارالمصنفین" کی بنیاد رکھوائی۔

سید سلیمان ندوی بھی اسی احیاء علوم اسلامیہ کی تحریک کا ایک ستون ہیں اس لئے انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اس قبیل کی چیز نہیں ہے جو ناموری یا دفع الوقتی یا ذہنی عیاشی کے لئے لکھا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف ان کے گہرے ملی درد کا مقیاس اور ان کی حمیت و غیرت کا آئینہ ہے، ان کی تالیف و تشکیل کے پیچھے یہ جذبہ کام کر رہا ہے کہ ہم اپنی عظیم تہذیبی و علمی روایات سے نہ صرف یہ کہ معرفت و شناسائی کا حق ادا کریں بلکہ ان کا تحفظ اور اجلال کرنا بھی سیکھیں۔ سید سلیمان ندوی نے جو تخم کاری کی تھی اس کے برگ و بار ہمیں نصیب ہوئے، مگر زمانہ اب دوسری کروٹ بھی لے چکا ہے اب عربی و فارسی تو خیر بدیسی زبانیں ہیں ہی، یہاں اردو کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، اردو کے ساتھ جو بے انصافی، حق تلفی و بے اعتنائی ہو رہی ہے اور آہستہ آہستہ اس کو ہمارے تہذیبی پس منظر سے دور کیا جا رہا ہے اس سے اعداء کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اپنی تہذیب و ثقافت سے بیگانے ہو جائیں اور دوسروں کی بیساکھیاں لگا کر چلنے کی عادت ڈال لیں۔ شبلی اور سید سلیمان ندوی نے جس مقصد کے حصول کے لئے ساری زندگی جہاد بالقلم کیا تھا اس کا حاصل کرنا آج بھی باقی ہے۔

یہ ملی مسائل سے گہری وابستگی اور سوز قلبی ہی ہے جو سید سلیمان کو سیاست کے کارزار تک بھی کھینچ لاتا ہے، اگرچہ انھوں نے خود کو کبھی سیاسی آدمی بننے نہیں دیا، اگر وہ ہوس دنیا کے اسیر ہوتے تو سیاسی لیڈری بھی دست بستہ حاضر ہو جاتی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی وساطت سے مہاراجہ محمود آباد نے کسی جھونک میں کہہ دیا ہوگا کہ وہ اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیں گے، یہ سید صاحب کا پسندیدہ کام تھا، اور وہ مقصد تھا جس کے لئے وہ ہر قربانی و ایثار کر سکتے تھے، انھوں نے ایک جامع اسکیم بھی تیار کر لی تھی، مگر مہاراجہ نے وہ معاملہ کیا جو غالب کے ساتھ پیش آیا تھا: ؎

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا   جتنے عرصے میں میرا لپٹا ہوا بستر کھلا

سید صاحب اپنے عہد میں پوری طرح چوکنا ہو کر جیے، انگریزی زبان کی بہت اعلیٰ لیاقت نہ رکھتے ہوئے بھی انھوں نے مستشرقین کے الزامات اور ہفوات لایعنی کا منہ توڑ جواب دیا اور ہمیشہ اس کوشش میں مصروف رہے کہ ہمارے درمیان باخبر لکھنے والے، نئی علم اور غیور اہل قلم پیدا ہوں جو اپنی تاریخ کو، فکر و فلسفہ کو، نظریۂ حیات و کائنات کو، معاش و معاد سے متعلق ملّی رویّہ کو پورے اعتماد کے ساتھ اور صحیح آب و رنگ میں پیش کر سکیں۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ مغربی مورخین مسلمانوں کی تاریخ کو کس طرح مسخ کر کے پیش کرتے ہیں، انھوں نے ہماری مادی دولت کے خزانے ہی نہیں لوٹے بلکہ علمی نوادر بھی یہاں سے مالِ غنیمت سمجھ کر لے گئے ہیں اور اپنے کتب خانوں کی زینت بڑھالی ہے۔ ع

غنی روز سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن   کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

"دارالمصنفین" کی تحریک سید صاحب نے اس لئے شروع کی تھی کہ ہندی مسلمانوں کے پاس اچھے ادارے اور اکیڈمیاں ہوں، پرانی اور قلمی کتابوں اور دستاویزوں کا تحفظ کیا جائے اور ان کی مدد سے اپنے ماضی کی تاریخ کا جائزہ لیا جاتا رہے۔ اس لئے سید صاحب کی تحریروں میں اکثریت ان مضامین کی ہے جو کتب مخطوطات کے تعارف و تحفظ کی نیت سے لکھے گئے۔ تاج محل آگرہ کے معمار خاندان کی علمی خدمات کو منظرِ عام پر لانا اور لطف اللہ مہندس کے دیوان کا تعارف اس کی صرف ایک مثال ہے۔ عمر خیام جسے یورپ نے ایک اشراقی اور لذت کوش شاعر خمریات کے روپ میں پہچانا تھا، سید صاحب نے اس کو ایک عظیم ماہر فلکیات و ریاضیات کی شکل میں روشناس کرایا جہاں اس کی شاعرانہ حیثیت محض ثانوی ہو جاتی ہے۔

آج ہمیں جن مخالف قوتوں سے لوہا لینا ہے ان کے ارادے سامراجیوں سے زیادہ ناپاک اور خطرناک ہیں اس لئے ہمیں سید سلیمان ندوی کے کاموں کا جائزہ ایک تحریک کی صورت میں لینا ہوگا اور اس تحریک کو زندہ رکھنا ہوگا کیونکہ اسے عالم وجود میں لانے کے دواعی آج بھی نہ صرف زندہ ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ توانا ہیں۔

كيفَ تنامُ الطيورُ في وكناتِها   وَقَد نصبت بالفرقدينِ الحبائلُ

سید حسین★

دور سلوک

حضرت علامہؒ کے سلوک و معرفت اور حضرت حکیم الامت و مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تعلق کا عنوان ہی ایسا ہے کہ جس پر یہ حقیر کچھ عرض کر سکتا ہے، حضرت حکیم الامتؒ سے قبلہ مولانا کا تعلق ۱۹۴۲ء سے مستقلاً شروع ہوا، اور اسی زمانے میں اس حقیر کا تعلق حضرت سید صاحبؒ سے پیدا ہوا، ظاہر ہے کہ اس سے پہلے کے حالات کا نہ مجھے علم ہے اور نہ کوئی رابطہ ہی رہا۔ اس سے پہلے جب حضرت کا علمی، ادبی و سیاسی دور رہا اس کے متعلق تو اہل علم و ادب کا حق ہے کہ وہ بیان کریں، دور سلوک کے متعلق میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

حضرت علامہؒ میں کچھ فطری اور وہبی صلاحیتیں جو مجھے نظر آئیں، ان میں سب سے اول ان کا وقار و سنجیدگی و متانت ہیں، چنانچہ پہلی ہی نظر میں ان کی وجاہت کا اثر دیکھنے والے کے قلب پر پڑتا تھا، ان کے بشرے ہی سے سیادت کے آثار ظاہر و باہر تھے، حضرت رسول پاکؐ کی سیرت مبارکہ جو انہوں نے چھ جلدوں میں مدوّن کی، ان میں حضرت قبلہ کو تقریباً ۲۵ برس کا عرصہ لگا۔ سیرت نبوی کی تصنیف میں آپ سر تا پا غرق رہتے تھے، سیرت مقدس کے ہر ہر پہلو پر حضرت علامہؒ نے کئی کئی برس تدبر و تفکر میں صرف فرمائے، جب اچھی طرح سے کسی ایک پہلو پر غور فرما لیتے تب اس کو سپرد قلم کرتے تھے، اس لئے حضور اکرمؐ کی سیرت مبارکہ پر آپ کی نظر غائر مدتوں پڑتی رہی، اس کے نتیجے میں وہ سر تا پا سیرت شریف کا مرقع و نمونہ بن گئے، ظاہر ہے کہ جو شخص اس قدر امعان نظر سے رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ پر غور کرے گا اس میں سے ضرور کچھ نہ کچھ اثر اپنے اندر جذب کرے گا۔

سید صاحبؒ کا تبسم ایسا تھا کہ جس طرح حضور اکرمؐ کا تبسم محدثین حضرات نے تحریر فرمایا ہے، اسی طرح سے آپ کا اپنوں اور غیروں سے میل جول، بول چال، اخلاق و معاملہ زندگی کے سب پہلوؤں پر سیرت نبوی کا پرتو نظر آتا تھا، خاص کر اپنے اہل خانہ کے ساتھ جو مراعات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں نہیں اور دیکھنے میں نہ آئیں مخالفین کی بری بھلی باتیں سنتے اور خاموش رہتے، اور اگر کچھ فرماتے تو نرمی اور شرافت سے بھلی بات خواہ آپ کا مخاطب کیسا ہی بداخلاق اور گستاخ کیوں نہ ہو۔ ان کی ناگوار باتوں کو

★ (داماد سید سلیمانؒ) رضا منزل (۱)، ۴/۳۶۱، دودھ پور، علی گڑھ، I.A.S., RETD. COMMISSIONER

اس قدر انگیز فرماتے کہ دیکھنے والے حیران وانگشت بدنداں رہ جاتے، آپ کے دوستوں میں سے اگر کوئی کہتا بھی کہ آپ کے تحمل سے آپ کے ماتحت بہت شوخ وزبان دراز ہوگئے ہیں تو اس کا بھی جواب بجز مسکرانے کے اور کچھ نہ دیتے بلکہ یہی فرماتے کہ چند دنوں میں وہ خود ہی اپنی غلطی کا احساس کرے گا۔

آپ کے طالب علموں نے بعض اوقات بڑی بڑی گستاخیاں زبانی اور تحریری کیں مگر آپ سب کا جواب اپنے سکوت وخاموشی سے دیتے رہے۔ اس صبر وتحمل کا اثر آپ کے قلب پر بھی پڑا، اور ۱۹۳۴ء میں قلب کے عارضہ میں مبتلا ہوگئے، معالجہ سے شفا بھی ہوئی تو ماحول کی ناہمواری نے ان کو چین نہ لینے دیا اور قلب کی بیماری کم وبیش چلتی ہی رہی۔ ایک بار جب کہ میں اعظم گڑھ حاضر تھا، مارچ ۱۹۳۴ء کے مہینہ میں قلب کا دورہ پڑا چنانچہ میں اپنے ساتھ ان کو جونپور لے گیا، اور وہاں مکرمی ڈاکٹر محمد عبدالحی کے علاج سے بہت فائدہ ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحیٰ صاحب خود بھی سنجیدہ اور متین آدمی ہیں، اس لئے ان کو بھی حضرت سے مناسبت ہوگئی، اور حضرت مولانا بھی ان پر بہت شفقت فرماتے تھے، ڈاکٹر صاحب موصوف اعظم گڑھ بھی حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور بہت عقیدت مندی کا اظہار فرماتے، سید صاحبؒ نے بھی تازیست ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اسی شفقت کا برتاؤ فرمایا۔

دوسری نمایاں خصوصیت جو میں نے سید صاحبؒ میں دیکھی کہ وہ اکثر اوقات خاموشی وتنہائی میں بسر فرماتے، گویا کہ حدیث "من صمت نجا" پر کما حقہ، پورا عمل کر کے دکھلایا، اور یہ صفت بھی ہم نے اپنے زمانے کے لوگوں میں شاذ ونادر ہی دیکھی۔ اس خاموشی میں اکثر اوقات گزارنے کا یہ ثمرہ عطا ہوا کہ جب آپ کلام فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے دُر افشانی کر رہے ہیں۔

جس طرح آپ کے مزاج میں اعتدال تھا اسی طرح آپ کا زہد وتقویٰ بھی اعتدال کے درجہ میں تھا اور افراط وتفریط سے آپ کا مزاج پاک تھا، غالباً شوال ۱۳۶۱ھ کا آخری عشرہ (اکتوبر ۱۹۴۲ء) تھا، میں اس زمانہ میں بلیا سے رخصت پر دارالمصنفین اعظم گڑھ گیا ہوا تھا، حضرت قبلہ کے قیام کا کمرہ تھا، عصر ومغرب کے درمیان کا وقت تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت قبلہ کو تھانہ بھون سے گہرا ربط اور حضرت مولانا تھانویؒ سے خط وکتابت کا اصلاحی سلسلہ شروع ہو چکا تھا، حضرت قبلہ اس وقت کن مقامات اور حالات سے گزر چکے تھے اور گذر رہے تھے، اس کا جاننے والا بجز رب العزت اور کوئی نہیں ہے، اسی دن حضرت قبلہ کے خط کا جواب حضرت تھانویؒ کے دست مبارک کا لکھا ہوا موصول ہوا، چونکہ حضرت قبلہ کے علم میں یہ تھا کہ اس ناچیز کو بھی حضرت حکیم الامتؒ سے عقیدت ہے، اس لئے فرمایا کہ حضرت مولانا کا والا نامہ آیا ہے اور خود حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس زمانہ میں حضرت مولاناؒ بوجہ ضعف خطوط کے جواب عموماً خود نہیں تحریر فرمایا کرتے

تھے، بلکہ دوسروں سے لکھوا دیتے تھے، لیکن حضرت قبلہ سے اس درجہ خصوصیت تھی کہ خود ہی جواب تحریر فرمایا تھا، یہ سن کر میں متوجہ ہوگیا کہ اگر کوئی خاص بات ہوگی تو خود ہی بتلائیں گے، میری توجہ کو دیکھ کر فرمایا: حضرت مولانا کبھی کبھی اشعار میں جواب تحریر فرماتے ہیں، میں نے دیکھا کہ چار پانچ اشعار حضرت مولانا تھانویؒ کے تحریر کردہ اس مکتوب میں تھے مگر مجھے زیادہ قریب سے دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی، میرا اشتیاق دیکھ کر وہ اشعار مجھ کو سنائے جن کا پہلا شعر یہ ہے ؎ از سلیماں گیر اخلاص عمل ۔ داں تو ندوی را منزّہ از دغل جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے اس کی تصدیق فرما دی کہ حضرت قبلہ اخلاص عمل کی منزل کو طے کر چکے تھے، اس پر رسوخ ہو چکا تھا اور دوسروں کے لئے ان کا اخلاص عملی نمونہ بن چکا تھا۔ حضرت تھانویؒ کو جن لوگوں نے دیکھا ہے اور ان کے معیار و مسلک سے آگاہ ہیں وہ اس کو سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت کا یہ فرمانا کہ فلاں شخص سے اخلاص عمل کا سبق لو معمولی بات نہ تھی۔

میرا قیام اعظم گڑھ ہی میں تھا کہ حضرت قبلہ نے ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو الہ آباد کا سفر کیا اور اثنائے راہ میں یہ غزل وارد ہوئی جو کسی حد تک ان کے اس وقت کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے، مطلع یہ ہے ؎

ابھی تو مشق فغاں کنج میں ہزار کرے   اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

اس غزل سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود شیخ کی طرف سے عطا کردہ نمونۂ اخلاص عمل کی سند کے وہ اپنی حالت پر مطمئن نہیں ہیں اور جذب و عشق کی حرارت سے یہ پوری غزل لبریز ہے۔

۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کو سید صاحب قبلہ نے الہ آباد سے لکھنؤ کا سفر فرمایا، اس سفر میں وہ غزل ارقام فرمائی جو دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کے تعزیتی جلسہ منعقدہ ۲۶ر ۲۷ر دسمبر ۵۳ء کو مولوی حمید صاحب زائر حرم نے پڑھ کر سنائی تھی تو ایک ایسا روح پرور سماں بندھ گیا تھا کہ اس کی تصویر کشی کم سے کم مجھ جیسے عاجز کے لئے ناممکن ہے اس کا مطلع یہ تھا ؎ صدق احساس کی دولت مرے مولا دیدے ۔ غم امروز بھلا دے غم فردا دیدے

یہ غزل اپنی کیفیات کے اعتبار سے سید صاحب کی بہترین غزلوں میں عروج و کمال کی آئینہ دار ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ اشعار میں جو عرض درگاہ قاضی الحاجات میں کی گئی تھی وہ مقبول ہوگئی، اس کو پڑھ کر بے ساختہ حضرت خواجہ حافظؒ کی وہ غزل یاد آتی ہے جس کا شان ورود بھی کچھ اس قسم کا ہے ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند   وندران ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند
بے خود از شعشۂ پرتو ذاتم کردند   بادہ از جامِ تجلیٰ بہ صفاتم دادند
من اگر کامروا گشتم وخوش دل چہ عجب   مستحق بودم وایں ہا بزکاتم دادند
کیمیائیست عجب بندگیٔ پیر مغاں   خاک او گشتم وچندیں درجاتم دادند

غلام محمد★

عُلوِّ سلیمانی

اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ وَاۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ ۝ میں نے اپنے پیر روشن ضمیر سے عرض کیا: ”حضرت سنا ہے کہ ولایت زیادہ سادات کے حصّہ میں آئی ہے“ جواب ملا: ”یہ کیا بات کہہ دی آپ نے؟ سید تو پیدا ہی ولی ہوتا ہے، یہ بات اور ہے کہ غفلت اور بداعمالی سے اپنے جوہر کو غبار آلود کر لیتا ہے۔“ شیخ کے اس ارشاد میں ”جوہر“ کا لفظ جوہری اہمیت کا ہے، توجہ تخلیقی اور وہبی امتیاز کی طرف پھیری گئی ہے اور یہ وہ صداقت ہے جس کی اطلاع خود مخبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم دے چکے ہیں کہ **الناس کمعادن الذهب والفضة** یعنی استعداد ذاتی کے اعتبار سے لوگ ایسے ہی ہیں جیسے سونے چاندی کی کانیں۔ قسام ازل نے جس کان میں سونا رکھ دیا رکھ دیا اور جس میں چاندی رکھ دی رکھ دی، دونوں نہ برابر ہو سکتے ہیں اور نہ بڑے سے بڑا سنار چاندی میں سونے کی صنعت کاری کی نزاکت اور کمال پیدا کر سکتا ہے۔ اسی طبعی استعداد کے فرق کو شیخ شیراز مصلح الدین سعدیؒ نے سلیس و عام فہم پیرایہ میں یوں سمجھایا ع

شمشیر نیک زاہن بد چوں کند کسے　　ناکس بہ تربیت نہ شود اے حکیم کس

پس ہر عاقل ماننے پر مجبور ہے کہ استعداد ذاتی ایک وہبی شرف ہے، اور جب یہ مان لیا تو ہمارے شیخ کے اس ارشاد میں کہ ”سید تو پیدا ہی ولی ہوتا ہے“ کسی ”روشن دماغ“ کو کوئی تامل یا جھجک کیوں ہو؟ اور جب یہ مقدمات مسلم ٹھیرے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت سلیمانؒ پیدائشی ولی تھے کیوں کہ وہ اپنے والد کی طرف سے حسینی اور والدہ کی طرف سے زیدی، نہایت محفوظ سلسلۂ سیادت کی زریں کڑی تھے ع

زیک سو بوئے گل وزیک طرف پیغام یار آید　　من آں دیوانہ ام کز ہر دو طرفِ من بہار آید

اب رہا شیخ کے قول کا دوسرا جزو کہ ”یہ اور بات ہے کہ غفلت و بداعمالی سے اپنے جوہر کو غبار آلود کر لے“ تو خود صاحب قول اس سے ہمیشہ محفوظ رہے، ان کا جوہر سیادت ہمیشہ آبدار رہا، ان کی نوعمری کے رفقا اس پر گواہ ہیں۔ مولانا عبدالباری ندویؒ کی تحریری شہادت یہ ہے کہ ”سید صاحب بطنی سید ہی نہیں ماشاءاللہ بڑے بطنی سعید تھے۔“[۲] اور یہ کہ ”مرحوم معصوم نہ تھے لیکن ان کی زندگی کا جو رخ طالب علمی سے لے کر آخر تک کم و بیش ہر نوع کے سابقہ میں سب سے زیادہ معصوم نظر آیا وہ یہی کہ خود رائی

★ مولف تذکرۂ سلیمان

و خود پسندی دور دور نظر نہیں آئی۔[۱۱۳]

سیدِ والا کی "محفوظیت" میں بڑا دخل خود گھر کے ماحول کا تھا جہاں تقویٰ و طہارت اور انوار ولایت کی ہر طرف تجلی پھیلی ہوئی تھی، والدہ ایک ولیہ اور تاجدار مدینہؐ کی محبت میں بقول حضرت مناظر احسن گیلانیؒ "مستعربہ" بنی ہوئی تھیں، یعنی لباس و پوشاک تک اہل مدینہ خواتین کا اختیار کر رکھا تھا، والد ماجد ابوالعلائی نقشبندی سلسلہ کے شیخ کامل تھے، اور بڑے بھائی جو عمر میں ہمارے شیخ سے اٹھارہ برس بڑے اور ان کے مربی تھے، وہ قطب وقت شاہ ابو احمد بھوپالی مجددیؒ کے خلیفہ مجاز تھے، مجھ سے خود حضرت شیخ نے فرمایا کہ "بھائی صاحب مجھ کو اپنے حلقۂ توجہ میں بٹھلایا کرتے تھے، اور میں لڑکپن ہی میں صفائے باطنی کا اثر محسوس کرتا تھا۔" دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ نفس کے رذائل سے خلاصی جو طویل مجاہدات کے بعد بفضلِ الٰہی حاصل ہوتی ہے، یہاں خود بخود حاصل تھی، اس لیے جب شیخ نے طے سلوک کا قصد فرمایا تو جو عام طور پر اوروں کا قدم آخر ہوتا ہے وہ شیخ کا آغازِ قدم تھا۔

معاملہ بس یہ رہا کہ ندوہ کے تعلیمی زمانہ سے لیکر چالیس سالہ عمر کو پہنچنے تک خالص علمی و تحقیقاتی انہماک کی وجہ سے روحانی ارتقار کی طرف ارادی توجہ نہ ہو سکی گو خالص و بے ریا جہاد قلمی اور خاص کر سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیات کے شغف کی برکت سے غیر محسوس روحانی نشو و نما ہوتا رہا، قلب کی جلا اور روح کی پاکیزگی بڑھتی گئی، مگر بات صرف اتنی تھی کہ جو حاصل تھا وہ معلوم نہ تھا، اور جو معلوم تھا وہ مشہود نہ تھا۔ بالفاظ دیگر بے حاصلی تو نہ تھی مگر بے خبری تھی، شاید یہی وجہ تھی کہ گاہے گاہے غیب سے چونکایا جاتا رہا کہ علمی اقلیم کے سلیمان کو معرفت الٰہی کی نامتناہی فضا میں بھی پہنچنا ہے۔ جس کا تقاضا لسان الغیب حافظ شیراز کی زبان میں یہ ہے ع

در حریم عشق نتواں زد دم از گفت و شنید
زانکہ آنجا جملہ اعضا چشم باید بود و گوش

چنانچہ بطور مثال صرف وہ واقعہ سنئے جس میں علامہ سلیمانؒ کی امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ سے برزخی ملاقات کرائی گئی۔ ہوا یہ کہ حضرت علامہ سرہند کے قریب بسّی نامی بستی سے اپنے رفقائے سفر مولانا آزاد سبحانی نقشبندی مجددیؒ وغیرہ کے ساتھ لوٹ رہے تھے، مجددِ سرہندی کے مزار پرانوار کی زیارت کے بغیر آگے کیسے بڑھتے۔ مزار پر سب حاضر ہوئے، علامہ تو فاتحہ پڑھ کر باہر آگئے، مولانا آزاد سبحانی اور دوسرے رفقار مراقب ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت علامہ ان رفقار کے انتظار میں متصل مسجد کے کٹہرے پر جو شاید ڈھائی تین فٹ اونچا ہوگا آبیٹھے، قدرت کی کرشمہ سامانی دیکھئے، عین عالم ہوش میں علامہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پرنور ہستی ان کے قریب آپہنچی اور سوال فرمایا: "مکتوباتِ ما را خواندہ؟" علامہ نے عرض کیا:

"بلے خواندہ ام!" اُدھر سے پھر سوال ہوا: "آں را فہمیدہ؟" اِدھر سے عرض کیا گیا: "اندکے ازاں فہمیدہ ام! اندکے ازاں فہمیدہ ام!!" بس جملہ کی تکرار کے ساتھ غش کھا کر فرش پر گر گئے۔ مولانا آزاد سبحانی نے آکر جگایا، گھبرا کر وجہ پوچھی، علامہ ٹالتے رہے مگر پھر اصل واقعہ بتانا ہی پڑا۔ مولانا نے فرمایا: "آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔" غرض یہ اشارۂ غیبی تھا کہ سید العلماء کو سید العرفاء بھی بننا ہے۔

جہاں تک نفس فنِ تصوف و احسان کا تعلق ہے حضرت علامہ کا ذہن اس معاملہ میں شروع ہی سے بالکل واضح اور نکھرا ہوا تھا، اس کا تحریری ثبوت، ان کی جوانی اور دکن کالج پونا کی پروفیسری کے دور کی بے نظیر کتاب "خیام" میں مل جاتا ہے۔ غور سے سنئے کس قدر ٹکسالی اور عارفانہ توضیح تصوف کی فرما گئے ہیں: "تصوف کا لفظ اب مدت سے دو معنوں میں بولا جاتا ہے یا یہ کہو کہ تصوف کی دو قسمیں ہیں: ایک مذہبی تصوف اور دوسرا فلسفیانہ تصوف، مذہبی تصوف سے مقصود مذہبی روح یعنی اخلاص محبت، زہد، تقویٰ، عبادت اور شریعت پر سنت نبوی کے مطابق عمل ہے اور اسی کا نام حدیث کی اصطلاح میں "احسان" ہے پہلی اور دوسری صدی میں زہاد اور عبّاد اسی قسم کے تھے، عام مسلمانوں سے الگ ان کے کچھ عقائد اور خیالات نہ تھے، وہ فلسفہ سے بھی ناآشنا تھے، وہ صرف قرآن و حدیث سے توغل رکھتے تھے اور روزہ نماز، تلاوتِ قرآن اور نوافل ان کا شب و روز کا شغل تھا اور اخلاص عمل اور خلق کی خدمت پر ان کے ہاں سب سے زیادہ زور تھا۔ اور فلسفیانہ تصوف سے مقصود الٰہیات کے متعلق حکیمانہ خیالات رکھنا اور فلسفہ کی طرح خشک زندگی اختیار کر کے ان کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔

پہلے تصوف کا مرکز خیال نبوت ہے اور اس میں انبیاء کے احوال کی پیروی ہوتی ہے" اور دوسرے تصوف کا مرکز حکمت ہے اور اس میں فلاسفہ اور حکماء کے احوال کی پیروی کی جاتی ہے، وشتان بینہما"۔ الغزالیؒ ہوں یا شاہ جیلانیؒ یا امام شعرانیؒ حقیقتِ تصوف کی توضیح علامہ کی تحریر کردہ تشریح کے سوا اور کچھ نہیں کرتے، مگر یہاں جو فرق ملحوظ نظر رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ علامہ کی یہ "معلومات" ہیں اور ان اکابر صوفیاء کی یہ "یافت" ہے، علامہ صرف باخبر ہیں، اور یہ حضرات صاحبِ نظر، علامہ ابھی بیرونِ در ہیں اور یہ اکابر خلوتِ خاص میں پہنچے ہوئے۔

بہر کیف سلامتیٔ ذہن اور قلبی محفوظیت کے ساتھ ہمارے شیخ جب چالیس برس کی عمر کو پہنچے اور علمی دنیا میں ان کی عظمت کا پھریرا خوب اونچا لہرا رہا تھا تو ان کا قلب اسرارِ قلبی اور مشاہداتِ روحانی کی طرف شدت سے مائل ہوگیا۔ اور قلب و روح کا غیر معمولی انجذاب شیخ العرب والعجم شاہ امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی طرف ہوا، حسرت طاری ہوئی کہ وہ تو اب موجود نہ تھے، خواب میں زیارت سے مشرف ہوئے اور اپنے سینہ

اور پھر حضرت اقدس کے سینۂ فیض گنجینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ "حضرت اس کو ایسا کر دیجیے۔" حضرت حاجی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "اب تو میں یہ کام نہیں کرتا۔" آنکھ کھلی تو دل میں یہ اشارہ پایا کہ ان کے کسی جانشین سے کسب فیض کرنا چاہیے۔ نگاہ ہر پھر کے خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون کے جانشین حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانوی کی ذاتِ مبارک پر ٹھہری جن کے ذریعہ فیوضِ امدادیہ بحرِ موج کی طرح جاری وساری تھے۔ حضرت علامہ کو یہاں پوری مناسبت ملی، اور توجہاتِ اشرفیہ بطرزِ خاص اور بطورِ خاص ان پر مبذول رہیں، اور سفرِ روحانی جس کا آغاز نقطۂ نفس سے نہیں بلکہ قلب و روح کے دائرے سے ہوا تھا، براق رفتاری سے طے ہو گیا، وہ دیکھتے ہی دیکھتے فانی فی اللہ ہو کر "قربِ بے غیبت" میں آ پہنچے اور دوامِ حضور سے سرشار ہو گئے، کیا خوب فرمایا ہے ع

قربِ بے غیبت نمازِ عاشقاں — فی صلوٰۃٍ دائمونَم آرزوست

قرآنی اصطلاح فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ، اب خبر نہیں رہی بلکہ یافت تھی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ تجلی گاہِ حق نظر آ رہا تھا، چنانچہ حاصل دید کا اظہار یوں فرماتے ہیں ع

اس تجلی گاہ کا ہر نازنیں! — کشتۂ اندازِ الا اللہ ہے

البتہ حضرت شیخ کے طے سلوک میں کہیں استہلاک، استغراق یا بے خودی کا عالم نہیں ملتا، اسی لئے ان کا قال شطح سے محفوظ ہے، پتہ نہیں چلتا کہ وہ کب "جمع" کے مرحلے سے گزرے اور "فرق بعد الجمع" کے مقام پر آ پہنچے، جو "معرفت الٰہی مع الصحو" کی محفوظ منزل ہے اور کمالِ سلوک کی منتہا ہے کہ یہاں مشاہدۂ حق اور دوامِ مشاہدہ کے باوجود رب اور عبد کا امتیاز برابر ملحوظ رہتا ہے۔ ذرا غور سے حضرت شیخ کے ان اشعار میں ان کے اس مقام کو دریافت کیجیے، فرماتے ہیں ع

جہاں ڈھونڈیں وہیں پائیں، جہاں دیکھیں وہیں تو ہے — تجھے جو یاد کرتا ہے، اسی کا ہمنشیں تو ہے
تری ہی روشنی ہر چار سو پھیلی ہے عالم میں — کہیں مہرِ فلک تو ہے، کہیں نورِ زمیں تو ہے

اور فرمایا

مری بیچارگی سے ہے تری قدرت کی آرائش — دلِ صد چاک میرا شانۂ گیسوئے قدرت ہے
تری رحمت سے پیدا ہے بہارِ گلشنِ ہستی! — یہاں جو ہے ترا پروردۂ بارانِ رحمت ہے

سید ذی جاہ کے مرتبۂ روحانی پر شیخ کبیر حضرت تھانوی کو جو سرور بلکہ فخر حاصل ہوا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حضرت نے مولانا روم کے اشعار میں قدرے تصرف فرما کر چند اشعار اپنے اس مرید باصفا کی تعریف میں موزوں فرمائے، جو یہ ہیں ع

از سلیمان گیر اخلاص عمل　　داں تو ندوی را منزہ از دغل
اے دلت معمور از اسرارِ حق　　اے دلت مخمور از آثارِ حق
اے دلت پرنور از انوارِ حق　　اے دلت مسرور از اخبارِ حق

پھر اپنا عصاء بطور تحفہ عطا فرمایا تو اس محبت بھری تحریر کے ساتھ کہ "راحتِ جاں، راحتِ جسم کا سامان بھیج رہا ہوں۔" اسی طرح جب شیخ تھانویؒ نے خلافت سے نوازا تو برملا اس شکر کا اظہار بھی فرمایا گیا اور بار بار فرمایا کہ "الحمد للہ مجھے اب کچھ فکر نہیں، میرے بعد ایسے ایسے لوگ موجود ہیں۔" یہ اور اس نوعیت کا اختصاص حلقۂ اشرفیہ میں حضرت شاہ سلیمان ہی کا حصہ رہا۔ **والفضلُ بیدِ اللہ۔**

سید عالی مقام کا تعلق اپنے پیر اشرف سے بہ مشکل پانچ برس رہا۔ اس کی تاریخ آغاز اگست سنہ ۱۹۳۸ء تھی، عرفی بیعت ۵ر اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کو ہوئی، کوئی چھ ماہ بعد اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء میں خلافت کا شرف پایا۔ ۱۹ و ۲۰ر جولائی سنہ ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب قطب الارشاد حضرت اقدس تھانوی رحلت فرما گئے۔

وما کان قیسٌ ھُلکُہٗ ھلکَ واحدٍ　　ولکنہ بنیان قومٍ تھدَّما

اولیاء کی نسبت کو پہچاننا کسی اونچے صاحبِ نسبت ہی کے حوصلہ کی بات ہے، ہم جیسے قاصر نظر سلیمانی نسبت کو کیا پہچانتے، مگر راقم کو اپنی خوش بختی پر ناز ہے کہ وہ آج وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ شیخ کس نسبت کے حامل تھے، ہوا یہ کہ ایک مرتبہ ایک ہستی نے جس کی ولایت دلیل کی محتاج نہ تھی اور جو واقعۃً اخص خلفائے اشرفیہ میں شمار ہوتے تھے، یعنی حضرت مولانا محمد حسن امرتسری نے میرے سامنے شیخ شاہ سلیمانؒ کو مخاطب کرکے بڑے جوشِ محبت اور یقین واثق سے فرمایا: "حضرت کی نسبت ہمارے دادا پیر شاہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ہم رنگ ہے، اور حضرت خواجہ صاحب (عزیز الحسن غوریؒ) کی نسبت ہمارے حضرت کے ہم رنگ تھی۔" ولی را ولی می شناسد۔ حضرت سیدیؒ مسکرا کر خاموش ہو گئے، مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ سید عالی مقام کو وہ جو انجذاب خاص حضرت حاجی صاحب مہاجر مکیؒ قدس سرہٗ سے تھا، اشرفی تربیت میں آکر وہی رنگ لایا اور بالواسطہ وہی نسبتِ خاص جو مطلوب تھی حاصل ہو گئی۔

ذاتِ سلیمانی چشتیت و نقشبندیت کا سنگم تھی، سکون، سکوت، وقار اور فیضان توجہ میں وہ نقشبندی تھے، اور سوز و دردِ محبت اور کمال فنائیت میں وہ چشتی تھے، عالمانہ وضع میں ان کی درویشی عوام کی نگاہ سے چھپی ہوئی تھی، البتہ ان کا چہرہ مطلع انوار تھا کہ جس نے ان کو دیکھا اکثر بے ساختہ اس کی زبان سے یہی نکلا کہ یہ تو بالکل فرشتہ نظر آتے ہیں۔ اس ناچیز نے مختلف سلاسل کے شیوخ کو یکساں طور پر ان کے کمالِ باطنی کا معترف ان کے اخلاق حمیدہ کا مداح اور ان کی ذات کا گرویدہ دیکھا۔ ان کی تواضع، بے نفسی، بے طمعی، وفورِ حیاء

اور حلم وعفو تو زمانہ بھر کو مسلم رہی۔

ذکر الٰہی شیخ کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا، میرے ایک خواجہ تاش سید احمد فریدالدین صاحب نے حضرت سے پاؤں دبانے کی اجازت چاہی، ان کے شوق و اخلاص کی رعایت فرما کر حضرت نے فرمایا: "اچھا ہاتھ دبا دیجئے۔" فرید صاحب کا بیان ہے کہ جیسے ہی انھوں نے اپنا ہاتھ حضرت کے بازو پر رکھا انھیں ایسا محسوس ہوا کہ بجلی کی لہر ان کے سارے وجود میں دوڑ گئی، اور جب تک وہ حضرت کا ہاتھ دباتے رہے اس اثر سے برابر متاثر رہے اور جب اپنا ہاتھ ہٹا لیا تو وہ کیفیت بھی منقطع ہو گئی۔ یہ ہے وہ بایزیدی حال جس کی بابت جب پوچھنے والے نے حیرت سے پوچھا تھا تو حضرت بایزید بسطامیؒ نے جواب میں کنایۃً یہ آیت قرآنی دہرا دی تھی: وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (النمل - ۸۸)

حضرت شیخ کے رتبۂ روحانی اور ان کے مقام عرفانی کو راقم بے بصر کیا تبلا سکتا ہے۔ ایک اندازہ البتہ بعض شاہدات سے ہو سکتا ہے۔ مدینہ طیبہ کے عرصۂ دراز کے سکونت پذیر جید عالم اور بڑے صاحب فیض بزرگ حضرت مولانا سید محمود طرازی مدظلہٗ مجھ سے فرماتے تھے کہ ۱۹۵۱ء میں وہ کسی کام سے کراچی تشریف لے گئے تھے تو اپنے خسر محترم کے ساتھ ہمارے شیخ کی زیارت بھی فرمائی، فرماتے تھے کہ "حضرت کا قلب مبارک کیا آئینہ تھا اور کیا اخلاق عالیہ تھے کہ ہم تو گرویدہ ہو گئے۔" دوسرا معاملہ دکن کے شیخ اکبر یعنی حضرت مولانا محمد حسین چشتی (جو حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی کے دور حاضر میں قالاً و حالاً منفرد ترجمان تھے) کا ہے ممدوح کے وصال سے پندرہ بیس دن قبل کا واقعہ ہے سید عالی مقام کے ساتھ یہ خادم حضرت ممدوح کی قیام گاہ پر حاضر تھا، حضرت نے بڑے جذب و کیف کے ساتھ توحید باری اور ربط خالق و خلق پر بڑی دقیق اور پر اثر گفتگو فرمائی اور تقریر ختم کر کے ہمارے شیخ سے فرمانے لگے: "میں نے آپ کے سامنے یہ تقریر اس لئے دہرائی کہ اس میں کوئی سقم ہو تو وہ معلوم ہو جائے۔" ہمارے حضرت نے ادب کے ساتھ فرمایا کہ "تقریر کامل و مکمل تھی۔" اس تصدیق پر فرطِ انبساط سے حضرت مولانا محمد حسینؒ کی زبان سے الحمد للہ کی صدا نکلی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عرفائے کاملین کی نگاہ میں حضرت شاہ سلیمان کا کیا رتبہ عرفانی تھا ع

ایں قدر گفتیم باقی فکر کن
فکر اگر جامد بود رو ذکر کن

جہاں تک حضرت کی علیٰ نفسی کا تعلق ہے خود آپ بیتی سنا دوں۔ مارچ ۱۹۴۴ء کی بات ہے، میں پوسٹ گریجویشن کے درجہ کا ایک طالب علم، انہی امنگوں اور آرزوؤں سے معمور جو ایک شریف اوج پسند جاہ طلب طالب علم میں ہوتی ہیں، دلچسپی زبان و ادب سے بھی خاصی تھی، جب سنا کہ علامہ سید سلیمان ندوی حیدر آباد آئے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا گیلانی و حضرت مولانا عبدالباری ندوی (جو قریب قریب ہی رہتے تھے) کے

مہمان ہیں تو علامہ کی ادیبانہ حیثیت میرے لیے ان سے حصول نیاز کا سبب بنی۔ خیال ان کے علم وفضل اور پیری و شیوخت کا سرے سے تھا ہی نہیں۔ ان کی خدمت میں پہنچا تو حضرت گیلانیؒ وسیلۂ تعارف بنے حضرت علامہ نے اس رتبہ ناشناس کو اپنا مخاطب بنالیا، باتوں ہی باتوں میں ایک نگاہِ نقشبند اس بے طلب پر ڈال دی اور بڑی سادگی سے نہایت نرم آواز میں اپنے دو شعر کیا سنائے کہ عشق الٰہی کی چشتی آگ دل میں پھونک دی، اور کچھ دیر بعد رخصت فرمادیا، مگر اپنا حال ہی دگرگوں ہو چکا تھا، اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آیا، مہینوں خلوت کی آہ زاری تھی یا لمبی لمبی نمازیں، مشاغل دنیا سے دل سرد تھا اور بس یہ دو شعر مدتوں آتش عشق کو بھڑکاتے بھی رہے، اور اسی تپش میں راحت بھی پہنچاتے رہے ؎

نو بہار است جنوں چاک گریباں مددے
آتش افتاد بجاں جنبش داماں مددے
گرمیٔ عشق بتے در جگر آتش افروخت
تشنگی سوخت مرا اے لب جاناں مددے

آج اس اولین ملاقات اور اس دورِ آغاز کا خیال آتا ہے تو حضرت شیخ کی نگاہ کیمیا اثر کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک کرشمۂ چشم میں مجھ جیسے کو جذب الٰہی کے لائق بنا دیا ؎

در صد ہزار ساغر و مینا نہ یافتیم !
خاصیتے کہ در نگہ مے فروش بود

اس سے زیادہ محسوس مثال حضرت کے ایک بھانجے عارف صاحب کی ہے جو نام کے تو عارف تھے مگر سال کی عیدین کی دو نمازوں کے سوا انھیں دین سے کوئی لگاؤ نہ تھا، تھے وہ بے باک و شوخ گفتار۔ ایک دن انہوں نے اپنا حال بلا تکلف بے کم و کاست اپنے ماموں صاحب **شیخ** کامل و مکمّل سے کہہ ڈالا۔ حضرت سن کر چپ رہے حضرت کے ہاں کام زجر و توبیخ کے بجائے حضرت مہاجر مکیؒ کی طرح "برکت" ہی سے زیادہ ہوتا تھا جب نمازِ ظہر کے لئے اٹھے تو اپنے بھانجے صاحب سے وضو کرنے کو فرمایا اور پھر نمازِ ظہر اپنی اقتدا میں پڑھوائی، بعد نماز کچھ دیر اپنے پاس بٹھائے رکھا اور رخصت فرمادیا، عارف صاحب کا کہنا ہے کہ وہ نیک گھڑی تھی کہ اس کے بعد سے پھر نماز کبھی قضا نہیں ہوئی، البتہ ایک لطیف فرق جس کو آشنایانِ طریقت ہی سمجھ سکتے ہیں، وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ جب تک شیخ زندہ رہے انھیں نماز کی ادائیگی بلا ارادہ محسوس ہوتی تھی، اور جب وہ رحلت فرما گئے تو اس میں اپنے ارادے کا احساس بھی ہونے لگا۔ سبحان اللہ کیا عیسیٰ نفسی تھی۔

رہی حضرت کی مربیانہ شان اور معالجانہ حذاقت تو اس بارے میں کہنے کی کوئی حاجت نہیں، حضرت کے جو مکاتیب "تذکرہ سلیمان" حصہ دوم میں اور "سلوک سلیمانی" (مؤلفہ مولانا محمد اشرف خاں صاحب) میں آگئے ہیں وہ ان کی مربیانہ حکمت کا آئینہ ہیں۔ عیاں را چہ بیاں، رذائل نفس اور دقائق طریق میں جو رمز نگاہی اللہ تعالیٰ نے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کو بخشی تھی، اس کی نظیر صدیوں کی تاریخ مشائخ میں نہ مل سکے گی۔

اور ہمارے شیخ تو گویا ان کے دل میں اتر گئے تھے تو پھر کیا تعجب ہے کہ تربیت باطنی میں ان کا اسلوب، ان کی تشخیص اور ان کی تجویز بالکل شیخ الشیوخ کے مشابہ ہوگئی تھی، خود حکیم الامت کی حیات میں ہمارے شیخ نے اپنے بعض عریضوں میں لکھا کہ " حضرت اشکال یہ ہے، اور اس کا جواب حضرت کی طرف سے غالباً یہ ہوگا، تو حکیم الامتؒ نے فرطِ انبساط سے بھری مجلس میں فرمایا کہ " مولوی سلیمان صاحب بھی عجیب ہیں کہ اشکال کا جواب بھی میری طرف سے خود ہی تجویز کرتے ہیں۔ " اور یہ فرما کر مجوزہ جواب کی تصدیق فرمادی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان اپنے پیرِ عارف کے قلب میں اتر کر اس گنجینۂ رشد و ہدایت سے سامان رشد لاتے تھے۔

ایک اور ثبوت حضرت کی مربیانہ کرامت، ان کے حیات بخش انفاس اور فیض کامل کا یہ بھی ہے کہ ان کے دست گرفتہ اور فیض یافتہ اکثر بہت جلد نسبت مع اللہ کے حامل اور فن تصوف و احسان کے شناسا بن گئے اور حضرت شیخ کی رحلت کے بعد ان میں سے جس کسی نے کسی اور بزرگ سے تکمیل سلوک کی نیت سے تعلق جوڑا تو بیشتر وہ خلافت ہی کا مستحق ٹھہرا، راقم عاجز کے حد علم میں ایسے چند نام ہیں جو ثبوت مدعا کے لئے کافی سمجھے جائیں گے، وہ نام یہ ہیں۔ پروفیسر مولانا اشرف خاں صاحب (پشاور) جنھوں نے مشہور تبلیغی بزرگ حضرت شاہ عبدالعزیز دعا جوؒ سے تعلق جوڑا اور ان سے خلافت پائی۔ میر علیم الدین صاحب (حیدرآباد۔ دکن) جنھوں نے حضرت مولانا سید ابرار الحق مدظلہ، سے ربط قائم کیا اور خلافت کے مستحق ٹھہرے، حکیم سید امداد اللہ صاحب (کراچی)، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے حلقہ بگوش بنے اور خلافت پائی۔ محترم ڈاکٹر علی ملپا (کرناٹک) حضرت مولانا شاہ وصی اللہؒ سے متعلق ہوئے اور ان کے مجاز صحبت بنے بعد کو مولانا ابرار الحق صاحب نے انھیں خلیفۂ مجاز بنا دیا۔ ایک عجیب تر مثال یہ ہے کہ میرے ایک خواجہ تاش کی ملاقات ایک سرحدی بزرگ سے ہوئی، پتہ چلا کہ سلسلۂ نقشبندیہ کے شیخ ہیں تو انہوں نے ان سے دعا اور توجہ کی درخواست کی، وہ فوراً متوجہ (بہ اصطلاح تصوف) ہو گئے اور پھر فرمایا کہ میری طرف سے آپ کو خلافت ہے۔ یہ سب کیا حضرت شاہ سلیمانؒ کے شیخ کامل و مکمل ہونے کے روشن دلائل نہیں ہیں؟

سید ذی جاہ میں مذکورہ اوصاف کمالیہ کے ساتھ ساتھ ابتدائے عمر ہی سے محبوبیت الٰہیہ کے آثار ظاہر ہیں جو ترقی روحانی کے ساتھ ساتھ عیاں تر ہو گئے تھے، حضرت کے گھر کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمیشہ یہ دیکھا گیا کہ جس کسی نے ان کو اذیت پہنچائی وہ گرفتار بلا ہو گیا۔ یہی مشاہدہ دیکھنے والوں کا بار بار بھی رہا۔ ایک ماجرا حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، نے بھی خود اپنے قلم سے لکھا ہے کہ سنہ ۱۹۴۳ء میں دارالعلوم ندوہ میں جب وہ نائب معتمد اور حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ معتمد و سرپرست تھے، ایک اسٹرائک حضرت علامہؒ کے خلاف ہوئی، اس اسٹرائک کی قیادت مولانا علی میاں صاحب کے بعض عزیز شاگردوں کے ہاتھوں میں تھی اور اس کے سرغنہ ان کے سب سے عزیز

وذہین شاگرد علی احمد کیانی تھے جو گستاخی کی حد تک پہونچ گئے تھے ظاہر ہے کہ اس سے ہمارے شیخ محبوب یزدانی کے دل کو چوٹ لگی اور علی احمد پر جنون کا سخت دورہ پڑا۔ اب آگے خود مولانا علی میاں صاحب کی قلمی روئداد یہ ہے: "میں نے ایک مرتبہ تنہائی میں موقع پاکر (سید عالی مرتبت) سے عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ ان پر (یعنی احمد کیانی پر) جذباتیت غالب آئی ہو اور ناگفتنی کا ارتکاب کیا ہو، حدیث شریف میں آتا ہے **من اذیٰ لی ولیاً فقد اذنتہٗ بالحرب** اور آپ تو ان کے محسن اور مربی بھی تھے، سید صاحب نے اس کے جواب میں فروتنی کے الفاظ فرمائے اور کہا کہ میں کیا چیز ہوں۔ میں نے دوبارہ عرض کیا اور دعا کی درخواست کی، سید صاحب نے اس پر سکوت فرمایا۔ دوسرے یا تیسرے دن مجھ سے فرمایا مولوی صاحب میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔ اب اس واقعہ کو سید صاحب کی کرامت سمجھا جائے یا اس کو کسی اور بات پر محمول کیا جائے کہ عزیز موصوف (یعنی مرتکب گستاخی کیانی) بالکل اچھے ہو گئے اور جہاں تک مجھے علم ہے یہ دورہ پھر کبھی نہیں پڑا۔"[9]

حدیث نبوی سے استدلال کے ساتھ بہ اصرار دعا کروا کر اثر دعا کا محمل بجز صاحب دعا کی محبوبیت کے کوئی اور بات تلاش کرنا محض تکلف معلوم ہوتا ہے، اس واقعہ میں سید ذی جاہ کی محبوبیت اور شرف و کرامت تو صبح صادق کے ظہور کی طرح ہویدا ہے۔

اب ایک بات اور بھی، وہ یہ کہ جس کو محبوبیت ربانی حاصل ہوتی ہے وہ محبوبیت نبوی سے بھی ضرور مشرف ہوتا ہے جیسا کہ اکابر اولیاء اللہ کے احوال اس پر شاہد ہیں۔ ہمارے شیخ بھی بیک وقت ان دو جہاتی امتیازات کے حامل تھے، چنانچہ بارگاہِ رسالت میں بھی ان کی قبولیت و محبوبیت کی صاف صاف شہادتیں ملتی ہیں۔ یہاں صرف دو پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ کے شاگرد رشید، دارالعلوم ندوہ کے سابق شیخ التفسیر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مرید رشید مولانا محمد اویس ندوی نگرامی جب مدینہ منورہ حاضر تھے تو خواب میں حضور اکرمؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے، ہادی اعظم نے ان سے فرمایا: "سید صاحب کو ساتھ لاتے تو یہاں کی بہار دیکھتے"۔ یہ واقعہ کراچی میں مولانا اویس مرحوم نے خود اس راقم آثم کو سنایا تھا۔ اللہ اکبر! ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

دوسرا واقعہ خود حضرت شیخ کا ہے، محرم ۱۳۶۹ھ (دسمبر ۱۹۴۹ء) میں بعد فراغِ حج جب حضرت شیخ مدینہ طیبہ پہنچے ہیں اور مواجہہ شریفہ میں حاضر ہو کر اپنی ایک نعت پیش کی ہے، جو وہیں موزوں ہوئی تھی جس کا آخری شعر یہ تھا ع

بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابرِ کرم آج　　جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

تو اسی رات شیخ نے رویا میں رحمت عالمؐ کی زیارت پائی، فرط شوق اور وفور فدویت میں خود کو قدوم رسالت پر ڈال دیا، حضورؐ نے اپنے شیدائی کو شفقت سے اٹھالیا اور ایک طویل دعا پڑھ کر سینہ پر دم فرما دی، یہ گویا

نفحِ سکینت تھا، عاشق نے اپنی مراد پالی، جب آنکھ کھلی سکینت سے معمور شیخ نے وہی نبوی دعا پڑھ کر اپنی رفیقۂ حیات پر دم کردی۔ اس کے بعد وہ کلماتِ دعا ذہن سے محو تھے۔ غالباً منظور یہ تھا کہ نبوی دعا کی برکات بالواسطہ حضرت شیخ کی رفیقۂ حیات کو بھی عطا ہوں اور اس طرح عاشق نبوی کی دلداری اور جاں نوازی کا اتمام ہو جائے۔

○

حوالے :

۱۔ سورہ النمل آیت ۳۰ سے اس مضمون کا عنوان اخذ کیا گیا ہے۔ یہ آیت نامۂ سلیمانیؑ بنام ملکہ سبا میں وارد ہوئی ہے
۲ و ۳۔ "سیرۃ السید کے کچھ انمول سبق"، معارف سلیمان نمبر، مئی ۱۹۵۵ء   ۴۔ خیام، ص ۳۱۳ - ۳۱۴
۵۔ عارف رومی کا شعر ہے ؂ از علیؓ آموز اخلاص عمل۔ شیر حق را داں منزّہ از دغل (دفتر اول، مثنویٔ معنوی)
۶۔ اس تحفہ کے پہنچنے پر مرید عارف کے جذبات شعر میں اس طرح ڈھلے ؂

مرا از لطفِ حق در دست خواجہ داد منا تم   سلیماں بودم و در دست منا تم نمی داند
ہم نقش و نگیں کو ملک معنیٰ را بود خاتم   دگر چوں لطف حق خواہد مرا نقش و نگیں بخشد

۷۔ تفصیل کے لئے راقم کی "تذکرہ سلیمان" ملاحظہ فرمائیں   ۸۔ محترم سید صباح الدین صاحب نے ہمارے خواجہ تاش
مولانا اشرف زاد فیضہ کو حضرت اقدس کا "خلیفہ مجبوب بھی" لکھا ہے۔ (معارف مئی ۱۹۸۴ء) جو بے بنیاد ہے،
غالباً یہ مغالطہ ان کے اپنے نام کے ساتھ التزاماً "سلیمانی" لکھنے سے پیدا ہوا   ۹۔ پرانے چراغ، جلد اوّل کا پہلا
مضمون "مولانا سید سلیمان ندوی"

○

علامہ سید سلیمان ندوی
اور
ریاست بھوپال

عبدالقوی دسنوی*

وسط ھند کی ایک چھوٹی سی ریاست ہونے کے باوجود بھوپال کو ہمیشہ اس لئے عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے کہ یہ ریاست علم پروری، ادب نوازی اور علماء و ادباء کی سرپرستی و قدردانی میں بے مثال رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سرسید سے لے کر علامہ سید سلیمان ندوی تک کتنے ہی مشاہیر کو بھوپال آنے کی دعوت دی گئی اور طرح طرح سے ان کی عزت کی گئی اور ان کے علمی، ادبی، مذہبی، تعلیمی اور تصنیفی کاموں کو آگے بڑھانے اور تکمیل تک پہنچانے میں مدد کی گئی۔ یہ بھی ہوا کہ اُن سے ریاست کے کاموں کے لئے مشورے لئے گئے، مختلف امور میں رہبری حاصل کی گئی، خاص طور سے اُن کی دینی خدمات حاصل کی گئیں، اور اُن کی مدد سے بعض مشکل مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح اُن کی طرف تعاون کا ہاتھ بھی بڑھایا گیا اور ان کی معاونت بھی حاصل کی گئی۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ریاست کا رشتہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جڑتا اور مضبوط ہوتا گیا، اور اس کی علم پروری، انسان دوستی، دینداری اور خدا ترسی کے چرچے دور دور تک پڑھے لکھے گھرانوں میں ہونے لگے جس سے اس ریاست کی شہرت اور عزت میں اضافہ ہوتا گیا اور اسے قرطبہ و بغدادِ ہند تصور کیا جانے لگا۔

مشاہیر اُردو، ماہرینِ تعلیم اور علماء کے قافلوں کے اگر ایک اہم فرد سرسید تھے جن کی آمد نے ان کی روشن خیالی سے اس ریاست کی تابناکی میں اضافہ کیا تو سب سے آخری عالم علامہ سید سلیمان ندوی نے یہاں سب سے زیادہ مدت تک یعنی تقریباً چار سال قیام کر کے اس ریاست کو اپنے علم و فضل سے،

★ صدر شعبۂ اُردو سیفیہ کالج بھوپال

اپنے افکار وخیالات سے، اپنی دانش وبینش سے، اپنی ریاضت اور عبادت سے، اپنی صلاحیت اور تجربات سے، اپنی نظر اور خبر سے فیض پہنچایا اور اس کی قدر ومنزلت میں اضافہ کیا۔

سید صاحب کا اس ریاست میں بہت پہلے یعنی بیسویں صدی کی پہلی دہائی ہی سے آنا جانا شروع ہوگیا تھا، اور یہاں سے ایک رشتہ قائم ہوگیا تھا، جو رفتہ رفتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا، کچھ تو وسط ہند کی مشہور ریاست ہونے کی وجہ سے اور بہت کچھ اس کی بیگمات کی دینداری، اور خداترسی کی وجہ سے عام طور سے علماء وفضلا کے دلوں میں اس ریاست کی اہمیت اور افضلیت کا احساس رہتا تھا، اس لئے انھیں اس ریاست سے دلچسپی بھی زیادہ رہتی تھی، اور وہ اس کی قدر دانی میں کوئی کسر بھی اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ سید صاحب بھی اُن میں ایک تھے، لیکن اس ریاست سے اُن کا ایک رشتہ یہ بھی تھا کہ ان کے بڑے بھائی مولوی سید ابو حبیب صاحب نے جو نہایت متقی وپرہیزگار بزرگ تھے، کچھ مدت تک یہاں قیام کیا تھا، وہ حضرت شاہ ابو احمد مجددی سے بیعت تھے اور ان کے انتقال کے وقت چونکہ ان کے صاحبزادے حضرت شاہ محمد یعقوب (پیر ننھے میاں) کی عمر بہت کم تھی مولوی سید ابو حبیب صاحب خلیفہ بنائے گئے تھے اور جب تک وہ سنِ شعور تک نہ پہونچے مولوی سید ابو حبیب بھوپال ہی میں رہے۔

سید صاحب کا بھوپال سے تیسرا رشتہ علامہ شبلی نعمانی کی وجہ سے تھا، جو پہلی بار سرسید کے ساتھ ۱۸۹۱ء میں بھوپال تشریف لائے تھے۔ اس کے بعد وہ کئی بار بھوپال آئے، ان سے یہاں کے مدرسوں کی تنظیم اور اصلاح میں مدد لی گئی، اور دار العلوم ندوہ کی ماہوار امداد اس ریاست سے جاری کی گئی۔ سلطان جہاں بیگم نے مجلس تالیف سیرت نبویؐ کے لئے امداد دینا منظور فرمائی اور نواب زادہ حمید اللہ خاں نے کتابوں کی خریداری میں بڑی دلچسپی لی۔

اس طرح علامہ شبلی نعمانی کو جب سیرت النبیؐ کے مصارف سے اطمینان ہو تو وہ لکھنؤ سے بمبئی کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں بھوپال پڑتا تھا اس لئے یہاں اتر گئے اور نواب سلطان جہاں بیگم سے ملاقات کی، بات چیت کے دوران میں مولانا سے بیگم صاحبہ نے دریافت کیا:۔

"آپ کی صحت تو اس قدر خراب ہے کہ دو دو وقت کھانا نہیں کھاتے آپ نہ رہے تو کتاب کیوں کر پوری ہوگی۔" ۱؎

تو مولانا شبلی نے نہایت یقین اور اعتماد کے ساتھ جواب دیا:۔

"کتاب ضرور پوری ہوگی۔ میں نے دو آدمی تیار کرلیے ہیں۔ حمید الدین اور سید سلیمان پوری کریں گے۔" ۲؎

غالباً سید صاحب کی علمی صلاحیت کا پہلا بھرپور تعارف، بیگم صاحبہ سے مولانا شبلی کی زبانی اسی طرح ہوا تھا اور یہی تعارف بعد میں تعلق اور پھر بھوپال سے مضبوط رشتہ میں تبدیل ہوتا گیا۔

علامہ شبلی نعمانی کی وفات کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ نے منشی محمد امین زبیری صاحب مہتمم صیغۂ تعلیم بھوپال کو اعظم گڑھ بھیج کر مولانا حمید الدین اور مولانا سید سلیمان ندوی کو بھوپال آنے کی دعوت دی۔ ۲۹؍ نومبر ۱۹۱۴ء کو دونوں سرکار عالیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے[۳]۔ سید صاحب لکھتے ہیں :-

> "اس کے بعد میں اور وہ دونوں مل کر سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ عالیہ بھوپال کی طلبی پر بھوپال گئے، سرکار عالیہ نے تسلی دی اور سیرت کی تصنیف کی رقم کو بدستور ہم دونوں کے نام جاری فرما دیا اور یہی دار المصنفین کے وجود و نشو و نما کے لئے ابرِ کرم کی پہلی بارش تھی۔"[۴]

بھوپال کے اس سفر میں سید صاحب کتب خانہ حمیدیہ بھی تشریف لے گئے تھے، جسے دیکھنے کے بعد ان کے تاثرات یہ تھے :-

> "میری آمد و رفت بھوپال میں ۱۹۱۱ء سے ہے، اس وقت تو اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور معلوم بھی نہیں کہ وہ اس وقت تھا بھی یا نہیں مگر ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب مولانا شبلی مرحوم کی وفات کے بعد سرکار عالیہ مرحومہ کی طلبی پر حاضری ہوئی تو اس وقت اس کتب خانہ کی حالت نہایت معمولی تھی۔"[۵]

اگست ۱۹۱۸ء میں سیرت النبیؐ کی پہلی جلد شائع ہوئی تو سید صاحب خود اس کی جلدیں لے کر بھوپال پہونچے تاکہ نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمت میں پیش کریں۔ اس سفر کے تاثرات انہوں نے معارف اعظم گڑھ ستمبر ۱۹۱۸ء کے شمارے میں اس طرح رقم کئے ہیں :-

> "۱۶؍ اگست ۱۹۱۸ء کو سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دو مطبوعہ جلدیں لیکر میں اس آستانہ پر حاضر ہوا جہاں آنکھیں اس کی دیدار کی سب سے زیادہ مشتاق تھیں یعنی سرکار عالیہ ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال خلد اللہ ملکہا۔ ہر ہائی نس نے تاریخ مقررہ پر باریابی بخشی۔ یہ شرف یابی کا دوسرا موقعہ تھا، ہر ہائی نس نے خود اپنے دست مبارک سے دونوں جلدیں اٹھائیں اور فرمایا کہ "الحمد للہ اتنا بڑا کام ہوگیا"

پھر اس کی فہرست ملاحظہ فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ فہرست اتنی بڑی ہے تو کتاب کتنی بڑی ہے، عرض کیا کہ یہ جلد تو کتاب کا چھٹا حصہ ہے اس کے بعد دیر تک قومی تعلیمی اور مذہبی مسائل پر گفتگو فرماتی رہیں، اثنائے کلام میں دریافت فرمایا کہ "مولوی صاحب! آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی خواب میں دیکھا ہے؟ عرض کیا کہ دو دفعہ، لیکن چہرۂ مبارک نگاہوں سے اوجھل رہا، تو فرمایا پھر یہ کیا زیارت ہوئی؟" [۶]

اسی سفر میں بیگم صاحبہ کو معلوم ہوا کہ سیرتِ عائشہؓ، سیر الصحابہؓ وغیرہ مکمل ہو چکی ہیں لیکن طباعت کی دشواری کی وجہ سے شائع نہیں کی جا سکی ہیں، دار المصنفین کو ایک پریس کی ضرورت ہے، جس کی قیمت تین ہزار ہے تو نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ نے کہا کہ "ایسے کام کے لئے تین ہزار کیا چیز ہے؟" اور حکم دیا :-

> "تین ہزار روپے مولوی سید سلیمان ندوی صاحب کو بہ شکریہ سیرت النبیؐ دیئے جائیں تاکہ ایسی کتب ہائے خیر کا سلسلہ جاری رہے اور قوم کو ان سے استفادہ حاصل ہو۔" [۷]

۱۹۳۰ء میں جب نواب سلطان جہاں بیگم نے وفات پائی تو سید صاحب بے حد رنجیدہ ہوئے، انھوں نے ان سے متعلق اپنے اس طرح کے جذبات واحساسات کا اظہار کیا :-

> "علیا حضرت کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس کا ماتم نہ صرف بھوپال، نہ صرف ہندوستان، نہ صرف مسلمان، بلکہ تمام دنیا کر رہی ہے اور کرے گی، وہ نہ صرف اسلام کی بلکہ مشرق کی وہ آخری تاجدار خاتون تھیں جن کے کارناموں پر مرد سلاطین اور امراء بھی رشک کر سکتے ہیں اور ان کا دورِ حکومت جو تینتیس ۳۳ سال سے کم نہیں رہا، بھوپال کی تاریخ کا زرین عہد ہے۔"

انھوں نے آگے یہ بھی تحریر کیا :-

> "وہ ہر قومی، مذہبی وعلمی تحریک پر سب سے پہلے لبیک کہتی تھیں اور اس کے لئے عملی قدم اٹھاتی تھیں، مسلم یونیورسٹی، مدرسہ دیوبند، دار العلوم ندوہ اور ووکنگ مشن چھوٹے بڑے بیسیوں تعلیمی ومذہبی ادارے

> ان کی امداد و اعانت کے طوقِ منت سے گراں بار ہیں، دار المصنفین اور سیرتِ نبویؐ کو کہا جائے کہ انھیں کے دستِ کرم سے ان کی بنیاد پڑی، خصوصاً سیرت النبیؐ جیسی اہم کتاب کا عالم وجود میں آنے کا شرف صرف ان کی ذاتِ گرامی کے لئے مخصوص ہے، امید ہے کہ تنہا ان کی یہی نیکی شفاعتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے استحقاق کے لئے کافی ہوگی۔"

اور اپنی اس تحریر کو اپنے ان جذبات پر ختم کیا :۔

> "سلطانہ ! تو آج سب سے بڑے سلطان کے دربار میں حاضر ہے، تیری ایک ایک نیکیاں انشاء اللہ اس دربار میں سفارشی ہوں گی، قبول و مغفرت کا تاج تیرے سر پر ہوگا اور رضا و خوشنودی کے مروارید تیرے گلے میں، سلطانہ، اب زمانہ ہزاروں کروٹیں بدلے گا مگر تجھ کو نہ پائے گا، تاہم تیری زندہ جاوید نیکیاں تجھ کو تا ابد زندہ رکھیں گی :۔
>
> ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
>
> ثبت است بر جریدۂ عالم دوام تو" ع۸

غالباً جولائی سنہ ۱۹۳۳ء میں سید صاحب نے حیدر آباد کا سفر کیا تو بھوپال میں چند روز کے لئے قیام کیا اور نواب حمید اللہ خاں صاحب سے ملاقات کی اور ان کے دریافت کرنے پر سید صاحب نے جب بتایا اور انھیں اس کا علم ہوا کہ :۔

> "سیرت النبی کی تالیف کے سلسلہ میں شروع سے ریاستِ بھوپال سے دو سو ماہوار کی امداد ملتی تھی، مگر چند سال میں اس رقم میں تخفیف کرکے نوے روپے کر دئے گئے تھے، تو انھوں نے پوری سابق امداد جاری فرمادی۔" ع۹

سید صاحب بارہا بھوپال تشریف لائے، انھیں اس کا احساس تھا کہ یہاں کسی پبلک کتب خانہ کا قیام عمل میں نہیں آیا ہے۔ چنانچہ اپنے مقالہ "کتب خانہ حمیدیہ بھوپال" میں انھوں نے نہایت دردمندی کے ساتھ اپنے احساسات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا :۔

"ایک زمانہ تھا کہ بھوپال مشرقی علوم و فنون کا مرکز تھا، سیکڑوں

> فضلار تھے طلبہ کا ہجوم تھا، نوادر کتب کا ذخیرہ تھا، دنیائے اسلام سے ہر روز نادر اور قلمی کتابوں کے تحفے بھوپال میں پہنچتے تھے، اگر اس وقت ریاست کا کوئی پبلک کتاب خانہ ہوتا تو اس وقت وہ رام پور، ٹونک اور حیدرآباد کی برابری کرتا، مگر افسوس ہے کہ اس وقت کے کتب خانے امرار کی ذاتی ملکیت اور نشان امارت کے طور پر تقسیم ہو کر فنا ہو گئے اور اب ان کا ایک نسخہ بھی بھوپال میں موجود نہیں۔" ع۱۰

لیکن جب وہ جولائی ۱۹۲۳ء میں بھوپال تشریف لائے اور کتب خانہ حمیدیہ میں بھی ان کا جانا ہوا تو انھوں نے اس کتب خانہ کو نہایت اچھی حالت میں پایا، اس وقت کے کتب خانہ حمیدیہ کے متعلق اُن کی رائے ملاحظہ کیجئے:۔

> "سب سے اخیر جولائی ۱۹۲۳ء میں کئی سال کے بعد وہاں جانے کا اتفاق ہوا، اعلیٰ حضرت سکندر صولت بہادر کی فرماں روائی کے عہد میں یہ دوسری بار بھوپال کی حاضری تھی، خیال آیا کہ اس علمی سیر گاہ کی پھر زیارت کر لی جائے۔
>
> اس دفعہ جو کتب خانہ گیا، تو اس کا رنگ بدلا پایا، کتابیں بھی زیادہ تھیں اور سلیقہ سے تھیں اور سب سے زیادہ یہ کہ بعض پرانے شاہی فرامین اور مغل شہزادیوں کی مشقی وصلیاں اور قطعات بھی نظر آئے۔" ع۱۱

غالباً ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء میں نواب حمید اللہ خاں نے "ریاست کے عربی مدارس کے انحطاط و تنزل سے متاثر ہو کر سید صاحب کی صدارت میں ماہرینِ تعلیم کی ایک مجلس مقرر کی۔" جس نے ان مدارس کے لئے ایک نیا نصاب تیار کیا اور ان کی اصلاح و تنظیم کیلئے ضوابط بنائے۔" ع۱۲

اس اہم کام کی تکمیل کے بعد ایک بار پھر نواب صاحب نے سید صاحب کو بھوپال آنے کی دعوت دی تاکہ وہ خود ہی نئے نصاب کو جاری کر سکیں، سید صباح الدین عبدالرحمٰن تحریر کرتے ہیں:۔

> "اس خاکہ کو عملی صورت میں لانے کے لئے نواب صاحب سید صاحب

> کو بھوپال برسوں سے مدعو کر رہے تھے۔ بقول جناب شعیب صاحب قریشی، قاضیٔ ریاست کا عہدہ تو ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا لیکن عربی تعلیم کی اصلاح و ترقی کے موقع کو وہ انکار نہ کر سکے۔" [۱۳]

سید صاحب نے اس پیشکش کے سلسلے میں مولانا عبد الماجد دریابادی کو ۱۶؍ اگست ۱۹۴۱ء کو تحریر کیا تھا :-

> "بعض حالات ایسے ہیں کہ مجھے آپ سے ملنا ضروری ہے، کچھ نج کی گفتگو بھی ہے۔" [۱۴]

مولانا عبد الماجد دریابادی مکتوبات سلیمانی حصہ دوم صفحہ ۱۰۵ کے حاشیہ پر اس کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں :-

> "یہ اغلباً بسلسلہ قیام بھوپال تھی نواب صاحب کی طرف سے قضاءت سید صاحب کو پیش ہوئی تھی۔"

۱۹۴۲ء میں بھی سید صاحب کا بھوپال آنا ہوا تھا لیکن اس کی تفصیل کہیں دستیاب نہیں ہوئی البتہ اس موقع کی حسب ذیل دو غزلیں یادگار ہیں جو انھوں نے سرکاری مہمان خانہ بھوپال میں کہی تھیں :-

دل حریفِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں　　　جو نہ بیخود ہو، وہ میخوار کہاں سے لاؤں
نور ہی نور جدھر دیکھو نظر آتا ہے　　　تابِ نظارۂ انوار کہاں سے لاؤں
اُف ری دریائے معاصی کی تلاطم خیزی　　　وہ سفینہ جو کرے پار کہاں سے لاؤں
فیض ساقی ہے بہ اندازۂ ظرفِ میخوار　　　دل حریفِ مے بسیار کہاں سے لاؤں
ٹوٹ ہی جاتی ہے ہر موسمِ گل میں توبہ　　　جو نہ ٹوٹے مرے غفار کہاں سے لاؤں
قطرۂ اشک میں ہوں دل کے کبھی ٹکڑے شامل　　　فطرتِ دیدۂ خوں بار کہاں سے لاؤں
توبہ توبہ، مری توبہ بھی ہے کوئی توبہ　　　ٹوٹ جائے جو نہ ہر بار کہاں سے لاؤں
مدرسہ چھوڑ، خرابات میں آکر بیٹھا　　　دوسرا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں

جام پر جام مجھے دے کے بنا دے بدمست
صبرِ سرجوشیٔ اذکار کہاں سے لاؤں [۱۵]

(۱۲؍ اپریل ۱۹۴۲ء ، بوقت صبح)

●

ذکرِ حق سے صیقلِ کامل ہوا
محو دل سے، نقشِ ہر باطل ہوا
چار جانب بارشِ انوار ہے
جلوہ فرما وہ مہِ کامل ہوا
دولتِ کونین سے محروم ہے
جو بھی تیری یاد سے غافل ہوا
قیل وقالِ مدرسہ کو چھوڑ کر
شیخ بھی رندوں میں اب شامل ہوا
آج ہی پایا مزہ ایمان کا
جیسے قرآں آج ہی نازل ہوا
ایسے کچھ انداز سے تقریر کی
پھر نہ پیدا شبۂ باطل ہوا
بزم میں دیکھا کئے اس ناز سے
جس طرف دیکھا، نشانہ دل ہوا
گھول کر کیا جانیے کیا دے دیا
حلق سے اترا کہ شیدا دل ہوا
دیکھ کر سب کو اسی کو چن لیا
جو نگاہِ ناز کے قابل ہوا

قیدِ پا ہے، حلقۂ پیرِ مغاں
پھر نہ اُٹھا جو یہاں داخل ہوا[۱۶]
(۱۲ اپریل ۱۹۴۲ء، بوقت شب)

پھر ۱۹۴۳ء میں سید صاحب کا بھوپال آنا ہوا۔ ۶ ر جولائی کو وہ لکھنؤ سے تھانہ بھون ہوتے ہوئے بھوپال کے خیال سے روانہ ہوئے۔ تھانہ بھون پہنچنے کا حال ملاحظہ کیجئے :۔

” ۷ رکی دوپہر کو عین بارش کی حالت میں اسٹیشن سے خانقاہ تک پیادہ پا بھیگتے ہوئے پہونچا، دریافت حال سے معلوم ہوا کہ افاقہ کی صورت ہے، جس سے تسکین ہوئی......نماز ظہر کے بعد مجلس میں حاضری ہوئی، ضعف سے بستر پر لیٹے تھے، مصافحہ فرمایا خاکسار نے دستِ مبارک کو بوسہ دیا، شفقت سے بشاشت ظاہر فرمائی، سفر کا حال پوچھا، کسی خادم کے ساتھ نہ لینے پر نصیحت فرمائی، قیام کے دن پوچھے، خاکسار نے بھوپال کے سفر کی ضرورت ظاہر کی کہ سرکار بھوپال نے اپنی ریاست میں مسلمان عورتوں کے طلاق وتفریق کے مسائل کے طے کرنے کے لیے علماء اور اہلِ قانون کی ایک مجلس مقرر کی ہے اسی کی شرکت کے لیے مع مولانا کفایت اللہ صاحب یہاں سے جانا چاہتا ہوں، اس لئے مجلس کی تاریخ کی اطلاع تک یہاں چند روز رہنا چاہتا ہوں۔

> فرمایا اللہ تعالیٰ والیہ بھوپال پر رحمت فرمائے کہ انھوں نے مسلمان عورتوں کے حال پر رحم کھایا، خاکسار نے عرض کی کہ حضرت وہاں اب والیہ نہیں والی ہیں، فرمایا ٹھیک ہے"۔ [۱۷]

سید صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۱ر جولائی کی صبح کو رخصت کی اجازت چاہی تو :۔

> " بایں ہمہ ضعف وقوت لیٹے ہی لیٹے دونوں ہاتھ رخصت کے لئے بڑھائے، حقیر نے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور آنکھوں کو ملا، آہ ! کس بلا کا رخصتانہ تھا، فرمایا "جاؤ خدا کے سپرد" یہ لفظ کانوں نے پہلے نہیں سنے تھے، آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور دیر تک چہرۂ مبارک پر جمی رہیں کہ یہ جمالِ جہاں آرا شاید پھر دیکھنے کو نہ ملے"۔ [۱۸]

سید صاحب تھانہ بھون سے روانہ ہوکر بھوپال پہونچے، لیکن ان کے دل پر بڑا اثر تھا وہ جذبات اور احساسات کے عجب عالم میں تھے ان کے یہ اشعار ان کی انھیں داخلی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں :۔

حرفِ دمِ وداع "خدا کے سپرد ہو" تا آخرِ حیات بھلایا نہ جائے گا
دل بھر کے دیکھ لو یہ جمالِ جہاں فروز پھر یہ جمالِ نور دکھایا نہ جائے گا
گوشِ جہاں بغور سنے اس کلام کو پھر یہ کلامِ شوق سنایا نہ جائے گا
اے میکشو یہ دُردِ تہِ جام بھی پیو
ترسو گے، پھر یہ جام پلایا نہ جائے گا

۱۹ر جولائی ۱۹۴۳ء کو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے وفات پائی، سید صاحب لکھتے ہیں :

> " خاکسار اب تک بھوپال میں تھا۔ عنایتِ الٰہی دیکھئے کہ عین شبِ وصال کو خواب دیکھا کہ مولانا شبیر علی صاحب مجھ سے فرما رہے ہیں کہ حضرت مولانا کو پوری صحت ہوگئی، صبح اٹھ کر میں نے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے یہ خواب بیان کیا، دونوں چپ رہے، مفتی صاحب ۲۱ر جولائی اور خاکسار ۲۲ر جولائی کو بھوپال سے روانہ ہوئے"۔ [۱۹]

اس وقت تک سید صاحب، شہرت، عزت اور قدردانی کی بلندترین منزل تک پہونچ چکے تھے، ہرطرف اُن کی عظیم خدمات کا اعتراف اور احترام کیا جارہا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں نہ صرف فروری ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دے کر اپنی عزتوں میں اضافہ کیا بلکہ اپنے لئے ان کی خدمات حاصل کرنے کی خواہش بھی کی، عثمانیہ یونیورسٹی بھی ان سے فیض حاصل کرنے کی خواہش مند رہی، استنبول یونیورسٹی بھی ان کو اپنے یہاں بلانا چاہتی تھی لیکن سید صاحب دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء کی وجہ سے کسی کے بھی حق میں فیصلہ نہیں کر سکے۔

پھر جب نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے بعد حیدرآباد میں صدرالصدور کی جگہ خالی ہوئی تو اس جگہ کے لئے بھی مولانا سید سلیمان ندوی کو بلانے کی کوشش کی گئی۔ مولانا کسی کام سے حیدرآباد پہونچے تو وزیر تعلیمات اور وزیر امور دستوری ان سے ملے اور اس عہدے کو قبول کرنے کے لئے اصرار کیا لیکن سید صاحب کو اس عہدے کی شان وشوکت اپنی طرف کھینچ نہیں سکی، اسی دوران نواب حمیداللہ خاں نے بھوپال آنے کی دعوت دی، انھوں نے اپنے خط میں جو کچھ تحریر کیا، اسے غلام محمد صاحب "تذکرہ سلیمانؒ" میں اس طرح بیان کرتے ہیں:-

> "میں نے اپنی ریاست کے دارالقضاء اور یہاں کے مدارس عربیہ کی اصلاح کا عزم کیا اور اس کام کے لئے میری نظر میں علامہ سید سلیمان ندوی سے موزوں شخصیت کوئی نہیں تھی لیکن میری دعوت کو آپ قبول نہیں فرماتے ہیں، اب میں بری الذمہ ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ قیامت میں مجھ سے اس بارے میں پوچھے گا تو صاف عرض کردوں گا کہ بارِ الٰہا میں نے اس کام کے لئے جس ہستی کو موزوں سمجھا، بہ اصرار اس کو بلانا چاہا مگر میرا اصرار کارگر نہ ہوا۔"[۲۰]

نواب صاحب کی اس تحریر نے سید صاحب کو بے حد متاثر کیا اور وہ بھوپال آنے کے لئے رضامند ہوگئے چنانچہ انھوں نے ۱۹ر جون ۱۹۴۶ء کو مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھا:-

> "بھوپال سے طلب اپریل سے جاری ہے میں تعلل کررہا ہوں، اب جون آخری مہینہ ہے، جولائی سے جامعہ حمیدیہ کا سال شروع ہوگا۔
>
> اس لئے میں کل پرسوں لکھنؤ ہوکر بالفعل بھوپال جارہا ہوں۔"[۲۱]

پھر ۳ جولائی ۱۹۴۶ء کو بھوپال سے اطلاع دیتے ہیں :-

"میری اس آوارہ گردی کے اسباب آپ کو معلوم ہیں۔ بہرحال ۲۵ر سے یہاں آگیا ہوں۔ ابھی تک سرکاری مہمان ہوں، یہاں مجھے قضاۃ اور دفاتر شرعیہ اور امارت جامعہ احمدیہ دے رہے ہیں۔ تنخواہ ایک ہزار، الاونس سواری اور ۵۰۰ برائے سلسلۂ تصنیف جو یہاں جاری ہو شعیب صاحب کے تحت میں یہ کام ہوگا۔

سب کچھ ہے مگر ابھی قلب مطمئن نہیں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ بہرحال مقصود بحمد اللہ کسب دنیا نہیں، کچھ کام ہی کا ہے خصوصاً دارالتکمیل مگر یہاں کے مدارس کا حال اچھا نہیں۔ ۴۲ ہزار کا بجٹ تیار ہوا ہے۔ مگر یہاں کام کے آدمی نہیں۔ تعلیم یافتوں کی کھیپ باہر سے آرہی ہے، مگر علما وہی ہیں جن کے آباء واجداد اُدھر سے آئے تھے مگر اب وہ بیکار ہو چکے ہیں اور نئی آمد نہیں۔ سب سے پہلے یہاں مولانا عبدالقیوم صاحب، یکے از نبائر شاہ ولی اللہ صاحبؒ تشریف لاتے تھے، ان کی پودھ لگائی ہوئی اب مر چکی۔" ۲۲

شاہ معین الدین احمد صاحب کو آگاہ کرتے ہیں :-

"یہاں سرکاری مہمان خانے میں ہوں، بہترین موسم، بہترین منظر اور بڑا خوش آئند مستقبل ہے۔ مگر خدا جانتا ہے ان سب سے بہتر شبلی منزل میری نگاہ میں ہے۔ اے کاش کہ وہاں مجھکو سکون میسر آتا ....

بحمد اللہ تعالیٰ وبفضلہ طمع نفس سے خالی ہوں مگر دل بعض کاموں کو چاہتا ہے۔ جن میں ایک دارالتکمیل کا خیال ہے جو مجھے یہاں لے آیا ہے، یہاں کے مدارس کی حالت اچھی نہیں ہے، روپیہ کی کمی نہیں ہے، مگر آدمیوں کی سخت کمی ہے۔ باہر سے چند آدمی شاید آجائیں تو کچھ کام چلے۔"

اور اطلاع دیتے ہیں :-

"۱۶ر جولائی کو میں نے دارالقضا اور مدارس عربیہ کا چارج لے لیا،

> دار القضاء میں زیادہ تر مقدمات نکاح وطلاق، خلع وتفریق اور ولایت اور کبھی کبھی قصاص کے ہوتے ہیں۔ مدارس کی حالت بہت خراب ہے، دین ومذہب کا تو نام نہیں، ادھر پوری توجہ کر رہا ہوں، رمضان میں یہاں بڑی رونق ہوتی ہے، محرم سونا گذرتا ہے اور بہت سے بدعات سے محفوظ ہے۔" ۲۳

سید صاحب اگرچہ بھوپال آگئے تھے لیکن دار المصنفین اور ندوۃ العلماء سے بے تعلق نہیں ہوئے تھے بلکہ سابقہ رشتہ برابر قائم تھا۔ یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ ان کا بھوپال میں زیادہ مدت تک قیام کا ارادہ نہ تھا۔

سید صاحب کے بھوپال آنے کے بعد پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان سے ایک بار پھر علی گڑھ کے لئے درخواست کی وہ لکھتے ہیں:۔

> "بھوپال کے قیام کے دوران میں میں نے عرض کیا تھا کہ جس طرح یا جس لئے سید صاحب نے اپنی پوری زندگی دار المصنفین کے لئے وقف کردی تھی، وہ مسلّم ہے، لیکن مسلم یونیورسٹی میں رہ کر کام کرنا اور اس کی شہرت میں اضافہ کرنا اس نصب العین کے خلاف نہ تھا جو ان کے سامنے تھا، کام کی نوعیت دونوں جگہ تقریباً یکساں تھی۔ علی گڑھ میں قیام کا مزید فائدہ یہ تھا کہ نوجوان طلبہ ان کی تصنیف ہی سے نہیں ان کی شخصیت سے بھی بہرہ مند ہوتے۔" ۲۴

بھوپال میں سید صاحب کی آمد کی خبر نے ایک خوشی کی لہر دوڑا دی تھی، عام طور سے یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ بھوپال علمی میدان میں اب اور زیادہ نیک نام ہو سکے گا چنانچہ اخبار "ندیم" بھوپال نے اپنے ۱۵ر جولائی ۱۹۴۶ء کے شمارے میں حسب ذیل تاثرات کا اظہار کیا:۔

> "علامہ سید سلیمان ندوی کی شخصیت یقیناً کسی تعارف کی محتاج نہیں، موصوف ہندوستان کے صفِ اول کے علماء و مصنفین میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں، آپ کی گراں قدر تصانیف و تالیفات دنیائے اسلام سے خراجِ تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ علامہ شبلی کے دستِ راست کی حیثیت سے آپ کے علمی کارنامے شرفِ عام اور بقائے دوام حاصل

کر چکے ہیں۔

دارالعلوم ندوہ بھی آپ کے فیوضِ علمیہ سے بہرہ اندوز ہوتا رہا ہے۔ یہ بھوپال اور اہلِ بھوپال کی خوش قسمتی ہے کہ علامہ موصوف جیسا فاضل اجل بھوپال کی مسندِ قضا اور جامعہ احمدیہ کے عہدۂ امارت کو زینت بخش رہا ہے۔

بھوپال عرصۂ دراز سے علومِ شرقیہ کا گہوارہ رہا ہے، اور نہ صرف ہندوستان بلکہ کل عالمِ اسلام میں بھوپال کے علماء و فضلا کے تبحرِ علمی کا سکہ اب تک رواں ہے۔ ایسی صورت میں علامہ موصوف کا تقرر بھوپال کے علمی روایات میں چار چاند لگا دے گا۔ بہت ممکن ہے کہ آپ بھوپال میں دارالمصنفین کے قسم کا کوئی ادارہ بھی قائم فرمائیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہم اسے اپنے لئے مزید خوش قسمتی کا باعث سمجھیں گے۔"

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بھوپال آنے کے بعد سید صاحب کو بعض مشکلات پیش آئیں جن کی تفصیل تو نہیں ملتی البتہ ان کے مکتوب بنام مولانا مسعود عالم ندوی مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۶ء سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ :-

"یہاں عزائم کے ساتھ آیا تھا، ان میں کافی مشکلات کا احساس ہو رہا ہے تاہم شاید کچھ ہو جائے۔"[۲۵]

مولانا عبدالماجد دریاآبادی کو ۱۰ دسمبر ۱۹۴۶ء کے خط میں آگاہ کرتے ہیں :-

"یہاں اپنے مدارس میں "صدق" جاری کرادیا ہے کہ طلبہ کی ذہنیت سے یورپ کی مرعوبیت دور ہو۔ عربی کے طلبہ انگریزی سے بھی زیادہ قابلِ رحم ہیں۔"[۲۶]

پھر ۲۸ دسمبر ۱۹۴۶ء کو مولانا عبدالماجد دریابادی کو اطلاع دیتے ہیں :-

"الحمدللہ خیریت ہے، یہاں مجلس نشر و تالیف کا ادارہ قائم ہوگیا، ایک ماہوار علمی رسالہ کی بھی تجویز ہے۔ آپ سے زبانی عرض کیا تھا کہ کوئی کتاب آپ کی اس ادارہ کو مل سکتی ہے؟ اور اس کے لئے کیا شرط ہوگی؟ آپ نے فرمایا تھا کہ خط سے جواب دوں گا، انتظار رہا۔"[۲۷]

۲۹ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ کو مولانا مسعود عالم ندوی کو مطلع کرتے ہیں :-

"یہاں چند سے آگیا ہوں۔ مستقل قیام کا خیال نہیں، اگر وسط ہند میں میری ذات سے کوئی اصلاح ہوسکی تو خیر، ورنہ رجوع الی الاصل ہر وقت ممکن ہے۔"

"اب بھوپال بھی ایک ادارۂ نشر و تالیف میرے زیر انتظام قائم کر رہا ہے، اگر کوئی بے ضرر کتاب ہو تو یہاں سے بھی بشرائط شائع ہونے کا انتظام ممکن ہے، ابھی کام شروع نہیں ہوا ہے۔ ریاست نے پانچسو ماہوار کی امداد منظور کی ہے۔"[۲۸]

سید صاحب کے بھوپال پہونچنے کے بعد ۱۹۴۶ء کے شاید آخری مہینوں میں ایک مخصوص مشاعرہ منعقد ہوا جس کی تفصیل مولانا ارشد تھانوی اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"میری ان کی ملاقات بھی ایک مخصوص مشاعرے میں ہوئی تھی یہ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے۔ جب سید صاحب مغفور بھوپال کے قاضی القضاۃ مقرر ہوکر آئے اور ذاتی زندگی میں وہاں کے علماء، ادباء، شعراء اور ارباب ذوق سے ربط پیدا کیا، ماہنامہ "افکار" کے نوجوان مدیران صہبا ورشدی نے حکیم قمرالحسن اڈیٹر روزنامہ "ندیم" کے مکان پر جہاں "افکار" تھا ایک شعری اجتماع کیا جس میں گنے چنے ارباب سخن مدعو کئے گئے اذن عام مطلق نہ تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ وہاں علامہ موصوف اور سید نواب علی پنشنر وزیر معارف جوناگڑھ کو مصروف تکلم دیکھا، صہبا صاحب نے مجھے ہر دو اصحاب سے متعارف کرایا اور دونوں محترمین نے ازراہ خلوص مجھے اپنے وسط میں بٹھا لیا میں نے نواب علی صاحب سے عرض کیا کہ آپ سے غائبانہ تعارف اس وقت سے ہے جب آپ کی غزل آگرہ کے ماہنامہ "نقاد" میں نکلی تھی :-

حسن کب شیفتۂ لذتِ اظہار نہ تھا
شعلۂ طور نہ تھا، گرمیٔ بازار نہ تھا

فرمانے لگے ۲۵، ۳۰ برس پہلے کی بات ہے آپ نے یاد دلائی، میرے حافظہ میں اب اس کا کوئی شعر محفوظ نہیں، سید سلیمان صاحب

نے فرمایا : آپ کے یاد رکھنے کو اور باتیں کیا کم ہیں میں نے عرض کیا ، مولانا شعری ذوق تو آپ کا بھی بہت سلجھا ہوا ہے رسالہ معارف کا حصہ نظم بہت معیاری ہوتا ہے۔ آپ تو ایسا نہ فرمائیں۔ مسکرا کر بولے : میں شاعر نہیں ہوں ، اس لئے میرے کہنے کا آپ برا نہ مانیں۔ میں نے کہا جناب والا شاعر تو آپ ضرور ہیں ، اسی صحبت شعر میں آپ کو زحمت دی جائے گی ، پہلے سے دفع دخل نہ فرمائیے۔ صہبا اور رشدی نے بھی میری تائید کی اور نتیجہ میں اختتام مشاعرہ کے قریب علامہ کو سنانا ہی پڑا۔ مگر وہ نظم کچھ نیم مذہبی سی تھی مجھ سے فرمایا کہ میں جب حکیم الامت (مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں تھانہ بھون گیا تھا ، اس وقت وہاں کی روحانی فضا سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی تھی "۔[۲۹]

اور سید صاحب کے اجلاس کی کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ارشد تھانوی نے یہ بھی تحریر کیا ہے :-

> "علامہ سید سلیمان ندوی نہ صرف ایک بلند پایہ مصنف اور دنیائے اسلام کے ایک وسیع النظر عالم تھے بلکہ ان کی ذات گرامی ، عملی زندگی میں اور بہت سی خصوصیات کی حامل تھی ، منجملہ ان کے فقہی مسائل میں صحیح نتائج کا استخراج اور مقتضیات حاضرہ کے مطابق ان کا جرأت مندانہ نفاذ بھی ان کا بڑا وصف تھا ، اس کا اندازہ مجھے اس زمانہ میں ہوا جب وہ ریاست کے صدر دار القضاء ہوئے۔ ان کے اجلاس پر بحیثیت وکیل کے مجھے اکثر حاضر ہونا پڑا۔ سید صاحب بڑے ٹھنڈے دل سے وکلاء کے دلائل سنتے اور قانونی موشگافیوں پر توجہ دیتے تھے مگر درمیان میں ایسے ایسے سوال ہلکے انداز میں کرتے جاتے تھے جو پرجوش فریق کے استدلالات کی راہ میں سنگ آمد و سخت آمد کی صورت پیدا کر دیتے۔ سماعت مقدمات کے سلسلے میں قاضی ریاست کو ضابطہ دیوانی اور ضابطہ فوجداری کے ضروری اختیارات دے دیئے گئے تھے ، جن کو سید سلیمان صاحب ہمیشہ ان حدود تک استعمال فرماتے تھے جو ایک

> محتاط قاضیِ شرع برت سکتا ہے، انھوں نے کبھی اجرائے وارنٹ، یا کسی شخص کی گرفتاری کی نوبت نہیں آنے دی۔ بایں ہمہ کسی فریق کو حصولِ انصاف میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات میں بہت آسانی کے ساتھ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیتے تھے، اور کبھی کسی ناکام فریق نے یہ شکایت نہیں کی کہ وہ بے انصافی کا شکار ہوگیا۔ مجلس علماء میں ان کا اپیل ہوسکتا ہے، مگر میرے علم میں کبھی اس کی نوبت نہیں آئی اور نہ کبھی ان کا فیصلہ منسوخ ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ انھیں کے اجلاس پر نظرِ ثانی کی درخواست پیش ہوکر معاملہ اور چھن گیا۔" ع۳۰

آخر جولائی ۱۹۴۷ء کے مکتوب بنام مولانا عبدالماجد دریابادی سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان کا ارادہ یہی تھا کہ وہ بھوپال میں مستقل قیام نہ کریں۔ بھوپال کے قیام میں ایک تذبذب یہ بھی تھا کہ :۔ "کہیں اس کا شمار حُبِ جاہ میں نہ ہو۔" ع۳۱

لیکن جب مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا :۔

> "جو دینی خدمت آپ نے اپنے سر لی ہے تو حضرت تھانوی اگر ہوتے تو میں وجداناً کہتا ہوں کہ وہ ضرور اسے پسند کرتے۔" ع۳۲

تو سید صاحب کو بڑی تسلی ہوئی جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا :۔

> "آپ کے اس وجدان سے کہ حضرت والا رحمہ اللہ میرے اس طرزِ عمل کو پسند فرماتے بڑی تسلی ہوئی، ابھی تک تو میرا عزم یہی ہے کہ مستقل قیام نہ کروں۔" ع۳۳

اسی خط میں بھوپال میں رمضان کے روزے اور رؤیتِ ہلال کے سلسلے میں سید صاحب نے تحریر کیا :۔

> " یہاں رمضان میں مسجدیں خاص طور سے آباد ہوتی ہیں، افطار اور سحر میں قلعہ سے توپیں سر ہوتی ہیں، ریاست کی طرف سے ائمہ اور حفاظ کا انتظام ہوتا ہے۔"
>
> " یہاں کئی سال سے ریڈیو کی خبر پر رمضان اور عید کی رؤیتِ ہلال تسلیم کرلینے کا مسئلہ درپیش ہے، رمضان میں تو خیریت گزری کہ ۲۹ کو

> یہاں باوجود ابر، رویت ہوئی، اب عید کا انتظار ہے۔ گذشتہ
> قاضی صاحب نے ریڈیو پر افطار کا فتویٰ دے دیا تھا جو عام
> علمار کے فتویٰ کے خلاف ہے۔ اب میں نے یہ مسئلہ یہاں کی مجلس
> دینیات میں دوبارہ چھیڑا ہے، دیکھئے فیصلہ کیا ہو۔"

ہندوستان میں آزادی کی صبح کے ساتھ مختلف علاقوں میں بدترین قسم کے فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے، جس کے بُرے اثرات ریاستِ بھوپال پر بھی پڑتے، لیکن بھوپال میں حکومت اور عوام نے امن وامان بحال رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سید صاحب ۹ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کے مکتوب بنام مولانا عبدالماجد دریابادی تحریر کرتے ہیں:-

> "ریاست بھوپال اس وقت پچاس ہزار پناہ گزینوں کا مرکز ہے،
> اور وہ ان کے لئے وہ سب کچھ کر رہی ہے جو انسانیت کا اقتضا ہے،
> ساتھ ہی اپنی ہندو رعایا کی بے حد دلجوئی اور دلدہی کر رہی ہے اور
> امن وامان کے قیام کے لئے فرمانروا سے لے کر ادنیٰ سپاہی تک
> شب و روز مصروف ہے، مستقبل پر تاریکی کا پردہ ہے۔" [۲۴]

سید صاحب کے بھوپال کے معمولات کچھ اس طرح کے تھے، نمازِ اشراق کے بعد دفتر کے کاموں میں مصروف ہوجاتے۔ یہ مصروفیت عصر کے وقت تک جاری رہتی۔

عصر اور مغرب کے درمیان مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی، ماسٹر شفیق احمد وغیرہ جمع ہوتے اور آپس میں مختلف موضوعات پر گفتگو کیا کرتے۔ چھ دن تک یہ سلسلہ رہتا لیکن جمعہ کو تعطیل ہونے کی وجہ سے موتی مسجد میں صبح نو بجے سے ایک گھنٹہ کے لئے ہفتہ وار پروگرام ہوتا جس میں شہر کے پچاس ساٹھ حضرات شرکت کرتے، اس پروگرام میں سید صاحب کسی ایک موضوع پر تقریر کیا کرتے تھے۔

سید صاحب کا جب تک بھوپال میں قیام رہا "تبلیغ" سے بھی بہت زیادہ دلچسپی لیتے رہے۔ اسی زمانے سے ہی بھوپال تبلیغ کا اہم مرکز بنا جا رہا تھا۔ اس کے روحِ رواں مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی سے متعلق سید صاحب اپنے مکتوب ۱۲ر جنوری ۱۹۴۹ء بنام مولانا مسعود عالم ندوی میں تحریر کرتے ہیں:-

> "آج کل سال دو سال سے مولوی عمران صاحب نے یہاں تبلیغی
> جماعت کا کام شروع کیا ہے جو کامیاب ہو رہا ہے۔ کل مع اپنی
> جماعت کے بمبئی گئے۔" [۲۵]

تبلیغی مصروفیات اور دوسرے دینی کاموں کی وجہ سے بھوپال میں سید صاحب کچھ سکون محسوس کرنے لگے تھے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں اس طرح کیا تھا:-

> "یہاں بھی بفضل الٰہی کچھ دینی کام انجام پا رہے ہیں، ورنہ یہاں کا قیام اجیرن ہو جاتا۔"[۳۶]

ستمبر ۱۹۴۷ء کے معارف میں بھوپال کو وسط ہند کا اسلامی مرکز قرار دیتے ہوئے سید صاحب نے تحریر کیا ہے:-

> "آج کل خاکسار بھوپال میں ہے، اور عجب نہیں کہ یہ اقامت کچھ دراز ہو، واقعہ یہ ہے کہ وسط ہند کے ظلمت کدہ میں یہی ایک اسلامی مرکز ہے یہاں علم کی مشعل حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے خاندان سے مولانا عبدالحی بڈھانوی کے صاحبزادے مولانا عبدالقیوم صاحب لائے تھے اور معرفت کا نور حضرت مجدد الف ثانی کے خانوادے کے چشم و چراغ حضرت شاہ رؤف احمد صاحب مجددی جو حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلوی کے خلیفہ تھے لائے، اور بحمد اللہ کہ یہ چراغ اب بھی روشن ہے۔ پھر منشی جمال الدین خاں مدار المہام اور نواب صدیق حسن خاں کے زمانے میں عرب و ہند کے بہت سے علماء، فضلاء کا یہاں مجمع ہو گیا تھا جن کی یاد بھی اب فراموش ہو چکی ہے۔"[۳۷]

البتہ جنوری ۱۹۴۸ء کے خط بنام مولانا مسعود عالم ندوی سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات اور ریاستوں پر اس کے اثرات کی وجہ سے بھوپال کا قیام سید صاحب کے لئے مسئلہ بنتا جا رہا تھا، وہ لکھتے ہیں:-

> "یہاں کا قیام اب غور کے قابل مسئلہ ہو رہا ہے۔"[۳۸]

پھر ۲۱ فروری ۱۹۴۸ء کو لکھتے ہیں:-

> "جہاں میں ہوں بحمد اللہ امن و امان اور سکون ہے، تاہم جو نئے انتظامات اور اس قسم کے مقامات پر ہو رہے ہیں، یہاں بھی ان کی امید ہے، اللہ تعالٰی بہتر فرمائے۔"[۳۹]

۳۰ مارچ ۱۹۴۸ء کو مولانا دریابادی کو مطلع کرتے ہیں:-

"اب ریاستوں میں عوام کی حکومت ہر جگہ قائم ہو رہی ہے، ہمارے یہاں بھی انتظامات ہو رہے ہیں۔" ع ۴۰

۱۰ر مئی ۱۹۴۷ء کو ذرا تفصیل سے ریاست کی سیاسی حالت سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"یہاں کا فتنہ تو بالفعل دب گیا ہے، ریاست کی کشتی ماہر ملاح کی ہوشیاری سے موجوں سے کھیلتی اور گردابوں سے بچتی آگے بڑھ رہی ہے، وزارت کا قلمدان نواب زادہ رشید الظفر خاں کو ملا، جو ہر طرح لائق اور اہل ہیں۔" ع ۴۱

۲۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو سید صاحب نے جامع مسجد میں "انجمن ہدایت المسلمین" کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں "فسادات کا سبب مذہب نہیں بلکہ لامذہبیت ہے" کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ جس کی روداد ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کے روزنامہ ندیم میں اس طرح شائع ہوئی:-

"گذشتہ رات کو جامع مسجد میں مسلمانوں کے ایک بڑے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے مسلمانوں سے کہا کہ انقلاب سے پہلے ملت کو اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے اپنی اصلاح کرنی پڑے گی، خدا کا قانون اٹل ہے اور اس کی رو سے کوئی قوم ہلاکت کے گڈھے اور ذلت اور نکبت کی پستی میں اسی وقت گرتی ہے جب اس قوم کے افراد اپنی اصلاح نفس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ علامہ ندوی نے کہا کہ کسی ملک کو فتح کر لینا اور کسی زمین پر قبضہ کر لینا کوئی بڑی بات نہیں، تاریخ دعوی کر سکتی ہے کہ محمود غزنوی اور سلاطین مغلیہ نے ہندوستان کو فتح کیا لیکن میں اس کو نہیں مانتا۔ فاتح دراصل وہ بے نوا درویش اور بے سروسامان کملی پوش تھے جو خواجہ معین الدین چشتی، سلطان نظام الدین اولیاء، امام احمد سرہندی اور دوسرے مشائخ کی شکل میں ہندوستان کے چپہ چپہ میں پھیل کر دین کی شمع روشن کرتے تھے۔"

تقریر کے اختتام پر انھوں نے صاف صاف کہا:-

"گھبراہٹ اور مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے، ملک میں پچھلے دنوں

> جو فتنہ و فساد پھوٹے تھے ، ان کی وجہ مذہبی اختلاف نہیں ہے ، بلکہ ان کا سبب مذہب سے ناواقفیت ہے ، میرا دعویٰ ہے کہ اگر مسلمان سچا مسلمان ، اور ہندو دھارمک (مذہبی) ہندو بن جائے تو ایک واقعہ بھی رونما نہ ہونے پائے ۔"

۱۹۴۶ء میں جب دارالعلوم کی بنیاد ڈالی گئی تو یہ بات نہایت مسرت کی ہوئی کہ اس کا افتتاح سید صاحب کے مبارک ہاتھوں سے ہوا دارالعلوم کے بانی مولانا محمد عمران خاں ندوی بیان فرماتے ہیں :۔

> " قضا اور قدر کا یہ فیصلہ بھی ہم وابستگان دارالعلوم کے لئے کس قدر قابلِ فخر ، لائق تبریک اور تاریخی ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی اس وقت بھوپال میں موجود تھے جب دارالعلوم تاج المساجد میں قائم ہوا ، اور مؤسس دارالعلوم نے انھیں کے علم و دانش اور حکمت و بینش سے لبریز ہاتھوں سے اس سرچشمۂ علم و دین کا افتتاح کرایا ۔"[۴۲]

۲۵ر تا ۲۸ر جنوری ۱۹۴۹ء تک بھوپال میں کل ہند ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس چار دن تک مسلسل ہوئی ، جس کا افتتاح علامہ سید سلیمان ندوی کے ہاتھوں ہوا ، صفیہ اختر نے اس کی روداد اس طرح تحریر کی ہے :۔

> " کرشن چندر کی فرمائش پر مولانا صاحب اسٹیج پر تشریف لائے ۔ نہایت نفیس ململ کا سفید عمامہ سر پر اور اس سے زیادہ سفید داڑھی ان کے دمکتے چہرے پر زیب دے رہی تھی ، مولانا کا قد و قامت بلند نہیں ، مگر اس کے کشیدہ پن میں بڑھاپے کے ساتھ بھی فرق نہیں آیا ، ان کے بشرے سے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ مترشح نظر آتی ، ان کی چال ڈھال میں ایک عالمانہ وقار ہے ، ان کے تیور میں محقق کا ٹھوس پن ۔"[۴۳]

کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے سید صاحب نے ترقی پسند نوجوان ادیبوں سے مخاطب ہو کر کہا :۔ " نوجوان ادیبو ! اور ہندوستان کی زبان اور قلم کے مالکو !! خوشی کی بات ہے کہ آج ایسے موقع پر جب لوگ سیاسی اور

> راج نیتک جھگڑوں میں پھنسے ہیں، چند ایسے لوگ بھی ہیں جو اُن سے اونچی باتوں کو سوچنے اور سمجھنے کے لئے بھوپال کے ترقی پسند اہل قلم کے بلاوے پر یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ترقی پسند اہلِ قلم کیا چاہتے ہیں؟ اس کے متعلق کچھ اچھی اور کچھ بُری باتیں میں نے سنی ہیں، لیکن خود میری زندگی کا یہ پہلا موقع ہے کہ میں اس میں شریک ہو رہا ہوں۔“

اور ترقی پسند مصنفین کو اس طرح کے مفید مشورے بھی دیئے :-

> ”زبان اور قلم کی قوت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، یہ نعمت جس کو ملی ہے، حق ہے کہ وہ اس کی قدر کرے اور اس قوت کو وہ ان کاموں میں صرف کرے جن سے مخلوقاتِ الٰہی کو فائدہ پہونچے، جن سے سچائی اُبھرے اور جھوٹ نیچے ہو، جن سے نیکی پروان چڑھے اور بدی پست ہو، جن سے اچھائی پھیلے اور برائی دبے۔ جن سے دیس والوں میں میل ملاپ ہو، انسانی بھائی چارہ اور امن داماں اور شانتی پیدا ہو، لڑائی کا چرچا بند کیا جائے، لوگوں کے دلوں سے، انسانوں سے نفرت کا جذبہ مٹے اور اس کی جگہ برائی سے نفرت اور بروں سے ہمدردی کی جائے۔ اور ان کے ساتھ ہمدردی یہی ہے کہ ان کو برائی کی برائی بتائی اور سمجھائی جائے، اور جس طرح بیماروں کو نہیں بلکہ بیماری کو ہم ناپسند کرتے ہیں اور بیماروں سے ہمدردی کرتے ہیں اور ان کی خدمت اور تیمارداری کرتے ہیں[۴۴]۔“

۲۶ر جنوری کی رات کو سید صاحب نے ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں اپنا مقالہ ”قومی زبان“ پڑھا جس میں انھوں نے بتایا کہ اُردو کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ اور خوشگوار تعلقات سے پیدا ہوئی اور دونوں کے خونِ جگر سے اس کی سینچائی ہوئی، کانفرنس کامیاب ہوئی اور سید صاحب کی ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں شرکت کے عرصہ تک چرچے رہے۔

اسی زمانے میں جوش ملیح آبادی نے ایک ملحدانہ نظم ۳۰ر جنوری ۱۹۴۹ء کو بھوپال میں پڑھی، جس کا پہلا شعر تھا :-

جبکہ بچے خواب کے ہنگام تھے گرم خروش
باپ کی صرف ایک ”ہوں“ نے کردیا سب کو خموش

اس نظم میں جوشؔ نے بتانے کی کوشش کی تھی کہ باپ کی ایک "ہوں" سے گھر کے تمام بچے "خاموش" ہو جاتے ہیں لیکن دنیا میں ازل سے جو ظلم وستم کا زور ہے اسے "آسمانی باپ" کی ہوں روکتی کیوں نہیں ہے۔ یہ نظم ۳۱ جنوری ۱۹۴۹ء کے ندیم بھوپال بھی شائع ہوئی جسے پڑھ کر سید صاحب بے چین ہو گئے اور اس کے جواب میں ایک نظم کہی جو ۲ فروری کے اخبار ندیم میں "جواب عارف ندوی" کے عنوان سے نمایاں طور سے شائع ہوئی۔ بعد میں اسے ملک بھر کے جرائد نے نقل کیا۔

مولانا عبد الماجد دریابادی نے اس نظم کو بہت پسند فرمایا اور ۲۵ فروری ۱۹۴۹ء کے صدق جدید میں جوشؔ کی ملحدانہ نظم کے ساتھ شائع کیا اور اس کے متعلق تحریر کیا :-

"یہ نظم جوشؔ کی ایک ملحدانہ نظم کے جواب میں تھی اور ہر اعتبار سے بہت خوب تھی"۔[۴۵]

ادھر ریاست کے سیاسی حالات روز بروز کچھ سے کچھ ہوتے جا رہے تھے، کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ سید صاحب بھی ان حالات سے بے حد متاثر تھے۔ ۱۶ مارچ ۱۹۴۹ء کو مولانا مسعود عالم ندوی کو بھوپال کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"فتنۂ دکن اب بھوپال کے قریب آ رہا ہے، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے"۔[۴۶]

اگست ۱۹۴۹ء میں سید صاحب کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی، اور وہ ۲۲ اگست کو حج کے لئے روانہ ہوئے جہاں سے دسمبر کے آخر میں واپسی ہوئی۔ جہاز میں علیل ہو گئے۔ چنانچہ بمبئی میں اپنے قدرداں منشی عبد العزیز صاحب کے یہاں قیام کیا۔ جب کچھ بہتر ہوئے تو ۹ جنوری ۱۹۵۰ء کو بھوپال واپس آئے لیکن کافی دنوں تک کمزوری باقی رہی۔

سید صاحب کا قیام بھوپال میں قاضی ریاست اور ڈائرکٹر تعلیمات کی حیثیت سے ۱۹۴۶ء سے تھا، ریاست کے ہندو مسلمان اور فرمانروا سب انھیں بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، لیکن جب ۱۹۴۹ء کے وسط میں ریاست کا انضمام عمل میں آیا، اور ریاست کے محکموں کی شکست و ریخت ہوئی، اور ریاست کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہوا، تو سیہور کے ایک ہیڈ ماسٹر کو چیف انسپکٹر مقرر کیا گیا، اور سید صاحب کو عملاً اس کا ماتحت کیا گیا، جسے انھوں نے بڑی ذلت سمجھی۔

اسی دوران میں مشرقی مدارس کے علوم دینیہ کے مدرسین کو ملازمتوں سے الگ کرنے کا حکم جاری ہوا، جو سید صاحب کی رائے میں کسی طرح درست نہ تھا، اس لئے انھوں نے کمشنر بھوپال کو اپنے خیالات لکھ کر بھیجے اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی، جس کے لئے سید صاحب کو ایک ماہ انتظار کرنا پڑا۔ وہاں سے

جواب آیا کہ وہ ڈپٹی کمشنر سے ملیں، چند روز انتظار کے بعد جب ان سے ملاقات کی نوبت آئی، سید صاحب طے شدہ وقت پر ملنے گئے تو وہاں ایک گھنٹہ مزید انتظار کی تکلیف اٹھانی پڑی، اور پھر جب ملاقات ہوئی تو سید صاحب کو بڑا رنج اس بات کا ہوا کہ وہ نہایت بے رخی سے ملے اور ان کی گفتگو میں فرعونیت کی بو آرہی تھی۔ سید صاحب لکھتے ہیں :-

> "...... اس جگہ یہ معاملہ کیا گیا، جہاں ریاست اور کانگریس کے وزراء نے ہمیشہ میرا احترام کیا، پھر باتیں بھی ایسی فرعونیت کے ساتھ کی گئیں کہ دل پر چوٹ لگی، اور فرمایا گیا کہ اس میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ "آپ کا کام حکم کی تعمیل ہے"۔ میں نے وہیں پہلی بار عزم کیا کہ میں اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دوں گا، چنانچہ واپس آکر میں نے تین ماہ کی رخصت کی درخواست دی، جو ایک ماہ میں منظور ہوئی"۔ [۴۷]

اور ۲ر مارچ ۱۹۵۰ء کو مولانا مسعود عالم ندوی کو ان حالات سے اس طرح آگاہ کرتے ہیں :-

> " افسوس ہے کہ یہاں سرکاری مدارس سے علوم دینیہ اور قرآن پاک کی تعلیم موقوف کرادی گئی، اور مدرسین علوم دینیہ کو تین ماہ کا نوٹس دے دیا گیا۔ کوشش کر رہا ہوں کہ وقف سے ان مدرسین کی تنخواہیں ملا کریں اور ان علوم کی تعلیم مدرسہ میں جاری رہے، اور عام مکاتیب قرآن پاک وابتدائی تعلیم کے مسلمان ہر محلہ میں قائم کریں"۔

اور اس کی بھی خبر دی کہ :-

> "اب میرا بھی یہاں سے چل چلاؤ ہے۔ تین ماہ کی رخصت بلا تنخواہ ابھی لی ہے، یہ آخری فیصلہ کی تمہید ہے"۔ [۴۸]

پھر وہ وقت بھی آگیا جب سید صاحب رخصت ہونے والے تھے، عین اس وقت انھیں کسٹوڈین کا یہ نوٹس ملا :- "آپ نے چونکہ کچھ روپے پاکستان بھیجے ہیں اس لئے آپ پر مقدمہ چلایا جائیگا"۔ [۴۹]

جس کے پانے کے بعد سید صاحب بے حد رنجیدہ ہوئے، وہ لکھتے ہیں :-

> "میرے لئے عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی سرکاری مقدمہ میں ماخوذ ہوں، دل نے اذیت محسوس کی"۔ [۵۰]

مجبوراً دوستوں سے مشورہ کے بعد ایک وکیل مقرر کیا، اور پھر یوپی روانہ ہو گئے، جہاں انھیں ایک ماہ

کے اندر ہی وکیل نے اطلاع دی :۔

"پچھلے اجلاس میں آپ کو براہِ راست حاضری کا حکم ہوا ہے، اسلئے چلے آئیں"[۵۱]

چنانچہ سید صاحب نے سخت گرمی کے باوجود سفر کیا اور بھوپال پہونچے، لیکن جب کسٹوڈین کے یہاں پیش ہوئے تو :۔

"اس وقت خلافِ معمول و توقع کسٹوڈین صاحب اخلاق سے پیش آئے اور فرمایا کہ گورنمنٹ آپ پر سے مقدمہ اٹھا لینے کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے۔"[۵۲]

اور پھر دوسرے دن اطلاع ملی کہ "بالفعل یہ مقدمہ اٹھا لیا گیا" اور "مذہبی محکموں کی شکست کا اعلان ہوا"۔ قاضی کا منصب ختم کر دیا گیا۔ مجبوراً سید صاحب نے امیر جامعہ مشرقیہ کے عہدے سے استعفیٰ دیدیا، جو خوشی کے ساتھ منظور ہوا۔ اور وہ نہایت دل برداشتہ یکم جون ۱۹۵۰ء کو بھوپال سے ایسے رخصت ہوئے کہ پھر یہاں آنا نصیب نہیں ہوا۔ اور یہ سرزمین سید صاحب سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔

○

حوالے

۱ و ۲۔ نشانِ منزل بھوپال : سالانہ خصوصی نمبر ۱۹۶۵ء، ص ۱۲
۳۔ حیاتِ سلیمان : شاہ معین الدین احمد ص ۹۷
۴۔ یادِ رفتگاں : سید سلیمان ندوی ص ۱۴۳
۵۔ مقالاتِ سلیمان حصہ دوم مرتبہ شاہ معین الدین احمد ص ۴۰۹
۶۔ حیاتِ سلیمان : شاہ معین الدین احمد ص ۱۷۹-۱۸۰
۷۔ نشانِ منزل ۔ سالانہ خصوصی نمبر ۱۹۶۵ء ص ۱۳
۸۔ یادِ رفتگاں : سید سلیمان ندوی ص ۱۱۲-۱۱۴
۹۔ حیاتِ سلیمان : شاہ معین الدین احمد ص ۴۳۰
۱۰ و ۱۱۔ مقالاتِ سلیمان حصہ دوم : شاہ معین الدین احمد ص ۴۰۸-۴۱۰
۱۲ و ۱۳۔ سوانح حیات، صباح الدین عبدالرحمٰن : معارف اعظم گڑھ، سلیمان نمبر (مئی ۱۹۵۵ء) ص ۲۹
۱۴۔ مکتوباتِ سلیمانی حصہ دوم : مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۱۰۵
۱۵ و ۱۶۔ ارمغانِ سلیمان : سید سلیمان ندوی ص ۲۰، ۲۱
۱۷ تا ۱۹۔ یادِ رفتگاں : سید سلیمان ندوی ص ۲۸۸-۲۸۹، ۲۹۴، ۲۹۸
۲۰۔ تذکرہ سلیمان : غلام محمد ص ۱۸۹
۲۱ و ۲۲۔ مکتوباتِ سلیمانی حصہ دوم : مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۱۷۸ و ۱۷۹
۲۳۔ حیاتِ سلیمان : شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۵۱۷، ۵۱۹
۲۴۔ گنج ہائے گرانمایہ : رشید احمد صدیقی، بحوالہ معارف سلیمان نمبر ص ۱۲۱
۲۵۔ مکاتیبِ سلیمان : بنام مسعود عالم ندوی ص ۲۰۲
۲۶ و ۲۷۔ مکتوباتِ سلیمانی حصہ دوم، عبدالماجد دریابادی ص ۱۸۱ و ۱۸۳
۲۸۔ مکاتیبِ سلیمان، مسعود عالم ندوی ص ۲۰۰
۲۹ و ۳۰۔ سید سلیمان ندوی مسندِ قضا پر : ارشد تھانوی : ماہنامہ ریاض، سلیمان نمبر (مارچ ۱۹۵۵ء) ص ۶۳ و ۶۲
۳۱ تا ۳۴۔ مکتوباتِ سلیمانی حصہ دوم، عبدالماجد دریابادی ص ۱۹۱ و ۲۰۰
۳۵۔ مکاتیبِ سلیمان، مسعود عالم ندوی ص ۲۱۲
۳۶ و ۳۷۔ حیاتِ سلیمان : شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۵۱۶
۳۸ و ۳۹۔ مکاتیبِ سلیمان : مسعود عالم ندوی ص ۲۰۷ و ۲۰۸
۴۰ و ۴۱۔ مکتوباتِ سلیمانی حصہ دوم، عبدالماجد دریابادی ص ۲۰۶ و ۲۰۸
۴۲۔ نشانِ منزل بھوپال، خاص نمبر یکم جنوری ۱۹۶۵ء ص ۱۴
۴۳ و ۴۴۔ خاص نمبر ماہنامہ افکار، بھوپال ۱۹۴۹ء ص ۱۲ و ۴۵
۴۵۔ مکتوباتِ سلیمانی حصہ دوم، عبدالماجد دریابادی ص ۲۱۴
۴۶۔ مکاتیبِ سلیمان، مسعود عالم ندوی ص ۲۱۳
۴۷۔ مکتوباتِ سلیمانی حصہ دوم : عبدالماجد دریابادی ص ۲۳۷
۴۸۔ مکاتیبِ سلیمان : مسعود عالم ندوی ص ۲۱۵
۴۹ تا ۵۲۔ مکتوباتِ سلیمانی حصہ دوم، عبدالماجد دریابادی ص ۲۳۶ و ۲۳۸

آخری قاضی القضاۃ ریاست بھوپال

سید عابد علی وجدی الحسینی★

ریاستِ بھوپال آغازِ تشکیل سے ہی علماءِ حق کا گہوارہ رہی ہے۔ ریاست کی تاسیس کا زمانہ وہ ہے جب کہ عالمگیرِ اعظم کی آنکھوں کے بند ہونے کے کچھ عرصہ بعد ملک میں طوائف الملوکی پھیلنی شروع ہوئی اس وقت بہادر، دلاور اور حوصلہ مند وہم جو انسانوں نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ سردار دوست محمد خاں بانیٔ ریاست بھوپال جنکا عہدِ حکومت سنہ ۱۱۳۰ھ تا سنہ ۱۱۵۲ھ رہا مالوہ کی اس سرزمین کو اپنی سرگرمیوں اور جولانیوں کا مرکز بنایا۔ ابتداءً قصبۂ بیرسیہ اور اس کے مضافات میں پنجۂ اقتدار جمایا اور مقامی عالموں و قاضیوں کا تعاون حاصل کیا۔ چنانچہ قاضی محمد صالح بیرسیہ (وفات سنہ ۱۱۶۲ھ) اور قاضی سراج الدین ٹاٹ پوش دوراہہ کے دستِ تعاون سے ریاست کا دائرہ وسیع ہوا۔ پھر جب بھوپال کا قصبہ ان کے قبضہ میں آیا تو مرکزی سرکار کے قاضی محمد معظم سنبھلی کو سنہ ۱۱۲۰ھ میں رائسین سے مدعو کر کے مسند آرائے قضاء کیا۔

قاضی صاحب تیغ و قلم دونوں کے دھنی تھے۔ اس لئے سردار صاحب کے دستِ راست بن کر توسیعِ ریاست میں برابر شریک رہے۔ جس کی بناء پر سردار صاحب نے بہت کچھ حقوق و اختیارات مرحمت فرمائے۔ پھر ان کے اخلاف قاضی محمد معلّم (وفات سنہ ۱۱۵۳ھ) قاضی محمد یعقوب (وفات سنہ ۱۱۸۰ھ) اور قاضی احمد علی (وفات سنہ ۱۲۰۰ھ) تک سابقہ اختیارات برقرار رہے۔ اس طرح آغازِ ریاست ہی سے یہاں قاضی کا عہدہ نہایت اہمیت کا حامل رہا۔ اس خاندانی قضاء کے ختم ہو جانے کے بعد پھر ہندوستان کے علمی خاندانوں کے مشاہیر افراد کو اس منصبِ جلیل کے لئے مدعو کیا گیا۔ چنانچہ

★ قاضی شہر بھوپال

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان سے وابستہ عالم فاضل قاضی شریف حسین دہلوی (وفات سنہ ۱۸۵۶ء) اور ولی اللہی سلسلہ کے قاضی محمد ایوب (وفات سنہ ۱۳۱۲ھ)، قاضی محمد یحییٰ (وفات سنہ ۱۹۳۰ء) اور قاضی محمد شعیب (وفات سنہ ۱۹۶۲ء) نیز دیگر علماء جیسے قاضی سراج الحق دیوبندی (وفات سنہ ۱۲۴۳ھ)، نواب قاضی محی الدین خاں مرادآبادی (وفات سنہ ۱۳۴۷ھ) اور قاضی محمد حسن مرادآبادی (وفات سنہ ۱۹۴۶ء) کی عظیم اور بزرگ شخصیتوں سے اس عہدہ کو زینت ملی۔ آخر میں قدیم الخیال اور جدید فکر دونوں مکتبوں کے درمیان مسلم شخصیت علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) قاضی القضاۃ کی حیثیت سے بھوپال رونق افروز ہوئے۔ علامہ ندویؒ کو یہ خصوصی فضیلت اس لئے حاصل ہوئی کہ انکی تعلیم کا ابتدائی سلسلہ پھلواری شریف میں شاہ محی الدین قادری اور پھر مدرسہ امدادیہ میں مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری کے زیر سایہ تکمیل پذیر ہوا۔ پھر سید صاحبؒ نے ندوہ پہونچکر علامہ فاروق چریاکوٹی اور علامہ شبلی سے خصوصی تکمیل فرمائی اور ان کے جانشین ہوئے۔ پھر آخر میں حکیم الامت تھانوی کی بارگاہ میں باریاب ہوکر دستارِ خلافت حاصل کی۔

ریاستِ بھوپال نے ہر دور میں ملک کی باکمال صاحبِ علم و فضل شخصیتوں کو مدعو کرکے نہ صرف ان کی میزبانی کا شرف حاصل کیا بلکہ ان کو اپنی کلاہِ افتخار کا قابلِ فخر تاج سمجھا۔ بھوپال کے آخری فرماں روا نواب حمید اللہ خاں (مرحوم) بھی اپنی خاندانی روایات کے مطابق اربابِ کمال کے قدرداں تھے، باوجودیکہ وہ ہندوستانی رئیسوں میں علیگڈھ کے پہلے گریجویٹ تھے لیکن موروثی خصوصیات کی وجہ سے علماء فضلاء کے معتقد و ارادت مند تھے۔

بھوپال جو پچھلے زمانہ میں علومِ دینی و مشرقی کا مرکز رہ چکا تھا اور انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں وہ پرانے چراغ ایک ایک کرکے بجھتے جا رہے تھے، نواب صاحب کو احساس تھا کہ اگر ان چراغوں سے نئے چراغ نہ جلائے گئے تو تھوڑے عرصہ میں مشرقی علوم و فنون کی محفل تاریک و ویران ہوکر رہ جائے گی، اس لئے ان علوم و فنون کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لئے ان کے دل میں بھوپال میں علومِ مشرقی کی ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تمنا کروٹ لے رہی تھی۔ بھوپال کے قدیمی مشرقی و دینی مدارس جامعہ احمدیہ و مدرسہ سلیمانیہ احوالِ زمانہ کے ہاتھوں کسمپرسی کے عالم میں پڑے تھے جیساکہ خود سید صاحبؒ نے معارف میں ریاست کے موجودہ و سابقہ علمی مقام پر روشنی ڈالی ہے۔[۱]

سید صاحبؒ کا ریاست بھوپال سے مولانا شبلی کے جانشین ہونے کی حیثیت سے دیرینہ تعلق تھا۔[۲] دارالمصنفین کے قیام کے بعد سید صاحب کو یہ تعلقات ورثہ میں ملے، مولانا شبلی کے انتقال کے بعد ان کا وظیفہ اور سیرت کی امداد کے بند ہونے کا خطرہ تھا اس لئے سید صاحب اس کی اجراء کی کوشش

کے لئے آخر نومبر ۱۹۱۴ء میں بھوپال تشریف لائے اور بیگم صاحبہ سے ملے اس وقت سیرتِ عائشہؓ زیرِ تالیف تھی۔ بیگم صاحبہ کو اس سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے تکمیل کی طرف توجہ دلائی اور اس کی اشاعت کے مصارف میں امداد فرمائی۔ سیرتِ نبویؐ کی پہلی جلد کی اشاعت کے لئے تین ہزار روپیہ یک مشت عطا کئے اور مستقل امداد بھی جاری کی چنانچہ اس کی اشاعت کے بعد سید صاحب خود سیرت النبیؐ کا نسخہ لے کر بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جس کا ذکر معارف میں ہے[۳]۔

سرکارِ عالیہ کے انتقال کے بعد نواب حمید اللہ خاں فرماں روائے بھوپال سے بھی سید صاحب کے تعلقات اسی طرح قائم رہے۔ بارہا ملاقاتیں رہیں۔ ایک مرتبہ حیدرآباد سے واپسی پر بھوپال اترے اور نواب صاحب سے مل کر دارالمصنفین کے لئے پوری امداد جاری کرائی۔ [۴]

نواب صاحب بھوپال حضرت سید صاحب کے کمالِ علمی کے پہلے ہی سے قدرشناس تھے لیکن مختلف ملاقاتوں اور مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات کے بعد ان کا نقشِ عظمت دل میں مزید بیٹھ گیا اور اپنے مجوزہ مشرقی یونیورسٹی کے خیالی خاکہ میں علمی رنگ بھرنے کے لئے سید صاحب پر ان کی نگاہِ انتخاب جم کر رہ گئی۔ ریاستی سطح پر دفتری خط و کتابت ہوتی رہی۔ سید صاحب دارالمصنفین کی ذمہ داری کا حوالہ دے کر معذرت خواہی کرتے رہے۔ لیکن آخری بار قصرِ سلطانی بھوپال سے جو خط نواب صاحب نے لکھا اس کے اندر ایسا پیرایہ اختیار کیا جس نے سید صاحب کو قیامِ بھوپال کیلئے غور کرنے پر مجبور کیا۔ [۵]

سید صاحب کی بھوپال تشریف آوری جس وقت ہوئی اس وقت آفتابِ عمر لبِ بام آچکا تھا، وہ اپنے فطری مزاج کے لحاظ سے صلح کل انسان تھے، سب کو ساتھ لے کر چلنے کے قائل تھے، لیکن جب عمر بھر کے ساتھیوں کی طرف سے بے اعتنائی برتی گئی تو اس صوفی منش انسان کا آبگینۂ دل ٹوٹ گیا، اور دارالمصنفین کو چھوڑنے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ اکابر صوفیہ کی طرح سید صاحب کی بھی دلی تمنا یہی تھی کہ اس دنیا سے جاتے جاتے کچھ کام کے آدمی پیدا ہو جائیں۔ عمر بھر کی کمائی (دارالمصنفین) کا حشر آنکھوں کے سامنے تھا، مستقبل تیرہ و تار نظر آیا۔ ریاستِ بھوپال کی دعوت میں ان کو امید کی کرن دکھائی دی۔ سید صاحب کے انکار پر نواب صاحب کا اصرار غالب آیا اور دارالتکمیل کا خیال ان کو کشاں کشاں بھوپال لے آیا۔ شاہ معین الدین صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

> "بحمد اللہ طمعِ نفس سے خالی ہوں، مگر دل بعض کاموں کو چاہتا ہے، جس میں سے ایک دارالتکمیل کا خیال ہے جو مجھے یہاں لایا ہے۔" [۶]

چنانچہ سید صاحب نے اس دعوت کو اس لئے نہیں قبول کیا تھا کہ ایک ہزار روپیہ مشاہرہ اور ہر طرح کے اختیارات اور آرام و راحت کے سامان مہیا ہوں گے۔ وہ صبح نہایت فرح بخش صبح تھی جبکہ اہلِ بھوپال کو علم عرفان کے ایک سورج کے افق پر جلوہ آرا ہونے کی خوش خبری ملی۔ نہ صرف سید صاحب کے قریب عزیز لوگوں بلکہ بھوپال کے تمام مسلمانوں کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سرکاری اور عوامی دونوں سطح پر شایانِ شان استقبال کیا گیا۔ شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا۔ ۱۶ر جولائی سنہ ۱۹۴۶ء کو مسندِ قضاء و امارتِ جامعہ کو زینت بخشی اور کام کا آغاز فرمایا۔ مدرسہ سلیمانیہ اور جامعہ احمدیہ کے مدرسین کی فہرست فن وار مرتب کرائی اور فرداً فرداً سب کو انٹرویو کے لئے بلایا گیا۔

بھوپال کی سابقہ علمی مرکزیت کی بنا پر سید صاحب جو توقعات لے کر آئے تھے وہ یہاں پوری نہ ہو سکیں۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوا کہ جدید علوم و فنون کی گرم بازاری نے مشرقی دینی علوم کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ پچھلے علماء و فضلاء اٹھ چکے تھے اور نئی نسل سے یہ جوہر مفقود ہوتا جا رہا تھا اس لئے اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے بیرونی علماء کو بلانے کا مسئلہ سامنے آیا۔ جیسا کہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

> " یہاں کے ملازمین کی حالت اچھی نہیں ہے، روپیہ کی کمی نہیں
> مگر آدمیوں کی سخت کمی ہے۔ باہر سے شاید چند آدمی آجائیں تو کچھ
> کام چلے "ے

چنانچہ اس سلسلے میں فقیہ الامت حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اور محدثِ وقت علامہ یوسف بنوری سے خط و کتابت کی گئی۔ مولانا بنوری بھوپال تشریف بھی لائے لیکن ملک کے غیر یقینی حالات کی بنا پر ان دونوں بزرگوں نے حامی نہ بھری البتہ مولانا اشفاق الرحمان کاندھلوی شارح "ترمذی" تشریف لا سکے۔ بھوپال کے مدارس کے پرانے اساتذہ میں سے ہر ایک استادان اعلیٰ عہدوں کا امیدوار بنکر کھڑا ہو گیا اور باہمی رسّہ کشی کا ماحول پیدا ہوتا چلا گیا۔ نہ دار التکمیل کھل سکا نہ شعبۂ تصنیف کا آغاز ہوا۔ شیخ عبید عرب مہتمم جامعہ نے ہر چند اس منصوبہ کی کامیابی کے لئے کوششیں کیں لیکن انکی ساری مساعی نقشِ برآب ثابت ہوئیں۔ سید صاحب نے ان مدارس کے نظام تعلیمی کو درست کرنے کے لئے آمد و رفت شروع فرمائی۔ اصلاح و تبلیغ کا جو باطنی رنگ ان پر چڑھ چکا تھا اس رنگ میں رنگنے کی ہر ایک کے لئے کوشش فرمائی۔ ہر فرد سے محبت و الفت سے بات چیت کرتے اور مصلحانہ انداز میں گفتگو فرماتے۔

بہرحال ان تمام کوششوں کے باوجود مطلوبہ نتیجہ حاصل نہ ہو سکا عوام کی اصلاح کے لئے ہر

جمعہ کے دن تفسیر کا سلسلہ جاری کیا اور عصر کے بعد مجلس روحانی منعقد ہوتی، مواعظ کا سلسلہ بھی جاری رہتا، راقم الحروف کو ان مجالس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوتی۔ جب کبھی علمی و تحقیقی و تاریخی مسئلہ احقر چھیڑ دیتا تو مختصر جواب دے کر اصل موضوع روحانیت کی طرف لوٹ آتے۔

دار القضاء میں ابتداءً مولوی رضوان الدین صاحب نائب قاضی جو ایک تجربہ کار عالم و فاضل تھے، سارے امور انجام دیتے رہے، پھر خود کام کو اپنے ہاتھوں میں لیا، چونکہ صلح کن مزاج پایا تھا اس لئے زیادہ تر فریقین میں صلح کی کوشش کرتے۔ جھگڑالو لوگوں کے مقدمات نائب قاضی صاحب کے سپرد کر دیتے۔ ایک مقدمہ میں عبرت ناک سانحہ پیش آیا۔ فریقین اور ان کے گواہوں کے بیانات ایک دوسرے سے ایسے متضاد تھے کہ صحیح فیصلہ تک پہنچنا دشوار ہو گیا، دونوں فریق اپنے اپنے بیانات پر قائم رہے، تب سید صاحب نے پیش کار کو حکم دیا کہ ان کو مسجد میں لیجا کر قرآن ہاتھ میں دے کر ان کے بیانات لئے جائیں۔ وہاں جب بیانات لئے گئے تو اس وقت بھی اپنے پچھلے بیانات پر اڑے رہے لیکن جب مسجد سے فریقین نے باہر قدم رکھا تو جس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا اس کی ناک سے خون بہا اور وہیں جاں بحق ہو گیا۔ قدرت کے اس فیصلے سے ہر شخص دم بخود ہو کر رہ گیا۔ ایک اور واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ریاست میں قتل کے مقدمہ کے سلسلے میں جب تک قاضیٔ ریاست کے دستخط نہ ہو جاتے عدالتِ مجاز کا فیصلہ نافذ نہ ہوتا تھا آخری اپیل دار القضاء میں پیش ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک ایسا ہی مقدمہ پیش ہوا۔ مقتول کی ماں اپنے لڑکے کے قتل پر اس قدر آتش زیر پا تھی کہ ہزار سمجھانے پر بھی معافی کے لئے تیار نہ ہوئی۔ آخر میں معاملہ سید صاحب کے اجلاس پر پہونچا۔ حضرت نے ہر چند اس کو فہمائش کی لیکن وہ قصاص پر اڑی رہی۔ جب قاتل کے باپ نے قصاص کا فیصلہ سنا تو وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ سید صاحب نے آخری بار ایک آخری کوشش کی۔ جس پر وہ معاف کرنے پر آمادہ ہو گئی جب قاتل کے باپ کو یہ خوشخبری سنائی گئی تو اک دم وہ جوانوں کی طرح اٹھ کھڑا ہوا گویا اس کو ایک نئی زندگی ملی۔

سید صاحب قاضی القضاۃ بن کر بھوپال تشریف لائے تھے لیکن وہ ملک کے مسلمہ ادیب و مصنف تھے اس لئے علمی و ادبی محفلوں میں راقم الحروف کے ذریعہ دعوت دی جاتی اور شرکت فرما کر سب کو مفتخر فرماتے۔ حضرت سید صاحب کے ارکانِ ریاست میں سے شعیب قریشی اور حسن محمد حیات سے خلافت کے زمانہ سے دیرینہ تعلقات تھے۔ لیکن چونکہ اب دوسرے رنگ میں رنگ چکے تھے اس لئے خانقاہ مجددیہ میں شاہ محمد یعقوب مجددیؒ کے یہاں زیادہ آمد و رفت تھی حضرت صاحب بھی دولت کدہ پر حاضر ہوتے اور روحانی صحبتیں رہتیں۔ وہ ایک دوسرے کے کمالات ظاہری و باطنی کے قدر شناس تھے ع

قدر گوہر شاہ بداند یا بداند جوہری

سید صاحب کا بھوپال میں چار سالہ قیام اس دور میں ہوا جب کہ ملکی سیاست میں لیگ و کانگریس کی آویزش آخری نقطہ پر پہونچ کر برطانوی ڈپلومیسی ملتِ اسلامیہ کو تین تیرہ کرنے کے قریب پہونچ چکی تھی۔ فسادات کے ہنگامے زور و شور سے ہر طرف برپا تھے۔ ہر جگہ تخریب ہی تخریب تھی اس لئے وہ اپنے تعمیری و تعلیمی منصوبوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان فسادات کی لہر سے ان ہمدرد قلب بزرگ کا دل خون ہو گیا۔ پھر ۱۹۴۷ء میں آزادی کا سورج خوں فشاں بن کر طلوع ہوا۔ ادھر حیدر آباد کا قضیۂ نامرضیہ پیش آیا اور خود ریاستِ بھوپال جون ۱۹۴۹ء میں انڈین یونین میں ضم ہو گئی۔ سید صاحب حج کو چلے گئے اور وہاں سے واپس ہو کر یکم جون ۱۹۵۰ء میں استعفیٰ دیکر بھوپال کو الوداع کہا۔ ہمارے لئے سید صاحب کا یہ جملہ مسرت بخش ہے:۔

> "میں نے بھوپال سے رخصت لینے کا فیصلہ کیا حالانکہ یہاں کے لوگ میرے قیام کیلئے بے حد مُصر ہیں، اور حق یہ ہے کہ بھوپال میں اعلیٰ سے ادنیٰ تک نے میرے استحقاق سے زیادہ قدردانی کی۔"[۸]

حوالے:

۱۔ معارف ستمبر ۱۹۳۶ء۔ ۲۔ تاریخ فرماں روایانِ بھوپال۔ ۳۔ معارف ستمبر ۱۹۱۸ء۔ ۴۔ معارف ۱۹۳۵ء بحوالہ حیاتِ سلیمان ص ۶۶۔ ۵۔۸ حیاتِ سلیمان۔

محمد یوسف کوکن عمری★

سیّد صاحب کے ساتھ میرے پانچ سال

۱۹۳۵ء —————— ۱۹۴۰ء

تحریکِ خلافت کے زمانہ میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی جس طرح شمالی ہند میں مشہور و معروف ہو چکے تھے اسی طرح جنوبی ہند میں بھی بہت مقبول ہو چکے تھے۔ مدراس کے فخر التجار حاجی ایم جمال محمد صاحب (المتوفی ۱۹۴۹ء) نے انھیں مدراس آنے کی دعوت دی۔ سید صاحب نے اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۵ء میں سیرت نبویؐ پر آٹھ پر مغز لکچر دیے، جو دسمبر ۱۹۲۵ء میں خطبات مدراس کے نام سے چھپے اور بہت پسند کیے گئے۔ اس زمانہ میں عمر آباد (ضلع شمالی آرکاٹ) میں دسمبر ۱۹۲۴ء میں دار السلام کے نام سے ایک عربی مدرسہ قائم ہوا۔ جس میں عربی فارسی اردو کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جانے لگی۔ میں ۱۹۲۵ء میں اس مدرسہ میں داخل ہوا اور ۱۹۳۳ء تک یہاں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء میں مدراس یونیورسٹی سے میٹریکولیشن کا امتحان دیا اور سکنڈ کلاس میں پاس کیا۔ میرا ارادہ طبِ جدید کے حاصل کرنے کا تھا۔ مگر جامعہ دار السلام کے سکریٹری الحاج کاکا اسمٰعیل صاحب نے جبر کر کے مجھ کو تصنیف و تالیف میں مہارت حاصل کرنے کے لئے سید صاحب کے پاس اعظم گڈھ بھیج دیا۔ جہاں میں نے اواخر ۱۹۳۴ء سے فروری ۱۹۴۰ء تک رفیق دار المصنفین کی حیثیت سے کام کیا اور امام ابن تیمیہؒ پر ایک ضخیم کتاب لکھی۔

سید صاحب نے میری تعلیم اور ادبی کاوشوں کے متعلق کئی سوالات کیے، جن کا میں نے ایک حد تک تشفی بخش جواب دیا۔ مگر میں نے کہا کہ مجھے قدیم یونانی فلسفے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یونانی فلسفہ ایک گورکھ دھندہ ہے۔ مگر اس کو بھی پڑھ لو تو آئندہ کام آئے گا۔ آپ نے میبذی کی "ہدایۃ الحکمۃ" پڑھانی شروع کی۔

ہم اپنے مدرسہ میں تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی پڑھ کر آئے تھے، مگر قرآن مجید کے واضح معانی و مطالب ہمارے ذہن نشین نہیں ہو سکے تھے، آپ نے تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول پر قرآن مجید کی تفسیر بیان کرنی شروع کی تو ایسا محسوس ہوا کہ قرآن مجید کے معانی و مطالب خود بخود واضح ہونے لگے ہیں اور ہم اب تک

★ پرنسپل جمالیہ عربی کالج مدراس و سابق صدر شعبہ عربی و فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی، مدراس۔

عربی طلبہ کو اسی اصول پر قرآن مجید کی تفسیر پڑھا رہے ہیں۔

سید صاحب نے مجھے دو سال تک کوئی خاص موضوع نہیں دیا۔ آپ نے حکم دیا کہ میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۵ء تک معارف کا پورا فائل پڑھ ڈالوں اور مختلف علوم و فنون کی اہم کتابیں دیکھ ڈالوں۔ میں نے دیکھا کہ سُرخ روشنائی سے ہر کتاب پر جلد اور صفحات کے نشانات لگے ہیں اور ان کے سامنے کسی موضوع کا ذکر نہیں ہے اور جب سید صاحب کو کوئی چیز لکھنی ہوتی تھی تو مجھ سے فرماتے تھے کہ فلاں کتاب لاؤں، ان پر نظر ڈال کر خود ہی حوالے نکالتے تھے اور ان پر لکھا کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۳۶ کا سال تھا سید صاحب نے بلایا اور کہا دیکھو کشف الظنون میں دیوان الصبا کا کوئی ذکر ہے یا نہیں۔ یہ چھٹی صدی ہجری کا دیوان تھا۔ آپ نے اقبال سہیل مرحوم کے علامہ شبلی کے متعلق الاصلاح میں مضمون کی طرف اشارہ کر کے کہا دیکھا اقبال کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ دیوان الصبا کو انھوں نے بچپن کا دیوان سمجھا اور پھر مولانا شبلی کو بچپن کا شاعر بنا دیا۔ حالانکہ یہ عشق کا دیوان ہے مولانا شبلیؒ نے اس دیوان کا ایک نسخہ نواب محسن الملک کو بھیجا تھا۔ جب اقبال سہیل دار المصنفین آئے تو آپ نے کہا خوب صاحب! آپ۔ نے مولانا شبلی کو بچپن کا شاعر بنا دیا۔ دیوان الصبا عشق کا دیوان ہے بچپن کا دیوان نہیں ہے۔ اقبال سہیل نے ہنس کر کہا ہم تو لوگوں کی دلچسپی کی خاطر اس قسم کے ادبی شوشے چھوڑا کرتے ہیں۔

مولانا سید ریاست علی مرحوم " ہند جدید " کلکتہ میں بہت سے دلچسپ مضامین شائع کیا کرتے تھے، مجھے بھی شوق ہوا تو میں نے ایک لمبا مضمون " چھٹی صدی ہجری میں مسلمانوں کا تمدن " کے عنوان سے روانہ کیا جو آٹھ قسطوں میں شائع ہوا۔ آپ نے ابتدائی تین قسطوں کو دیکھا، چوتھی قسط پر مجھے بلایا اور پوچھا یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟۔ میں نے کہا ابن الحاج مالکی نے اپنی کتاب المدخل میں یہ حالات لکھے ہیں۔ میں نے ان کا خلاصہ کر دیا ہے آپ نے فرمایا کہ آپ اگر اس لائٹ لٹریچر پر پڑ گئے تو آئندہ تحقیق نہیں کر سکتے، اس وقت سے میرے قلم کی جولانی بند ہو گئی۔

پھر آپ نے فرمایا لوگ میری کتابوں کو پڑھ کر یہ پوچھنے لگتے ہیں کہ میں نے کس طرح چند مہینوں میں " عرب و ہند کے تعلقات " اور " عربوں کی جہاز رانی " پر ایسے پُر از معلومات لکچرز لکھ ڈالے لیکن یہ نہیں جانتے کہ یہ میرے برسوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں، وہ فرماتے تھے لکھنا آسان ہے مگر اہم معلومات کا جمع کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں تحقیق و تدقیق کے اعلیٰ معیار پر کام کروں۔

دو سال کے مسلسل مطالعہ کے بعد آپ نے میرے لئے امام ابن تیمیہ کا موضوع تجویز کیا، میں نے مولانا شبلی اور مولانا ابو الکلام کی دلنواز تحریریں پڑھیں، میں یہ سوچنے لگا کہ میں کیونکر ان کے اسلوب پر کتاب لکھ سکتا ہوں۔ مگر سید صاحب کی بروقت رہنمائی میری ہمت بڑھا رہی تھی، میں نے سب سے پہلے امام

ابن تیمیہؒ کے موافقین اور مخالفین کی ایک فہرست ان کی تاریخ ولادت و وفات کے ساتھ تیار کرلی۔ جہاں کہیں ان کے متعلق کوئی بات لکھی ہوتی تو اس فہرست پر ایک نظر ڈال لیتا تھا تاکہ کہیں کوئی غلطی سرزد نہ ہوجائے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ کسی بڑے سے بڑے محقق کی نقل کردہ عبارتوں پر کلّی اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ تاوقتیکہ ان کی اصل عبارت دیکھ نہ لی جائے۔ میں نے امام ابن تیمیہ کی تالیف میں اس اصول کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ ابن تیمیہؒ کے بعض مخالفین نے جنوبی ہند میں لکھی ہوئی کتاب کا حوالہ دیا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب الدرر الکامنہ میں ابن تیمیہ کی خوب خبر لی ہے۔ میں نے کہا کہ جس شخص کو حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ ابن حجر ہیتمی کے درمیان فرق کرنا نہ آئے اس کو میرے سامنے پیش کر رہے ہو، یہ حافظ ابن حجر ہیتمی ہیں جنھوں نے الفتاوی الحدیثیہ میں امام ابن تیمیہ پر بڑا ہی لعن طعن کیا ہے، امام ابن تیمیہ کے مخالفین جھینپ کر رہ گئے۔

سید صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ دو شخص آپس میں لڑتے ہیں اور ہر ایک دوسرے پر ناروا حملہ کرتا ہے تو تیسرے محقق کو نہیں چاہیے کہ ان میں سے کسی ایک کا لب و لہجہ اختیار کرے۔ میں نے اپنی کتاب امام ابن تیمیہ میں اس اصول کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ جب کبھی محی الدین ابن عربی کے متعلق امام ابن تیمیہ کی تحریریں نقل کرتا ہوں تو ادے ترے کی زبان ہوتی ہے مگر میں جب کبھی ابن عربی کا کوئی نقل کرتا ہوں تو لکھتا ہوں "شیخ اکبر" فرماتے ہیں، میرا یہ لب و لہجہ مخالفین ابن تیمیہ کو بھی بہت پسند آیا اور انھوں نے تعریفی خطوط لکھے ہیں۔

سید صاحب کا ایک زریں اصول یہ تھا کہ بڑی شخصیتوں کی سیرت معاصرانہ تاریخ اور تذکروں کی روشنی میں سمجھنی اور لکھنی چاہیے۔ میں نے اپنی کتابوں میں اس اصول کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ خانوادۂ قاضی بدرالدولہ جلد اوّل لکھی تو اس اصول کی روشنی میں کئی واقعات کو غلط ثابت کیا جو بعد کی تاریخوں میں آگئے ہیں۔ جنوبی ہند میں حضرت عبدالقادر جیلانی کے متعلق شاندار جلسے ہوتے ہیں جن میں عجیب و غریب روایتیں پیش کی جاتی ہیں جو ابن القادفی الحنبلی کی قلائد الجواہر میں منقول ہیں۔ یہ کتاب نویں صدی ہجری کی ہے اور شیخ عبدالقادر جیلانی چھٹی صدی ہجری کے نصف اوّل میں تھے۔ اپنی تقریروں میں جب کبھی ان بے سروپا روایتوں پر تنقید کرتا ہوں تو مجھے وہابی سمجھ کر ان تنقیدوں پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔

اسلامی فقہ پر سید صاحب کی بڑی دوررس نظر تھی، سرائے میر میں مولوی عبدالغنی صاحب پھولپوری نے بیت العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ لیکن جب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی شہرت ہونے لگی تو انھوں نے مولوی مفتی کفایت اللہ سے ایک فتویٰ منگوایا کہ زید کئی کتابوں کا مصنف ہے اس نے ان میں علم کلام کے مباحث پیش کیے ہیں وہ عالم کو قدیم مانتا ہے کیا قدم عالم کا عقیدہ شریعت اسلامیہ کی رو سے ٹھیک ہے؟ زید کے احباب ایک مدرسہ چلا رہے ہیں جہاں ان عقائد کی تعلیم اور تلقین کی جاتی ہے۔ کیا اس مدرسہ کی مالی امداد

کرنا جائز ہے ؟ ۔ مولوی مفتی کفایت اللہ نے جواب دیا کہ قدمِ عالم کا عقیدہ باطل ہے اور اس قسم کے مدرسے کی مالی امداد کرنا ناجائز ہے ۔ مولوی عبدالغنی نے فرضی ناموں کو نکال کر مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی کے نام داخل کئے اور ایک بہت بڑا اشتہار شائع کیا، جس کی وجہ سے عوام میں ایک طرح کا اضطراب و انتشار پیدا ہو گیا۔

سید صاحب نے مولوی مفتی کفایت اللہ صاحب کو خط لکھا، زید اگر کئی کتابوں کا مصنف ہے تو وہ کوئی مشہور شخص ہی ہوگا آپ کو پوچھنا چاہئے تھا کہ یہ کون شخص ہے اگر سائل مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی کا نام لیتا تو آپ ہرگز ان کے متعلق کفر کا فتویٰ نہ دیتے، مولوی کفایت اللہ صاحب نے غلطی کا اعتراف کیا اور لکھا آپ ہی نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں انشاء اللہ ہم سے آئندہ اس قسم کی کوئی غلطی سرزد نہ ہوگی ۔

سید صاحب کے نام بہت سے استفتاء آیا کرتے تھے جن کا جواب ان کی رہنمائی میں میں لکھتا تھا۔ غالباً ۱۹۳۷ء میں بنگلور سے آلۂ مکبر الصوت کے اذان، نماز اور خطبے میں استعمال کے جواز اور عدم جواز کا استفتاء آیا، حنفی فقہاء کا یہ خیال ہے کہ اگر کوئی نمازی غیر نمازی کی آواز پر حرکت کرے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے۔ یہ حضرات خطبہ کو ظہر کی دو رکعت فرض کے برابر سمجھتے ہیں، جنوبی ہند میں خطبہ سے پہلے موذن ایک روایت سناتا ہے اور کہتا ہے :

" الجمعة حج الفقراء وعيد المساكين الخطبة ماكان ركعتين من الفرض،

اذا صعد الخطيب على المنبر فلا يتكلمن احد كمُ ومن تكلم فقد لغا ومن لغا فلا

جمعة له، إسمعوا وانصتوا رحمكم الله "

اس روایت کی بنا پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غیر عربی میں خطبہ دینا ناجائز ہے ۔ تلاش و تحقیق میں شمس الائمہ سرخسی کی المحیط میں ایک عبارت نکل آئی، انھوں نے اس روایت پر سخت تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ خطبہ ظہر کی دو رکعت کے برابر نہیں ہے ۔ نماز میں قبلہ رو ہونا ضروری ہے اس میں صرف قرآن مجید ہی پڑھا جا سکتا ہے ادھر ادھر گھوم کر دیکھنا نہیں چاہئے خطبہ قبلہ کی مخالف جہت میں دیا جاتا ہے، خطبہ میں ادھر ادھر گھوم کر آیاتِ قرآنیہ کے ساتھ حدیث و فقہ و عقائد پر بحث کی جا سکتی ہے، اور علماء، و فقہاء کے اقوال اور ان کے دلائل پیش کئے جاتے ہیں اس لئے خطبہ کو ظہر کی دو رکعت کے برابر قرار دینا سراسر غلط ہے میں نے سید صاحب کو یہ عبارتیں دکھائیں اور پھر انہی کی بنیاد پر اس فتوے کا جواب لکھا۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ آلۂ مکبر الصوت کا اتنا ہی کام ہوتا ہے کہ قاری کی آواز کو اونچا کر کے دور دور تک پہنچا دے اس میں قاری کا لب و لہجہ نہیں بدلتا، دور ہی سے ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ فلاں کی آواز ہے۔

یہ فتویٰ بنگلور پہنچا تو وہاں کی اکثر مسجدوں میں آلۂ مکبر الصوت استعمال کیا جانے لگا اور پھر مدراس

اور دوسرے شہروں میں بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔

شہر مدراس میں ایک قاضی عبدالرحمٰن تھے، انھوں نے اپنے ہفتہ وار " رفیق " میں اس فتوے پر سخت تنقید کی اور لکھا کہ اس میں غلط استدلالات سے کام لیا گیا ہے۔ جب یہ پرچہ سید صاحب کے نام آیا تو مجھے بلایا اور کہا دیکھو بھائی یہ کون ہے جو ہماری بری طرح خبر لے رہا ہے۔ میں نے کہا یہ ایک جامد مقلد ہے۔ اگر ہم اس کا کوئی جواب بھی لکھیں تو وہ پھر اس پر اپنا اظہار خیال کرے گا۔ ہمیں اس کا کوئی جواب نہیں لکھنا چاہئے۔ عوام نے ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا، اور ہر جگہ آلہ مکبر الصوت استعمال کیا جانے لگا۔

سید صاحب جہاں بھی جاتے اور مختلف اشخاص سے ملتے تو ان کے آباء واجداد کے متعلق بھی دریافت کر لیتے، اس لئے ان کی " وفیات " ضروری معلومات سے پر ہوتی تھیں۔ انھوں نے جنوبی ہند کی معروف شخصیتوں کے متعلق جو بھی لکھا ہے ان سے ہم بھی اتنے واقف نہیں ہیں۔

جب میں دار المصنفین پہنچا تو سید صاحب ہی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ایک صبح ان کو آنے میں دیر ہوئی تو مولانا مسعود علی ندوی نے مجھے کھڑا کر دیا، میری آواز سن کر سید صاحب گھر سے تشریف لائے اور نماز میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد مجھے حکم دیا کہ میں پنجوقتہ نماز پڑھاؤں اور جب مولانا اویس ندوی مرحوم بھی آ گئے تو میں اور وہ نماز پڑھایا کرتے تھے۔ جب رمضان کا مہینہ آیا تو ابتدائی بارہ رکعت کے لئے مجھے کھڑا کیا گیا، میں نے سورۂ بقر سے چند آیتیں تلاوت کیں۔ نماز کے بعد سید صاحب نے پوچھا، کیا آپ حافظ ہیں؟ میں نے کہا میں حافظ نہیں ہوں، ادھر ادھر سے چند سورتیں یاد ہیں۔ میں الم تر سے پڑھنے کے بجائے اس کو پسند کرتا ہوں کہ یاد کی ہوئی سورتوں سے سناؤں۔ سید صاحب نے اس کو پسند کیا۔ اس طرح میں نے سال بسال اس کے سلسلے ملائے اور اکتوبر ۱۹۳۹ء میں پورا قرآن مجید سنا دیا۔ سید صاحب نے خوش ہو کر " معارف " کے شذرات میں میری بہت تعریف کی۔

سید صاحب کسی کانفرنس میں شریک ہوتے تھے تو دوسروں کے مضامین بھی نوٹ کرتے جاتے تھے، اور پھر ہر ایک کے دلائل پر ان کی نظر رہتی تھی۔ ایک مرتبہ شاہ معین الدین مرحوم لاہور کی ایک کانفرنس میں شریک ہوئے، جب واپس ہوئے تو سید صاحب نے پوچھنا شروع کیا کہ کون کون آئے تھے اور انھوں نے کیا کیا مضمون پڑھا؟ جب وہ تشفی بخش جواب نہ دے سکے تو آپ نے طنزاً کہا تو آپ صرف سیر و تفریح کے لئے گئے تھے۔

ہم میں سے بہتوں کو یہ تعجب تھا کہ ہندوستان کا اتنا بڑا محقق عالم مولانا اشرف علی مرحوم کے ہاتھ پر کیسے بیعت کر گیا اور پھر اختلافی مسائل سے کیونکر توبہ کر لی۔ ۱۹۴۴ء میں سید صاحب ہسٹری کانگرس کے سلسلہ میں مدراس تشریف لائے، آپ کی ظاہری اور باطنی وجاہت کا ہندوؤں پر بھی بڑا اثر ہوا۔ ایک مصور نے

کاغذ پر آپ کی قلمی تصویر کھینچ ڈالی۔ وہ میرے پاس آیا اور چاہتا تھا کہ اس پر سید صاحب کے دستخط لیکر دیدوں۔ میں نے دبی زبان سے سفارش کی، اور کہا کہ اس نے بڑی عقیدت سے یہ قلمی تصویر کھینچی ہے آپ اس کا دل نہ توڑیئے۔ آپ نے اس پر دستخط کر دیئے اور کہا کہ وہ اس کو پسند نہیں کرتے۔ آئندہ کوئی ان کی تصویر لینے کی کوشش نہ کرے

مدرسہ باقیات الصالحات ویلور کے ارباب حل و عقد اُن کو ویلور لے گئے۔ آپ نے اساتذہ و طلبہ کے سامنے عربی زبان میں اصلاح اخلاق پر ایک ولولہ انگیز تقریر کی، جس کے ہر لفظ سے ایک والہانہ کیفیت مترشح ہو رہی تھی۔ آپ کی پوری تقریر دلی جذبات و کیفیات سے لبریز تھی۔ میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ دلی کیفیت بیعت کے بعد ہوئی ہے۔ آپ کی وفات کے بعد کریسینٹ سوسائٹی مدراس میں آپ کے متعلق میری ایک تقریر ہوئی۔ جس میں مولانا ابو الجلال ندوی مرحوم بھی تھے۔ میں نے باقیات الصالحات کی تقریر کا حوالہ دے کر کہا کہ میں نے آپ کو بیعت سے پہلے بھی دیکھا ہے اور بیعت کے بعد بھی دیکھا ہے۔ مگر ایک والہانہ کیفیت جو بعد میں پیدا ہوئی ہے وہ بیعت کے بعد ہی ہوئی ہے۔ جب تقریر ختم ہوئی تو مولانا ابو الجلال نے کہا واہ صاحب آپ نے بیعت کے جواز کی بہت عمدہ توجیہ پیش کردی ہے۔

مجھ میں پہلے سے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا جو جذبہ تھا وہ دار المصنفین میں آنے کے بعد بھی کم نہیں ہوا۔ میں شبلی اسکول اعظم گڈھ کے طلبہ کو انگریزی اور حساب سکھاتا تھا، برادرم نیاز احمد صدیقی مرحوم کی حوصلہ افزائی سے الہ آباد بورڈ کے انٹرمیڈیٹ امتحان میں شریک ہوا اور کامیابی حاصل کی۔ اس کی اطلاع سید صاحب کو نہیں تھی۔ مدراس جاکر میں نے بی اے میں داخلہ لینے کی کوشش کی اور سید صاحب سے اجازت چاہی تو وہ خفا ہوگئے اور لکھا آپ تصنیفی زندگی کو چھوڑ کر انگریزی کی طرف کیوں توجہ کر رہے ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ تصنیف و تالیف میں آپ کو اتنا روپیہ نہیں ملے گا ؟۔

میں نے معذرت کا خط لکھا کہ مدراس میں انگریزی کا چلن زیادہ ہے میں یہاں اس کی مدد سے بہت زیادہ کام کرسکتا ہوں۔ میں نے ۱۹۴۲ میں بی اے ۱۹۴۸ میں ایم اے کا امتحان پاس کیا اور مدراس یونیورسٹی کی ملازمت اختیار کرلی۔ ۱۹۶۵ میں ایم لٹ کی ڈگری لی، میں نے ۲۸ سال مدراس یونیورسٹی میں گزارے اور کئی کتابیں شائع کیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ میری کامیابی سید صاحب کے بتاتے ہوئے اصول کی پابندی کرنے کی وجہ سے ہے۔

اختصار کی بنا پر میں اپنے مضمون کو اسی پر ختم کرتا ہوں اگر کوئی اور موقع ملے تو انشاء اللہ اور بہت سی باتیں سامعین کے گوش گزار کرسکوں گا۔

○

مجیب اللہ ندوی★

خدمت سلیمانی میں

چند سال

مظہر العلوم بنارس میں ابھی عربی دوم کا طالب علم تھا کہ قرآن و ادب کے محترم استاذ مولانا کوثر صاحب ندوی نے ایک دن علامہ شبلیؒ کی کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" اور حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی "خطبات مدراس" کے پڑھنے کی ترغیب دی، کتب خانہ سے کتاب بلکوائی اور پڑھنا شروع کیا "موازنۂ انیس و دبیر" کے بہت حصے سمجھ میں نہیں آئے مگر جو عبارت اپنے معیار کے اعتبار سے اچھی لگی یاد کر ڈالی اور خوب یاد ہے کہ اس شعر ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

کی فصاحت و بلاغت پر علامہ شبلیؒ نے جو عبارت لکھی ہے وہ آج بھی یاد ہے، اسی طرح حضرت سید صاحبؒ کے "خطبات مدراس" کے کئی خطبے زبانی یاد کر ڈالے اور ایک خطبہ طلبہ کے ہفتہ وار تقریری پروگرام میں سنا بھی دیا یہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اس وقت اتنی تمیز نہیں تھی کہ اس کے آگے پیچھے خود دو چار جملے اپنی طرف سے لگا لیتے چنانچہ ایک استاذ نے فرمایا کہ تم نے تقریر کیا کی تراویح سنائی ہے۔

یہ تھا سید صاحب اور ان کے استاذ علامہ شبلیؒ سے پہلا تعارف اور غائبانہ تعلق، اس کے کئی برس کے بعد ۱۹۳۹ء میں داخلہ کے لئے ندوہ گیا، ندوہ میں داخلہ ہو گیا اور داخلہ کے چند دن بعد حضرت سید صاحبؒ تشریف لائے اور تشریف لانے کے بعد دوسرے دن بعد نماز ظہر اعلان ہوا کہ حضرت سید صاحبؒ طلبہ سے خطاب فرمائیں گے، حضرت سید صاحبؒ کے سراپا اور لباس کا جو نقشہ ذہن میں تھا اس کے برعکس پتلی مہری کا پائجامہ، کرتا، اس پر شیروانی اور سر پر صافہ باندھے ہوئے فرشتہ جیسی صورت لئے ہوئے کھڑے ہوئے تو ہمارے اکثر نئے ساتھی حیرت زدہ ہو گئے۔ یعنی قدامت پرستی کا یہ تصور ان کے بارے میں نہیں تھا۔

حضرت سید صاحبؒ نے بہت سی نصیحتیں کیں، دو باتیں حافظہ میں اب بھی محفوظ ہیں ایک یہ کہ

★ ناظم جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ

طالب علم کو اپنے زمانۂ طالبعلمی میں محض اپنے مقصد سے دلچسپی رکھنی چاہیئے سطحی اور سیاسی دلچسپیوں میں اپنا وقت برباد نہ کرنا چاہیئے۔ استاذ کے درس کی جو باتیں چھوٹ جاتی ہیں وہ محض مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتیں اگر ہو بھی جاتی ہیں تو اپنی فہم پر پورا اعتماد نہیں ہوتا۔ اجتماعی اور سیاسی چیزوں سے واقفیت ضرور رکھیے مگر اسے غذا نہ بنائیے بلکہ اسے دسترخوان کی چٹنی ہی سمجھیے۔ جو لوگ چٹنی کو کھانا بنا لیتے ہیں ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے، پھر ان کا معدہ کھانا کھانے کے قابل بھی نہیں رہ جاتا۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا کرنا ندوہ کے بنیادی مقاصد میں ہے مگر عزیزو! یہ بھی سمجھ لو کہ اگر کسی سونار کو سونا بنانے کا فن آتا ہو مگر اس کے پاس سونا چاندی نہ ہو تو کیا وہ لوہے اور مٹی کے زیور بنائیگا اگر بنائیگا تو صرافہ کے بازار میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہوگی۔ بالکل اسی طرح اگر آپ کو لکھنا پڑھنا آجائے تو آپ کے پاس معلومات کا خزانہ نہیں ہے تو آپ کوئی قابل ذکر تحریر نہیں لکھ سکتے بلکہ جذباتی اور سطحی چیزیں لکھیں گے جن کی علم وفن کے بازار میں کوئی قیمت نہیں ہوگی۔

ندوہ میں اس وقت عام طور پر طلبہ کا اور متعدد اساتذہ کا جو مذاق اور ان کی دلچسپی تھی اس کے پیش نظر حضرت سید صاحبؒ نے یہ باتیں فرمائی تھیں اسی ذوق کے نتیجہ میں سنہ ۱۹۴۲ء میں طلبہ نے کانگریس کے رزولیشن کوئٹ انڈیا کی حمایت میں ہفتوں ندوہ بند رکھا اور اسی کے نتیجہ میں سنہ ۱۹۴۳ء میں بڑی اسٹرائک ہوئی جن میں کئی اساتذہ علیحدہ کیے گئے اور کئی اپنی مرضی سے گھر بیٹھ رہے۔ راقم الحروف ۵ رنومبر سنہ ۱۹۳۹ء کو ندوہ میں داخل ہوا تھا اور اس کے تین ہی مہینے کے بعد جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن صاحب مرحوم اپنے وطن ٹونک چلے گئے اور مولانا عمران خان صاحب مصر سے پڑھکر واپس ہوئے اور مہتمم بنائے گئے اور انھوں نے اپنے اہتمام میں طلبائے قدیم کا جلسہ کرایا جس میں تمام قابل ذکر قدیم ندوی، مثلاً حضرت سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالباری ندوی مرحوم، مولانا عبدالسّلام مرحوم، مولانا جعفر ندوی پھلواروی مرحوم، مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم وغیرہ شریک ہوئے اس کا سارا انتظام خود طلبائے قدیم نے اپنی جیب سے پورا کیا تھا۔ ایک وقت طلبائے قدیم نے طلبائے جدید کو دعوت دی اور دوسرے وقت طلبائے جدید کی طرف سے طلبائے قدیم کی دعوت ہوئی۔ دعوت کے بعد ایک استقبالیہ جلسہ ہوا جس میں کچھ طلبہ نے تقریریں کیں اور کچھ نے تہنیتی نظمیں پڑھیں، راقم الحروف نے بھی فارسی میں ایک تہنیتی نظم پڑھی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا ؏

العجب از دید یارانِ قدیم
در نمی گنجد بخود ہر کس کہ دید

اس شعر کو حضرت سید صاحبؒ نے دوبارہ پڑھوایا اور پھر یہ چیز ان سے مزید تعارف کا سبب بنی۔ ندوہ کی زندگی کے پانچ سال میں اور بھی کئی مواقع حضرت سید صاحبؒ سے تعارف کے آئے مگر ان کی تفصیل بہت زیادہ ہے۔

اس لئے چھوڑتا ہوں، سنہ ۱۹۴۲ء میں ہم لوگ فضیلت کے پہلے سال میں تھے، گرمی کی چھٹی میں تین چار ساتھیوں نے طے کیا کہ چھٹی کے کچھ دن دارالمصنفین چلکر حضرت سید صاحب کی خدمت میں گزارے جائیں اور ان سے حجۃ اللہ البالغہ اور الفوزالکبیر کے کچھ اسباق تبرکاً پڑھے جائیں چنانچہ مولوی معین اللہ ندوی، اقبال انصاری ندوی، اقبال کشنوی ندوی، اور مولوی عبدالغفار خاں ندوی اور راقم الحروف نے اس کے لئے رخت سفر باندھا اور ہم لوگ پروگرام کے مطابق دارالمصنفین پہنچ گئے، اور کتب خانے کے مشرقی جانب کچے بنگلے میں ٹھہرا دیئے گئے، اور دوسرے دن ناشتہ کے بعد حجۃ اللہ البالغۃ اور الفوزالکبیر کا سبق بھی شروع ہو گیا، ہمارے دوسرے ساتھی تو دس دن بعد واپس چلے گئے، مگر راقم الحروف بیس دن ٹھہرا رہا پہلے لوگ دارالمصنفین کے مہمان تھے مگر جب میں تنہا رہ گیا تو سید صاحب نے اپنا مہمان بنالیا، ناشتہ تو ساتھ ہوتا تھا البتہ کھانا نوکر کمرہ میں پہنچا جاتا تھا۔ اس مدت میں سید صاحب کے سامنے عبارت عام طور پر مولانا عبدالغفار صاحب ندوی پڑھتے یا راقم الحروف۔

سید صاحبؒ کی خدمت میں یہ چند دن کی حاضری نہ صرف علمی لحاظ سے مفید رہی بلکہ اپنی علمی زندگی کی سمت بھی انہی چند دن میں متعین ہو گئی، ورنہ نہ جانے کس کس وادی میں ہم لوگ بھٹکتے رہتے۔

اس کے بعد ڈیڑھ سال تک ندوہ میں اور رہنا ہوا مگر سید صاحب سے مزید قرب کی کوئی صورت نہیں پیدا ہوئی الا یہ کہ سنہ ۱۹۴۳ء میں طلبہ کو نگراں سے کوئی شکایت پیدا ہوئی جس کی تلافی کی کئی صورتیں ذمہ داران ادارہ نے اختیار کیں، انھیں میں ایک تجویز مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم نے سید صاحب کے سامنے یہ پیش کی کہ کچھ سنجیدہ طلبہ کو بھی نگراں کا معاون مقرر کر دیا جائے چنانچہ بارہ طلبہ نقیب دارالاقامہ بنائے گئے چھ پچھمی حصہ کے لئے، اور چھ پوربی حصّہ کے لئے، جن میں ایک راقم الحروف بھی تھا جسے نقیب صلوٰۃ مقرر کیا گیا تھا مگر اس سے کوئی سدھار کیا ہوتا اور بگاڑ پیدا ہوا، اس لئے کہ غلطہ قریش کی حکومت تھی چنانچہ طلبہ سے یہ حق لے لیا گیا، اس کے نتیجہ میں زبردست اسٹرائک ہوئی جن میں کئی درجن طلبہ نکالے گئے، اور مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی مرحوم اور ایک دو اساتذہ کو ندوہ سے علیحدہ کر دیا گیا اور مولانا علی میاں نے خود تدریس سے معذرت کرلی، اس مدت میں کئی بار طلبہ کا جو وفد سید صاحبؒ سے ملا اس میں عام طور پر علی احمد کہانی مرحوم صادق اللہ بہاری کے علاوہ مولوی عبدالغفار صاحب ندوی اور راقم الحروف اور بعض دوسرے طلبہ بھی پچھلے کہار کی ہکاری بھرنے والوں میں رہتے تھے، ایک بار طلبہ کا وفد مہمان خانے میں سید صاحب سے ملنے گیا تو سید صاحب نے فرمایا کہ میں تم لوگوں سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا، علی احمد کہانی مرحوم نے کہا کہ حضرت ہم لوگوں کی بات اور تکلیف تو آپ کو ضرور سننی چاہیئے مگر حضرت سید صاحبؒ سخت بیزاری کا اظہار فرماتے

رہے اس پر علی احمد مرحوم نے کہا کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں معمولی لوگ بھی اپنی بات کہہ ڈالتے تھے، اس لیے اس اسوہ کے تحت ہماری بات آپ کو ضرور سن لینی چاہیئے، اس فقرے پر حضرت سید صاحبؒ کا دل پسیج گیا اور فرمایا کہ کہو کیا بات کرنی ہے؟ علی احمد مرحوم نے طلبہ کی صفائی میں کچھ باتیں کیں مگر سید صاحبؒ اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور نتیجہ وہی ہوا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد بڑے لڑکوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی اس لئے اس میں سے کچھ طلبہ دارالعلوم کی عمارت میں منتقل کر دیئے گئے، جن میں ہم لوگ بھی تھے، ایک اور چیز حضرت سید صاحب کی خدمت میں پہنچنے کا ذریعہ بنی، وہ یہ کہ ایک دن عشاء کے وقت میں اور میرے ساتھی وصی مظہر وضو کرتے ہوئے ایک نحو کے مسئلہ پر بحث کر رہے تھے، سید صاحب مہمان خانے کی طرف والے دروازے سے مسجد میں داخل ہوئے اور ان کے کان میں ہم لوگوں کی بحث پڑ گئی، عشاء بعد مولانا ناظم صاحب ندوی جو دارالاقامہ کے نگراں تھے ان سے پوچھا کہ کون لڑکے آج نحو کے مسئلہ پر بات چیت کر رہے تھے، بہت دنوں کے بعد ندوہ کے طلبہ میں علمی مسئلہ پر گفتگو سنی ہے ورنہ یہاں تو عموماً سیاست و صحافت پر گفتگو ہوتی ہے، مولانا ناظم صاحب نے پتہ لگا کر ہم لوگوں کو بلایا اور صبح سید صاحب کے سامنے پیش کیا، سید صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمیشہ آپس میں اپنے درس اور کتابوں کی بات کیا کرو سیاست کمبخت میں طلبہ کا پڑنا مناسب نہیں ہے، اس سے ان کا سراسر نقصان ہوتا ہے میں چاہتا ہوں کہ بچوں میں علمی و دینی ذوق پیدا ہو سیاسی اور سطحی اور محض صحافتی ذوق نہ پیدا ہو۔

راقم الحروف فضیلت کے آخری درجہ کا امتحان دے رہا تھا صرف ایک پرچہ باقی تھا کہ مجھے درد گردہ ہو گیا، پرچہ کئی دن کے وقفہ کے بعد تھا، درد گردہ کی تکلیف تو ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم کے علاج کے بعد ختم ہوئی مگر کمزوری باقی تھی، آخری پرچہ دیوار کے سہارے تکیہ لگا کر لکھنے کی مجھے اجازت ملی اس درمیان میں حضرت سید صاحبؒ کا ایک پوسٹ کارڈ دارالمصنفین سے آیا جس میں تحریر تھا کہ عزیزم! تم امتحان ختم کر کے سیدھے دارالمصنفین چلے آؤ، تم مجھے قرآن سناؤ اور میں تمہیں قرآن پڑھاؤں۔ قرآن سنانے کا مطلب تراویح میں قرآن سنانا تھا اور سید صاحب رمضان میں خاص طور پر ظہر بعد قرآن پاک کا درس دیا کرتے تھے، قرآن پڑھانے سے ان کی مراد یہی تھی میں نے جواب میں سید صاحبؒ کو لکھا کہ درد گردہ کا دورہ پڑ گیا ہے اس لئے میں سیدھے اپنے گھر غازی پور جا رہا ہوں، ہفتہ عشرہ میں جب کمزوری دور ہو جائے گی تو حاضر خدمت ہوں گا۔

جب پندرہ دن بعد میں نے حضرت سید صاحبؒ کو خط لکھا کہ اب میں اچھا ہو گیا ہوں، آپ جب فرمائیں میں حاضر ہو جاؤں، خلاف توقع سید صاحبؒ کا خط آیا کہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تم میرے

مشوروں پر عمل کرنا نہیں چاہتے، اس صورت میں کیسے یہاں آنے کے لئے لکھوں"۔

یہ خط میرے لئے ایک شدید دھچکا تھا، میں نے اسی وقت جواب میں لکھا کہ میں نے آپ کے حکم ہی کی وجہ سے مولانا علی میاں کے اس خط کا جواب نہیں دیا۔ جو انھوں نے لکھا تھا کہ سو روپے ماہوار (۱۹۴۲ء کا سو روپے) پر ایک جگہ مل سکتی ہے، جانا ہو تو لکھو، سید صاحبؒ کے خط میں یہ خط رکھ کر میں نے بھیج دیا، یہ خط پاکر سید صاحبؒ خوش ہو گئے، اور مجھے لکھا کہ تم میرے دوسرے خط کا انتظار کرو آخر میں یہ مصرع لکھا تھا ؏

وفاداری بشرط استواری عین ایمان ہے

ایک ہفتہ بعد دوسرا خط پہنچا کہ بحیثیت رفیق تمہارا تقرر ہو گیا ہے، فی الحال تم کو ۲۵ روپے ماہوار بطور وظیفہ ملیں گے میں نے والد صاحب سے مشورہ کیا، انھوں نے فرمایا کہ سو روپے کے بجائے تم ۲۵ روپے قبول کرلو مستقبل میں یہ تمہارے لئے مفید رہے گا۔

چنانچہ میں دو تین دن بعد دار المصنفین حاضر ہو گیا، میری حاضری کے دوسرے دن حضرت سید صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت آمنہؓ پر ایک مضمون لکھ کر دکھاؤ۔

حضرت سید صاحب کا طریقہ تربیت: بحمد اللہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ کی صحبت کی وجہ سے تاریخ اور رجال وطبقات کی کتابوں کا علم بالفہرست پہلے تھا اس لئے میں نے ان کے صفحات الٹنے شروع کر دیئے اور ایک ہفتہ بعد تقریباً ۱۰-۱۲ صفحے کا ایک مضمون لکھ کر حضرت سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا، مضمون میں میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ حضرت عبد اللہؓ کی شادی کے وقت عمر ۲۲ سال تھی، سید صاحب جب اس جملہ پر پہنچے تو فرمایا کہ حضورؐ کے والد محترم کی عمر کے بارے میں جو تم نے لکھا ہے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، میں نے عرض کیا کہ طبقات ابن سعد میں ہے، انھوں نے کہا لاؤ، اب طبقات دیکھا تو ندارد، اس وقت ٹال گیا مگر کچھ دیر بعد حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ حوالہ لائے نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ وہ تو نہیں مل رہا ہے، فرمایا تم نے یہ بات قیاس سے لکھ دی ہے! پھر فرمایا تم نے تاریخ نویسی کے بجائے تاریخ سازی کر ڈالی، اگر قیاس و قرائن سے کوئی بات لکھنی ہو تو جزم ویقین کے انداز سے نہیں لکھنا چاہیئے بلکہ یوں لکھنا چاہیئے کہ ان واقعات اور قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی عمر شادی کے وقت اتنی رہی ہوگی۔ یہ ایک ایسی تنبیہ تھی جس سے راقم الحروف نے اپنی پوری علمی زندگی میں فائدہ اٹھایا۔

ایک بار راقم الحروف نے ایک مضمون "ہندوستان کے چند نو مسلم اکابر" کے سلسلہ میں لکھا، یہ پورا مضمون بیس پچیس صفحے کا رہا ہوگا۔ اتفاق سے سید صاحب کسی سفر پر گئے ہوئے تھے اور "معارف" شاہ معین الدین مرحوم دیکھ رہے تھے میں نے ان کو مضمون دکھلایا تو انھوں نے فوراً کاتب کے حوالہ کر دیا، مضمون لکھ کر آ گیا، کاپی کی تصحیح ہو گئی

پروف دیکھا جا چکا کہ سید صاحب سفر سے واپس تشریف لائے اور شاہ صاحب سے پوچھا کہ کون کون سے مضامین اس ماہ کے پرچے میں جا رہے ہیں؟ شاہ صاحب نے بتایا جب میرے مضمون کا ذکر آیا تو اسے منگایا اور ایک نظر ڈال کر فرمایا کہ اس مضمون کو روک دیجیے، کچھ دیر بعد شاہ صاحب نے مجھے بتایا کہ تمہارا مضمون سید صاحب نے روک دیا ہے، جوانی میں چھپنے چھپانے کا شوق ہوتا ہے اس کی وجہ سے قدرے تکلیف ہوئی پہلا مضمون معارف میں چھپنے جا رہا تھا مگر بحمد اللہ کوئی کدورت دل میں نہیں پیدا ہوئی۔ دوسرے دن سید صاحب نے بلایا اور فرمایا کہ تمہارا مضمون (یہ ذہن میں رہے کہ سید صاحب رفقا یا طلبہ کو کبھی تم کہہ کر شاید ہی مخاطب کرتے ہوں، احتراماً میں تم کا لفظ استعمال کر رہا ہوں) میں نے روک دیا ہے، یہ موضوع بہت وسیع ہے، اس پر اور پڑھو اور جس موضوع پر لکھنا ہو تو اتنا پڑھو کہ جس طرح پیالہ بھر جانے کے بعد چھلکنے لگتا ہے اسی طرح معلومات چھلکنے لگیں پھر لکھنا شروع کرو۔ چنانچہ میں نے پڑھنا شروع کیا تو صرف سرمد (جو نومسلم تھے) پر تین قسطوں میں ۵۰۔ ۶۰ صفحے کا مضمون لکھا اور اضافہ کے بعد سوا سو صفحے کی کتاب بن گئی، جس وقت معارف میں یہ مضمون شائع ہو رہا تھا اس وقت سید صاحب بھوپال میں تھے، وہاں سے انھوں نے ہمت افزائی کا خط لکھا۔

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں سید صاحب کو گجرات کے کئی مدرسوں کی طرف سے دعوت نامہ ملا، سید صاحب نے سفر کا ارادہ فرمالیا اور مجھے خادم کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر ان کی عادت مبارکہ حکماً کچھ کہنے کی نہیں تھی، عصر بعد ہم لوگ جب ان کی مجلس میں بیٹھے تو مزاحاً فرمایا کہ اگر لال پیلی زمین اور مختلف تہذیب کے لوگوں کو دیکھنا چاہو تو میرے ساتھ چلو، میرے لئے اس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی تھی میں نے عرض کیا کہ سفر میں آپ کی خدمت کی سعادت حاصل ہو جائے یہ میری خوش قسمتی ہے۔

دوسرے دن ہم لوگ لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گئے اور پھر تیسرے دن وہاں سے بمبئی، سید صاحب نے اسٹیشن پر مولانا عمران خاں صاحب سے فرمایا کہ بمبئی کے لئے دو ٹکٹ سکنڈ کلاس کے خرید لیجیے، مگر مولانا عمران خان صاحب نے کفایت کی وجہ سے ایک ٹکٹ سکنڈ کلاس کا لیا اور دوسرا سرونٹ کلاس کا اس وقت فرسٹ کلاس اور سکنڈ کلاس کے ساتھ سرونٹ کے لئے ایک مختصر سا حصہ اسی ڈبہ سے لگا رہتا تھا۔ سید صاحب کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ تم میرے ساتھ ہی سکنڈ کلاس میں بیٹھنا، جب ہم لوگ جھانسی سے آگے پہنچے تو کچھ پڑھے لکھے لوگ ڈبہ میں آئے جو سید صاحب کو صورت سے نہیں نام سے جانتے تھے، انھوں نے آہستہ سے پوچھا کہ یہ کون صاحب بیٹھے ہیں؟ میں نے اپنے جذبۂ احترام اور عظمت کی بنا پر کافی القاب و آداب کے ساتھ حضرت سید صاحب کا نام بتایا کچھ دیر بعد جب وہ حضرات اتر گئے تو حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ دیکھو راستہ میں زیادہ لمبا چوڑا تعارف نہ کرایا کرو، بس نام بتا دینا کافی تھا، دوسرے دن ہم لوگ بمبئی پہنچے، اسٹیشن پر حاجی عبدالرحمٰن صاحب، نجیب اشرف صاحب،

ندوی وغیرہ موجود تھے، ہم لوگ بمبئی میں حاجی عبدالرحمٰن صاحب کے مہمان ہوئے، وہاں ایک دن رہ کر دوسرے دن گجرات کی روانگی اور تقریباً ایک ہفتہ سورت اور راندیر وغیرہ میں قیام رہا، ایک ہفتہ کے قیام میں کئی باتیں یا کئی لطیفے قابل ذکر ہیں۔ جس زمانہ میں یہ سفر ہوا اس زمانہ میں راقم الحروف تبع تابعین میں امام محمد بن حسن شیبانیؒ کے حالات لکھ رہا تھا، دارالمصنفین کے کتب خانہ میں امام محمدؒ کی کتاب الآثار موجود تھی جن میں ان کے بارہ شیوخ حدیث کا ذکر ہے مگر ان کی کتاب الحج جن میں ایک سو سے زیادہ شیوخ کا ذکر ہے، یہاں موجود نہ تھی، سورت میں مولانا مفتی مہدی حسن صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں کتاب نظر آئی تو میں نے نوٹ تیار کرنا شروع کر دیا اور ان کے کتب خانہ کی دوسری کتابیں بھی دیکھتا رہا، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مرحوم اس وقت ڈابھیل میں موجود تھے اور سید صاحب کی آمد کا سنکر سورت آگئے تھے، میرا انہماک دیکھ کر مولانا نے مجھ سے دارالمصنفین کے کتب خانے کے بارے میں پوچھنا شروع کیا کہ فلاں فلاں کتاب وہاں موجود ہے؟ میں ہاں یا نہیں میں جواب دیتا رہا، پھر یکایک انہوں نے پوچھا کہ آپ کے کتب خانہ میں بیضاوی کا متن ہے؟ میں اس اصطلاح سے اس سے پہلے واقف نہیں تھا اس لئے جواب میں ہچکچایا، یہ بات حضرت سید صاحب کے سامنے ہو رہی تھی، سید صاحب نے جب میری ہچکچاہٹ دیکھی تو فرمایا کہ یہ تو ان کے سینے میں بھی ہے (میرے حفظ کی طرف اشارہ فرمایا) اتفاق کی بات کہ اسی مجلس میں مولانا کی زبان سے ابن خلّدون تشدید کے ساتھ نکلا اور المخصص لابن سیدہ کو انھوں نے بالتشدید کہا، میں نے کہا کہ ابن خلدون تشدید کے بغیر پڑھا جاتا ہے اور اسی طرح ابن سیّدہ نہیں بلکہ ابن سیدہ ہے، ابن خلدون کے بارے میں میں نے عرض کیا مغرب میں اس وزن پر بہت سے نام ہوتے تھے، مولانا نے فرمایا جیسے میں نے عرض کیا، فرحون، زیدون، سحنون وغیرہ، مولانا بنوری نے سید صاحب کی طرف رجوع کیا، سید صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ انھوں نے تو ارتجالاً آپ سے بدلہ چکا لیا، مولانا یوسف صاحب مرحوم بڑے ذی علم آدمی تھے، ان کے مقابلہ میں میری کوئی حیثیت نہیں تھی، مگر ابھی وہ جوان تھے اور میں نوجوان اس لئے یہ علمی لطیفہ پیش آیا۔ استاد محترم شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم اور سید صاحبؒ ناموں کے صحیح تلفظ کا بڑا اہتمام فرماتے یہ انہی کی صحبت کا اثر تھا، سورت اور راندیر میں ہفتہ دس دن قیام رہا، وہاں کھانا عموماً بغیر مرچ بے مزہ پکتا ہے اور کھانے پر جیلی وغیرہ قسم کی چیزوں سے دسترخوان بھرا رہتا تھا مگر اپنے مذاق کی چیزیں بہت کم ہوتی تھیں اس لئے میں برائے نام کھاتا تھا، سید صاحب فرماتے تھے کہ تم کو اگر کچھ دن اور رہنا ہوا تو چارپائی پکڑ لوگے۔

جس دن وہاں سے روانگی تھی کچھ لوگ میرے کمرہ میں آئے اور ایک جوڑہ کپڑا اور پچیس روپے نقد میرے سامنے رکھ دیئے، میں نے کہا کہ اگر یہ مدد ہے تو مجھے اس کی ضرورت نہیں اور اگر یہ ہدیہ ہے تو اس کے

لئے تعلق شرط ہے، یہ بیچارے بڑے نادم ہوئے اور یہ چیزیں لئے ہوئے سید صاحبؒ کی خدمت میں گئے اور میری بات نقل کی، سید صاحبؒ نے روپیہ اور کپڑا لے لیا اور اپنے بکس میں رکھوا دیا جس کا مجھے کوئی علم نہیں ہوا جب ہم لوگ واپس لکھنؤ پہنچے تو سید صاحبؒ خریداری کے لئے بازار گئے، اس زمانہ میں مولانا عمران خاں صاحب نے شہر جانے کے لئے ایک چھوٹا تانگا اور ایک گھوڑی رکھ چھوڑی تھی ہم لوگ اس پر سوار ہو کر نظیر آباد کے بجائے لاٹوش روڈ ہوتے ہوئے امین آباد جا رہے تھے، لاٹوش روڈ کے چڑھاؤ پر گھوڑی اڑ گئی خان صاحب خود ہی ہانک رہے تھے اس لئے انھوں نے لگام کھینچی کھانچی مگر گھوڑی ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی ادھر سے ایک تانگے والا اپنا تانگہ لئے ہوئے گزرا جب یہ صورت اس نے دیکھی تو زور سے بولا میاں چابک کا سہارا لیجئے چابک کا سہارا، یہ فقرہ سنکر سید صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ خاں صاحب یہ لکھنؤ ہے لکھنؤ اب جلدی چابک لگائیے، اس پر بڑی ہنسی ہوئی۔

سید صاحب ایک کپڑے کی دوکان پر تشریف لے گئے اور بچوں کے لئے کچھ خریداری شروع کی اور مجھ سے فرمایا کہ تم بھی کچھ بیوی کے لئے خریدو، میں نے عرض کیا کہ مجھے کچھ نہیں لینا ہے، فرمایا کہ نہیں کچھ خریدو چنانچہ انھوں نے خریدوایا اور اپنے پاس سے قیمت ادا کی اور فرمایا کہ یہ وہی روپیہ ہے جو تم کو دیا جا رہا تھا، ابھی نئے نئے نکلے ہو مولویت ابھی نہیں آئی، ہدیہ واپس نہیں کرنا چاہیئے میرے واسطے تم سے بھی تعلق ہو گیا تھا۔

واپسی میں جب ہم لوگ بمبئی آئے تو میں نے سید صاحبؒ سے عرض کیا کہ علامہ شبلیؒ نے ساحل سمندر چوپاٹی کا ذکر بہت کیا ہے، ذرا وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں، سید صاحب نے ابراہیم عجاوی صاحب ندوی سے فرمایا کہ ان کو چوپاٹی دکھائیے، چنانچہ وہ مجھے بس سے لے گئے اور دیر تک اس کی سیر کرائی، کچھ دیر بعد سید صاحب بھی حاجی عبدالرحمن کی کار سے پہنچ گئے۔ اور پھر دیر تک ہم لوگ وہاں رہے اور سید صاحبؒ نے علامہ شبلیؒ کے بعض اشعار کا شان نزول بھی بتایا۔

سنہ ۴۶ء میں سید صاحب بھوپال چلے گئے، اور اسی زمانہ میں میرا مضمون "فتاویٰ عالمگیری اور اس کے مؤلفین شائع ہونا شروع ہوا، وہاں سے انھوں نے لکھا کہ "یہ مضمون میرے پیش نظر تھا تم نے اسے پورا کر دیا۔ جس سے خوشی ہوئی"۔ سید صاحبؒ نے شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی اس میں شرکت کی طرف راہنمائی فرمائی تھی۔ انفاس العارفین دیکھی تو اس پر سید صاحب کا نوٹ موجود تھا، ایک بار میں نے بھوپال خط لکھا کہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں فلاں فلاں کتابوں کے نسخے بہت بوسیدہ ہو گئے ہیں، ان کا دوسرا نسخہ منگانا چاہیئے اور فلاں فلاں کتابیں آنی چاہئیں، سید صاحب نے تحریر فرمایا کہ مولانا مسعود علی صاحب سے کہکر جو کتابیں چاہو منگالو، چنانچہ بیسوں کتابیں منگائی گئیں۔

سید صاحب اکثر فرماتے کر فلاں کتاب میں فلاں مسئلہ نکال کر لاؤ، ہم لوگ نکال کر لاتے اور وہ اپنے کام میں مشغول ہو جاتے، کتاب نکال کر ادباً کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ نکال کر لائے ہیں، بسا اوقات آدھ آدھ گھنٹہ ہم لوگ کھڑے رہتے، جب وہ گردن اٹھاتے اور دیکھ لیتے تو فرماتے کر لائے؟ اس وقت ہم لوگ دکھاتے۔

دار المصنفین آنے پر دو تین مہینے بعد میں نے سید صاحب کو ایک درخواست دی کہ میں دوبارہ ندوہ جا کر تکمیل کرنا چاہتا ہوں، انھوں نے درخواست لے لی اور دوسرے دن بلایا اور سوال فرمایا کہ کیوں ندوہ واپس جانا چاہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ بہت سی کتابیں پڑھنی رہ گئی ہیں، یہاں معلومات تو وسیع ہو رہی ہیں مگر استعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے، فرمایا کیا کتابیں نہیں پڑھی ہیں؟ عرض کیا کہ اصول فقہ میں نور الانوار پڑھی، اس سے پہلے اصول فقہ کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی اس لئے سمجھ میں نہیں آئی اور ہدایہ وغیرہ بھی اچھی طرح نہیں پڑھ سکا ہوں، فرمایا کہ ہدایہ کا مطالعہ کرو جہاں بات سمجھ میں نہ آئے پوچھو اور مسلم الثبوت نکالو، میں نے نکالی دو چار دن اس کو پڑھایا، اس کے بعد فرمایا کہ صرف پڑھتے رہنے سے علم نہیں آتا، خود مطالعہ کرو تو اعتماد پیدا ہوگا۔

میرے اس وقتی جوش کے رخ کو اس طرح سید صاحب نے پھیر دیا۔ ایک بار اضافہ تنخواہ کی درخواست دی، غالباً دس روپے کا اضافہ فرما دیا اور پھر بلا کر کہا زندگی میں سکون آمدنی بڑھانے میں نہیں بلکہ خرچ پر کنٹرول کرنے سے حاصل ہوتا ہے، آمدنی بڑھانا آسان مگر خرچ قابو میں رکھنا مشکل ہے۔ فرماتے تھے کہ ارض القرآن میں نے نوجوانی میں بڑی محنت سے لکھی ہے مگر جدید معلومات اور اکتشافات کی روشنی میں اس پر حاشیہ لکھنے کی یا پھر الگ سے تیسری جلد لکھنے کی ضرورت ہے، راقم الحروف اس پر کچھ کام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فرماتے تھے کہ سیرت نبویؐ تو دوسری جلد تک ختم ہو گئی، مگر سیرت نبویؐ کے ساتھ ساتھ تعلیمات نبویؐ کا پڑھنا بھی مسلمانوں کے لئے ضروری ہے، میں نے سیرت کی کئی جلدیں اس لئے لکھی ہیں کہ سیرت نبوی کے ساتھ لوگ مکمل تعلیمات نبوی بھی پڑھ ڈالیں، اگر یہ چیز دوسرے نام سے لکھی جائے تو اتنی عقیدت سے لوگ نہیں پڑھیں گے مگر افسوس ہے کہ تعلیمات نبوی کا سب سے اہم حصہ مکمل نہ ہو سکا اور میری صحت اس قابل نہ رہی، فرماتے تھے کہ آدمی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک ماتحت رہ کر اچھا کام کرتے ہیں، اور دوسرے آزاد رہ کر اچھا کام کرتے ہیں، اس کی نشاندہی کر کے یہ بات فرماتے تھے مگر نام کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔

ابوالعرفان ندوی★

دید و شنید

سب سے پہلے حضرت سید صاحبؒ کو ۳۷ء میں مجھے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اور آخری بار مارچ ۵۳ء میں دیکھا۔ اس سولہ برس کی مدت میں ان کی مجلس سے جو کچھ اپنی کم سوادی کے باوجود مجھے فوائد پہنچے ہیں وہ آج بھی میرے علمی مطالعہ کے لئے مشعل راہ ہیں۔

دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ سے پہلے جب میں نے پہلی بار حضرت سید صاحب کو دیکھا ہے تو یہ جان کر کہ ہم لوگ نحو کی مشہور کتاب شرح جامی پڑھ رہے ہیں۔

فرمایا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کلام پاک میں روزہ کی فرضیت کی آیت میں ایاماً معدودات ہے اور چونکہ ایام جمع قلت ہے اس لئے روزہ پورے ایک مہینہ کا فرض نہیں ہے۔ بلکہ صرف ۹ دن کا روزہ فرض ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ بات غلط ہے اس لئے کہ جمع قلت و جمع کثرت کا لحاظ وہاں ہوتا ہے جہاں کسی لفظ کی دو جمع ہوں، اور چونکہ یوم کی ایک جمع ایام ہے اس لئے اس میں جمع قلت و کثرت کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ مزید فرمایا کہ آگے آیت میں ہے، فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ جس سے استیعاب مطلوب ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت طالب علم جب میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو ایک بار درجہ میں تشریف لائے، اتفاق ایسا کہ فلسفہ کی کتاب میبذی کا سبق ہو رہا تھا اور فلسفہ کی مشہور بحث زیر درس تھی، وکل حادث زمانی فھو مسبوق بمادۃ ومدۃ۔ دوران سبق سید صاحب نے فرمایا کہ فلاسفہ زمانہ اور مادہ کو قدیم مانتے ہیں اور اس کی دلیل یہی دیتے ہیں، زمانۂ طالب علمی کی یہ بات میرے ذہن میں قائم رہ گئی اور بعد میں فلاسفہ کے آراء و خیالات کے سلسلہ سے سید صاحبؒ کا یہ افادہ میرے لئے راہ نما تھا۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ فلسفہ کی کتابوں میں ہیولے سے پہلے جزء لا یتجزی (جوہر فرد) کے ابطال و تردید کی بحث اس لئے آتی ہے کہ بغیر جوہر فرد کی تردید کے ہیولا کا اثبات ممکن نہیں ہے اور چونکہ ہیولا اور مادہ ماننے کے بعد لازماً اس کو قدیم ماننا پڑے گا اس لئے متکلمین اسلام ہیولا کا انکار کرتے ہیں اور جوہر فرد کو مانتے ہیں، اور پھر فرمایا یونان کا

★ عمید کلیۃ الشریعۃ واصول الدین دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

مشہور فلسفی دیمقراطیس بھی جوہر فرد کا قائل ہے، لیکن متکلمین اسلام اور دیمقراطیس کی رایوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ متکلمین کا جوہر فرد مخلوق ہے اور حادث ہے اور دیمقراطیس کا جوہر فرد خالق ہے اور قدیم ہے۔

عالم کے حادث و قدیم ہونے کا مسئلہ مذہب و فلسفہ دونوں جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اہلِ مذہب عالم کو مخلوق و حادث اور زوال و فنا کے قابل مانتے ہیں۔ لیکن فلاسفہ کے نزدیک عالم قدیم ہے۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ عالم کو قدیم ماننے میں اللہ تعالیٰ کو صاحبِ ارادہ اور صاحبِ اختیار نہیں مانا جا سکتا ہے اور اسی طرح مستقبل میں عالم کو فنا کرنے کی اللہ تعالیٰ کو قدرت نہیں ہوگی، اور چونکہ یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ارادہ و اختیار کے خلاف ہیں اس لئے عالم کو قدیم ماننا شرعی حیثیت سے صحیح نہیں، اور پھر فرمایا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ حوادث لا اول لہا کے قائل ہیں جو ایک درجہ میں قدمِ عالم کے نظریہ کے قریب ہے۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کو صاحبِ ارادہ و صاحبِ اختیار مانتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ شیخ الاسلام کے تفردات میں ہے۔

فلسفہ کے مہمات مسائل میں ایک مسئلہ ربط الحادث بالقدیم کا ہے۔ یعنی جب فلاسفہ کے اصول کے مطابق علت العلل قدیم ہے اور علت و معلول میں تخلف نہیں ہوتا ہے۔ تو سلسلہ موجودات میں حادث و متغیر اشیاء کا وجود کیسے ہوا۔ سید صاحبؒ نے ایک بار فرمایا کہ ربط الحادث بالقدیم کی توجیہ فلاسفہ حرکتِ افلاک سے کرتے ہیں۔ متکلمینِ اسلام اللہ تعالےٰ کے ارادہ و اختیار سے کرتے ہیں۔ اور عقیدہ وحدۃ الوجود بھی درحقیقت اسی سوال کا جواب ہے۔ یعنی جب موجودِ حقیقی ایک ہی ہے تو پھر حادث و قدیم کے درمیان ربط کی توجیہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ابو البرکات بغدادی کی کتاب "المعتبر" فلسفہ کی بہت معیاری کتاب ہے، اور صاحبِ کتاب نے ارسطو اور بو علی سینا کی بہت سی آراء کی تردید کی ہے۔ میبذی جو نصابِ درس کی ایک مشہور کتاب ہے اس کے متعلق فرمایا کہ یہ کتاب اصلاً ردِ فلسفہ کی ہے، اور اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اگر کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو کتاب کو سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں ہوگی۔

زمانہ کا مسئلہ بھی فلسفہ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک زمانہ ایک ثابت اور موجود حقیقت ہے۔ زمانہ کی جو حقیقت فلاسفہ بیان کرتے ہیں اس کی بنیاد پر زمانہ کو قدیم ماننا ضروری ہے۔ چونکہ متکلمینِ اسلام اللہ تعالےٰ کی ذات کے علاوہ کسی موجود کو قدیم نہیں مانتے ہیں اس لئے ان کے یہاں زمانہ کا حقیقی وجود نہیں ہے۔ بلکہ وہمی وجود ہے۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث "لاتسبوا الدھر، فانَّ الدھر انا" کے پیشِ نظر کیوں یہ نہ کہا جائے کہ زمانہ نام ہے استمرارِ وجودِ باری کا۔ اس سلسلے سے سید صاحب نے دار المصنفین میں علامہ ابن قیم کی کتاب شرح حدیث النذور کی بعض عبارتیں مجھ سے پڑھوائیں جس سے سید صاحب کے اس خیال کی تائید ہوتی تھی۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ امام غزالیؒ اور امام رازیؒ نے یونانی فلسفہ کی بہت پُرزور تردید کی ہے۔ لیکن ان کی کتابوں سے فلسفہ کا رعب ذہن سے نہیں ختم ہوتا ہے۔ لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابوں کو پڑھنے سے فلسفہ اور فلاسفہ سے مرعوبیت بالکل ختم ہوجاتی ہے، اور اگر کسی کو فلسفہ کی حقیقت سمجھنا ہے تو اس کو چاہئے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی انگلی پکڑ کر ان کے ساتھ اس راہ سے گزر جائے۔

ایک بار فرمایا کہ یونانی فلسفہ درحقیقت یونانیوں کا علم الاصنام ہے۔ اس لئے یہ ان کا علم کلام ہے۔

سید صاحبؒ کا معمول تھا کہ رمضان شریف میں بعد نماز ظہر دارالمصنفین کی مسجد میں بعض رفقاء و متعلقین کو درس قرآن دیا کرتے تھے۔ ایک سال مجھے بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کے درس قرآن کا طریقہ تفسیر القرآن بالقرآن کا تھا۔ کسی آیت کی تفسیر و توضیح میں کلام پاک کی دوسری آیت وہ فوراً پڑھ دیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ کلام پاک میں کسی جگہ کسی مضمون کو اجمال و اختصار سے بیان کیا گیا ہے، اور دوسری جگہ شرح و بسط کے ساتھ۔ القرآن یفسر بعضہ بعضا، ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نماز میں امامت سے بچتا ہوں اس لئے کہ ایک آیت کے زبان پر آنے کے بعد اس کی ہم معنی دوسری آیت فوراً ذہن میں آجاتی ہے اور تشابہ لگ جاتا ہے۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ اشاعرہ معراج جسمانی کی دلیل سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ سے دیتے ہیں کہ عبد جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اشاعرہ کی دلیل صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ آیت قرآنی ہے یا أیتها النفس المطمئنّة ارجعی إلی ربّكِ راضیةً مرضیة، فادخلی فی عِبادی وادخلی جنّتی یہاں تنہا نفس کو بھی عبد کہا گیا ہے۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ یہ جو فقہاء کا اصول ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے یہ تو قیاس ہے، اور قیاس کی سند کتاب و سنت سے ہونی چاہئے۔ اس قیاس کی سند آیت قرآنی خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ہے۔ اس لئے جب یہ کہا جاتا ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے تو اشیاء سے مراد اعیان و ذوات ہیں۔ افعال و اعمال نہیں ہیں، ورنہ بدعات کو جو مسکوت عنہ ہیں جائز ماننا پڑے گا۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ جب حضرت تھانویؒ سے بیعت کا وقت آیا تو میں نے ان سے عرض کیا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابوں کا میں نے زیادہ مطالعہ کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ صرف اللہ اللہ کا ذکر مناسب نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ لفظ اللہ کے ساتھ کوئی صفت بھی لگائی جائے۔ حضرت تھانویؒ نے یہ سن کر فرمایا کہ آپ کے لئے کوئی شرط و قید نہیں ہے۔ آپ کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اللہ کا ذکر کریں، اور پھر اس کے بعد فرمایا کہ مجھے بعد میں ابوداؤد شریف میں ایک حدیث ملی جس میں مذکور ہے کہ قیامت اس وقت آئے گی جب زمین پر کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا۔ اس لئے اس وقت سے میری رائے بدل گئی ہے، اور اب میں اللہ اللہ کے ذکر کو صحیح سمجھتا ہوں۔

ایک بار درس قرآن کے وقت فرمایا کہ تم لوگوں کو میری ایک وصیت و نصیحت ہے کہ اہل سنت والجماعت کے آرا، و معتقدات سے انحراف نہ ہو، علمی و تحقیقی طور پر بھی ان کی رائیں صحیح ہیں۔

ایک بار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے افعال میں حکمت ضرور ہے۔ لیکن یہ کب ضروری ہے کہ ہم ہی اس کو جانیں۔ حکم و مصالح بہت سے لوگوں نے بیان کئے ہیں لیکن یہ ان کا اجتہاد و قیاس ہے۔ یہ کب ضروری ہے کہ ان کی بیان کردہ حکمتیں وہی ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہوں۔ البتہ بہت سے حکم و مصالح کی صراحت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ؐ میں ہے۔ ان کا ماننا ہمارے لئے ضروری ہے۔

ایک مجلس میں سوال فرمایا کہ مبذرین کو شیطان کا بھائی کیوں کہا گیا ہے۔ اور پھر خود ہی جواب میں فرمایا کہ بعد کی آیت میں اس کی وجہ ہے ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین وکان الشیطان لربہ کفورا۔ شیطان اللہ تعالیٰ کا ناشکر گذار ہے اور مبذر و مسرف بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو غلط جگہ میں صرف کر کے اس نعمت کا ناشکر گذار ہے۔

ایک مجلس میں فرمایا اشاعرہ کے کلامی عقائد میں اللہ تعالیٰ کی صفت حاکمیت کا زیادہ لحاظ ہے اور معتزلہ کے عقائد میں اللہ تعالےٰ کی صفت حکمت کا زیادہ لحاظ ہے اور اللہ تعالیٰ حاکم و حکیم دونوں ہی ہے۔

اشاعرہ و معتزلہ کے جس رجحان کا سید صاحب نے ذکر فرمایا اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو کسی کلامی مسئلہ میں یہ بات معلوم کی جا سکتی ہے کہ اس میں اشاعرہ کی کیا رائے ہونی چاہئے اور معتزلہ کی کیا۔

ایک مجلس میں فرمایا چشتی سلسلہ کا زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا زمانہ تھا۔ اس لئے ان کے سلسلہ کی توسیع و اشاعت پیش نظر رہی، اور نقشبندی حضرات کا زمانہ نظم و انتظام کا عہد تھا۔ اس لئے اس سلسلہ میں توسیع و اشاعت سے زیادہ اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ تصوف کو کتاب و سنت سے زیادہ سے زیادہ قریب کیا جائے، اس لئے جو تسامحات چشتی سلسلہ میں ملتے ہیں وہ ہمیں نقشبندی سلسلہ میں نہیں ملتے۔

علامہ سید سلیمان ندوی

ذاتی تجربات کی روشنی میں

سید حشمت علی★

قرنہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بوصہیب اندر خراسان یا اویس اندر قرن

علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا خداداد حسن وجمال کے ساتھ اسی قدر صاف اور پاکیزہ لباس اس حقیقت کی نشاندہی کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی قدر نورانی باطن بھی عطا فرمایا ہے۔

تبسم میں انتہائی متانت، تکلم میں انتہائی سلاست، بیان بلاغت آفریں، کلام فصاحت آگیں، بہر نوع خدائے عزوجل نے علامہ مرحوم کو جن صفاتِ عالیہ سے نوازا تھا ان صفات کے ساتھ عالی مرتبت اور عالی مقام ہستیاں صدیوں کے طویل انتظار کے بعد ہی اس عالم وجود میں رونما ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اعلیٰ حضرت نواب سر حمید اللہ خاں صاحب فرمانروائے بھوپال کیلئے فرمایا تھا کہ:۔

زمانہ با امم ایشیا چہ کرد و کند
کسے نہ بود کہ ایں داستان فرو خواند

تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است
ل تو بیند و اندیشۂ تو می داند

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

بلاشبہ نواب صاحب مرحوم اپنی فراست و دانائی کے لحاظ سے ایک منفرد شخصیت تھے، اور یہ ان کی نظرِ انتخاب تھی جس نے ہندوستان کی ممتاز ہستیوں کو اس چھوٹی سی ریاست میں جمع کر لیا تھا۔ اسی نظرِ انتخاب نے علامہ سید سلیمان صاحبؒ کو اس اسلامی ریاست کے عہدۂ قضا پر متمکن فرما دیا۔ اسی کے ساتھ جامعہ احمدیہ بھوپال جو درس نظامی کی یہاں سب اہم درسگاہ تھی سید صاحب کے نظم وضبط میں

★ سابق نائب مہتمم، دار العلوم تاج المساجد بھوپال

دے دی گئی۔ محکمۂ قضاء اور جامعہ احمدیہ کے ذریعہ سید صاحب مرحوم کا فیض جاری رہا۔ اسی کے ساتھ موتی مسجد بھوپال میں موصوف سلسلہ وار تفسیر قرآن حکیم بیان فرماتے تھے، اور اس نورانی مجلس سے اہل ایمان کو کتاب الٰہی سے وابستہ اور اس کے حقائق سے روشناس کرتے رہے۔ اہل نظر کی نظر میں سرزمینِ بھوپال پر علم و فضل کا ایک آفتاب طلوع ہوگیا تھا جس کی کرنیں بھوپال کے گوشہ گوشہ کو منور کر رہی تھیں۔

ایک خواب اور اس کی تعبیر : بھوپال میں ہفتہ وار دینی تبلیغی اجتماع بدھ کے روز ہوتا تھا ایک بزرگ عابد و ذاکر جن کا نام غالباً عبد الحی تھا جو محلہ ریت گھاٹ بھوپال میں رہتے تھے ان کے دونوں پیر مفلوج ہوگئے تھے ہر وقت کلمۂ طیبہ کا ورد اپنا معمول بنائے ہوئے تھے۔ ان بزرگ نے خواب دیکھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بدھ کے دن جب کہ اجتماع ہو رہا تھا جامع مسجد کے جنوبی دروازہ سے مسجد میں داخل ہوئے اور وسط صحن میں سے گذرتے ہوئے شمالی دروازہ پر پہونچ کر زینہ چڑھ کر بالائی حصہ میں پہونچے وہاں ایک وسیع کمرہ میں جلوہ افروز ہوگئے، لوگوں نے زیارت و ملاقات کا سلسلہ شروع کر دیا، اسی دوران دو انگریز شمالی دروازہ مسجد پر کھڑے نظر آئے وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ہم حضور سے ملنا چاہتے ہیں اجازت کے طالب ہیں، حضور نے اجازت دی اور دونوں کمرہ میں پہونچ گئے۔

عبد الحی صاحب کی فرمائش پر میں خواب کی تعبیر حاصل کرنے سید سلیمان صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خواب سن کر فرمایا کہ :

> "یہ خواب اس تبلیغی کام کی مقبولیت کی علامت ہے اور امید ہے
> کہ یہ کام اور یہ دینی دعوت بیرونِ ہند مغربی ممالک تک پہونچ جائے
> گی، خواب دیکھنے والے سے کہہ دیجئے کہ اپنے معمولات پر قائم رہیں۔"

قرآنی بصیرت : ایک روز سید صاحب اپنے دولت کدہ سے باہر کمرۂ اجلاس میں تشریف فرما تھے اور اہلِ عقیدت حاضرِ خدمت تھے کہ سید صاحب کے صاحبزادہ سلمان میاں تشریف لائے اور سوال کیا کہ ایک صاحب نے ریڈیو خریدا ہے اس پر کوئی کتبہ لگانا چاہتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ کیا لکھوائیں۔ سید صاحب نے بے ساختہ فرمایا کہ لکھ دیں :-

اَنطَقَہُ اللّٰہُ الَّذِیۡ اَنۡطَقَ کُلَّ شَیۡءٍ

ایک دعوت میں عدیم المثال شرکت : میری حقیقی بہن کی شادی تھی، اس سلسلہ تقریب میں دعوتِ ماحضر کا پروگرام بھی تھا، میں نے سید صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور دعوتِ ماحضر میں شرکت کی درخواست کی۔ فرمایا کہ معمول کے مطابق اس روز میرا روزہ ہوگا (غالباً یہ ایام بیض کے روزوں کا

سلسلہ تھا)، میں معذور تھا کہ سید صاحب کا عذر قبول کروں اور مجبور تھا کہ اپنی ناکامی پر صبر کروں ......

تقریب کا دن آگیا، مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی، اس مصروفیت کے عالم میں ناگہاں یہ نظر آیا کہ مجسم پاکیزگی اور سراپا نورانیت کا ایک پیکر علامہ سید سلیمان صاحبؒ تشریف لا رہے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے زائد خوشی کس بات پر تھی۔ اپنی حقیقی بہن کی شادی پر یا سید سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری پر۔

اس کے بعد تھوڑی دیر کرسی پر آرام فرمایا اس کے بعد کھانے کی ایک مجلس برخاست ہو کر دوسری مجلس شروع ہوئی تو سید صاحب بھی دسترخوان پر تشریف لے گئے۔ موصوف کے سامنے پلیٹ رکھ دی گئی، کھانے کے ڈونگے لائے گئے۔ اس وقت فرمایا کہ میرا روزہ ہے مگر مجھے روزے کے باوجود اس دعوت میں جس حد تک شرکت کرنا ممکن تھا اس کو میں نے نظر انداز نہیں کیا۔ مجھ جیسے حقیر و ناتواں کی دلجوئی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق دعوت کی پذیرائی اور حسن خلق کی اس عدیم المثال اثر انگیزی نے تمام مہمانوں کے دلوں پر عقیدت و محبت کی مہر ثبت کر دی۔

ایک سبق آموز واقعہ : جب ہندوستان آزاد ہوا اور ادھر پاکستان بنا تو ہزاروں لوگ اپنی جائدادیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اور ان کی متروکہ جائدادوں پر حکومتِ وقت نے قبضہ کر لیا۔ کچھ اسی قسم کی زمین و جائداد کا قصہ تھا۔ عدالتی تحقیقات ہونا تھی اور سید سلیمان صاحب ندوی قاضی بھوپال کے نام بھی سمن جاری ہوا جس میں ایک مقررہ تاریخ پر موصوف کو حاضری عدالت کا پابند کیا گیا...... بھوپال کے تمام حساس مسلمانوں کو یہ اندیشہ تھا کہ فضا مسموم ہے ہواؤں کا رخ بدلا ہوا ہے کہیں سید صاحب کے ساتھ کوئی توہین آمیز خطاب اور دل شکن طریقِ عمل نہ اختیار کیا جائے خود سید صاحب بھی متفکر تھے۔

بہرحال مقررہ تاریخ پر پیشی ہو گئی اس واقعہ کے چند روز بعد سید سلیمان صاحبؒ مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کے مکان پر تشریف فرما تھے چند عقیدت مند موجود تھے میں بھی ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا تھا۔

سید صاحب نے فرمایا کہ عدالت میں میری طلبی ہوئی۔ موتی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد میں نے دعا مانگی کہ اے اللہ مجھے جج سے مرعوب نہ فرمانا بلکہ جج کو مجھ سے مرعوب فرما دیجئے گا اور عدالت جانے کے لئے روانہ ہو گیا میں نے کمرۂ عدالت میں قدم رکھا تھا کہ جج صاحب کھڑے ہو گئے میرا استقبال کیا فوراً کرسی منگائی اپنے پاس مجھ کو بٹھلایا اور کہنے لگے کہ ناحق آپ کو تکلیف دی آپ اطمینان رکھیں معاملہ کی تحقیقات کے بعد آپ کو مطلع کر دیا جائے گا اور اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے میں بہت خوش اور بہت مطمئن واپس آگیا۔ یہ فرمانے کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا یہ کیا ہوا؟ میں نے سمجھا کہ تخاطب مجھ سے ہی لیکن سوال پوری مجلس سے ہوگا، اس لئے جواب میں عجلت نہ کی مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب

نے فرمایا کہ جج کو کسی طرح معلوم ہو گیا ہوگا کہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے توسط سے جواہر لال نہرو آپ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ سید صاحب نے اپنا سوال پھر دوہرایا اور مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب نے ذرا تبدیلی کے ساتھ پھر یہ فرمایا کہ ضرور جواہر لال نہرو نے جج صاحب کو کچھ ہدایت دے دی ہے ۔ سید سلیمان صاحب نے تیسری بار مجھ کو مخاطب بنا کر فرمایا کہ یہ کیا ہوا ؟ مجھے یقین ہو گیا کہ اس وقت میرا ہی امتحان مقصود ہے اور میں نے عرض کیا کہ آپ اللہ سے مانگ کر چلے تھے اللہ نے آپ کی لاج رکھ لی ۔ اس کے بعد سید سلیمان صاحبؒ نے اپنا رخ پوری مجلس کی طرف فرما کر یہ ارشاد فرمایا کہ انسان ظاہر پرست اور حقیقت فراموش ہوتا ہے ۔ قرآن حکیم نے اس ظاہر پرستی اور حقیقت فراموشی کو مختلف موقعوں پر مختلف انداز میں بیان فرمایا ہے اسی سلسلے کی ایک آیتِ کریمہ یہ ہے :

وَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ	جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں
دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ج	تو خدا کو پکارتے ہیں اور خالص اسی کی
فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ	عبادت کرتے ہیں لیکن جب وہ نجات دیکر
اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ .	خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو جھٹ شرک کرنے لگتے ہیں

فرمایا کہ ساحل سے دور دریا کی موجوں میں خالصاً اللہ کو پکار رہے تھے لیکن جب امن و سلامتی کے ساتھ خشکی پر اتر آئے تو کہنے لگے کہ خیریت ہو گئی کہ تند و تیز ہواؤں سے واسطہ نہ پڑا اور ہم بخیریت پہونچ گئے ۔ کسی نے کہا کہ جہاز کا کپتان بہت دانا بینا اور تجربہ کار ہے کتنی خوبی سے یہ سفر طے ہو گیا ۔ غرضکہ خدا کو بھول گئے اور کامیابی دوسروں کی طرف منسوب کرنے لگے اسی کو قرآن حکیم اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ فرما کر شرک قرار دے رہا ہے ۔

خطاب عام تھا اور روئے سخن کسی خاص فرد کی طرف نہ تھا اور وہ قرآن حکیم کی روشنی میں اس حقیقت کو آشکارا فرما رہے تھے کہ خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارنے والے بھی کس طرح مبتلائے شرک ہو جاتے ہیں ۔ غفر اللہ تعالیٰ و نور مرقدہٗ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

○

ابوالبقاء ندوی★

مولانا سید سلیمان ندوی اور
مولانا محمد علی جوہر

بدیں مصطفےٰ دیوانہ بودی ٭ ندائے ملّت جانانہ بودی

انیسویں صدی جواگرچہ مسلمانوں کی سیاسی بدحالی اور بدنظمی کا دور رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس دور میں ایسی قدآور شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کی مثال کسی اور دور میں ملنا مشکل ہے۔ سرسید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، سر آغا خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محمد علی جناح، ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا ظفر علی، مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا حسرت موہانی۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد علی میں یہ جوہر ودیعت فرمایا تھا کہ انھوں نے اپنی سحر انگیز شخصیت سے مسلمان قوم کو سوتے سے جگایا، اور ممولوں کو شہباز سے لڑایا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ ان کی جد وجہد اور قربانی اور ان کی پُرشور اور ہنگامہ خیز زندگی صرف توحید کے اذعان اور ایمان ویقین کی جلوہ گری کے لئے تھی، وہ سچے اور پکّے مسلمان ہونے کے ساتھ سچّے اور پکّے ہندوستانی بھی تھے۔ ان کی اسلام پسندی اور ملک سے بے انتہا محبت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا پیام تھا کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کی قوس قزح سے ملک کی سیاست میں رنگین اور حسین بہار لائی جا سکتی ہے۔ مولانا محمد علی نے مختلف تحریکوں میں شامل ہو کر اپنی تحریروں اور سحر انگیز خطابت سے مسلمانوں کو یہ کہہ کر بیدار کیا کہ وہ اپنے ساتھ انسانی شرف وجلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتے ہیں۔ وہ دنیا میں اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ وہ ان غلامی کی زنجیروں کو، جو ان کی گردنوں میں پڑی ہوئی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، وہ دنیا میں اس لئے آئے ہیں کہ حاکم ہوں نہ کہ محکوم، وہ خود ایسی قوت ہیں کہ دوسری قومیں اس کے آگے جھک کر روحانی اور جسمانی نجات پا سکتی ہیں۔

دوسری طرف مولانا سید سلیمان ندوی نے نصف صدی تک ہندوستان اور عالم اسلام کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پُرشور رکھا اور اپنی انتھک تحقیقی کاوش اور سحر انگیز قلم کی جادوگری سے خشک سوتوں کو اس طرح جگایا کہ

★ رفیق دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

ابن رشد کی تلاش ہو تو سیرۃ النبیؐ جلد سوم کو دیکھئے۔ ابن خلدون اور ابن تیمیہ کی تصویر دیکھنا چاہتے ہو تو سیرۃ النبیؐ جلد چہارم کو دیکھئے۔ ابن قیم کی تعلیمی موشگافیوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں تو سیرۃ النبی جلد پنجم کو پڑھیے۔ غزالی اور رومی کے فلسفۂ اخلاق کی تلاش ہو تو سیرۃ النبیؐ جلد ششم کو دیکھئے۔ سحرانگیز خطیب اور جامع صفات پیغمبر کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں تو خطبات مدراس کو پڑھئے۔ عاشق رسول اور جاں نثار نبوت اور محرم راز رسالت کی سیرت کا مطالعہ مقصود ہو تو سیرت عائشہؓ کا مطالعہ کیجئے۔ ابن حنیفہ دینوری، ابن قتیبہ اور ابن جریر طبری کے تحقیقی اکتشافات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں تو تاریخ ارض القرآن پڑھئے۔ البیرونی، ابن بطوطہ کی سیر و سیاحت اور قدیم ہند کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں تو عرب و ہند کے تعلقات پر نظر ڈالئے۔ ایک بڑے عالم، حکیم و صوفی کو دیکھنا چاہتے ہوں تو خیام کا مطالعہ کیجئے جس میں بدنام خیام رند شاہد باز کے بجائے ایک بڑا عالم حکیم اور فلسفی نظر آئے گا۔ ابن ماجد، واسکوڈی گاما کی سیاحت اور عربوں کی بحری ایجادات و انکشافات جاننا چاہتے ہوں تو عربوں کی جہاز رانی کا مطالعہ کیجئے۔

الغرض بقول مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم، سلیمان عالی جاہ کے حدود مملکت کا جائزہ لینا ہرگز کم ہمتوں کم فرصتوں، کوتاہ نظروں کا کام نہیں۔

علامہ شبلی سے مولانا محمد علی کو شاگردی کے علاوہ بہت انسیت اور قرب حاصل تھا جس کا انھوں نے اپنی تحریروں میں بار بار اظہار کیا ہے۔ یہ تعلقات سید صاحب کے لئے نقطۂ اتصال ثابت ہوئے، دونوں ایک دوسرے کے بڑے قدرداں تھے۔ مولانا محمد علی کو سید صاحب سے بڑی جذباتی عقیدت تھی۔ خود سید صاحب بھی ان سے دلی محبت رکھتے تھے۔ اور ان کی ذہانت، فطانت، اخلاص اور دینی جذبے کے بڑے مداح تھے۔ دونوں کی سب سے پہلی ملاقات ۱۹۱۳ء میں کلکتہ الہلال کے دفتر میں ہوئی تھی جب سید صاحب الہلال کے ادارتی اسٹاف میں شامل تھے، اور خود مولانا محمد علی کامریڈ کے ایک صاحب طرز اور جادو نگار اڈیٹر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ طرابلس اور بلقان کی جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، مولانا نے کامریڈ میں ترکوں کی حمایت میں ایک مضمون "مقدونیہ آؤ اور میری مدد کرو" شائع کیا تھا جسے حکومت نے قابلِ ضبطی قرار دیا تھا۔ ماہرینِ قانون کے مشورہ پر محمد علی اس حکم کے خلاف کلکتہ ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کرنے کے سلسلے میں کلکتہ آئے تھے تو الہلال کے دفتر میں بھی تشریف لائے۔ حضرت سید صاحب اس پہلی ملاقات کے وقت کا اُن کا حلیہ تحریر کرتے ہیں۔ "دیکھا تو بالکل صاحب، کوٹ، پینٹ، بوٹ، نکٹائی، داڑھی صاف بڑی بڑی اُٹھی ہوئی مونچھیں، سر پر ترکی ٹوپی، لمبا قد، گداز بدن، بھرا ہوا جسم، خندہ جبیں" (یادِ رفتگاں ص ۱۵۱) اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طلبہ کی مشہور اسٹرائیک ہوئی تو اس سلسلہ میں سید صاحب کو دہلی میں مولانا محمد علی سے ضرورۃً بار بار ملنا پڑا اور ان ملاقاتوں سے دونوں کے روابط گہرے ہوتے چلے گئے۔

دارالمصنفین کا قیام علامہ شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد ۱۹۱۴ء میں عمل میں آیا۔ اس وقت جنگ عظیم کا ہنگامہ کارزار

گرم ہو چکا تھا اور مولانا محمد علی کے شہرۂ آفاق انگریزی اخبار "کامریڈ" اور اُردو روزنامہ "ہمدرد" کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی تھی، مولانا محمد علی صحافت کی راہ سے مسلمانوں کی عوامی قیادت کی زمام سنبھال چکے تھے اور اپنے بے لاگ قلم کی وجہ سے انگریزوں کی نظروں میں ایک خطرناک عوامی لیڈر بن چکے تھے، حکومت کی نظرِ عنایت کی وجہ سے قید و بند کی آزمائشوں میں مبتلا ہو چکے تھے، ایسے وقت میں اپنے استاد کی علمی یادگار دار المصنفین کی زیارت کی تمنّا کے باوجود اس کی حاضری کی سعادت سے محروم رہے، جس کا اظہار اپنے ایک خط مورخہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۶ء کو چھنڈواڑہ سے سید صاحب کے نام تحریر فرماتے ہیں کہ

> "آپ کو تو غالباً معلوم ہوگا کہ دار المصنفین کی تحریک میں نے ہی کانفرنس میں بمقامِ راولپنڈی کی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مجھے اس تحریک سے کس قدر دلچسپی ہے، افسوس ہے کہ جب یہ پودا لگایا گیا میں نظر بند ہونے کے قریب ہی تھا اور اب جب کہ یہ بار آور ہو رہا ہے اسی طرح نظر بند ہوں، تاہم اس کے حالات اور ضروریات سے مطلع فرماتے رہیں۔ میں جن تصانیف یا تراجم کی ضرورت محسوس کروں گا اس کے متعلق لکھتا رہوں گا، تاکہ آپ حضرات کو فرصت ہو تو اس طرف متوجہ ہوں۔" (خطوطِ محمد علی ص ۵۵)

مولانا محمد علی کو سید صاحب اور دار المصنفین سے دلچسپی اور اس سے کس قدر غایت تعلق تھا اس کا اندازہ مولانا شوکت علی کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۹۱۹ء کو بیتول جیل سے مولانا مسعود علی ندوی کے نام لکھا ہے، لکھتے ہیں کہ

> "محمد علی کا مستقل ارادہ ہے کہ جب خدا کی دی ہوئی آزادی ہم کو ملے گی تو والدہ کی خدمت ضروری سے فارغ ہو کر سیدھے اعظم گڈھ آئیں اور وہاں قیام کر کے پوری محنت کے ساتھ اپنی انگریزی قابلیت اللہ کی راہ میں صرف کریں، سیرت نبویؐ کو انگریزی جامہ پہنا کر پیامِ حق یورپ کے کانوں تک پہونچائیں۔"
>
> (معارف اکتوبر ۵۵ء ص ۳۰۷)

مولانا محمد علی اپنی اس دیرینہ تمنّا کو بصورتِ قیام تو پورا نہ کر سکے لیکن سید صاحب اس خلوص و محبت کی یاد کو جب چھوٹوں گا روضۂ استاد کے پھولوں کی خوشبو سے دماغ و روح کو معطر کروں گا" خطوط کے ذریعہ برابر یاد دلاتے رہے اور بالآخر یہ دیرینہ تمنّا و آرزو مارچ ۱۹۲۱ء میں پوری ہوئی۔ دار المصنفین میں ان کی آمد اور پُرکیف صحبت کا تذکرہ سید صاحب معارف کے شذرات میں بڑی عقیدت اور احترام سے کرتے ہیں، اور اس کی جو تصویر اور مرقع آرائی فرمائی ہے ملاحظہ فرمائیں:

> "یکم مارچ ۲۱ء کو سالہا سال کے وعدوں کے بعد محترم محمد علی نے شبلی منزل (دار المصنفین) کو رونق بخشی وہ اس وقت سے جب نظر بند تھے یہ وعدہ کر چکے تھے کہ آزاد ہو کر وہ سب سے پہلے دار المصنفین

میں آئیں گے اور چھ ماہ اس گمنام مقام کے کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر عربی کی تکمیل اور سیرتِ نبوی کا انگریزی ترجمہ کریں گے لیکن آزادی کے ساتھ جو اطمینان شکن اور [illegible] واقعات پیش آئے وہ سب کے سامنے ہیں

بہرحال یہ پرانا وعدہ کسی نہ کسی صورت میں یکم مارچ کو پورا ہوا، ہزارہا آدمی استقبال کے لئے شاہ گنج سے اعظم گڈھ (۳۲ میل) اور شہر اعظم گڈھ کے ناکے سے شبلی منزل تک (۲ میل) موجود تھے، شبلی منزل پہنچ کر سب سے پہلے وہ استاد مرحوم (مولانا شبلی) کی قبر پر گئے اور پھولوں کے وہ ہار جو قدردانوں نے گلے میں ڈالے تھے قبر کے گوشے میں ڈال دیئے اس کے بعد انھوں نے دار المصنفین کی خانقاہ میں ایک دن ٹھہر کر مختلف شعبوں کو دیکھا اور دوسری شام کو علی گڈھ واپس چلے گئے۔"

(شذرات معارف مارچ ۳۱ء ص ۱۶۲)

مولانا محمد علی اپنی ملی، قومی اور ہنگامہ خیز سیاسی زندگی میں جب بھی فرصت پاتے دار المصنفین کی علمی سرگرمی اور ترقی سے دلچسپی لیتے اور یہاں کی جدید مطبوعات کو بہت ہی شوق سے طلب فرماتے اور اس سلسلہ میں خطوط کے ذریعہ سید صاحب کو تحقیق و تالیف کے جدید عصری تقاضوں اور نئے نئے موضوعات کی نشان دہی کرتے، مفید علمی مشورے دیتے اور یہاں کی مطبوعات پر غائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اپنی بے لاگ مگر مخلصانہ رائے سے ضرور مطلع فرماتے۔ رسالہ معارف سے ان کو خاص شغف اور انس تھا، اس کی مجلدات کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کرتے، دار المصنفین کی مطبوعات میں جس وقت ارض القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی تو مولانا محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند تھے، سید صاحب نے ان کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین اور قرآن سے انتہائی شغف کی بنا پر یہ کتاب جیل میں بھجوادی، اس کتاب کو پانے کے بعد وہ سید صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "اس زمانہ میں ارض القرآن جیسی کتاب کی سخت ضرورت درپیش تھی، میرا گمان ہے کہ خداوند کریم نے آپ کو صرف میری ضرورت کو دور کرنے کے لئے اس کی تصنیف پر آمادہ کیا، جب یہ ہے تو مجھ سے زیادہ کون مشکور و ممنون ہوگا، یہ محض بیعانہ ہے، اصل قیمت پڑھنے کے بعد ادا ہوگی۔"

(خطوطِ محمد علی ص ۵۴)

اگر دار المصنفین میں کسی نئی کتاب کی تالیف کا مژدہ سنتے اور کتاب ملنے میں تاخیر ہوتی تو بے قرار ہو جاتے اپنے ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں:

> "مسعود صاحب کے خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ صحابۂ کرام کے متعلق ایک تالیف تیار ہے مگر طباعت میں کیوں دیر ہے۔ بھائی یہ تعویق تو ہم لوگوں پر جبر ہے کیا ایسی کتابوں کے بکنے میں دقت پیش آتی ہے؟ واللہ ارض القرآن جیسی کتاب کے لئے تو ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو جس کی آمدنی سو روپے ماہوار

کی ہے کم از کم پچیس روپیہ دینا ضروری ہے اور سیرت کے لئے تو ہر شخص کو ایک ماہ کی آمدنی دینا لازمی ہے ہم لاکھ نادار سہی مگر اتنے بھی نادار نہیں کہ سال میں تیس پچیس روپیہ ایسی کتابوں کی خریداری کے لئے نہ نکال سکیں۔" (ایضاً ص ۸۲)

۲۴ ستمبر ۱۹۱۹ء کو بیتول جیل سے مولانا مسعود علی صاحب کے نام ایک خط لکھتے ہوئے سید صاحب کے خط نہ لکھنے کی شکایت کرتے ہیں جس میں شکوہ کے ساتھ اپنی عقیدت، محبت اور خلوص کا اظہار کس انداز میں کرتے ہیں:

> "برادرم سید سلیمان صاحب کے محبت نامے کا اب تک انتظار ہے، مگر شکایت نہیں، کیونکہ اس عرصہ میں میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد بھی ختم کر ڈالی ہے، سلیمان صاحب اسی طرح کتابیں لکھتے رہیں اور ساری عمر بھی خط نہ لکھیں تب بھی شکایت کا موقع نہ ہوگا بلکہ مشکوریت کا سلسلہ جاری رہے گا۔" (ایضاً ص ۸۵)

اسی طرح جب استادِ گرامی کی سیرۃ النبی جلد اول کے شائع ہونے کی خبر ملی تو اس کی دید و مطالعہ کے شوق سے بے تاب ہو کر سید صاحب کو لکھتے ہیں:

> "کل شام ہی معارف دیکھنے میں آیا اور سیرت النبیؐ کی پہلی جلد تیار ہو جانے کا مژدہ سنا، اب بھی اگر ایک جلد ارسال نہ فرمائیں گے تو یقین جانیئے میں رسیاں تڑا کر خود اعظم گڈھ آ کودوں گا اور دار المصنفین میں وہ ہڑبونگ مچاؤں گا کہ آپ حضرات اہل قلم کی محبوب یکسوئی کا خاتمہ ہو جائے گا۔" (ایضاً ص ۵۸)

مولانا محمد علی کو دار المصنفین کی ایک ایک چیز دل و جان سے عزیز تھی اس لئے رسالہ معارف کا برابر انتظار رہتا اور اس کے بلند علمی و تحقیقی مضامین کے دل سے معترف رہتے اور اس کے ایسے قدردان تھے کہ اس کے علاوہ کسی پرچے کی مکمل فائل کو مجلد کرانے کا بندوبست نہیں فرماتے، چنانچہ ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء کو سید صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "اب تک میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں اور ممکن ہے میرے عزیز دوست اور سارق کتب جالب صاحب ان میں سے اکثر پر قبضہ بھی کر چکے ہوں یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائیں۔" (ایضاً ص ۶۷)

مولانا محمد علی کو سید صاحب سے جو تعلق تھا اور اس تعلق کی بنا پر یہاں کے لوگوں سے جو محبت و اخلاص ان کو تھا اس کا عکس اکثر ان کے خطوط میں ملتا ہے، اسی طرح کا ایک خط ناظم امور انتظامی مولانا مسعود علی ندوی کو جو خود تحریک خلافت کے ممتاز کارکنوں میں تھے اور علی برادران کے مخصوص مخلصین میں تھے، اپنے ایک خط میں مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء کو بیتول جیل سے لکھا ہے اس کی ہر سطر دار المصنفین کی حاشیہ نشینی پر احساسِ فخر اور سید صاحب کے گوناگوں فضائل و کمالات کے ذکر سے معمور ہے تحریر فرماتے ہیں کہ

”دار المصنفین کسی ایک شخص کا نام نہیں اور اگر نام بھی ہو تب بھی مولانا شبلی مرحوم میں ان کی تمام علمی ذریت شامل ہے اور اب اسی طرح سید سلیمان ندوی میں سارا دار المصنفین اور تمام ندوہ شامل ہے“ (ایضاً ص ۹۵)

معارف اور مولانا محمد علی

مولانا محمد علی کو ملک و ملت کی جان فروشی اور اس کی خدمت گزاری کا جو صلہ ملا وہ یہ تھا کہ تقریباً پانچ سال مئی ۱۹۱۵ء تا دسمبر ۱۹۱۹ء تک ملک کی مختلف جیلوں میں قید و بند کی آزمائشوں میں مبتلا رہے اور اس وقت ان کی جاں نثاری کا دم بھرنے والے مسلمانوں میں عزت و حمیت کی کوئی حرکت نہ پیدا ہو سکی اور نہ ہی ہمدردی میں کسی اخبار یا رسالہ نے قلمی حمایت کا دم بھرا۔ یہ سعادت صرف معارف کو حاصل ہے کہ سید صاحب نے معارف میں بڑی جرأت اور دُکھ کے ساتھ مولانا کی قید و بند کی آزمائشوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، چنانچہ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ملک و ملت کے بہی خواہوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”مسلمانوں کی ترقی اور تنزلی کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے ان کا وقتی اور فوری جوش، وہ سیلاب کی مانند پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں لیکن کوہ کن کی طرح ایک ایک پتھر جدا کر کے راستہ صاف نہیں کر سکتے، وہ بجلی کی مثل ایک آن میں خرمن کو خاک سیاہ کر سکتے ہیں لیکن چیونٹی کی طرح ایک ایک دانہ نہیں ڈھو سکتے، وہ ایک مسجد کی مدافعت میں اپنا خون پانی کی طرح بہا سکتے ہیں لیکن منہدم مسجد کو دوبارہ بنانے کے لئے مسلسل کوشش جاری نہیں رکھ سکتے ہیں، یہاں سے ممکن تھا کہ محمد علی اور ابو الکلام کے دائیں بائیں گر کر جان دے دیتے لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں کہ مسلسل آئینی جد و جہد سے اسیرانِ اسلام کو چھڑا لائیں۔
>
> مسز اینی بیسنٹ چھوٹ سکتی ہیں کہ ان کی آزادی کے لئے وہ قوم بے تاب تھی جو اپنی مسلسل اور پائیدار کوششوں سے برطانیہ کے پُرعظمت اور ذخار سمندر کو ہلا سکتی ہے اور اس وقت تک ہلاتی رہ سکتی ہے جب تک گوہرِ مقصود اس کے ہاتھ نہ آجائے لیکن مسلمان وہی کام کر سکتے ہیں یا اس پُرخطر دریا میں کود کر اپنی جان گنوا دیں یا اس میں سیل کر صاف و شفاف سطح کو گدلا کر دیں۔“ (شذرات معارف اکتوبر ۱۹۱۷ء ص ۲۴۲)

سید صاحب نے ۱۹۱۹ء میں مولانا حسرت موہانی کی رہائی کی تقریب سے معارف میں ”نظر بندانِ اسلام“ کے عنوان سے کئی نمبروں میں ایک پُرمغز مقالہ سپردِ قلم کیا، جس میں تاریخی طور پر زندانِ یوسفی سے لے کر تاتاریوں کے سیلاب بلاخیز تک عہد بعہد اسیرانِ اسلام کی قید و بند اور عزیمت و استقامت کے واقعات نیز جرأتِ حق گوئی کی پاداش میں ان کی قربانیوں پر نہایت مؤثر انداز میں روشنی ڈالی، اس طویل مضمون کی تیسری قسط مارچ ۱۹۱۹ء ”موجودہ نظر بندانِ اسلام علمی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے“ کو سید صاحب نے خاص سرزمین ہند پر دعوت و عزیمت کے علم بلند کرنے والے اسیرانِ اسلام کے لئے وقف کیا ہے۔ انھوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن، ابو الکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولوی محی الدین اور علی برادران کی آزادی وطن کے لئے بطیبِ خاطر قید و بند کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔

— جماکر

اس سلسلہ میں سید صاحب نے علی برادران کی نظر بندی اور استقامت و عزیمت کے اپنے ذاتی سفر کے چشم دید واقعات اور ذاتی مشاہدات کو مفصل طور پر قلم بند فرمایا ہے، لکھتے ہیں۔

" ان دونوں بھائیوں کے سوانحِ زندگی کا ایک ایک حرف اخبار بیں طبقہ کے سامنے ہے، جذبۂ ملت اور راہِ حق میں سرفروشی اور جانبازی اگر علمائے کرام سے ظاہر ہو تو ہم کہیں گے کہ انبیائے اولوالعزم، اصحابِ کبار اور بزرگانِ دین کے کارنامے ان کی آنکھوں میں ہیں، بچپن سے جوانی تک اپنی تعلیم و تربیت کا زمانہ علماء و صالحین کے آغوش میں بسر کیا، لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم وہی جذبۂ ملت پرستی، وہی ذوق و شوق خدمتِ دینی، وہی جذبۂ اخلاقِ محمدی ان میں پاتے ہیں، جنہوں نے نہ صرف غیر علماء کی گودوں میں تربیت پائی، بلکہ نامسلمانوں کے دامنِ تربیت میں پل کر جوان ہوئے اور ہمیشہ اس تعلیم و تعلم کے زیرِ اثر رہے جس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی قومی و مذہبی روح کے قتل کرنے کا مسموم آلہ ہے۔

دلی کی جامع مسجد شاہجہانی میں جمعہ کے دن ان کے وداعِ عام کا منظر جن آنکھوں نے دیکھا ہے وہ اس کیفیت کو اب تک بھولے نہیں ہیں۔ چھنڈواڑہ ممالکِ متوسط کا وہ مقام تھا جہاں آغازِ تخلیقِ عالم سے ۱۹۱۶ء تک روحانی مناظر کا کوئی جلوہ فروغِ چشم نہیں ہوا، نہ صرف اس چھوٹے سے ضلع میں بلکہ ممالکِ متوسط کے پورے احاطہ میں اسلام تنِ مردہ تھا، مسلمانوں میں بے کسی، بے چارگی اور موت تھی، لیکن دونوں بھائیوں کے ورود کے بعد نہ صرف چھنڈواڑہ بلکہ تمام احاطہ میں ایک روشنی سی جھلک اٹھی ہے، ان دونوں بھائیوں کے نشۂ صحبت نے ننھے بچوں سے لے کر ضعیف العمر بڈھوں تک کو سرخوش بادۂ طہور بنا دیا اور جس بے باکی اور بہادری کے ساتھ وہ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں، وہ ان ہی کا حصہ ہے محترم محمد علی کا زیادہ تر وقت کتابوں اور رسالوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ قوت فنا نہیں ہوتی، اگر یہ سچ ہے تو وہ نطق جس کے استعمال پر ان کو قابو نہیں ہے، نغماتِ موزوں کی شکل میں نکل رہے ہیں، ان کی نظر بندی سے پہلے شاید کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ تلمذِ رحمانی کا بھی شرف اور سخن سنجی کا بھی جوہر رکھتے ہیں، ان کے حبسیات میں ہم کو وہ لطف ملتا ہے جو ابو فراس ہمدانی (برادر سیف الدولہ ہمدانی ملک شام) کے رومی حبسیات میں ملتا ہے۔

چھنڈواڑہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے اور جو ہے وہ مفلس ہے تاہم جس اسلام کے وہ پیرو ہیں اس کا نام بڑا ہے، ان دونوں بھائیوں کی کوششوں سے یہاں ایک عظیم الشان جامع مسجد کی بنا ڈالی گئی ہے۔ جس کو نیم تعمیری حالت میں دیکھنے کی عزت مجھے بھی حاصل ہے۔ ان دونوں بھائیوں کو تصویرِ مسجد در بغل راستوں اور گلیوں میں غریب و مفلس مسلمانوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے کا منظر جن آنکھوں نے دیکھا ہے، اس بادۂ سرشار کی مستی اب بھی ان میں باقی ہے۔ اس مسجد کا نام لوگ نہ جانے کیا رکھیں، میں تو اس کو "شوکت الاسلام" کہتا ہوں۔

مذہبی پابندی، عام اخلاقی محاسن اور غرباء کے ساتھ مساوات پسندی نے ان بھائیوں کو محبوب القلوب بنا دیا ہے، مسلمان اور ہندو دونوں ان سے محبت کرتے ہیں۔ راستہ میں ایک طرف سے السلام علیکم کی آواز آتی ہے تو دوسری طرف بندے ماترم کا ترانہ سُنائی دیتا ہے، حافظؔ ہوتے تو دیکھتے کہ اُن کا خیالی فلسفہ پانچ سو برس کے بعد عملی ہوگیا ع

با مسلماں اللہ اللہ　　با برہمن رام رام

ان کی مذہبی وارفتگی اور ایمان کی تصویر دیکھنا چاہو تو ان کے سفینۂ تحریر کی وہ چند سطریں پڑھو جو اپنی مشروط آزادی کے وقت حکومت کو دی تھیں، یقیناً یہ طرۂ امتیاز ان کے ناصیۂ محاسن پر ہمیشہ کے لئے یادگار رہ جائے گا۔"

(معارف مارچ ۱۹۱۹ء)

مولانا محمد علی کا "ہمدرد" جو قوم و ملت کی خدمت کے لئے دل و جان سے حاضر رہتا تھا اور جس کے لئے مولانا نے اپنا دل، دماغ، وقت، محنت، مال سب کچھ داؤں پر لگا دیا تھا۔ مسلمانوں کی بے توجہی اور حکومت کی زیادتی کی بنا پر مالی بحران کا شکار ہوگیا اور ہمدرد کو مجبوراً بند کرنا پڑا تو سید صاحب نے اسے ایک عظیم المیہ قرار دیا اور اس پر دل کھول کر معارف میں ماتم کیا اور ہمدرد کی قومی صحافت اور اس کی ملی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا، لکھتے ہیں کہ

"ملک کے تمام لوگوں نے اس خبر کو افسوس کے ساتھ سُنا ہوگا کہ مولانا محمد علی نے اپنا روزانہ اخبار ہمدرد اس بنا پر بند کر دیا کہ اس کے خریداروں کی تعداد اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اخبار کی اشاعت کا بار اُٹھا سکتی، مولانا محمد علی کے مسلک اور مشرب سے جس کسی کو بھی اور جس قدر بھی اختلاف ہو، تاہم اس اظہار میں باک نہیں کہ ہمدرد تنہا اُردو کا روزنامہ تھا جس کا اصول عوام پرستی کے سیلاب میں بہنا نہیں، بلکہ اپنے مسلک پر عوام کو چلانا تھا، وہ تفریح و قہقہہ کا اخبار نہ تھا، بلکہ عوام اردو دانوں کو سیاسی مسائل سکھانے والا انصاب درس تھا۔ اس میں خبریں اپنی تبلیغ، پروپیگنڈا اور بڑھانے کے اصول پر نہیں شائع ہوتی تھیں، بلکہ ملک کو حقیقت و واقعیت سے باخبر رکھنے کے لئے اُس کے مضامین صرف دوراز کار انشا پردازی اور بے معنی لفاظی سے پاک ہوتے تھے۔ اس کے مقالے معلومات سے لبریز دلائل سے معمور اور سنجیدگی و متانت کے معیار پر پورے ہوتے تھے، بازاری لطائف و ظرائف، عامیانہ پھکڑ اور بے سلیقہ الفاظ سے پاک ہوتا تھا، اس کی ناکامی نے یہ افسوس ناک حقیقت ثابت کر دی کہ مسلمان اب سنجیدہ، متین اور باوقار لٹریچر کی قدردانی کے لئے تیار نہیں۔"

(معارف اپریل ۱۹۲۹ء ص ۲۴۲)

مولانا محمد علی کی شاعری اور معارف

مولانا محمد علی کی شاعری جو زیادہ تر آپ بیتی تھی اور قید و بند کی زندگی نے اس کو اور بھی جِلا بخشی تھی۔ بقول سید صاحب

"کہ محمد علی کی شاعری کا جوہر قید خانہ میں جاکر کھلا اس لئے ان کا بیشتر کلام حبسیات پر مشتمل ہے، اس لئے جب کبھی یہ واردات قلبی نغمات موزوں بن کر اشعار کا روپ ڈھال لیتے تو وہ اکثر اپنے ایسے کلام سید صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیتے اور سید صاحب اس کو معارف میں بہت ہی خوشی سے شائع کرتے۔ مثلاً جب بیتول جیل میں نظر بند تھے تو وہ ماہ رمضان المبارک کے عنوان سے ۱۹۱۹ء میں تیرہ اشعار کی ایک نظم بھیجی اور اس کے ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا کہ "چند اشعار بے ساختہ زبان پر آ گئے، نذر خدمت کرتا ہوں، یہ شب قدر کی بیداری اور یوم وداع کا تحفہ ہے" سید صاحب نے یہ نظم اکتوبر ۱۹۱۹ء کے معارف میں "زندانیوں کا وداعِ رمضان" کے عنوان سے شائع کی۔

اسی طرح دسمبر ۱۹۲۲ء میں "عاشقِ رسول قیدی کی فریاد" کے عنوان سے معارف میں ایک نظم شائع ہوئی، اس کے اشعار پڑھنے کے بعد مولانا محمد علی کی اندرونی قلبی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی عشقِ رسول میں کیا مقام رکھتے تھے۔

پھر نومبر ۱۹۲۳ء میں سید صاحب نے معارف میں بیس اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم "کلامِ جوہر" کے عنوان سے شائع کی اور اس پر ایک سطری نوٹ یہ تحریر فرمایا "جناب جوہر کا کلام ان کی آزادی سے پہلے آزاد ہو کر ہمارے پاس پہنچا۔"

سیّد صاحب اور مولانا محمد علی دورِ خلافت میں

۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ کے خونیں واقعہ نے پورے ملک میں ایک ہیجان برپا کر دیا تھا، اور پورا ملک کوہِ آتش فشاں بن گیا تھا۔ مجلس خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں اپنے شباب میں داخل ہو چکی تھیں، ہندو مسلم اتحاد کی شمیم عنبر ہوائیں پورے ملک میں چل رہی تھیں، اللہ اکبر کے نعرے ملک کے سارے باشندوں کی زبان پر تھے، لیکن مسلمانوں میں خصوصی طور پر خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ سے سخت بے چینی تھی، ان حالات میں مجلسِ خلافت نے اپنے اجلاس امرتسر دسمبر ۱۹۱۹ء میں طے کیا کہ ۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء تک مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لئے مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ایک وفد انگلستان بھیجا جائے۔ اس وفد کے سکریٹری حسن محمد حیات مقرر ہوئے، خلافت کی مذہبی ترجمانی کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی کا انتخاب ہوا۔

سید صاحب کا ذوق اگرچہ خالص علمی تھا اور ظاہر ہے کہ سیاست کی ہنگامہ آرائیاں علمی مشاغل کی دشمن ہیں اس لئے وہ عملی سیاست سے ہمیشہ کنارہ کش رہنے کی کوشش کرتے رہے، مگر مولانا محمد علی کے پیہم اصرار اور ملی مفاد کے پیشِ نظر آخر تیار ہو گئے۔

یہ وفد پورے آٹھ ماہ تک یورپ کے مختلف ملکوں میں سرگرم رہا، لندن میں وزیر اعظم لائڈ جارج، لارڈ فشر اور دوسرے ممتاز لیڈروں سے ملاقاتیں کر کے خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستانی مسلمانوں کے

جذبات و مطالبات کی وضاحت کی، وفدِ خلافت کی اس آٹھ ماہ کی ہم سفری اور شب و روز کی مصاحبت نے مولانا سید سلیمان اور مولانا محمد علی کو ایک دوسرے کا بے حد گرویدہ اور قدردان بنا دیا تھا۔ لندن کے دورانِ قیام جب سید صاحب نے مشہور انگریزی رسالہ "فارن افیرز" میں مسئلہ خلافت پر ایک مدلل اور جامع مضمون لکھا تو مولانا محمد علی نے بار بار اس کی تعریف و تحسین کی، اسی طرح وفدِ خلافت جب ہندوستان واپس آیا تو یہاں کے بعض حلقوں میں مولانا محمد علی اور ان کے رفقائے وفد کی یورپ میں فضول خرچیوں اور قومی دولت کے اسرافِ بیجا کے الزامات کا ہنگامہ گرم ہوا، تو مرکزی خلافت کمیٹی نے "حسابات وفدِ خلافت" کے نام سے ایک مختصر کتاب شائع کی، اس کے شروع میں سید صاحب نے ایک مقدمہ سپردِ قلم فرمایا، جس میں ایک جگہ مولانا محمد علی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ہمارے رئیس وفد کو حسابات کی ترتیب اور درستگی میں اس قدر اہتمام بلکہ غلو تھا کہ کبھی کبھی ان کے ساتھ کے ملّا کو غصہ آجاتا تھا، ان کے ہاتھ سے جو اخراجات ہوتے تھے وہ روزانہ ان کو اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتے تھے، اسی کے ساتھ ان کا یہ فرض بھی تھا کہ اپنے بے پروا رفقائے سفر کے اخراجات کو یاد رکھیں، اور رات کو سوتے وقت جب وہ بنیوں کی طرح دن کا حساب بند کرنے بیٹھتے تو حقیقت یہ ہے کہ ان کی یادداشت پر تعجب ہوتا۔" (سیرت محمد علی از رئیس احمد جعفری ص ۲۸۷)

وفدِ حجاز میں معیت

سید صاحب اور مولانا محمد علی میں یہ مثالی تعلقات تاحیات قائم رہے بجز مؤتمرِ اسلامی کے، اس وفد میں اختلافِ رائے ہوا لیکن دونوں طرف خلوص باقی رہا۔

سلطان عبدالعزیز بن سعود نے ۱۹۲۶ء میں یہ مؤتمرِ اسلامی حجاز میں جمہوری حکومت کے قیام اور اس کے نظام پر صلاح و مشورہ نیز حرمین کی حفاظت و اہلِ حرمین کی خدمت اور حجاجِ کرام کی راحت و آسائش کے وسائل پر غور و فکر کے لئے طلب کی تھی، ہندوستان سے بعض دوسری سیاسی و مذہبی تنظیموں کے ساتھ خلافت کمیٹی کے نام بھی ایک دعوت نامہ آیا، چنانچہ اس مؤتمر میں شرکت کے لئے سید صاحب کی قیادت میں مجلسِ خلافت کا چار رکنی وفد تشکیل پایا، دوسرے ارکانِ وفد میں علی برادران اور شعیب قریشی تھے، وفد کے مکہ پہونچنے تک اس کے تمام ارکان حرم کے آثار و مشاہد کے انہدام اور مسائلِ حجاز میں بظاہر فکری طور پر ہم آہنگ تھے۔ لیکن مؤتمر میں بحث اور گفتگو کے بعد یہ اتفاق رائے قائم نہ رہ سکا، اور حضرت سید صاحب کی رائے ابن سعود کی ملوکیت اور انہدام مقابر کے بارے میں وفد کے دوسرے ارکان سے مختلف ہو گئی۔ اگرچہ وفد کے درمیان یہ اختلافِ رائے مبنی بر اخلاص تھا۔ مگر سید صاحب نے اپنی طبعی شرافت اور علمی وقار کی خاطر اس کا برملا اظہار وہاں نہیں فرمایا، بلکہ اختلاف و کشاکش پیدا کرنے کے بجائے ہندوستان کی واپسی کے بعد سیاسیات ہی سے کنارہ کش ہو گئے کیونکہ اس کے اظہار

سے مسلمانوں میں آپس کے اختلافات بڑھتے اس لئے سید صاحب نے اس مسئلہ میں مکمل خاموشی اختیار فرمائی، مگر مولانا محمد علی نے اس سلسلہ میں مسلسل مضامین لکھے اور بیانات دیئے اگرچہ سید صاحب کو ان سے اتفاق نہ تھا۔ اس اختلاف رائے کی طرف محترم سید صباح الدین صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> "اسی زمانہ میں سید صاحب دہلی تشریف لے گئے تو مولانا محمد علی سے ملاقات ہوئی، سید صاحب نے اثنائے گفتگو ان سے کہا کہ آپ چاہے جیسے بھی مضامین لکھیں یا بیانات دیں میں خاموش ہی رہوں گا، مولانا محمد علی نے برجستہ کہا یہ مضامین اور بیانات تو آپ کو خاموش کرنے ہی کے لئے شائع کئے جارہے ہیں، اس حاضر جوابی سے سید صاحب خود بھی محفوظ ہوئے اور اس کو کئی بار اپنی نجی صحبتوں میں دہرایا۔"
>
> (معارف سلیمان نمبر ص ۲۔)

تعلقات کا اختتام

مولانا محمد علی سے سید صاحب کو غایت تعلق تھا اس کا اندازہ سید صاحب کے اس تاثر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب جنوری ۱۹۳۱ء میں ملت کے اس فدا کار اور ہمدردی خواں کے انتقال کی خبر ملی تو اس پر اپنے وفور جذبات سے بے قابو اور آب دیدہ ہو کر اپنے خونِ جگر کی سرخی معارف کے صفحات میں بکھیری کہ اس کو پڑھ کر سخت سے سخت دل انسان کچھ دیر کے لئے ماتم کناں ہو جائے اور شاید سید صاحب نے اس سے زیادہ غم انگیز کوئی ماتم نہ لکھا ہو، جو غم انگیزی کے ساتھ ساتھ انشاء پردازی کا بھی نمونہ ہے، اس درد انگیز ماتم اور شاہ کار تحریر کو آپ بھی سماعت فرمائیں:

"افسوس وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی، وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے آب ہو ہو جاتا تھا، اور اوروں کو بے تاب کرتا تھا دریغا کہ قیامت تک کے لئے ساکن ہو گیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوش نوا بلبل بن کر چہکتے تھے، ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پُر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لئے تھم گیا۔ وہ پُر زور دست و بازو جو شب و روز کی خدمت گذاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعداء کے نرغے میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہوگا، الوداع محمد علی الوداع! والسلام الی یوم القیامۃ،

تو ملت کا عزادار تھا حق ہے کہ ساری ملت تری عزادار ہو تو ملت کا سوگوار تھا فرض ہے کہ پوری ملتِ

محمدی ترا سوگ کرے، تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا، سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام ترا ماتم کرے، ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لئے غم زدہ، بلقان کے لئے اشک بار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں حجاز کا سوختۂ غم اور بیت المقدس کے لئے وقف الم، اے ہند کے آوارہ گرد مسافر ترا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہی تھا کہ ترے لئے اوّلین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے۔

وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا، لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی، مشرق کی مٹی سے اس کا جسم بنا، لیکن مغرب کے ہتھیاروں سے اس نے اپنا جسم سجایا، اس کا دماغ مغربی، مگر دل مشرقی تھا، وہ مشرق کی حمایت میں بارہا مغرب سے مغرب کے ہتھیاروں سے لڑا، اے مشرق و مغرب کے مالک! تو اپنی رضامندیوں کے پھول سے اس کا دامن بھر دے۔

مولانا محمد علی کا ماتم جس طرح دنیا میں ہوا، مشرق و مغرب میں ہوا، یورپ اور ہندوستان میں ہوا، مصر اور شام میں ہوا، فلسطین اور اس کے بیت المقدس میں ہوا، وہ شاید ہی کسی کے لئے ہوا ہو، صاحب دل شاعر کی اس پیش گوئی کی صداقت سے آج کس کو انکار ہے ع

ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لئے ہے"

(شذرات معارف جنوری ۳۱ء ص ۴)

○

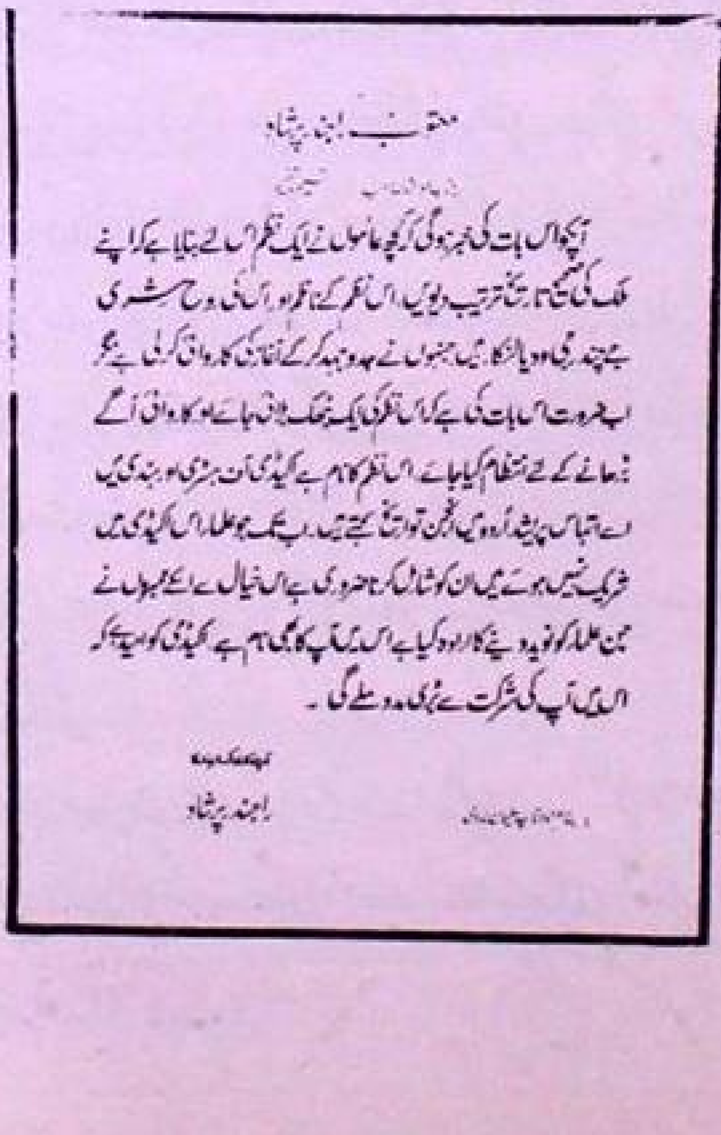

سید شرافت علی ندوی*

علامہ سید سلیمان ندوی اور
ڈاکٹر اقبالؒ

علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ اقبالؒ بیسویں صدی کے نصف اول کی ان ممتاز شخصیتوں میں ہیں جنھوں نے ہندوستانی ملتِ اسلامیہ کی علمی و فکری نشاۃِ ثانیہ میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اپنے فکر و تخیل سے جو تعمیری اور انقلابی کارنامے ان دو بزرگوں نے انجام دیئے ہیں اس سے ملی شعور کو ایک نئی راہ ملی اور فکرِ جدید کی ایک نئی تاریخ کا آغاز ہوا، دونوں شخصیتوں کے دائرہ عمل مخصوص و متعین ہونے کے باوجود دونوں کا نصب العین ایک نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ علمی ادراک اور عملی احساس دونوں کے درمیان قدر مشترک ہے۔ سید صاحب مطالعہ و تحقیق، تصنیف و تالیف کے امام ہیں تو اقبال ذوق و شوق، شعر و ادب اور عشق و محبت کے علم بردار لیکن دونوں کے درمیان کوئی ایسا علمی و فکری اختلاف نظر نہیں آتا ہے۔ جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکے کہ یہ دو مختلف راہوں پر چلنے والے ہیں۔ نظم و نثر کے فرق کے باوجود دونوں کے قلم و زبان عشق رسولؐ سے سرشار ہیں اور قوم و ملت کے لئے سرگرم، ہر ایک نے اپنی صنف میں روایات سے انحراف کیا اور وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے انھیں موضوعات کو اختیار کیا جن کی اس دور میں سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ جس دور میں عالم اسلام کی زبوں حالی مسلمانوں کی علمی و دینی پسماندگی اقوام مغرب کے استبداد اور مغربی تہذیب و تمدن کی یلغار سے پوری ملت پر یاسیت طاری تھی، اس وقت دیگر مشاہیرِ علم و دین کے قدم بہ قدم ان دونوں ہستیوں نے قوم کے شعور کو نیا رخ دیا، ایک نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ قوم کو اس کی میراث سے باخبر کیا، دوسرے نے سخن دلنواز سے خوابیدہ دلوں میں صور پھونکا، ملت نے دونوں سے استفادہ کیا، اور جلد ہی ایک ایسی نسل تیار ہو گئی جس نے ان کی بخشی ہوئی سوغات کو حرزِ جاں بنا لیا، اس دور میں ایسا فکری انقلاب پیدا ہوا جس سے برصغیر کے علمی و ادبی اداروں میں نئی روح اور نئی زندگی دوڑنے لگی۔

یوں تو علامہ سید سلیمان ندوی کے معاصرین میں علم و دین، تحقیق و تصنیف، سیاست اور حکومت سے تعلق رکھنے والے بہت سے ممتاز افراد گزرے ہیں، بہت سے ایسے بھی بزرگ ہیں جن کو کئی کئی سال تک سید صاحب

★ استاد دارالعلوم تاج المساجد بھوپال

کے ساتھ شب و روز رہنے کا اور ان سے کچھ سیکھنے اور حاصل کرنے کا اتفاق ہوا، ایک کثیر تعداد خود ان کے شاگردوں کی ہے جنہوں نے براہِ راست سیّد صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور علوم اسلامیہ میں فراغت حاصل کی، نیز ایک عرصہ تک سیّد صاحب کی تربیت میں رہنے کا ان کو موقعہ ملا۔ اقبال کا نام اگرچہ ان لوگوں میں آتا ہے جن کی سیّد صاحب سے زیادہ صحبت نہیں رہی، اور نہ کسی علمی یا سیاسی ادارہ میں کوئی باہمی تعاون رہا، لیکن ان کی تین ملاقاتیں (جن میں افغانستان کا سفر بھی شامل ہے) اور سب سے زیادہ باہمی مراسلت نے دونوں کے تعلق کو مستحکم کیا، یہ تعلق ایک مستقل علمی اور تحقیقی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں یہی کچھ واضح کرنے کی طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے۔

اقبال اور سیّد صاحب کی ملاقات

علامہ سیّد سلیمان ندوی اور ڈاکٹر اقبال کے درمیان مراسلت کا سلسلہ تو ۱۹۱۳ء سے جاری تھا لیکن دونوں بزرگوں کی پہلی ملاقات لاہور میں انجمن حمایتِ اسلام کے بیالیسویں اجلاس کے موقعہ پر ہوئی۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک انجمن کے جلسوں میں شرکت کے لئے ڈاکٹر اقبال سیّد صاحب کو برابر لکھتے رہے، لیکن ہر وقت کچھ نہ کچھ موانع پیش آئے، اور سیّد صاحب باوجود اپنے ارادہ کے لاہور نہ جا سکے۔ آخر اقبال کے شدید تقاضہ پر ۱۵ تا ۱۸ اپریل ۱۹۲۶ء کو انجمن حمایتِ اسلام کے بیالیسویں اجلاس میں سیّد صاحب تشریف لے گئے، اور مولانا ظفر علی خاں کے یہاں زمیندار کے دفتر میں قیام کیا۔ یہاں ۱۵ اپریل کی صبح کو خود علامہ اقبال ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے ہمراہ سیّد صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لائے، سیّد صاحب اس ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "ڈاکٹر اقبال سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی، اور مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۳ء سے قائم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کرم کیا کہ ملنے میں پیش دستی فرمائی۔ قیام گاہ میں آئے، متعدد صحبتوں میں ساتھ رہے اور پھر خود اپنے کاشانہ میں مدعو کیا جس کو وہ دارالفقر اور میں دارالاقبال کہوں گا۔" (معارف مئی ۱۹۲۶ء مقالہ "سفر لاہور کی یادیں")

اس ملاقات نے سیّد صاحب کو خاصا متاثر کیا، پہلے وہ اقبال سے واقف ضرور تھے لیکن مشاہدہ کے بعد کچھ اور کیفیت پیدا ہوگئی، لاہور کی مختلف صحبتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمع محفل تھے، انھوں نے تو "شمع اور شاعر" لکھا ہے، لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا، اور قدرشناسوں کو اس کا پروانہ پایا، ان کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بلند کر رہی ہے، ان کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار شاعرانہ خیالات ان کی آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں، اُن کی "زمزمہ پردازیوں" کا نیا مجموعہ "زبورِ عجم" کے نام سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ میں نے کہا کہ فلسفۂ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھوں میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفے کو مزامیر داؤد کی دعاؤں سے بدل دے، اور ان کے کانوں پر زبور کا پردہ رکھ کر

قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کردے"۔ (معارف مئی ۱۹۳۶ء)

اس سفر کے بعد دونوں شخصیتوں کے درمیان تعلقات مزید گہرے ہو گئے تھے۔ دوسری بالمشافہ ملاقات بھی لاہور ہی میں ہوئی تھی، یہ واقعہ ۱۹۳۲ء کا ہے۔ جب ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کے لاہور اجلاس کی صدارت علامہ اقبال نے کی تھی، اس موقع پر علامہ کے ذہن میں علوم اسلامیہ کی تحقیق و ترویج کے لئے ایک ادارہ کے قیام کا خیال آیا۔ بالآخر موصوف کی تحریک اور رہنمائی سے لاہور کے اہلِ علم و دانش نے " ادارہ معارف اسلامیہ" قائم کیا۔ سید صاحب کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو بڑی مسرت کا اظہار کیا اور معارف اکتوبر ۱۹۳۲ء کے شذرات میں اس ادارہ کے قیام و مقاصد پر تفصیل سے لکھا۔ اس کا پہلا اجلاس ۱۵ اور ۱۶ اپریل ۱۹۳۳ء کو لاہور میں ہونا طے پایا۔ سید صاحب اور دار المصنفین کے دیگر رفقاء کو بطورِ خاص اس میں مدعو کیا گیا۔ اس اجلاس کی صدارت بھی علامہ اقبال نے کی سید صاحب نے " لاہور کے ایک مہندس نے تاج محل اور لال قلعہ بنایا " کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔" اس مقالہ میں اس خاندان کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے علمی کارناموں کی سرگزشت نامعلوم گوشوں سے تلاش اور تفحص کے ساتھ مرتب کی گئی تھی، اور تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ اس خاندان کے مورث نادر العصر استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری کے حالات بتائے گئے اور اس کے بیٹے ملا لطف اللہ مہندس (جو شاہ جہاں کے زمانے میں موجود تھا اور دارا شکوہ کا درباری تھا) معاصرانہ شہادت سے حقیقت ثابت کی گئی ہے، اور ثابت کیا گیا کہ تاج کا معمار درحقیقت یہی استاد احمد شاہجہانی ہے، یہ ہندسہ، ہیئت اور ریاضی کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس دریافت سے وہ تمام افواہیں جو تاج کے کاری گروں اور معماروں کی نسبت مشہور تھیں بے سروپا ثابت ہو کر رہ گئیں۔

(اقبال سید سلیمان کی نظر میں، از اختر راہی ص ۲۸۲)

اس دوسری ملاقات کے بعد اکتوبر ۱۹۳۳ء میں شاہ افغانستان نادر شاہ کی دعوت پر علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر اقبال اور سر راس مسعود کا افغانستان کا سفر ہوا۔ اس سفر میں کئی روز تک مصاحبت رہی۔ سفر سے واپسی پر اقبال نے اپنی مشہور مثنوی " مسافر" لکھ کر پیش کی، اور علامہ سید سلیمان ندوی نے پورے سفر کی روداد لکھی جو ۱۹۳۴ء کے معارف کے مختلف شماروں میں شائع ہوئی، پھر بعد میں " سیرِ افغانستان" کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آئی۔ سید صاحب نے اپنی داستان سفر کے آخر میں لکھا تھا " کیا عجیب اتفاق ہے کہ آج ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو جب اس داستانِ سفر کی آخری سطر سے میں نے فراغت پائی ہے، ڈاک کے قاصد نے ڈاکٹر سر اقبال کی تالیف " مسافر" ہاتھ میں دی، یہ افغانستان کی چند روزہ سیاحت پر موصوف کے شاعرانہ جذبات کا مجموعہ ہے جو ابھی شائع ہوا ہے۔ فارسی زبان میں خیبر و سرحد و کابل و غزنین و قندھار کے عبرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر کے آنسو ہیں اور بابر، سلطان محمود، حکیم سنائی، اور احمد شاہ ابدالی کی خاموش تربتوں کی زبانِ حال

سے سوال وجواب ہیں "مسافر" کا آغاز نادر شاہ شہید کے مناقب سے اور اختتام شاہ محمد ظاہر خاں سے اظہارِ توقعات پر ہے۔" (سفرنامہ اقبال، مرتب حق نواز ص ۲۳۵)

اس سفر میں دونوں بزرگوں کو ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا مزید موقع ملا۔ علامہ اقبال سید صاحب کے علمی تبحر کے معترف تو پہلے ہی تھے، اس سفری صحبت نے ان کو اور زیادہ معتقد بنا دیا۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں "افغانستان کے سفر میں اقبال سید صاحب سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے" اس سفر کے بعد ایک موقع پر تحریر فرمایا "آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں، رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں، اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں"۔ (معارف سلیمان نمبر ۱۹۵۵ء، ص ۲۸)

اسی سفر میں علامہ اقبال نے اپنی طالب علمی کا وہ واقعہ سید صاحب کو بتایا تھا جس میں موصوف کے والد محترم نے قرآن کی تلاوت کے بارے میں یہ فرمایا تھا "جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمہارے قلب پر اسی طرح اترا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اقدس پر نازل ہوا تھا تلاوت کا مزہ نہیں"! اس نصیحت کے کچھ دنوں بعد انھوں نے اپنے نوجوان بیٹے سے یہ عہد بھی لیا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان و قلم سے ملتِ محمدیؐ کی خدمت بجا لاتا رہے گا۔ سید صاحب نے اس عہد کی تکمیل کے بارے میں "سیرِ افغانستان" میں لکھا ہے "ڈاکٹر اقبالؒ کی شاعری ان کے والد مرحوم کی زندگی ہی میں پورا فروغ پا چکی تھی، اور ایک عالم ان کے نغمے سے سرشار و مست تھا۔ اور مسلمانوں میں قیامت انگیز تاثر پیدا کر دیا تھا، اور بالآخر باپ اپنے بیٹے کی عیسیٰ نفسی سے مسرور ہو کر اس دنیا سے سدھارا۔" (سفرنامہ اقبال، مرتبہ حق نواز، ص ۲۳۴)

ان بالمشافہ ملاقاتوں کے علاوہ سید صاحب اور اقبال کے درمیان اصل ربط و ضبط جو ۱۹۱۴ء سے ہی قائم تھا مراسلت سے تھا۔ اس میں سے تقریباً اکہتر خطوط اقبال کے ہیں (جو دستیاب ہوئے ہیں اور دار المصنفین کی تحویل میں ہیں)۔ یہ خطوط ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء کے درمیان میں سید صاحب کو لکھے گئے تھے، دار المصنفین کی ایک البم میں محفوظ ہیں۔ اقبال اکیڈمی لاہور نے ان خطوط کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہا تھا، لیکن دار المصنفین نے انکار کر دیا۔ یہ خطوط مختلف علمی، فقہی اور سیاسی نیز فلسفیانہ مسائل سے متعلق استفسارات پر مشتمل ہیں۔ سید صاحب نے بھی تقریباً اتنے ہی خطوط تحریر کئے ہوں گے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اقبال نے جن موضوعات کے بارے میں سید صاحب سے رجوع کیا تھا، سید صاحب کے جوابات ان کے بارے میں ایک قیمتی اور مفید علمی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور دین و ادب کا اثاثہ شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن سید صاحب کے خطوط کا دستیاب نہ ہونا ایک بڑا علمی نقصان ہے، خود سید صاحب نے اقبال کے نام اپنے خطوط کے بارے میں لکھا تھا کہ میرے

پاس ان کی نقلیں بھی نہیں ہیں، اور اقبال کے پسماندگان کے پاس میرے وہ خطوط موجود بھی نہیں ہوں گے، شیخ عطاء اللہ مرحوم بھی یہ حسرت لے کر دنیا سے انتقال کر گئے کہ اگر سید صاحب کے جوابات مل جاتے تو انھیں علیحدہ ضرور شائع کرتا، لیکن ڈاکٹر مرحوم کے یہاں سے خود ان کے کلام کا کچھ حصہ اور ان کی دوسری تحریرات ایک شخص لیکر گیا ہوا ہے۔"
(انداز سخن صہ ۳۷)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے سید صاحب ہی نہیں دیگر مشاہیر کے خطوط کے بارے میں جناب اختر راہی مرتب "اقبال سید سلیمان کی نظر میں" کو لکھا تھا کہ "ایسے بیشتر خطوط انھوں نے اپنی زندگی میں وفات سے پہلے تلف کر دیئے تھے"۔ اب یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے کہ وہ کون شخص تھا جو اقبال کے کلام کا بعض حصہ اور دوسری تحریرات لے کر چلا گیا۔ ان تحریرات میں کیا سید صاحب کے خطوط بھی تھے؟ اور اگر یہ بات درست نہیں ہے تو یہ بھی غور طلب بات ہے کہ آخر اقبال نے مشاہیر کے خطوط کیوں تلف کئے تھے؟ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، مکاتیب سلیمانی کی اس تلفی سے وابستگان دامن سلیمانی اور اقبال شناسوں کی جو حق تلفی ہوئی ہے اُس کی کوئی تلافی نہیں ہوسکتی۔ اقبال نے سید صاحب کو جو خطوط لکھے وہ محض خیریت نامے نہیں تھے، بلکہ ہر خط میں کسی نہ کسی علمی، دینی مسئلہ کا ذکر تھا، یا اپنے اشکالات رفع کرنے کی درخواست کی گئی تھی، یا کسی سوال کا جواب مطلوب تھا۔ آئندہ سطور میں بعض اہم مسائل سے متعلق اقبال کے خطوط کے اقتباسات نقل کئے جائیں گے۔

اقبال جدید تقاضوں کے پیش نظر اسلامی فقہ کی تدوینِ جدید کو وقت کی اہم ضرورت سمجھتے تھے، جس طرح شبلیؒ تاریخ کی تدوینِ جدید زمانہ کے مذاق کے مطابق کرنا چاہتے تھے، اور اس کا کامیاب آغاز بھی کر چکے تھے۔ اسی طرح اقبال بھی فقہ اسلامی کی تدوینِ نو کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کی نظر میں یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس کو حل کئے بغیر اسلامی شریعت کو دورِ جدید کے موافق کیا جانا مشکل تھا۔ اکثر فقہی مسائل وراثت، عائلی قوانین، قانونِ شہادت، ملکیت، امانت، اجتہاد، اجماع وغیرہ کے سلسلے میں انھوں نے سید صاحب سے رجوع کیا تھا وہ خود بھی ان مسائل پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے اور سید صاحب سے بھی اس کا تقاضا کر چکے تھے، اپنے مکتوب مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۲۶ء میں لاہور سے لکھتے ہیں "اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے، اس بحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی ہے جو میری نظر سے گزری ہے، مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے، اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے مصنف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے، اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے۔ میں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا، مگر چونکہ میرا دل بعض اُمور کے متعلق خود مطمئن نہیں، اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا۔ (مکتوب مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۲۶ء از لاہور) ایک دوسرے خط مورخہ ۷ر اگست ۱۹۳۲ء میں

لکھتے ہیں " انشاءاللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔ اس میں آپ کے مشورے کی ضرورت ہے، بدور البازغہ بھی اسی مطلب کے لیے منگوائی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر قوانین اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے متعلق جو جو کتب آپ کے ذہن میں ہیں مہربانی کر کے ان کے ناموں سے مجھے آگاہ فرمائیے اور یہ بھی فرمائیے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی۔ (صرنہ، معارف مارچ ۱۹۵۵ء)

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے اسلام مغربی تہذیب و ثقافت کی زد میں آگیا تھا، اور جدید افکار و نظریات مسلمانوں کو تشکیک میں مبتلا کر رہے تھے، دنیائے اسلام ان سے مرعوب نظر آرہی تھی، برصغیر کے بہت سے دردمند اس صورتِ حال سے فکرمند تھے، اقبال اور سید صاحب بھی پریشان تھے اس سلسلہ میں اقبال سید صاحب کو لکھتے ہیں:

> " یوروپین افکار کی تاریخ کا اعادہ آج کی دنیائے اسلام میں ہو رہا ہے، ان حالات میں جو اس وقت کیفیت آپ کے قلب کی ہے وہ ایک حد تک نیچرل امر ہے، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ جو کام کر رہے ہیں وہ امتِ مسلمہ کے لئے ازبس مفید ہے۔ دنیائے اسلام اس وقت ایک روحانی پیکار میں مصروف ہے، اس پیکار و انقلاب کا رُخ متعین کرنے والے قلوب و اذہان پر شک و ناامیدی کی حالت کبھی کبھی پیدا ہو جاتی ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ کا قلب قوی ہے اور ذہن ہمہ گیر، آپ اس حالت سے جلد نکل جائیں گے۔
>
> (مکتوب مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۳۳ء اقبال اور سید سلیمان ندوی ـــــ محمد طاہر)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آرہا ہے جس کی ابتداء یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی، مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہنما نہیں ہے، اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں، نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لئے کیا کیا نتائج پیدا کئے۔ ہندوستان کی جمعیۃ العلماء کی توجہ اس طرف ضروری ہے۔ آپ چونکہ اس جمعیت کے صدر ہیں، اس واسطے آپ سے درخواست ہے کہ اس کام کو مستقل طور پر اپنے ہاتھ میں لیجئے، ندوہ کے دیگر ارکان یا فارغ التحصیل طلبہ کو بھی اپنے ساتھ ملائیے تاکہ اقوام اسلامیہ کو فقہ اسلامی کی اصل حقیقت معلوم ہو۔ میں نے سُنا ہے کہ البانیہ کے مسلمانوں نے وضو اُڑا دیا، اور ممکن ہے نماز میں بھی کوئی ترمیم کی ہو ترکی کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ مصر میں یہ تحریک جاری ہے اور عنقریب ایران و افغانستان میں بھی اس کا ظہور ہوگا، ایران کو بابیت سے اندیشہ ہے۔"

(مکتوب مورخہ ۲۴ راپریل ۱۹۲۶ء)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: " نظامِ عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے، ان حالات میں آپ کے خیال

میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک مدد ہو سکتا ہے۔ اس بحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیے اور اگر کوئی کتابیں ایسی ہوں جن کا مطالعہ اس ضمن میں مفید ہو تو ان کے ناموں سے آگاہ فرمائیے۔"

(مکتوب مورخہ ۱۵؍جنوری ۱۹۳۴ء معارف جلد ۵، ۱۹۵۵ء)

علمی اور دینی موضوعات کے علاوہ اقبال اور سید صاحب کے درمیان زبان و ادب اور ان کے متعلقات کے بارے میں بھی مراسلت رہتی تھی۔ اقبال سید صاحب سے استصواب کرتے رہتے تھے، اور سید صاحب کے جوابات پر اپنے اشکالات بھی ظاہر کر دیتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "قوافی سے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے بالکل بجا ہے، مگر چونکہ شاعری اس مثنوی سے مقصود نہ تھی، اس واسطے میں نے بعض باتوں میں عمداً تساہل برتا، اس کے علاوہ مولانا روم کی مثنوی میں قریباً ہر صفحہ پر اس قسم کے قوافی کی مثالیں ملتی ہیں۔" آگے لکھتے ہیں: "اصولِ تشبیہ کے متعلق کاش آپ سے زبانی گفتگو ہو سکتی۔ قوت واہمہ کے عمل کی رُو سے بیدل اور غنی کا طریق زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، گو کہ کتب بلاغت کے خلاف ہے۔ زمانہ حال کے مغربی شعراء کا بھی طرزِ عمل یہی ہے، تاہم آپ کے ارشادات نہایت مفید ہیں، اور میں ان سے مستفید ہونے کی پوری کوشش کروں گا۔" اسی خط میں فارسی کی بعض مثالوں کے بارے میں استصواب کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اگر آپ اجازت دیں تو لکھوں، محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میں نے غلط مثالیں تو انتخاب نہیں کیں۔"

(مکتوب مورخہ ۳؍اکتوبر ۱۹۱۸ء)

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال سید صاحب کے فضل و کمال کے معترف تھے، اور علمی و فنی اُمور میں سید صاحب سے رجوع کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد ہندوستان میں سوائے سید صاحب کے اور کون ہے۔" اسی طرح خود سید صاحب بھی اقبال کی شاعری فکر و فن اور ان کے فلسفہ اور نظریات کے قدردان تھے۔ یہ قدردانی سید صاحب کو اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی سے وراثت میں بھی ملی تھی۔ شبلی نے ۱۹۱۰ء میں ہی اقبال کے ستارہ کو عروج سے ہم آہنگ دیکھ کر کہا تھا کہ جب حالی اور آزاد کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے۔"

(انوارِ اقبال ۱۹۱۱ء، ص ۸۵)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقعہ پر شبلی نے قوم کی طرف سے اقبال کو پھولوں کا ہار پہناتے ہوئے کہا تھا کہ جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ ان کے لئے بڑی عزت و فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔"

(اقبال سید سلیمان کی نظر میں، ص ۱)

اقبال کی وفات پر سید صاحب نے شبلی کے تاثر کا حوالہ دیتے ہوئے معارف میں لکھا تھا "مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اس وقت پہچان لیا تھا جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغ شہرت نے بال و پر پیدا نہیں کئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے پیش گوئی کی تھی کہ آزاد اور حالی کی جو کرسیاں خالی ہوں گی ان میں سے ایک اقبال کی نسبت سے

پُر ہو جائے گی، افسوس کہ آج اڑتیس برس بعد وہ کرسی خالی ہوگئی، اور اب اس کے بھرنے کی کوئی صورت نہیں۔"

(معارف مئی ۱۹۳۸ء)

شبلی نے نہ سہی لیکن سید صاحب نے اقبال کے عروج اور ان کی شاعری کی عظمت و مقبولیت کو بڑے قریب سے دیکھا تھا، اور وہ ان سے ذاتی طور پر بھی انسیت اور عقیدت رکھتے تھے۔ بقول صباح الدین عبدالرحمٰن سید صاحب اپنے معاصرین میں ڈاکٹر اقبال سے بڑا گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ نجی مجلسوں میں کہا کرتے کہ عالم اسلام میں ایک عرصے کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا مفکر اعظم پیدا ہوا ہے۔ ان کو موحد خالص، رسولؐ کا شیدائی، دین کامل کا علمبردار، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور تجدید ملت کا طلب گار کہا کرتے تھے۔ (مقالہ اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے، معارف سلیمان نمبر ص ۶۴)۔ خود اقبال کی زندگی میں "رموزِ بے خودی" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے معارف اپریل ۱۹۱۸ء میں لکھا تھا: "زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو ان شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلہ میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے، لیکن حق یہ ہے کہ اس ایک لغزش مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ رفتاریں قربان ہیں۔ مصرعوں کے دروبست اور فصل و وصل میں قصور ممکن ہے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرع ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اتر جائے، شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفہ، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں اور اس لئے مخاطب اختلافِ مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک راہ سے بھی بچ کر نکل نہیں سکتا۔" (معارف اپریل ۱۹۱۸ء)۔ معارف کے اسی شمارہ میں زمانہ حال کے لئے مثنوی مولانا رومؒ کے دوسرے نسخہ کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اب حالت یہ ہے کہ ہمارے مشتعل قویٰ سرد ہو گئے ہیں، ہمارے خون کی گرمی محکومانہ برودت سے بدل گئی ہے، اور ہمارے قویٰ میں مفتوحانہ ضعف آگیا ہے ایسی حالت میں اگر پرانے نسخہ کا استعمال جاری رہا تو بردِ اطراف کے بعد شاید بردِ قلب کا باعث ہو جائے، اس لئے ضرورت تھی کہ ہمارے اہل دل شعراء "مثنوی مولوی روم" کا دوسرا نسخہ ہمارے لئے تیار کریں، شعرائے حال میں ڈاکٹر اقبال کو اللہ تعالے نے اس ضرورت کے لئے چن لیا۔ انھوں نے اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر دو مثنویاں لکھیں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" مسلمانوں کے قومی مزاج کو جن لوگوں نے پہچانا ہے وہ صرف تین شخص ہیں مولانا شبلیؔ نے آخری تین سال کے کلام میں، مولانا ابوالکلامؒ نے مجلدات "الہلال" میں، اور ڈاکٹر اقبالؔ نے اپنی ان دو مثنویوں میں۔"

(معارف اپریل ۱۹۱۸ء) انھیں مثنویوں کے بارے میں معارف کے جولائی ۱۹۳۸ء کے شمارہ میں بھی یہ تقریظ لکھی: "ڈاکٹر اقبال مرحوم نے ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء میں خودی و بیخودی کے اسرار فاش کئے، اور مسلم کامل اور مرد غازی

کے وہ فلسفیانہ اصول بنائے جس سے ایمانِ کامل یقینِ محکم اور عملِ پیہم پیدا ہو، جس سے مسلم قوم کی دینی و سیاسی زندگی تکوین پائے، اور اس کو روئے زمین کی امامت اور پیشوائی کا درجہ حاصل ہو، (معارف جولائی ۱۹۴۳ء)

سید صاحب اقبال کی شاعری کو محض شاعری نہیں بلکہ جدید علمِ کلام تصور کرتے تھے، اس موضوع پر سید صاحب نے مستقل ایک مقالہ بعنوان "ڈاکٹر اقبال کا علمِ کلام" سپردِ قلم کیا تھا اس میں کلامِ اقبال کو سائنسی دور کے عین مطابق قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ڈاکٹر اقبال کی شاعری نے اس تمدن، اس تہذیب اور اس فضا میں بال و پر کھولے ہیں، اس لیے انھوں نے اسلامی عقائد کا اثبات زیادہ تر ان کے عملی نتائج سے کیا ہے اور خودی کا جو فلسفہ ان کا مخصوص فلسفہ ہے اس سے انھوں نے ان مسائل کی تشریح و اثبات میں بھی کام لیا ہے، اس لئے ان کا طرزِ بیان قدیم علمائے کلام اور قدیم متکلم صوفی شعراء کے اندازِ بیان سے زیادہ اس کے رجحانِ مذاق کے مطابق ہے۔" (اقبال اور سید سلیمان ندوی، از محمد طاہر ص۱۳۹)

"پیامِ مشرق" پر بھی سید صاحب نے معارف کے شذرات میں اپنی رائے تحریر کی تھی، اقبال نے اس کی بڑی قدر کی اور اپنے لئے قابلِ افتخار بھی سمجھا، وہ لکھتے ہیں:

> "پیامِ مشرق' پر جو نوٹ آپ نے معارف میں لکھا ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں، پروفیسر نکلسن کا خط بھی آیا ہے، انھوں نے اسے بہت پسند کیا ہے، اور غالباً اس کا ترجمہ بھی کریں گے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب جدید اور اوریجنل خیالات سے مملو ہے، اور گوئٹے کے دیوان مغربی کا قابلِ تحسین جواب ہے مگر میرے لئے آپ کی رائے پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابلِ افتخار ہے۔"
>
> (اقبال نامہ جلد اول ص۱۱۱ بحوالہ یادگارِ سلیمان ص۲۰۳)

پھر جب ۱۹۳۸ء میں اقبال دنیا سے رخصت ہو گئے تو سید صاحب کی دور رس نگاہوں نے مستقبل میں بھی اقبال کی مقبولیت کا صحیح اندازہ لگایا اور ان کی تصنیفات کو اسلام کے غیر فانی لٹریچر سے تعبیر کیا:

> "اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یاد رہیں گی، وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر ان شاء اللہ رہے گا ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، تشریحیں کی جائیں گی، نظریئے ان سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا، اس کی دلیلیں ڈھونڈی جائیں گی، قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا رومیؒ اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا، اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں ان شاء اللہ زندہ رہے گا، اور اقبال زندہ جاوید۔" (معارف، مئی ۱۹۳۸ء)

آج سے پچاس برس قبل کا یہ جائزہ کس قدر صحیح تھا، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ علامہ سید

سلیمان ندوی کی نظر میں اقبال بھی ان مشاہیر میں تھے جن سے انھوں نے دارالمصنفین کے قیام کی نسبت صلاح ومشورہ کیا تھا، اور جن کو وہ اس ادارہ کا اعزازی رکن بنانا چاہتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: " ملک کے مشاہیر علم یا امرائے قدردانِ علم اس کے سرپرست و ارکان اعزازی ہوں گے" ان مشاہیر میں اقبال کا نام شامل تھا۔ (مکتوبات سلیمانی ص ۴۲ جلد اول)۔ اسی طرح ایک دوسرے خط مورخہ ۹ فروری ۱۹۱۵ء بنام مولانا دریابادی میں تحریر فرماتے ہیں: " دارالمصنفین کی نسبت ڈاکٹر اقبال، سید اکبر حسین عمادالملک اور مولوی حبیب الرحمٰن اور مولوی ابوالکلام سے گفتگو کر رہا ہوں"۔

(مکتوب سلیمانی ص ۳۸، جلد اول)

قدردانی، شخصیت شناسی اور فضل وکمال کے اعتراف میں اقبال نے بھی کچھ بخل سے کام نہیں لیا۔ سید صاحب کے مکاتیب کے علاوہ ان کے مقالات وشذرات سے اقبال برابر مستفید ہوتے رہتے تھے، معارف کے بارے میں تو ان کا خیال تھا " یہی ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے"۔ (معارف سلیمان نمبر ۱۹۵۵ء ص ۱۷)۔ سید صاحب ایک طرف معارف کے لئے اشعار کا تقاضا کرتے، دوسری طرف اقبال تواضع اختیار کرتے جاتے اور یہ کہتے " میں تو اپنے اشعار کو چنداں وقعت نہیں دیتا، لیکن جب ایڈیٹر معارف ان کے لئے تقاضا کرتے ہیں تو شبہ ہوتا ہے کہ شاید ایسا ہی کچھ ہوگا"۔ (اقبالنامہ جلد اول ص ۱۰۵، بحوالہ یادگار سلیمان)۔ معارف کے صفحات میں اقبال کے شعری مجموعوں پر تنقید وتبصرہ ہوتا تو اقبال خوش ہوتے، اور تنقید سے مستفید ہوتے، ۲۸ اپریل ۱۹۱۸ء کو تحریر کردہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> " رموز بیخودی میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی ہے، ریویو کے لئے سراپا سپاس ہوں، آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے انھوں نے میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے، مولانا شبلی کے بعد آپ استاذ الکل ہیں، اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا"۔ (اقبال نامہ جلد اول ص ۱۰۱ بحوالہ یادگار سلیمان)۔

دوسری طرف خود سید صاحب کی تصانیف سے بھی اقبال فیض حاصل کرتے، اور ایک سچے طالب علم کی طرح استفادہ کرتے۔ سیرتِ عائشہ رضؓ کے مطالعہ کے بعد سید صاحب کو لکھتے ہیں:

> " سیرۃ عائشہ رضؓ کے لئے میں سراپا سپاس ہوں، یہ ہدیہ سلیمانی نہیں، سرمۂ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا ہے، خدا تعالیٰ جزائے خیر دے"۔
>
> (معارف سلیمان نمبر ص ۱۶)

اسی طرح ۱۹۳۳ء میں "خیام" منظر عام پر آئی تو اقبال نے سید صاحب کو لکھا:

> " عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا۔ (مکتوب از لاہور مورخہ ۹ر دسمبر ۱۹۳۳ء بحوالہ معارف جنوری ۱۹۵۵ء)۔

سید صاحب تصنیف و تالیف کے علاوہ مشق سخن بھی فرمایا کرتے تھے، اور بحیثیت شاعر بھی اردو ادب میں ان کا اپنا ایک مقام ہے، بقول سید صباح الدین عبدالرحمن ”سید صاحب اپنے کو غیر فطری شاعر کہا کرتے تھے۔ لیکن ان کی شاعری کو ارباب نظر نے پسند کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۶ء میں سید صاحب کی ایک غزل کے بارے میں لکھتے ہیں:

آپ کی غزل لاجواب ہے بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا ؎

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا، اور چند نظمیں جو انھوں نے لکھی تھیں وہ نہایت مقبول ہوئیں، غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھئے، شاید اسی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے سید صاحب کبھی کبھی اس قسم کی نظمیں کہہ لیا کرتے تھے۔“ (معارف سلیمان نمبر مقالہ سوانح حیات از سید صباح الدین عبدالرحمن ص ۱)

ان سطور سے دونوں بزرگوں کے درمیان جس علمی ربط کا پتہ چلتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے دل و دماغ میں سید صاحب کے بارے میں بڑا گہرا تاثر تھا اور وہ سید صاحب کو ایک عقیدت مند کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سید صاحب اور اقبال کے درمیان اس تعلق میں معاصرانہ چشمک کبھی پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے وجود کو قوم و ملت کے لئے مفید اور ضروری خیال کرتے رہے تھے۔

مرتبہ: مسعود الرحمن خان ندوی

مباحثاتِ بزم

مقالات نشست اوّل ۴ ستمبر ۱۹۸۵ء بعد ظہر

زیر صدارت: پروفیسر خلیق احمد نظامی معتمد: عبداللطیف اعظمی روداد نگار: ڈاکٹر محمد فضل الرحمن ندوی

۱۔ کلیدی مقالہ از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب (صفحات ۲۶-۴۷)

صدر: آپ نے سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا مقالہ سنا۔ ایک کلیدی مقالہ میں جو خصوصیات ہونا چاہئیں وہ سب اس کے اندر موجود ہیں، اور اس میں ہر اس گوشہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس بزم کی آئندہ نشستوں میں بحث کا موضوع بن سکتا ہے، میں ان کے اس مفصل مقالہ کے لئے بہت شکر گزار ہوں۔

۲۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی تنقیدی بصیرت سیرۃ النبی کے حوالے سے از ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی (صفحات ۱۷۱-۱۹۵)

صدر: مولانا شبلی نے ۱۹۱۳ء میں الہلال میں کچھ مضامین لکھے تھے جن میں ان تمام اصولوں کو بیان کیا ہے جن کی روشنی میں وہ سیرۃ النبی کا کام کرنا چاہتے تھے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انہوں نے سیرت النبی کی تحقیق کا کام بہت اونچی محراب پر سجایا تھا، اس سلسلہ کے ایک مضمون کا پہلا جملہ یہ ہے کہ تیرہ سو سال میں علمائے حدیث نے سیرت کے مطالعہ میں تنقید سے کام نہیں لیا ہے، ساری تنقیدی صلاحیتیں اور اصول اسناد مسائل عبادات سے متعلق رہے، میری یہ کوشش ہوگی کہ محدثین کے وہی اصول نقد سیرت کے سلسلہ میں بھی استعمال کئے جائیں۔ پھر مولانا سید سلیمان ندوی نے جب جلد اول کا چوتھا ایڈیشن شائع کیا تو مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ استاد مرحوم علامہ شبلی کو بہت سی کتابیں میسر نہ تھیں اس لئے بہت سے فروتر ماخذ کے حوالے آگئے، لیکن اب جبکہ تمام چیزیں دستیاب ہوگئی ہیں میں نے ان سے پہلے کے بنیادی ماخذ سے استفادہ کیا اور ان کے حوالے دیئے۔ بہرحال میرا تاثر تو یہ ہے کہ علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی دونوں کے کام میں ایک مکمل تسلسل ہے اس لئے اس کو ایک جگہ سے علیحدہ کرکے دوسری جگہ سے شروع نہیں کیا جا سکتا، سید صاحب نے استاد کے کام کی مکمل روح برقرار رکھی ہے، دوزخ اور معجزات سے متعلق بعض بیانات سے خود سید صاحب نے رجوع کر لیا تھا جو مولانا اشرف علی تھانوی کی تعلیم کا اثر

تھا، آئندہ مقالہ بھی کیونکہ سیرت پر ہی ہے اس لئے سوالات ایک ساتھ کر لئے جائیں۔

۴۔ سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبیؐ اور جدید عربی کتب سیرت : از ڈاکٹر محمد راشد ندوی (صفحات ۲۹۴-۳۰۱)

اقبال احمد انصاری صاحب: سر سید احمد کی "خطبات احمدیہ" سیرت شبلی و سلیمان سے پہلے کی ہے اور سر سید و شبلی کے تعلقات کے باوجود ان کے درمیان بنیادی اختلافات حاضرین بزم سے مخفی نہیں۔ اس وقت کے مقالات اور صاحبِ صدر کے ملاحظات سن کر میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ علامہ شبلی و مولانا سید سلیمان کی سیرۃ النبیؐ پر سر سید کی خطبات احمدیہ کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں؟ اگر پائے جاتے ہیں تو کس حد تک؟

صدر: صورت حال یہ ہے کہ ہر عہد کے تقاضوں کے مطابق کتابیں لکھی جاتی ہیں اور علم کلام کا ارتقاء ہوتا ہے۔ سر سید کے زمانے میں سائنس اور مذہب کا معرکہ برپا تھا، تاریخ عالم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دور ہر مذہب میں آیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبۂ علی گڑھ کے مطابق یہ دور یورپ میں آیا اور نکل گیا لیکن ہندوستان میں یہ معرکہ بہت عرصہ تک جاری رہا۔ سر سید نے اپنی تمام تحریریں بشمول خطبات احمدیہ اسی معرکہ کے زیر اثر لکھیں۔ لیکن ہندوستان میں اس معرکہ کا زور ٹوٹا تو مولانا آزاد نے کہا کہ سائنس سے مذہب کی تطبیق کی کوشش ہی بیکار ہے، کیونکہ آج ایک سائنسی نظریہ صحیح سمجھا جاتا ہے کل وہ غلط ثابت ہوتا ہے لیکن مذہب کی بنیادی حقیقتوں کو اس طرح نہیں بدلا جا سکتا، اگرچہ مولانا آزاد بھی اپنے زمانہ کے رجحانات انسان دوستی اور یورپ کی انسان دوستانہ تحریکات سے متاثر تھے جو مذاہب عالم کو انسانی قلوب میں محبت پیدا کرنے والے عنصر کی حیثیت سے پیش کر رہی تھیں۔ خود مولانا آزاد نے بھی ربوبیت کا نیا تصور پیش کیا۔

بہر حال سر سید کی مساعی اپنے عہد کے لحاظ سے بالکل صحیح تھیں لیکن علماء نے ان کی طرف توجہ نہ کی سوائے مولانا عبدالحلیم شرر کے (اگر آپ ان کو عالم کہہ سکتے ہوں) کہ انہوں نے نہ صرف اس کا NOTICE لیا بلکہ "سر سید کی دینی برکتوں" کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ لکھا، لیکن علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے نہ ان کی تردید کی نہ تائید، سر سید کی "خطبات احمدیہ" کے مطالعہ سے ضرور یہ خیال ہوتا ہے کہ سید صاحب کی "ارض القرآن" پر اس کا کچھ اثر ہو جو علامہ شبلی کی حیات میں "سیرۃ النبیؐ" کے ایک باب کی حیثیت سے لکھی گئی تھی، لیکن "سیرۃ النبیؐ" کے بارے میں یہ خیال بالکل صحیح نہیں۔ اگرچہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سر سید نے علامہ شبلی سے عربی میں ایک کتاب سیرت نبوی پر لکھوائی تھی۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی: میرے خیال میں سر سید اور شبلی و سلیمان کے انداز فکر میں بنیادی

اختلاف ہے، سرسید معذرت خواہانہ نقطۂ نظر کے حامل نظر آتے ہیں، تو شبلی و سلیمان ذہن و فکر کو جلا دینے والے مثبت انداز فکر کے ساتھ جلوہ گر ہیں، وہ شکوک و شبہات کے تسلی بخش جوابات دے کر تسکین روح کا سامان فراہم کرتے ہیں، اس وجہ سے دونوں نقطۂ نظر میں تطبیق کی کوشش کا کوئی جواز نہیں ہے،

صدر: سرسید کا شبلی و سلیمان کے علمی تبحر اور دینی بصیرت کے لحاظ سے کوئی مقابلہ نہیں، اس لئے مذکورہ ملاحظات کو اس روشنی میں نہیں دیکھنا چاہیئے۔

اقبال احمد انصاری صاحب: نقطۂ نظر کو بالکل رد کرنے کے باوجود بھی کسی عالم کی علمی تحقیقات سے استفادہ اور تاثر عین ممکن ہے۔ لیکن صرف سوال کی حد تک یہ بات میرے ذہن میں اس لئے آئی کہ مجھ سے ایک مستند عالم دین نے ایک بار کہا کہ "خطبات احمدیہ" کے نتائج تحقیق نے بعد کی تمام ہندوستانی کتب سیرت کے لئے مأخذ کا کام انجام دیا ہے، جب کہ پروفیسر نظامی صاحب نے فرمایا کہ شبلی نے سرسید کی مساعی سے صرف نظر کیا اور اغماض برتا اور تیرہ سو سال میں سیرت نگاری کی کوئی قابل لحاظ کوشش سامنے نہیں آئی، حالانکہ سرسید نے خطبات احمدیہ میں جمعِ مواد، تفحص اور تنقید و تحقیق کا حق ادا کیا ہے، اور میرے خیال میں ان کی بعض باتیں اب بھی مستند ہیں، اس لئے عقائد کے بارے میں سرسید کے موقف اور ان کے کلامی نقطۂ نظر کو رد کرنے کے باوجود ان کی بہت اہمیت ہے، جس جذبہ سے سرشار ہو کر انھوں نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے وہ قابل ستائش ہے اگر کوئی ان کے کاموں کو علمی مأخذ کے طور پر استعمال کرے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، پروفیسر نظامی صاحب کے اس جواب سے میری تشفی ہوئی کہ "ارض القرآن" میں کچھ اثر معلوم ہوتا ہے، ممکن ہے بعض اور مقامات پر بھی اثرات پائے جاتے ہوں، میرے خیال میں اس پر مزید تحقیق کی گنجائش ہے۔

مقالات نشست دوم ۵ ستمبر ۱۹۸۵ء صبح

زیر صدارت: جناب سید صباح الدین عبدالرحمن   معتمد: ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی   روداد نگار: جناب حمید اللہ ندوی

۴۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی کارناموں پر ایک نظر، از پروفیسر خلیق احمد نظامی (صفحات ۴۸-۶۲)

اقبال احمد انصاری: اس فاضلانہ مقالہ کی پوری قدر و قیمت کے ساتھ مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ اقبال کے خطبات پر سید سلیمان ندوی کے اثرات کا احساس کچھ زیادہ ہی مبالغہ آمیز ہے، میری رائے میں ایک خطبہ میں تو اثرات براہِ راست تلاش کئے جا سکتے ہیں لیکن ان کے دوسرے خطبات میں ان کے اپنے خاص نظام فلسفہ کے مطابق ایسی باتیں بھی ہیں جو مسلمہ اسلامی معتقدات سے پوری مطابقت نہیں رکھتیں۔ دوسری

بات آپ نے آخر زمانہ میں اقبال کے تصوف میں پناہ لینے کی کہی ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ تصوف کے لحاظ سے اقبال کے تین دور رہے ہیں: پہلا ایران کی الٰہیات پر مقالہ پیش کرنے کا زمانہ ہے، جب وہ خود وحدۃ الوجود کے ایک طرح سے قائل تھے جیسا کہ ان کے ایک استاد نے اپنے ایک خط میں ان کو یاد دلایا تھا۔ دوسرا دور اسرار و رموز کے زمانہ یعنی ۱۹۱۴-۱۵ء کا جب انھوں نے تصوف خصوصاً وجودی تصوف کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ اور تیسرا وہ دور ہے جب ابن عربی اور منصور حلاج کی تحریروں کے مطالعہ کے نتیجہ میں دونوں کی طرف ان کے رویہ میں تبدیلی آئی جیسا کہ ان کے خطبات سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن خود وجودی تصوف کے بارے میں اس آخری دور میں بھی ان کا موقف تبدیل نہ ہوا، اگرچہ تصوف جو ابتداء سے ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا، ان کی شخصیت، شاعری اور پیغام کا جزو اعظم بنا رہا۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی: اس پرمغز مقالے میں سید صاحبؒ کے تصوف پر کچھ نہ لکھنے کی بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ کسی مقالہ یا کتاب کی صورت میں ہمارے پاس ان کی کوئی یادگار تحریر نہیں ہے لیکن سلفیت سے بڑھ کر توہّب کے علمبردار مسعود عالم ندوی کے نام ان کے جماعت اسلامی سے ارتباط کے زمانہ کی مراسلت میں مسعود عالم ندوی ہی کے الفاظ میں ایسے خطوط بھی ہیں جو تصوف کی بڑی بڑی تصنیفوں پر بھاری ہیں۔ اس لئے اس موقع پر میری دار العلوم ندوۃ العلماء اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے ذمہ داروں سے یہ گذارش ہے کہ ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے سید صاحبؒ کے ایسے خطوط کو جمع کر کے شائع کرنا بہت ضروری اور اہم خدمت ہے۔

پروفیسر مشیر الحق: ابتداءِ مقالہ میں معاصرت کے حجاب کا تذکرہ کرتے ہوئے آنجناب نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر اقبال کے درمیان وہ حجاب نہیں تھا، لیکن درحقیقت معاملہ یک طرفہ معلوم ہوتا ہے، یعنی سید صاحبؒ تو اقبال کی حیات میں ان کا کھلم کھلا اعتراف کرتے ہوئے، ان کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے، معارف کے صفحات پر ان کے محاسن کو نمایاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن اقبال کو پڑھیے تو کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس دور میں کہیں سید سلیمان ندوی کا وجود بھی تھا، یہاں اقبال کے ان ذاتی خطوط کا تذکرہ نہ کیجیے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے اور جن سے ہم کو ان کی نظر میں سید صاحب کا مرتبہ معلوم ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کے خیالات کا ذریعہ اظہار شعر زیادہ تھا اور نثر کم، یہ بھی سچ ہے کہ وہ نہ کسی اخبار کے مدیر تھے نہ کسی رسالہ کے نگراں، لیکن آخر انھوں نے اپنی شاعری میں بھی تو شخصیات پر خامہ فرسائی کی ہے؟ اس لئے اگر یہ معاصرت کا حجاب نہیں تو پھر کیا تھا جس نے ان کو سید صاحب کے علانیہ اظہارِ اعتراف سے باز رکھا؟

پروفیسر خلیق احمد نظامی: میرے مقالہ کا ابتدائی حصہ غالباً آپ نے غیر شاعرانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کی، میرا مقصد صرف یہ تھا کہ عموماً معاصرین اپنے زمانہ کی اہم شخصیات کے کارناموں کے دوررس اثرات کا اندازہ نہیں کر پاتے، بہت سے لوگوں کو ہم نے بھی دیکھا لیکن ان کی زندگی میں یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کتنے عظیم تھے۔ اسی لئے میں نے شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی مثال دی جن کا اگرچہ لوگوں نے بہت احترام کیا لیکن جو بات مرزا مظہر جان جاناں نے محسوس کی اس کو ایک شاعر کی حساس روح ہی سمجھ سکتی تھی۔ آپ نے اس بارے میں جو ایک نیا پہلو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ میرے خیال میں بالکل بے بنیاد ہے، یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ اقبال مستقل طور پر ایک منافقانہ نقاب ڈالے ہوئے تھے، وہ سید صاحب کو ذاتی طور پر لکھتے کچھ تھے۔ اور ان کا عمل کچھ اور تھا۔ انھوں نے بعض لوگوں کے انتقال پر شعر کہے تو سید صاحب کا انتقال ان کے پندرہ برس بعد ۱۹۵۳ء میں ہوا۔ اس لئے اس کا موقع ہی نہ آیا، اور پھر ایک شاعر کے لئے یہ ضروری بھی نہیں کہ وہ ہر ایک کے لئے شعر کہے، وہ تو صاحب پیغام شاعر تھے، اور ان کا پیغام سب کے لئے عام تھا۔

خطبات کے سلسلہ میں عرض کروں گا کہ اگر دو چیزیں بیک وقت پیش نظر رہیں یعنی اقبال نامہ علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا انور شاہ کشمیری کے نام مختلف فقہی مسائل سے متعلق مراسلت اور پھر خطبات کا کا باب THE PRINCIPLE OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے بنیادی چیزیں کس طرح اور کہاں سے حاصل کیں، مثلاً شاہ ولی اللہ دہلوی صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ ہر ملک کا قانون وہاں کے باشندوں کے مخصوص حالات و رجحانات کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اقبال نے یہ اقتباس سید صاحب کو بھیجا اور ان کی رائے معلوم کی۔ پھر یہ پورا اقتباس اپنے خطبات میں اسی وضاحت کے ساتھ شامل کیا جو سید صاحب نے اپنے جواب میں تحریر کی تھی۔ میں نے اپنے مقالہ میں یہ بات سرسری طور پر نہیں بلکہ دونوں چیزوں کو سامنے رکھ کر کہی تھی، نیز اقبال کوئی فقیہ تو تھے نہیں خود ان کے مراسلت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت سے بنیادی فقہی مسائل پر سید صاحب کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اقبال سے یہ توقع رکھنا بے سود ہے کہ وہ ان مسائل میں آخری رائے دیں۔ میں حضرت مولانا علی میاں صاحب کے عربی میں اقبال پر خطبات میں مذکور اس بات سے پوری طرح متفق ہوں کہ اقبال بعض مقامات پر اس حد تک چلے گئے ہیں جس سے اتفاق رائے اب بھی ممکن نہیں ہے، بہر حال اقبال کے ہاں یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی غیر معمولی بات کہنا چاہتے ہیں، اور پھر جھجک جاتے ہیں، یہ کس کا اثر تھا جو اقبال کو بات مکمل کرنے سے باز رکھتا تھا۔ انھوں نے تو خود ایک بار کہا تھا کہ میں

مسلمانوں میں کسی کا لیڈر رہوں، نہ کسی کا دستِ نگر: جو بات میرے ذہن میں آتی ہے کہہ دیتا ہوں، لیکن بہرحال وہ مسلمانوں کی اجتماعی نفسیات سے پوری طرح واقف تھے، مسلم معاشرہ کے مسائل کا ان کو پورا پورا ادراک تھا، انھوں نے اپنی سمجھ کے مطابق بہت سی باتیں کہیں جن سے آج بھی شاید پوری طرح اتفاق نہ کیا جا سکے (جیسے اجماع کے بارے میں ان کی رائے) لیکن وہی اقبال اپنے کلام میں یہ کہتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں ع اجتہاد اندر زمانِ انحطاط۔ یعنی انحطاط کے زمانہ میں اگر اجتہاد کرو گے تو قوم درہم برہم ہو جائیگی، یہ ایک ہی اقبال ہے، لیکن جب وہ یہ کہتا ہے تو معاشرہ کی مختلف نبضوں پر اس کا ہاتھ ہوتا ہے۔

آپ کی دوسری بات تصوف کے بارے میں ہے، یہ چیز بالکل واضح ہونی چاہیئے کہ ایک عجمی تصوف ہے جس کو کسی صورت میں اسلامی تصوف نہیں کہا جا سکتا، دوسرا تصوف جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے اسلام کی روح کہا ہے وہ بالکل علیحدہ ہے اور اسی کو اقبال نے مانا ہے، اقبال پر مختلف دور آئے جس کے سلسلہ میں آپ نے وحدۃ الوجودی تصوف کا لفظ استعمال کرکے بات کو خود مکمل کر دیا ہے، ایک زمانہ میں اقبال اس کے بڑے مبلغ تھے، لیکن پھر ایک حدیث ان کے سامنے آئی جس میں یہ کہا گیا ہے کہ مسلمانوں میں میں ایک انحطاط کا زمانہ آئے گا جس میں سِمَن کا ظہور ہوگا، اس سے انھوں نے اپنے ایک مضمون (شائع شدہ "وکیل" امرتسر ۱۹۱۰ء) میں تصوف کا عروج مراد لیا تھا، پھر ان کی رائے بدلی جیسا کہ آپ نے بتایا، لیکن یہ ایک علیحدہ چیز ہے، کیونکہ ایک فکر مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے متاثر ہوتی ہے، اقبال عجمی تصوف کے خلاف تھے، اس کو نہیں مانتے، لہٰذا وہ اخیر تک کہتے رہے کہ ع یہ امت خرافات میں کھو گئی۔ لیکن ایک تصوف وہ ہے جو اسلام کی روح ہے، وہی اقبال کا تصور خودی ہے۔

صل ر: ایک صاحب نے سید صاحبؒ کی تصوف پر تحریروں کو جمع کرکے شائع کرنے کی ذمہ داری دارالمصنفین پر عائد کی ہے، ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ سید صاحب کے صوفیانہ خیالات پر دو کتابیں لکھی جا چکی ہیں: ایک جناب غلام محمد صاحب کی "تذکرۂ سلیمان"، اور دوسری پروفیسر محمد اشرف (شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی) کی "سلوک سلیمانی" دو جلدوں میں، ان دونوں کتابوں میں بہت سارے وہ خطوط بھی جمع کر دیئے گئے ہیں جو سید صاحب نے اپنے مسترشدین کے جواب میں لکھے، جن حضرات کو سید صاحب کی زندگی کے اس گوشہ سے زیادہ دلچسپی ہو وہ ان کتابوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں، دارالمصنفین نے جو علمی، ادبی، دینی، تاریخی کام اپنے ذمے رکھے ہیں وہ خود بہت متنوع، وسیع اور ضروری ہیں، یہ تو اپنے اپنے ذوق کی بات ہے، ایک سفیر صاحب نے مذکورہ کتابوں میں سے ایک کا اشتہار دیکھا تو انھوں نے خاص طور پر امریکہ میں منگا کر پڑھا، ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ بھائی! اس میں ہم کو مولانا سید سلیمان ندوی تو نظر نہیں آئے، کچھ اور نظر آئے ہیں

نے عرض کیا کہ وہ کتاب آپ جیسے لوگوں کے لئے "نہیں لکھی گئی ہے"، جن لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے وہ ان کو اس میں نظر آتے ہیں، "تھوڑا انتظار کیجیے، آپ جس سید سلیمان ندوی کی تلاش میں ہیں وہ آپ کو "حیات سلیمان" میں ملیں گے"۔ چنانچہ اشاعت کے بعد جب یہ کتاب ان کو بھیجی تو انہوں نے لکھا کہ اس میں سید صاحب نظر آئے۔

رہا اقبال اور سید صاحبؒ کا معاملہ تو میں ذاتی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ سید صاحب اپنی زندگی میں جن معاصرین سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال تھے، سید صاحب نے ان دونوں پر جو نوحے لکھے ہیں وہ ان کے شاہ پاروں میں ہیں۔ اقبال کے ساتھ سفر افغانستان سے واپسی کے بعد تو سید صاحب اپنی نجی مجلسوں میں اکثر کہا کرتے تھے کہ اتنا بڑا مفکر اسلام صدیوں بعد پیدا ہوا ہے، ان کی وفات پر اپنے تعزیتی شذرات میں لکھتے ہیں: "وہ فتح اسلام تھے، مشرق کی آبرو تھے ان کا ہر ترانہ بانگ درا تھا، ان کا ہر کلام جاوید نامہ ہے، وہ ہم کو ایک نئی زندگی دے گئے" وغیرہ۔ اقبال نے اپنے خطوط میں سید صاحب کے بارے میں وہ جملے استعمال کئے جو ہندوستان میں ان کے شاگردوں نے بھی نہیں لکھے: "جوئے شیر اسلامیہ کا فرہاد وہ لکھ رہا ہے جو خود اپنے وقت کا فرہاد تھا"، استاد الکل، رئیس المصنفین، رئیس العلماء جن سے کتنی سوکھی ندیاں سیراب ہو رہی ہیں، وغیرہ ایسے کتنے ہی جملے جن سے سید صاحب کے مطالعہ کی شاہراہیں کھلتی ہیں، ان کی جگہ اگر وہ ان پر ایک مضمون لکھ دیتے یا دو چار شعر کہہ دیتے تو یقیناً وہ کیفیت پیدا نہ ہوتی جو ان معنی خیز جملوں میں پائی جاتی ہے۔

۵۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی ملفوظات از مولانا ابوالعرفان ندوی (صفحات ۵۰۲-۵۰۵)

پروفیسر مشیر الحق: مجالس مذاکرہ میں وقت کی تنگی کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے پہلے ہی اپنے مقالہ میں اختصار سے کام لینے کا جواز فراہم کر لیا تھا، لیکن سید صاحب کے علمی ملفوظات ایک ایسا نیا موضوع ہے جس کی طرف لوگوں کی توجہ ابھی تک نہیں ہوئی ہے، اور لوگ جن کو سید صاحب سے براہ راست فیض اٹھانے کا شرف حاصل ہے ان میں آپ کو قریبی تعلق حاصل رہا ہے، اس لئے آپ سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں ان کو قلمبند فرما کر اس علمی ذخیرہ کو محفوظ فرما دیں گے۔

۶۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی تاریخ نگاری "عرب و ہند کے تعلقات" کی روشنی میں از ڈاکٹر عبدالباری (صفحات ۱۵۵-۱۶۲)

صدر: اس فاضلانہ مقالہ کو سن کر مجھے ذاتی طور پر خوشی ہوئی کہ اس میں سید صاحب کی تاریخ نگاری کا ایک اچھا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ارض القرآن کا نام سید صاحب نے "تاریخ ارض القرآن" رکھا "عرب و

ہند کے تعلقات" اور "عربوں کی جہاز رانی" خالص تاریخی کتابیں ہیں، لیکن ان کتابوں میں کار فرما روح اس دیار سے تعلق رکھتی ہے جس کے رسولؐ کی سیرت کی سرشاری اور خمار میں وہ ہمیشہ مست رہے، ایک بار مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ایک جملہ لکھا کہ "ہم کو فردوسی کی ضرورت ہے محمود غزنوی کی نہیں، امیر خسرو کی ضرورت ہے علاء الدین خلجی کی نہیں۔" سید صاحب نے لندن سے لکھا کہ یہ نہ لکھنا چاہئے تھا، کیونکہ محمود غزنوی کی بدولت فردوسی پیدا ہوئے اور علاء الدین خلجی کی بدولت امیر خسرو نے بہت سے کام کئے، اسی لئے اس کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے، لیکن رفتہ رفتہ ان کا ذوق بدلتا گیا، مجھ سے خود فرمایا کرتے تھے کہ میں تاریخ کو ایک فن تو نہیں سمجھتا، لیکن اس ذوق کا تعلق ایک خاص عینک لگانے سے ہے اور اس ذوق میں بھی تبدیلی ہوتی ہے، وہ بچہ ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے پھر بوڑھا ہوتا ہے مجھ کو تاریخ ہند کے کام پر انھیں نے مامور کیا تھا، فرماتے تھے کہ ممکن ہے جب تمہارا ذوق بوڑھا ہوگا تو تم بھی اسی نتیجہ پر پہنچو۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ فن کے لحاظ سے تاریخ نہ لکھی جائے۔

۷۔ علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت شاعر از جناب اختر سعید خاں صاحب (صفحات ۲۴۴-۲۴۹)

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی: ایک شاعر و ادیب سے اپنی یہ خلش دور کرنے کا بہترین موقع ہے کہ سید صاحب کے شعر

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

کو بعض ادبی تحریروں اور تذکروں میں مولانا احسن مارہروی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس کے برخلاف صرف علامہ اقبال کا ایک خط سید صاحب کے نام ہے جس میں اس مرصع غزل کو انھوں نے بہت پسند فرمایا اور خاص طور پر مذکور شعر کی ان کو خوب داد دی اس سلسلہ میں آپ سے اپنی تسلی کے لئے یہ معلوم کرنا تھا کہ مذکور سند کے علاوہ کوئی اور شہادت بھی آپ کی نظر میں ہے جس سے ڈاکٹر اقبال کی رائے کی تائید ہوتی ہو؟

جناب اختر سعید خان صاحب: اس سلسلہ میں اگرچہ میں نے کوئی خاص تحقیق نہیں کی ہے، لیکن علامہ اقبال کے خطوط میں اس شعر کی نسبت سید صاحب کی طرف بالکل واضح ہے، سید صاحب کے مجموعۂ کلام "ارمغان سلیمان" مطبوعہ ۱۹۶۵ء میں بھی یہ شعر شامل ہے، اور ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی کے حال میں شائع شدہ تحقیقی مطالعہ میں بھی اس شعر پر کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔

صدر: سید صاحب کی طرف اس شعر کی نسبت میں کوئی شبہ نہیں ہے، ان کے مجموعۂ کلام کی اشاعت سے پہلے یہ غزل معارف میں بھی شائع ہو چکی ہے، خود سید صاحبؒ کی زبانی ڈاکٹر اقبال

کی پسندیدگی اور داد کے بارے میں ہم لوگ سنتے رہے ہیں، اس لئے مولانا احسن مارہروی کی طرف اس کی نسبت کسی غلط فہمی کی بنا پر کی گئی ہوگی۔

جناب اختر سعید صاحب نے بہت اچھا مقالہ پڑھا، ایک چیز قابل توجہ یہ ہے کہ سید صاحب نے جوش کی کفریاتی نظم کا ترکی بہ ترکی جواب بھوپال ہی کے قیام میں دیا تھا، جس کا بھوپال کے اس جشن میں ایک بھوپالی شاعر و ادیب کے مقالہ میں ذکر ضروری تھا، کیونکہ وہ نظم "پاپوش بر سر جوش" ہے اور اس کی ہر لحاظ سے بڑی اہمیت ہے۔

۸۔ سیرۃ النبی جلد چہارم کے بعض قرآنی مباحث از جناب ضیاء الدین اصلاحی (صفحات ۸۱-۱۰۳)

ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی: مولانا ضیاء الدین صاحب نے میرے مقالہ کے سلسلہ میں ایک سوال اٹھایا ہے جس کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ میں سید صاحبؒ کے "رجوع و اعتراف" والے شذرہ سے واقف تھا، اور اس سے میری تائید ہوتی ہے کہ جب سید صاحبؒ پر اپنی کوئی غلطی واضح ہو جاتی تھی یا ان کا فکری و ذہنی رنگ بدل جاتا تھا تو وہ اس کا اعتراف کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ منتظمین دار المصنفین کو میں اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ "سیرۃ النبی" کے موجودہ اڈیشنوں سے عام قاری کو یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ سید صاحب نے کن نظریات و مسائل سے رجوع فرما کر جمہور کا مسلک قبول فرما لیا تھا، اس لئے گذارش ہے کہ ایسے مقامات پر آئندہ ایڈیشن میں وضاحتی نوٹ بڑھا دیئے جائیں تو کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو۔

جناب ضیاء الدین اصلاحی: ڈاکٹر یسین صاحب کے مقالہ پر بحث کی نوبت نہیں آئی تھی، لیکن اس سے یہی مترشح ہو رہا تھا کہ ان کو "رجوع و اعتراف" کا علم نہیں ہے یا کسی مصلحت کی وجہ سے انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ توضیحی نوٹ کے بارے میں ان کی بات واقعی قابل توجہ ہے، یقین ہے کہ ناظم دار المصنفین جن کی صدارت میں یہ نشست ہو رہی ہے اس مشورہ کا خیال رکھیں گے۔

ڈاکٹر سید حامد حسین: "سیرۃ النبیؐ" جلد چہارم سے اصلاحی صاحب نے ایک جملہ نقل فرمایا ہے: "سَمَت ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو" میں نے بھی اس کو پڑھا ہے، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "جوف" کی جگہ کہیں کتابت کی غلطی سے "خول" نہ چھپ گیا ہو؟ اس لئے مسودہ دیکھ کر اس کی تحقیق کر لینا چاہیئے، کیونکہ جملہ کی ساخت اور ترتیب الفاظ کے لحاظ سے "اندر خول ہونا" کھٹکتا ہے۔

جناب ضیاء الدین اصلاحی: مسودہ دیکھ کر تصحیح کر لینے میں حرج نہیں، لیکن دونوں کے معنی و مفہوم تو ایک ہی ہیں، مولانا محبوب الرحمٰن صاحب جن کی لغت پر نظر ہے، وہ یہاں تشریف رکھتے ہیں، ممکن ہے اس پر زیادہ روشنی ڈال سکیں۔

جناب محبوب الرحمٰن ازھری: عربی لفظ سَمت کا ٹھوس، صحیح ترجمہ ہے، اب اس کی مزید وضاحت کے لئے جوف یا خول دونوں ہم معنی ہیں، پہلا لفظ عربی ہے تو دوسرا عجمی، اس لئے اگر جوف کے بجائے خول استعمال کیا گیا ہے تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں، بلکہ اردو زبان کے سیاق میں خول ہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

۹۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی تحقیقات مقالات کے حوالے سے از عبید اللہ فہد (صفحات ۱۰۴-۱۱۳)

۱۰۔ مقدمات سلیمانی از پروفیسر بشیر الحق (صفحات ۲۴۲-۲۴۹)

جناب اختر سعید خان: سب سے پہلے تو اس خوبصورت تحریر کا اعتراف کرتا ہوں جو ابھی آپ نے سنی، تنقیدی مضامین اتنے سلجھے ہوئے، اتنے دلنشیں اور اتنے معنوی انداز سے کم سننے میں آتے ہیں، لیکن دو ایک باتیں مجھے فاضل مقالہ نگار سے معلوم کرنا ہیں، ایک تو یہ کہ مقدمہ کا معیار اور اس کی مختلف تعریفیں بیان کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مقدمہ کبھی کبھی کتاب بن جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ اگر کوئی مقدمہ کتاب بن جائے اور کتاب کی شکل میں شائع ہو تو اس کو ہم اس مضمون میں کس طرح شامل کر سکتے ہیں جو محض مقدمات کے بارے میں ہے؟ مثال کے طور پر سیرۃ النبیؐ کا مقدمہ جو کتاب کی شکل اختیار کر گیا اور دو جلدوں میں علیحدہ شائع ہوا، اس کو آپ کے مقالہ میں زیر بحث مقدمات میں شامل کر کے ہم اس موضوع کے ساتھ کس حد تک انصاف کر سکتے ہیں؟

دوسری بات یہ کہ سید صاحب کے مقدمات کے سلسلہ میں آپ کے حوالے یقیناً بہت خوبصورت ہیں، لیکن موجودہ مقالہ سے یہ روشنی نہیں ملتی کہ سید صاحب نے مقدمات تحریر کرتے وقت ان ادبی کتابوں اور ان کے مصنفین کے ساتھ کہاں تک انصاف کیا ہے؟ یا وہ محض تاثراتی ہیں؟ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی اپنے مختصر سے مضمون میں ایک مقدمہ یا تعارف کا حوالہ دیا تھا، اس کے سحر سے آج تک آزاد نہ ہو سکنے کے اعتراف کے باوجود یہ یقینی ہے کہ وہ جگر کی شاعری کے تنقیدی تجزیہ کے بجائے ایک تاثراتی ادبی شاعرانہ تحریر ہے، آپ کے اس گرانقدر مضمون میں مجھے اس بات کی تلاش تھی کہ سید صاحبؒ اپنے مقدمات کی تحریروں میں تنقیدی معیار کو کہاں تک ملحوظ رکھتے تھے؟

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی: وکیل جناب اختر سعید صاحب نے ایک

مقدمہ اس عدالت میں دائر کیا ہے جہاں مدعی، مدعا علیہ اور گواہ سب موجود ہیں، اس کے سلسلہ میں میری محدود معلومات کے مطابق عرض یہ کرنا ہے کہ "سیرۃ النبیؐ" پر علامہ شبلیؒ کا مقدمہ فنِ تاریخ نگاری کے اصول و معیار پر بھرپور اور مکمل ہے۔ اور سید صاحب کی "تاریخ ارض القرآن" بنیادی طور پر "سیرۃ النبیؐ" کا پہلا باب تھا جو پھیلتے پھیلتے ایک مستقل تصنیف بن گیا۔ ڈاکٹر مشیر الحق صاحب سے میں دریافت کرنا چاہوں گا کہ میری یہ معلومات صحیح ہیں یا نہیں؟

پروفیسر مشیر الحق: میری توقع کے برخلاف کچھ نہ کچھ گرمی تو پیدا ہو ہی گئی۔ "تاریخ ارض القرآن" سے متعلق دو سوال تو تقریباً ایک ہی نوعیت کے ہیں یعنی یہ کہ اس کو کس حد تک مقدمہ کہا جا سکتا ہے؟ یا یہ کہ وہ سیرت کا پہلا باب تھا؟ یقیناً اب یہ بتانا تو بہت مشکل ہے کہ علامہ شبلیؒ کی ہدایت کے مطابق سید صاحبؒ اس کو مختصر کر دیتے تو "تاریخ ارض القرآن" سیرت کے مقدمہ کی حیثیت سے شائع ہوتی یا اس کے پہلے باب کی حیثیت سے؟ کیونکہ "سیرۃ النبیؐ" کے تمام ابواب کا تعلق صاحبِ سیرتؐ سے اتنا گہرا ہے کہ میری رائے میں اس کو مقدمہ ہی میں جگہ مل پاتی۔

دوسرا سوال سید صاحب کے مقدمات میں تاثراتی رنگ اور تنقیدی معیار سے متعلق تھا میری رائے میں سید صاحب کی ان تحریروں میں اگر کہیں تاثراتی رنگ در آیا بھی ہے تو وہ تنقیدی معیار کو نظر انداز کر کے نہیں، وہ تو ان کے ادبی انداز بیان اور موضوع کے تقاضہ کا حصہ ہے، اگر تاثراتی انداز کے مقدمات لکھنا ان کی عام روش رہی ہوتی تو یہ رنگ "شعلۂ طور" کے مقدمہ سے زیادہ "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے مقدمہ میں نمایاں ہوتا۔ کیونکہ جگرؔ اور ان کی شاعری سے زیادہ سید صاحبؒ کا جذباتی لگاؤ علی میاں اور ان کی کتاب کے موضوع سے تھا، لیکن اس کتاب کے مقدمہ کا آپ مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل موضوع "اسلام غریب بتکدۂ ہندوستان میں" ہے، اور مصنف کا تعارف چند سطروں میں اس حیثیت سے ہے کہ وہ صاحب سیرت کے خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی اولاد میں ہیں، لہذا صاحب البیت أدری بما فیہ کے اصول پر ان سے بڑھ کر اس موضوع پر لکھنے کا حقدار کون ہو سکتا ہے؛ خاص طور پر اس لحاظ سے کہ زیر بحث سیرت سے متعلق ٹونک میں محفوظ بنیادی مآخذ مصنف کی دسترس میں تھے، تو ان حقائق کے بیان کو محض تاثراتی بات نہیں کہا جا سکتا۔ میرے اندازہ کے مطابق ان کے مقدمات بحیثیت مجموعی اپنے موضوع ہی سے متعلق ہیں، شخصیات سے متعلق نہیں۔

صدر: ہم وابستگانِ دار المصنفین "ارض القرآن" کو کسی حال میں محض ایک مقدمہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اس کے سرورق پر ہمیشہ "تاریخ ارض القرآن" ہی لکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس

کی ابتدا "سیرۃ النبی" کے لئے مواد جمع کرنے سے ہوئی، لیکن موضوع اتنا بڑھ گیا کہ پھر وہ ایک مستقل تصنیف بن گئی جس کو دو جلدوں میں شائع کیا گیا، اس کو "مقدمہ ابن خلدون" یا "مقدمۂ شعر و شاعری" پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان کے مصنفین نے تو ان کا نام ہی یہ رکھا تھا جس کی ذمہ داری ان پر ہے کہ وہ ان کو مقدمہ سمجھیں یا الگ کتاب، لیکن حضرت سید صاحبؒ نے کبھی اس کو "مقدمہ سیرۃ النبی" تسلیم نہیں کیا، وہ اس کو ایک تاریخ کی کتاب سمجھتے تھے۔ آپ اس کے مباحث دیکھیں تو خود اندازہ ہو جائے گا کہ اس کی ایک مستقل تصنیفی شان ہے جس کو اسی حیثیت سے تسلیم کرنا درست ہے، مقدمہ کی حیثیت سے اب اس کا ذکر کرنا میرے ناچیز خیال میں صحیح نہیں ہے۔

جگرؔ مرادآبادی کے متعلق جس وقت سید صاحب نے "شعلۂ طور" کے مقدمہ میں لکھا تو ان پر بڑی نکتہ چینی ہوئی کہ یہ محض تاثراتی ہی نہیں بلکہ غیر حقیقی بات ہے، جب وہ پینے پلانے کے لئے بہت بدنام ہو چکے تھے، اس وقت سید صاحب نے لکھا کہ وہ مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے الخ، ہم لوگوں کو بھی یہ بات بہت کھلتی تھی، لیکن آپ نے غور فرمایا کہ یہ تحریر کب لکھی گئی تھی اور کب "نقوش سلیمانی" میں شامل ہوئی، اس درمیان میں اگر سید صاحب چاہتے تو بہت کچھ ترمیم کر سکتے تھے لیکن انھوں نے کوئی ترمیم نہیں کی، اور پھر ہم سب نے اپنی آنکھوں سے ان کی وہ زندگی بھی دیکھی جب ان میں واقعی توحید، رسالت اور مئے الست کی سرشاری پیدا ہو گئی تھی، اس وقت ہم لوگوں کو اندازہ ہوا کہ سید صاحبؒ نے جو بات پیشگوئی کے طور پر بہت پہلے لکھ دی تھی وہ جگرؔ صاحب کی آخری زندگی میں بالکل صحیح ثابت ہوئی، اور ان کی زندگی ایسی قابل رشک ہو گئی کہ ہر مردِ مومن کا وہی نیک انجام ہو جائے تو کیا بات ہے، اس لئے اس تحریر کے لئے یہ کہنا کہ وہ تاثراتی یا جذباتی تھی غلط ہے، صحیح بات یہ ہے کہ وہ سب انھوں نے سوچ سمجھ کر لکھا تھا، اور آخر تک اس پر قائم رہے، پھر یہ کہ یہ کوئی عقیدہ یا مسلک کی بات تو تھی نہیں، شعر و ادب کا معاملہ تھا، اور ان کو حق تھا کہ اس پر تاثراتی لکھیں یا جذباتی، عقلیاتی لکھیں یا تجرباتی یا سائنٹفک، ہم کو اس پر اعتراض نہیں، اعتراض تو اس پر ہو سکتا ہے کہ جس کو حق نہیں وہ منصب نبوت، شانِ رسالت، خلود فی النار، دوزخ کی ابدیت یا غیر ابدیت پر لکھے، لیکن سید صاحب کے پایہ کا شخص ان موضوعات پر لکھے تو اس کو حق ہے، اور صداقت کے سامنے جھک جانا اس پر واجب، جیسا کہ سید صاحب نے آخر میں کیا بھی۔

مقالات نشست سوم ۵ ستمبر ۱۹۸۵ء بعد ظہر

زیر صدارت: مولانا ابوالعرفان ندوی معتمد: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی روداد نگار: ڈاکٹر محسن عثمانی

۱۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور فقہ اسلامی از جناب عبید اللہ کوٹی ندوی (صفحات ۱۱۴-۱۳۹)
۱۲۔ سید صاحب کی شان فقیہانہ از جناب محمد علی قاسمی (غیر مطبوعہ)
۱۳۔ العلامۃ سید سلیمان الندوی واهتمامه بالعربیة از مولانا محمد رابع صاحب ندوی (صفحات ۲۷۶-۲۸۷)
۱۴۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی خدمات اور ان میں تاریخ ارض القرآن کی اہمیت از پروفیسر محمد اقبال انصاری (صفحات ۶۳-۸۰)

مقالات نشست چہارم ۶ ستمبر ۱۹۸۵ء صبح

زیر صدارت: عالی جناب سید ہاشم علی معتمد: جناب اقبال احمد انصاری روداد نگار: جناب عبد النور ندوی

۱۵۔ "ارض القرآن" میں بعض الفاظ کی لغوی تحقیق از جناب محمد عمیر الصدیق ندوی (صفحات ۲۲۲-۲۲۷)
۱۶۔ علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت محقق و تنقید نگار از پروفیسر سید ابراہیم ندوی (صفحات ۱۹۶-۲۰۳)
۱۷۔ مطالعۂ سلیمانی: تبصرہ و تنقید از جناب حبیب ریحان خان ندوی ازہری (صفحات ۱۶۴-۱۷۶)

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی: آپ کے پر مغز مقالہ کے بہت سے خیالات سے مجھے بھی اتفاق ہے، خاص طور پر اس بات سے کہ تنقید کو تنقیص نہیں سمجھنا چاہئے، نیز ناقد کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ جس شخص پر تنقید کر رہا ہے اس کا ہم پایہ ہو، کیونکہ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر کوئی میزانِ عدل میں تولے بغیر تنقید کرنے کا اہل ہی نہ ہوگا، لیکن دو ایک باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں، اپنی معلومات کے لئے وضاحت چاہتا ہوں: ایک تو نمازوں کی تعداد کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ نے لوگوں کو پانچ وقت کی نماز کا حکم دیا جبکہ خود آٹھ وقت کی نماز پڑھتے تھے، پھر آپ نے یہ کہا کہ سید صاحب نے متفق علیہ اور مختلف فیہ نمازوں میں فرق نہیں فرمایا اشراق، چاشت، یا تہجد وغیرہ نمازیں مختلف فیہ تو ہرگز نہیں؟ مستحب نوافل ضرور ہیں۔ علماء میں کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے کہ یہ نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں اور خود رسول اللہ اہتمام فرماتے تھے اس لئے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحب نے فرائض اور مستحب نوافل میں فرق نہیں فرمایا، لیکن مختلف فیہ کی تعبیر نا قابلِ فہم ہے۔

ایک اور بات رکعتوں کی تعداد سے متعلق ہے، آپ کے خیال میں سید صاحب نے پچاس ساٹھ رکعتوں کی تعبیر میں علمی احتیاط نہیں برتی، کیونکہ یہ محاورہ کی بات نہیں، فرائض و واجبات اور نوافل و مستحبات کی ادائیگی کا معاملہ ہے، اس سلسلہ میں میری گذارش یہ ہے کہ راویوں کے مختلف عینی

مشاہدات سے روایتوں میں رکعات کی تعداد کا اختلاف ہوا ہے، کسی نے آپؐ کو چالیس رکعات پڑھتے دیکھا، کسی نے پچاس، کبھی آپؐ نے ساٹھ پڑھیں، کبھی اس سے کم و بیش، سید صاحب نے کوئی بے احتیاطی نہیں فرمائی، بلکہ مختلف روایتوں کو سامنے رکھ کر واضح کیا کہ آپؐ کتنی رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

ایک اور بات آپؐ نے زیورات میں زکوٰۃ اور تصویر کے ذیل میں فرمائی کہ سید صاحبؒ نے دلائل تو جواز کے قائم کیے اور پھر حرمت کے دلائل دیئے بغیر یہ کہکر رجوع فرمالیا کہ میں نے جمہور کا مسلک قبول کرلیا ہے، کیونکہ جمہور کے مسلک کے دلائل پہلے سے موجود ہیں اس لئے ان کو دلائل پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔" یہ بھی معلوم رہے کہ سید صاحبؒ جب جمہور کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو عموماً ان کا مطلب حنفی مسلک سے ہوتا ہے، مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے بعض جزئیات میں اختلاف کے باوجود وہ عموماً فقہ حنفی کی تائید کرتے تھے، بلکہ آخر زمانہ میں تو جزئیات تک کے قائل ہو گئے تھے، لہٰذا جمہور کے مسلک سے جمہور احناف کا مسلک ہی مراد ہے دوسرے فقہاء کا نہیں۔

جناب حبیب ریحان ندوی: میں نے خود کہا تھا کہ اگر جمہور فقہائے احناف مراد ہیں تو اس میں کسی قسم کے کلام کی ضرورت نہیں، لیکن سید صاحبؒ نے حضرت عائشہؓ کا نام لیا تھا، جمہور علماء فقہ اربعہ کا نہیں، جس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ جمہور صحابہ، یا جمہور تابعین یا جمہور امت کوئی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

آپکے پہلے دونوں سوالات ایک دوسرے سے مربوط ہیں، جن حضرات نے آٹھوں نمازوں کو متفق علیہ مانا ہے تو یقیناً ان کے نزدیک رکعات کی تعداد پچاس سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے، لیکن امام ابن تیمیہ اور اکثر سلفِ صالح کی تحقیقی رائے میں رکعات کی تعداد چالیس ہے جیسا کہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ بھی ہے یعنی سترہ رکعتیں فرض، بارہ سنت مؤکدہ اور گیارہ نوافل تہجد۔ رہا مختلف فیہ نمازوں کا مسئلہ تو ان میں بہت اختلاف ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، صرف اس سے اندازہ لگائیے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے آپ کو کبھی سبحۃ الضحیٰ پڑھتے نہیں دیکھا لیکن میں اس کو پڑھتی ہوں، دوسری روایت کے الفاظ ہیں، لیکن میں اس کو مستحب سمجھتی ہوں، ایک اور صحابیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کو فتح مکہ کے دن پڑھتے ہوئے دیکھا، تو اس کو علماء شکرانہ کی نماز مانتے ہیں۔ ضحیٰ کی نہیں وقس علی ھذا

۱۸- مولانا سید سلیمان ندوی اور تفہیم اقبال از جناب اقبال احمد انصاری (صفحات ۲۵۹-۲۶۶)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی: آپ نے خواجہ منظور اور شیخ اکرام کے اس الزام کا اپنے مقالہ میں تذکرہ کیا ہے کہ سید صاحب نے اقبال کے خیالات و افکار کے کچھ گوشوں کو گند کرنا چاہا ہے، حالانکہ

حقیقت یہ ہے کہ نظری طور پر اقبال کی فکر اسلامی کے نشو و نما میں پہلے علامہ شبلی اور ان کے بعد لیکن ان سے زیادہ بڑے پیمانے پر علامہ سید سلیمان ندوی کا حصہ ناقابل فراموش ہے، لیکن میرے خیال میں یہ دونوں حضرات (جن میں سے ایک کی تو شبلی اسکول سے کد معروف ہے) اس حیثیت سے اقبال اور سید صاحب دونوں کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں، آپ نے ان دونوں حضرات کے خیال پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے، اس لئے آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔

جناب اقبال احمد انصاری: میں نے بالکل آخری جملہ میں اس کا تذکرہ کیا تھا اس لئے شاید اس کی طرف آپ کی توجہ نہ ہو سکی۔ برصغیر میں ملت اسلامیہ کی علمی زندگی میں شیخ اکرام کا تو بہر حال ایک مقام ہے، میں نے خود لکھا ہے کہ اس بات کا تعلق ان کے اپنے نقطۂ نظر سے ہے، کیونکہ وہ خود تجدد کے حامی تھے، اس لئے ذرا بے باکانہ اجتہاد چاہتے تھے جس کی ان کو اقبال میں کمی نظر آئی، میں نے خواجہ منظور حسین اور شیخ اکرام کے اقتباسات اس لئے بھی دیئے کہ فکر اقبال کا مثبت یا منفی مطالعہ کسی پہلو سے بھی سید صاحب کے حوالے کے بغیر ممکن نہیں ہے، اسی لئے میں نے دونوں پہلو دکھائے۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے تو میں دیانتداری کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھے خوشی ہے کہ بعض مسائل میں اقبال راہِ اعتدال پر قائم رہے جس میں یقیناً سید صاحبؒ کے اثرات کا بھی دخل ہے اور یہ سب کو تسلیم ہے، لیکن بسا اوقات میں محسوس کرتا ہوں کہ اسلام کے متعینہ حدود میں رہتے ہوئے اجتہاد کو زیادہ ہمت کے ساتھ بروئے کار لانے کی ضرورت تھی۔ اور اقبال ایسا کر سکتے تھے، لیکن وراثت اور ترکی میں اسلامی قانون کے موضوعات پر ان کی تحریریں دیکھئے تو تمہید تو ایسی اٹھاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کسی اور مقام پر لے جائیں گے، لیکن پھر بات کو یکدم اس طرح ختم کرتے ہیں کہ جس سے کچھ مایوسی ہوتی ہے۔ بہر حال میرا اصل مقصد تو یہاں یہ دکھانا تھا کہ اقبال کی فکر کے مطالعہ میں سید صاحبؒ کی اہمیت سے کوئی ناقد بھی انکار نہیں کر سکتا، یہ بات ہم ابو الکلام آزاد، سر سید یا کسی اور مفکر و داعئ اسلام کے بارے میں اقبال کے سیاق میں نہیں کہہ سکتے۔

پروفیسر عبد القوی دسنوی: سید صاحب اور عبد السلام ندوی کے مشترک مقالہ کا حوالہ معلوم کرنا تھا، اور یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ آپ نے اس کو کس حیثیت سے سید صاحب کے مرتبہ سے فروتر سمجھا ہے۔

جناب اقبال احمد انصاری: علامہ اقبال کی حیات میں یومِ اقبال منایا گیا تھا، جس میں نہ اقبال خود شریک ہو سکے تھے نہ سید صاحب، ممکن ہے عبد السلام صاحب شریک ہوئے ہوں، بہر حال "مقالات یوم اقبال" مرتبہ ڈاکٹر الطاف حسین شوکت ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئے اور ان میں "اقبال کا علم کلام"

سید صاحبؒ اور عبد السلام صاحب دونوں کے نام سے طبع ہوا، جس میں "رموزِ بے خودی" کے وقت کے تاثرات ہیں، ہو سکتا ہے کہ سید صاحب کے پرانے نوٹ رہے ہوں، مجھے مایوسی اس پر ہوئی کہ ۱۹۳۸ء میں اقبال کے علم کلام پر کوئی مقالہ لکھا جائے اور ان کے خطبات زیر بحث نہ آئیں، اسی لئے میں نے تاویل کی کہ حسنِ ظن قائم رہے۔

۱۹- علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیقاتِ الفاظ از ڈاکٹر سید حامد حسین (صفحات ۲۱۶-۲۲۱)

۲۰- مکاتیب سلیمان میں علمی و ادبی نکات از ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی (صفحات ۲۵۸-۲۴۹)

۲۱- مولانا سید سلیمان ندوی اپنے خطوط کی روشنی میں از جناب عبد اللطیف اعظمی (صفحات ۲۵۰-۲۵۷)

جناب ابوالبقاء ندوی: سید صاحبؒ کے خطوط کی اشاعت کی تجویز آپ پہلے بھی پیش کر چکے ہیں، اس وقت ناظم صاحب دار المصنفین کی غیر موجودگی میں ان کی طرف سے پھر یہ عرض کر دوں کہ مستقبل قریب میں اس کا امکان کم ہے کہ مذکورہ خطوط دار المصنفین سے شائع ہوں، اس لئے کہ ابھی ان کے دوسرے بہت سے کام مقالات وغیرہ کی اشاعت باقی ہے، نیز خطوط مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان پرائیویٹ چیز ہوتی ہے جس کا ہمارے معاشرتی نظام میں پڑھنا جرم ہے اگرچہ اب یہ فیشن چل پڑا ہے کہ اہل علم کے خطوط افادۂ عام کے نام سے چھاپے اور پڑھے جاتے ہیں، لیکن مولانا شبلیؒ کے خطوط کی اشاعت ہوئی تو آج تک قوم نے ان کو معاف نہیں کیا اور طرح طرح کے الزامات ان پر لگاتے رہے، اس صورت حال سے بچنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ سید صاحب کے خطوط شائع نہ کئے جائیں تاکہ کم از کم ان کی عزت و آبرو تو محفوظ رہے۔

پروفیسر مشیر الحق: سید صاحبؒ کے بارے میں ایسا سوء ظن ہے آپ کو؟

جناب عبد اللطیف اعظمی: مشاہیر کے خطوط پر میری ایک کتاب پریس میں ہے جس میں میں نے اردو مکاتیب کا جائزہ لیا ہے، ان پر تبصرہ کیا ہے اور ان کی اہمیت کے پیش نظر میری یہ کوشش رہی ہے کہ غیر مطبوعہ خطوط شائع ہوں۔ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام دہلی میں سید صاحب پر منعقدہ سیمنار میں بھی میں نے سید صباح الدین صاحب سے عرض کیا تھا کہ سید صاحبؒ نے تو اپنے استاد علامہ شبلی کے خطوط پہلی فرصت میں شائع فرما دیئے، لیکن آپ اپنے استاد گرامی کے خطوط شائع نہ کر کے ایک بڑی علمی دولت کو افادۂ عام سے روکے ہوئے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ سید صاحب کی وصیت تھی کہ ان کے خطوط شائع نہ کئے جائیں، میں نے عرض کیا کہ اس کی خلاف ورزی تو آپ "معارف" میں کچھ خطوط چھاپ کر پہلے ہی کر چکے ہیں، لہٰذا باقی خطوط کی اشاعت میں کیا مانع ہے؟ جو خطوط دوسرے لوگوں کی تحویل میں ہیں وہ تو چھپ چکے ہیں، اور چھپیں گے۔ خود داعیٔ بزم سلیمان کے خطبۂ استقبالیہ میں تھا کہ مکاتیب سلیمانی بنام

مولانا محمد عمران خانصاحب عنقریب شائع ہوں گے، جہاں تک نجی زندگی میں تاک جھانک کا مسئلہ ہے تو آخر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ممانعت کے باوجود ان کے خطوط کے تین مجموعے ان کی وفات کے فوراً بعد منظر عام پر آگئے۔ خود دار المصنفین کے منتظمین کی مرضی کے خلاف مولانا عبد الماجد دریابادی نے سید صاحب کے خطوط چھاپے رہا بدنامی کا خطرہ تو آخر عطیہ کے خطوط چھپے کہ نہیں؟ اصل میں یہ خطوط مکتوب الیہ کو پہنچنے کے بعد مکتوب نگار کی ملکیت نہیں رہتے، خاص کر اہل علم کے خطوط سے بعد کے لوگوں کو مکتوب نگار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اس لئے کہ احباب کے نام نجی خطوط میں انسان کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، اسی لئے ان کی اہمیت ہے، وہ بہت پسند کئے جاتے ہیں اور بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں، غالباً لوگوں کے لئے یہ تو ناممکن ہو کہ بغیر انتخاب کے خطوط شائع کریں، اس لئے نکتے نکتے بھی درمیان میں آگئے جس سے اگرچہ منفعت میں کمی ہو جاتی ہے، لیکن جو خطوط منظر عام پر آسکتے ہیں ان کو تو آنا ہی چاہیئے۔

۲۲۔ عربی ثقافت کے فروغ میں سید صاحب کا علمی کردار از ڈاکٹر شفیق احمد ندوی (صفحات ۲۳۸-۲۴۲)

۲۳۔ سید سلیمان ندوی اور ملی سیاست از جناب حمید اللہ ندوی (صفحات ۲۱۰-۲۱۳)

۲۴۔ سید صاحب اور ادب اسلامی از جناب عارف عزیز (صفحات ۲۶۷-۲۶۹)

۲۵۔ علامہ سید سلیمان ندوی کا تصور خلافت از جناب صلاح الدین عمری (صفحات ۲۴۷-۲۴۳)

صدر: میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس نشست کی معتمدی کے فرائض جناب اقبال احمد انصاری صاحب نے انجام دیئے اور مجھے صدارت کی ذمہ داریوں سے عملی طور پر بے فکر رکھا۔ آج کے گیارہ مقالات بہت بلند معیار کے تھے، اتنی محنت سے لکھے گئے مقالات پر ایک ایسے شخص کے لئے جو اس موضوع کا ماہر نہ ہو کچھ تبصرہ کرنا زیب نہیں دیتا۔ اس بزم علم و ادب کی جو خوبی میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ آج تیسرا دن ہے، ہر روز مختلف نشستوں میں کثیر تعداد میں علمی مقالے پیش ہو رہے ہیں، مندوبین کی دلچسپی برقرار ہے، سامعین ہمہ تن گوش ہیں، مباحثات تہذیب و شائستگی کا نمونہ ہیں، دیگر انتظامات بھی قابلِ اطمینان اور آرام دہ ہیں، میں اپنی طرف سے اور آپ سب کی طرف سے اس دلچسپ علمی ادبی بزم کے منتظمین اور ان کے سرپرست حضرت مولانا محمد عمران خان ندوی اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کا شکر گذار ہوں کہ ان کی غیر معمولی توجہ سے یہ بزم کامیابی سے ہمکنار ہونے جا رہی ہے اور جو یادیں ہم یہاں سے لے کر جانے والے ہیں وہ یقیناً بڑی خوش گوار ہوگی۔

مقالات نشست پنجم ۶ ستمبر ۱۹۸۵ء بعد ظہر

زیر صدارت: جناب محمد یوسف کوکن عمری معتمد: جناب عبید اللہ کوٹی ندوی روداد نگار: ڈاکٹر شفیق احمد ندوی

۲۶۔ تحریک خلافت اور سید سلیمان ندوی از جناب سید یوسف کمال بخاری (صفحات ۴۱۵-۴۲۶)

۲۷۔ سید سلیمان ندوی ایک تحریک از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (صفحات ۴۲۹-۴۴۳)

۲۸۔ علامہ سید سلیمان ندوی اور تصور امارت شرعیہ از ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی (صفحات ۴۴۴-۴۳۸)

۲۹۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا محمد علی جوہر از جناب ابوالبقار ندوی (صفحات ۵۱۰-۵۲۱)

۳۰۔ علامہ سید سلیمان ندوی اور ریاست بھوپال از پروفیسر عبدالقوی دسنوی (صفحات ۴۵۷-۴۸۰)

○

مسعود الرحمٰن خان ندوی★

کارگذاری بزم

صدر محترم، مندوبین کرام اور ہم کار ساتھیو!

تین دن کی مشغول ترین مجلس مذاکرہ کے بعد اب ہم اس مؤقر بزم کے اختتام پر پہنچ رہے ہیں جس کا خاکہ آج سے مکمل دو ماہ قبل بنا اور مقالہ نگاروں کو اطلاع ہوتے ہوتے تیاری کے لئے صرف ڈیڑھ ماہ اور بعض حضرات کو تو اس سے بھی کم وقت ملا۔ لیکن ہندوستان کی مشہور و معروف تعلیم گاہوں اور تصنیفی و تالیفی اداروں نے جس پر جوش طریقہ پر اس بزم کے انعقاد کا خیر مقدم کیا اور علمی تعاون اور حصّہ لیا اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔

ساٹھ مقالہ نگاروں نے بزم میں شرکت کی منظوری دی، بعض حضرات نے ایک سے زیادہ مقالات تیار کئے، لیکن ان کے صرف ایک مقالہ ہی کو اس بزم میں جگہ مل سکی، جو حضرات کسی عذر کی وجہ سے بزم میں شریک نہ ہو سکے ان میں سے اکثر کے مقالات بھی وقت پر موصول ہو گئے، مگر وقت کی تنگی کی وجہ سے صرف تیس ۳۰ مقالات اس سہ روزہ بزم میں پیش ہو سکے اور باقی بزم کی کاروائی میں داخل کر لئے گئے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ جناب ابو علی اثری: مولانا سید سلیمان ندوی کی "سیرت عائشہ" (صفحات ۳۰۲-۳۱۰)
۲۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی: "نقوش سلیمانی" تحقیق کی روشنی میں (صفحات ۳۳۵-۳۴۱)
۳۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن خان شروانی: "سیرت عائشہ": ایک تنقیدی جائزہ (صفحات ۳۱۱-۳۱۹)
۴۔ پروفیسر سید احتشام احمد ندوی: حضرت سید صاحب کا نظریۂ لسانیات (صفحات ۴۰۴-۴۱۵)
۵۔ مولانا سید احمد عروج قادری: خطبات مدراس (صفحات ۴۲۰-۴۲۸)
۶۔ جناب سید حسین: دور سلوک (صفحات ۴۴۳-۴۴۶)
۷۔ مولانا سید حشمت علی: علامہ سید سلیمان ندوی — ایک اجمالی نظر (صفحات ۵۰۶-۵۰۹)
۸۔ پروفیسر سید سلمان ندوی: قرآن اور فہم سلیمانی" (غیر مطبوعہ)
۹۔ جناب سید شرافت علی ندوی: علامہ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر اقبال (صفحات ۵۲۲-۵۳۲)

★ رپورٹ ناظم بزم بوقت اختتامی تقریب

۱۰۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن: سید سلیمان اور طب یونانی (صفحات ۲۸۵-۲۹۲)

۱۱۔ قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی: علامہ سید سلیمان ندوی اور بھوپال (صفحات ۴۸۱-۴۸۶)

۱۲۔ ڈاکٹر سید محمد ہاشم: علمی و ادبی صحافت کے رہرو علامہ سید سلیمان ندوی (صفحات ۲۷۰-۲۸۴)

۱۴۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام: احکام شرعی کا تدریجی نزول "سیرۃ النبی" کی روشنی میں (صفحات ۱۴۰-۱۵۴)

۱۵۔ جناب غلام محمد: علوِ سلیمانی (صفحات ۴۴۷-۴۵۶)

۱۶۔ ڈاکٹر کبیر احمد جائسی: خیام پر ایک نظر (صفحات ۲۱۹-۲۲۴)

۱۷۔ مولانا مجیب اللہ ندوی: حضرت سید صاحب کی خدمت میں چند سال (صفحات ۴۹۳-۵۰۱)

۱۸۔ جناب محمد یوسف کوکن عمری: علامہ کے ساتھ میرے پانچ سال (صفحات ۴۸۷-۴۹۲)

۱۹۔ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خان ندوی: علامہ سید سلیمان ندوی کی اولیں عربی تحریریں (صفحات ۳۸۸-۴۰۹)

۲۰۔ جناب منصور نعمانی ندوی: سید سلیمان ندوی بحیثیت ایک شاعر (صفحات ۲۵۰-۲۵۸)

اس طرح سے اس بزم کے کل مقالات کی تعداد پچاس ہوتی ہے جو یقیناً کسی سہ روزہ مجلس مذاکرہ کے لئے غیر معمولی ہے اس کے لئے میں تمام مقالہ نگار حضرات کا شکر گذار ہوں کہ ان کی توجہ اور دلچسپ سنجیدہ مباحثات کی وجہ سے یہ بزم بھوپال کی تاریخ میں ایک علمی ادبی جشن کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس خوشگوار یاد کو شایان شان طریقہ پر محفوظ کرنے کے لئے داعی بزم حضرت مولانا محمد عمران خان صاحب مدظلہ العالی کا ارادہ ہے کہ اس کو کتابی صورت میں بھی شائع کیا جائے۔ لہٰذا تمام مقالہ نگار حضرات سے گذارش ہے کہ نظر ثانی کے بعد اپنے مقالات جلد از جلد ناظم بزم کے پتہ پر ارسال کردیں تاکہ ان کی نشر و اشاعت کا انتظام کیا جا سکے۔

غیر مقالہ نگار بیرونی شرکا کی تعداد بھی توقع سے بہت زیادہ مقالہ نگاروں سے بھی بڑھ کر رہی جو ملک کے تقریباً تمام صوبوں کی نمائندگی کر رہے ہیں، بھوپال کے علم دوست شہر کے عوام کے جوش و خروش کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ افتتاحی جلسہ کے لئے منتخبہ شخصیات کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے، لیکن عوام کی شرکت کے احتمال کے پیش نظر بڑے شامیانے میں تین ہزار نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا جو آخر میں ناکافی ثابت ہوا اور کافی بڑے مجمع کو خیمہ سے باہر دھوپ میں کھڑے ہو کر جلسہ کی کارروائی سننا پڑی جس کے ذریعہ انھوں نے علامہ مرحوم سے اپنی گہری عقیدت، اس دارالعلوم سے اپنی وابستگی اور اس کے معزز مہمانوں سے اپنے تعلق خاطر کا مظاہرہ کیا، اور پھر مقالات کی طویل نشستوں کو بھی آباد رکھا جو علم و اہل علم کی قدردانی کی دلیل ہے۔

اس چھوٹے سے ادارہ کے محدود وسائل اور محدود تر عملہ کے لوگوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر اس عمارت کو جہاں آپ قیام فرما ہیں آپ کے آرام کے قابل بنایا، یہ بارونق ہال اور نمائش گاہ آج سے صرف

ایک ماہ قبل تک تعمیر کے آخری مراحل میں تھے، جن کو ہمارے عزیز خلیل الرحمٰن ندوی اور ان کے ساتھیوں نے دن رات کی محنت سے اس جشن کے شایانِ شان بنا دیا، جناب حبیب ریحان خان ندوی ازہری، جناب محمد لقمان خان ندوی ازہری کے زیرِ نگرانی ڈاکٹر محمد حسان خان اور ان کے رفقاء نے بزم کے تمام انتظامات کی دیکھ بھال کی، پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے زیرِ نگرانی جناب سید شرافت علی ندوی نے نمائش اور جناب منصور نعمانی ندوی نے شعری نشست سجائی، جناب حمید اللہ ندوی نے شہر کے مختلف پروگرام ترتیب دیئے، جناب عبدالحفیظ منیار صاحب، مولانا محمد احمد رضوی اور ان کے رفقاء نے دفتر اطلاعات کے ذریعہ آپ کی خدمت کی کوشش کی، ماسٹر محمد عقیل خان، قاری عبدالشکور، حافظ عبدالاحد بیگ، حافظ محمود الرحمٰن خاں جناب شمس الدین ندوی، جناب عبدالسبحان ندوی، جناب سید مسعود علی، ماسٹر عبدالعزیز، جناب عبدالرؤف (عرف پیر صاحب) نے آپ کے قیام و طعام، استقبال و تودیع کے انتظامات رضاکار طلباء دارالعلوم تاج المساجد کے ذریعہ انجام دیئے، ان سب مخلص رفقاء کار بزرگوں، اور عزیز ساتھیوں کا میں تہِ دل سے ممنون احسان ہوں۔

استاذ محترم حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء لکھنو)، جناب سید ہاشم علی صاحب (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب (ناظم دارالمصنفین) میرے خاص شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہ صرف ذاتی طور پر اس بزم میں شرکت فرمائی بلکہ اپنے مؤقر اداروں سے بڑے بڑے وفود بھیج کر اس بزم کی رونق میں چار چاند لگا دیئے۔

عم محترم مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی ازہری کی قدم بہ قدم رہبری و رہنمائی کا ذکر تحصیل حاصل ہے کہ صحت کی موجودہ حالت میں بھی ان تین دنوں میں آپ نے خود ان کی بلند حوصلگی و عالی ہمتی کے جیتے جاگتے مظاہرے دیکھے، حقیقت یہ ہے کہ اس بزم کا انعقاد سراسر ان کے قلبی تقاضا کا مرہون منت ہے، جس کا بوجھ ان کے دل و دماغ پر مہینوں سے تھا اور جس نے آخر میں اتنی شدت اختیار کر لی کہ اس میں مزید تاخیر ناممکن تھی۔

آخر میں ایک بار پھر آپ سب حضرات کا مخلصانہ شکریہ ادا کرتا ہوں، تاآنکہ کسی اور مبارک موقعہ پر دوبارہ جمع ہونے کی سعادت نصیب ہو۔ دل کی گہرائیوں سے بہت بہت شکریہ۔

○

سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

اختتامی تاثراتِ صدرِ بزم

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات!

رفقاءِ کار، شرکاء، سفرا اور احباب کرام!

میرے دل میں یہ تقاضا پیدا ہوا تھا کہ تقریب کے آخر میں اپنے تاثرات کا اظہار کروں، اور ابھی اپنی اس خواہش کا اظہار کر ہی رہا تھا کہ معلوم ہوا کہ یہ چیز پروگرام میں شامل ہے، اس کا اس لئے ذکر کیا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس موقع پر محض خانہ پری کے لئے میں کچھ عرض کرنے جا رہا ہوں، بلکہ یہ میرے دل کی آواز ہے، اور اس وقت خود میرے اندر یہ تقاضا پیدا ہوا کہ میں بھی اپنے تأثر کا اظہار کروں۔

حضرات!

مجھے ہندوستان و بیرون ہند کی بہت سی مجالس مذاکرہ میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے، اس علمی تجربہ کی بنا پر بلا تکلف عرض کر سکتا ہوں کہ "بزم سلیمان" غیر معمولی طریقہ پر کامیاب رہی، اور یہ اس لئے نہیں کہ مجھے اس میں بعض مجلسوں کی صدارت کا شرف بخشا گیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے شاندار رہی۔ کمیت تو آپ کے سامنے ہے اور کیفیت بھی آپ کے ذہنوں میں ابھی تازہ ہی ہو گی، بہت سی مجالس مذاکرہ میں اکثر ایسے مقالات پیش ہوتے ہیں جو موضوع و معیار کے مطابق نہیں ہوتے۔ اس بزم میں میں نے کوشش کی کہ جتنی دیر بیٹھ سکتا ہوں شرکت و استفادہ کروں، اس لئے بہت کم ایسے مقالات ہوں گے جن کو میں نے بذاتِ خود نہ سنا ہو، لیکن اپنے مشاہدہ اور تاثر کی بنیاد پر عرض کر رہا ہوں کہ جس معیار کے مقالات اس بزم میں پیش ہوئے بہت کم ایسی مجالس مذاکرہ ہوتی ہیں جن میں ایسی وحدت اور معیار کی ایسی یکسانیت پائی جائے، یہ میں موضوع بزم علامہ سید سلیمان ندوی کی گویا بلند اقبالی اور قبولیت کی دلیل سمجھتا ہوں کہ اس انتشار کے دور میں جن لوگوں کو شرکت کرنا تھی وہ اپنی تعلیمی تدریسی تحقیقی مصروفیتوں کے باوجود اس معیار کے مقالات تیار کر سکے، اور ایک جگہ پر اتنے مختصر وقت میں اتنی بڑی تعداد میں پیش ہو سکے۔

اس پر میں اپنے عزیز رفقاء کو مبارکباد دیتا ہوں، جہاں تک (مولانا محمد عمران خان صاحب) کا تعلق ہے وہ میرے قدیم ترین رفقاء میں ہیں، میں ان کو ان رسمیات سے بلند سمجھتا ہوں اور تحریری طور پر ان کی خدمت میں مبارکباد پیش بھی کر چکا ہوں، لیکن یہاں میں اپنے تمام احباب کو اور خود اپنے آپ کو مبارکباد

دیتا ہوں کہ ہم سب کو ایک ایسی بزم اور ایک ایسی تقریب میں شرکت کا موقع ملا جس میں ہمیں یہ کسی وقت محسوس نہ ہوا کہ ہمارا وقت ضائع ہو رہا ہے، اور ہم اس وقت میں کوئی دوسرا زیادہ مفید کام کر سکتے تھے، بلکہ جس حسنِ انتظام کے ساتھ اور ذوق و سلیقہ کے ساتھ یہاں کے وہ انتظامات مکمل کیے گئے جن کا تعلق تقریروں و تحریروں سے نہ تھا، وہ سب قابلِ مبارکباد ہیں، ہم لوگوں نے ایک بڑے اچھے پرسکون علم پرور ماحول میں اور علم کے لئے سازگار فضا میں اپنا وقت گذارا۔

میں نے اپنے مقالہ کے آخر میں کہا تھا: صحیح بات تو یہ ہے کہ اس وقت تو میں نے اپنے سابق علم کی بنا پر کہا تھا، لیکن اب اس میں اور بھی زیادہ وثوق و استحکام پیدا ہو گیا ہے، سید صاحب جیسی ہندگیر بلکہ عالمگیر شخصیت کے لئے تو قاہرہ و دمشق و استنبول و اسلام آباد میں بھی مجالس مذاکرہ اور اس طرح کے سیمینار منعقد ہو سکتے تھے۔ اور خود ہندوستان میں متعدد جگہیں ایسی تھیں، میں دارالمصنفین اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اس سے مستثنیٰ کرتا ہوں کہ یہ تو ان کے گویا اپنے وطن اور مسکن کی بات ہے، ان کی روح کے نشیمن اور ان کے علم کے مخزن کا ذکر ہے، لیکن ہندوستان میں شاید کسی شہر کو اتنا حق نہیں پہنچتا تھا ان کی یاد منانے کا جتنا کہ بھوپال کو" اور اس وقت میرے قلم سے یہ الفاظ بے ساختہ نکلے کہ ندوۃ العلماء کے وفا شعار فضلاء کی جماعت کے اتنے افراد کسی ایک شہر میں جمع نہیں ہوں گے جتنے کہ بھوپال میں، اور میں سمجھتا ہوں کہ مردم شماری کے مقابلہ میں اگر ندوی شماری کی تعبیر صحیح ہو اور ادبی حیثیت سے ذوقِ سلیم پر گراں نہ ہو، اچھا تو فضلاء ندوہ کے لئے مردم شماری کی تعبیر کو چھوڑیئے کہ ان کے مردم ہونے میں کیا شک ہے؟ وہ تو مردم آفریں ہیں، مردم ساز ہیں، لیکن اگر ندوی فضلاء کا کوئی ایسا جائزہ لیا جائے کہ وہ کتنی تعداد میں کہاں موجود ہیں؟ تو میرے اس لکھنے کی تصدیق ہو گی کہ ان کی سب سے بڑی تعداد بھوپال میں ہے، اور اس میں بہت بڑا دخل میں صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ مولانا محمد عمران خاں صاحب کے خاندان کی خود وفا شعاری کو ہے۔

ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے بھی مجھے کچھ رعایت (CONCESSION) دینا چاہیئے، اس لئے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ہندوستان کے تین خاندان میرے علم میں ایسے ہیں جنہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ جو بچہ بھی ان کے خاندان میں پیدا ہو گا اور پڑھنے کے قابل ہو گا وہ ندوہ جائے گا، اور کہیں کا سوال نہیں، اس میں کسی کی تنقیص یا مقابلہ کا سوال نہیں، یہ تو اپنے اپنے ذوق و انتخاب کی بات ہے، ایک مولانا ابوبکر صاحب جونپوری (سابق ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا خاندان کہ وہاں جو بچہ پڑھنے کے قابل ہوا وہ دارالعلوم ندوہ آیا اور اس نے وہیں پڑھا، وہ لوگ پہلے بنگلہ دیش میں اور آجکل کراچی میں موجود ہیں، ان کے ہاں کا ہر مذہبی تعلیم حاصل کرنے والا نوجوان ندوی فاضل ہے، دوسرا پشاور کے حکماء کا خاندان تھا، حکیم عبدالجلیل صاحب، حکیم عبدالعزیز

صاحب، حکیم محمد امین صاحب، حکیم عبدالرؤف صاحب وغیرہ کہ ان کے ہاں کا ہر بچہ بُعدِ مسافت کے باوجود، اس میں صرف تقسیم کے واقعہ نے دیوار کھڑی کر دی، ورنہ اس سے پہلے وہاں کا جو بچہ پڑھنے کے قابل ہوتا تھا وہ ندوہ ہی آتا تھا۔ تیسرا خاندان جس کا اس سلسلہ میں ذکر کیا جا سکتا ہے وہ مولانا حافظ محمد عمران صاحب ندوی کا خاندان ہے کہ وہاں بھی یہ بات گویا ایک طے شدہ اصول کے طور پر مانی جاتی ہے کہ دینی تعلیم حاصل کرنا ہے اور جب لڑکا پڑھنے کے قابل ہو تو اس کو صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء بھیجنا چاہیئے، میرے علم میں اس میں کوئی استثناء نہیں ہے، ان کے فرزندوں، برادر زادوں اور قریبی عزیزوں میں میرے علم میں کوئی ایسا نوجوان نہیں ہے جس نے مذہبی تعلیم حاصل کی ہو اور اس نے ندوۃ العلماء کا رخ نہ کیا ہو۔

یہ سب خصوصیات ایسی تھیں اور ان کے علاوہ سب سے اہم بات یہ کہ سید صاحب کے قیام ہندوستان کے آخری چند سال بھوپال میں گزرے، اور گویا یہیں سے انھوں نے رختِ سفر باندھا، تو بھوپال کو ہر طرح سے ان کی یاد کا جشن منانے کا حق تھا، لیکن محض حق کا حاصل ہونا کافی نہیں ہوتا، حق کا ادا کرنا بھی ایک بڑی اہم بات ہے، حق تو بہت سی چیزوں کا بہت سے اشخاص اور اداروں کو ہوتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ حق ادا بھی کر سکے کہ نہیں؟ کہنے والے نے تو کہا تھا کہ ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا، لیکن یہاں بھوپال میں واقعہ یہ ہے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا ہوا۔ تو میں مبارک باد دیتا ہوں اہلِ بھوپال کو، خاص طور پر دارالعلوم تاج المساجد کو، اور میں مستحق سمجھتا ہوں مولانا (محمد عمران خان صاحب) اور ان کے اعزہ کو، اور اس بزم کے تنظیم کرنے والے نوجوان رفقاء کو کہ یہ بزم ہماری توقع سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں خود توقع نہیں کرتا تھا کہ اس کے لئے اتنی تیاری کی گئی ہوگی، اور اتنے اچھے مقالات اتنی بڑی تعداد میں اور اس پایہ و معیار کے حاصل ہو جائیں گے۔ بعض ایسی مجالس مذاکرہ میں شرکت کا اتفاق ہوا کہ جو عالمی تھیں اور عرب حکومتوں کی سرپرستی میں ہوئیں جن کو وسائل کی کمی نہیں جیسا کہ آپ جانتے ہیں، مندوبین کو اعلیٰ سے اعلیٰ ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا، لیکن جہاں تک مقالات کا تعلق ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس سے پہلے ایسے وقیع مقالات اتنی بڑی تعداد میں پیش ہوئے ہوں۔

اس میں سید صاحب کے اقبال اور اقبال سے بڑھ کر ان کی قبولیت عند اللہ کو بھی میں اس کا ایک بہت بڑا سبب سمجھتا ہوں، جس شخص نے اپنے استاد کے ساتھ وفا کی، اپنے ادارہ کے ساتھ وفا کی، اور سب سے بڑھ کر اپنے دین اور اس دین کے لانے والے رسولؐ کے ساتھ وفا کی کہ ساری عمر سیرت نبویؐ کی خدمت میں صرف کر دی اور اخیر میں تو وہ اپنے کو سیرت نگار نبوی سید سلیمان ندوی لکھا کرتے تھے، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے رفع درجات کے لئے یہی بہت کافی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے الجزاء من جنس العمل (جس نوعیت کا عمل ہوتا ہے اس

کا انعام بھی اسی نوعیت کا ملتا ہے) کے مطابق اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ بِرُّوا آبائکم تَبَرَّکُم اَبناؤکُم (تم اپنے والدین اپنے بزرگوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، تمہاری اولاد تمہارے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے گی) تو واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آباء، اپنے مادر علمی، اپنے محبوب و محترم استاد علامہ شبلی نعمانی اور سب سے بڑھ کر اپنے محبوب پیغمبر کے ساتھ اس وفا کا ثبوت دیا اور مظاہرہ کیا جس کا ایک کرشمہ کہیے اس کا ایک قطرہ کہیے کہ ان کے ساتھ اس شکل میں وفا کی جا رہی ہے کہ ان کے ادارہ کے فضلاء ان کی کتابوں سے استفادہ کرنے والے اہل علم اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قابلِ احترام اساتذہ سب نے مل جل کر ان کی یاد منانے کے اس جشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نام بھی یہاں میں نے سوچ سمجھ کر لیا ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے بعد اگر ان کا کسی دوسری دانش گاہ سے قریبی اور مسلسل تعلق رہا ہے تو وہ مسلم یونیورسٹی ہے۔ میں ندوۃ العلماء کے ایک فرزند ایک معلم اور سید صاحب کے ایک حقیر خوشہ چیں کی حیثیت سے جانتا ہوں کہ وہ کتنی بار علی گڑھ آتے جاتے تھے اور ان کا علی گڑھ سے کیا تعلق تھا، اور یہ حقیقت میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خوش قسمتی ہی نہیں بلکہ میں اس کی صحت فیصلہ اور قوت فیصلہ کی بات سمجھتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی نے سید صاحب کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دے کر اپنی عزت و اعزاز میں اضافہ کیا، اور اپنے حسنِ مذاق اور اعتراف علم و فضل کا ثبوت دیا۔ ہندوستان میں بہت سی یونیورسٹیاں تھیں، لیکن یہ توفیق صرف علی گڑھ کو نصیب ہوئی، اس نے سید صاحب کے عمامۂ فضیلت میں کسی طرہ یا تکمہ کا اضافہ نہیں کیا بلکہ اپنی تاریخ اور اپنے ریکارڈ میں ایک بہت بڑے مبارک اقدام کا اضافہ کیا، تو دار العلوم ندوۃ العلماء اور دار المصنفین کے بعد یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا حق تھا کہ وہ ملک کے تمام اہل علم کے شانہ بشانہ ان کے یادگاری جشن میں شریک ہو۔

علی گڑھ کے ابتدائی سفروں میں مجھے بتایا گیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے طلباء نے اگر کسی کا احترام کیا ہے اور یونین میں اس کو تقریر کرنے کا پورا پورا موقع دیا ہے اور عزت و احترام کے ساتھ اس کی بات سنی ہے تو وہ صرف دو شخصیتیں ہیں، ایک مسٹر محمد علی جناح اور دوسرے مولانا سید سلیمان ندوی۔ اس میں کوئی مابہ الاشتراک چیز تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تو علی گڑھ کے طلباء کی فہم و فراست اور شرافت کی بات تھی کہ انھوں نے ایک ایسی شخصیت جس پر مسلمانوں نے اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا اور جو ملّی خدمت کے لئے میدان میں آئی تھی انھوں نے اس کے ساتھ احترام و اعزاز کا معاملہ کیا، اور مولانا سید سلیمان ندویؒ جو سیاسی لیڈر نہیں، ایک عالم دین تھے، ان کے ساتھ احترام و اعزاز کا معاملہ کر کے انھوں نے اپنے دین و علم کے ساتھ احترام کا ثبوت دیا۔

مجھے خوشی ہے کہ یہاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ دونوں کی بہت مکمل اور

بھرپور نمائندگی ہوئی ہے، اور میں اپنے احساس کی بنیاد پر یہ بھی کہہ سکتا ہوں جو انشاء اللہ صحیح ہوگا کہ یہاں آنے والے اس طرح نہیں آئے جس طرح کہ اور سیمناروں میں جایا کرتے ہیں، یونیورسٹیاں بھیجا کرتی ہیں، جانے والوں کے شعبوں کے مفادات اور خود ان کے ذاتی مفادات وابستہ ہوا کرتے ہیں، اس بزم میں آنے والوں کے پیشِ نظر زیادہ تر ان کا علمی ذوق اور سید صاحب کی ذات کے ساتھ ان کا احترام و اعتراف کا تعلق اصل عامل ومحرک رہا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ہماری یہ بزم علمی ودینی وقار کے ساتھ ختم ہونے جا رہی ہے جو موضوعِ بزم سید صاحبؒ کے شایان شان بھی ہے، اور صاحب سیرت ومصنف سیرت نبویؐ کے شایانِ شان بھی، اور خود دار العلوم تاج المساجد بھوپال کے شایانِ شان بھی کہ جو ایک علمی دینی درسگاہ ہے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے دار العلوم ندوۃ العلماء کے بارے میں کہیں لکھا تھا کہ ندوی فضلاء کی ایک خصوصیت ان کے قلم کی شرافت ہے، الحمد للہ کہ قلم کی شرافت ومتانت بھی اس بزم میں کارفرما رہی، کسی شخصیت، ادارہ اور تحریک پر کوئی جارحانہ حملہ یا طنز وتضحیک وغیرہ قسم کی کوئی بدنمائی سامنے نہ آئی۔ سارے مقالات علمی زبان وپیرایۂ بیان میں لکھے گئے جو علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی میراث ہے، اس چیز کو نہ صرف باقی رہنا چاہیئے بلکہ ترقی دینا چاہیئے، کم از کم دینیات اور علوم اسلامیہ کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ ہماری اُردو ادبیات کا ذخیرہ بہت سی اسلامی زبانوں کے مقابلہ میں نہ صرف یہ کہ مالامال اور زیادہ وسیع ہے بلکہ اس میں ثقاہت وتحقیق کا عنصر بھی بہت سی زبانوں سے زیادہ ہے، اور یہ مولانا شبلیؒ کی ان روایات میں سے ہے کہ بغیر حوالے کے کوئی بات نہ کہی جائے، منقولہ بات جہاں تک ممکن ہو اس کے مصنف کے الفاظ میں نمایاں کی جائے وغیرہ، مجھے یاد ہے کہ سید صاحب کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے بعض فضلاء بڑے زود نویس اور بہت اچھے لکھنے والے تھے اور ان سے علامہ شبلی کے تعلقات وروابط بھی تھے۔ میں نے بعض مرتبہ ذکر کیا کہ فلاں صاحب سے بھی کام لینا چاہیئے، تو مولانا شبلی نے فرمایا کہ ان کی بیماری یہ ہے کہ وہ حوالہ نہیں دیتے اُردو میں حوالہ دینے کی روایت (اور اب تو صفحہ اور ایڈیشن کا اہتمام بھی ضروری ہے) کا اہتمام غالباً سب سے پہلے مولانا شبلی نے کیا جواب ایک مسلمہ اصول بن گیا ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ اس کو دار المصنفین نے قائم رکھا اور اس مسلک تصنیف وتحریر کے تمام پیروکار بھی اس کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اپنے کو شامل کرتے ہوئے آپ سب کو مبارکباد دیتا ہوں، اور باوجود اس کے کہ حجاب معلوم ہوتا ہے مولانا حافظ محمد عمران خان صاحب کو بھی، اللہ تعالیٰ ان کو صحت وعافیت عطا فرمائے ان کو طویل عمر عطا کرے، ان کی اس اُولوالعزمی اور بلند نظری کو قائم رکھے۔ صحت کی اس حالت میں جسمانی طور

پر ان کی شرکت یقیناً ایک کرشمہ ہے، ذہنی طور پر تو وہ کہیں ہوتے شریک تھے، قلبی طور پر دعاؤں کے ساتھ بھی شریک تھے، ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ جسمانی طور پر شرکت کا تھا، لیکن انہوں نے جسمانی طور پر شرکت کرکے سید صاحب کے ساتھ، اس موضوع کے ساتھ اور آنے والے عزیز مہمانوں کے ساتھ جن میں اکثر ان کے خورد یا ان کے ہم عمر ہیں (وہ حضرات معاف کریں جو عمر میں ان سے بڑے ہوں) سب کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کا پورا پورا اظہار کیا۔ ان کی ایک خوش قسمتی صباح الدین صاحب تو یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ”تاج المساجد“ کے نام سے ایک ”تاج محل“ کھڑا کر دیا، لیکن میں ان کی ایک دوسری خصوصیت کو بہت قابل رشک سمجھتا ہوں کہ انھوں نے کارکنوں کی ایک ایسی اچھی جماعت تیار کر دی جس کے تیار کرنے میں بہت کم لوگ کامیاب ہوتے ہیں" اور اس کا ثبوت وہ خوش انتظامی، خوش اسلوبی اور کامیابی ہے جو اس بزم کی ہر چیز سے ظاہر ہو رہی ہے۔

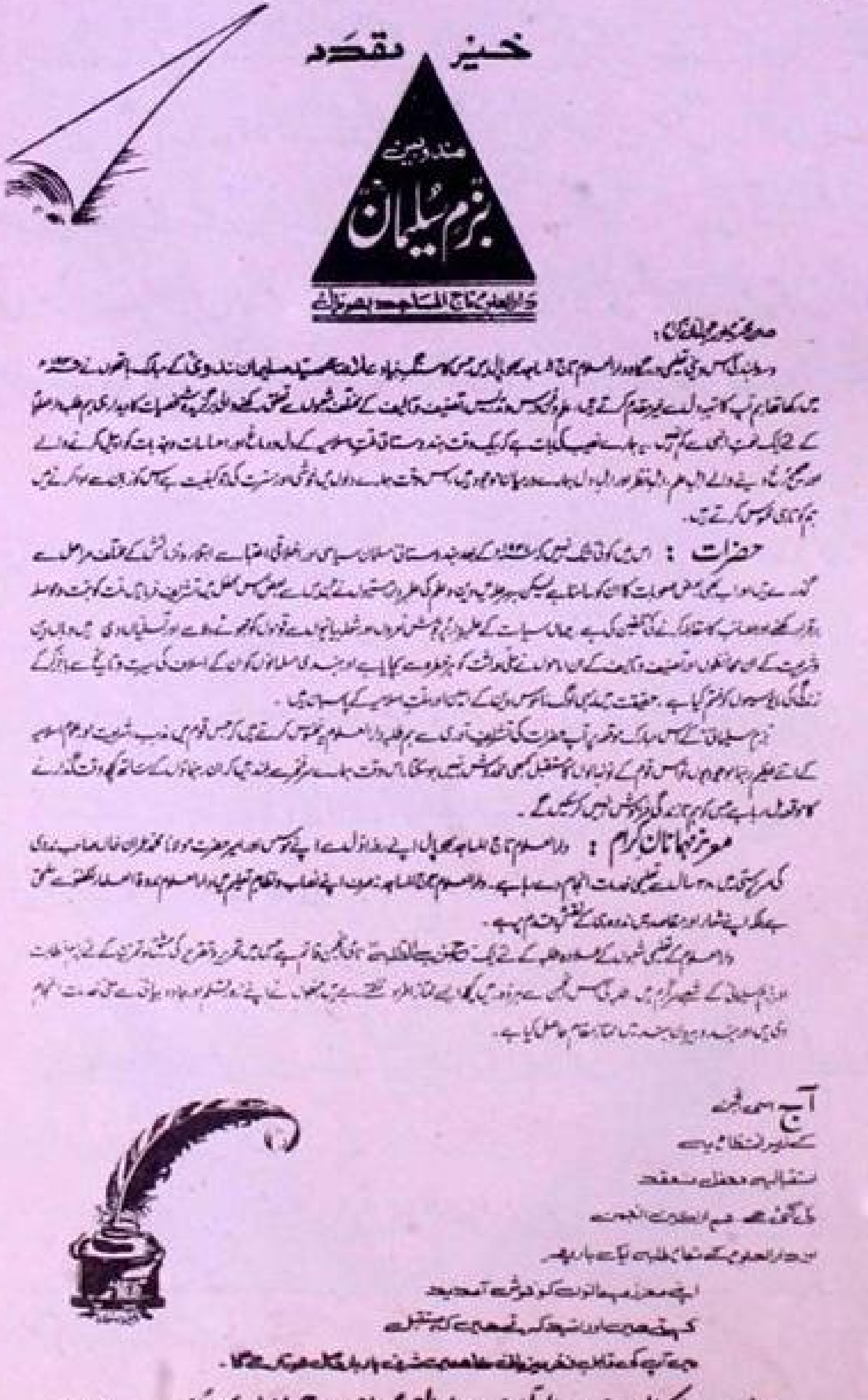

خیر مقدم

بزم سلیمان

حضرات :

معزز مہمانانِ کرام :

آج

منجانب ۔ ارکان حزب الطلبہ دار العلوم تاج المساجد بھوپال۔

محمد عمران خان ندوی ازہری★

شکریہ داعیٔ بزم

سب سے پہلے اللہ رب العالمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے ہم سب کو اپنے ایک محسنِ اعظم کی یادگار قائم کرنے اور اس کے علمی ادبی کارناموں اور ملی خدمات کو منظرِ عام پر لانے کی توفیق عطا فرمائی، اس کے بعد آپ سب حضرات کا شکر گذار ہوں کہ دور دراز علاقوں سے تکلیفیں اٹھاکر اور اپنے بہت سے کاموں کا حرج کرکے آپ بھوپال تشریف لائے اور اس بزم میں شریک ہو کر نہ صرف ہماری عزت افزائی فرمائی بلکہ اس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے حقیقی سعی و کوشش کی جس کے لئے آپ سب حضرات خود مبارکباد کے مستحق ہیں، حضرت مولانا علی میاں صاحب کا بھی میں ممنونِ احسان ہوں کہ انھوں نے اپنی مصروفیتوں کے باوجود اس جلسہ کی صدارت قبول فرمائی اور اس میں شرکت فرماکر اس کی قدر و قیمت میں اضافہ فرمایا، جناب سید ہاشم علی صاحب (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا بھی ممنونِ کرم ہوں کہ انھوں نے اس مبارک موقع پر ہمارے ساتھ شریک ہو کر نہ صرف اپنی علم دوستی بلکہ ملی سرگرمیوں سے وابستگی کا بہترین ثبوت فراہم کیا۔

اس بزم کی کامیابی کا صحیح فیصلہ تو وہ شرکاء کرسکتے ہیں جو اس سے پہلے کی متعدد مجالس مذاکرہ میں شریک ہوئے ہیں، ہمارے لئے تو اتنا کافی ہے کہ تمام مندوبین نے بار بار اچھے تاثرات کا اظہار کیا، خاص کر مولانا علی میاں صاحب نے تو تحریری طور پر مبارکباد دیتے ہوئے ندوہ کی طرف سے دس ہزار روپے کی پیشکش فرماکر ایک انوکھے انداز سے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

برادر گرامی منزلت زیدت مآثرہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سب سے پہلے آپ کو صدقِ دل سے اس سیمنار کی غیر معمولی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں، یہ آپ کے خلوص، اولوالعزمی اور بلند نگاہی کا نتیجہ ہے۔

چونکہ موضوع دارالعلوم تاج المساجد اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مشترک اور محبوب موضوع ہے،

★ امیر دارالعلوم تاج المساجد بھوپال

اس لئے اس سعادت میں ندوہ بھی شریک ہونا چاہتا ہے، اور دس ہزار (عشرۃ آلاف روبیہ) روپیہ کے نذرانہ سے اس میں خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہوتا ہے، انشاء اللہ لکھنؤ پہنچ کر ڈرافٹ کی شکل میں اس کو پیش کر دیا جائے گا، امید ہے آپ اس کو قبول فرمائیں گے۔

آپ کا

ابوالحسن علی ندوی　　　　جمعہ ۲۰ر ذوالحجہ ۱۴۰۵ھ

ناظم ندوۃ العلماء

یہ اجلاس یقیناً کسی چندہ کی مہم کے لئے نہ تھا، چونکہ ندوہ کی طرف سے مولانا کی یہ پیش کش انکی پسندیدگی کی ترجمان ہے، اس لئے اس کو بصد شکریہ قبول کیا جاتا ہے۔

مندوبین و شرکاء بزم کے شکریہ کے بعد میرے رفقاء کار منتظمین بزم اساتذہ وطلباء اور عملہ دارالعلوم کا شکریہ بھی ضروری ہے کہ ان کی انتھک فکر محنت و کوشش کے نتیجہ میں مسلسل مجھے داد ملتی رہی جس کے وہ مستحق تھے، لہٰذا حق بمقدار رسید کے مطابق وہ ان کو منتقل کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس اجتماع کو قبول فرمائے اور اس کا نفع عام فرمائے۔

* * *

"قضا و قدر کا یہ فیصلہ بھی ہم وابستگان دارالعلوم
کے لئے کس قدر قابل فخر اور تحریک آموز ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی
اس وقت بھوپال میں موجود تھے جب دارالعلوم تاج المساجد قائم ہوا
اور دارالعلوم نے انھیں کے علم و دانش اور حکمت
و بینش سے لبریز ہاتھوں سے اس سرچشمہ علم و دین
کا افتتاح کرایا۔"

(مولانا محمد عمران خاں ندوی)

مجلس تجاویز*

تجاویز بزم

۱۔ بزم سلیمان منعقدہ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کا یہ جلسہ ناظم دارالمصنفین سے درخواست کرتا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے جو مضامین "الندوہ"، "معارف" وغیرہ متعدد رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں ان کو مرتب کر کے مختلف جلدوں میں جلد از جلد شائع کریں۔

۲۔ سید صاحب نے ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ کی حیثیت سے جو فیصلے و احکام جاری کیے ان کو مرتب کرنے کے لیے مولانا محمد عمران خان ندوی سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ایک مجلس عمل کی تشکیل فرمائیں اور ان کی ترتیب و اشاعت کے لیے بھوپال کے مقامی ادارے دارالقضاء، وقف اور دارالعلوم تاج المساجد ایک دوسرے سے اشتراک عمل کریں۔ جمع شدہ فتاویٰ اور قضایا کی اشاعت میں دارالمصنفین اعظم گڑھ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بھی تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ بزم سلیمان میں جو مقالے پیش کیے گئے ان کو مرتب کر کے جلد از جلد شائع کیا جائے۔

۴۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے عالی مرتبت وائس چانسلر سے گذارش کی جاتی ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی میں "مولانا سید سلیمان ندوی چیئر" قائم فرمائیں۔

۵۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے عالی مقام وائس چانسلر سے مزید التماس ہے کہ وہ سیرت نبوی پر ایک درسی سیریز تیار کرائیں جو بی۔ اے تک مختلف تعلیمی مراحل کے طلبہ کی گوناگوں ضروریات کو پورا کرے۔ یہ سیریز تینوں زبانوں یعنی اردو، ہندی اور انگریزی میں ہو، اور ان کی تیاری کے لیے دارالمصنفین، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مسلم یونیورسٹی کا ایک مشترکہ ایڈیٹوریل بورڈ بنایا جائے جو کام کو آگے بڑھائے۔

۶۔ ملک کے مسلم اداروں اور دوسری یونیورسٹیوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ہر سال یا ہر دو سال بعد سیرت نبویؐ پر اپنے یہاں توسیعی خطبات کا اہتمام کریں۔

۷۔ تعلیمی اور علمی اداروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ نئی نسل کی تربیت کے لیے سیرت النبیؐ پر نوجوانوں

★ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا ابوالعرفان خان ندوی، مولانا محمد رابع حسنی ندوی، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی، جناب حبیب ریحان خان ندوی (معتمد)

کے تقریری و تحریری مقابلے ہر سال منعقد کریں۔

۸۔ حکومت مدھیہ پردیش سے پرزور درخواست کی جاتی ہے کہ وہ بھوپال یونیورسٹی میں "سید سلیمان ندوی چیئر برائے مطالعہ اسلامیات" قائم کرے۔

۹۔ دارالمصنفین سے استدعا کی جاتی ہے کہ عام افادہ کی خاطر سیرۃ النبیؐ کا ایک ملخص ایڈیشن جلد از جلد شائع کرے اور مسلم ملی اداروں سے درخواست ہے کہ وہ اس کو ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں شائع کرنے کا اہتمام کریں۔

۱۰۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے التماس ہے کہ وہ ہر سال "سید سلیمان ندوی توسیعی خطبات" کا اہتمام کرے اور فاضل مقالہ نگاروں کو قابل قدر معاوضہ بھی پیش کرے۔

۱۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی تمام تصانیف کا انگریزی، عربی اور ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا جائے اور اس کام میں ملی اداروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنا بھرپور تعاون کریں۔

۱۲۔ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ سید صاحب کی یادگار کے طور پر ایک "کتب خانہ سلیمانیہ" قائم کرے۔

۱۳۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے خیال میں مسلم اقلیتی ممالک کے لئے بالعموم اور ملت ہندیہ کیلئے بالخصوص ایک ملک گیر امارت شرعیہ کا قیام ضروری تھا۔ لہٰذا یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ کل ہند پیمانے پر امارت شرعیہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا محمد عمران خاں ندوی کے مشورے سے قائم کی جائے اور امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس اہم ملی معاملہ میں اقدام و پیشرفت کرے۔

○

یہ صد سالہ یادگار جلسے

- ★ نشستند و گفتند و برخاستند ہو کر نہ رہیں، ضرورت ہے کہ ان کا علم پھلے پھولے۔
- ★ اولاً ان کے مقالات کا مجموعہ شائع ہونا چاہیئے، جو اب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے
- ★ اس کے بعد ان کے عربی اور انگریزی ترجمے ہونے چاہئیں، فرانسیسی اور جرمنی میں بھی ہو سکیں تو کیا کہنے
- ★ تراجم میں مقالے ہی نہیں کتابیں بھی ہوں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مقیم پیرس)

معارف مئی ۱۹۸۶ء ۳۹۶

مسعود الرحمٰن خان ندوی (مرتب):

اشاریہ★

مقالات تقریبات صد سالہ یوم پیدائش علامہ سید سلیمان ندویؒ

رموز:

اورنگ	اورنگ سلیمان: سید الملت حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے جشن ولادت کا نذرانۂ عقیدت، مرتبہ آفاق صدیقی، مجلس علوم اسلامیہ کراچی، ستمبر ۱۹۸۵ء، صفحات ۲۰۴
بھوپال	مطالعۂ سلیمانی: مقالات بزم سلیمانی، مرتبہ مسعود الرحمٰن خان ندوی و محمد حسان خاں، دار العلوم تاج المساجد بھوپال، جون ۱۹۸۶ء، صفحات: ۲۴+۵۷۰ = ۵۹۴
پٹنہ	مقالات سیمنار اردو اکیڈمی پٹنہ، ۱ر تا ۳ر دسمبر ۱۹۸۴ء (زیر طبع)
دہلی	سید سلیمان ندوی، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی۔ صفحات ۲۴۰
علی گڑھ	سید سلیمان ندوی: مجموعہ مقالات سید سلیمان ندوی سیمنار ۱۹۸۴ء، مرتبہ پروفیسر عتیق احمد صدیقی، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۸۵ء، صفحات ۱۴۲
مجلہ	مجلہ صد سالہ یوم پیدائش علامہ سید سلیمان ندوی، مرتبہ صبیح محسن، ویلفیئر ایسوسی ایشن کراچی، دسمبر ۱۹۸۴ء، صفحات ۱۲۴۔
معارف	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ۔

شمار	عنوان مقالہ	مقالہ نگار	حوالہ
	سیرت وشخصیت:		
۱	آخری قاضی القضاۃ ریاست بھوپال	قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی	بھوپال ص ۴۸۱-۴۸۶
۲	ایک ہمہ جہت عالم۔ ایک گراں مایہ شخصیت	ڈاکٹر سید محمد ہاشم	علی گڑھ ص ۱۵-۳۴

★ غیر مطبوعہ مقالات کے عنوانات میں "معارف" اعظم گڑھ کے شذرات اور بعض شرکائے مجالس مذاکرہ کی یادداشتوں پر اعتماد کیا گیا ہے۔

۳	تاریخ ولادت	ڈاکٹر اختر علی	اورنگ ص۱۶۳ - ۱۶۹
۴	تاریخ ولادت کے مزید دیکھیں مکتوب پیرس	ڈاکٹر محمد حمید اللہ	معارف مارچ ۱۹۸۵ء ص۲۳۱ - ۲۳۵
۵	حالات اور کارنامے	ڈاکٹر خلیق انجم	دہلی ص۲۰ - ۳۳
۶	حیات سلیمان کا ایک ورق	مولانا ابو علی	مجلہ ص۸۹ - ۹۶
۷	حیات وعلمی کارنامے (کلیدی مقالہ)	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن	بھوپال ص۳۶ - ۴۷
۸	دور سلوک	جناب سید حسیو	بھوپال ص۴۳۵ - ۴۴۶
۹	سید سلیمان ندوی: مختصر جائزہ	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن	مجلہ ص۷۵ - ۸۰
۱۰	ظرافت سلیمانی	ڈاکٹر غلام محمد	مجلہ ص۲۳ - ۲۷
۱۱	علامہ سید سلیمان ندوی	جناب عبدالمجید سالک ـ	اورنگ ص۲۹۱ - ۳۰۲، منقول از ماہ نو کراچی ۱۹۵۳ء
۱۲	علو سلیمانی	ڈاکٹر غلام محمد	بھوپال ص۴۴۷ - ۴۵۶
۱۳	عہد وشخصیت	جناب سید ابوالخیر کشفی	اورنگ ص۲۸۳ - ۲۹۰
۱۴	عہد تا لحد	جناب سید ریاض الحسن	اورنگ ص۲۶۹ - ۲۸۲
۱۵	مولانا سید سلیمان ندوی کی صد سالہ یادگار ولادت ـ	ڈاکٹر محمد حمید اللہ ـ	معارف مئی ۱۹۸۵ء ص۳۸۱ - ۳۸۸، منقول از البیان پشاور

دارالمصنفین وندوہ:

۱۶ ـ	سید صاحب اور دارالمصنفین	جناب ابوالبقاء ندوی	دہلی ص۱۵۶ - ۱۶۸
۱۷	سید صاحب اور ندوۃ العلماء	جناب سید شہاب الدین دسنوی ـ	دہلی ص۱۴۵ - ۱۵۰ اورنگ سلیمان ص۱۴۳ - ۱۵۴
۱۸	ندوہ کے تعلق سے سید سلیمان ندویؒ اور مولانا شبلیؒ ـ	پروفیسر سید یحییٰ احمد ہاشمی	مجلہ ص۳۱ - ۵۲

تاریخی وتہذیبی خدمات:

۱۹	عربوں اور ان کے تاریخ پر تحقیقی خدمات	جناب سید واضح رشید ندوی	بھوپال (غیر مطبوعہ)
۲۰	عربی ثقافت کے فروغ میں علمی کردار	ڈاکٹر شفیق احمد ندوی	بھوپال ص۴۲۸ - ۴۴۲

قیام بھوپال وپاکستان:

۲۱	سید سلیمان ندوی اور ریاست بھوپال	پروفیسر عبدالقوی دسنوی	بھوپال ص۴۵۷ - ۴۸۰
۲۲	سید سلیمان ندوی پاکستان میں	پروفیسر سید فخر الحسن	اورنگ ص۲۵۸ - ۲۶۸
۲۳	شبلی وسلیمان اور بھوپال (خطبۂ استقبالیہ)	مولانا محمد عمران خان ندویؒ ازہری	بھوپال ص۱ - ۸

تاثرات ومشاہدات

۲۴	ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن - پٹنہ / معارف جون ۱۹۸۵ء	ص ۴۲۱-۴۴۸
۲۵	خدمت سلیمانی میں چند سال	مولانا مجیب اللہ ندوی	بھوپال ص ۴۹۲-۵۰۱
۲۶	دید و شنید	مولانا ابوالعرفان خان ندوی	بھوپال ص ۵۰۲-۵۰۵
۲۷	ذاتی تاثرات و مشاہدات	مولانا عبدالقدوس ہاشمی	مجلہ ص ۱۳-۱۶
۲۸	ذاتی تجربات کی روشنی میں	مولانا سید حشمت علی	بھوپال ص ۵۰۶-۵۰۹
۲۹	سید صاحب کے ساتھ گذرے ہوئے چند دن	جناب سید ابو عاصم (ایڈوکیٹ)	مجلہ ص ۵۳-۶۱
۳۰	سید صاحب کی یاد میں	جناب سید ابوالخیر کشفی	مجلہ ص ۲۸-۳۰
۳۱	علامہ کے ساتھ میرے پانچ سال	جناب محمد یوسف کوکن عمری	بھوپال ص ۴۸۷-۴۹۲
۳۲	فخر عصر سید سلیمان ندوی	ڈاکٹر محمد حمید اللہ	اورنگ ص ۱۱-۱۶
۳۳	کچھ یادیں کچھ باتیں	حفیظ الحق دسنوی	مجلہ ص ۱۰۲-۱۰۴

معاصرین سے روابط:

۳۴	اقبال اور سلیمان ندوی	جناب مصباح دسنوی	مجلہ ص ۶۹-۷۲
۳۵	ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا سید سلیمان ندوی (انگلش)،	جناب مصباح الہدیٰ	روزنامہ ڈان کراچی
۳۶	سید صاحب اور ڈاکٹر اقبال	جناب سید اشرف علی ندوی	بھوپال ص ۵۲۲-۵۲۴
۳۷	سید صاحب علامہ اقبال کی نظر میں	جناب ابراہیم خلیل نقوی	اورنگ ص ۱۹۶-۲۲۷
۳۸	سید صاحب اور مولانا محمد علی جوہر	جناب ابوالبقار ندوی	بھوپال ص ۵۱۰-۵۲۱

آراء و افکار اور علوم و فنون:

۳۹	آزادیٔ ہند سے قبل فرقہ پرستی پر سلیمانی نقطۂ نظر	جناب انوار عالم	دہلی ص ۱۳۳-۱۴۴
۴۰	افکار سلیمان	جناب شمس بدایونی	اورنگ ص ۲۲۸-۲۴۳
۴۱	تصور امارت شرعیہ	ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی	بھوپال ص ۴۲۴-۴۲۸
۴۲	تصور خلافت	جناب محمد صلاح الدین عمری	بھوپال ص ۴۲۷-۴۳۴
۴۳	تصور نبوت و شریعت	ڈاکٹر عنوان چشتی	دہلی ص ۱۲۲-۳
۴۴	سید صاحب — ایک تحریک	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	بھوپال ص ۴۳۹-۴۴۳
۴۵	مسلک سلیمانی (تفسیری، حدیثی، فقہی، صوفیانہ، اجتماعیاتی)	ڈاکٹر غلام محمد	اورنگ ص ۴۲-۶۰
۴۶	سلیمانی نظریۂ علم	پروفیسر مشیر الحق	دہلی ص ۱۰۳-۱۱۱

تاریخ نگاری:

۴۷	ایک ممتاز تاریخ نگار بحوالہ "عرب و ہند کے تعلقات" ۔ ڈاکٹر عبدالباری		بھوپال ص ۱۵۵-۱۶۲
۴۸	سید صاحب بحیثیت مورخ و محقق	زینت النساء رابعہ	مجلہ ص ۱۰۵-۱۰۷

تحقیق و تنقید:

۴۹	بحیثیت تنقید نگار	پروفیسر عبدالمغنی	پٹنہ / معارف دسمبر ۱۹۸۴ء ص ۴۲۱-۴۲۸
۵۰	بحیثیت محقق	ڈاکٹر خورشید نعمانی	پٹنہ
۵۱	بحیثیت ناقد و تبصرہ نگار	ڈاکٹر لطف الرحمٰن	پٹنہ
۵۲	تنقیدی بصیرت بحوالہ سیرۃ النبیؐ	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی	بھوپال ص ۱۸۷-۱۹۵
۵۳	محقق و تنقید نگار	پروفیسر سید ابراہیم ندوی	بھوپال ص ۱۹۶-۲۰۳
۵۴	نقد و نظر	جناب حبیب ریحان خان ندوی ازہری	بھوپال ص ۱۶۴-۱۷۶

تعلیمات:

۵۵	دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی کوشش	جناب شہباز حسین	پٹنہ

زبان و ادب:

اُردو:

۵۶	ادب اسلامی	جناب سید عارف عزیز	بھوپال ص ۲۶۷-۲۶۹
۵۷	اُردو ادب	جناب ارتضیٰ کریم	دہلی ص ۲۲۹-۲۴۴
۵۸	اُردو کی ادبی روایت	جناب شمیم احمد	اورنگ ص ۱۷۰-۱۷۷
۵۹	اُردو زبان	پروفیسر عتیق احمد صدیقی	علی گڑھ ص ۲۵-۴۶
۶۰	اسلوب نگارش	پروفیسر قاضی عبدالستار	علی گڑھ ص ۶۶-۷۲
۶۱	انشاء پرداز (بحوالہ سیرۃ النبیؐ)	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۔ علی گڑھ ص ۴۷-۶۵	معارف فروری ۱۹۸۵ء ص ۱۰۱-۱۴۸
۶۲	بحیثیت ادیب	پروفیسر عبدالمغنی	دہلی ص ۳۴-۴۳
۶۳	دبستان شبلی کا ایک ممتاز ادیب	ڈاکٹر مسز افتخار بیگم	دہلی ص ۱۱۲-۱۲۱
۶۴	سید صاحب اور تفہیم اقبال	جناب اقبال احمد انصاری	بھوپال ص ۲۵۹-۲۶۶
۶۵	نثری خدمات	ڈاکٹر سید مظفر اقبال	پٹنہ
۶۶	نثر نگاری	ڈاکٹر عبدالوہاب اشرفی	پٹنہ

عربی:

۶۷ اولیں عربی تحریریں	ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خان ندوی	بھوپال ص ۲۸۸-۳۰۹
۶۸ عربی زبان میں خدمات	مولانا محمد رابع ندوی	بھوپال ص ۲۷۶-۲۸۷

فارسی:

۶۹ فارسی ادبیات	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	دہلی ص ۷۹-۹۲

سلوک ومعرفت:

۷۰ مسلک طریقت	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ۔ علی گڑھ ص ۱۳۰-۱۳۶/ پٹنہ/ معارف جولائی سنہ ۱۹۸۵ء ص ۳۱-۴۲

سیاسیات:

۷۱ تحریک خلافت	جناب سید یوسف کمال بخاری	بھوپال ص ۲۱۵-۲۲۶
۷۲ سیاسی رجحانات	پروفیسر ابوالفضل عثمانی	علی گڑھ ص ۱۲۷-۱۴۲
۷۳ ملّی سیاست	جناب حمید اللہ ندوی	بھوپال ص ۲۱۰-۲۱۴

۷۴ سوانح نگاری:

۷۴ سیرت نگاری	جناب ضیاء الدین اصلاحی	پٹنہ
۷۵ فن سوانح نگاری	مولانا سعید احمد اکبر آبادی (مرحوم)	علی گڑھ ص ۹۱-۱۰۱

شعروشاعری:

۷۶ اُردو شاعری	ڈاکٹر ممتاز احمد	پٹنہ
۷۷ اردو کلام	پروفیسر عبدالقوی دسنوی	پٹنہ
۷۸ سخن سلیمانی	جناب منصور نعمانی ندوی	بھوپال ص ۲۵۰-۲۵۸
۷۹ شعری آہنگ	جناب اختر سعید خاں (ایڈوکیٹ)	بھوپال ص ۲۴۳-۲۴۹
۸۰ کوچۂ شاعری میں	ڈاکٹر رفعت سروش	دہلی ص ۲۲۳-۲۲۸

صحافت:

۸۱ حیات سلیمانی کا ایک اہم ورق (متعلق الہلال)	ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری	اورنگ ص ۱۴۷-۱۶۱
۸۲ سید صاحب کی کچھ تحریریں (ایک خط متعلق الہلال)۔	ڈاکٹر عابد رضا بیدار	اورنگ ص ۱۱۴-۱۲۷
۸۳ علمی ادبی صحافت کا پیشرو	ڈاکٹر سید محمد ہاشم	بھوپال ص ۲۷۰-۲۸۴
۸۴ معارف کے شذرات	جناب ابوالبقار ندوی	پٹنہ
۸۵ معارف کے شذرات: افکار واسالیب	ڈاکٹر شیخ فرید	پٹنہ

طب:

۸۶	سید صاحب اور طب یونانی	پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن	بھوپال ص ۲۸۵-۲۹۳

علم کلام:

۸۷	سید صاحب اور علم کلام	مولانا ابوالعرفان خان ندوی	علی گڑھ ص ۱۱۹-۱۲۹

فقہیات:

۸۸	احکام شرعی کا تدریجی نزول (بحوالہ سیرۃ النبیؐ)	ڈاکٹر ظفر الاسلام	بھوپال ص ۱۴۰-۱۵۴
۸۹	شانِ فقیہانہ	جناب محمد علی قاسمی	بھوپال (غیر مطبوعہ)
۹۰	فقہی مباحث	جناب عبید اللہ کوٹی ندوی	بھوپال ص ۱۱۴-۱۳۹

قرآنیات:

۹۱	قرآن اور فہم سلیمان	ڈاکٹر سید سلمان ندوی۔	اورنگ ص ۶۱-۷۰ / بھوپال (غیر مطبوعہ)
۹۲	قرآنی تحقیقات (بحوالہ مقالات)	جناب عبید اللہ فہد	بھوپال ص ۱۰۴-۱۱۳
۹۳	قرآنی خدمات	پروفیسر محمد اقبال انصاری	بھوپال ص ۶۳-۸۰
۹۴	قرآنی مباحث (بحوالہ سیرۃ النبیؐ) جلد چہارم	جناب ضیاء الدین اصلاحی	بھوپال ص ۸۱-۱۰۳

لسانیات:

۹۵	اردو کے مستعمل الفاظ کی تحقیقات (بحوالہ سیرۃ النبیؐ)۔	جناب عبید اللہ کوٹی ندوی	دہلی ص ۱۶۹-۲۰۱
۹۶	تحقیقات الفاظ	پروفیسر سید حامد حسین	بھوپال ص ۲۱۶-۲۲۱
۹۷	سلیمانی نظریۂ لسانیات	پروفیسر سید احتشام احمد ندوی	بھوپال ص ۲۰۳-۲۱۵
۹۸	لسانی تحقیقات	پروفیسر سید حامد حسین	پٹنہ
۹۹	لسانی خدمات	ڈاکٹر خلیق انجم	پٹنہ
۱۰۰	لغوی تحقیق (بحوالہ ارض القرآن)	محمد عمیر الصدیق ندوی	بھوپال ص ۲۲۲-۲۳۷
۱۰۱	نقوش سلیمانی اور ہمارے لسانی مسائل	جناب سحر انصاری	اورنگ ص ۱۷۸-۱۹۵

تصنیفات و دیگر نگارشات:

۱۰۲	تصنیفات اور علمی دینی خدمات (خطبۂ صدارت)	سید ابوالحسن علی حسنی ندوی۔	بھوپال ص ۱۳-۵۷ / تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۱-۵
۱۰۳	سید صاحب اپنی تصنیفات کی روشنی میں	پروفیسر ابراہیم خلیل	مجلہ ص ۷۹-۸۸
۱۰۴	علمی کارنامے (رہنما مقالہ)۔	پروفیسر خلیق احمد نظامی۔	بھوپال ص ۳۸-۶۲ / معارف نومبر ۱۹۸۵ء ص ۳۴۷-۳۵۸
۱۰۵	مولانا سید سلیمان ندوی: نذرانۂ عقیدت (افتتاحیہ خطبہ)۔	جناب سید مظفر حسین برنی۔	دہلی / معارف اپریل ۱۹۸۵ء ص ۲۹۱-۲۹۸

۱۰۶	ارض القرآن پر ایک نظر	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن	معارف اگست تا اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۱۰۱-۱۲۴، ۱۸۷-۲۱۰، ۲۵۹-۲۷۴
۱۰۷	ارض القرآن پر ایک نظر	ڈاکٹر نثار احمد	اورنگ ص ۷۱-۱۱۳
۱۰۸	ارض القرآن اور مستشرقین کے اعتراضات	محمد عمیر الصدیق ندوی - تبصرہ	معارف دسمبر ۱۹۸۴ء ص ۴۰۵-۴۲۰، جنوری ۱۹۸۵ء ص ۵-۲۰
۱۰۹	حیات امام مالکؒ	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن	معارف دسمبر ۱۹۸۵ء ص ۴۲۳-۴۳۶
۱۱۰	خطبات مدراس	مولانا سید احمد عروج قادری (مرحوم)	بھوپال ص ۳۲۰-۳۲۸
۱۱۱	خطبات مدراس	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن	معارف فروری ۱۹۸۶ء ص ۱۱۹-۱۴۶
۱۱۲	خیام پر ایک نظر	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن - دہلی ص ۲۳-۳۰	معارف اپریل ۱۹۸۶ء ص ۲۶۳-۲۸۸
۲۱۳	خیام پر ایک نظر	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی (علیگ)	بھوپال ص ۲۲۹-۲۳۴
۱۱۴	خیام کا مختصر جائزہ	پروفیسر لطیف اللہ	اورنگ ص ۱۲۹-۱۴۲
۱۱۵	سید صاحب اور خیام	ڈاکٹر سید محمد طارق	علی گڑھ ص ۷۳-۹۰
۱۱۶	سیرت عائشہؓ	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن	معارف جنوری ۱۹۸۶ء ص ۱۷-۴۸
۱۱۷	سیرت عائشہؓ: ایک تنقیدی جائزہ	پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی	بھوپال ص ۲۱۱-۲۱۹
۱۱۸	سیرت عائشہؓ علامہ شبلیؒ کے خطوط کی روشنی میں	جناب ابو علی اثری	بھوپال ص ۲۰۲-۲۱۰
۱۱۹	سیرۃ النبیؐ اور جدید عربی کتب سیرت	ڈاکٹر محمد راشد ندوی	بھوپال ص ۲۹۳-۳۰۱
۱۲۰	سیرۃ النبیؐ سوم پر ایک نظر	جناب ضیاء الدین اصلاحی ـ	معارف مئی ۱۹۸۶ء ص ۳۴۹-۳۶۲
۱۲۱	سیرۃ النبیؐ پنجم کا جائزہ	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن	اورنگ ص ۱۷-۴۱
۱۲۲	سیرۃ النبیؐ ششم پر ایک طالبعلمانہ نظر	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن	مجلہ ص ۱۷-۲۲
۱۲۳	شبلیؒ کی سیرۃ النبیؐ میں اضافات سلیمانی	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی	علی گڑھ ص ۱۰۲-۱۱۸
۱۲۴	نقوش سلیمانی تحقیق کی روشنی میں	ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی	بھوپال ص ۲۳۵-۲۴۱
۱۲۵	مقدمات سلیمانی	پروفیسر مشیر الحق	بھوپال ص ۲۴۲-۲۴۹
۱۲۶	ایک اہم خط پر اظہار خیال	ڈاکٹر ظہیر احمد	دہلی ص ۹۳-۱۰۲
۱۲۷	خطوط سلیمانی	جناب عبداللطیف اعظمی	بھوپال ص ۲۵۰-۲۵۷
۱۲۸	خطوط بنام ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان	علامہ سید سلیمان ندوی	مجلہ ص ۹۷-۱۰۰
۱۲۹	مکاتیب بنام سید ابوظفر ندوی کا مطالعہ	پروفیسر سید حسن	پٹنہ
۱۳۰	مکاتیب سلیمان: علمی ادبی نکات	ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن ندوی	بھوپال ص ۲۵۸-۲۶۵
۱۳۱	مکاتیب سلیمان کا ایک جائزہ	جناب عبداللطیف اعظمی،	دہلی ص ۲۱۳-۲۲۲

اضافہ

سید سلیمان ندوی، مرتبہ خلیق انجم، شائع شدہ انجمن ترقی اردو دہلی کے چند مقالات جو مندرجہ بالا فہرست میں شامل ہونے سے رہ گئے

ل - ایک جامع صفات شخصیت	مالک رام	دہلی ص۱۸-۱۹
ب - تنقید نگاری	ڈاکٹر شارب ردولوی	دہلی ص۲۰۲-۲۱۱
ج - نقوش سلیمانی	رشید حسن خاں	دہلی ص۶۴-۷۸

ملاحظات